علی گڑھ میگزین

نمبر	تعطیلات نمبر ۱۹۳۷ء	جلد ۱۵

طلبا مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا علمی و ادبی سہ ماہی رسالہ

نگران

خواجہ منظور حسین صاحب ایم۔اے (علیگ) بی اے آنرز (آکسن)

ایڈیٹر

محمد معین الدین دردائی۔ بی۔اے آنرز (علیگ)

پیشکش

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

معین الدین دردائی

اسمائے گرامی سابق مدیران علی گڑھ میگزین

(۱) مولانا شبلی نعمانی مرحوم

(۲) پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی ایم۔ اے علیگ (۱۹۲۰ء سے ۱۹۲۲ء تک)

(۳) پروفیسر خواجہ منظور حسین صاحب ایم۔ اے علیگ بی۔ اے آنرز (آکسن) ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۴ء تک

(۴) اشفاق حسین صاحب بیرسٹر ایم۔ اے۔ ایل ایل۔ بی علیگ (۱۹۲۴ء سے ۱۹۲۵ء تک)

(۵) بشیر احمد صاحب بی۔ اے علیگ (۱۹۲۵ء سے ۱۹۲۶ء تک)

(۶) پروفیسر عبد الستار صاحب ایم۔ اے علیگ (۱۹۲۶ء سے ۱۹۲۷ء تک)

(۷) محمود الحسن صاحب صدیقی بی۔ اے علیگ (۱۹۲۷ء سے ۱۹۲۸ء تک)

(۸) جمیل الدین احمد صاحب جعفری ایم۔ اے آنرز علیگ (۱۹۲۸ء سے ۱۹۲۹ء تک)

(۹) محمد زکریا فیاضی صاحب ایم۔ اے۔ ایل ایل۔ بی علیگ (۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۰ء تک)

(۱۰) ممتاز احمد صاحب [illegible] بی۔ اے علیگ (۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۱ء تک)

(۱۱) پروفیسر عبد الاحد خان صاحب خلیل ایم۔ اے علیگ (۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۲ء تک)

(۱۲) دلشاد علی صاحب بی۔ اے علیگ (۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۳ء تک)

(۱۳) آل احمد صاحب سرور ایم۔ اے علیگ لکچرار شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی (۱۹۳۳ء سے ۱۹۳۴ء تک)

(۱۴) ظفر احمد صاحب صدیقی ایم۔ اے علیگ لکچرار شعبہ فلسفہ مسلم یونیورسٹی (۱۹۳۴ء سے ۱۹۳۵ء تک)

(۱۵) [illegible] حسین صاحب جعفری بی۔ اے آنرز علیگ (۱۹۳۵ء سے ۱۹۳۶ء تک)



خواجہ منظور حسین صاحب ایم اے (علیگ) بی اے آنرز (آکسن)
نگران و سابق مدیر میگزین (۱۹۲۲—۱۹۲۴)

فہرست مضامین

تصاویر:- (۱) پروفیسر خواجہ منظور حسین صاحب ایم۔اے علیگ بی۔اے آنرز (اکسن) نگراں علی گڑھ میگزین (۲) ایڈیٹر (۳) سر سید راس مسعود صاحب مرحوم (۴) جناب زکریا فیاضی صاحب ایم۔اے ایل ایل۔بی علیگ (۵) جناب عبدالاحد خاں صاحب خلیل ایم۔اے علیگ (۶) جناب انیس الدین احمد صاحب رضوی ایم۔اے آنرز علیگ (۷) جناب محمود الحسن صاحب صدیقی بی۔اے علیگ (۸) پروفیسر عبدالباسط صاحب ایم۔اے علیگ (۹) جناب ظفر احمد صاحب صدیقی ایم۔اے علیگ (۱۰) پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی صدر شعبۂ اردو (۱۱) جناب آل احمد صاحب سرور ایم۔اے علیگ



محمد معین الدین دردائی بی۔ اے اور (علیگ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

علی گڑھ میگزین

جلد ۱۵ | تعطیلات نمبر | نمبر ۴

شذرات

۱۶ جولائی کی شام کو تعلیمی سال نے ہمیں الوداع کہا۔ سال بھر کی رونق اور چہل پہل دیکھتے دیکھتے سکوت اور خاموشی میں بدل گئی۔ پڑھنے والوں نے کتابوں کو اور ہم نے یونیورسٹی کو تین ماہ کے لئے خداحافظ کہا۔ تعطیلات جن کی مدت ابتداءً بہت معلوم ہوتی ہے گنتے گنتے گذر گئیں اور سال نو اپنی تمام دلچسپیوں اور رعنائیوں کے ساتھ پھر ہم سے آملا۔ یہ وقت بھی سال میں یادگار موقع ہوتا ہے۔ نئے طلبا کے داخلے، پرانی برادری والوں کی ملاقاتیں، تعلیمی اور غیر تعلیمی دلچسپیوں کا آغاز اس وقت علی گڑھ کی رونق میں مزید اضافہ کر دیتی ہیں۔ اس موقع پر ہم اپنے قدیم دوستوں اور نئے آنے والوں کو خوش آمدید کہتے ہیں اور ان سے جو پہلی مرتبہ اس سرزمین پر قدم رکھ رہے ہیں ہم صرف اتنا عرض کریں گے کہ اب وہ جس برادری میں شامل ہو رہے ہیں اس کی کچھ روایات ہیں، کچھ اُصول ہیں جن کا تعلق ہماری کالج کی زندگی سے بہت پُرانا اور بہت محبوب ہے، آپ بھی ان روایات کے علمبردار ہوں گے۔ اپنے طریقۂ عمل سے اپنی مادرِ تعلیم گاہ کے نام کو اور روشن کیجئے۔

میگزین کا یہ نمبر ہمارے دورِ ادارت میں آخری نمبر ہے اس کے بعد ہم آپ سے رخصت ہوں گے اور زندگی کی ایک دوسری منزل میں داخل ہوں گے جہاں راستہ اس قدر صاف اور آسان نہیں جتنا کالج کی زندگی میں سمجھتے رہے۔

اس ایک سال کی مدت میں ہم نے میگزین کی خدمت اپنے مقدور بھر کی اس سے زیادہ کے نہ ہم دعویدار تھے اور نہ اب ہیں۔ بھلے یا بُرے کسی طرح آپ ہی لوگوں کی اعانت سے چار پرچے پابندیِ اوقات کے ساتھ ہم نے آپ کی خدمت میں پیش کر دیے میگزین کا معیار بھی جہاں تک ہم سے ممکن تھا ہم نے گرنے نہیں دیا۔ اور جس پالیسی کا ہم نے ابتدا میں اعلان کیا تھا اس پر آخر تک پابند بھی رہے۔ اس سلسلہ میں ممکن ہے ہمارے اکثر دوستوں کو کچھ شکایتیں بھی پیدا ہو گئی ہوں لیکن ہم اس کے لئے مجبور تھے ہم نے جو کچھ بھی کیا ان ہی کی محبوب تعلیمگاہ کے وقار کو برقرار رکھنے کے لئے کیا۔ ہمیں ہرگز اس کا افسوس نہیں کہ ہمارے پرچوں کو ضرورت سے زیادہ خشک اور سنجیدہ قرار دیا گیا اگر یہ درست بھی ہو تو ہمیں اس پر اطمینان ہے لیکن اس کے لئے ہم کبھی تیار نہیں کہ ہماری درسگاہ کے نام سے جو چیز منسوب ہو اس میں بلند پایہ سنجیدگی اور علمیت کی شان نہ پائی جائے۔

اس لحاظ سے ہم بڑے خوش قسمت ہیں کہ میگزین کی تیاری اور ترتیب میں اساتذہ سے لے کر طلبا تک اپنی اپنی بساط بھر ہر شخص نے ہماری پوری مدد کی۔ مقالہ نگاروں میں عزیز احمد صاحب ایم۔ اے (ریسرچ اسکالر)، محمد ابو اللیث صاحب صدیقی بدایونی بی۔ اے آنرز اور شان الحق صاحب حقی کے مقالے بہت پسند کئے گئے اور قدر کی نگاہ سے دیکھے گئے۔ تقی محمد صاحب کے ترجمے بھی میگزین کی رونق میں کافی حد تک شریک ہیں۔ تقی محمد صاحب نے شروع سے آخر تک ہماری بڑی مدد کی ہے اور ہمارے کاموں میں پوری طرح ہاتھ بٹایا ہے۔ لیکن ان سبھوں کے علاوہ ایک دلچسپ ہستی اور بھی ہے جو ادبی دنیا سے زیادہ علی گڑھ کی عملی دنیا میں مشہور ہے۔ یہ ہمارے مہربان دوست بھائی فضل الرحمٰن بی۔ اے (علیگ) ہیں۔ اُنہوں نے پریس کے کاموں میں جس قدر ہماری مدد کی ہے وہ واقعی ناقابلِ فراموشی ہے۔ اُنہوں نے پرچوں کو وقت پر نکالنے کی خاطر نہ اپنی عزت و آبرو کی پرواہ کی اور نہ دوسروں کی۔ ہم ان سب دوستوں کے دل

سے شکر گذار ہیں۔

اپنی خصوصیت کے لحاظ سے میگزین کا موجودہ نمبر پچھلے تین نمبروں سے زیادہ اہم ہے۔ تعطیلات نمبر بھی ہے اور اڈیٹر نمبر بھی۔ اس میں ہم نے کوشش کی ہے کہ قریب قریب جتنے سابق مدیر میگزین ہیں ان سب کے مضامین ان کی تصاویر کے ساتھ شائع کئے جائیں۔ یہ ارادہ جنوری میں ہوا اور اس کے لئے اسی وقت سے کوشش شروع کردی گئی تھی۔ ہمیں انتہائی مسرت ہے کہ آج ہم اپنی اس دیرینہ آرزو میں کامیاب ہو رہے ہیں۔

اس مخصوص نمبر کی تیاری کے سلسلہ میں ہمیں مختلف قسم کے تجربات سے ہم کنار ہونا پڑا۔ بعض سے مضمون موصول ہوا اور بعض سے صرف ہمت افزائی اور وعدہ کے خطوط۔ کچھ ایسے بھی نکلے جنہوں نے نہ مضمون ہی بھیجا اور نہ ہمت افزائی ہی فرمائی۔ لیکن سب سے زیادہ دلچسپ وہ ثابت ہوئے جنہوں نے وعدہ تو بہت کچھ فرمایا لیکن عین وقت پر گول کر گئے۔ بہرحال ہم شکر گذار اپنے تمام کرمفرماؤں کے ہیں کیونکہ کسی نہ کسی طرح پر ہمیں مدد سبھوں سے پہنچی۔

موجودہ نمبر میں زکریا فیاضی صاحب ایم۔ اے ایل ایل۔ بی (علیگ) وکیل بجنور کا مقالہ رجب علی بیگ سرور بڑی تحقیق اور کاوش سے لکھا گیا ہے۔ اب تک سرور کے اوپر کوئی اتنا اچھا بسیط اور تحقیقی مقالہ ہماری نظر سے نہیں گذرا۔ زکریا فیاضی صاحب ہماری یونیورسٹی کے مشہور اور مقبول طالب علم رہ چکے ہیں۔ اور ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۰ء تک ہماری علی گڑھ میگزین کے کامیاب مدیر بھی رہ چکے ہیں۔

"کشمکش حیات" عبدالاحد خاں صاحب خلیل ایم۔ اے (علیگ) کا بہت ہی دلچسپ افسانہ ہے۔ عبدالاحد صاحب ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۲ء تک ہماری علی گڑھ میگزین کی ادارت کے فرائض انجام دے چکے ہیں۔ آج کل تعلقداران کالج لکھنؤ میں اردو اور فارسی کے پروفیسر ہیں۔

"بغاوت یونان اور ترکی سیاست" انیس الدین احمد صاحب رضوی ایم۔ اے آنرز (علیگ) کا عالمانہ سیاسی مقالہ ہے۔ اس میں رضوی صاحب نے یورپ کی سیاست پر قابلیت کے ساتھ روشنی ڈالی ہے رضوی صاحب امروہہ ضلع مراد آباد کے ایک معزز خانوادہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اُردو ادب کا بہت اچھا ذوق رکھتے ہیں۔ سنہ ۱۹۲۸ء سے سنہ ۱۹۲۹ء تک میگزین کی ادارت کی خدمت بہت ہی خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دے چکے ہیں۔ آج کل وکالت کرتے ہیں۔

"ہم خدا کو کیوں نہ آزمائیں" میری پکفورڈ کے ایک افسانہ کا کامیاب ترجمہ ہے اسے جناب محمود الحسن صاحب صدیقی بی۔ اے (علیگ) سابق مدیر علی گڑھ میگزین نے بڑی محنت اور سلیقہ سے ترجمہ کیا ہے۔ محمود الحسن صاحب بھوپال کے نوجوانوں میں ممتاز درجہ رکھتے ہیں اور ادبی دنیا میں کافی مشہور ہیں۔ ابتدا سے اس وقت تک برابر اردو ادب کی خدمت اپنا نصب العین رکھا ہے۔ جب علی گڑھ میں تھے تو علی گڑھ میگزین کو اپنی ادارت سے چار چاند لگائے ہوئے تھے اور اب علی گڑھ سے فارغ ہو کر ندیم ہفتہ وار کے اڈیٹر کی حیثیت سے صوبہ متوسط کی اُردو صحافت نگاری میں ایک ممتاز جگہ حاصل کئے ہوئے ہیں۔

"ہندوستانی زبان اور معاشرت پر انگریزی اثرات" پروفیسر عبد الباسط صاحب ایم۔ اے (علیگ) سابق مدیر علی گڑھ میگزین کا فاضلانہ مقالہ ہے۔ باسط صاحب آج کل اسلامیہ کالج لاہور میں فارسی اور اُردو کے چیرمین ہیں۔

"ہیوم اور مسئلہ جبر و قدر" جناب ظفر احمد صاحب صدیقی ایم۔ اے (علیگ) لکچرار شعبہ فلسفہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا ایک فلسفیانہ مضمون ہے۔ آپ نے اس میں جبر و قدر کے مسئلہ پر ہیوم کے نقطہ خیال کو پیش نظر رکھتے ہوئے بہت اچھی روشنی ڈالی ہے۔ ظفر صاحب سنہ ۱۹۳۴ء سے سنہ ۱۹۳۵ء تک علیگڑھ میگزین کی ادارت کی خدمت انجام دیتے رہے ہیں۔

"سفر کا ماضی و حال" حضرت استاذی پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی صدر شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا ایک عجیب مضمون ہے۔ رشید صاحب ہندوستانی ادب کے بے مثل طنزیین میں سے ہیں۔ آپ کی

تحریر کا ایک خاص رنگ ہے جس کی تقلید ہر شخص کرنا چاہتا ہے لیکن کسی کے لئے بھی ممکن نہیں۔ سنہ ۱۹۲۰ء سے سنہ ۱۹۲۲ء تک آپ نے اپنی ادارت سے علی گڑھ میگزین کے وقار اور معیار میں جو بلندی پیدا کر دی تھی اس کے صرف برقرار رکھنے میں ان کے جانشینوں کی عزت برابر خطرہ میں رہی۔

ابھی حال میں رشید صاحب کے مضامین کا مجموعہ بھی شائع ہوا ہے جو ہندوستانی ادب میں ایک گرانمایہ اضافہ ہے۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار جناب آل احمد صاحب سرور ایم۔ اے (علیگ) لکچرار شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا ایک علمی مضمون ہے۔ سرور صاحب انگریزی اور ہندوستانی دونوں ادب پر پوری قدرت رکھتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریر میں ایک خاص لوچ ہے۔ سرور صاحب کی ادارت کا زمانہ بھی بہت کامیاب رہا ہے۔

نظموں میں "میں اُن کے گیت گاتا ہوں" جناب جان نثار اختر صاحب بی۔ اے آنرز (علیگ) کی ایک پُرجوش نظم ہے جس کے ایک ایک لفظ سے جوش و اضطراب ظاہر ہوتا ہے۔ جان نثار صاحب ہماری یونیورسٹی کے ایک پرجوش شاعر اور بے چین دل رکھنے والے نوجوان ہیں۔ مجھ سے پہلے علی گڑھ میگزین کی ادارت آپ ہی کے سپرد تھی۔ اور جاننے والے جانتے ہیں کہ علی گڑھ میگزین کا وہ زمانہ کتنا شاندار رہا ہے۔

اشفاق حسین صاحب بیخود ایم۔ اے علیگ بھی ہماری برادری کے پرانے گنہگاروں میں ہیں۔ سنہ ۱۹۲۴ء سے سنہ ۱۹۲۵ء تک آپ کی ادارت کا بہت کامیاب زمانہ رہا ہے۔ آج کل اٹاوہ میں وکالت کا شغل ہے۔ آپ کی ایک غزل اس نمبر میں شائع ہو رہی ہے جو امید ہے بہت زیادہ پسند کی جائے گی۔

آپ کی اور جان نثار صاحب کی تصویریں چونکہ ہمیں بالکل آخر وقت میں وصول ہوئیں اس لئے ان کا بلاک تیار نہ ہو سکا جس کا ہمیں نہایت افسوس ہے۔

اس نمبر میں ایک مقالہ "شاد کا رنگ تغزل" جناب شاہ منظور الرحمن صاحب اختر کاکوی کا شائع ہو رہا ہے۔ اختر صاحب صوبہ بہار کے ایک کامیاب شاعر اور بلند پایہ مضمون نگار ہیں۔ بہار کی پرشور زمین افسوس کہ انہیں بارآور نہیں ہونے دیتی لیکن پھر بھی ہمیں یقین ہے کہ وہ ایسی چیز بھی نہیں جسے بہار کی پرشور زمین آسانی سے ہضم کر جائے۔ یہ مقالہ آپ نے بڑی تحقیق اور کاوش سے لکھا ہے اور یہ معلوم کرکے کہ ایک شاگرد رشید نے اپنے محبوب استاد کے کلام کے ایک صنف پر سلیقہ سے روشنی ڈالی ہے اس مقالہ کی قدر اور بھی بڑھ جاتی ہے ہم اختر صاحب کے بے حد شکر گذار ہیں۔

"انقلابات اسپین" میں ہم نے سپین کی موجودہ خانہ جنگی اس کے اسباب اور بتدریج ترقی پر مفصل روشنی ڈالی ہے۔ یہ مقالہ اپنے موضوع کے لحاظ سے اور ذرا زیادہ تفصیل طلب تھا لیکن میگزین کی تنگ دامانی نے ہمیں "ہرچہ گیرد مختصر گیرید" پر عمل کرنے کو مجبور کیا۔ اس مقالہ کی ترتیب میں ہم نے مختلف کتابوں، اخباروں اور رسالوں سے استفادہ کیا ہے لیکن ان سبھوں میں خصوصیت کے ساتھ (Spain in Revolt) اور (Spanish Front) ان دونوں کتابوں پر بہت زیادہ اعتماد کیا ہے۔

اگست میں بھوپال کے ہفتہ وار اخبار ندیم سے ہمیں اپنے محبوب رہبر ڈاکٹر سر سید راس مسعود سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی کے انتقال کی خبر سب سے پہلے مرتبہ ملی۔ یہ خبر سن کر ہمیں تھوڑی دیر کے لئے یقین نہیں آیا اور رہ رہ کر خیال آتا رہا کہ راس مسعود کو آخر موت نے زیر کس طرح کیا ہوگا ــــــــ خود موت پر کیا گذری ہوگی۔

راس مسعود بڑے باپ کے نامور بیٹے تھے۔ اُنہوں نے ایثار اور قومی درد اپنے دادا سر سید سے اور ذہانت اور شیریں بیانی اپنے والد مرحوم سے وراثت میں پائی تھی اُنہوں نے دولت بھی حاصل کی اور شہرت بھی لیکن دنیا جانتی ہے کہ اُنہوں نے خودداری اور نیک نفسی پر دولت کو کبھی ترجیح نہ دی۔

ایسے شخص کی سوانح حیات جس نے بیس پچیس سال تک برابر ملک و قوم کی خدمت کی ہو۔ غریبوں کا مددگار

اور بیکسوں کا سہارا رہا ہو، جو ایک ساتھ بہترین انشاپرداز بھی ہو اور جادو بیان مقرر بھی، جو ایک بلند فکر مدبر بھی ہو اور اعلیٰ مرتبہ لیڈر بھی اور سب سے بڑھ کر جو ایک سچا دوست اور مخلص رفیق ہو کچھ ہنسی کھیل نہیں۔ اس وقت ضرورت ہے کہ ہمارے ملک کے اہل قلم حضرات اس طرف توجہ فرمائیں اور اپنے محسن کی ایک جامع اور مکمل سوانح حیات لکھ کر جلد از جلد شائع فرمائیں۔ اس خدمت کے لئے سب سے زیادہ موزوں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ہے اور پھر جامعہ عثمانیہ۔ ہمیں امید ہے کہ یہ دونوں علمی ادارے اس بارہ میں خصوصیت کے ساتھ توجہ فرمائیں گے۔ ہم فی الحال مرحوم کی چند خصوصیتوں کے اظہار پر اکتفا کرتے ہیں۔

مرحوم کی سب سے بڑی خصوصیت ان کی ہمہ گیری اور عالمگیر محبت تھی جس نے ایک عالم کو ان کا شیدا اور گرویدہ بنا دیا تھا۔ وہ جس سے ملتے مسکرا کر اور خندہ پیشانی سے ملتے۔ اور معمولی سے معمولی آدمی کو بھی ملنے کے وقت یہ محسوس نہ ہونے دیتے کہ وہ ہندوستان کی ایک بڑی ہستی سے مخاطب ہے۔ جس طرح وہ خود بے مثل ادیب تھے اسی طرح اہل علم اور ادیبوں کے دل سے قدردان بھی تھے۔ جو ان سے ایک بار مل لیتا ان سے ہمیشہ ملنے کی تمنا رکھتا۔ "ان کو جاننا گویا ان سے محبت کرنا تھا۔"

وہ تصنع اور منافقت سے ہمیشہ بیزار رہے۔ وہ جس سے محبت کرتے تھے سچی اور جس سے نفرت کرتے تھے واقعی یقینی ان کے کردار کا یہی وہ تابناک رُخ ہے جس نے ان کو آج کل کے عام انسان سے کافی بلند سطح پر پہنچا دیا تھا۔

مرحوم میں ضد اور ہٹ فطری تھی۔ یہ دونوں چیزیں ان کو خاندان سے وراثت میں ملی تھیں۔ وہ جس بات کو ایک مرتبہ "نہیں" کہہ دیتے ممکن نہ تھا کہ وہ پھر ہاں ہو جائے۔ علی گڑھ یونیورسٹی سے علیحدگی کے بعد ایک موقع پر مرحوم نے خود ہی فرمایا تھا "ضد میری طبیعت میں ہے، یہ مجھے اپنے خاندان سے ترکہ میں ملی ہے۔ دادا جان کی ضد نے ان کو ہمیشہ کے لئے اپنے اکلوتے بیٹے سے جدا کرا یا تو ادھر والد مرحوم کی ہٹ نے ان کو اپنی اطاعت شعار بیوی سے مرتے دم تک ملنے نہ دیا" مرحوم کے کردار کا یہ بہت اہم پہلو ہے جسے ایک سوانح نگار کو کبھی اور کسی حال میں نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔

مرحوم کی ایک خصوصیت اور بھی تھی جو ہماری نظر میں ان کو مولانا محمدؐ علی کے دوش بدوش کھڑا کر دیتی ہے یہ ان کی غیر معمولی جذبہ خودداری، خود اعتمادی اور دنیا سے بے نیازی ہے۔ مرحوم نے کبھی اور کسی حال میں بھی کسی بڑی سے بڑی طاقت کے سامنے سر نہیں جھکایا۔ لیکن آخر ؎

جو سر جھکتا نہ تھا میر و وزیر و شاہ کے آگے
وہی سر جھک گیا اک بار پھر اللہ کے آگے

انا للہ و انا الیہ راجعون ۃ

جناب جلیل احمد صاحب قدوائی ایم۔ اے (علیگ)، سابق لکچرار مسلم یونیورسٹی نے مرحوم کی وفات پر ایک دردناک مرثیہ لکھا ہے جو ان ہی صفحوں میں کہیں نظر سے گذرے گا۔ یہ مرثیہ گرچہ بعض دوسرے اخباروں میں بھی شائع ہو چکا ہے لیکن یہ اتنا متاثر ہو کر لکھا گیا ہے کہ بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ ساتھ ہی نواب صاحب مرحوم کی ایک تصویر بھی شائع کی جاتی ہے۔

جنوری نمبر میں ادارہ نے طلبا میں سے بہترین مقالہ نگار اور فسانہ نگار کے لئے دو گرانقدر انعامات مقرر کئے تھے۔ اس انعامی مقابلہ میں ابو لیث صاحب صدیقی بی۔ اے آنرز (علیگ) اور تقی محمدؐ صاحب (علیگ) کامیاب ثابت ہوئے اور انعامات کے مستحق قرار دئے گئے۔ مقالہ کا انعام ابولیث صاحب صدیقی کو اور افسانہ کا انعام تقی محمدؐ صاحب کو دیا گیا۔ ہم ان دونوں حضرات کو ان کی شاندار کامیابی پر مبارکباد دیتے ہیں۔

۲۷ر اکتوبر ۱۹۳۷ء ایڈیٹر

مرثیہ سر سیّد راس مسعود مرحوم!

جناب جلیل احمد صاحب قدوائی ایم۔ اے (علیگ)

پوچھے نہ کوئی مجھ سے مرا حال خدارا — غم دل پہ ہے ایسا کہ بیاں کا نہیں یارا
کس طرح سے اس غم کا ہو اظہار کہ جس سے — آنکھیں ہیں مری اشک فشاں دل ہے تو پارا
جو شمع کہ رونق دہ محفل تھی ہوئی گل — ٹوٹا وہ، جو تھا علم کے گردوں کا ستارا
تھی سیدِ محمود کی باقی جو نشانی — اور قوم کا لے دے کے جو تھا ایک سہارا
نیرنگی تقدیر نے اس کو بھی نہ چھوڑا — اس کو بھی ہوا کوچ کا دنیا سے اشارا
موجوں کے تلاطم میں ہوا غرق کھویا — کشتی ہے سو ٹوٹی ہوئی اور دور کنارا!

ہاں اے فلک پیر جواں تھا ابھی مسعود — اور کون جواں؟ قوم کی جو آنکھ کا تارا
لو قوم کی بہبود کی تھی اس کے جگر میں — اور قلب میں تھا جذبۂ خدمت کا شرارا
وہ علم و ہنر، فکر و نظر، صدق و صفا کا — دریا تھا کہ ملت ہی نہ تھا اس کا کنارا
اس کے دم تقریر وہ گرمی، وہ روانی — وہ صرف و حکایات کا بہتا ہوا دھارا
ملنے پہ وہ احباب سے اخلاص و مروت — وہ لطف و محبت وہ تلطف وہ مدارا
کچھ اس سے ابھی اہلِ وطن فیض اٹھاتے — اے پیر فلک! یہ نہ ہوا تجھ کو گوارا

اے مادر علمی! ہے تجھے یاد کہ تری — بگڑی ہوئی تقدیر کو تھا کس نے سدھارا؟
قوت تھی نہ ہاتھوں میں نہ قدموں میں سکت تھی — اس دم تجھے تھا کس نے دیا آکے سہارا؟

تھے حوصلے ٹوٹے ہوئے اور پست ارادے
تھا کس نے ترے جذبۂ ہمت کو ابھارا؟
مسعود تھا اس دم تجھے تھا جس نے سنبھالا
مسعود سے تھی تجھ میں پڑی جان دوبارا!
پھر شومیِ قسمت سے ہوا تجھ سے جدا وہ
تھا پھر بھی مگر تجھ کو بڑا اس کا سہارا
لے آج ہمیشہ کو جدا ہو گیا تجھ سے
اے مادرِ علمی! وہ ترا راج دلارا!

مرنا ترا مرنا نہیں اے سید عالی!
سچ یہ ہے تری موت نے اک قوم کو مارا
روتے ہیں تری موت پہ سب اپنے پرائے
اپنوں کا چہیتا تھا تو غیروں کا تھا پیارا
پٹنہ ہو دکن ہو کہ علی گڑھ ہو کہ بھوپال
فریاد کناں غم میں ترے ملک ہے سارا
جس قوم میں گنتی کے ہوں مردان خود آگاہ
کیونکر وہ کرے موت بھلا تیری گوارا
مرنے سے ترے مفلس و نادار ہوئی قوم
دنیا میں نہیں اور کوئی اس کا سہارا

خاموش ہو دل! کس لئے دیوانہ ہوا ہے
اس غم کی کہانی کو نہ دے طول خدارا
روتے ہیں سبھی غم میں پر اتنا نہیں روتے
جو سر پہ پڑے دہر میں کرتے ہیں گوارا
جز صبر کے کچھ اور نہیں غم کا مداوا
جز ضبط کے کچھ اور نہیں درد کا چارا
بس اب تہِ دل سے یہ دعا کر کہ خدایا
جنت میں جگہ پائے مسافر یہ ہمارا

ڈاکٹر سید راس مسعود مرحوم



لے آج ہمیشہ کو جدا ہوگیا تجھ سے * اے مادر علمی! وہ ترا راج دلارا

رجب علی بیگ سرور

(جناب ذکریا فیاضی صاحب ایم۔اے۔ایل۔ایل۔بی علیگ وکیل بجنور)

تمہید دلی کی مرکزی حکومت میں اختلال کا پیدا ہونا تھا کہ تمام صوبے یکے بعد دیگرے خود مختار و آزاد ہوتے گئے۔ شاہجہاں آباد جو کبھی علم و ادب، فضل و ہنر، شائستگی و تمدن کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔ اُس کا آفتابِ ترقی گہن میں آگیا۔ جب خود والئی ملک دوسروں کا دست نگر ہو جائے تو رعیت کا خدا حافظ ہے۔ ایک نفسی نفسی کا عالم تھا جس کے جہاں سینگ سمائے وہاں چلا گیا۔ ادیب و انشا پرداز، دستکار و اہلِ فن غرض ہر ایک حاجت مند و محتاج ہو کر دلی جیسے عزیز و دلفریب وطن کو بہ حسرت و یاس ترک کرنے پر مجبور ہو گئے اور جب کبھی اُس کی یاد ستاتی تو بے ساختہ زبان سے نکل جاتا ہے

دلی جو ایک شہر تھا رشکِ نعیم خلد — تھے جمع عمدہ لوگ وہاں ہر دیار کے
اُس کو فلک نے مار کے تاراج کر دیا — ہم رہنے والے ہیں اُسی اُجڑے دیار کے

اِن کے سینوں میں دلّی کے اس اُجڑے دیار کی یاد تازہ تھی، اپنی زبان و محاورات کی سند کے لئے خانم کے بازار کی سند پیش کرتے اور جامع مسجد کی سیڑھیوں کی طرف اشارہ کرتے تھے مگر "دلی کا مطلع اُس وقت دھندلا ہو رہا تھا، ادبار و انحطاط کا سامان ہو چکا تھا۔ اولوالعزم تیمور اور بابر کی بے حس اولاد اُن کے مشہور آفاق تخت پر بیجان تصویر کی طرح متمکن تھی۔ اقبال جواب دے چکا تھا اور سیاہ رُو زوال اُن کے گرد و پیش منڈلا رہا تھا، جہاں بادشاہ خود دست نگر اور اُمیر اُمرا مضمحل و پریشاں ہوں وہاں کمال کی قدر کون کر سکتا ہے" ایسے وقت میں شاعر بیچارے تو کس گنتی میں ہیں بڑے بڑے وضعداروں اور متوکلوں کے اوسان بجا نہیں رہتے، دلّی کے اُجڑنے کے بعد لکھنؤ آباد نظر آتا تھا۔

"شجاع الدولہ کے زمانے سے سعادت علی خاں کے وقت تک اُردو کے تمام نامور شعرا کا جمگھٹا لکھنؤ ہی میں رہا۔ یہاں تک کہ میر، سودا، سوز، جرأت، مصحفی اور انشا وغیرہ اخیر دم تک وہیں رہے،

اور وہیں مرے، مگر متاخرین کی غزل میں اُن کے طرز بیان کا اثر بہت کم پایا جاتا ہے، ظاہرا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب دلّی بگڑ چکی اور لکھنؤ سے زمانہ موافق ہوا اور دلّی کے اکثر شریف خاندان اور ایک آدھ کے سوا تمام نامور شعرا لکھنؤ ہی میں جا رہے اور دولت و ثروت کے ساتھ علوم قدیمہ نے بھی ایک حد تک ترقی کی تو اُس وقت نیچرل طور پر اہل لکھنؤ کو ضرور یہ خیال پیدا ہوا ہوگا کہ جس طرح دولت اور منطق و فلسفہ وغیرہ میں ہم کو فوقیت حاصل ہے، اِسی طرح زبان اور لب و لہجے میں بھی ہم دلّی سے فائق رہیں، لیکن زبان میں فوقیت حاصل کرنے کے لئے ضرور تھا کہ اپنی اور دلّی کی زبان میں کوئی امر مابہ الامتیاز پیدا کرتے، چونکہ منطق و فلسفہ و طب و علم کلام وغیرہ کی ممارست زیادہ تھی خود بخود طبیعتیں اِس بات کی مقتضی ہوئیں کہ بول چال میں ہندی الفاظ تو رفتہ رفتہ ترک اور اُن کی جگہ عربی الفاظ کثرت سے داخل ہونے لگے، یہاں تک کہ سیدھی سادی اُردو اُمرا اور اہل علم کی سوسائٹی میں متروک ہی نہیں ہو گئی بلکہ جیسا کہ ثقات سے سُنا گیا ہے معیوب اور بازاریوں کی گفتگو سمجھی جانے لگی اور یہی رنگ رفتہ رفتہ نظم و نثر پر بھی غالب آگیا۔"

"اصل بات یہ ہے کہ ملک کی شاعری اُس کے تمدن کے تابع ہوتی ہے جو سوسائٹی جس رنگ میں ڈوبی ہوئی ہوتی ہے اُسی کی جھلک اُس کی نظم و نثر میں آجاتی ہے، اگر ہم اُس زمانہ کے لکھنؤ کو دیکھیں اور اُس کے تمدن پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ اہل لکھنؤ کے کھانے پینے، رہنے سہنے، لباس و آداب و اطوار غرض تمام طرز معاشرت میں سراسر تصنع اور تکلف پایا جاتا تھا۔ جو عام روش زندگی کے ہر شعبے میں نظر آتی تھی اُسی میں اُن کا علم ادب بھی رنگا ہوا تھا۔ منطق و فلسفہ اور علم کلام کی ممارست نے بھی اُن کے علم ادب پر اثر ڈالا، لیکن اُس زمانے کی لکھنؤ کی ممتاز خصوصیت تصنع اور تکلف تھی، اور یہ اُن کے تمدن کے ہر پہلو اور ہر شعبے میں صاف نظر آتی ہے وہ نئی تراش خراش اور جدت پر مٹے ہوئے تھے اور عوام و خواص میں اُس کی بڑی قدر ہوتی تھی، اسلئے سب کے سب اُدھر ہی ڈھل گئے، اور ساری ہمت تکلفات میں صرف کر دی۔ ...گی کی جگہ بناوٹ نے اور فطرت کی جگہ صنعت نے لے لی، میر اور اُن کے ہم عصروں کا اثر زائل ہو گیا، اُن کے بجائے دوسرے اُستاد پیدا ہوئے جو اُس سوسائٹی کے سپوت اور اُس تمدن کے پروردہ تھے حضرت ناسخ اور اُن کے بعد وزیر، صبا، رشک اور امانت وغیرہ کے کلام میں سوائے ضلع جگت،

لفظی مناسبت اور تلازمہ اور دیگر تکلفات کے کچھ بھی نہیں، نثر میں اِس کا سب سے عمدہ نمونہ مرزا رجب علی بیگ سرور کا فسانۂ عجائب ہے، گو فورٹ ولیم کالج نے ایک نئی روح پھونکی تھی مگر لکھنؤ اُس اثر سے بالکل متاثر نہیں ہوا۔"

"ناسخ اور آتش کے دور میں لکھنؤ نے علم بغاوت بلند کیا، متروکات سخن کے نئے دفتر اور معائب کلام کے جدید قوانین مرتب ہوئے، تازہ محاورات خانہ ساز ٹکسال میں ڈھلنے لگے، شعرا نے دلی کی مرکزی حکومت کا جوا گردنوں سے اُتار پھینکا، صحت زبان صفائی بیان پر مرجح قرار پائی، صنعت طرازی اظہار جذبات سے اعلیٰ متصور ہوئی، اور زباندانی خوش بیانی کا ایک جدید اسکول یہاں قائم ہو گیا۔" میر حسن نے اپنی شہرۂ آفاق مثنوی میں زبان صاف، سادہ اور بے تکلف اختیار کی جو واقعہ نگاری کے لئے مناسب و موزوں تھی مگر اہل لکھنؤ نے اِس مثنوی کے انداز بیان پر تعریض کی اور یہ کہکر مذاق اُڑایا کہ "بدرِ منیر کی مثنوی نہیں کہی گویا سانڈے کا تیل بیچتے ہیں"۔ نسیم نازک خیالی، نقش طرازی اور معنی آفرینی کے بغیر شعر کہنا ضعدازی کے خلاف سمجھتے تھے اور یہ فکر بھی دامن گیر تھی کہ کسی جگہ اسلوب بیان سحرالبیان سے ٹکر نہ کھائے، یہی وجہ ہے کہ ہر دو مثنویوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

نثر نگاری میں بھی یہی جذبہ کارفرما نکلا، میر امن کی سادہ مگر شاندار اور روزمرّہ کی جان، زبان اور اسلوب بیان کو جو بآواز خاموش انقلاب عظیم کی آمد آمد کا پتہ دے رہا تھا، ٹھکرا دیا گیا اور اُس کی روانی، قدرتی زور اور فطری دلکشی کا بالقصد مقابلہ کیا گیا، اور دلی کے اِس روڑے کی ٹکسالی زبان کو فٹ بال بن کر دور پھینکدیا گیا، اہل لکھنؤ کے اِن تکلفات باردہ نے اُردو عبارت کو مروجہ فارسی کی تقلید میں پُرتکلف بنا دیا، عبارت مقفیٰ اور مسجع ہونے لگی، مرصع کاری اور عبارت آرائی کے سحر و طلسم قائم کر دئے اِس زمانہ میں فارسی ذریعۂ تعلیم و ترجمانِ خیال تھی اور سادگی عبارت کو لکھنے والے کی سادہ لوحی اور عدم قابلیت پر محمول کیا جاتا تھا، اِسی وجہ سے جو راستہ اختیار کیا گیا اگرچہ وہ کچھ کم دلچسپ نہیں مگر مشکل اور دشوار گزار تھا اور عوام اُس پر بآسانی گامزن نہ ہو سکتے تھے، بہرحال لکھنؤ میں عرصہ تک اسی قسم کی نثر رائج رہی اور صاحب فسانۂ عجائب کو لوگوں نے اسلوب بیان میں ستارۂ ہدایت سمجھا۔

سرور کی پیدائش تعلیم و تربیت اور دیگر حالات

مقفیٰ و مسجع اُردو اور رنگین عبارت آرائی کا یہ سب سے بڑا علم بردار اور پیش رو مرزا رجب علی بیگ ۱۲۰۱ھ ہجری مطابق ۱۷۸۶ء میں دارالسرور لکھنؤ میں پردۂ عدم چاک کرکے رونق بخش بزمِ عالم ہوا ان کے باپ کا نام مرزا اصغر علی بیگ تھا اور حسب نسب اور خاندانی وجاہت و آبائی عز و وقار کے لحاظ سے اُن کا شمار شرفائے لکھنؤ میں ہوتا تھا، تعلیم و تربیت لکھنؤ ہی میں پائی اور بڑے بڑے ماہرینِ فن کی خدمت میں رہکر وہ تمام علوم و فنون حاصل کئے جو اُس دور کے شرفا کا تمغۂ امتیاز سمجھے جاتے تھے، عربی و فارسی میں کافی استعداد بہم پہونچائی، موسیقی میں کمال حاصل کیا اور خطاطی میں محمد ابراہیم مشہور خوش نویس کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا، یہ یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ شاعری کس عمر میں شروع ہوئی لیکن یہ واضح ہے کہ مذاق شاعری فطرت نے ودیعت کیا تھا اور یہ جذبہ وہبی تھا نہ کہ اکتسابی۔ رسم زمانہ کے مطابق آغا نوازش حسین خاں عرف مرزا خانی متخلص بہ نوازش کی شاگردی کی، فسانۂ عجائب میں انکا ذکر نہایت عزت و احترام کے ساتھ کیا گیا ہے اور اُن کے اشعار جابجا بطور سند پیش کئے گئے ہیں "بندۂ کمترین تلامذہ اور خوشہ چین خرمن سخن جناب قبلۂ اُستاد شاگرد نواز معزز و ممتاز مجمع فضل و کمال، نیک سیرت فرخندہ خصال، خرد آگاہ دانش آموز یادگار جناب میر سوز، عرفی عصر سعدی زماں، رشک انوری و خاقانی، نوازش حسین خاں صاحب عرف مرزا خانی تخلص نوازش کا ہے۔ حقیقت حال یہ مقام ہے کہ طرز ریختہ اور روزمرہ اُردو کا ان پر اختتام ہے، شعر اُن کے واسطے، وہ شعر کی خاطر موضوع ہیں" بایمائے اُستاد مرزا نے سرور تخلص کیا جو اُنکی رنگینی طبیعت کے لحاظ سے نہایت موزوں تھا، سرور کی ہستی دلچسپیوں اور طرب انگیزیوں کا مرکز اور محاسن وصفات عالیہ کا گنجینہ تھی وہ خندہ دل، شگفتہ مزاج تھے اور مرنجاں مرنج طبیعت لیکر پیدا ہوئے تھے، خوش پوشاکی اور خوش خوراکی جو اُس دور میں لازمۂ شرافت و انسانیت سمجھی جاتی تھی اُن کی محبوب صفت تھی وہ کثیر الاحباب تھے، بیرون لکھنؤ بھی بہت سے فضلائے عصر سے رشتۂ اتحاد و اخوت قائم تھا جن میں غالب دہلوی، شرف الدین میرٹھی اور سید علی حسین خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں، انشائے سرور کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سرور کی زندگی بھی اپنے ازلی و روحانی دوست، نظم و نثر اردو

کے چمن پیرا مرزا غالب کی طرح آلام و مصائب کی آماجگاہ بنی رہی، عوارض جسمانی کے علاوہ روحانی صدمات نے اُن کی صحت پر بُرا اثر ڈالا افسوس ہے کہ موجودہ تذکروں میں اُن کی زندگی کے حالات نہایت مختصر اور ناکافی ہیں۔ غازی الدین حیدر کے دورِ حکومت میں ۱۲۴۰ھ میں تلاش معاش کے لئے لکھنؤ کو تھوڑے عرصہ کے لئے خیرباد کہنا پڑا لیکن لکھنؤ کی جیسی آباد اور خرم و شاد دنیا کانپور جیسے کوردہ میں کہاں میسر آسکتی تھی، کانپور کی موجودہ ترقی و خوشحالی اُس دور میں مفقود تھی، یہ کایا پلٹ "زنستخیز بیجا" ۱۸۵۷ء کے بعد سے ہوئی، کانپور کی اس ابتر اور ناگوار حالت کا نقشہ سرور نے فسانۂ عجائب میں اپنے مخصوص انداز میں بدیں طور کھینچا ہے "بس کہ یہ بستی پوچ و لچر ہے، اشراف یہاں عنقا صفت ناپید ہیں، احیاناً جو ہونگے تو گوشہ نشین عزلت گزیں، مگر چھوٹی اُمت کی بڑی کثرت دیکھی، یہ طور دیکھ کر دل وحشت منزل سخت گھبرایا، کلیجہ مُنہ کو آیا، قریب تھا خون ہو جائے" ذرا برسات کی کیفیت بھی ملاحظہ ہو "ہیہات، ہیہات، دخل کیا دروازے سے باہر قدم دھرے اور پھسل نہ پڑے، گلی میں پانوں رکھا، کیچڑ کا چھپکا سر پر پہنچا، دو اِس فصل میں باہم نہ دیکھے مگر چہلے کے پھنسے، اور جنھیں سواری کا مقدور نہیں، دخل کیا جو وہ جائیں کہیں، اُن کے حق میں برسات حوالات، گھر جیل خانہ، نہ کہیں جانا نہ آنا، اگر خواب میں کہیں نکل گئے تو چونک پڑے کہ پھسل گئے اور جو بازاری کاروباری ہیں اُن کا یہ نقشہ دیکھا۔ ہاتھ میں جوتیاں، پائنچا چڑھا، کیچڑ میں لت پت، یہاں گرے وہاں گرے، خدا خدا کر جیتے گھر پھرے اور جو تنگی کے مارے ننگے پانوں نہ نکلے تو سہ

دیکھی ہے یہ رسم اِس نگر میں   جوتا ہے گلی میں آپ گھر میں"

حقیقت یہ ہے کہ اِن بزرگوں کی نگاہوں میں لکھنؤ کے مقابلہ میں کوئی دوسرا شہر جنچتا ہی نہ تھا۔ لکھنؤ کی یہ محبت عشق کے درجہ تک پہونچ گئی تھی، وجہ ظاہر ہے، یہاں ہنر کی قدر کافی اور فن کی قیمت واقعی ہوتی تھی، سرور نے دیگر شعرائے لکھنؤ کیطرح اپنے اِس جذبۂ ہواخواہی لکھنؤ کو نظم و نثر دونوں صنفوں میں ظاہر کیا ہے۔ "خطۂ بے نظیر دل پذیر، رشکِ گلشنِ جنان، مسکنِ حور و غلمان، جائے مردم خیز، باشندے یہاں کے ذکی، فہیم، عقل کے تیز، اگر دیدۂ انصاف، نظرِ غور سے اِس شہر کو دیکھئے تو جہاں کی دید کی جا

نہ رہے آنکھ بند کرلے ؎

رشکِ جناں بھی جس کا خوشہ چیں ہے | وہ بیشک لکھنؤ کی سرزمیں ہے

دبمدۂ عجب شہر گلزار ہے، ہر گلی کوچہ دلچسپ باغ و بہار ہے، ہر شخص اپنے طور پر با وضع قطع دار ہے۔"
اس رشک جناں شہر کی یہ آب و تاب، یہ چہل پہل اور یہ رونق و گرم بازاری آصف الدولہ اور اُس کے
جانشینوں کی مسلسل و پیہم کوششوں کا نتیجہ تھی، جو اُس کو دلی کا مدمقابل بنانے میں ہر دم ساعی
تھے، خدا کی قدرت دیکھئے یہ وہی لکھنؤ ہے جس کی مذمت میر حسن نے اپنی مثنوی گلزار ارم مصنفہ ۱۱۹۲ھ
میں اس طرح کی ہے۔ ؎

نہیں یہ لکھنؤ ہے یہ زمانا	زمانے پر عبث رکھنا بہانا
زبس یہ ملک ہے پتھر پہ بستا	کہیں اونچا کہیں نیچا ہی رستا
کسی کا آسماں پہ گھر ہوا ہیں	کسی کا جھونپڑا تحت الثریٰ میں
زبس گنجان ہے یہ شہر باہم	سما سکتا نہیں ہے غیر کا دم
سیہ گل سی گلی یوں تر رہے ہے	بغل جس طرح زنگی کی بہے ہے
فراغت سی یہاں کس کا مکاں ہے	ہر اک گھر نحس کا سا دل یہاں ہے
زبس کو فہ سی یہ شہر ہم عدو ہے	اگر شیعہ کہی نیک اس کو بد ہے
چڑھے ہی گومتی جب گرد آکر	حباب آسا بہے پھرتے ہیں گھر گھر
رکھے ہی پار ہو سکنا تب امکاں	چڑھے جب آدمی پر آدمی یاں
سوائے قندیاں دیکھا نہ کچھ اور	سو ہی روپوش وہ بھی دیکھ یہ طور
چلا میں یاں سی دل اپنا اُٹھا کر	کہ کیجے سیر فیض آباد جا کر

اس میں شعریت شدت خیال کے باعث کسی تشریح کا محتاج نہیں۔ نصف صدی کی یہ ترقی اور رفعت
نوابان اودھ کی حیرت انگیز جد و جہد کا پتہ دیتی ہے مگر افسوس ہے کہ یہ حالت زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکی
نہیں معلوم کس بدبیں کی نظر اس کو کھا گئی کہ بہار لکھنؤ پامال خزاں ہو گئی۔ اور سرور کو کہنا پڑا ؎

لکھنؤ میں جب نہ ہووے تاجدار لکھنؤ — کیوں نہ پامالِ خزاں ہو سب بہارِ لکھنؤ
اے سلیماں چھانتی ہیں خاک پریاں رات دن — ساتھ حضرت کے گیا عز و وقارِ لکھنؤ

اقتصادی ابتری و شومیٔ قسمت سے اپنے برادرِ روحی مرزا غالب کی طرح سرور بھی ہمیشہ تنگ دست و بے حال اور پریشان و نالاں رہتے تھے۔ انتزاعِ لکھنؤ کے بعد شکم پُری اور اہل و عیال کی پرورش کا سہارا ڈھونڈنے کے لئے ان کو مختلف امصار و دیار کا سفر نمونۂ سقر اختیار کرنا پڑا، ایک خط سے پتہ چلتا ہے کہ واجد علی شاہ کی ملازمت سے قبل نو سال تک عسرت و تنگدستی کے ساتھ گزراں کرتے اور عالمِ بیکاری میں بسر کرتے تھے۔ ان کا اپنا ذاتی مکان بھی نہ تھا، کرایہ کے مکان میں رہتے تھے۔ اِس خانۂ وحشت سرا کی مذمت کے تیور دیکھئے۔ سردی، گرمی اور برسات کے عالم کی منظر کشی پر غور کیجئے، نثر میں نظم کی داد دی ہے، ناخدائے سخن مرزا رفیع السودا نے اپنی لاٹھی کا رشتۂ حیات عصائے موسوی سے جوڑا تھا ؎

اِس کے گھرنے کی بڑائی قدیم — دال ہے اعجاز عصائے کلیم[1]

سرور نے اِس غمکدہ کو طوفانِ نوح کی یادگار بنایا۔

"وہ جو کرایہ کا مختصر سا منحوس گھر تھا، وحشت سرا، ڈھٹی دیواریں، ٹوٹا ہر ایک در تھا، معمار قدرت بھی جسے دیکھ کے ششدر تھا۔ مسکن گزینوں کو دہن اژدر تھا، صحن کا طول سخت نامعقول، جیسے گزی کا عرض، گوگاڑھے پسینے کا پیسا ئل کے لگا یا ہو پر کا واک طرز، شر قرویہ، بدمین، بکدار، شیر دہاں اس پر سورج بید، زمین میں ہزار طرح کے رخنے جا بجا چھید، رہنے والوں کو تمام دن فاقہ مستی یا آفتاب پرستی، چار پہر سر پر دھوپ کا سایہ عجب بد ساعت کا بنایا، دیواروں میں دراڑیں، چھت کی دھنی کوئی اجہت نہیں سب میں اڑ واڑیں، ایک گھُنی تو دوسری ٹوٹی، دروں کی کھگل پھول پھول کے چھوٹی، حشرات الارض کا گھر، سانپ بچھو کا ہر وقت ڈر، ایک کوٹھری تنگ، دوسرا تاریک دالان یہ رشکِ گلخن، وہ غیرتِ زندان، چھتیں انتہا کی بوسیدہ، پٹاؤ کے تختے، جیسے نرم کبادہ، ابتدا کی خمیدہ،

---

[1] مولوی امیر احمد صاحب علوی نے اِس شعر کو مرزا کے شاگرد حافظ فضل علی صاحب ممتاز کی مثنوی لاٹھی نامہ کا شعر بتایا ہے۔ لیکن مولوی اسمٰعیل میرٹھی مرحوم نے اِس مثنوی کو سودا سے منسوب کیا ہے۔

خشکی میں گرنے پر آمادہ، سرنگوں چھپر کا سائبان، حویلی کی وہ شوکت، اس کی یہ شان، پھوس سڑا تنکا تنکا
ثابت نہیں، گلے بانس کی ہر گرہ خالی، پور پور میں گھن، بندھن کھلے، بان کے بدلے عجیب آن بان سے
جالے رجالے کیطرح لپٹے، کڑیوں کی اُدھیڑ بن، وہ جو ایک آدھ سڑی گلی تھونی تھی، سرکنڈے سے
نصف کم سرکی سے البتہ دونی تھی۔ سرِ شام سے کڑیاں کڑکتیں، خوف سے بچوں کی جانیں دھڑکتیں،
شب کے دار، سائبان میں تمام گھر چار پہر چھنی دھوپ کھاتا تھا جان کے خوف سے ڈر کے اندر کوئی نجاتا
تھا، دن کو دیواروں پر چیلیں، مونڈیروں پر کوّے غل مچاتے تھے، رات کو سرِ شام سے الو چلاتے تھے
دروازوں میں بازو نہ چوکھٹ، پٹوں میں پٹے بازی، ہر دم کی کھٹ پٹ، زنجیر پا بزنجیر، کنڈی گھس کے
گھنڈی ہو گئی۔ قفل کے طالع سو گئے، کنجی کھو گئی، نہ زنجیر کو کنڈی تک کوئی لایا۔ نہ قفل نے کنڈی کا سوراخ
پایا۔ دیدۂ منتظر کی صورت دروازہ وا رہتا۔ دن رات بکشادہ پیشانی کھلا رہتا۔ آنے جانے میں عقل ہنستی
تھی۔ خلقِ خدا دیکھکر ہنستی تھی، بازو سے بازو، چوکھٹ سے ماتھا رگڑتا تھا۔ آمدرفت میں ٹکر کھاکے منہ بگڑتا۔
جھکتے جھکتے کمر میں بل آیا کچھ دن نہیں گذرے کہ کُب نکل آیا۔ اور گرمی کے موسم میں دوپہر کو وہ گھر بھاڑ سے
بدتر ہوتا۔ جس کو اُس میں بھیجا، بھیجا اُس کا پکتا تھا۔ چھت سے بلبلا کے کبھی بچھو گر پڑا۔ کبھی کنکھجورا ٹپکتا تھا
جب تڑاقے کی لوں چلتی تھی، بانس کی چربی پگھلتی تھی، بتی ہر ایک شمع کی صورت جلتی تھی، اندھیرا گھر روشن
ہو جاتا، حویلی میں فانوس کا جوبن ہو جاتا، کبھی گرمی میں تفنناً غیر فصل کے بونٹ جو خریدے یا کچے چنے منگائے
دالان میں جا کے گھبرا کے بھولے سے جو کھولے، بونٹ کے ہولے چنے بھاڑ کے بُھنے پائے، ہونٹ لب سوفار
سے زیادہ خشک رہتے تھے، دن کو اژدر لیس کیا، وہ چرخ سے تیر شہاب پے درپے چلتے تھے گو سہم کر بچے
چلا کے مچلتے تھے، گوشۂ عافیت سے رُخ باہر نہ کرتے تھے، کرایہ دینے کا مقدور نہ تھا، جنگل میں چل جانا منظور
نہ تھا، مجبور چند سوختہ جگر باسوز و گداز جلتے تھے، وگرنہ وہاں قدم رکھتے سمندر کے پَر جلتے تھے، گرم فقرہ تو یہ
ہے کہ حرارت میں فقط چولھے جلتے تھے، باورچی خانہ کی جگہ سرد رہتی تھی، برتنوں میں ناج خاک نہ تھا، آندھی
کے احسان سے گرد رہتی تھی، گو فلک جفا پسند اس گرمی کے گزند میں بھار دیدے کے ہم کو تاتا تھا،
لیکن یہ آنکھ کب جلنے والی تھی، صائم النہار و قائم اللیل رہا تاتھا، یہ لگی ہوئی بجھ کے برسات اگر آتی، تو

حال زار پر ابر زار زار روتا، ایذا اور تکلیف کا سامان ہر آن کچھ زیادہ ہوتا، کوٹھری یا دالان یا چھپر نظر آتا، گھٹ کے کہتا ہوں انگنائی سے بدتر نظر آتا، ہمسایہ کے جور سے ہر دم فلک پر نالے چلتے تھے، اونچے گھروں کے چاہر اس جھونپڑے پر پرنالے چلتے تھے، برسات بھر ہل چل، اہل محلہ سے ردوبدل رہتی، کوٹھری میں کیچڑ، دالان میں دلدل رہتی، اور انگنائی میں تو لٹس ہونے سے رنگ نرالا تھا، اسباب بہا بہا پھرتا تھا، گھر کا ہیکو تھا کا ندو کا نالا تھا، ہر ایک بدحواس تن پر آبشار کا لباس، وہی چولھے جو گرمی میں جلتے تھے فار التنور کا عالم نظر آتا تھا۔ طوفان ادبلتے تھے، اِن پریشانیوں میں برسات اگر بہ جاتی تو جاڑے کا خوف ہوتا کہ گھر اجاڑے گا، اب اس سے پالا پڑیگا، حیثیت بگاڑے گا، سردی کی آمد سے کانپتے تھے، روئی کے تصور سے جسم ڈھانپتے تھے، جہاں جہاں سے پانی ٹپکا تھا، فلک بدسگال کو تو آزار دینے کا لپکا تھا، وہاں سے برف گرتی، چارپائی ہاتھوں ہاتھ چاروں کونے دوڑتے پھرتی، دن تو دوڑ دھوپ میں کٹ جاتا، رات کو تھک کر گھر میں جب ہم جاتے تنگ حویلی جیسے برف کی قفلی، دیوار کا کونا شورے کا کام کرتا، جس کونے میں دبک کے بیٹھے جم جاتے، کوٹھری کو نمونہ کرۂ زمہریر کا پاتے، دالان میں مزا کشمیر کا اُڑاتے، خلاصہ یہ کہ ؎

گرما بگذشت وایں دل زار ہماں ‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌ سرما بگذشت وایں دلِ زار ہماں
القصہ تمام گرم وسرو عالم ‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌‌ برما بگذشت وایں دلِ زار ہماں

خدا جانے کس عصر کا وہ مکان بنا تھا یا بنا کی تاریخ کسی مورخ کو یاد نہ تھی، بستی ویران، ہرانی، وحشت کی نشانی آباد نہ تھی، انتہا کی جستجو کو بکو کر کے اتنا پتا لگایا تھا کہ نوح علیہ السلام کے زمانہ میں جب طوفان آیا تھا، ہنوز پانی کی جا بجا علامت اور نشانی تھی، خشک نہ ہونے پایا تھا، اُسی ہلڑ میں بغیر پنسال کسی بے اٹکل نے دَل دَل کے لوندوں سے نشیب میں یہ گھر بنایا تھا، الحاصل کچھ کپڑے تو گرمی کی دوادوش میں جلے، کچھ برسات کی جھڑاکوں میں بھیگ کے سڑے گلے، گلی کی جاڑے میں کشمکش، گردش گردوں دوار سے، گردش لیل ونہار سے لتے ہو کے تار تار ہو گئے، شکر ستار مطلق کیا کہ دامن کی آلائش گئی دست جنون سے گریبان دری کی فرمائش گئی، گٹھری بقچے کے کھولنے باندھنے سے سبکبار ہو گئے، جھٹ پٹ بہ کشادہ پیشانی اپنے قوت بازو سے دروازہ کھولدیا، گھوڑا بیچ کے سونے لگے، چور اُچکے خالی پھر

کے مجوب ہونے لگے۔"

اِس کا مقابلہ سرتاج شعرائے اُردو میر تقی میر کی "ہجو خانہ" سے کیجیے۔

کیا لکھوں میرؔ اپنے گھر کا حال
اِس خرابی میں میں ہوا پامال

گھر کہ تاریک و تیرہ زنداں ہے
سخت دل تنگ یوسف جاں ہے

کوچۂ موج سے ہے آنگن تنگ
کوٹھری کے حباب کے سے ڈھنگ

چار دیواری سو جگہ سے خم
ترکنک ہو تو سوکھتے ہیں ہم

لونی لگ لگ کے جھڑتی ہے ماٹی
آہ کیا عمر بے مزہ کاٹی

کیا تھے مینہ سقف چھلنی تمام
چھت سے آنکھیں لگی رہے ہیں مدام

اِس چلکش کا علاج کیا کریے
راکھ سے کب تلک گڑھے بھریے

جا نہیں بیٹھنے کو مینہ کے بیچ
ہے چلکش سے تمام ایواں کیچ

ایک حجرہ جو گھر میں ہے واقع
سو شکستہ تراز دلِ عاشق

کہیں سوراخ ہے کہیں ہے چاک
کہیں جھڑ جھڑ کے ڈھیر سی ہے خاک

کہیں گھونسوں نے کھود ڈالا ہے
کہیں چوہے نے سر نکالا ہے

کہیں گھر ہے کسو چھچھوندر کا
شور ہر کونے میں ہے مچھّر کا

کونے ٹوٹے ہیں طاق پھوٹے ہیں
پتھر اپنی جگہ سے چھوٹے ہیں

اینٹ چونا کہیں سے گرتا ہے
جی اسی حجرے ہی میں پھرتا ہے

آگے اُس حجرے کے ہے اک ایوان
وہی اس تنگ خلق کا ہے مکان

کڑی تختے سبھی دھوئیں سے سیاہ
اُس کی چھت کی طرف ہمیشہ نگاہ

کبھی کوئی سپولیا ہی پھسکے (کبھو)
کبھی چھت سے ہزار پائے گرے

کوئی تختہ مکاں سے ٹوٹا ہے
کوئی داسہ مکاں سے چھوٹا ہے

دب کے مرنا ہمیشہ مدِ نظر
گھر کہاں صاف موت ہی کا گھر

مٹی تو وہ جو ڈالی چھت پر ہم — تھے جو شہتیر جوں کماں ہیں خم
مضطرب ہو کے جو بچھائی بہت — ہر کڑی نے کڑی اٹھائی بہت
دیں ہیں اڑ داڑیں پھر جو حد سے زیاد — چل ستوں سے مکاں ڈہے ہے یاد
اینٹ مٹی کا در کے آگے ڈھیر — گرتی جاتی ہے ہوئے ہوئے منڈیر
کنگنی دیوار کی نپٹ بے حال — بدڑی کا بوجھ بھی سکے نہ سنبھال
طوطا، مینا تو ایک بابت ہے — پودنا پھدکے تو قیامت ہے
مٹّی اس کی کہیں کہیں بھسکی — جی ڈہا اور چھاتی بھی دھسکی
اچھے ہونگے کھنڈر بھی اِس گھر سے — رہے ہے یک خرابی گھر در سے
اکھڑے پکھڑے کواڑ ٹوٹی وصید — زلفی زنجیر ایک کہنہ جدید
ایک چھپر ہے شہر دلّی کا — جیسے روضہ ہو شیخ چلّی کا
بانس کی جا دیئے تھے سرکنڈے — سو وے مینہو میں سب ہوئے ڈھنڈے
گل کے بندھن ہوئے ہیں ڈھیلے سب — پاکھے رہنے لگے ہیں گیلے سب
مینہ میں کیوں نہ بھیگے ایک سر — پھوس بھی تو نہیں ہے چھپّر پر
مٹی ہو کر گرا ہے سب والا — وہ رہے یاں جو ہو وے ڈھب والا
واں یہ ٹپکا تو یاں سرک بیٹھا — یاں جو بھیگا تو واں تنک بیٹھا
حال کس کو ہے اولتی کا یاد — گری اِس جھگڑے میں گئی برباد
کہیں صحنک رکھوں کہیں پیالا — کہیں ہانڈی کے ٹھیکرے لالا
ٹپکے دو چار جا تو بند کروں — بیچ کوئی لڑاؤں فند کروں
یاں تو چھلنے ہزار ہیں تنہا — کچھ نہیں ہائے مجھ سے ہو سکتا
بسکہ بدرنگ ٹپکے ہے پانی — کپڑے رہتے ہیں میرے افشانی
بان جھینگر تمام چاٹ گئے — بھیگ کر بانس پھاٹ پھاٹ گئے

پوچھ مت زندگانی کیسی ہے | ایسے چھپر کی ایسی تیسی ہے
کیا کہوں جو جفا چلکش سے سہی | چار پائی ہمیشہ سر پر رہی
ڈیوڑھی کی یہ خوبی و دراپا | چھپر اس چو پلے کا گھر ایسا
وہ جو ایوان تھا حجرے کے آگے | اس کے اجزا بکھرنے سب لاگے
کوٹھا بوجھل ہوا تھا بیٹھ گیا | پانی جز جز میں اس کے پیٹھ گیا
کڑی تختہ ہر ایک چھوٹ پڑا | ناگہاں آسمان ٹوٹ پڑا
اینٹ پتھر تھے مٹی تھی یکسر | خاک میں مل گیا تھا گھر کا گھر
دن کو ہے دھوپ رات کو ہے اوس | خواب راحت ہے یاں سے سو سو کوس
نہ اثر بام کا نہ کچھ در کا | گھر ہے کاہے کا نام ہے گھر کا

جان عالم پیا واجد علی شاہ کی خدمت میں تخت نشینی کے موقع پر تہنیت نامہ پیش کرنے اور تاریخ جلوس کہنے پر پچاس روپیہ ماہوار مشاہرہ مقرر ہوا۔ فسانۂ عجائب کا ایک نسخہ بھی خدمت میں پیش کیا تھا اور توقع تھی کہ اعزاز و اکرام میں باعث ایزادی ہوگا، اور حصول ملازمت کا موجب ہوگا، الحاق سلطنت کا دردناک، ہمت شکن اور روح فرسا سانحہ جب پیش آیا اور واجد علی شاہ والئ سلطنت، کلکتہ سدھارے، سرور اس وقت لکھنؤ میں موجود نہ تھے، بلکہ بنارس میں مہاراجہ ایشری پرشاد نراین سنگھ کے لطف و عنایات سے مستفیض ہو رہے تھے، "بنارس پہونچا، راجہ صاحب سے ملاقات ہوئی، دفعتاً عجب واردات ہوئی کہ خبر ویرانی و بربادی لکھنؤ کو بہ کو مشہور ہوئی، شیشۂ دل سنگِ حوادث سے چور ہوا، وہاں کا قیام نہ کسی طرح منظور ہوا، ہر چند مہاراج بہادر نے بڑی عنایت کی، کفالت کی راہ سے بہت کچھ رعایت کی، مگر دل و دماغ نہ رہا، غم سے فراغ نہ رہا، بہر کیف افتان و خیزاں اشک ریزاں لکھنؤ میں آیا، ایک عالم کو تہلکۂ عظیم میں مبتلا پایا۔ شہر میں سناٹا، چھوٹا بڑا آفت میں مبتلا، ہر گلی کوچہ میں انگریزی بندوبست، اپنے اپنے حال میں ہر ایک مست"

انھوں نے اپنے خطوط میں تباہی لکھنؤ کا حال نہایت دردناک پیرائے میں تحریر کیا ہے مگر تعجب

سا تعجب ہے کہ اِس جگر خراش اور زہرہ شگاف حادثہ کا کوئی خاص اثر اُن کے دماغ پر مترتب نہیں ہوا اور تباہیٔ دہلی سے عملی طور پر متاثر ہونے کا جو الزام غالب کے سر تھوپا جاتا ہے وہی اعتراض سرورؔ پر بھی صادق آتا ہے۔ کس طرح ایک حسرت زدہ اور افسردہ دل اِس قسم کی عبارت آرائی پر مائل ہو سکتا ہے

"حضرت کے قدموں سے چُھٹ گئے، بستی میں اُجڑے لُٹ گئے، تقدیر برگشتہ ہوئی تمام رات اپنے دنوں کو روتے ہیں ایسے سانحہ دنیا میں کم ہوتے ہیں، قبلہ عالم کی برکت سے شہر غیرت گلزار تھا، گلی کوچہ رشکِ باغ سراپا بہار تھا۔ اب سنسان ہُو کا مکان ہو گیا ایسا بسا بسایا نگر ویران ہو گیا، وہ قصر و ایوان خجلت وہ جنان، قیصر سے جس کے دار بان تھے زیر آسمان بروے زمین اِس جھگڑے کے اور کہاں تھے، کیونکر سینے میں سانس برچھی کا کام نہ کرے، جب اُن میں خوگیر کی بھرتی بھری، وہ نہر حسن کے دید کی سمندر کو لہر ہو دفعتہً یہ قہر ہو، کس طرح حیرانی نہ ہو جب انھیں بوند بھر پانی نہ ہو، غضب کا مقام ہے ساون جائے بھادوں آئے بھری برسات میں وہ سر پر خاک اُڑائے، خدا کسی کو بے وارث و والی نہ کرے، مالک سے مکان کو خالی نہ کرے، فرح بخش سخت دل تنگ ہے، بے مکین مکان کا عجب رنگ ہے، جن کمروں کے دیکھنے کا پریوں کو خار تھا، اس گلزار میں بُلبل کو ادب سے چہکنا دشوار تھا، طالع اُس کا شوم ہوا، ہما نے مُنہ پھیرا، نحوست نے گھیرا، مسکن زاغ و بوم ہوا، طاقوں میں طوطے کانسوں پر کوّے، منڈیروں پر مینا، برجوں میں ابابیل، چھت پر چیلیں ہیں، ویرانے پن کی دلیلیں ہیں، جھاڑوں پر جھاڑو پھری، کوڑے کی مانند جھاڑ ڈالا، فرش بیکار سمجھ کر پھاڑ ڈالا، پہلے تو راہ صاف کی، ہموار بلند و پست ہوا اِس حال میں جائے ضروروں کا بندوبست ہوا، حلال خوروں کو حرام زادے پکڑ لے گئے، گھر گھر سنڈاس بند ہوئے، لوگ غلیظ قسمیں کھا کے حاجت مند ہوئے، زبردست کے قبض و تصرف میں گھرے، سر دست غریب غربا پیٹ پکڑے پھرے، بلوچ پورے کی گڑھیا نجاست کی علت میں گھری ہے، قصابوں کے گلے پر چھری پھری ہے۔"

تباہیٔ لکھنؤ پر اشک ریزی سے جب فرصت ملی تو پیٹ کی سوجھی، ذرائع معاش پیدا کرتے کرتے جب تھک گئے، تو بالآخر ۱۸۵۹ء میں مہاراجہ الشری پرشاد نراین سنگھ والئی بنارس کی ملازمت میں

داخل ہو گئے اور اصطبل خاص کی خدمت عطا ہوئی، مشاہرہ پچاس روپیہ ماہوار مقرر ہوا مگر یہ قلیل رقم اُن کے ضروری مصارف کی بھی کفیل نہیں ہو سکتی تھی نہایت تنگی و ترشی سے زندگی بسر کرتے تھے، خطوط میں جا بجا اِس کا ذکر ہے، معلوم ہوتا ہے کہ دوست احباب بھی حتی الوسع اِن کی دست گیری کرتے اور مالی سے اعانت کرتے تھے، سید علی حسن، سید قربان علی اور منشی شیو پرشاد خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ملازمت سے قبل بھی مہاراجہ بنارس وقتاً فوقتاً اُن کی مالی امداد کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ ایک خط میں ہنڈوی کی رسید کا شکریہ ادا کرتے ہیں اور اپنی بیماری کی کیفیت لکھتے ہیں کہ اسی باعث سے حاضری میں کوتاہی ہوئی۔ ایک موقع پر مہاراجہ پٹیالہ نے جبکہ وہ مہاراجہ بنارس کے مہمان تھے۔ سرور کو دوران ملاقات میں بطور اظہار خوشنودی مرصع طلائی کڑوں کی ایک جوڑی عنایت کی اور پٹیالہ آنے کی دعوت بھی دی۔ اس جوڑی کو بیچ کر سرور نے اپنا کام چلایا اور قرض ادا کیا مہاراجہ شیو دان سنگھ والی الور نے بھی طلب کیا لیکن یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کیا انعام ملا، خط میں بیٹے کو تحریر کرتے ہیں "شنبہ کو مہاراجہ صاحب الور سے ملازمت ہوئی مگر تمھارے نہ ہونے سے رنج ہوا، جو ہوتے تو فائدہ سے خالی نہ تھا۔ یہ شعر بقلم جلی یا خط گلزار میں لکھ رکھنا کہ اُسی راہ سے ریاست الور کو جائینگے اور شعر یہ ہے ؎

اے رونق گلزار جہاں کچھ تو ادھر بھی گل پھینکے ہے اوروں کیطرف بلکہ ثمر بھی

اِس کو لکھ رکھنا، ملاقات کے وقت دینا، تمھارا ذکر آ چکا ہے، آدمی خوش ہمت ہے" مہاراجہ ایشری پرشاد نراین سنگھ بہادر اور بلرام پور کے راجہ کا نام بخط گلزار بیٹے سے لکھوایا اور مرزا پوس پائی گج پتی راج مہاراج دیبی رام کا نام بھی خط گلزار میں تحریر کرنے کے لئے بیٹے سے تحریک کرتے ہیں۔

آخر ایام میں ان کی صحت بہت گر گئی تھی۔ پھوڑے پھنسیوں کے باعث آرام میسر نہ آتا تھا، بائیں آنکھ بالکل بیکار ہو چکی تھی، دائیں میں غبار آ گیا تھا، اختلاج قلب کی شکایت بھی کبھی کبھی عذاب جان ہو جاتی تھی۔ خواب و خور موقوف ہو گیا تھا اور نسیان یوماً فیوماً ترقی کرتا جاتا تھا "عرصہ سے پیشاب میں دیت آتی ہے دم تحریر ہاتھ میں رعشہ ہوتا ہے"۔ لقوے کا اثر ہو جانے سے زبان میں بھی لکنت پیدا ہو گئی تھی، پہلے آنکھوں کی مجبوری سے لکھنے پڑھنے میں سخت تکلیف ہوتی تھی اب گفتگو میں بھی تکلف ہونے لگا

کسی نے کیا خوب کہا ہے

تن کے معمورے میں یہی دل و چشم — گھر تھے دو۔ سو خراب ہیں دونوں
کچھ نہ پوچھو کہ آتشِ غم سے — جگر و دل کباب ہیں دونوں
ایک سب آگ ایک سب پانی — دیدہ و دل عذاب ہیں دونوں

دردِ گردن میں مبتلا ہوئے۔ بعد پریشانی بسیار چھٹکارا ہوا، نزلہ کا مرض ابتدا سے بلائے جان بنا ہوا تھا اُس کے تدارک کے لئے افیوں کا استعمال شروع کیا مگر چار رتی سے زیادہ نہ بڑھنے دیا۔ فسانۂ عجائب میں افیونی کا ذکر کس مزہ سے کیا ہے "پھر جا بیٹھا کسی افیونی کی دوکان میں سفید سفید چینی کی پیالیاں خوبصورت رنگتیں نرالیاں افیون فیض آبادی لانے کی وہ رنگین جس نے تریاک مصر کے نشے کرکرے کئے، زیادہ پی جانے والے کو جان کے لالے ہوئے، ایسے متوالے ہوئے جھگڑہ بادۂ ارغوانی و زعفرانی کا پیدا، تبدیلِ ذائقہ کو فرنی کے خوانچے، نقرئی ورق جمے، پستے کی ہوائی چھڑکی ہوئی مہیّا۔ چسکی پی ایک دم کے بعد دم حقّے کا کھینچا آنکھوں میں سرور موجود ہوا"

سیر و سیاحت اور ملاقاتیں

اوّل مرتبہ ۱۲۴۰ھ میں سرور کانپور پہونچے اور کافی عرصہ تک وہاں قیام کرنا پڑا پھر لکھنؤ واپس آئے، لکھنؤ کی تباہی کے بعد وہ بنارس اور الہ آباد گئے ایک خط میں وہ اپنے دلی اور میرٹھ کے سفر کا تذکرہ کرتے ہیں، گمان غالب ہے کہ ان ہر دو مقامات پر جانے کا باعث عزیز دوستوں سے ملاقات ہو لیکن افسوس ہے کہ گو وہ میرٹھ ایک ہفتہ سے زیادہ مقیم رہے اُنھوں نے اپنے سفر کے حالات بالاجمال بھی قلمبند نہیں کئے، اسی طرح راجپوتانہ کی سیاحت کا بھی حال نہیں کھلتا، البتہ ۱۸۶۲ء میں کلکتہ کے سفر کا باعث بیماریٔ چشم ہوئی۔ بنارس سے عظیم آباد، صاحب گنج، محمدی نگر اور مرشد آباد ہوتے ہوئے کلکتہ پہونچے اور وہاں ایک مشہور ڈاکٹر کے زیر علاج رہے۔ مگر افاقہ کی صورت نظر نہ آئی بلکہ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔

"اُس بدبخت نے فریب کیا ایک عرق ایسا دیا کہ اُس کا آنکھ میں ڈالنا تھا وہیں کے بعد داہنی میں غبار شروع ہو گیا" اور آنکھوں کی بیماری اُن کے لئے مزید پریشانی اور غم گینی کا موجب ہو گئی، دوران

قیام کلکتہ میں البتہ واجد علی شاہ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور ہوا خواہان دولت اور حاشیہ نشینوں سے ملاقات کرنے کا موقع نصیب ہو گیا اور اس طرح اُن کی دیرینہ آرزو بر آئی۔ ایک خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ انبالہ جانے کا قصد تھا ممکن ہے گئے ہوں اور پٹیالہ بھی حاضری دی ہو۔ دوران قیام بنارس میں میر انیس سے ملاقات کی، قیاس چاہتا ہے کہ جب ۱۸۶۰ء میں میر انیس پٹنہ سے مجالس محرم پڑھکر بنارس پہونچے ہیں اور قاضی میر یاد علی کے امام باڑہ میں مجلس خوانی کی ہے اُس وقت ملاقات ہوئی ہوگی لیکن افسوس ہے کہ خطوط سے اِس ملاقات کا بھی مفصل حال معلوم نہیں ہوتا۔

اولاد افسوس ہے کہ موجودہ تذکرہ نویس سرور کی اولاد کا کوئی ذکر نہیں ملتا اِس لئے وثوق کے ساتھ نہیں بتایا جا سکتا کہ اُن کے کتنے بچے پیدا ہوئے اور زندہ رہے اور اُنھوں نے کیا کیا کارہائے نمایاں سرانجام کئے۔ انشائے سرور کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے کئی بچے تھے اور وہ اپنے اہل و عیال کی پرورش کے خیال سے بہت زیادہ پریشان حال رہتے تھے، اِس انشا میں جامع خطوط مرزا احمد علی کے نام کئی خط ہیں جن میں اُن کو "نور چشم عزیز از جان" سے خطاب کیا ہے لیکن کتاب کے سرورق اور خاتمہ طبع میں مشار الیہ کو میر احمد علی متنبہ مرزا سرور بتایا گیا ہے۔ خاتمہ طبع میں یہ عبارت خاص طور پر قابل غور ہے: "سید احمد علی سلمہ اللہ العلی متخلص بہ سالم متبنائے ستتنائے اُس اُستاد ہمہ ایجاد ...... ؎

سالم فرزند خواندہ آپ کے — زندہ و سالم رہیں با صد سرور
آپ کے رقعے انھوں نے اندنوں — اُردو کے کچھ، فارسی کے کچھ ضرور
بعد جمع و طبع کے رائج کئے — تاکہ ہووے نام نامی دور دور

اِس سے شبہ ہوتا ہے کہ یہ احمد علی اُن کے پسر حقیقی نہ تھے بلکہ لے پالک تھے حالانکہ خود احمد علی صاحب نے سبب تالیف کتاب میں "حضرت ولی نعمی والد ماجد مرحوم و مغفور مرزا رجب علی بیگ سرور" اور خود کو "کمترین فرزند" ظاہر کیا ہے، خطوط کے لب و لہجہ اور معاملات کے در و بست سے بھی یہی مترشح ہوتا ہے کہ احمد علی اُن کے فرزند حقیقی تھے۔ اور مرزا اُنھیں بہت عزیز رکھتے تھے کبھی اُن کی دل شکنی نہ کرتے اور جب کبھی اُنکی خیر و عافیت کے معلوم ہونے میں دیر ہو جاتی طرح طرح کے خیالات فاسد میں مبتلا

ہو جاتے اور اُن کی جان کی امان مانگتے۔ احمد علی موصوف خود قابل، ذہین اور ہوشیار شخص تھے فارسی نثر و نظم پر بھی قدرت رکھتے تھے اور سالم تخلص کرتے تھے، خطاطی میں بھی بلند پایہ رکھتے تھے، خطوط میں سرور نے اُن سے بارہا اِس فن کی سحر کاری سے فائدہ اٹھانے کے لئے قطعے تحریر کرائے اور راجاؤں اور نوابوں کی خدمت میں پیش کئے۔ اُن کے بیٹے واحد علی سے بھی مرزا کو بہت اُنس تھا، وہ اپنی ہر تحریر میں اُن کی کیفیت مزاج دریافت کرتے، بوقت ضرورت اُن کے اخراجات کے لئے روپیہ بھی بھیجتے، بیٹے کو پوتے کی ختنہ ہونے پر مبارکباد دیتے ہیں۔ خطوط سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ نامور فرزند رائے بریلی میں کوتوال شہر مقرر ہو گئے تھے، اُن کو اچھی صحبت میں زندگی بسر کرنے اور منہیات سے بچنے کی تاکید کرتے ہیں اور اپنی خیر و عافیت سے جلد جلد مطلع کرنے کو کہتے ہیں وہ ڈاک رسانی کے نظام سے کچھ زیادہ مطمئن نظر نہیں آتے اور اِس خوف سے کہ مبادا ڈاک کے ڈاکو بیٹے کے خطوں کو مال غنیمت سمجھکر ہڑپ نہ کر جائیں بیرنگ خطوط بھیجنے کی ہدایت کرتے ہیں۔

علمی مشاغل | حسب ذیل کتب مرزا کی تراوش قلم کا نتیجہ ہیں اور اُن کی بہترین یادگار سمجھی جاتی ہیں۔

(۱) فسانہ عجائب۔ ۱۲۴۰ھ یہ مرزا کا شاہکار ہے اس پر مفصل تبصرہ کسی آئندہ اشاعت میں کیا جائیگا۔

(۲) **سرور سلطانی** ۱۸۴۷ء / ۱۲۶۴ھ | یہ شمشیر خانی کا اُردو مسجع عبارت میں ترجمہ ہے اصل کتاب شاہنامۂ فردوسی کی فارسی زبان میں تلخیص ہے اِسے سرور نے سلطان عالم واجد علی شاہ کے حکم سے ترجمہ کیا لیکن اس میں ہندوستان کی تعریف کرکے اپنے جذبہ حب الوطنی کا ثبوت دیا ہے۔ نمونہ حسب ذیل ہے۔

"راویانِ اخبار و حاکیانِ آثار متفق ہیں کہ پہلے جس نے گلزار ثبات میں روش سلطنت نکالی، تخت و تاج کی بنا ڈالی، عدل و داد کو رواج دیا، محصول و خراج لیا وہ **کیومرث** تھا اِلابود باش کوہ بیابان کی، اور پوشاک پوست حیوان کی، بیٹا اُس کا **سیامک** نام تھا اس کو عبادت کے سوا اور نہ کچھ کام تھا دیو نے اس کو مارا کیومرث کو بہت قلق ہوا، **ہوشنگ**، سیامک کا بیٹا تھا اُس نے باپ کے خون کا بدلہ لیا، دیو کو قتل کیا۔ تیس برس کیومرث نے سلطنت کی پھر دار فنا سے رحلت کی، یہ قول

فردوسی ہے اِس نام کی تحقیق میں کیومرث کاف فارسی اخیر تار نوقانی اور ائمۂ اخبار نے اختلاف کیا ہے امام غزالی نے اِس وادی سے رم کیا ہے بزرگترین اولاد صلبی آدمؑ لکھا ہے، بعضے کہتے ہیں کہ ولیم بن لاوبن سام بن نوح ہے اور مصنف روضۃ الصفا لکھتا ہے کہ یافث بن نوح کا بیٹا ہے عرب اس کو عامِ عجم کیومرث کہتے ہیں اور علمائے مجوس آدم اُسی کو جانتے ہیں کلشاہ کہکے مانتے ہیں ہزار برس کا سن اور چالیس برس سلطنت کے دن "۔ کتاب کی ضخامت ۱۹۶ صفحات ہے آخر کتاب میں مشکل الفاظ کی فرہنگ بھی دی ہے جس کے آٹھ صفحے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ فرہنگ منشی نولکشور صاحب نے لکھوائی اور پہلی مرتبہ ۱۸۸۷ء میں چھپکر شایع ہوئی۔

۳۔ گلزار سرور ۱۲۷۴ھ ۱۸۵۸ء ۔ ایک شخص رضی ابن محمد شفیع نے جو نظام الدولہ نواب الہ ویردی خاں حاکم بنگال کا مصاحب تھا۔ کتاب حدائق العشاق فارسی زبان میں تحریر کی سرور نے مہاراجہ بنارس کی فرمایش سے اُس کو اُردو لباس پہنایا۔ عبارت مقفّٰی و مسجع رہی گلزار سرور نام رکھا، اس میں عشق و روح کی جنگ کا مذکور ہے غالب نے اس پر تقریظ لکھی اور سرور کو بہترین نثر نگار کا سرٹیفیکٹ عطا کیا۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

"مذکور آوارہ وطن خزاں دیدہ چمن مترجم حدائق العشاق مرزا رجب علی بیگ سرور عفی عنہ۔ یہاں سے نقاش ثانی معترف نادانی، گردش دیدہ، بلا رسیدہ، یار و دیار سے دور، رجب علی بیگ سرور اپنی گذشتہ داستان حیرت بیان لکھتا ہے ۱۲۷۴ھ شہر شعبان میں فلک نے وہ سامان کیا گلزار لکھنؤ پر عین بہار میں خزاں آئی اس شعبدہ بازکہن نے نئی نیرنگی دکھائی، بعد خرابی شاہجہاں آباد یہ زمین بسی، سب طرح کی خلقت کا یہاں قیام ہوا دور دور اِس شہر کا شہرہ ہو، نام ہوا، اس سلیقہ سے آباد ہوا کہ دنیا کی ملک اِس کے رو برو ویران تھی، سرزمین شام کی صبح ہوگئی، اپنے شہر کی کیفیت اور فضا پر ترجیح دیتے ساکن شیراز و اصفہان تھے، ہر گلی گلزار، جو کوچہ نظر پڑا پُر بہار تھا، خزاں بار نہ پاتی تھی، بہار کا دل نثار تھا سب علم و فضل کے کامل، ہر فن کے اُستاد شامل ایک جا تھے، عقل حیران تھی وہ کون تھے کیا تھے، جو کسی کمال کا کسی طرف سے آیا جفا دیدۂ روزگار، بے برگ و بار تھا بہ چشم زدن سر سبز ہو کے نہال ہوگیا قدر شناسی ہوئی،

مالا مال ہوگیا... غربا نوازی، شرفا پروری کی راہ سے مہاراج بہادر دام دولتہم نے یاد فرمایا، سر کے بل یہ بے سروپا چلا آیا، ملازمت حصول ہوئی، سعادت حصول ہوئی، مسافر پروری کی، ناموری کی للہ الحمد امیر جوہر شناس قدر داں ہاتھ آیا، زیست باقی ماندہ بسر کرنے کو مکان خوب پایا اگر فلک سفلہ پرور حسد شعار جل نہ جائے چکر کر کے رنگ نہ لائے۔ ایک روز حسب اتفاق نسخہ حدائق العشاق نظر سے گزرا، اُس کے ترجمہ کرنے کو فقیر سے ارشاد فرمایا، ہر چند عذر کیا کہ اب تحریر کا زمانہ نہیں، حواس مختلف، ہوش کا ٹھکانا نہیں، نشہ جوانی، لطف زندگانی گھٹ گیا، جہان کی کہانی قصہ ہوگئی، دل ہٹ گیا قبول نہ ہوا، ناچار الامر فوق الادب سمجھ کے احکام بجا لایا، اطاعت سے سر نہ پھرایا، خزاں کی بار یابی سے معذور ہے نام اِس کا گلزار سرور ہے، گو مزے اور کیفیت سے یہ نثر عاری ہے فقط تحریر فرماں برداری ہے، ناظرین پُر تمکین سے عرض پیرا ہوں، کیا میرا لکھنا اور میں کیا ہوں صاحب زبان فارسی داں کے روبرو ہندی کیا چیز ہے، العاقل تکفیہ الاشارہ شرط تمیز ہے۔"

۱۴۔ شبستانِ سرور ۱۲۷۹ھ / ۱۸۶۳ء منشی نولکشور کی فرمائش سے مسجع اُردو میں الف لیلہ کو مرتب کیا۔ چار سال سے زائد عرصہ میں مکمل ہوئی، محمد حسن خاں مسودات کو تحریر کرتے تھے "چار برس میں آدھی الف لیلہ لکھی سو پہاڑ کے پھینک دینے کی گون ہے" معلوم ہوتا ہے کہ منشی صاحب خوشخط نہ تھے اور سرور کو اُن کی تحریر سے روحانی تکلیف ہوتی تھی، آنکھوں کی کمزوری کے باعث خود تحریر کا بار زیادہ دیر تک نہ اُٹھا سکتے تھے اور محسوس کرتے تھے کہ کوئی باہوش، صاحب تمیز اور اہل علم شخص مسودات کو صاف اور خوشخط تحریر کردے چنانچہ مرزا احمد علی کو لکھتے ہیں" اِن دِنوں تمھاری جدائی سے بڑا حرج ہے الف لیلہ تمام کرچکا نظر ثانی کی دیر ہے وہ ہو نہیں سکتی آنکھ کے روبرو جو اندھیرا ہے" بہر حال شبستان سرور پایۂ تکمیل کو پہونچی اور زیور طباعت سے آراستہ ہوکر شائع ہوئی۔" درنیولا الف لیلہ نظم و نثر منشی نولکشور صاحب نے بہت روپیہ دے کے لکھوائی ہے[۱] جو کچھ ہم نے ہذیان بکا ہے اُس کے چھپنے کی بھی نوبت آئی ہے

---

[۱] ۱۸۶۲-۶۹ء میں منشی نولکشور صاحب نے مطبع سے الف لیلہ کے منظوم تراجم شائع کئے۔ جلد اول نواب محمد اصغر علی خاں نسیم دہلوی نے لکھی۔ دوم و سوم جلد طوطا رام شایاں اور چہارم و آخری جلد منشی دیبی لعل چمن نے مرتب کیں۔ پھر طوطا رام شایان نے ۱۸۶۸ء میں کل کتاب کو اردو نثر میں لکھا۔

بفضلِ تعالیٰ یہ سب تمھاری نظر سے گزرینگے، اُس وقت یاد کرنا ہماری روح کو شاد کرنا" نمونہ بخوف طوالت نظر انداز کیا جاتا ہے۔

۵۔ شررِ عشق ۱۸۵۶ء میں بحکم نواب سکندر بیگم والیہ بھوپال معرض تحریر میں آئی اس میں ایک ہنس اور اُسکی محبوب ہنسنی کا قصہ عشق و محبت تحریر کیا گیا ہے۔

۶۔ شگوفۂ محبت امجد علی خاں گوالیری کی خواہش پر تحریر کی گئی، وہی داستان حسن و عشق ہے ان کے علاوہ چند متفرق نظم و نثر ہیں۔ ایک نثر اور ایک قصیدہ پرنس آف ویلز (ابعدہٗ شاہ ایڈورڈ ہفتم) کے جشن شادی کی تہنیت میں لکھا جس کا ایک مشہور شعر یہ ہے ؎

باپ میں شوکت شاہی تھی پسر زینت تخت ماں کے پرتو سے پری خانہ ہے شہر لندن

ایک نثر مہاراجہ بنارس کی سواری کی تعریف میں لکھی۔ رنگ سب کا ایک ہے وہی مسجع عبارت اور قافیہ بند جملے ہیں

۷۔ انشائے سرور ۱۲۹۷ھ / ۱۸۸۲ء اُن خطوط کا مجموعہ ہے جو سرور نے وقتاً فوقتاً مختلف احباب کی خدمت میں ارسال کئے یہ خطوط بعد وفات مرزا، انشا کی شکل میں منشی نولکشور کی ایما سے مرزا احمد علی نے مرتب کئے اور جنوری ۱۸۸۲ء میں کانپور سے شائع ہوئے خطوط کی ترتیب میں کوئی خاص قاعدہ اور اصول پیش نظر نہیں رکھا گیا بلکہ بلا لحاظ مضمون اور تاریخ تحریر جمع کر دیئے گئے ہیں جس سے سرور کے دماغی ارتقاء اور ادبی نشو و نما کا پتہ لگانے میں دقت محسوس ہوتی ہے بعض خطوط میں سنہ تحریر بھی درج نہیں ہے اور بعض میں مکتوب الیہ کی طرف اس قدر لطیف اشارہ ہے کہ یہ معلوم نہیں ہوتا کہ یہ کون بزرگ ہیں اور مرزا سے ان کا کیا واسطہ ہے بہر حال خطوط کی تقسیم مرقوم الذیل ہے:۔

عرائض اُردو ۱۰ جن میں سے کچھ واجد علی شاہ کے نام اُن کے دور حکومت میں لکھی گئیں اور کچھ مہاراجہ بنارس کی خدمت میں پیش کی گئیں زبان سب کی مسجع اور مقفیٰ ہے۔ ان میں مقصد براری کے لئے التجا کی ہے۔

خطوط اُردو ....۶۵ ان میں دو رقعہ عام ہیں جو کسی کے نام نہیں ہیں بلکہ تہنیت اور جشن

نوروز کے متعلق لکھے گئے اور مرزا کے رنگ اور اسلوب انشا کے بہترین آئنہ دار ہیں:۔

رقعۂ تہنیت | اس سال نیا ساز و سامان ہے ہولی شب برات بہار سے دست و گریبان ہے، جوش و خروش کے دن آئے، نائے نوش کے دن آئے، باغبانِ ازل دفینۂ چمن نکالے گا، بوٹہ بوٹا جوبن نکالے گا، نسیم سحر غنچوں کی گانٹھ ٹٹولنے لگی، عبیر اور گلال گرہ سے کھولنے لگی، تختہ لالہ چراغاں کا ڈھنگ دکھاتا ہے، نہروں میں فوارے پچکاری ہیں، پانی عجب رنگ دکھاتا ہے، چشم بینا ہو تو کھلے، کارخانہ قدرت کہیں بند رہتا ہے گوش شنوا اور کار ہے یحی الارض بعد موتہا کا آوازہ بلند رہتا ہے، کوسوں تک سبز مخمل کا فرش بچھا ہے، شاداب کوہ و صحرا ہے، پتا پتا کانِ زمرد کا پتا دیتا ہے، شبنم کا دانہ دُرِ بے بہا کا آویزا ہے، جس قلمِ راش میں شاخ کا دستا ہے، قوتِ نامیہ کے فیض سے یک قلم گلدستہ ہے، برگ و بار گل و خار بلکہ شاخ چنار میں فیض ہوا کا اثر ہے، عصائے زاہد خشک بھی اُمیدوار گل و ثمر ہے، اُمید کا اس قدر چرچا پھیلا ہے کہ بید مجنوں کو ہوائے لیلا ہے، چوب خامہ سے دم رفتار قطعہ قرطاس پر گل پھولتے ہیں، ہم صیاد خوف باغبان جو نہیں، اِس روش پر گلبن پھولتے ہیں، یاسمین پیکروں کے گل تو شک نے نیا شگوفہ کھلایا ہے، اپنی بو باس پر عندلیب کو پھنسایا ہے، بلبل نالاں ہے پروانہ جل مرتا ہے، جس دم سرِ محفل شمع سوزاں سے گلگیر گل کرتا ہے، اِس گلشنِ ایجاد میں یہ نمونہ قدرت پروردگار ہے کہ دست و گریباں خزاں و بہار ہے اگر شاخ سے کوئی پتی مرجھا کے ٹوٹتی ہے تو برابر سبز کونپل پھوٹتی ہے، گل کی ہنسی پر گریاں شبنم ہے، مہلت یہاں بہت کم ہے، بشر کو لازم ہے فرصت غنیمت جان کر اِن خیالوں سے درگذرے، جو امر ضروری ہو اُسے کر گزرے، لہٰذا صدر نشینانِ بزمِ طرب و سرور و انجمن آرایانِ جلسہ شادی و سور کی خدمت میں اُمیدوار ہوں کہ از راہ دوستانہ بیعذر و بہانہ رونق بخش جلسہ احباب ہوں، رہینِ منت خاکسار ہوگا۔"

تہنیت جشن نوروز میں ایک قطعہ ذوق نے بہادر شاہ ظفر کی نذر گزرانا تھا مدحیہ و دعائیہ اشعار زیادہ ہیں، نوروز کی رنگارنگی کی داد نہ بن پڑی، سرور نے نثر میں اپنی رنگینی طبع کے جوہر دکھائے ہیں "ہوائے چمن دنیا آج کل سرور افزا ہے ساکنانِ افلاک کو مسرت ہے مقیمانِ سطح خاک کو فرحت،

عجب مزا ہے، ہر سو مژدہ تہنیت کو بکو غلغلہ مبارکباد ہے جو ہے خرم، شاد ہے آمد روز سعید ہے، گھر گھر عید ہے نرگس ہمہ تن چشم گوش برآواز ہے، در عیش وطرب باز ہے، طاؤس آمادہ رقصِ ناز ہے، زمین کے رخسارہ پر سبزہ آغاز ہے، کوہ وصحرا میں سنبل وریاحین، لالہ ونسرین کی نشو ونما ہے، دامنِ دشت وجبال اس سال سبد گلچین ہوگیا پھولوں سے بھرا ہے، گل رعنا کس زیبائی سے شگفتہ ہوکے سراپا گوش ہے، بلبل شیدا پھولا نہیں سماتا چہک رہا ہے خوف خزاں، گلزار جہاں دونوں کو فراموش ہے، نالہ نوازانِ صحن گلشن حمد رب ذوالمنن میں ترانہ سنج ہیں، وحشیان صحرا بصد تمنا جویائے گنج ہیں، باغبانِ قدرت دفینہ چمن نکالتا ہے، پتا پتا جوبن نکالتا ہے، مشاطہ بہار وایہ وار گیسوی سنبل مسلسل کرکے دلجمعی سے پریشانی کھوتی ہے، سرسبز ٹہنیوں سے نئی نئی کونپل پھوٹتی ہے، نسیم سحر چل بھت کے کیا کیا مزے لوٹتی ہے، بوٹے کے سرو قامتوں سے لجا لو شرماتا ہے، بے بار ہے ندامت سے شرمسار ہے، انسان کی پرچھائیں سے سمٹا جاتا ہے، نرگس بیمار مشہور ہے کہ علیل ہے اس پر فرط شوق سے عصا ٹیکے بر سر سبیل ہے، نازپروران آغوش بہار پر البیلے پن کا جوبن ہے لالہ زار ہے غیرت گلزار جوبن ہے آبجو کے قہقہہ سے نارسیدہ پھل امرودوں کے روش شرما کے پتوں میں منہ چھپاتے ہیں گلوں کے غنچے دامنِ گلچین میں کھلکھلا کے لوٹے جاتے ہیں، فراشِ صبا گل کا دست بقچہ کبھی باندھتا ہے کبھی کھولتا ہے، غنچہ مسکرا کے پھولا ہے دستگی بھولا ہے اپنی گرہ میں زرِ گل ٹٹولتا ہے سر شاخ لالہ یاقوت کا پیالہ یادگار ساغر مل ہے، جھرنوں سے آبشار کا شور ہے، کیفیت کا زور ہے ہر تختہ میں طائروں کا غل ہے، نہروں کے متصل سرو پابگل لڑکھڑا کر ایک پانوں سے عازم رفتار ہے، فاختہ کی کوکو، قمری کی حق سرہٗ جلوہ دار ہے، سبزہ خط سے گلعذاروں کا رخ پر نور ہرا ہوتا ہے، دھوکے کی ٹٹی میں دلفگاروں کے زخم جگر کا انگور ہرا ہوتا ہے، ایسا نمو کا جوش اس سال دیکھتے ہیں کہ لکھنؤ کی گلیوں میں سبز لال دیکھتے ہیں، فیض ہوا سے تعجب نہیں جو طوطی تصویر سبز ہو، چوب خامہ قلم ہو کر سبز ہو، ہر کیاری میں عبیر سے زیادہ معطر خاک ہے، بسا بسایا خس وخاشاک ہے بجائے باغبان خوف خزاں سے طبیعت جو رکتی ہے دعائے بقائے بہار کیواسطے ہر شاخ باردار کس سبکی سے سجدہ کرنے کو جھکتی ہے، صحن گلشن میں ناز ونیاز کا جلسہ ہے، داربست پر سبکی

تاک ہے، سہ برگہ نغمہ سنجانِ چمن کی سواری کا پچکلسہ ہے، قوت نامیہ کا یہ جوش ہے کہ کوہ بھی لباسِ کاہی سے ہم لباس زمرّد پوش ہے، شبنم کو خدمت آبداری ہے، گلعذاروں کے چہرے سے گرد کلفت دھونے کی تیاری ہے، گُل کے بناؤ پر بلبل سے بگاڑ ہے، کچھ بو پائی ہے گو خبر بادِ ہوائی ہے اِس پر چلی کٹی کی چھیڑ چھاڑ ہے، ہر گل و خارِ گلشن مثلِ کبک دری قہقہہ زن ہے، ہنسانے کو گیندے کا تختہ رشک زعفران ہے۔ مہندی کی پتی پتی سے خونِ پوشیدہ کا پتا برملا اُبلا آتا ہے، پنجۂ مریم کے رشک سے پنجہ مرجان کا مثلِ کہربا رنگ اُڑا جاتا ہے، خونِ بلبل سُرخ قبا کا دامنگیر ہے، گیسوئے سنبل پائوں کی زنجیر ہے، رنج و ملال کا نام چمنِ دہر سے مثلِ حرفِ غلط حک ہے، غنچوں کے چٹکنے کی صدا مبارکباد کی سلک ہے، آمادہ ناز بصدا انداز گُل اور ہزار نیاز سے بلبل ہے، ارض و سما میں نوروز کا غل ہے، بلند صدائے دورباش ہونے لگی، غنچہ دہنوں کو گُل اشرفی کی تلاش ہونے لگی، ایسی ہوا چلی کہ دفعتاً گلرخوں کے بھاؤ بڑھ گئے، جوبن ٹپک پڑا دام چڑھ گئے، ماہرو عنبرین مو، دامِ زلف بردوش، مرصع پوش، طائر دل پھنسانے کے گھات میں خوب نکھرے ہیں، کوئی چمک چمکا کسی کی جلدی کے جنجال میں بھیگے بال شانوں پر بکھرے ہیں، کسی نے سلکِ گہر پرمتی ملکر ریخ کے جوبن سے نیلم کو ہیرا کھلایا ہے، کسی بیدرد سُرخ پوش نے قتلِ عالم پر بیڑا اُٹھایا ہے دھڑا دھڑی لوٹنے کو لاکھ انداز سے لاکھا جمایا ہے، دروازوں پر طلائی نقرئی بانس جڑاؤ کھٹولے کی وہ وہ ڈولی ہوتی ہے جس کو دیکھ کر جی کو ڈانون ڈوبی ہوتی ہے، پردوں میں نبت گوکھرو لچکا سیروں کھلا ہوا لگا، ایسے متغرق کہ جب غفلت میں اُٹھیں ہوشیاروں کی عقل پر پردے پڑیں، جب آنکھوں سے آنکھیں لڑیں، کہاروں کی کرتیاں پُربہار، لے بھاگنے پر طیار، یہ ہنگامہ نظر سے جو گذرا، خیال آیا آج جلسہ نوروز ہے، ہر بزم میں روشن شمع شب افروز ہے، بیساختہ یہ فقرہ فقیر کی زبان پر آیا باواز بلند ہر ورد مند کو سُنایا کہ اِن دنوں جو جو رشک بدر ہیں اُن کی راتیں غیرت شبِ قدر ہیں:

ذوق کا قطعہ یہ ہے:-

خسروا سُن کے ترا مژدۂ جشنِ نوروز	آج ہے بلبلِ تصویر تلک زمزمہ سنج
خبر عیش تری دی ہے چمن کو جا کر	زرِ گُل پیک صبا پائے نہ کیونکر پا رنج

بادۂ جوشِ جوانی کی ہے گویا اک موج — تنِ پیرانِ کہن سال پہ ہر چین شکنج
چند قطرہ سے ہیں شبنم کے وہ بلکہ کمتر — آگے ہمت کے ترے گوہرِ شہوار کے گنج
حسنِ نیت سے ہے تو یوسفِ مصرِ بخشش — دستِ حاتم ہیں بجا ہے کہ جو دیں تیغ و ترنج
شش جہت پر جو ہے غالب ترا سرپنجۂ امن — فتنہ کو اٹھنے میں جوں نرد ہے کیا کیا شش و پنج
نہ بجھے آب سے آتش، نہ حسن آتش سے جلے — ایک سے ایک موافق کہ مرنجان و مرنج
تیرے منصوبہ کے تابع ہیں سب احکامِ نجوم — صفحۂ تقویم کا گویا ہے بساطِ شطرنج
لایا ہے معنیٔ رنگیں سے یہ لعلِ خوش رنگ — ذوق جو مدح و ثنا میں ہے ترے گوہر سنج
خسروا ہوتا ہے اس رنگ سے معلوم یہ رنگ — رنگ نوروز جو ہے ایسے بہ رنگِ نارنج
بزمِ رنگیں میں تری رنگ طرب ہو ہر روز — اور تری خاطرِ اقدس پہ کبھی آئے نہ رنج

بقیہ خطوط میں زیادہ تر احمد علی کے نام ہیں اور کمتر دیگر احباب کے نام۔ یہ خطوط بھی اسی ایک رنگ میں رنگے ہوئے ہیں مگر دلچسپ ہیں اور مرزا کی حیات کے اہم واقعات پر کافی روشنی ڈالتے ہیں، ان میں جابجا اردو اور فارسی اشعار اور برمحل ضرب الامثال استعمال ہوئے ہیں، بعض خطوط کی ابتدا صرف "قبلہ بندہ" سے کی گئی ہے اور آداب میں لفظ "بندگی" کو کافی سمجھا گیا ہے اور خاتمہ "والسلام" پر ہوا ہے، ایک خط میں القاب و آداب بھی غائب ہیں اور اس فرد سے شروع ہوتا ہے ؎

"یادم نمی کنی و زیادم نمی روی — عمرت دراز باد فراموش کارِ من"

ان میں سے ایک خط پر "۱۲ رمضان ۱۲۷۲ھ مطابق ۲۹ مئی سنہ حال" مرقوم ہے جو ۱۸۵۵ء کے مطابق ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ جس زمانہ میں حضرت غالب قدیم اور فرسودہ طرزِ نگارش کی خلاف علمِ بغاوت بلند کر رہے تھے، سرور بھی خطوط میں اسی راہ پر گامزن تھے اور گو اب تک اس جدت طرازی کا سہرا غالب کے سر رہا ہے میرا خیال ہے کہ اگر سرور کے تمام خطوط مل جائیں اور ان کو سنہ وار جمع کیا جائے تو اس عقدہ کی حقیقت وا ہو جائے کہ دراصل اردو خطوط کی ابتدا پہلے کس نے کی اور اس

جدت طرازی کا حق کس کو حاصل ہے، اگر فسانۂ عجائب کو سرور کی پہلی اُردو تحریر مان لیا جائے کیونکہ اِس سے قبل کا کوئی نمونہ ہمارے سامنے نہیں ہے تو یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ انھوں نے ۱۸۲۴ء کے قریب اِس وادی میں قدم رکھا جب کہ وہ عمر عزیز کی "چہل سالہ" منزلیں ختم کر چکے تھے اور اُن کا مزاج "حال طفلی" سے گذر چکا تھا، اُن کے ارادوں میں استقلال، استدلال میں پختگی اور فہم و فراست میں ثبات آچکا تھا اور زبان سحر کاری اور قلم ضیا پاشی میں معجز نمائیاں کرنے لگا تھا۔ یہ ظن غالب ہے کہ اس منزل گلریز تک رہرو کش ہونے سے پیشتر سرور نے ابتدائی مشقوں میں اپنی قوت پرواز کا پورا پورا امتحان کرلیا ہوگا، پھر میر امن کے باغ و بہار کا جواب لکھنے کی جرأت کی ہوگی اور بعد تکمیل کتاب دوست احباب کو ہدیتہً پیش کی ہوگی خیال ہے کہ ان احباب کو خطوط بھی اُسی رنگین مقفیٰ عبارت میں تحریر کئے ہونگے، اِن قیاسات کی بنا پر یہ نتیجہ مستنبط ہوتا ہے کہ سرور نے غالب سے پیشتر اُردو خطوط نویسی شروع کردی تھی، بہرحال یہ امر یقینی ہے کہ القاب و آداب کی سادگی، بے تکلفی اور برجستگی کے مرزا غالب ہی تنہا و واحد اجارہ دار نہیں ہیں بلکہ یک اور شوخ بھی عنان در عنان اُن کے ہمراہ ہے اور وہ اُن کا ازلی دوست مرزا سرور ہے یہ ضرور ہے کہ غالب کی جیسی ہمہ گیری، دلآویزی اور سلاست و بے تکلفی اور شوخی و شرارت یہاں مفقود ہے خطوط میں سادہ اور بلا تکلف و تصنع عبارت کا نمونہ یہ ہے۔ بیٹے کو تحریر کرتے ہیں۔

"عزیز القدر سعادت مند سلمہٗ تعالیٰ۔ بعد دعائے صحت و عافیت و تمنائے ملاقات مسرت سمات واضح خاطر عزیز ہو، خط مرسلہ تمھارا آیا حال کھلا مگر یہ عجب معاملہ ہے کہ نسخۂ بستان خیال منگوایا تھا، تم نے بستانِ حکمت بھیجا، اسی میں کچھ حکمت الٰہی تھی۔ مگر خیر اب اُس کتاب کو اُسی طرح بھیجدو اور لاٹھی بازار میں تمباکو والا رہتا ہے ایک جلد اس کے پاس ہے اگر دوسری جلد اُس کے آگے کی ہو تو اُس کو مول لیکر بھیجدو، دوسری جلد ہو تو لے لینا ضرور ہے غفلت نہ کرنا کہ ہمیں اُس کا لکھنا منظور ہے غالب ہے کہ جناب مولوی محمد یعقوب صاحب لکھنؤ سے آگئے ہوں یا اُن کے پاس لیجا نا وہ بھجوادینگے۔ بہت جلد سب حال مفصل لکھنا۔

خطوط فارسی ۸ ان میں سے چھ احمد علی کے نام ہیں اور دو دیگر احباب کے نام ہیں

یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ سرورؔ نے بالالتزام اُردو یا فارسی خطوط کس کس دور میں لکھے۔ لیکن ایک خط میں سنہ ۱۲۶۳ھ درج ہے (سنہ ۱۸۴۶ء) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اُردو اور فارسی برابر لکھتے تھے اُن کی فارسی سادہ اور دلکش ہے، اور اُس دَور کے ہندی نثر اور فارسی نویسوں کی تحریر کا عمدہ نمونہ کہی جا سکتی ہے اور غالباً کبھی کد و کاوش اور جگر تپ دہی کے ساتھ سرانجام نہیں ہوئی۔ بلکہ قلم برداشتہ توضیح مطالب کے لئے سپردِ قلم ہوئی ہے۔ مگر قافیہ بندی اور مسجع نگاری یہاں بھی دوش بدوش ہیں۔ اِن فارسی خطوط میں ایک خاص بات اُردو اشعار کا استعمال ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ سرورؔ کو اُردو سے کتنا شغف تھا اور وہ کس قدر اُن کی زبان پر مستولی تھی۔

"نورِ چشم راحتِ دل وجان سعادت توامان مد اللہ عمرہٗ و مزید قدرہٗ۔ پس از دعاے صحت و عافیت آں عزیز القدر کہ وظیفۂ شام و سحر است واضح رائے آں سعادت پیرا ے باد بنائے ایں عالمِ ایجاد خراب آباد نقش بر آب ست و معاملات ایں بے بنیاد بدتر از سیراب است۔ ہر گلے کہ دریں گلشنِ پُر حوادث دم سحر بر قباے خوش رنگ خود خندید، تا شام ناکام از جورِ صرصرِ حوادث گریباں تا بدامن درید، ونخلے کہ دریں بوستاں پامالِ خزاں مثلِ سرو سر کشید بیک دم از ستم تیر و جفاے آرہ بخاکِ ناکامی بغلطید، بلبلِ شوریدہ دریں گلزارِ سراسر خار بر بے ثباتیِ گُل نالاں ست و شبنم پاکدامن بر نیرنگیِ چمن بچشمِ عبرت اشک ریزاں، باغبانِ تماشا خزاں و بہار بادلِ خار خار ششدر، و صیاد گرفتارِ دامِ تحیر، مہر از بے مہریِ سپہر نیلی فام جگر تفسیدہ و ماہ ہر ماہ بصد آلام کاہیدہ، ایں سرائے فانی جائے دلبستگی نیست چرا کہ گذشتنی و گذاشتنی است و آمادۂ سفر بعید خوف و خطر محتاج و غنی ست، ازیں جائے پُر محن خوش قسمتاں کافور و کفن بُردہ اند وگرنہ صدہا پیر و جوان از مائدہ ایں دوں پرور بامید نوش بلاہل حسرت و ناکامی خوردہ اند، دفترہا مملو از فسانہاے چرخ کہن است کہ ایں جائے پُر آلام مقامِ راحت و آرام نیست پُر محن است، حالات انبیاے ذوی الاحترام و حکایات از یکہ نشیناں پر احتشام برائے عبرت کافۂ انام کافیست کہ دریں دارِ ناپائدار چہ صدمہ ہائے جانکاہ کشیدہ اند و بمطلب نرسیدہ اند و علی الخصوص جناب خاتم المرسلین و ائمہ معصومین علیہ السلام کہ خلاصۂ کائنات و فخرِ موجودات ذاتِ خجستہ صفات ایں ہا بود بلائے نیست کہ نکشیدہ اند و المی

نہ کہ ندیدہ اند، محبوب خدا جل و علی کہ در شانِ شان ذاتِ کبریا می فرمائید لولاک لما خلقت الافلاک باعث نمود ایں سے بود و سبب خلقت جن و انس ذات گرامی بود بجز شصت مرحلہ زندگانی آں مورد وحی آسمانی طے نہ کرد کل نفس ذائقۃ الموت و کل من علیہا فان و یبقیٰ وجہ ربک ذو الجلال و الاکرام از عہد آدم علی نبینا علیہ السلام تا قیام روز قیام ہر شی کہ خلق شد و خواہد شد انجامش فنا ست بقا برائے ذات کبریاست ؎

اگر صد سال مانی ور یکے روز　　　بباید رفت زیں کاخ دل افروز

پس آں بہتر کہ دل را شاد داری　　　دراں شادی خدا را یاد داری

دل بریں گنبد گردندہ منہ کایں دولاب آسانیست کہ بر خونِ عزیزاں گرد دلپس رنج و الم آں شے کہ عالمی دراں شریک باشد نتواں نمود و راہے کہ رہگذر خاص و عام ست، کمالم رہرواں با ب آلام بروئے خود نباید کشود ؎

عرفیؔ اگر بگریہ میسر شدی وصال　　　صد سال میتواں بہ تمنا گریستن

کسی کی مرگ پر اے دل نہ کیجے چشم تر ہرگز　　　بہت سار دیئے اُپر جواس جینے پہ مرتے ہیں

و ازاں خوش نصیب تر کدام خواہد بود کہ تجہیز و تکفین مثل آں نور چشم مصروف باشد و بہ قلق مہاجرت رخ زیبا از تاختن الم خراشد صد ہا بیگور و کفن بصد محن زیر خاک با دلِ پُر حسرت و چاک چاک رفتند گلے بجز داغ جگر و شمع سوائے سینہ سوزاں میسر نشد۔ مترصد ام کہ پند پدر پیر بگوش دل و سمع قبول شنیدہ سررشتہ حبل المتین صبر و رضا از دست ندادہ تسکین و تشفی دیگراں نمایند کہ خوشنودی پروردگار ست ان اللہ مع الصابرین کلام رب العالمین ست ...... ورنیو لاخطوط جلد جلد باید فرستاد بہ جمیع کسان دعا و سلام"

شاعری

سرورؔ کی شاعری کے بارہ میں بھی تذکروں میں کچھ مواد نہیں ملتا، اُن کی نثر نگاری نے اُن کی نظم کو چمکنے نہیں دیا، کثرت تصانیف کے باعث وہ عام طور پر نثر نگار ہی سمجھے جاتے ہیں لیکن یہ طے شدہ امر ہے کہ سرورؔ صاحب دیوان تھے مگر افسوس ہے کہ اب

دیوان ناپید ہے اُن متفرق اشعار اور جستہ جستہ غزلوں سے جو اُن کے مصنّفات میں منتشر پائی جاتی ہیں اور جن کو میں نے یکجا جمع کر دیا ہے سرور کے مذاق شاعری کا ہلکا سا اندازہ ہو سکتا ہے، تعجب سا تعجب ہے کہ اُس دور میں جبکہ ناسخ و آتش اور اُن کے تلامذہ رشک، برق، بحر، وزیر، نسیم وغیرہ لکھنؤ کی فضائے شاعری پر چھائے ہوئے تھے اور طرز نو کے موجد و مخترع بنے ہوئے تھے اور خود سرور بھی نثر نگاری میں اُس ماحول کا شکار ہو چکے تھے نظم میں اُنھوں نے اِس رنگ کی تقلید کرنے سے بزور انکار کر دیا اور ان کی اعلیٰ تخیل نے اپنی جولانیوں کے لئے ایک جداگانہ میدان پیدا کر لیا ہے

عشق کی اک اک ادا پر جان و دل صدقے مگر
لطف کچھ دامن بچا کر ہی نکل جانے میں ہے

اُنھوں نے نہایت پیش بینی اور دور اندیشی سے اپنی قوت ممیزہ کو رہنما بنا کر لکھنؤ رنگ کی پرزنگی اور زیاں کاری کو سمجھ لیا اور اپنے دامن شاعری کو اُس رنگ میں آلودہ نہ ہونے دیا، اُن کی غزلیں صفائی زبان، زور کلام اور جوش ادا کا اعلیٰ نمونہ پیش کرتی ہیں، سرور نظم میں بلند رتبہ و منصب کے مستحق ہیں۔

غزلیات

(در مدح نصیر الدین حیدر)

تا ابد قائم رہے فرماں روائے لکھنؤ
یہ نصیر الدین حیدر بادشائے لکھنؤ

گو ملے جنت بھی رہنے کو بجائے لکھنؤ
چونک اُٹھتا ہوں میں ہر دم کہہ کے ہائے لکھنؤ

رشک کھا کھا کو فلک مجھ سی چھڑائے لکھنؤ
تب میں جانوں دل سے جب میرے بھلائے لکھنؤ

یا تو ہم پھرتے تھے اُنمیں یا ہوا یہ انقلاب
پھرتے ہیں آنکھوں میں اب دم کوچہ ہائے لکھنؤ

اُن کی استغنا سے کیا کیا آرزو کرتی ہے رشک
جام جم پر تف نہیں کرتے گدائے لکھنؤ

کیوں گمان زاغ و بلبل کے ترانے پر نہ ہو
یاد آجائیں جو وہ نغمہ سرائے لکھنؤ

ہر محلے سے بچانا جی ہے عیسیٰ کو محال
چھوڑتے جیتا نہیں معجز نمائے لکھنؤ

جنس و انس و وحش و طائر کیوں نہ سب محکوم ہوں
ہے سلیماں اِن دنوں فرماں روائے لکھنؤ

دشت غربت میں کیا برباد وحشت نے تو کیا
دل سے اُڑتی ہے کوئی اپنے ہوائے لکھنؤ
یہ رہے آباد یا رب تا بدورِ مشتری
میں کہیں ہوں مانگتا ہوں پر دعائے لکھنؤ
بلبلِ شیراز کو ہے رشک ناسخ کا سرور
اصفہاں اُس نے کئے ہیں کوچہ ہائے لکھنؤ

لکھا ہوا یہی قسمت کا تھا سو جان ملا
کہ میری خاک میں محنت دے آسمان ملا
ہزار صدمہ پہ دل نے ہمارے اُف بھی نہ کی
جو اِک رفیق ملا وہ بھی بے زبان ملا
نہ ہم نے چین بزیرِ فلک کبھی پایا
عنایت ازلی سے عجب مکان ملا
تری تلاش میں در در بھٹکتے پھرتے ہیں
ملا نہ تو ہی تو جوتی سے گو جہان ملا
نہ کہہ تو پیرِ فلک پر کہیگی ساری خلق
کہ خاک میں ترے جوروں سے کیا جوان ملا
بہت جہان کی، کی سیر اے سرورِ حزیں
یہ ہجراں نہ ہمیں کوئی بوستان ملا

توڑ کر خم اور پٹک کر آج پیمانے کو ہم
سوئے مسجد جاتے ہیں زاہد کے بہکانے کو ہم
شمع رو محفل میں کب دیں بار پروانے کو ہم
ایک کپڑے سے بھی کیا کچھ کم ہیں جلجانے کو ہم
خواب سا کرتے ہیں ہم ایّامِ عشرت کو قیاس
دہیان میں لاتے ہیں جسدم گذرے افسانے کو ہم
کل تلک تھا جس مکاں میں شمع رویوں کا ہجوم
چھانتے ہیں اب وہاں پر خاکِ ویرانے کو ہم
اشکِ گلگوں کے نشاں چھٹ کچھ پتہ ملتا نہیں
جب خزاں میں ڈھونڈتے ہیں اپنے کاشانے کو ہم
جرم کچھ صیاد کا اپنی اسیری میں نہیں
روتے ہیں کنجِ قفس میں آب اور دانے کو ہم
رشکِ زلفِ یار سب عقدے ہیں سیدھے اے سرور
اور اُلجھ اُٹھتے ہیں اُٹھیں جب کہ سلجھانے کو ہم

قرار باقی نہیں جانِ زار بن تیرے
ستا رہا ہے دلِ بے قرار بن تیرے
گھمنڈ تھا مجھے جن جن کا سب وہ بھاگ گئے
حواس و ہوش و شکیب و قرار بن تیرے

سرورِ کشتۂ محبوب خاک شرح کرے — بسر جو کرتا ہے لیل و نہار بن تیرے

بسوزِ شمع رویاں اس طرح کا سینہ سوزاں ہوں — کہ رفتہ رفتہ آخر جلوۂ سروِ چراغاں ہوں
نسیم صبح ہوں یا بوئے گل یا شمع سوزاں ہوں — میں ہوں جس رنگ میں پیارے غرض دم بھر کا مہماں ہوں
نہ پھل پایا لگانے کو بجز افسوس و حسرت کے — میں نخلِ بے ثمر کس مرتبہ مردودِ دہقاں ہوں
عیش تدبیر ہے گور و کفن کی اس کے کوچہ میں — میں ننگِ دو جہاں ننگے ہی رکھدینے کا شایاں ہوں
نہ مرتے مرتے منہ پھیرا محبت سے کبھی میں نے — جفائیں کس قدر جھیلیں وفا پر اپنی نازاں ہوں
تنی رہتی ہے اکثر چادرِ مہتاب تربت پر — کہ تا معلوم ہو سب کو قتیلِ مہ جبیناں ہوں
سرور غم رسیدہ ہوں مجھے طوفانِ محشر میں — ترا ناتو خداوندا غریقِ بحرِ عصیاں ہوں

مجھکو رونیکو نہ تم منع کرو ہم نفسو! — غمِ دل کرتا ہوں میں دیدۂ تر سے خالی
مدد اے سوزِ جگر تا کہ نہووے خفت — نوکِ مژگاں ہوئی پھر لختِ جگر سے خالی
پھر نہ منہ اُسنے کیا میری طرف اے ظالم — سخت تم بھی مرے نالو ہوا اثر سے خالی
نہ لگا اِس کو مری بات کو تو مان سرور — دل کا لگنا نہیں اے یار ضرر سے خالی

حالت ہے اُسکی پارے کی، برق و شرار کی — کیا کیا تڑپ سناؤں دلِ بے قرار کی
پھوٹے تپش سے دل کے یہ سب آبلے مرے — منت کشی نہ کرنی پڑی نوکِ خار کی
دل اپنا قبر میں بھی جلے گا اسی طرح — حاجت رہیگی ہم کو نہ شمعِ مزار کی
وعدہ کی شب کو دیدۂ اختر جھپک گئے — دیتے مثل ہیں لوگ مرے انتظار کی
لیجائیو اُدھر سے جنازہ مرا سرور — حسرت بھری ہے دل میں مرے کوئے یار کی

عشرت کدے جہاں میں ہوئے سینکڑوں ویلے
اِک دل ہمارا تھا کہ وہ ماتم کدہ رہا
تاثیرِ آہ دیکھی نہ گریہ میں کچھ اثر
ناحق میں اس اُمید پہ کرتا بکا رہا
کیا دیکھتا ہے سینے کو میرے تو اے سرور
اُجڑا دیار اس میں نہیں دوسرا رہا

کمالِ ضبط کو عاشق کرے اگر پیدا
کہاں کی آہ، کرے بات بھی اثر پیدا
ہزار رنگ زمانے کے بدلے پر افسوس
کہیں ہوئی نہ شبِ ہجر کی سحر پیدا
کرے گی ہمسری نالے کی میرے تو بلبل
شعور اتنا تو کر جا کے جانور پیدا
ہمیشہ ہاتھوں سے اُنکے رہا ہوں میں جلتا
یہ زور گرم ہوئے تھے دل و جگر پیدا
یہ دل میں ذوقِ اسیری ہے جو قفس میں مدام
میں نوچتا ہوں جو ہوتے ہیں بال و پر پیدا

شادی و جشن سزاوار مبارک ہووے
آج شہزادی کا دیدار مبارک ہووے
صد وسی سال سلامت رہیں با امن و اماں
حُسن کی گرمی بازار مبارک ہووے
وہ بھی دن آئے جو سہرہ بندھے سر پر اسکے
سب خوشی سے کہیں ہر بار مبارک ہووے
بعد شادی کے خدا دے کوئی فرزند رشید
ہم کہیں آکے یہ دلدار مبارک ہووے
خار کھاتے رہیں کم بخت جو دشمن ہوں سرور
دوستوں کو گل و گلزار مبارک ہووے

تپِ جدائی سے اسطرح اب نزار ہوں میں
اجل کے منہ سے بھی غالب ہے شرمسار ہوں میں
کیا ہے رنج جدائی نے ایسا کاہیدہ
نظر میں خلق کی رشکِ خطِ غبار ہوں میں
جو تو وہ گل ہے کہ عالم کے دل میں ہے تری جا
تو سب کی آنکھ میں کھٹکا کیا وہ خار ہوں میں
قرار می بَرَد از خلق آہ و زاریِ ما!
سرور رنج میں کس کے یہ بیقرار ہوں میں

مریضِ ہجر کو صحت سے اب تو کام نہیں
اگر جو صبح کو یہ بچ گیا تو شام نہیں

رکھو دیا نہ رکھو مرہم اُس پہ ہم سمجھے
ہمارے زخمِ جدائی کو التیام نہیں

کیا جو وعدۂ وصل اُس نے دن پہاڑ ہوا
یہ دیکھو مری شامت کہ ہوتی شام نہیں

وہی اُٹھائے مجھے جسنے مجھکو قتل کیا
کہ بہتر اِس سے مرے خوں کا انتقام نہیں

اُٹھایا داغِ گُل افسوس تم نے دل پہ سرورؔ
میں تم سے کہتا تھا گلشن کو کچھ قیام نہیں

گر اُس کے ہجر میں یونہی اندوہگیں رہے
تو ہوئیگا وصال دلا یہ یقیں رہے

ہے احتیاط شرط کہ اس چشمِ تر پہ آہ
دامن رہے رہے نہ رہے آستیں رہے

مدفن کا اپنے ہمکو تردد ہو کس لئے
کوچہ کی تیرے یار سلامت زمیں رہے

تو گلشنِ وصال کی کر سیر عندلیب
ہم خرمنِ فراق کے بس خوشہ چیں رہے

جو جو کہ انتخاب تھے صفحے پہ دہر کے
ایسے وہ مٹ گئے کہ نشاں بھی نہیں رہے

کس کی خوشی کہاں کی ہنسی کیسا اختلاط
ہم کو نہ چھیڑو تم کہ وہ اب ہم نہیں رہے

چھوٹا نہ نزع میں بھی خیال اُسکا اے سرورؔ
دم بھرتے ہم اُسی کا دمِ واپسیں رہے

بسانِ نقشِ پا بیٹھے جہاں واں سے نہ پھر سرکے
ٹھکانا پوچھتے ہو کیا بھلا ہم بے ٹھکانوں کا

بیادِ دوستاں پہروں مجھے ہچکی لگ آتی ہے
کہیں مذکور جب ہوتا ہے کچھ گذرے فسانوں کا

عَلَم سے آہ کے ثابت ہوئی غم کی ظفر ہم کو
کہ باعث فتح کا ہوتا ہے کُھل جانا نشانوں کا

چھڑائے جبر سے پیرِ فلک نے دوست سب میرے
مٹے گا داغ کب دل سے مرے اُن نوجوانوں کا

شرر مُنہ سے نکلتے ہیں سرورِ دل حزیں ہر دم
بھلا دیوان ہو کیونکر جمع ہم آتش بیانوں کا

لازم ہے سوزِ عشق کا شعلہ عیاں نہ ہو
جل بجھئے اس طرح کہ مطلق دھواں نہ ہو

اللہ رے بے حسی کہ جو دریا میں غرق ہوں
تالاب کی طرح کبھی پانی رواں نہ ہو

گُل خندہ زن ہیں چہچہے کرتی ہے عندلیب
پھولی ہوئی چمن میں کہیں زعفراں نہ ہو

بھاگو یہاں سے یہ دلِ نالاں کی ہے صدا
بہکے ہو یارو! یہ جرسِ کارواں نہ ہو

ہستی عدم سے ہے مری وحشت کی اک تلنگ
اے زلفِ یار پاؤں کی تو بیڑیاں نہ ہو

لینا بجائے فاتحہ تربت پہ نامِ یار
مرنے پہ یہ خیال ہے وہ بدگماں نہ ہو

ناقہ چلا ہے نجد میں لیلیٰ کا بے مہار
مجنوں کی بن پڑے گی اگر ساربان نہ ہو

چالوں سے چرخ کی یہ مرا عزم ہے سرور
اُس سرزمیں پہ جاؤں جہاں آسماں نہ ہو

آتشِ فرقت سے سینہ جب سے مجمر ہو گیا
ٹھنک کے لختِ دل مرا ہر ایک اخگر ہو گیا

باعثِ افشائے ذلت دم نہ مارا میں نے گاہ
ورنہ زیرِ آسماں کیا کیا نہ مجھ پر ہو گیا

نزع تک تو آمدِ جاناں کا کھینچا انتظار
وہ نہ آیا وعدہ اپنا یاں برابر ہو گیا

کیا ڈراتا ہے ہمیں واعظ سُنا شورِ نشور
شامِ فرقت یاں عذابِ روزِ محشر ہو گیا

اب جو ہنستا ہوں تو ہنستے ہنستے بھی گرتے ہیں اشک
روتے روتے آخرش رونے کا خوگر ہو گیا

فکر پھر کس کو ہے دیواں جمع کرنے کی سرور
اپنا جب مجموعۂ خاطر ہی ابتر ہو گیا

تم چھٹے پر خیال باقی ہے
گئی شادی ملال باقی ہے

ناوکِ ہجر نے جگر چھانا
اب فقط دیکھ بھال باقی ہے

دیدہ و دل میں روز جھگڑا ہے
آپ پر انفصال باقی ہے

دل و جاں کو دیں آپ پر صدقے
گو کہ دولت نہ مال باقی ہے

شبِ فرقت میں جیتے رہنے کا
کس قدر انفعال باقی ہے

مر کے اُلفت کا حق ادا کرتے
یہ اُمیدِ وصال باقی ہے

جس قدر چاہو امتحاں کر لو　　کچھ اگر احتمال باقی ہے
حسرتِ دید میرے سینہ میں　　اے شہ خوشخصال باقی ہے

مسدس در مدح عشق

(۱)

کیا میں اِس کافر بدکیش کا احوال لکھوں　　یہی خونخوار پیا کرتا ہے عاشق کا خوں
زار کر دیتا ہے انسان کو یہ اور زبوں　　رفتہ رفتہ یہی پہنچاتا ہے نوبت بہ جنوں
خوں ریز تو خوں خوار ہے انسانوں کا　　دین کھوتا یہی کافر ہے مسلمانوں کا

یہی کرتا ہے ہر اک شخص کو رُسوا ظالم　　یہی کرتا ہے ہر اِک چشم کو دریا ظالم
کوہ دکھلاتا ہے گاہے، گہے صحرا ظالم　　کیا بتاؤں تمھیں، کرتا ہے یہ کیا کیا ظالم
دربدر خاک بسر چاک گریباں کر کے　　جان لیتا ہے دلے بے سر و ساماں کر کے

یہی بانی تو زلیخا کی بھی تھا خواری کا　　یہی باعث دمن و نل کی ہوا یاری کا
یہی فرہاد کا حامی تھا تبرداری کا　　عشق کہئے نہ اسے قہر ہے یہ یاری کا
تلخ کامی ہوئی شیریں کو اِسی سے حاصل　　کئے بے پردہ و برباد ہزاروں محمل

اِس نے مجنوں سے بنائے ہیں بہت دیوانے　　اِس نے خود رفتگی میں اپنے کئے بیگانے
گو کہ مشہور جہاں اس کے ہیں سب افسانے　　پر جو اِس کام کا مشتاق ہو وہی جانے
کبھی معشوق کے پردے میں نہاں ہوتا ہے　　کبھی سر چڑھ کے یہ عاشق کے عیاں ہوتا ہے

ناقۂ لیلیٰ مضطر کا شتربان یہ تھا　　نجد میں قیس سے پہلے ہی حدی خوان یہ تھا
چاہ میں ڈال کے یوسف کا نگہبان یہ تھا　　جانِ ہر شیر کی لینے کو نیستاں یہ تھا
حسن بن جاتا ہے انداز کہیں ناز کہیں　　درد دل ہے یہ کہیں سوز کہیں ساز کہیں
مثلِ فرہاد بہت مر گئے سر پھوڑ حزیں　　دی ہے شیریں کی طرح کتنوں نے جانِ شیریں

پاس عذرا کے گیا اور کبھی وامق کے قریں | اِس سے آوارہ بچا اور نہ بچا گوشہ نشیں
اس سے ملتا ہے جسے رنج و محن ملتا ہے | گور ملتی ہے کسی کو نہ کفن ملتا ہے
طور کو نور کے جلوے میں جلایا اس نے | کبھی آتش کو ہے گلزار بنایا اس نے
جان چھوڑی نہیں، جیتا جسے پایا اس نے | اور نیرنگ جہاں اپنا دکھایا اس نے
کام مُردوں سے لیا زندوں کو ناکام رکھا | درد کا نام بھی بیدرد نے آرام رکھا
اِس کے افسانے ہیں دنیا میں بہت طول و طویل | جس کا ہمدم یہ ہوا ہو گیا وہ خوار و ذلیل
اِس کا بیمار پڑا رہتا ہے بستر پہ علیل | دھونس دے دے کے بجا دیتا ہے یہ کوسِ رحیل
رنج و ماتم کے سوا اور یہ کیا دیتا ہے | وصل کی شب سحرِ ہجر دکھا دیتا ہے
یہی اخفا ہے بصد زیب رگِ ہر گل میں | سوز و نالہ یہ اسی کا ہے دلِ بلبل میں
یہی ہے جزو میں گر دیکھو یہی ہے کل میں | گر فرشتہ ہو تو آجاتا ہے اس کے جل میں
خون بیجرم زمانے کا بہاتے دیکھا | میل چتون پہ کبھی اُسکے نہ آتے دیکھا
ایک شمّہ ہے لکھا حال جو میں نے اس کا | جس پہ اِس دیو نے الطاف کا سایہ ڈالا
دشت غربت میں وہ آوارہ و سرگشتہ ہوا | دوست بھی چھوٹتے ہیں شہر بھی چھوٹے اپنا
پاس جس کے یہ گیا خلق سے وہ دور ہوا | کون سا شیشۂ دل تھا کہ نہ وہ چور ہوا
ہجر کے رنج میں کتنوں کا ہوا اسیں وصال | لگ گئے سینہ میں فرقت کا سبھی درد و ملال
اس کی گردش سے ہر اک ماہ ہوا بدر ہلال | کس کی طاقت ہے جو تحریر کرے اسکا حال
زیست کرنا غمِ ہجراں سے ہے یہ سبکو شاق | جان دیدیتے ہیں کہہ کہہ کے یہی ہائے فراق

---

(۲)

یاد ایام کہ نفرت تھی زمانہ سے تجھے | ہوتی وحشت تھی بہت غیر کے آنے سے تجھے
خوف آتا تھا کہیں آنے سے جانے سے تجھے | مکر تھا یاد، خبر تھی نہ بہانے سے تجھے

بیڈھٹک غیر سے باتوں کا کبھی طور نہ تھا | ہمیں ہم تھے تری صحبت میں کوئی اور نہ تھا
کبھی چوٹی کی خبر تھی، نہ تھا کنگھی کا خیال | بار ہا الجھے سے رہتے تھے ترے سر کے بال
پانکے لاکھے اور مسّی سے ہوتا تھا ملال | مجھکو افسوس یہ آتا ہے کہ گذرا نہیں سال
ایسی کیا بات ترے دلمیں سمائی ظالم | دفعتۃً سب وہ رہ و رسم بھلائی ظالم

تھی لگاوٹ ہی تجھے یاد نہ خلطہ سب سے | گرمجوشی کا بھلا کب تھا یہ ییکا سب سے
بیٹھنا کونے میں ہر دم تجھے تنہا سب سے | تجھکو لگ چلتے کبھی ہم نے نہ دیکھا سب سے
ابتو ہٹی میں کیا چھید غضب تونے کیا | کھل گیا سب پہ ترا بھید غضب تونے کیا

شکر صد شکر ہوئی جلد رہائی تجھ سے | ابتو تا حشر مکدر ہے صفائی تجھ سے
وضع اپنی نہیں کیا کیجیے برائی تجھ سے | نہ ملیں پر جو کبھے ساری خدائی تجھ سے
بخدا ملنے سے ہم ہاتھ ترے دھو بیٹھے | خوش رہو تم کہ تمھیں کھول کے دل رو بیٹھے

اب قسم کھاتا ہوں لو دل نہ لگاؤں گا کبھی | ذلت و رنج نہ اس طرح اٹھاؤں گا کبھی
گر طرحدار بھی اس دہر میں پاؤں گا کبھی | ربط تو کیا ہے نہیں پاس بٹھاؤں گا کبھی
موسم اب دل کے لگانے ہی کا جاتا نہ رہا | ربط کیا خاک کریں ہم وہ زمانا نہ رہا

برزباں یاروں کے یہ ذکر رہیگا ہر بار | گو کہ عاشق تھا مگر تھا یہ بڑا غیرت دار
دیکھ بد وضع کیا دیکھئے ایسا انکار | سر پٹک مر گئے سب پر نہ ملا وہ زنہار
کرے معشوق کسی سے تو دغا ایسی کرے | تیج کرے بات کی عاشق تو بھلا ایسی کرے

مثنویات

چل اے توسن خامہ چالاک و چست | کہ اب بیٹھے بیٹھے بہت جی ہے سست
جگہ بیٹھ رہنے کی دنیا نہیں | یہاں خاک بیٹھے کوئی دل حزیں

سفر ہر نفس سب کو رہتا ہے یاں		سرائے فنا بھی عجب ہے مکاں
نہ بیٹھا کبھی جم کے اک جا سرور		قریبوں سے اپنے رہا دور دور

مصیبت نگار و مصائب رقم		جگر چاک و مغموم میرا قلم
زمانے کے کچھ طرز لکھتا ہے یاں		عجب غرائب ہے یہ داستاں
مری بات یارو یہ کرنا یقیں		کسی کا کوئی دوست مطلق نہیں
جو یہ دوست ہیں ایسے دشمن کہیں		نہیں ہیں نہیں ہیں نہیں ہیں نہیں
کیا امتحاں میں نے اکثر سرور		ضرورت کی کچھ دوستی ہے ضرور

نگارندۂ داستانِ عجیب		یہ لکھتا ہے پھر ماجرائے غریب
طلسم جہاں دید کا ہے مکاں		پھنسے اس میں رہتے ہیں پیر و جواں
ولیکن ہنسا جو کوئی غنچہ ساں		ہوا مثلِ گل دست بُردِ خزاں
جسے ہم نے دیکھا وہ تھا دل حزیں		خوشی کی جگہ ہیچ ہے دنیا نہیں

اے جنوں تو دل شوریدہ کی امداد کو آ		تا لکھوں حال میں اک اور ستم دیدہ کا
چین دنیا میں نہیں عشق کے بیماروں کو		نت نیا رنج فلک دیتا ہے بیچاروں کو
بار فرقت کبھی معشوق جو دھر جاتے ہیں		جتنے جی دب کے یہ اُس بوجھ سے مرجاتے ہیں
زیست بے لطف گذر جاتی ہے بیچاروں کی		کیا کہانی میں کہوں تم سے دل افگاروں کی

چل اے توسنِ خامہ منزل رساں		کہ اب گھر پہنچتا ہے یہ کارواں
پھرا گھر کو شہزادۂ خوش سیر		جھمکڑے کا عالم بہت کر و فر

وہ اس طرح پہونچا وطن کی طرف   بہار آئے جیسے چمن کی طرف
بڑی فکر رہتی تھی ہر صبح و شام   ہوئی فضل حق سے کہانی تمام
وہ بچھڑے تو سب ہوگئے ایک جا   ہوئے اپنے مطلوب سے ہم جدا
رہی شرح جورِ فلک ناتمام   سرورِ حزیں توسنِ خامہ تھام

نظم

نظر پڑا چمنِ دہر میں جو ہم کو مکاں   ہزار خار ہوئے دیکھی بلبلِ نالاں
ہمارے زعم میں اُس سا نہیں کوئی ناداں   جو اپنے حسنِ دو روزہ پہ کچھ ہوا نازاں
شکستہ رنگیٔ گل شاہدِ چمن ہے یاں   کہ اِس بہار کا انجام آخرش ہے خزاں
گھمنڈ اسپہ حماقت کی بس نشانی ہے   مقامِ عبرت و حیرت سرائے فانی ہے

ساقی نامہ

کدھر ہے تو اے ساقیٔ گل عذار   مرا غم سے دل ہوگیا خار خار
پلا دے کوئی ساغرِ لالہ رنگ   جوانی کی لائے جو دل میں ترنگ
سہے کتنے صحرا نوردی کے رنج   بھلا کچھ تو شادی کا ہوں نغمہ سنج

کدھر ہے تو اے ساقیٔ بے خبر   نہ کی تُلطف سے غم زدوں پر نظر
ہوا حال شادی کا سب اختتام   مگر غم کا قصہ ہے وہ ناتمام
تپش سے تڑپ سے تو کر دے بہم   کہ لکھتا ہوں پھر داستانِ الم
خوشی سے مجھے رنج مرغوب ہے   یہ مونس ہی ہمدم بہت خوب ہے

یہی ساتھ دیتا شب و روز ہے ۔ یہ غم عاشقوں کا غم اندوز ہے

پلا دے تو ساقی مے لالہ فام ۔ ہوا چاہتا ہے یہ قصہ تمام
وہ مے دے کہ ہو دور دل سے الم ۔ کہ ہوتے ہیں معشوق و عاشق بہم
جدائی کے ایام طے ہو چکے ۔ شب ہجر میں خوب سا رو چکے
مناؤں کوئی دم بھلا جیسے ۔ کہ رنج جدائی بہت سے سہے
مثل ہے یہ مشہور اے ذی شعور ۔ کہ ہے رنج کے بعد راحت ضرور

اشعار متفرق

سنا رضواں بھی جس کا خوشہ چیں ہے ۔ وہ بیشک لکھنؤ کی سرزمیں ہے
الٰہی لکھنؤ بستا رہے دورِ قیامت تک ۔ سرور دشت پیما کا کبھی وہ شہر مسکن تھا
کب لگاتا ہے کوئی اس دلِ بیحال کا مول ۔ سب گھٹا دیتے ہیں مفلس کے غرض مال کا مول
خدا کو مان نہ لے نام عاشقی کا سرور ۔ کہ منفعت میں بھی اُسکے ہیں سو ضرر پیدا
غنیمت جان لے یہ صحبتیں آپس کی آناداں ۔ دگرگوں حال ہو جاتا ہے اکدم میں زمانے کا
وہ بھی ہوگا کوئی امید بر آئی جس کی ۔ اپنے مطلب تو نہ اس چرخ کہن سے نکلے
وصل کی شب چونک اٹھے ہم سنکے زاہد کی صدا ۔ یاں دمِ تکبیر ہی اللہ اکبر ہو گیا
زاہد بھی تیرا ہے شب وصل میں حریف ۔ مشہور گو جہاں میں صبح و خروس ہے
کوچ کی اپنے اب تیاری ہے ۔ تیرا حافظ جناب باری ہے
بیدرد کوئی اتنا سمجھتا نہیں ہے ۔ دل دکھے تو کس طرح سے فریاد نہ ہووے
افسوس یہ حال ایک عالم دیکھے ۔ ایسا نہ ہو کہ جانِ عالم دیکھے

لله الحمد ٹھکانے لگی محنت میری
طے ہوئی آ چکی منزل میں مسافت میری

یہ کہکر وہ اِس طرح غش کر گیا
کہے تو کہ جیتے ہی جی مر گیا

وا درِ دیدہ مدار رہتا ہے تیری یاد میں
آنکھ جب سے لگ گئی روتے ہیں سو جانیکو ہم

میں جو چونکا تو وہ بھی چونک پڑا
ہوئی غفلت جو ہوشیار ہوا

ایک وضع پر نہیں ہے زمانے کا طور گاہ
معلوم ہو گیا مجھے لیل و نہار سے

نہ پوچھو کچھ مری حالت کہ اِس دل کے لگانے سے
پریشاں سینہ سوزاں منفعل سر در گریباں ہوں

شبِ وصال جو قسمت میں ہے تو ہووے گی
دعا کرو شبِ فرقت تو یہ سحر ہووے

اُس لعبتِ فرنگ کو دکھلا کے فاتحِ دل
کہتا ہوں چکھو یہ دل بریاں کا توس ہے

مر کے حاصل کیا فرقت ہی میں لو نام وصال
جان دی ہمنے مٹایا ہے خلش ہجران کا

تفریح کلفتوں کی ترغیب ہے لاحاصل
بہلانیکی باتیں ہیں یہ دل بھی بہلتے ہیں

عشق میں طرفین سے اُلفت برابر چاہیئے
جو بدل بندہ ہوا اس کو بندہ پرور چاہیئے

ق
کیا شاخِ گل پہ پھول کے بیٹھی ہے عندلیب
ڈرتا ہوں میں نہ چشمِ فلک کو بُرا لگے

جب لایا بار یاس ہی لایا یہ اے سرور
گاہے نہ نخلِ غم میں ثمر اِس سوا لگے

بلبل کو خزاں میں جان کھوتے پایا
صیاد کو سر پٹک کے روتے پایا

گلچیں کی بھی نیند اُڑ گئی لیک سرور
جو اہلِ دول تھے اُن کو سوتے پایا

اچھے کو بُرا بُرے کو اچھا سمجھے
کتنی یہ بُری سمجھ ہے اچھا سمجھے

یاں کے جانے سے جی اُلجھتا ہے
کیا ہی دلکش سرائے فانی ہے

کبھی نہ چین سے رہنے دیا تمنا نے
خرابِ خستہ میں اِس دل کی آرزو سے رہا

کمال شے زوال شے ہے اُس پر لاکہ حاسد ہوں
بھلا نازاں نہوں کیونکر میں اپنی بے کمالی کا

خدا جانے ہے دیکھا دیکھکر یہ چاند مُنہ کس کا
ہوئی ہے عید غیروں کو ہمیں ہے چاند خالی کا

اک وضع پر نہیں ہے زمانے کا طور آہ
معلوم ہو گیا ہمیں لیل و نہار سے



جناب عبدالاحد خان صاحب خلیل ایم اے [illegible]
پروفیسر تعلیمات [illegible] لکھنؤ
سابق ایڈیٹر علی گڑھ میگزین (۱۹۳۱ — ۱۹۳۲)



جناب [illegible] قاضی صاحب ایم اے [illegible] (علیگ)
[illegible]
سابق ایڈیٹر علی گڑھ میگزین (۱۹۲۹ — ۱۹۳۰)

تم سلامت رہو زمانے میں ۔ ایسی باتیں زبان سے نہ کہو
اک انقلاب چرخ سے افسوس دیکھنا ۔ وہ صحبتیں رہیں نہ تو وہ ہم نشیں رہے
نامۂ شوقیہ جب میں نے رقم اسکو کیا ۔ سو جگہ مضمون تب اُسمیں مکرر ہو گیا
شکل اپنی ہم کو دکھلاؤ خدا کے واسطے ۔ جان جاتی ہے اجی آؤ خدا کے واسطے
تم نے ہماری پر خبر لی ۔ چھاتی پتھر کی کیوں جی کرلی
جس میں باہیں تری حمائل تھیں ۔ طوق حسرت میں اب وہ گردن ہے
غنچہ نہیں گل نہیں باغ میں بلبل نہیں ۔ فصل خزاں کی بہار دیکھئے کب تک رہے
سراسر دل دکھاتا ہے کوئی ذکر اور ہی چھیڑو ۔ پتا خانہ بدوشوں سے نہ پوچھو آشیانیکا
نیک وبد زمانہ نہیں اختیار میں ۔ ہوتا وہی ضرور ہے جو سرنوشت ہو

وفات افسوس ہے کہ لکھنؤ کی اِس قابل فخر ہستی نے ۸۲ برس کی عمر میں ۱۲۸۴ھ/۱۸۶۷ء میں بمقام بنارس داعیٔ اجل کو لبیک کہا، لیکن صاحب سیر المصنفین نے لکھنؤ میں اُن کا وفات پانا تحریر کیا ہے جو درست نہیں معلوم ہوتا۔

کشمکش حیات

(جناب عبدالاحد خاں صاحب خلیلؔ ایم۔اے علیگ پروفیسر تعلقدار کالج لکھنؤ)

آج کل کی معاشی اور سماجی دشواریوں کی بدولت انسان جب اپنی زندگی سے تنگ آجاتا ہے تو یا تو خودکشی پر آمادہ ہو جاتا ہے یا کسی معقول کھاتے پیتے گھرانے میں بے سوچے سمجھے شکل و صورت قوم و مذہب۔ سن و سال اور اخلاق و اطوار کی پابندیوں سے ذرا بلند ہو کر شادی کر لیتا ہے۔ میں نے ان دونوں میں خودداری کی شکست اور کسرشان سمجھتے ہوئے ڈرائنگ سیکھنا شروع کر دیا۔ اور خدا کے فضل و کرم سے ۲۵۔سال کی عمر میں اچھا خاصا چھوٹا موٹا ڈرائنگ ماسٹر بن گیا۔

کچھ روز دنیا دیکھنے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ جہاں دیدہ ہونے کی تمام خصوصیات ولوازمات کو اپنے اندر جمع کرنے اور جہان گردی کا لطف اٹھانے کے بعد ہندوستان کے مشرقی صوبوں سے مغربی آبادی کا رخ کیا اور رفتہ رفتہ کلکتہ سے لکھنؤ پہنچ گیا۔

حسن اتفاق سے ساری خدائی ایک طرف، دالارشتہ ایک بڑے زبردست مالک تخت و تاج، جہاں خراب کو ایک نگاہ سے دیکھنے والے یا ایک نظر سے زیادہ نہ دیکھنے والے، ہندوستان کو دارالحرب قرار دیتے ہوئے بہت سی عقلاً اور شرعاً ناجائز باتوں کو جائز رکھنے والے سیاہ و سفید کے مالک ایک صاحب دفتر سے ہو گیا۔ لہٰذا تھوڑے ہی عرصہ میں ایک معزز بنگالی ہائی اسکول میں جگہ مل گئی۔ اور چین سے گزرنے لگی لیکن کچھ دنوں کے بعد احساس ہونے لگا کہ یہاں تو کام کچھ رکتا ہوا نظر آتا ہے اور اس کے رواں ہونے کی بس یہی ایک صورت ہے کہ میں روانہ ہو جاؤں بات یہ تھی کہ ہر درجہ میں ۳۰۔۳۰۔۳۵۔۳۵ لڑکوں سے سابقہ اور پھر اس میں ایک سے بڑھکر ایک بگڑا ہوا نواب اور بنگال کا جادوگر۔ بھلا مجھ میں اتنی سکت کہاں کہ اتنی بڑی جماعت کا مقابلہ کر سکوں [illegible] زندگی محال ہو گئی۔ اس وجہ سے نہیں کہ میں خدانخواستہ کچھ ناقابل واقع ہوا ہوں

بلکہ تعداد میں طلبہ کی زیادتی۔ میری قدرتی رحم دلی اور بھلا آپ سے کیا چوری۔ کچھ رعب داب کی کمی اور نظم ونسق قائم نہ رکھ سکنے میں قدرتی کمزوری کلاس روم کو بزم گاہ عیش ونشاط بنا دیتے تھے اور ہمارے ہونہار طالب علم بغیر نوٹس دئے اکثر ایسے سوالات کرنے لگتے تھے کہ جن کا جواب بگڑ کر بجز اس کے اور کچھ بن نہ آتا تھا کہ "تم ہمارا مذاق اڑاتے ہو"

غرضکہ بہت جلد اس اسکول میں شاگرد مجھ سے اور میں اپنے شاگردوں سے اکتا گیا۔ لیکن مجبوریاں ایسی سدراہ ہوتی ہیں کہ کچھ کر نہ سکا۔ نہ جائے رفتن کا پتہ چلتا تھا اور نہ پائے ماندن۔ نہ تو موت ہی آتی تھی نہ کسی اور جگہ رزق کی سبیل نکلتی تھی۔ میرے ساتھ ان بیچارے طالب علموں کی زندگی بھی تباہ تھی کہ جن سے میرا سابقہ تھا۔ خدا بھلا کرے ہیڈ ماسٹر صاحب کی ہم وطنی کا کہ جس کی بدولت جلد سے لگا ہوا تھا اور اس قسم کے مدرسوں میں مدرسین کے تقرر وبرطرفی کی شعبدہ بازیوں اور طلسم سازیوں سے ذرا محفوظ تھا۔ ورنہ آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ بصورت موجودہ ابتک میں کہاں کا مارا کہاں پہنچ چکا تھا۔

خدا کا شکر ہے کہ دو سال کے اندر ہی کارپردازان قضا وقدر کو ہمارا عقدہ مشکل کشائش کے لئے پسند آگیا یعنی ایک نہایت مقتدر کالج کے ڈرائنگ ماسٹر صاحب بہت کچھ جمع کر کے رخصت پر چلے گئے اور کسی نہ کسی طرح بالآخر ہماری بن آئی۔ طلبہ کی تعداد جماعت میں ۳۵ سے صرف ۳ رہ گئی اور مخلصانہ یکسوئی سے کام کرنے کا بے نظیر موقعہ ہاتھ آیا۔ اس غیر متوقع اور زریں فرصت کو غنیمت سمجھتے ہوئے میں نے ارادہ کر لیا کہ افراد قوم وملک کے اس نادر اور منتخب مجموعہ یعنی اس کالج کے طلبہ کی جتنی خدمت ہو سکے گی کرونگا۔ اور گزرے ہوئے بزرگوں کے نقش قدم پر چل کر ہر ممکن کوشش کرونگا۔ کہ کسی کو حرف زنی یا انگشت نمائی کا موقع نہ ملنے پائے اور اپنے پاس بھی رقم کثیر جمع ہو جائے۔

اس کالج میں جہاں مالی قسم کی خوبیاں اور دفتری قسم کی آسانیاں جو ساری خدائی والے رشتہ کی بدولت مجھکو مہیا تھیں کچھ غیر معمولی بے ترتیبیاں بھی تھیں مثلاً وقت کی سخت پابندی۔ ہر طالب علم اور اس کے کام کو روزانہ بغور دیکھنا۔ جماعت میں شور وغل نہ ہونے دینا۔ وغیرہ وغیرہ

ایسی چیزیں تھیں کہ اگر دفتری خوش اسلوبیاں شامل حال نہ رہتیں تو میں کب کا کلکتہ پہنچ گیا ہوتا۔
نمونتاً ایک آدھ واقعہ آپ بھی سن لیجئے۔

ایک روز صبح ہی صبح کالج جاتا تھا (جمعہ کے دن طلبہ کی زیادہ تر اقامتی زندگی ہونے کی وجہ سے ایام سرما میں بھی اکثر ۸ بجے صبح کالج شروع ہو جایا کرتا ہے) سوء اتفاق کہ آنکھ دیر میں کھلی اور کالج پہنچنے میں صرف آدھ گھنٹہ رہ گیا۔ چہرہ کی صفائی دانتوں کی منجھائی کے علاوہ اور بھی بہت سے صحت جسمانی کے ضامن بے حد ضروری کام رہ گئے۔ جلدی جلدی افتاں و خیزاں سائیکل سنبھال کالج پہنچا۔ اور لڑکوں کے انتظار میں کلاس روم میں جا کر بیٹھ گیا۔ گھنٹہ ہوئے تقریباً پانچ منٹ گزر گئے۔ لیکن درجہ میں ایک لڑکے کا پتہ نہیں تحقیقات سے معلوم ہوا کہ آج کل تو صرف طلبہ کا ششماہی امتحان ہو رہا ہے اور بظاہر میرے موجود رہنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ کوئی لڑکا پڑھنے نہیں آئیگا۔ اپنی موجودگی اور بروقت حاضری کا تحریری ثبوت دینے کے لئے دستخطوں والے رجسٹر پر ایک بے باکانہ نقش موجودگی بنا گھر واپس آ گیا۔ ہیٹ کھونٹی پر لٹکایا۔ کوٹ پتلون کو مبدل بہ دھوتی کیا اور ٹائی کھول کر پلنگ پر رکھی اور لوٹا لیکر خلوت گزیں ہو گیا۔ تنازع للبقا کا سلسلہ ابھی جاری تھا کہ کسی نے باہر سے آواز دی۔ کانوں کو کچھ آشنا لیکن نہایت بے ہنگام معلوم ہوئی۔ شبہ ہوا کہ کالج کا چپراسی یا دفتری میرے پیچھے پیچھے (معلوم نہیں کیوں) سائیکل پر بھاگا ہوا آیا ہے۔ غرضکہ ایک عجیب ہیجانی اور سیمابی کیفیت دل و دماغ اور جسم و جان پر طاری ہو گئی اور بڑی بڑی امیدوں پر پانی پڑ گیا۔ گھبرا کر باہر نکلا تو دیکھا کہ شبہات و خیالات اصل میں واقعات ہیں۔ اور کالج کا ایک ہرکارہ امیر جامعہ یعنی ہمارے پرنسپل صاحب کا زبانی سلام دے رہا ہے۔ رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے اور پھر تخلیہ کی ضرورت محسوس کرنے لگا۔ لیکن چونکہ سلام اشد ضروری قسم کا تھا اور وقت میں گنجائش بالکل نہیں تھی۔ مجبوراً جلدی جلدی موزہ۔ جوتہ۔ پتلون۔ کوٹ۔ ٹوپی وغیرہ بالترتیب یا بلا ترتیب جیسے بن پڑی پہن پہنا باہر نکلا اور سائیکل اٹھائی۔ سوار ہونا ہی چاہتا تھا کہ ہرکارہ نے ٹائی کی غیر موجودگی کی طرف متوجہ کیا۔ غصہ تو بیحد آیا لیکن بے کسی کی بدولت مفلس کی جوانی کا مرادف ہو کر رہ گیا۔ بالآخر اس وقتی

ذلت کو در جیب کرتے ہوئے گھبرا کر گھر میں گیا۔ ٹائی لگائی اور پتلون کے پائنچے درست کرتا ہوا سائیکل پر سوار ہو گیا۔

تمام راستہ اس ادھیڑ بن میں کٹا کہ یا الٰہی اس بے وقتی سلام میں آخر مصلحت کیا ہے۔ دماغ پر بہت زور ڈالا لیکن بالکل بے سود۔ ہر کارہ سے مدد چاہی لیکن بالکل بیکار۔ جہاں تک تھوڑا بہت سمجھ میں آیا تو آج صبح کالج پہنچکر فوراً واپسی ہی سے کچھ متعلق نظر آیا۔ لیکن دل میں عدم تعاون۔ بری نیت یا بے تکی کے عناصر کی غیر موجودگی اور دفتری امداد کی بدولت خلاف ورزی احکام کے الزام کی دوری نے ڈھارس بندھائی۔ کچھ کچھ یہ بھی خیال ہوا کہ ممکن ہے کسی لڑکے کے لئے اردو سے بنگالی میں کسی امتحان کے پرچہ کا ترجمہ کرنا ہو اور اس لئے صاحب نے یاد کیا ہو۔

بہرحال اس کشمکش اور ناگفتہ بہ حالت میں کالج پہنچا۔ سب کو سوائے اپنے نہایت مطمئن اور مسکراتا ہوا پایا۔ صاحب کا سامنا ہوا اور کچھ نہ پوچھئے کہ کیا گزری۔ بس دل من داند و من دانم و داند دل من۔ سرخ و سفید چہرہ تمتمایا ہوا تھا۔ دانت پیسے جا رہے تھے۔ فضا میں کچھ آوازیں گونج رہی تھیں اور آنکھوں سے شعلے نکل نکل کر مجھ بے کس و بے بس تک پہنچ رہے تھے۔ صاحب کے کمرے کے دروازے بند تھے لیکن پھر بھی باہر تماشائیوں کا ہجوم تھا۔ اور میں مجسمہ شرم عبرت بنا ہوا خجلت کی بدولت زمین میں دھنسا چلا جا رہا تھا۔ عرق ندامت فرش تک پہنچ چکا تھا اور صرف بے زبانی جوابدہی کر رہی تھی . . . . . بات صرف اتنی تھی کہ غلط فہمی سے اور کچھ ضرورتاً جلدی میں لڑکوں کی ایک جماعت کو چھوڑ کر گھر چلا گیا تھا کہ جس کا مجھکو اس وقت زبانی امتحان لینا تھا۔

حضرت کرزن کی کرزنی کا جہاں تک تعلق ہے میں ماننے کو تیار ہوں کہ اس کا کچھ شائبہ میری فارغ البالی میں ضرور شامل ہے۔ لیکن بعض احباب میرے متعلق یہ کہا کرتے ہیں کہ مجھ پر کچھ ڈارون کے خیالات اور نظریہ کا بھی اثر ہے۔ اور اکبر الہ آبادی کی نکتہ رسی اور حقیقت شناسی میں شبہ کرنے لگتے ہیں۔ اگرچہ میں ابھی تک بصحت ہوش و حواس اور برضا و رغبت ماننے کو تیار نہیں ہوں لیکن ممکن

ہے کہ بہت جلد ان کے خیال کی تصدیق کرنا پڑے کہ ڈارون صاحب حقیقت سے کچھ زیادہ دور نہیں تھے جس کا بین ثبوت میرے احباب کی نگاہیں اکثر مجھ میں پاتی ہیں۔

اس ہی قسم کی باتوں کی بدولت نیز کچھ اپنی کمزوریوں کو محسوس کرتے ہوئے بے تکلف دوستوں کے مجمع اور خصوصاً اسٹاف روم میں بہت ہی کم جاتا ہوں۔ لیکن اتفاقاً جب کبھی اس محفل میں آنکلتا ہوں تو وہ اسمائے صفات موزوں ہوتے ہیں اور وہ وہ فقرے چست کئے جاتے ہیں کہ بعض اوقات مجھکو طنز و تعریف میں تمیز نہیں رہتی۔ اکثر میں محسوس کرتا ہوں کہ خواہ کتنا ہی صحت دماغی۔ ہوشمندی اور فرزانگی سے کسی کام کو انجام دوں۔ اپنی کبک رفتاری اور سلامت روی کو شکر آگین نگاہوں۔ اور ایک طرف کو جھکی ہوئی گردن نیز متانت آمیز چہرہ سے زینت دیتا رہوں خودداری اور کسرنفس کے توازن کے ساتھ ساتھ سنجیدگی سے بھی کام لیتا رہوں۔ لیکن زیادہ تر میرے احباب مجھکو 'تفریح مجسم' اور 'ظرافت متحرک' ہی سمجھتے ہیں۔

جہاں انسان کے فرائض منصبی کی ادائیگی اہمیت رکھتی ہے وہاں اتفاق سے تمدنی اور معاشرتی فرائض کی ادائیگی کا احساس بھی اگر کسی بھلے آدمی کو رہے تو بعض اوقات بلائے جان ہوجاتا ہے۔ اوروں کا جو کچھ بھی عقیدہ ہو لیکن کم از کم اپنا تو یہی تجربہ ہے۔ اچھا سنئے۔

کل شام کو ایک خط میرے نام آیا۔ ہم وطنی اور ہم مذاقی کے علاوہ چونکہ اور بھی بہت سے تعلقات ان سے تھے اور جو رہے سہے تھے وہ ہونے والے تھے یا سمجھ لیجئے کہ تھے۔ لہذا عنوان کی دلفریبی پر جان نذر گزرانتے ہوئے اس کو کھولا گھنٹوں پڑھا اور رات کو سوتے وقت سرہانے رکھکر لیٹا۔ سونے سے پہلے کئی مرتبہ پڑھا اور کیف مسرت و عالم بے خودی میں کھو جانے کے بعد بھی جب ذرا ہوش آیا تکیہ کے نیچے سے 'نیند اپنی ہے دماغ اپنا ہے راتیں اپنی ہیں' کہ ان کی زلفیں نہیں تو اس سے ملتا جلتا کم از کم ان کا خط تو سرلیٹر موجود ہے کہتے ہوئے نکالکر ٹارچ کی روشنی میں پڑھا اور لطف نصف الملاقی اٹھاتے ہوئے نیز سود و زیان کی فکر بالائے طاق رکھتے ہوئے خیالی معاملات کے انتظار میں

ٹارچ گل کردی اور معلوم نہیں کیا کیا دیکھتا رہا۔غرضکہ رات بھر اسی لطف میں گزری۔علی الصباح حسب معمول کالج جانے میں ذرا جلدی کرنا پڑی۔نہا دھو کر کپڑے پہنے اور کالج کا رخ کیا۔چلتے وقت ان کا خط بھی جیب میں رکھ لیا کہ اگر موقع ملا تو پڑھا جائیگا اور فرصت کے لمحوں میں جواب لکھنے کی بھی کوشش کی جائیگی۔

پہلے پیریڈ کے بعد چونکہ دوسرا پیریڈ خالی تھا۔لہذا کوٹ اتار کر جوتہ اور موزے ایک طرف رکھکر اطمینان سے پالتی مار کر کرسی پر بیٹھا اور کئی بار خط کو پڑھا حتیٰ کہ طبیعت میں روانی اور فطرت میں جو لانی پیدا ہوگئی فضا میں محبت نے ایک خاص سماں باندھ دیا فکر سخن کے ساتھ ساتھ ایک عالم محویت طاری ہونے لگا۔اور میں کچھ جواب دہی یا 'عرائض نویسی' کی طرف مائل نظر آنے لگا۔یہ کیفیت یہاں تک پہنچی کہ میں واقعتاً خط لکھنے کی تیاری میں مصروف ہوگیا۔اور جگر لخت لخت کو جمع کرکے صفحۂ قرطاس پر چھپنے پر آمادہ ہوگیا۔پہلی ہی سطر میں الجھن محسوس ہوئی۔سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا لکھوں اور کیسے شروع کروں۔ایک مشہود کی حیثیت سے جواب لکھوں کہ ایک شاہد کی حیثیت سے موصول شدہ خط سے تو وہ، شاہد و مشہود دونوں ہی معلوم ہوتے ہیں۔اظہار نیاز بھی کیا ہے اور پھر ناز بھی اصل مشہود کی گہرائیوں کا پتہ چلانا قطعی ناممکن تھا۔بہرحال کچھ ناپ تول کر کے خط شروع کیا اور قلم برداشتہ جواب لکھنے لگا۔ابھی اچھی طرح حسرتیں نکلنے نہ پائی تھیں کہ گھنٹہ ہوگیا۔مجبوراً چند منٹ کے لئے کام روکنا پڑا۔ کلاس میں آنے والے لڑکوں کو جلدی سے ڈانٹ پھٹکار کر خاموش بٹھایا جو چپ رہتے نظر نہ آئے ان کو زبردستی پانی پینے بھیج دیا۔اور تختہ سیاہ پر ایک مرغِ بسمل کا سرسری خاکہ بنا کر اپنی اپنی کاپیوں پر اتارنے کی ہدایت کرکے میں نے پھر اپنے مشغلہ کی طرف رجوع کیا۔

برسات کے زمانے میں ندی نالوں کے بہاؤ میں اگر کچھ رکاوٹیں آجاتی ہیں تو وہ قدرتی طور پر چڑھ جاتے ہیں لیکن غالب مرحوم کی طرح میرا بھی تجربہ اس وقت اس اصول فطرت کے بالکل برعکس ہوا۔یعنی یہ کہ رکنے میں طبیعت اور رواں ہوگئی۔اور طلبہ کے ادھر ہلگ جانے کے بعد جولانی طبع کے مظاہرے روانی قلم میں ہونے لگے۔القصہ نامہ شوق مکمل ہوگیا۔کئی مرتبہ شروع سے آخر تک پڑھا اور

لطف اٹھایا۔ ایک آدھ جگہ کچھ رہ گیا تھا۔ درست کیا۔ ایک جگہ جلدی میں نورچشمی راحت جان لکھ گیا تھا۔ کچھ خیال آیا کہ یہ ٹھیک نہیں ہے۔ قلم زد کرکے حورجان۔ روح رواں۔ جان جہاں بنایا۔ اور لفافہ میں جو احتیاطاً گھر سے چلتے وقت جیب میں رکھ لایا تھا بند کرکے ایک خاص احساس مسرت اور کیف بیخودی کے ساتھ پتہ لکھا اور میز پر ایک طرف کو رکھکر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

فکر رسا اور طبع فلک پیما کی مدد سے اس خط میں میں نے وہ وہ ادبی رنگ آمیزیاں کی تھیں کہ جی چاہتا تھا اپنے تمام احباب کو جن کو میری قابلیت اور ادیب ہونے میں کلام ہے ایک مرتبہ سنا کر خط غلامی لکھوالوں۔ لیکن اس سے زیادہ بے چینی اس بات کی تھی کہ فوراً مکتوب الیہ کے ہاتھوں میں پہنچا کر برافروختہ اور مسکراتے ہوئے چہرے سے دادطلبی کروں۔ ہوائی ڈاک کا دن اور تاریخ گزرچکی تھی۔ مجبوراً یہی سوچا کہ ابھی ڈاکخانہ جاکر ڈال آؤں۔ ۱۱ بجے دن کے کلکتہ جانے والی ڈاک سے نکل جائیگا اور کل کسی وقت دست بوسی کا شرف حاصل کرلیگا۔ کچھ التہاب شوق اور کچھ اشتیاق دادطلبی غرضکہ فوراً سائیکل لے ڈاکخانہ روانہ ہوگیا۔ حالانکہ بہت تیز گیا اور واپسی پر بھی کہیں نہیں رکا۔ پھر بھی پندرہ منٹ اس مرحلہ کو طے کرنے میں لگ ہی گئے۔ کالج پہنچنے پر کلاس روم خالی ملا۔ گھنٹہ ختم ہوچکا تھا۔ طلبہ دوسرے درجہ میں تاریخ پڑھنے چلے گئے تھے۔ ہاں یہ بھی معلوم ہوا کہ میری غیرموجودگی اور طلبہ کی موجودگی میں اتفاق سے صاحب پرنسپل جراحت دل کو آپہنچے تھے اور سلام دے گئے ہیں۔

شاد باید زیستن ناشاد باید زیستن۔ مجبوراً تھوڑا پانی پی کر پرنسپل صاحب کے اسی پرانے کمرے میں پہنچا جو کچھ گزرنا چاہیئے تھی یا گزری وہ آپ خود ہی سمجھ گئے ہونگے۔ مجھ سے اب اس کے اعادہ کی توقع یا اصرار نہ کیجئے کیونکہ آپ کی چھیڑ چھاڑ اس عالم بیزاری میں کچھ اچھی معلوم نہ ہوگی۔ مجھے اعتراف ہے کہ جماعت میں لڑکوں کو پڑھاتے پڑھاتے چھوڑ جانا اور خط ڈالنے کے لئے ڈاکخانہ چلا جانا اگرچہ بصورت موجودہ اور بحالت مذکورہ کتنا ہی قرین قیاس اور اصول فطرت کے موافق سہی لیکن تاثرات و محسوسات کی روحانی دنیا سے کوسوں دور بسنے والے محکمہ تعلیم کے ارباب حل وعقد کی نظر میں ایک صریح بے اصولی اور زبردست بے اعتدالی ہے لیکن اس قسم کے اصول بنانے اور عمل سے ثابت کرنے میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ دنیا چونکہ اس قدر مادہ پرست

واقع ہوگئی ہے اور ہوتی جاتی ہے کہ مجھکو اظہار حقیقت کی ضرورت ہی پیش نہ آئی اور سطحی بے عنوانی اور ذراسی بے اعتدالی کی بدولت اس غریب فرزند آدم پر قولاً و فعلاً وہ سب کچھ جو نہ گزرنا چاہیئے تھی گزر گئی اتنا آپ کو بھی بتا سکتا ہوں کہ اس دن کی مزاج پرسی اور نمک پاشی کا مزہ اب بھی پرنسپل صاحب کی صورت دیکھکر یاد آجاتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ اگر زبان اردو بغیر رومن رسم الخط اختیار کئے ترقی نہیں کر سکتی تو یہ بھی یقینی بات ہے کہ فن ڈرائنگ بغیر معلم و متعلم میں رشتہ یگانگت اور بے تکلفی پیدا کئے قائم نہیں رہ سکتا پہلی وجہ تو یہ ہے کہ اگر وہ استاد سے بے تکلف نہ ہونگے اور استاد بھی حسب خواہش طلبہ کو منہ مانگے نمبر نہ دیں گے تو طلبہ فوراً ڈرائنگ چھوڑ کر کوئی دوسرا اختیاری مضمون مثلاً فارسی۔عربی۔سنسکرت۔دستکاری وغیرہ لے لیں گے اور ڈرائنگ ماسٹر کی جماعتیں خالی نظر آیا کرینگی۔ دوسری بات یہ ہے کہ بغیر بے تکلفی کے یہ فن ترقی کر ہی نہیں سکتا۔ آپ خود ہی ذرا غور کیجئے۔ اگر ہمارے شاگرد ہمارا ہی مذاق اڑا اڑا کر طبیعت میں جولانی فطرت میں روانی ذکاوت میں دل پسندی اور ذہانت میں ہوشمندی پیدا نہیں کریں گے تو وہ کس طرح مستقبل قریب میں وائسرائے۔گورنر منسٹر نیز دیگر سیاسی و قیاسی ارکان ملک و ملت کے کارٹون بنا بنا کر اپنے نام میں شہرت عام کے چار چاند لگا سکیں گے اور شاگرد کہلانے کی حیثیت سے ہم کو بقائے دوام کا تاج پہنا سکیں گے۔

اور صرف ڈرائنگ ہی پر کیا منحصر ہے۔ ہر صورت میں استاد شاگرد میں بے تکلفی ہونا ضروری ہے سنجیدگی کے ساتھ ہی ساتھ اگر شوخ طبعی کی کچھ شمولیت رہیگی تو سبق بھی اچھی طرح سمجھ میں آئیگا اور طبیعت بھی مکدر نہ ہونے پائیگی۔ دور کیوں جائیے ہمیں علی گڑھ کی فضا میں بعض اوقات پرانے پرانے استادوں کے یہاں وہ وہ سامان انبساط مہیا ہو جاتا ہے۔ کہ لکچر سے کہیں زیادہ قابل قدر واحترام ہوتا ہے اور دور دراز کی مسافت طے کرکے مادر درسگاہ کی عزت افزائی کرنے والوں کی محنت وصول ہو جاتی ہے اس قسم کی ذہنی گستاخیوں پر اکثر جرمانے بھی ہوتے ہیں لیکن خدا بھلا کرے ناقدران حق شناس کا کہ مجرمین و ملزمین کی فہرست میں معہ رقم جرمانہ نام کی اشاعت کے بعد بھی بعض اوقات جرمانہ تشہیر سے آگے نہیں بڑھتے اور والدین کو ہماری وقتی تفریح کا مالی خمیازہ بھگتنا نہیں پڑتا ہے

بغاوتِ یونان اور سیاسیاتِ یورپ

(جناب سید انیس الدین احمد صاحب رضوی امروہوی ایم۔اے۔آنرز (علیگ)

(حسب ذیل مضمون زیادہ تر ایسن فیبس کی مشہور کتاب "ماڈرن یورپ" سے ماخوذ ہے۔ اس کے علاوہ جن کتابوں سے مدد لی گئی ہے، ان میں سے خاص خاص مآخذ کی تشریح حاشیہ پر کر دی گئی ہے۔)

سلطنتِ علیہ عثمانیہ کے اکثر حصوں میں نظام حکومت کے وہی قدیم طریقے رائج تھے، جو ان علاقوں کی فتح سے قبل مقامی حکومتوں نے قائم کر رکھے تھے۔ پرانے نظام کو بحال برقرار رکھنے سے ترکوں کو خاص فائدہ یہ حاصل ہوتا تھا کہ رعایا سے ٹیکس بہ آسانی وصول ہو جاتے تھے، اور یہی ان کا مقصدِ اصلی تھا۔ بالخصوص جزیرہ نمائے موریہ کے باشندے اپنے اپنے شہروں اور ضلعوں کے حکام کا خود ہی انتخاب کرتے تھے۔ ضلع کے حکام، جو عموماً معزز اور دولتمند اشخاص ہوتے تھے، ہر سال طرابلیجہ (Tripolitza) کے مقام پر صوبہ کے پاشا (گورنر) سے ملاقات کر کے لگان اور خراج کے متعلق مشورے کیا کرتے تھے۔ اس کے باوجود بعض یونانی قبیلے ایسے بھی تھے، جو ہمیشہ بغاوت پر کمربستہ رہتے تھے اور صرف تلوار کے زور سے خراج ادا کرتے تھے۔ یہ لوگ پہاڑوں اور جزیروں میں چھپے رہتے، اور جب کبھی موقع پاتے اپنی کمین گاہوں سے نکل کر لوٹ مار کا بازار گرم کر دیتے۔ مینوٹ اور کلفٹ کے قبیلے، جو خراج ادا نہ کرنے کو اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتے تھے اور تلوار کے سوا کسی کو اپنا حاکم نہ مانتے تھے، ہمیشہ تجارتی شاہراہوں پر ڈاکے ڈالتے، اور اس طرح عثمانی رعایا کو پریشان کرتے رہتے تھے۔ اس بے لگامی کے انسداد کے لئے ترکی احکام اس کے علاوہ اور کچھ نہ کر سکے کہ ان میں سے بعض یونانی ڈاکوؤں کو سرکاری ملازمت میں لے لیا گیا اور انھیں خزانۂ سلطانی سے تنخواہیں ملنے لگیں۔

جزائر کی حالت اس سے بھی بدتر تھی۔ یونان کی شورش شروع ہونے سے بہت عرصہ پیشتر اکثر

جزائر تقریباً کامل خود مختاری حاصل کر چکے تھے اور خراج کی ایک قلیل رقم دینے اور عثمانی بیڑے کے لئے چند ملاح مہیا کرنے کے علاوہ قسطنطنیہ سے انھیں کوئی سروکار نہ تھا۔ صلحنامۂ کوچک قینارچہ (۱۷۷۴ء) کے بعد سے ان جزائر کے باشندے جو قدرتی طور پر اعلیٰ درجہ کے ملاح ہوتے تھے، اپنے جہازوں پر سلطنت روس کا جھنڈا اڑا کر نکلنے لگے، اور اس کے بعد سے فنِ جہاز رانی میں اچھی ترقی کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ غارتگران بربر کے مستقل خطرہ نے انھیں اس بات پر مجبور کر دیا کہ اپنے تمام جہازوں کو مسلح کرلیں۔ اس طرح خود عثمانی حکام کی آنکھوں کے سامنے اس یونانی بحری طاقت کی بنیاد پڑی، جس نے آزادی کی شورش میں نمایاں اور قابلِ قدر حصہ لیا۔

اِس صورت سے یونانیوں نے ترکوں کی غفلت شعاری اور بے توجہی سے فائدہ اٹھا کر اپنے قومی نظام اور قومی جذبات کو برقرار رکھا۔ انیسویں صدی کے اوائل میں ان جذبات کو زیادہ سے زیادہ ترقی دینے کی ذمہ دار وہ علمی تحریک تھی، جس نے صدیوں کے یونانی علوم اور ادبیات کو ازسرِ نو زندہ کر دیا، اور یونانیوں کو ان کی گذشتہ پُرعظمت روایات کا محو شدہ سبق یاد دلا دیا۔ اس سلسلہ میں اڈامان ٹیس کورَیس کا نام نہ لینا یقیناً ناانصافی کے مترادف ہوگا، جس نے اپنی تمام زندگی قدیم یونانی ادبیات کو آسان اور عام فہم زبان میں منتقل کرنے کے لئے وقف کر دی۔ کورَیس کی مطبوعات کا امید سے کہیں زیادہ اثر ہوا، یہاں تک کہ وہ دیہاتی بھی، جو جاہلِ مطلق ہونے کے علاوہ صاف اور شستہ زبان کی شیرینیوں سے ناواقف تھے، اب سقراط اور افلاطون کی زبان بولنے کی کوشش کرنے لگے تغیر نے تخیلات کی رو کو بھی بدل دیا۔ اور اس وقت کے بعد سے یونانی عوام الناس، جو فخریہ طور سے خود کو رومانی کے لقب سے پکارتے تھے اسی عظیم الشان بازنطینی سلطنت کے روح پرور خواب دیکھنے لگے، جو ترکوں کی فتوحات سے قبل جنوب و مشرقی یورپ میں پھیلی ہوئی تھی۔

اسی مقصدِ عظیم کے حصول کے لئے بازنطینی تحریک کے حامیوں نے ۱۸۱۴ء میں شہر اڈیسہ میں ایک خفیہ انجمن کی بنا ڈالی، جس کا نام ہیٹیریا فلیک (انجمن اتحاد و اخوت) تھا۔ اس انجمن کے اغراض و مقاصد کی اشاعت اس قدر برق رفتار سرعت سے ہوئی کہ تھوڑے ہی عرصہ میں نہ صرف یونانی زبان بولنے والے

طبقہ میں اس کو شہرت حاصل ہوگئی، بلکہ ان سلافی اقوام میں بھی بہت مقبول ہوئی، جو یونانی کلیسا کی پیرو تھیں۔ حسبِ معمول ترکوں کی غفلت نے اس انجمن کو اس قدر دلیر بنا دیا کہ اس نے علی الاعلان رضا کاروں کی بھرتی شروع کر دی اور تھوڑی ہی مدّت میں بغاوت کی تیاریاں مکمل کر لیں۔ انجمن کے اراکین کو یقین تھا کہ شورش شروع ہوتے ہی روس کی امداد ان کی پشت پر ہوگی، اور شہزادہ کیپوڈ یسٹریا جس نے زارِ روس کا وزیر ہونے کے باوجود اس امر کو کبھی فراموش نہیں کیا تھا کہ وہ یونانی النسل ہے، ان کے دعاوی کی کھلم کھلا تائید کر رہا تھا۔ لیکن جب ۱۸۲۰ء میں انجمن نے اس بغاوت کی قیادت اسے پیش کرنا چاہی، تو اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ابھی وقت نہیں آیا۔ تاہم یونان کے معاونین اس انکار سے روس کی مدد و اعانت کی طرف سے مایوس نہیں ہوئے، اور اس کے بعد ہی انھوں نے اپنا ایک دوسرا سردار تلاش کر لیا۔ شہزادہ الکزانڈر ہپسلانٹی، جو قسطنطنیہ کے ایک معزز یونانی خاندان کا رکن تھا اور روسی فوج میں میجر جنرل کے عہدہ پر ممتاز تھا، اس خدمت کے لئے آمادہ ہوگیا، اور سردار کے ملتے ہی انجمن کے اراکین بغاوت کے لئے کسی زرّیں موقع کا انتظار کرنے لگے۔

قضا و قدر نے انھیں فوراً ہی اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے موقع بھی عطا کر دیا۔ یانینہ کا والی، علی پاشا، بابِ عالی سے باغی ہوگیا۔ البانیہ کا یہ چالاک قزاق، جس نے جزیرہ نمائے بلقان میں اپنے لئے ایک سلطنت کی بنا ڈالنا چاہی تھی، اور اس وقت اپنے آقا سلطان المعظم سے خود مختاری حاصل کرنے کے لئے جھگڑ رہا تھا، یونانی قومیت کو برسرِ کار لانے کا بہت بڑی حد تک ذمہ دار تھا۔ چنانچہ آج تک یونانی کوہستان کے جھونپڑوں میں یسوع مسیحؑ اور مقدس کنواری مریمؑ کی تصاویر کے پہلو بہ پہلو علی پاشا کی تصویر بھی دیہاتی باشندوں کے جوشِ عقیدت کو ظاہر کرتی نظر آتی ہے۔ علی پاشا کا مقصد اصلی یہ تھا کہ جزیرہ نمائے موریہ کے ساتھ بحیرۂ ایڈریاٹک اور مجمع الجزائر کے تمام جزیروں کو ملا کر ایک جدید بحری سلطنت کی بنیاد ڈالے، جو بربرا اور ٹیونس کے بحری قزاقوں کی ہم پلہ ہو۔ یانینہ کی بغاوت کی خبروں نے ترکوں کو ان کی خوابِ گراں سے بیدار کر دیا، اور ترکی فوج کی ایک بڑی تعداد خورشید پاشا کے زیر کمان البانیہ کی طرف روانہ کر دی گئی جس نے تھوڑے ہی عرصہ میں اس شورش کا کلّی استیصال کر دیا، اور "شیر یانینہ"

کو اس کے نیستان میں ہی محصور کر لیا۔ تاہم ہپسلانٹی نے اس موقع کو غنیمت جانا، اور ۶ مارچ ۱۸۲۱ء کو روسی فوج کے چند یونانی افسروں کی معیت میں دریائے پروتھ کو عبور کر کے مالدیویہ میں داخل ہو گیا۔

ان واقعات نے ایسے لوگوں کو بے حد پریشان کر دیا جو انقلابی تحریکات سے سخت خوفزدہ تھے اور آج سے صرف چھ سال پیشتر انقلاب فرانس کی زکیں اٹھائے ہوئے تھے۔ ان لوگوں کو یقین تھا کہ سلطنت عثمانیہ کے بقا و قیام پر تمام یورپ کے امن اور سلامتی کا دار و مدار ہے۔ ادھر سے آسٹریا کے وزیر خارجہ میٹرنیخ نے روس کے صوفی مزاج بادشاہ پر دباؤ ڈالا اور تنبیہ کی کہ دریائے پروتھ کے پار ایک روسی سپاہی کا قدم رکھنا گویا تمہید ہوگا تمام یورپ میں انقلابی شورشوں کے اٹھ کھڑے ہونے کی۔ دوسری جانب سے انگلستان کے وزیر لارڈ کیسل ریے نے لکھا کہ سلطنت عثمانیہ کی شورش بغاوت کی منظم لہر کا ایک جزو ہے۔ ان اثرات اور دلائل نے زار روس الکزانڈر کے تذبذب کا تصفیہ کر دیا اور شہزادہ کیپوڈی آسٹریا کے اثرات کو خاک میں ملا دیا۔

زار کی اس دست کشی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہپسلانٹی کو کسی طرف سے مدد نہ مل سکی کیونکہ بغاوت کا آغاز ایک ایسے علاقہ (مالدیویہ) میں کیا گیا تھا جہاں کے باشندے ترکوں سے زیادہ یونانیوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ہپسلانٹی کے غرور اور انتہائی نا قابلیت نے اس مہم کو اور زیادہ مضحکہ انگیز بنا دیا اور اسی کے ساتھ غریب اور معصوم مسلمانوں کے قتل عام نے (جس سے مسیحی یورپ کے کان پر جوں بھی نہ رینگی) اس کی وقعت بالکل ضایع کر دی۔ مہم کی تاریخ یونانیوں کی بدبختی اور ناکامی کی عبرت انگیز داستان ہے اور سارے قضیہ میں صرف دراغشاں (۱۹ جون ۱۸۲۱ء) اور آسکولینی کی لڑائیوں کو کچھ وقعت دی جا سکتی ہے۔ جون کے آخر تک اس بظاہر سخت خطرناک بغاوت کے شرارے بالکل فرو ہو چکے تھے اور ہپسلانٹی ذلت کے ساتھ اپنی جان بچا کر آسٹریا کی حدود میں داخل ہو چکا تھا۔

تاہم میٹرنیخ کا یہ خیال کہ بغاوت مالدیویہ کے فرو ہونے سے یورپ کو مشرقی کابوس سے نجات مل جائیگی قطعی غلط ثابت ہوا۔ ادھر ہپسلانٹی اپنی جان چھپانے کے لئے جیسی اور بخارسٹ میں بھاگا بھاگا پھرتا تھا اس طرف جزیرہ نمائے موریہ میں ہٹیریا کے اراکین دوسری شورش کا انتظام کرتے پھر رہے تھے۔ ادھر

کا خیال تھا کہ مالدیویہ اور ایشیا جیسے دور دراز صوبوں کی بہ نسبت خود یونانی سرزمین میں ان جذبات کی تخم ریزی زیادہ کارآمد اور بہتر طریقہ پر ہو سکے گی، اور ان کا خیال بڑی حد تک صحیح تھا۔ شورش پھیلانے والوں نے لیاں بھی کوئی منظم طریق کار یا کوئی لائحہ عمل اپنے لئے تیار نہیں کیا بلکہ چند غیر ذمہ دار افراد ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں تک "کافروں" کے خلاف مقدس لڑائی (جہاد) کی تبلیغ کرتے پھرتے رہے اور ہلال کی "وحشت و بربریت" کے مقابلہ میں صلیب کے "معصوم" پیروؤں کو بھڑکاتے رہے۔ ان لوگوں کی اشتعال انگیز تقریروں نے تمام جنوبی یونان میں ایک آگ لگا دی، جس کے اثرات خاکنائے کاذنتھ کو عبور کرکے شمالی علاقوں میں تھسلی، اپائرس اور مقدونیہ تک جا پہنچے۔ باغیوں نے شروع ہی سے اس شورش کو انتہائی سفاکی اور خونریزی کا رنگ دیدیا تھا، اور یونانی پادری ہر طرف "کفار" کو صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کر دینے کا پرچار کر رہے تھے۔ موریہ کے بے خبر اور بے گناہ مسلمان باشندے اس ناگہانی آفت کا مقابلہ نہ کر سکے، اور چھ ہفتوں کے اندر پچیس[۲۵] ہزار کی آبادی میں سے ان لوگوں کے سوا جو اپنی جانیں بچا کر قلعہ بند شہروں کی طرف بھاگ گئے تھے، ایک مسلمان بھی باقی نہ رہا۔ ہر مقام پر جہاں جہاں شہر اور قلعے محاصرہ کے بعد فتح ہوتے گئے، ہلال کے نام لیواؤں کے ساتھ یہی سلوک روا رکھا گیا، اور طرابلیجہ کے قتل عام نے جس میں دو ہزار سے زائد مسلمان مرد عورتیں بچے بوڑھے انتہائی بے دردی اور درندگی کے ساتھ ذبح کر ڈالے گئے، تاریخ یونان کے پہلے باب پر بہیمیت اور سفاکی کی مہر ثبت کر دی۔

دولت عثمانیہ بالخصوص دو وجوہات سے اس بغاوت کی طرف فوری طور پر متوجہ نہ ہو سکی۔ سب سے پہلے علی پاشا کی بغاوت نے، جس کا پیشتر ذکر کیا جا چکا ہے، خشکی پر ترکی افواج کو اپنی جانب مشغول رکھا۔ دوسری طرف یونانی جزائر کی بغاوت نے ترکی بیڑہ کو بہترین ملاحوں اور خلاصیوں کی خدمات سے محروم کر دیا۔ اور بالآخر جب ترکی بیڑہ اس مصیبت کا مقابلہ کرنے کے لئے ناتجربہ کار ملاحوں اور بندرگاہ قسطنطنیہ کے قلیوں کو لئے ہوئے منظر جنگ پر نمودار ہوا، تو چالاک یونانی قزاقوں کے مقابلے میں تقریباً بالکل ناکارہ رہا۔ یونانیوں کی کامیابی کا سب سے بڑی وجہ یہی تھی کہ بحری لڑائیوں میں ان کا پلہ بھاری رہا، یہاں تک کہ انگلستان کے وزیر خارجہ

ڈیوک آف ولنگٹن نے اس امر کا اقرار کر لیا تھا کہ "سمندر میں یونانیوں کو فوقیت حاصل ہے، اور جن لوگوں کو یہ فوقیت حاصل ہو انھیں ضرور کامیاب ہونا چاہیے"۔ یانینہ کی تسخیر اور علی پاشا کے قتل کے بعد بھی، جب ترکی افواج البانیہ کی طرف سے فراغت حاصل کر کے موریہ کی طرف متوجہ ہوئیں، یونانی بغاوت میں کوئی کمی نہ ہو سکی، کیونکہ ترکی افواج زیادہ تر ناتجربہ کار اور غیر قواعد داں سپاہیوں سے بھری پڑی تھیں۔ یونانی جب تک سمندر کے حاکم تھے، خشکی پر ترکوں کا بہ آسانی مقابلہ کر سکتے تھے۔ چنانچہ درامہ کا والی علی پاشا، جس وقت اپنی افواج کے ساتھ بڑھا، تو عثمانی بیڑے سے کوئی مدد نہ مل سکنے کی وجہ سے اسے پسپا ہونا پڑا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۶ اگست ۱۸۲۲ء کو اس کی تمام فوج دیورناکی کی گھاٹیوں میں تباہ و برباد ہو گئی۔ دو تین سال اسی طرح گزر گئے اور بغاوت کے فتنہ ساماں شرارے ترکوں کے دبائے نہ دب سکے، یہاں تک کہ سلطان المعظم محمود خاں ثانی نے محمد علی پاشا والیٔ مصر کے نام فرمان جاری کیا کہ وہ اپنی مصری افواج کے ساتھ آ کر اس فتنہ کو فرو کرے اور دولت علیہ کے دامن کو اس بدنما داغ سے بچائے۔

اس سلسلہ میں اگر اس خاص جذبہ اور تحریک کا ذکر نہ کیا جائے، جو اس وقت یونانیوں کی حمایت میں یورپ کے اس سرے سے اس سرے تک کارفرما تھی، تو بغاوتِ یونان کی تاریخ یقیناً نامکمل رہیگی۔ عام طور پر یونان کی ادبی تحریک نے تمام دنیائے عیسائیت کو اپنی طرف مائل کر لیا تھا۔ ان کی آزادی کی جدوجہد نے اس میلان کو انتہائی ہمدردی اور حمایت کے جذبہ میں منتقل کر دیا، حتیٰ کہ ان آزادی کے شیدائی یونانیوں کے کالبد میں تمام یورپ کو سقراط، افلاطون اور ہومر کے زمانہ کی برگزیدہ ہستیوں کی روحیں جلوہ نما نظر آتی تھیں۔ یونانی لیڈروں کے نام و نسب کی پستی سے چشم پوشی کی جاتی تھی، ان کے ظلم و ستم کو ناقابلِ اعتراض سمجھ کر نظر انداز کر دیا جاتا تھا، ان کی ہیمیت اور درندگی کی داستانیں مزے لے لے کر بیان کی جاتی تھیں۔ یہ جذبہ، جو برطانی سیاسیات میں "فل ہیلن ازم" کے نام سے موسوم ہے، درحقیقت نتیجہ تھا ان کی رومان پسند فطرت کے جوش و خروش کا، ان کے مذہبی امیال و عواطف کا، اور برطانی سیاسی نقطۂ نظر سے، سب سے بڑھ کر ان لبرل جذبات کی کارفرمائیوں کا، جو اب تک دبے ہوئے تھے اور اب موقع پاتے ہی ایک دم ابھر پڑے۔ تمام یورپ میں صرف آسٹریا کا شہنشاہ فرانسس ہی وہ ایک شخص تھا، جس کے نزدیک یونان کی

بغاوت دراصل ”ان شورش پھیلانے والوں کا کام تھا، جو خدا پر اعتقاد نہیں رکھتے۔“

حقیقت یہ ہے کہ یونان اپنے قیام واستحکام کے لئے اسی جذبہ کا مرہون منت ہے، اور اس کی مدد کے بغیر یونانیوں کی تحریک آزادی کا بہت جلد خاتمہ ہوگیا ہوتا۔ یوروپ کے ہر حصہ سے یونان کے حمایتی روپیہ اور رضاکار لیکر اُٹھے اور موریہ میں پہونچ کر ترکوں کے مقابلہ پر ڈٹ گئے۔ فرانس کے نامی گرامی جنرل، جو نپولین کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھے، اور انگلستان کے کارآزمودہ فوجی افسر، اپنی تلوار، اور اس سے زیادہ اپنی تجربہ کاری کی امداد لیکر باغیوں سے آملے۔ انگلستان کا مشہور شاعر بائرن بھی، جس نے اپنے اشعار سے انگلستان کو ترکوں کے خلاف برانگیختہ کردیا تھا، اپنی جان کا نذرانہ لے کر آیا، اور اپنی تمناؤں کے مطابق ”کفار“ کے ہاتھوں فی النار ہوا حکومتوں کی دخل اندازی سے پیشتر ہی رائے عامہ اپنی تلوار بے نیام کرچکی تھی، اور یہ قول کچھ بے جا نہ تھا کہ ”سلطنتِ عثمانیہ صرف یونان سے نہیں، بلکہ تمام یوروپ سے برسر پیکار ہے۔“

یونانیوں کے بے محابا ظلم وستم کی داستانیں جب قسطنطنیہ میں پہونچیں، تو قدرتی طور پر ترکوں میں غیظ وغضب اور انتقام کے جذبات بھڑک اُٹھے۔ خود سلطان محمود مصلح، جو ہمیشہ انتہائی روشن خیال اور مدبر حکمران ثابت ہوئے تھے، ان زہرہ گداز واقعات کو سنکر اپنے اشتعال کو ضبط نہ کرسکے، اور اسی وقت باغیوں کی سرکوبی کے واسطے فوج کے ایک بڑے حصہ کو تیاری کا حکم دیدیا۔ اس کے علاوہ باغیوں کو خوفزدہ کرنے اور ان کی بہیمانہ کارروائیوں کا انتقام لینے کے واسطے قسطنطنیہ کے یونانی بطریق اعظم کو بھی سزا دی گئی۔ دولتِ علیہ کے قوانین کی رو سے یونانی بطریق اپنے ”گلے“ کے وفادارانہ برتاؤ کا کلی طور پر ذمہ دار تھا، لہذا ۲۲ اپریل ۱۸۲۱ء کی صبح کو فرمان سلطانی کے ذریعہ سے موجودہ بطریق کو معزول کردیا گیا۔ اسی کے ساتھ جس وقت جدید بطریق سلطان المعظم کے ہاتھوں اپنے عہدہ کی خلعت حاصل کررہا تھا، معزول شدہ بطریق کو اسی کے محل کے سامنے پھانسی پر لٹکایا گیا، یہاں سے یہودیوں کے ایک ہجوم نے اس کی نعش کو اُتار کر شہر کی تمام سڑکوں پر گھسیٹا اور بالآخر باسفورس میں پھینک دیا۔

بطریق کی معزولی اور قتل کو تمام یورپ میں مسیحیت کے خلاف اعلانِ جنگ کے مترادف سمجھا گیا۔ [illegible] کی آبادی، جو یونانی کلیسا کی ہی پیرو تھی، حد درجہ مشتعل ہوگئی۔ بطریق کا مردہ جسم ایک روسی تجارتی

جہاز کے ہاتھ آگیا، اور اسے نہایت عزت و احترام کے ساتھ اڈیسہ میں شہیدوں کی طرح دفن کردیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام ملک میں "مقدس جنگ" کے لئے شور مچ گیا تاکہ اپنے مشرقی کلیسا کو "ظالموں" کے پنجہ سے نجات دلائی جائے، ایا صوفیہ پر دوبارہ صلیب کا علم بلند کیا جائے، اور قسطنطنیہ کو، جو روس میں زاریگراڈ (شاہانِ روس کا شہر) کہلاتا تھا، مسیحی زار کے ظلِ عاطفت میں لے لیا جائے۔ ان حوادث کے وقت زار الکزانڈر اگر اپنے دارالحکومت میں ہوتا، تو لازمی طور پر رعایا کے جذبات کی رو اسے بہالیجاتی لیکن وہ اس وقت مملکتِ روس سے میلوں دور لیباش (آسٹریا) میں بیٹھا ہوا مدبرینِ یورپ کے ساتھ انقلابی تحریکات کو دبانے کی تجاویز سوچ رہا تھا اس کے قریب ہی میٹرنیخ تھا جو برابر اس کے کان میں اس قسم کی شورشوں کے نتائج و عواقب سے ڈرا ڈرا کر انقلابِ فرانس کی مصائب کی بھیانک تصویریں دکھا دکھا کر، اپنے غیر مداخلت کے اصول کا سحر پھونک رہا تھا۔ تاہم ترکوں کا اس قدر "خوفناک جرم" بھی اتنی بے پروائی کے ساتھ نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا، چنانچہ بطریق کے قتل کے چند روز بعد روسی سفیر معہ تمام عملہ کے واپس بلا لیا گیا اور سیاسی تعلقات منقطع کر لئے گئے لیکن اس انقطاعِ تعلقات کی جو وجوہات حکومتِ روس نے بابِ عالی کو پیش کیں، ان میں مذہبی شکایات پر، یا یونانیوں کے مفروضہ قتلِ عام پر اس قدر زور نہیں دیا گیا تھا، جتنا کہ ان حقوق پر، جو گزشتہ صلحناموں کی رو سے حکومتِ روس کو حاصل تھے۔ اسی بنا پر میٹرنیخ اور اس کے ہم خیال مدبرین کو، جو بہر صورت امن اور صلح کے خواہاں تھے، قوی امید تھی کہ یہ قضیہ بھی بغیر کسی لڑائی جھگڑے کے صلح و آشتی کے ساتھ طے ہو جائے گا۔

بابِ عالی نے آسٹریا اور انگلستان کے دباؤ سے روس کے مطالبات کو تسلیم کر لیا، تاہم روس نے اس وقت تک پورے سیاسی تعلقات قائم کرنے سے انکار کر دیا، جب تک مسیحیوں کے قتلِ عام کا بالکل خاتمہ نہ کر دیا جائے۔ ترکوں سے تو ادھر سختی کے ساتھ یہ مطالبہ ہو رہا تھا، لیکن باغیوں کی طرف کوئی نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھتا تھا۔ ۱۸۲۲ء کے شروع میں جزیرۂ خیوس کے یونانی سرکشوں نے ترکوں کی مشغولیت سے فائدہ اٹھا کر وہاں کی معصوم اور بے ضرر مسلمان رعایا کے ساتھ وہی برتاؤ کیا، جو ان کی فطرتِ ثانیہ بن چکا تھا۔ ترکوں کے سمندباز پہ یہ واقعہ ایک اور تازیانہ ثابت ہوا، اور اپریل ۱۸۲۲ء میں جوشِ انتقام میں بھرے ہوئے ترکی سپاہیوں نے اپنے شہید بھائیوں کے خونِ ناحق کا پورا پورا بدلہ لیا اور خیوس کے تمام مسلح مسیحی باشندوں کو

گھاٹ اُتار دیا۔ یورپ کے وہ "منصف مزاج" باشندے، جو مسیحی درندوں کی ہر بہیمانہ حرکت کو بھی انتہائی معصومیت کی نظر سے سمجھتے ہیں، اس جذبۂ انتقام کو کس طرح گوارا کر سکتے تھے۔ چنانچہ دو ماہ بعد ۱۸ رجون کو جب ایک یونانی آتشین کشتی نے ترکی بیڑے کے قلب میں گھس کر قبودان پاشا (امیرالبحر) کے جہاز کو آگ لگا دی اور تین ہزار ملاحوں سمیت اسے جلا کر خاک کر ڈالا، تو تمام مسیحی دنیا میں اس کی خوشی ایک یادگار فتح کے طور پر منائی گئی۔ تاہم اس زمانہ میں حکومتیں رائے عامّہ کے اس قدر زیرِ اثر نہ تھیں، خصوصاً خارجی معاملات میں تو حکومت کو کلّی اختیارات حاصل تھے، ورنہ نا دارین کا شرمناک حادثہ (جس کی تفصیل آگے آتی ہے) شاید اسی وقت پیش آگیا ہوتا۔

اس عرصہ میں برطانی کابینہ میں تبدیلی واقع ہوئی، جو ایک بڑی حد تک یونانیوں کی قسمت کا پانسہ پلٹ جانے کی ذمہ دار ہے۔ اور جارج کیننگ وزارتِ خارجہ کے منصب پر فائز ہوا۔ کیننگ عیسائی ہونے کے علاوہ قدیم ادبیات کا دلدادہ تھا، لہٰذا اس کی تمام تر ہمدردی یونانیوں کے ساتھ تھی۔ حالانکہ اس کا پہلا اصول انگلستان کے مفاد کو مدِ نظر رکھنا تھا، تاہم اس نے کسی موقعے پر یونانیوں کی امداد سے دریغ نہیں کیا۔ وہ سمجھتا تھا کہ توازنِ قوت کے اصول کے مطابق روس کی جارحانہ پیش قدمی کو روکنے کے لئے سلطنت عثمانیہ کی بقا ضروری ہے۔ اسے اس کا بھی اندازہ تھا کہ انگلستان کا مفاد اس وقت کامل امن و امان چاہتا ہے، لہٰذا اس نے کوئی عملی حصہ تو نہ لیا۔ تاہم اس کا مقصدِ اصلی یہ تھا کہ روس اور ٹرکی کے مابین تصفیہ ہو جائے تاکہ اول الذکر کو ترکوں کے خلاف اِعلانِ جنگ کرنے کا کوئی بہانہ نہ رہے علاوہ ازیں وہ اس کا بھی خواہشمند تھا کہ دولِ عظمیٰ کی جارحانہ مداخلت کے بغیر سلطان المعظم اور مسیحی رعایا کے درمیان مطالبات کا فیصلہ کر دیا جائے۔ غیر مداخلت کے اصول پر وہ بھی کاربند رہنا چاہتا تھا اور میٹرنیخ کی طرح اس کو بھی یہی خوف تھا کہ اس مداخلت کا نتیجہ، بین الاقوامی اشتعال انگیزی کے تمام عظیم خطرات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے، کہیں اس خرابی سے بھی بدتر ثابت نہ ہو، جس کا رفع کرنا مقصود ہے۔ اسی بنا پر اس نے میٹرنیخ کے ساتھ مل کر دولتِ عثمانیہ پر زور دیا اور بالآخر اس سے روس کے تمام مطالبات منوائے۔ لیکن گفت و شنید میں اتنی تاخیر ہو گئی کہ اس تصفیہ کے وقت سیاسی حالات میں بہت کافی تغیر واقع ہو چکا تھا۔

اس تغیر کا دیباچہ یہ تھا کہ ۲۵ مارچ ۱۸۲۳ء کو برطانیہ نے کیننگ کی حکومت کے زیر اثر سب سے پہلے یونان کی خود مختاری کو تسلیم کرلیا۔ باغیوں کے لئے حقیقتاً یہ ایک زبردست اخلاقی امداد تھی، اور امر واقعہ یہ ہے کہ برطانیہ کا یہی فعل بالخصوص ناوارین کے اندوہ ناک حادثہ اور یونان کی آزادی کا بڑی حد تک ذمہ دار ہے۔ کیننگ کے نزدیک انگلستان کے مفاد کا اقتضا اس وقت یہی تھا کہ یونان کو آزاد تسلیم کرلیا جائے، اور اس نے اس اعلان کے ساتھ اپنی دلی مسرت کا بھی اظہار کیا کہ انگلستان کا مفاد یونان کی فلاح وبہبود کا علم بردار ہے۔ کیننگ کی اس حرکت کا نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ کی تمام سلطنتوں نے، جو نپولین اور انقلاب فرانس کے تلخ تجربات سے سبق حاصل کرکے اتحاد و یکجہتی کا عہد و پیمان کر چکی تھیں، انگلستان کے اس فعل کو بدنیتی پر محمول کیا، اور زار الکزانڈر کا دماغ پھر پہلو بدلنے لگا۔ سلطنت عثمانیہ کی مسیحی رعایا کے تحفظ کے بارے میں روس اور انگلستان میں عرصہ سے رقابت چلی آتی تھی، اور اس وقت الکزانڈر کو بجا طور پر یہ خوف پیدا ہوگیا کہ انگلستان روس کے متذکرۂ بالا عہد و پیماں اور غیر مداخلت کے اصول سے فائدہ اٹھا کر خود کو یونانیوں کے خاص مربی اور محافظ کی حیثیت سے پیش کرنا چاہتا ہے۔

انگلستان کے اس فعل کے بعد بغاوت کی کامیابی کو دیکھتے ہوئے اب یورپ کے مفاد کا یہ تقاضا تھا کہ اس معاملہ میں بہر نوع دخل دیا جائے۔ لیکن آخر مداخلت کی صورت کیا ہونا چاہیئے؟ ترکوں کو بغاوت کے استیصال میں مدد دینا قطعی ناممکن تھا، کیونکہ رائے عامہ کی اس قدر خلاف ورزی بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔ دوسری طرف باغیوں کی مدد کرنے کے یہ معنی تھے کہ "اتحادِ مقدس" کے تمام اصول باد رہوا ثابت ہوئے جاتے تھے۔ واقعات کی رو نے یورپ کے مدبرین کو سیاسی دلدل میں اس بری طرح پھنسا دیا تھا کہ اس سے رہائی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ اکتوبر ۱۸۲۳ء میں الکزانڈر اور فرانسس (شہنشاہ آسٹریا) نے ان واقعات کے متعلق باہم مشورہ کیا، لیکن کوئی قابلِ پذیرائی فیصلہ نہ ہو سکا۔ الکزانڈر نے بالآخر تنگ آکر یہ تجویز پیش کی کہ سینٹ پیٹرز برگ میں دول عظمیٰ کی ایک کانفرنس منعقد کی جائے، اور اتفاقِ آرا سے یونان کی سرزمین تین سلطنتوں میں تقسیم کر دیا جائے، جو ترکوں کی ماتحتی اور دول کی ضمانت میں رہیں۔ جنوری ۱۸۲۴ء میں حکومت روس کی طرف سے ایک گشتی مراسلہ شائع

کیا گیا، جس میں اسی تجویز کو دُہرایا گیا تھا۔ میٹرنیخ اور کیننگ دونوں اس تجویز کے خلاف تھے، کیونکہ یونان کی ان تینوں ریاستوں کا بھی وہی حشر ہوتا، جو مالدیویہ اور والیشیا کا ہو چکا تھا، اور جزیرہ نمائے بلقان کے جنوب میں بھی روسی اثر و اقتدار سب پر بازی لے جاتا۔ میٹرنیخ نے زار کی تجویز کے مقابلہ میں یہ مطالبہ کیا کہ یونان کی کامل آزادی کو تسلیم کر لیا جائے، اور کانفرنس میں اسی پر بحث کی جائے۔ اُدھر کیننگ نے اس بنا پر کانفرنس میں حصہ لینے سے انکار کر دیا کہ آسٹریا اور روس کے متضاد مفادات کے طے کرنے میں انگلستان دلّال بننا نہیں چاہتا، اس کی سلامتی اسی میں ہے کہ باہر کھڑا ہوا تماشہ دیکھتا رہے۔

اس انکار کے باوجود کیننگ نے کچھ عرصہ کے بعد اپنے روّیہ کو تبدیل کر لیا اور اپریل ۱۸۲۴ء میں کانفرنس کے آغاز پر برطانی مندوب کو گفت و شنید میں حصہ لینے کے لئے بھیج دیا۔ لیکن چند ماہ بعد نومبر میں اس نے پھر رنگ بدلا۔ اس عرصہ میں ایک طرف تو دولت علیہ نے احتجاجی مراسلات شایع کئے کہ دولِ یورپ کو ترکوں کے "خانگی معاملات" میں دخل اندازی کا کوئی حق نہیں، اور دوسری طرف یونانیوں نے اعلان کر دیا کہ اس کانفرنس کے فیصلوں کو تسلیم کرنا ہمارے لئے لازمی نہ ہوگا۔ کیننگ نے اس بنا پر گفت و شنید میں حصہ لینے سے انکار کر دیا اور برطانی سفیر کو واپس بلا لیا۔ اب کانفرنس میں روس اور آسٹریا ایک دوسرے کے مدِّمقابل رہ گئے۔ ایک کا مفاد یونان کو تین ماتحت حکومتوں میں منقسم کر دینے کا متقاضی تھا، دوسرا مالدیویہ اور والیشیا کی مثال پیش نظر رکھتے ہوئے اپنے رقیب کے اثر کو موریہ میں کسی طرح گوارا نہیں کر سکتا تھا۔ زار کی تجویز کے مقابلہ میں میٹرنیخ نے اعلان کر دیا کہ آسٹریا صرف دو ممکنات کو قبول کر سکتا ہے، یعنی یونان کی کامل خود مختاری یا کامل اطاعت۔ اس اختلاف آرا کا نتیجہ یہ ہوا کہ کانفرنس میں کوئی قابلِ عمل بات طے نہ ہو سکی، البتہ ۱۳ مارچ ۱۸۲۵ء کو ایک مراسلہ باب عالی میں ضرور پیش کر دیا گیا کہ وہ دولِ یورپ کی متحدہ مداخلت کو منظور کرے، لیکن ترکوں نے اسے حقارت کے ساتھ مسترد کر دیا۔

اُدھر تو متضاد اور متخاصم مفادات سینٹ پیٹرزبرگ میں ایک دوسرے سے اُلجھ رہے تھے،

اس طرف سلطان محمود خاں ثانی نے تنگ آکر اپنے ماتحت محمد علی پاشا والی مصر کو اپنی مدد پر بلایا۔ محمد علی پاشا نے حسبِ معمول اپنے ولیِ نعمت کی دعوت پر صدائے لبیک بلند کی، اور مصری بیڑہ اور مصری افواج یونان کی طرف ارسال کردیں۔ نپولین کے حملۂ مصر سے سبق حاصل کرکے محمد علی نے اپنی فوج اور اپنے بیڑے کو یورپ کے لئے طریقوں پر از سرِ نو ترتیب دیا تھا، اور یہ جدید تربیت یافتہ فوج اس سے پیشتر نجد، سوڈان اور کارڈوفان میں اپنا سکہ بٹھا چکی تھی۔ یونانی ترکوں کی غیر قواعد داں افواج کے مقابلہ میں اب تک خاصی کامیابی حاصل کرچکے تھے، لیکن منظم مصری فلاحین کے سامنے ہر جگہ انھیں ذلت اور فرار کا منہ دیکھنا پڑا۔ دسمبر ۱۸۲۴ء میں محمد علی کا بیٹا، ابراہیم پاشا جو اس مہم کا سپہ سالارِ اعظم تھا، مصری بیڑے کے ساتھ مجمع الجزائر یونان میں داخل ہوا، اور جزیرۂ قریطش (کریٹ) کو مستقر بناکر یونانی بحری قوت کا خاتمہ کردیا۔ اس طرف سے فراغت حاصل کرکے ۲۴ فروری ۱۸۲۵ء کو اس نے چار ہزار پیدل اور پانچ سو سوار جزیرہ نمائے موریہ کے بالکل جنوب میں بندرگاہِ متون پر اتار دیئے اور اندرونِ ملک کی طرف بڑھا۔ ابراہیم پاشا کی مداخلت نے یونانیوں کی قسمت کا پانسہ بالکل پلٹ دیا، اور ایک سال کے اندر ہی تمام جزیرہ نمائے موریہ میں بغاوت کے شعلے بالکل فرو ہوگئے۔ صرف مسولونگی کے قلعہ کی مدافعت میں، جس کو رشید پاشا کے زیرِ قیادت ترکی افواج سختی کے ساتھ گھیرے ہوئے تھیں یونانی محصورین نے کچھ نبرد آزمائی کی طاقت کا اظہار کیا، لیکن ابراہیم کی فتحمند افواج کے آتے ہی ان کے قدم بھی اکھڑ گئے، اور جون ۱۸۲۶ء تک تمام ملک میں امن و امان قایم ہوگیا۔

ابراہیم کی فاتحانہ پیشقدمی نے یونان کے حمایتوں کے حواس پراگندہ کردئے، اور عیسائیت کی مقابلہ میں اسلام کی شکست اور ذلت کے جو خواب یورپ کے ہر متنفس کو نظر آرہے تھے، سب کے سب باطل ہوکر رہ گئے۔ کیننگ گھبرا کر اٹھا، اور اپنے تمام سابقہ دعادی اور اصول کو پسِ پشت ڈال کر حکومت روس سے نامہ و پیام شروع کردیا۔ اِدھر میٹرنیخ کی مسحورکن سرگوشیوں کا طلسم آنِ واحد میں ٹوٹ کر رہ گیا، اور زار کی عاجلانہ تیاریوں نے دنیا کو یقین دلا دیا کہ ترکوں سے عنقریب جنگ چھڑ جانے والی ہے۔ روس کے جنوبی صوبوں میں گزشتہ عرصہ سے افواج کی تعداد میں متواتر اضافہ ہو رہا تھا، اور اب ۱۸ اگست ۱۸۲۵ء کو زار نے اعلان کردیا کہ وہ مسئلۂ مشرق کے حل کو خود اپنے ہاتھ میں لے لیگا۔ اس اعلان کے ساتھ ہی

وہ دورہ کرنے کی غرض سے جنوبی صوبوں کی طرف روانہ ہوگیا۔ کیننگ نے اس موقع کو غنیمت جانا، اور اس خوف سے کہ مبادا زار تنہا کاروائی شروع کردے، فوراً روسی سفیر متعینۂ لندن سے گفت وشنید شروع کردی۔ اس وقت متضاد مفادات اور مستعمرانہ رقابتوں کو بروئے کار لانا یونان کی کامل تباہی اور دول یورپ کی ذلت آمیز شکست کے مترادف تھا۔ لہذا ان مسائل کو بالائے طاق رکھ دیا گیا، اور انگلستان اور روس کی متحدہ مداخلت کے اصول پر گفتگو شروع ہوگئی۔

لیکن اس گفت وشنید کے دوران میں ہی یکم دسمبر ۱۸۲۵ء کو زار الگزانڈر غیر متوقع طور پر اس دنیا سے رخصت ہوگیا، اور تخت نشینی کے مسئلہ پر سلطنتِ روس میں بے چینی پھیل گئی۔ مختلف سازشوں اور شورشوں کے بعد بالآخر زار نکولس اول تخت نشین ہوا، جو یورپ کی سیاسیات میں اپنے پیشرو کا نہ صرف مقلد تھا، بلکہ اس سے زیادہ سختی کے ساتھ ان اصول پر کاربند ہونا چاہتا تھا۔ "اتحادِ مقدس" کا راسخ العقیدہ حامی ہونے کے علاوہ غیر مداخلت کے اصول کا پکا معترف تھا۔ البتہ سلطنتِ عثمانیہ کے مسائل کو، شاہانِ روس کی عام ذہنیت کے مطابق، روس کے خانگی معاملات کا ایک جزو سمجھتا تھا، اور اس بنا پر یونانی بغاوت کے واقعات میں دخل دینے کا خود کو جائز طور پر حقدار خیال کرتا تھا۔ کیننگ کو اس کے ارادوں کی طرف سے بجا طور پر خوف پیدا ہوگیا، اس وجہ سے نہیں کہ سلطنت عثمانیہ خطرہ میں تھی، بلکہ صرف اس خیال سے کہ جزیرہ نمائے موریہ میں روسی اقتدار کا قیام بحیرۂ روم اور مشرقِ قریبہ میں برطانی مفاد کے لئے ناقابلِ تلافی نقصان کا باعث ہوتا۔

مذکورۂ بالا متحدہ مداخلت کے تصفیہ سے پیشتر ہی کیننگ یونانی رہنماؤں سے مفاہمت کرچکا تھا۔ یونانیوں نے اس سے قبل سینٹ پیٹرز برگ کانفرنس کے فیصلوں کو ماننے سے انکار کردیا تھا، لیکن ابراہیم پاشا کے ہاتھوں اپنے تمام منصوبوں کو خاک میں ملتا دیکھ کر انھیں جبراً وقہراً انگلستان سے مدد واعانت کی درخواست کرنا پڑی۔ جنوری ۱۸۲۶ء میں برطانی سفیر یونانی لیڈروں سے جزیرۂ پر یغلا کیں میں ملا، اور ان کے مطالبات اور شرائط معلوم کرکے واپس آگیا۔ فروری میں انگلستان کا سفیر ڈیوک آف ولنگٹن بظاہر نئے زار کو مبارکباد دینے، لیکن درحقیقت متحدہ مداخلت کی شرائط

طے کرنے کے لئے، سینٹ پیٹرز برگ پہونچا۔ زار پریفلاکیہ کانفرنس کی خبر سنکر برطانیہ کے ارادوں کی طرف سے پریشان ہوگیا تھا، لہٰذا یہ موقع پاتے ہی اس نے ڈیوک آف ولنگٹن کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور ۴؍اپریل ۱۸۲۶ء کو پروتو قول پر دستخط کر دیئے، جس کی رو سے یونان کو خودمختار لیکن باجگزار ریاست تسلیم کیا گیا تھا۔ سلطنتِ عثمانیہ کے ان شرائط کو ماننے سے انکار کر دینے کی صورت میں ہر دو حکومتوں کو یہ اختیار دیا گیا تھا کہ خواہ منفردہ طور پر یا متحد ہوکر دولت علیہ سے بالجبر اس کو تسلیم کرا لیں۔

اس باہمی معاہدہ نے، جو یورپ کے سیاسی مدبّرین کی نظر میں "کمزور اور مضحکہ انگیز تخلیق" سے زیادہ وقعت نہ رکھتا تھا، ایک نئی صورتِ حالات پیدا کر دی۔ ولنگٹن، جس کا دماغ سیاست اور تدبّر سے بالکل عاری تھا، زار نکولس کی مسحور کن عیّارانہ گفتگو کے مقابلہ میں عہدہ برآنہ ہوسکا، اور زار کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن کر رہ گیا۔ اس سے فائدہ اُٹھا کر متحدہ پروتو قول پر دستخط ہونے سے پیشتر ہی زار نے ۱۷؍مارچ کو اپنے خصوصی مطالبات کے متعلق ایک علیحدہ الٹیمیٹم بابِ عالی میں پیش کر دیا، جس میں دیگر اُمور کے علاوہ یہ مطالبہ بھی کیا گیا تھا کہ والیشیا اور مالدیویہ سے عثمانی پولیس کو ہٹا لیا جائے، چند سرویٔ سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا جائے اور عثمانی سفراکو آخری تصفیہ کے لئے حدودِ مملکت پر بھیج دیا جائے۔ لیکن بابِ عالی نے ان بالکل نئے مطالبات کو ماننے سے انکار کر دیا، اور ساتھ ہی ساتھ سلطان محمود خاں ثانی نے فوج کی اصلاح اور تنظیم کے لئے جو اسکیم مدت دراز سے اپنے ذہن میں تیار کر رکھی تھی، اس کو نافذ کر دیا۔ قدرتی طور پر افواج ینی چری نے، جو صدیوں تک ترکی غلبہ و اقتدار کی دست و بازو رہ چکی تھیں، لیکن گذشتہ دو صدی کے عرصہ میں سلاطین آلِ عثمان کے لئے آفتِ جان اور بلائے مبرم بنی ہوئی تھیں، اس جدید اصلاح کی مخالفت کی کیونکہ اس سے ان کی حیثیت اور وقعت کو سخت صدمہ پہونچنے کا اندیشہ تھا۔ ۱۵؍جون ۱۸۲۶ء کو انھوں نے بغاوت برپا کر دی اور اسکیم کی تنسیخ کا مطالبہ کیا۔ لیکن سلطانِ مصلح اس مصیبت کی پیش بندی کر چکے تھے، اور ینی چری افواج کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار تھے۔ اناطولیہ کی فوجوں نے، جو اسی مقصد کے لئے قسطنطنیہ میں خفیہ طور پر بلا کر جمع کر لی گئی تھیں، باغیوں کو گھیر لیا اور بارکوں کی طرف ڈھکیل کر ایک

کو تلوار کے گھاٹ اتار دیا۔

سلطان محمود مصلح کے اس مدبّرانہ فعل نے سلطنت عثمانیہ کو ہمیشہ کے لئے اس خطرناک اور مضرّت رساں عنصر سے نجات دیدی، لیکن ساتھ ہی ساتھ روس کے الٹیمیٹم کو پیش نظر رکھتے ہوئے ترکوں کی فوجی قوت کو ایک بڑی حد تک گھٹا دیا، جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ چار و ناچار روس کے مطالبات کے سامنے ترکوں کو سرِ تسلیم خم کرنا پڑا، اور اپنے سفرا گفت و شنید کے لئے آق کرمان میں بھیجنا پڑے۔ یہاں ۷ اکتوبر ۱۸۲۶ء کو صلح نامہ آق کرمان پر دونوں حکومتوں کے دستخط ہو گئے، جس کی رو سے مالدیویہ، والیشیا، آبنائے جات (دردانیال اور باسفورس)، اور سرکیشیہ میں روس کے حقوق کو مان لیا گیا، اور فریقین کے درمیان سیاسی تعلقات پھر قایم ہو گئے۔

اس عرصہ میں ۴ اپریل والے پروتوقول کے متعلق روس اور انگلستان میں پھر بدگمانیاں پیدا ہو گئیں۔ کیننگ اس معاہدہ کو اس وقت تک استعمال کرنا نہیں چاہتا تھا، جب تک کہ سلطنتِ عثمانیہ کا انکار اسے لازمی نہ کر دے۔ اس کے مقابلہ میں زار کو یہ خیال پیدا ہو گیا کہ برطانیہ، روس کی منفردہ کارروائی سے خائف ہو کر، معاہدہ کی شرائط کو ٹال مٹول میں رکھنا چاہتا ہے۔ اس بدگمانی کا نتیجہ یہ ہوا کہ یورپ کے دارالحکومتوں میں نامہ و پیام کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا۔ آسٹریا اپنے غیر مداخلت کے اصول سے منحرف ہونا نہ چاہتا تھا، اور ترکوں کے خلاف ہر کارروائی کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ برلن کے ایوانات میں وائنا کی ہی صدائے بازگشت گونج رہی تھی۔ گویا صرف انگلستان، فرانس اور روس "کافر ترکوں" کے خلاف جنگ آزمائی کرنے کو آمادہ تھے۔ ۴ ستمبر ۱۸۲۶ء کو کیننگ نے ایک مراسلہ کے ذریعہ حکومت روس سے اجازت طلب کی کہ انگلستان ترکوں پر دباؤ ڈالے اور ان سے سابقہ شرائط منظور کرائے، بصورت دیگر دونوں حکومتوں کے سفرا کو قسطنطنیہ سے واپس بلا کر یونان میں سفارتیں قایم کر لی جائیں، اور جزیرہ نمائے موریہ اور مجمع الجزائر یونان کی آزادی کو تسلیم کر لیا جائے۔ زار نے اس مراسلہ کو منظور کر لیا، اور ساتھ ہی یہ تجویز بھی پیش کی کہ تینوں حکومتوں کے جنگی بیڑے متحد ہو کر بحیرۂ روم میں اپنا مرکز قایم کر لیں، اور اس سے ابراہیم پاشا اور اس کے وطن مصر کے درمیان سلسلۂ رسد و رسائل کو منقطع کر دیں۔

۱۸۲۶ء کے شروع میں لندن میں تمام سفراء کی ایک اور کانفرنس منعقد کی گئی، تاکہ مسئلۂ شرقیہ سے دلچسپی رکھنے والی تمام حکومتیں، جو "اتحادِ مقدس" کی رکن تھیں، کسی ایک فیصلہ پر پہونچ سکیں اور متحدہ مقصد کے تحت کارروائی کر سکیں۔ آسٹریا اور پروشیا (جرمنی) نے حسبِ معمول غیر مداخلت کے اصول پر زور دیا، اور شنوائی نہ ہونے کی صورت میں دونوں حکومتیں احتجاج کے طور پر اس کانفرنس سے علیحدہ ہوگئیں۔ فرانس نے تجویز پیش کی ۴ اپریل ۱۸۲۶ء والے پروتوقول کو معاہدہ کی صورت میں تبدیل کر دیا جائے اور حکومت عثمانیہ سے بالجبر منوالیا جائے۔ چنانچہ ۴ اپریل ۱۸۲۶ء کو برطانی اور روسی سفراء نے پروتوقول کو بابِ عالی میں پیش کر دیا لیکن اسے حقارت کے ساتھ مسترد کر دیا گیا، کیونکہ وہ "دولتِ علّیہ کے نجی معاملات میں گستاخانہ مداخلت" کے مترادف تھا۔ اسی دوران میں انگلستان کے وزیر اعظم کی وفات پر کیننگ وزیر اعظم مقرر کیا گیا، اور وزارتِ خارجہ کا منصب لارڈ ڈڈلے کو تفویض ہوا۔ ولنگٹن، جو شروع ہی سے ترکوں کے خلاف جبر و استبداد کے مظاہرے کو ناپسند کرتا تھا، برطانی کابینہ کی متخاصمانہ پالیسی کو دیکھتے ہوئے، اپنی جگہ سے مستعفی ہوگیا، اور خود کو انگلستان اور روس کی جابرانہ اور ہوس پرستانہ حکمت عملی کی مخالفت کے لئے وقف کر دیا۔

لیکن کیننگ نے ولنگٹن کی مخالفت کی کوئی پروانہ کی اور اپنی پالیسی کے مطابق نامہ و پیام جاری رکھا۔ ۶ جولائی ۱۸۲۷ء کو مذکورۂ بالا پروتوقول معاہدۂ لندن کی صورت میں تبدیل کر لیا گیا جس پر آسٹریا اور پروشیا نے حسبِ توقع دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ اس معاہدہ کی رو سے انگلستان، فرانس اور روس نے یونان کو ترکوں کے زیر اثر حکومتِ خود اختیاری دلانے کا فیصلہ کر لیا، اور چند خفیہ دفعات کی رو سے یہ بھی طے پا گیا کہ دولتِ علّیہ کے انکار کر دینے کی صورت میں قونصلوں کے ذریعہ یونان سے سیاسی و تجارتی تعلقات قایم کر لئے جائیں گے، متحاربین سے التوائے جنگ کی درخواست کی جائیگی، اور اس کو منظور کرانے کے لئے وہ تمام طریقے استعمال کئے جا سکیں گے، جو دول معاہد کے نزدیک صحیح اور مناسب ہوں۔ ان شرائط کے زیر اثر تینوں حکومتوں نے اپنے اپنے بیڑوں کو جو بحیرۂ روم میں متعیّن تھے۔ ہدایات بھیجدیں اور کپتانوں کو کلی اختیارات دیدیئے۔ ۱۸ اگست کو تینوں سفیروں نے ایک متحدہ مراسلہ کے ذریعہ بابِ عالی میں التوائے جنگ کی درخواست پیش کر دی اور اس کو بالجبر منوانے کی دھمکی بھی

دی۔ یہ درخواست ابھی پیش بھی نہ ہونے پائی تھی کہ ۸ اگست کو لارڈ کیننگ عالمِ آخرت کو سفر کر گیا، اور میٹرنیخ کی راہ سے وہ پہاڑ ہٹ گیا "جس کو قضا و قدر نے ایک منحوس اور بدخواہ شہابِ ثاقب کی مانند انگلستان اور یورپ پر پھینک مارا تھا" میٹرنیخ فوراً میدان میں آکودا، اور آنِ واحد میں کیننگ کے بنے بنائے طلسم کو توڑ کر رکھ دیا۔ انگلستان کے وزراء اپنی روحِ رواں کے اٹھ جانے کے بعد سست پڑ گئے، زار نکولس میٹرنیخ کے اثر میں آکر یونانیوں کو باغی کہہ کر پکارنے لگا اور آسٹریا اور جرمنی کے بغیر معاہدۂ لندن پر دستخط کر دینے پر ندامت کا اظہار کرنے لگا، چارلس دہم شاہِ فرانس بھی خود کو تنہا پا کر بغلیں جھانکنے لگا۔ قریب تھا کہ تصفیہ کی کوئی معقول صورت پیدا ہو جائے کہ یکایک ۲۰ اکتوبر ۱۸۲۷ء کو خلیج ناوارین میں واقعات کی رُو نے یونان کی قسمت کا فیصلہ کر دیا۔

اپنی حکومتوں کی ہدایات کے تحت دولِ یورپ کا متحدہ بیڑہ، جو برطانی امیرالبحر کاڈرنگٹن کی کمان میں تھا، اگست کے وسط میں سمرنا سے روانہ ہو کر ناپولی پہونچا، جہاں یونانیوں نے التوائے جنگ کی شرائط کو مان لیا، لیکن ترکوں نے مسترد کر دیا۔ سواحلِ موریہ کی حفاظت کے لئے ترکی اور مصری بیڑہ ۷ ستمبر کو خلیج ناوارین میں داخل ہو کر لنگر انداز ہو گیا۔ جس کے پانچ روز بعد اتحادی بیڑہ بھی اس کے تعاقب میں آپہونچا۔ کاڈرنگٹن نے ابراہیم پاشا کو ایک تہدید آمیز خط لکھا، جس میں اسے "حکم" دیا گیا تھا کہ خشکی اور تری پر مخاصمانہ کارروائیوں کا التوا کر دے اور خلیج سے باہر نکلنے کی کوشش نہ کرے۔ تھوڑی سی ردّ و قدح کے بعد ابراہیم پاشا نے حالات کی رپورٹ آستانۂ علیہ کو ارسال کر دی اور وہاں سے احکامات موصول ہونے تک کوئی کارروائی نہ کرنے کا وعدہ کر لیا۔ لیکن التوائے جنگ منظور کر لینے کے باوجود یونانی اپنی شرارتوں سے باز نہ آئے اور ۲۳ ستمبر کو ایک یونانی دستہ نے حملہ کر کے چند ترکی جہازوں کو جلا ڈالا۔ یونانیوں کی اس شرمناک غداری اور عہد شکنی پر رواداری اور غیر جانبداری کے حاملین نے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا، لیکن جب ابراہیم پاشا نے اس بدعہدی کا انتقام لینے کے لئے لنگر گاہ سے نکلنا چاہا تو اسے انتہائی سختی کے ساتھ روک دیا گیا۔ اور یہی وہ طرزِ عمل ہے، جس کو جا و بیجا رواداری کے غلط نام سے موسوم کر کے یورپ کا بچہ بچہ اپنی اس صفت پر فخر و مباہات کے مارے زمین پر قدم نہیں رکھ سکتا

ابراہیم پاشا جبراً وقہراً لیکن غصہ میں بھرا ہوا واپس ہوگیا خشکی پر پہونچ کر اسے سلطان المعظم کا جوابی فرمان ملا کہ اتحادی بیڑے کی پروا نہ کرو اور ملک و ملت کی خدمات بلا خدشہ انجام دیئے جاؤ اس فرمان کو پاکر ابراہیم اندرون ملک کی طرف بڑھا اور یونانی باغیوں کے خلاف جنگی کارروائیاں شروع کردیں۔ کاڈرنگٹن ان کارروائیوں کو روکنے اور ابراہیم پاشا کو خوفزدہ کرنے کی غرض سے خلیج ناوارین کے اندر داخل ہوگیا، اور عثمانی بیڑے کے مقابل اپنے جہازوں کو اس صورت سے کھڑا کردیا گویا کہ جنگ کے لئے تیار ہے۔ انگریزی مورخین نے حکومتِ برطانیہ کے "معصوم" دامنوں سے اس خونی داغ کو دور کرنے کے لئے جنگ شروع کرنے کا تمام تر الزام ترکوں کے سر ڈال دیا ہے، حالانکہ ان کی تاویلات بیّن طور پر حقیقت سے کوسوں دور نظر آتی ہیں۔ لارڈ ایورسلے نے جس قدر صریح غلط بیانی سے کام لیا ہے، اور واقعات سے جو متعصبانہ چشم پوشی کی ہے، اس کا راز خود اسی کے متضاد اور غیر فطری بیانات سے فاش ہوکر رہ گیا ہے۔ اتحادی بیڑے کے خلیج ناوارین کے اندر گھس آنے کی وجہ وہ **صرف** یہ بیان کرتا ہے کہ "موسم سر پر آگیا تھا اور (شاید سردی کے سبب سے) برطانی امیر البحر نے خیال کیا کہ خلیج کے باہر اس کا لنگر انداز رہنا مشکل ہوگا"۔ اس قدر مضحکہ خیز توجیہ صرف ایسے ہی مورخین کے فانوسِ خیال کی اختراع ہوسکتی ہے۔ علاوہ بریں تمام مورخین اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ خلیج کے دہانہ پر دونوں جانب ترکوں کے قلعے موجود تھے، جنھوں نے اتحادی بیڑے کے داخل ہوتے وقت کوئی مزاحمت نہیں کی۔ کیا یہ کسی طرح تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ ترکوں کی نیت فاسد ہونے کی صورت میں، اور ایسی حالت میں کہ خود اتحادی بیڑہ بظاہر حملہ کرنے کے لئے ترکی بیڑے کی طرف اقدام کر رہا تھا، ترکی قلعہ اس "بدنیتی" میں کوئی حصہ نہ لیتے، اور خاموش بیٹھے تماشہ دیکھتے رہتے، دراں حالیکہ وہ گولہ باری کرکے اتحادی بیڑے کو بہت کافی نقصان پہونچا سکتے تھے؟ حقیقت یہ ہے کہ اپنی حکومت کے اس صریح مستبدانہ فعل کی تاویلات پیش کرنے میں انگریزی مورخین نے عقلمندی سے کام نہیں لیا۔

اس کے برخلاف صحیح واقعات پر ایک سرسری نظر ہی ڈالنے سے برطانی عمال حکومت کی ذمہ داری

---

[1] ایورسلے اینڈ چیرل:۔ دی ٹرکش ایمپائر؛ (لندن) مطبوعہ ۱۹۲۳ء؛ صفحات ۲۹۹—۳۰۰۔

صاف طور پر ظاہر ہو جاتی ہے۔ سب سے پہلے کیننگ کا طرزِ عمل اور معاہدۂ لندن کی شرائط جنگِ ناوارین کی ذمہ دار شخصیت کے چہرے سے نقاب اُلٹ دیتی ہیں۔ میریٹ جیسا متعصب مورخ کیننگ کے جرم کا اعتراف کئے بغیر نہ رہ سکا، اور اقرار کر گیا کہ

"لیکن یہ امر کہ وہ (کیننگ) خود طاقت کے استعمال کو ذہن میں متصوّر کئے ہوئے تھا، اس بات سے ظاہر ہے کہ ڈیوک آف ولنگٹن نے معاہدۂ لندن کو بایں وجہ ناجائز قرار دیا تھا کہ وہ معاہدہ جبر و استبداد کے ایسے وسائل کا مظاہرہ کرتا ہے، جو جنگ کے طریقوں سے کسی طرح کم ہیں نہ زیادہ۔"[۱]

معاہدۂ لندن کی شرائط اور وہ احکامات، جو اس کے ساتھ کیننگ نے ارسال کئے تھے، کچھ ایسے مبہم اور ذو معانی الفاظ میں تھے کہ کاڈرنگٹن کا سپاہیانہ غیر سیاسی دماغ ان کا صحیح مفہوم سمجھنے سے قطعی قاصر رہا۔ لہٰذا اس نے برطانی سفیر متعینۂ قسطنطنیہ سے استصواب کیا، جس نے جواب میں لکھا کہ

"رسد کی روک تھام، اگر ضرورت پڑے اور دوسرے وسائل اختیار کئے جا چکے ہوں، تو توپ کے گولوں کے ذریعہ سے آخر کار کرنا پڑے گی۔"

کاڈرنگٹن نے اس جواب سے یہ سمجھ لیا کہ وہ حسبِ منشا طاقت کا مظاہرہ کرنے کا مجاز اور اس میں حق بجانب ہوگا، لہٰذا اس حکم کے ملتے ہی اس نے عمداً خلیج ناوارین میں داخل ہو کر جنگ کی طرح ڈال دی۔

سلطان المعظم کے حکم کی تعمیل میں ابراہیم پاشا ناوارین سے اندرون ملک کی طرف روانہ ہو چکا تھا، اور عثمانی بیڑے کی کمان اوغلی طاہر پاشا اور محرم بے کے ہاتھوں میں تھی۔ ابراہیم کی روانگی کے چند روز بعد مصری بیڑے کے فرانسیسی ملازموں کے پاس فرانسیسی امیر البحر ڈی رنی (De Rigny) کی تحریریں آئیں کہ عثمانی بیڑے سے جنگ کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ لہٰذا تم اپنی ملازمتوں سے استعفا دے کر یہاں چلے آؤ، اور ان لوگوں نے اس کی تعمیل کی[۲]۔ کیا اس امر سے بھی کاڈرنگٹن اور اتحادی بیڑے کی خلیج میں داخل ہونے کی غرض و غایت کا انکشاف نہیں ہوتا؟ عثمانی بیڑہ خلیج کے اندر ہلال کی شکل میں لنگر انداز تھا، اور اتحادیوں کے معاندانہ ارادوں سے قطعی بے خبر۔ کاڈرنگٹن نے خلیج میں داخل ہونے کے بعد اپنے

---

[۱] جے اے آر میریٹ، ایسٹرن کوئسچن (آکسفورڈ یونیورسٹی پریس)، مطبوعہ ۱۹۲۴ء، صفحہ ۲۱۹۔ [۲] کرنل ایلیل بک، حقائق الاخبار عن دول البحار مترجمہ مولوی محمد حلیم انصاری، صفحہ ۲۴۷۔

جہازوں کو اس کے مقابل صف آرا کر دیا' اور چونکہ ترکوں نے چند آتشین جہازوں کو' جن سے اتحادی بیڑے کو کچھ فرضی نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا' ہٹانے سے انکار کر دیا' لہذا دونوں طرف سے گولہ باری شروع ہو گئی' جس نے آخرکار باقاعدہ خوفناک جنگ کی صورت اختیار کر لی۔ سورج غروب ہونے سے پیشتر ہی عثمانی بیڑے کے بجائے اس کے جلتے ہوئے تختے اور تباہ شدہ بادبان خلیج ناوارین کے اندر دنیا سے قانونِ انسانیت و شرافت کے اٹھ جانے کا مرثیہ پڑھ رہے تھے۔

"یہ شرمناک جنگ' جو ابدالآباد تک دولت انگلشیہ کے دامن پر بدنما داغ بنی رہیگی" درحقیقت نتیجہ تھی کیننگ اور اس کے ہم خیال عاملین حکومت کے متعصبانہ اور معاندانہ روّیہ کا۔ کیننگ کی موت کے بعد برطانی کابینہ اس کی پالیسی کا اس قدر پرزور موّید نہ تھا' لیکن ابھی اپنی ہدایات کاڈرنگٹن کو ارسال نہ کرنے پایا تھا' لہذا کاڈرنگٹن نے اپنی ہدایات پر عمل کیا' جن کو وہ پیشتر وصول کر چکا تھا۔ اس حادثۂ فاجعہ کی خبر نے برطانی پارلیمنٹ کے ہر ایک فرد کو مبہوت بنا دیا' اور دارالعوام میں امیرالبحر کا کورٹ مارشل کرنے کی تجویز پاس ہو گئی۔ مجلس حربی (کورٹ مارشل) میں' حالانکہ وزیر بحر نے اپنے ماتحت کو الزامات سے بری کرانے کی انتہائی کوشش کی' لیکن اس کی کچھ پیش نہ گئی اور کاڈرنگٹن کے لئے سزائے موت کا فیصلہ صادر ہو گیا۔ امیرالبحر نے اپنے قتل کا حکم سنا تو علیحدگی میں وزیر بحر سے کہا کہ عثمانی بیڑے کو جلا دینے کی بابت آپ کا دستخطی فرمان میرے پاس موجود ہے' جسے میں حسب الحکم جلا دینا بھول گیا تھا۔ علاوہ ازیں ان ہدایات کے حاشیہ پر' جن میں کاڈرنگٹن کے عام اختیارات کو کسی حد تک محدود کر دیا گیا تھا' برطانی وزیر بحر' ڈیوک آف کلیرنس کے یہ الفاظ تحریر تھے:۔

> پیارے ایڈورڈ[1] یہ حکم تم کو اس بات سے منع نہیں کرتا کہ اگر موقع
> ملے تو تم اپنی بارود نہ جلاؤ۔"

یہ حالات سنکر مجلس حربی نے ایک خفیہ جلسہ منعقد کیا جس میں امیرالبحر کو سزائے موت سے بری کر دیا گیا۔[2]

---

[1] یعنی سر ایڈورڈ کاڈرنگٹن۔

[2] کرنل اسمٰعیل بک: حقایق الاخبار عن دول البحار' مترجمہ مولوی محمد حلیم انصاری' صفحات: ۵۰ و ۵۱م۔

جنگ ناوارین نے دولِ یورپ پر بہت زیادہ اثر کیا۔ برطانی پارلیمنٹ کا حال تحریر کیا جا چکا ہے۔ جارج چہارم شاہ انگلستان نے اپنی افتتاحی تقریر میں حد سے زیادہ ندامت کا اظہار کیا اور امید ظاہر کی کہ اس واقعہ سے دولت علیہ اور انگلستان کے دوستانہ تعلقات پر کوئی اثر نہ پڑیگا۔ اس کے برعکس زار روس نے اس جنگ کو تمہید سمجھا دولت علیہ کے خلاف آئندہ متحدہ کارروائیوں کی اور فوراً ہی یہ تجویز پیش کی کہ روسی فوجیں مملکتیں (مالدیویہ و الیشیا) کی طرف سے اور متحدہ بیڑے دردانیال کی طرف سے حملہ آور ہوں اور بالجبر سلطان المعظم سے معاہدۂ لندن کو تسلیم کرالیں لیکن انگلستان اور فرانس دونوں اس کے لئے تیار نہ تھے۔ اس طرف سلطان المعظم نے دول ثلثہ سے معاوضہ اور اظہار ندامت کا مطالبہ کیا لیکن اس کا جواب صرف یہ ملا کہ تینوں حکومتوں کے سفراء دارالخلافہ سے رخصت ہو گئے اور سیاسی تعلقات منقطع کر لئے۔ سلطان المعظم نے دول یورپ کی "عیاری اور دغابازی" سے متأثر ہو کر ۲۰ دسمبر ۱۸۲۷ء کو خطبۂ شریف کے ذریعہ جہاد کا اعلان کر دیا اور معاہدۂ آق کرمان کو قابل تنسیخ قرار دیدیا۔

روس نے اس فرمان کو اعلان جنگ سمجھا اور برطانی اور فرنسیسی حکومتوں سے نامہ و پیام شروع کر دیا۔ لیکن جنوری ۱۸۲۸ء میں ڈیوک آف وِلنگٹن برطانیہ کا وزیر اعظم مقرر کیا گیا جو کیننگ کی مستبدانہ پالیسی کا شروع ہی سے سخت مخالف تھا۔ اس نے وزارت لیتے ہی روسی مراسلات کا سخت جواب دیا اور ترکوں کے خلاف کسی جنگی کارروائی میں حصہ لینے سے قطعی انکار کر دیا۔ زار نکولس کو اس انکار سے بجا طور پر یہ خوف پیدا ہو گیا کہ دولت عثمانیہ کے خلاف قدم اٹھا کر وہ تمام دول یورپ کو اپنے مقابل صف آرا پائیگا کیونکہ مسئلہ شرقیہ جہاں تک ٹرکی کا تعلق ہے روس اور بقیہ دولِ یورپ کے مقابلہ کا مسئلہ[1] تھا۔ لیکن زار نے سلسلہ رسل و رسائل کو برابر قائم رکھا اور بالآخر جب اس نے یہ وعدہ کر لیا کہ اس جنگ سے کوئی تجارتی یا ملکی فائدہ حاصل نہ کریگا بحیرۂ روم میں کوئی جنگی کارروائی نہ کی جائیگی اور یہ کہ اس کا مقصد صرف معاہدۂ لندن کو تسلیم کرانا ہوگا تو برطانیہ

[1] یورپ کے ماہر سیاست پروفیسر ادسٹین کا مقولہ۔

اور فرانس نے اسے تنہا کارروائی کرنے کی منظوری دیدی۔ ادھر سے اطمینان حاصل ہوتے ہی اس نے دولت علیہ پر اعلان جنگ کر دیا۔

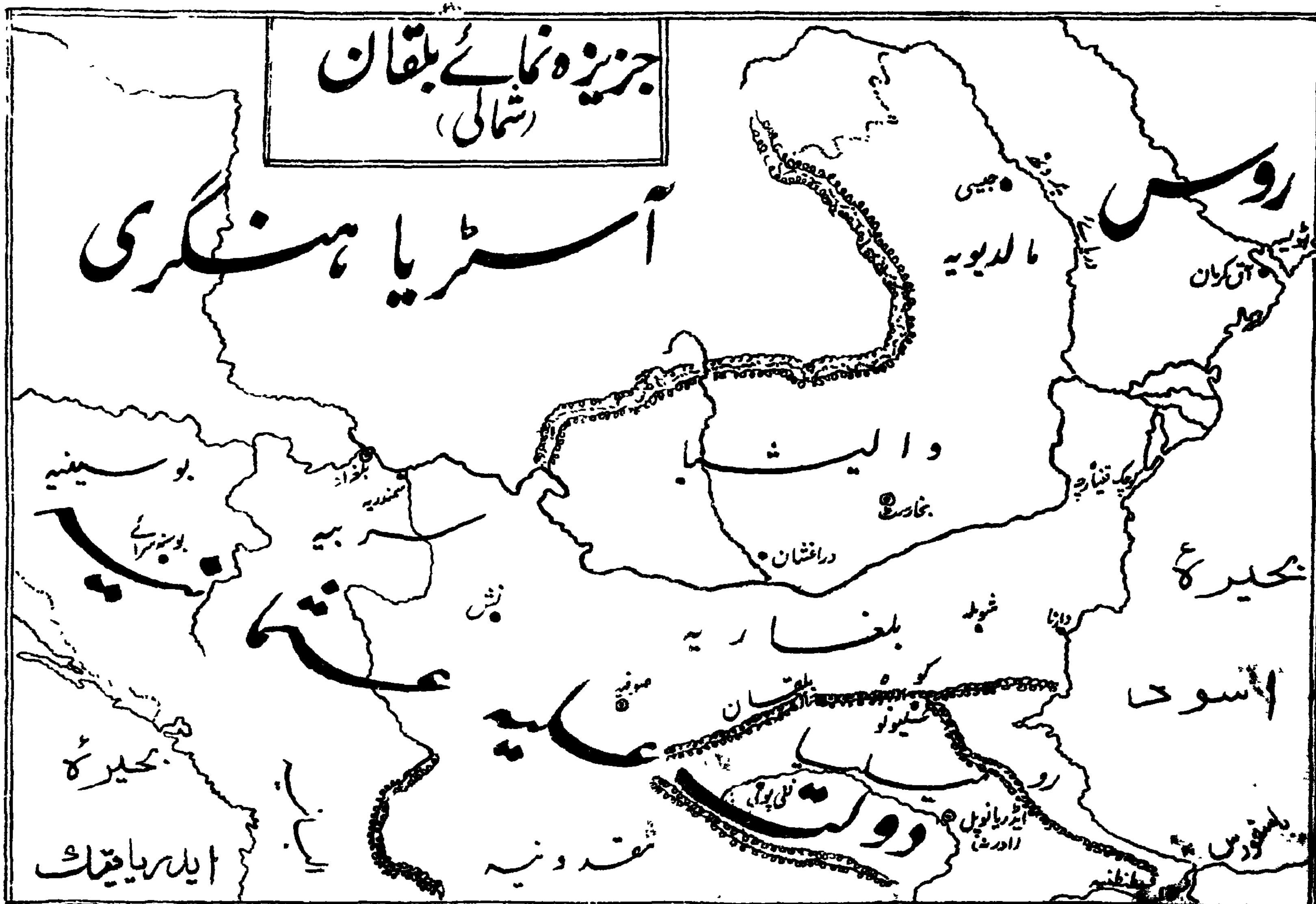
روسی سپاہ نے، جس کی کمان زار نکولس بہ نفس نفیس کر رہا تھا، ۶ رمئی ۱۸۲۸ء کو دریائے پرتھ کو عبور کیا، اور مالدیویہ میں داخل ہو گئی۔ نہ صرف زار بلکہ تمام یورپ کا خیال تھا کہ روسی فوجیں پیش قدمی کرتی ہوئی سیدھی قسطنطنیہ پر جاکر دم لینگی، لیکن یورپ کے "مرد بیمار" نے باوجودیکہ اس کی فوجی قوت ینی چری افواج کے قتل عام سے بہت بڑی حد تک کمزور ہو چکی تھی، ایک مرتبہ پھر دنیا کو اپنی فطری طاقت کا نمونہ دکھایا، اور ڈیڑھ لاکھ سے زائد روسیوں کے مقابلہ میں مٹھی بھر غیر تربیت یافتہ ترکوں نے وارنا اور شوملہ کے قلعوں کی مدافعت میں جو کارہائے نمایاں دکھائے وہ تمام یورپ کو انگشت بدنداں کر گئے۔ وارنا جس کو روسیوں نے خشکی اور تری دونوں طرف سے سختی کے ساتھ محصور کر رکھا تھا، صرف ترکی سپہ سالار یوسف پاشا کی غداری اور نمک حرامی کی وجہ سے تسخیر ہو سکا۔ اس شجاعانہ مدافعت کا نتیجہ یہ ہوا کہ جنگ کا انجام ایک سال کے لئے ملتوی ہو گیا اپنی افتاد طبیعت سے مجبور ہو کر ایورسلے روسی افواج کی تعداد بہت گھٹا کر بیان کرتا ہے تاکہ مشرق کے مقابلہ میں مغربیوں کی ذلت اور ناکامی کی داستان زیادہ باوقعت نہ ہونے پائے۔

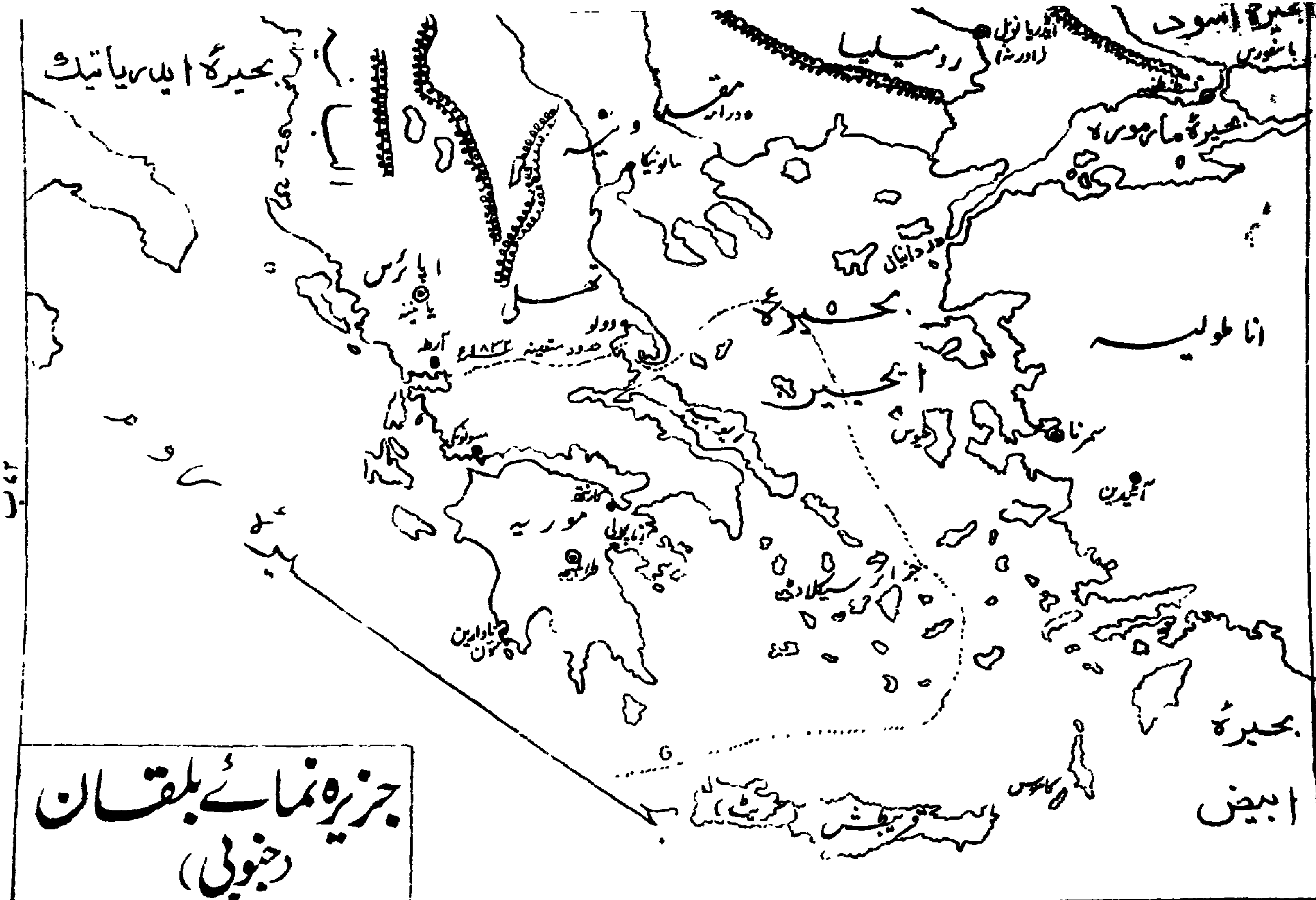
اس عرصہ میں دوسری حکومتیں بھی بیکار نہ بیٹھی رہیں۔ انھوں نے یونان میں روسی اثرات کے نفوذ کا سدباب کرنے کے لئے لندن میں ایک اور کانفرنس کی طرح ڈالدی، اور ۱۹ جولائی ۱۸۲۸ء کو یہ طے کیا کہ جزیرہ نمائے موریہ پر عارضی طور پر فرانسیسی فوجیں قبضہ کر لیں، اور دول یورپ کے آخری فیصلہ تک انتظام قائم رکھیں۔ ادھر ناوارین سے نکل کر کاڈرنگٹن حسب ہدایات سابقہ متحدہ بیڑے کے ساتھ سکندریہ پہنچا، اور محمد علی پاشا پر دباؤ ڈالکر ابراہیم اور مصری افواج کو موریہ سے واپس بلوا لیا۔ فرانسیسی فوجیں متون میں اتریں تو میدان خالی پایا، اور ان کا تنہا کام یہ رہ گیا تھا کہ ملک کی حفاظت کریں اور ہر طرف امن و امان قائم رکھیں۔ ۱۶ رنومبر ۱۸۲۸ء کو اسی کانفرنس نے ایک پروتوکول کے ذریعہ ترکوں کی ماتحتی میں یونان کی حکومت خود اختیاری

کو تسلیم کر لیا، اور ۲۲ مارچ ۱۸۲۹ء کو ایک دوسرے پروٹوکول نے یونان کی حدود جزیرہ نمائے موتہ جزائر سیکلادہ (CYCLADES) اور دیگر متصلہ جزائر کے علاوہ کچھ اضافہ کے بعد جزیرۂ ایوبیہ اور خلیج آرطہ اور خلیج دولو کی لائن تک متعین کر دیں۔ اس تصفیہ کی رو سے حکومت یونان کو دولت علیہ کا باجگذار رکھا گیا تھا، اور بادشاہ کے انتخاب کا مسئلہ تمام حکومتوں کی رائے پر چھوڑ دیا گیا تھا۔

زار نکولس نے، جو اپنی گذشتہ مہم کی ناکامی سے سبق حاصل کر چکا تھا، ۱۸۲۹ء کی مہم کی کمان ایک مشہور روسی جنرل ڈی بیش کو تفویض کی، جس نے انتہائی جرأت بلکہ محاربانہ حماقت سے کام لیکر یمین و یسار کے قلعہ جات کو غیر تسخیر شدہ چھوڑا، اور تھوڑی سی فوج کے ساتھ سیدھا قسطنطنیہ کا رخ کر دیا۔ ترکوں کی اصل فوج چونکہ ان ہی قلعہ جات کی حفاظت و مدافعت پر مامور تھی، لہذا کوہ بلقان کے تمام راستے بلا حفاظت پڑے تھے۔ ڈی بیش کی اس جرأت نے اس کا کام بنا دیا اور ترک یہ سمجھکر کہ روسیوں کی لاتعداد افواج کا یہ صرف ہراولی دستہ ہے کسی جگہ جم کر مقابلہ نہ کر سکے۔ روسی جنرل کوہ بلقان کو عبور کر کے دار الخلافہ کی طرف بڑھا، سلیونو پر ایک مقامی ترکی فوج کو شکست دی، اور بلا مزاحمت ایڈریا نوپل میں داخل ہو گیا۔ ڈی بیش کی فاتحانہ پیشقدمی نے ترکوں کو پریشان کر دیا اور انھیں اپنی سلطنت سخت خطرے میں نظر آنے لگی۔ جرمن سپہ سالار ہر موتھ فان مالٹکے، جو ترکی افواج کو تربیت دینے اور قواعد جنگ سکھانے کی غرض سے جرمنی سے بلایا گیا تھا، لاکھ چیختا رہا کہ صرف ایک ہفتہ طول دئے جاؤ تو اس روسی فوج کا خاتمہ ہو جائیگا۔ لیکن اس کی کسی نے نہ سنی، اور ترکی سفیر ایڈریا نوپل میں روسی سفراء سے جا ملے، جہاں ۱۴ ستمبر ۱۸۲۹ء کو صلحنامہ اورنہ پر فریقین کے دستخط ہو گئے۔ اس صلحنامہ کی رو سے مالدیویہ اور والیشیا کو تقریباً بالکل خود مختار کر دیا گیا، باسفورس اور دردانیال میں روسی جہازوں کے حقوق دوبارہ تسلیم کر لئے گئے، اور یونان کے متعلق لندن کانفرنس کے ۲۲ مارچ والے پروٹوکول کو صلحنامہ کا ایک جزو بنا لیا گیا۔

ایڈریا نوپل کے صلحنامہ کی خبر نے برطانی حلقوں میں پھر سراسیمگی پھیلا دی۔ اس کے یہ معنی


جزیرہ نمائے بلقان
(شمالی)
آسٹریا ہنگری
روس
مالدیویہ
جیسی
آق کرمان
والیشیا
بخارسٹ
دراغشان
بوسینیہ
بوسنہ سرائے
سربیہ
بلغراد
سمندریہ
نِش
بلغاریہ
ورانا
شوملہ
صوفیہ
کوہ بلقان
فلیپولو
ایڈریانوپل
(ادرنہ)
دولت
بحیرہ اسود
باسفورس
قسطنطنیہ
مقدونیہ
بحیرہ
ایڈریاٹیک



جزیرہ نمائے بلقان
(جنوبی)

تھے کہ یونان دولِ یورپ کو نہیں بلکہ صرف روس کو اپنا محسن اور نجات دہندہ سمجھے گا اور اس طرح روس کا اقتدار جزیرہ نمائے بلقان کے جنوب میں بھی سب پر فوقیت حاصل کرلیگا۔ میٹرنیخ جو اس اثر کی مخالفت میں شروع ہی سے یونان کی کامل اطاعت یا کامل آزادی کا مؤید تھا، اب اوّل الذکر کو قطعی ناممکن سمجھ کر کامل آزادی کی تجویز پر برطانی حکومت سے نامہ و پیام کرنے لگا، اور ولنگٹن کو اپنا ہمنوا بنالیا۔ اسی نظریہ کے تحت لندن سے ۳ر فروری ۱۸۳۰ء کو ایک اور پروتوقول شایع ہوا، جس میں یونان کی کامل آزادی کا مطالبہ کیا گیا تھا، لیکن ۲۲ر مارچ والے پروتوقول کی اضافہ کردہ حدود گھٹا کر سابقہ حدود باقی رکھی گئی تھیں۔ شہزادہ کیپوڈی آسٹریا نے، جو جنگ ناوارین کے بعد سے ملک میں با اقتدار لیڈر بنا ہوا تھا، اس پروتوقول کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا۔ دوسری طرف شہزادہ لیوپولڈ آف کوبرگ نے بھی، جسے یونان کا تخت پیش کیا گیا تھا، اپنی امیدواری سے استعفا دیدیا۔ ان حالات کے تحت دولِ یورپ کے لئے یہ ضروری ہوگیا کہ یونانیوں کو ان کی مطلوبہ چند مراعات اور دیدی جائیں۔ اس عرصہ میں ۱۸۳۰ء کے انقلابِ فرانس نے چارلس دہم کی حکومت کا تختہ الٹ کر تمام یورپ کی توجہ کو اپنی طرف منعطف کرلیا تھا اور مغربی مدبرین جنوب و مشرقی یورپ کے اس قضیۂ نامرضیہ سے جلد از جلد فراغت حاصل کرنا چاہتے تھے۔

یونان کی حالت اس وقت بد سے بدتر ہورہی تھی اور ہر طرف سوءِ مزاج کا دور دورہ تھا شہزادہ کیپوڈی آسٹریا، جو اب تک ملک کی بے لگامی اور انتشار کو بہت بڑی حد تک روکے ہوئے تھا، ایک مخالف کے ہاتھوں مارا جاچکا تھا اور تمام ملک ایسے فرقوں کی بدولت، جو اپنے غلبہ و اقتدار کے خواہاں تھے، تباہ و برباد ہورہا تھا۔ اس حالت کو دیکھتے ہوئے اس امر کی سخت ضرورت تھی کہ ملک میں جس قدر جلد ممکن ہوسکے ایک باقاعدہ طاقتور حکومت قائم کردی جائے کیونکہ لندن یا سینٹ پیٹرز برگ میں بیٹھے بیٹھے ہدایات شایع کرنے سے اس نوضعیت کا خاتمہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ نومبر ۱۸۳۰ء کے انتخابات نے ولنگٹن کے کابینہ کو عنانِ حکومت سے برطرف کردیا

لارڈ پامرسٹن نئے وزیراعظم نے جدید کابینہ کی بنا ڈالی۔ پامرسٹن پیشتر ہی سے یونانیوں کا حامی تھا، لہٰذا منصب وزارت پر فائز ہوتے ہی اس نے ۲۶ ستمبر ۱۸۳۱ء کو ایک پردتو قول شائع کیا جس کی رو سے یونانیوں کو "آراطہ دولو" کی لائن تک کی حدود دیدی گئیں۔

یونانیوں نے اس تصفیہ کو مان لیا، اور دول یورپ کے سامنے اب صرف ان کے لئے ایک بادشاہ کو انتخاب کرنے کا مسئلہ رہ گیا۔ شاہ بویریا کے دوسرے بیٹے شہزادہ "آٹو" کو جو بہ لحاظ عمر ابھی لڑکپن کی حدود سے بھی متجاوز نہ ہونے پایا تھا، بالآخر یونان کا تخت پیش کیا گیا، جس کو اس نے بہ طیب خاطر قبول کرلیا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ شاہ بویریا کی درخواست پر شہزادہ کو دول یورپ کی طرف سے ایک معتدبہ رقم قرضہ کے طور پر دی گئی تاکہ ابتدائی انتظامات مکمل کرنے میں اسے دشواریاں پیش نہ آئیں۔ ۷ مئی ۱۸۳۲ء کو مسئلہ شرقیہ کے اس باب کو ختم کرنے کے لئے معاہدہ لندن پر تمام دول یورپ کے دستخط ثبت ہوگئے، اور یونان کی جنگ آزادی پر کامیاب انجام کی مہر لگ گئی، جس نے یورپ کے نظام حکومت میں ایک اور عیسائی سلطنت کا اضافہ کردیا۔

۲۰ جنوری ۱۸۳۳ء کو یونان کا پہلا تاجدار بویریا کے عمال حکومت اور بویریا کے سپاہیوں کے ساتھ بندرگاہ ناپولی پر اترا، تاکہ یونانیوں کی وحشت، دہقانیت اور درندگی کو دور کرکے انھیں تہذیب جدید کے نام نہاد فیوض اور برکات سے آشنا کرے۔ لیکن سمرنا اور آئیدین کے گذشتہ ہولناک مظالم کو دیکھتے ہوئے آج کامل ایک صدی گزرنے کے بعد بھی کون کہہ سکتا ہے کہ اس کا یہ مقصد اس وقت تک پورا ہو سکا ہے یا نہیں۔

نقدِ حیات

جناب فراق صاحب گورکھپوری

نہ سمجھنے کی یہ باتیں ہیں نہ سمجھانے کی — زندگی اچٹی ہوئی نیند ہے دیوانے کی
کم نہیں کچھ غمِ پنہاں ترے ناکاموں کی — کس کو فرصت ہے ترے ہجر کے غم کھانے کی
نگہِ یاس کسی مست کی کیوں آئے نہ یاد — ساقیا آہ وہی روح تھی میخانے کی
زندگی میں دلِ برباد کے ھوے بیچین — پھر ہوائے چمنِ عشق نہیں آنے کی
کھینچ کے رکھدی تری لغزشِ مستانہ نے — ایک تصویر چھلکتے ہوئے پیمانے کی
کیا ہے یہ سلسلۂ ہستیٔ پیچیدۂ دہر — ایک اتری ہوئی زنجیر ہے دیوانے کی
صبح کو دیکھ جو عالم ہے سرِ شمعِ خموش — رہ گئی بات سرِ بزم تو پروانے کی
پردۂ یاس میں امید نے کروٹ بدلی — شبِ غم تجھ میں کمی تھی اسی افسانے کی
چھپ گئی شمع سرِ طور تماشائی سے — داستاں کہتی ہوئی سانس اکھڑ جانے کی
اب کسے نیستی کہئے کسے ہستی کہئے — زندگی مجھ کو قسم دیتی ہے مر جانے کی
دامنِ ابر میں کیا برق کا چھپنا دیکھیں — ہم نے دیکھی ہیں ادائیں تری شرمانے کی

غفلتوں سے مری دنیا ہوئی بیدار فراق
ایک تصویر ہوں میں رات کے کٹ جانے کی

ہم خدا کو کیوں نہ آزمائیں

میری پکفورڈ کے ایک معرکۃ آلارا حقایق آفریں مضمون کا آزاد ترجمہ

جناب محمود الحسن صاحب صدیقی بی، اے (علیگ)

فرض کیجئے کسی بینک میں آپ کے حساب میں چند ڈالر جمع ہیں لیکن آپ کو اتنی بھی آگہی نہیں کہ چک بھی لکھ لیں تو وہ ڈالر آپ کے کس کام آئیں گے۔

اور دیکھئے اگر موٹر خانہ میں آپ کا موٹر بند ہو جائے، اور موٹر خانہ کی چابی آپ کے پاس سے کھو جائے تو اب اپنی منزل مقصود پر جلد سے جلد کس طرح پہونچ جائیں گے؟

آج انسانیت ہستئ باری تعالیٰ کے متعلق جس گمراہی میں مبتلا ہے اس کا تطابق کچھ ان ہی دو مثالوں سے خوب ہوتا ہے آپ خود مرا اپنا واقعہ سنئے۔

چند سال ہوئے جبکہ میں غیر معمولی آلام و افکار کا شکار تھی مجھے اس عظیم الشان طاقت کی طرف خود بہ خود رہبری حاصل ہوئی۔ اور مجھے محسوس ہوا کہ ایک طاقت ایسی موجود ہے جس سے مجھے وہ ہر چیز مل سکتی ہے جس کی مجھے ضرورت ہے۔ اور آج اس حقیقت پر میرا راسخ اعتقاد ہے کہ ایسی رحیم وکریم طاقت موجود ہے جو ہر موقع پر میری رہبری کرے گی ہر موقع پر مجھے تسلی دیگی اور آلام ومصائب کے طوفان میں میرے لئے راحت ومسرت کے اسباب پیدا کرے گی۔ ان حالات میں جبکہ میرا قلب افراط افکار سے مجروح ہو رہا ہوگا۔

اب اس بصیرت کا راز سنئے، جو مجھے حاصل ہوئی۔ میں نے خود اپنی ذات میں اس متجسس طاقت کا پتہ لگالیا۔ وہ طاقت کیا ہے۔ وہ "صداقت خیال" ہے۔

اور یقین کیجئے کہ اس دریافت کے بعد مجھے ناقابل بیان روحانی مسرت، اور وہ حقیقی روشنی حاصل ہوئی جسے کہ میں چاہتی ہوں کہ میرے ساتھ ہر شخص جو تلاش حقیقت میں سرگردان ہے



جناب سید انیس الدین احمد صاحب رضوی امروہوی
ایم۔ اے آنرز (علیگ)
سابق اڈیٹر علی گڑھ میگزین (۱۹۲۸—۱۹۲۹)



جناب محمود الحسن صاحب صدیقی بی۔ اے (علیگ)
مدیر [illegible] دہلی
سابق اڈیٹر علی گڑھ میگزین (۱۹۲۷—۱۹۲۸)

حاصل کرے۔

اس سے پہلے بھی مجھے اس اصول کا علم تو تھا کہ ہم کو جتنا ممکن ہو خوش رہنا چاہئے مصائب کا مقابلہ دلیری کے ساتھ کرنا چاہئے۔ اور کسی تکلیف پہونچنے پر بجائے آہ وزاری کے مسکرانا چاہئے لیکن یہ اصول ایک فلسفیانہ اصول تھا۔ اور اُس پر عمل درآمد اگر ممکن ہو تو زندگی کے خوشگوار حالات میں ہی ہو سکتا تھا۔ میں اس سے واقعی طور پر مطمئن نہیں تھی بلکہ اس دن کا انتظار کر رہی تھی جب حقیقت خود بخود ہم پر روشن ہو جائے۔ اور میں قانع اور زندہ دل نظر آؤں۔

مجھے اس وقت یہ نہیں معلوم تھا کہ صداقت خیال ہی وہ کنجی ہے۔ جو خدا تک رسائی کے لئے ضروری ہے۔ جس سے تم اپنے آپ کو اس مبدأ اصلی سے قریب کر سکتے ہو۔ اور اس کو اس پر قدرت ہے کہ حالات کو خواہ وہ کیسے ہی پیچیدہ اور نازک کیوں نہ ہوں، ہمارے موافق تبدیل کر دے۔ ممکن ہے کہ یہ تبدیلی بالکل اس نوعیت سے نہ ہو جس طرح ہم چاہتے ہیں لیکن وہ یقیناً اس طرح تبدیل ہوں گے کہ نتیجہ میں بالآخر ہمارے لئے بہتر ہوں اور صداقت خیال ہی وہ قوت ہے جس کے ساتھ ہم کو مبدأ حقیقی سے وہ بصیرت اور وہ قابلیت عطا ہوتی ہے جس کی امداد سے پریشان کن حالات میں ہم اپنی ہمت کو بحال اور امید افزا مستقبل کے تخیل سے اپنے آپ کو مسرور رکھ سکتے ہیں۔

مجھے ایک واقعہ اس موقع پر یاد آیا۔

کچھ عرصہ ہوا ایک لڑکی میرے پاس آئی۔ اور مجھ سے کہا:۔

"میری! میں انتہائی غمزدہ ہوں۔ انتہائی مصیبت میں ہوں، اور اس سے نجات کی کوئی تدبیر میرے سمجھ میں نہیں آتی۔ مجھے معلوم ہے تمہارے پاس کوئی عمل ہے۔ جو تم کو اس وقت بھی خوش اور مطمئن رکھتا ہے جبکہ بظاہر حالات تم مشکلات، اور پریشانیوں میں گھری ہوئی ہو، کیا اس سے کچھ مجھے بھی مدد ملے گی؟ میں بالکل مایوس ہو گئی ہوں"

میں نے اس سے کہا:۔ ہاں، میں جس چیز پر عامل ہوں وہ ہر اس شخص کی مدد کریگی جو اس کا متلاشی ہو۔

"لیکن! میری! تمھیں معلوم ہے کہ میں مذہبی خیال کی آدمی نہیں۔ میں خود خدا کی ہستی پر بھی ایمان

نہیں رکھتی،،

میں نے اس سے کہا:- "میں خود مذہبی خیال کی انسان نہیں تھی؛ وہ خدا کا جو تخیّل اس وقت میرے ذہن میں تھا۔ میں خود اس تخیّل سے متنفر تھی۔ میں نے اس کو اپنے لڑکپن کا ایک واقعہ سنایا۔

"میں ایک لالٹین کے کھمبے کے نیچے لیٹی ہوئی تھی اور بہت ہی رنجیدہ خاطر تھی میری ماں نے مجھ سے کہا۔ "تم یہاں کیا کر رہی ہو؟"

"میں خدا سے نفرت کر رہی ہوں" میں نے کسی قدر زور دے کر کہا،

میری ماں جو ایک خدا پرست عیسائی خاتون تھی اس کلمۂ کفر سے خوفزدہ ہوگئیں۔ لیکن ان کی خدا پرستی اور مذہبیت بھی خدا کے تخیّل کو میرے دماغ سے نہ بدل سکی۔

وہ تخیّل کیا تھا، ایک نہایت ہی ترش رو اور جابر قہار انسان کا تخیّل، جو عناد اور ذاتیات سے ملوث، مجھے بتایا گیا تھا کہ اگر میں اپنی ماں سے اس سے زیادہ محبت کرنے لگوں تو وہ مجھ سے ناراض ہو جائے گا۔ وہ مجھے بہت سی معمولی فروگذاشتوں پر سزا دے گا۔ اس سے ماورا میرا یہ بھی خیال تھا کہ خدا نے بہت سے نیک اور اچھے آدمیوں کے ساتھ بدسلوکی کی۔

میری ایک بچپن کی ساتھی۔ یکایک مرگئی۔ اور اپنی ماں، باپ، اور بہن بھائیوں کو اپنے غم میں مبتلا چھوڑ گئی۔ لوگوں نے مجھ سے کہا خدا کا حکم یہی تھا۔ میرے دل میں ایسے خدا سے بغاوت کا جذبہ پیدا ہوا اور میں نے طے کر لیا کہ میں منافق نہ بنوں گی۔ میں ایسے خدا سے محبت نہیں کر سکتی میں اس سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتی، مجھے اس کے طریقۂ کار پسند نہ تھے مجھے معلوم ہے اس قسم کے خیالات بہت سے لوگوں کے ہیں خصوصاً نوجوان آدمی عموماً ایسے خیالات میں مبتلا ہیں۔ لیکن زندگی کا یہ دور گذر گیا میرے تجربات زندگی وسیع ہوتے گئے۔ میں نے انتہائی مسرت کے لمحات بھی دیکھے میں نے انتہائی کلفت کو بھی برداشت کیا۔ بہت سی وہ نعمتیں جن کے لئے لوگ خواب دیکھتے میرے اردگرد نہایت بہتات سے میسر تھیں۔ لیکن کامیابی، شہرت، دولت، اور تمھارے بہت سے اچھے اور غم گسار دوست یہ سب تمھارے لئے بیکار ثابت ہوتے ہیں۔ جب تم کسی روحانی اور جذباتی اذیت میں مبتلا ہوتے ہو اور جب

فکر اور مایوسی کی گھٹا ایک نہایت ہی تاریک سخت کہر کی طرح تمھارے دل پر چھا جاتی ہے لیکن یہ سب ایک نظری دہوکا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تم کو راستہ کی جو منتہا نظر آئی ہے وہ راستہ کا صرف ایک موڑ ہے جس کو تم اپنے سفر کا اختتام سمجھ رہے ہو۔ وہاں سے ایک دوسری منزل سفر شروع ہوتی ہے ایک نہایت ہی دلچسپ اور دل آویز سفر۔ اسی قسم کے ایک راستہ کا موڑ تھا یا زندگی کا ایک غمناک رُخ جہاں پہونچ کر مجھے اس حقیقت کبریٰ کی معرفت حاصل ہوئی اور مجھے محسوس ہوا کہ میں خدا کا ایسا تخیل لئے پھرتی ہوں جو مضحکہ خیز ہے اس لئے پہلا قدم تو یہ تھا کہ میں نے اس تخیل کو بالائے طاق رکھدیا۔

دوسرا جذبہ یہ تھا کہ میں یہ معلوم کروں کہ "آخر خدا ہے کیا" اور اس کا میری ذات کے ساتھ کیا تعلق ہے اور یہی ایک عظیم الشان کارنامہ کی ابتدا تھی۔

یہ تھی تلاش حقیقت،

اپنی ذات میں، اپنے کاموں میں۔ ان لوگوں میں جن کا ہم سے کوئی تعلق تھا اور ہر چیز میں ہے جو میرے ارد گرد تھی۔

اور اس تلاش کے بعد۔

خدا کا تخیل میرے ذہن میں نہایت مہیب، ڈراونا، طاقتور، "دیوتا" آسمانوں کی بلندیوں پر یہ نہیں رہا۔

بجائے اس کے میرے ذہن اور تجسس نے مجھے خدا تک رہبری کی، وہ میرے نزدیک تک آگیا، ایک عقل کُل، ایک محبت مجسّم۔

تمہارا ناصر، مددگار، جو ہر جگہ، ہر وقت تمھارے ساتھ ہو، کائنات میں سمایا ہوا ہو اکے ہر ذرہ میں پنہاں ہو۔ وہ ہوا جس کو میں سانس کے ذریعہ سے اپنے جسم میں پہونچاتی ہوں۔

اس کے بعد میں نے خدا کے عنصر کو دوسرے لوگوں میں ڈھونڈا۔ حالات میں واقعات میں، جتنا زیادہ غور و تعمق سے اسے ڈھونڈا اتنی ہی وضاحت سے میں نے اسے پایا اور مجھے بے پایاں مسرت حاصل ہوئی

اب خدا میرے لئے، میرا آقا ہی نہ تھا۔ بلکہ میرا رفیق، جس کو میری نظریں نہیں دیکھ سکتیں میرا خاموش شریک، میرا مشیر و صلاح کار۔

وہ ہر وقت میرے ساتھ ہے۔

یہ میرے لئے بالکل صاف اور واضح حقیقت تھی کہ کائنات کی تخلیق صرف ایک دماغ اور ایک عقل کا نتیجہ ہے اور اس دماغ اور عقل کامل تک میری بھی دسترس ہے۔ آپ کی بھی، اور ہر شخص کی ہو سکتی ہے۔

یہی ہمارے اوپر حکمراں ہے، اپنی حکمت بالغہ کے ساتھ اور کامل یکسانیت کے ساتھ اس عقیدہ پر قائم ہو جانا اس شخص کے لئے فی الوقت دشوار ہوگا جو مصائب و افکار میں مبتلا ہے۔ اس کو اس کا یقین دلانا ہی دشوار ہے۔ لیکن اس کی مثل ایسی ہی ہے جیسے کہ کیلیفورنیا میں کسی بچوں کے مدرسہ میں استاد نے بچوں سے کہا۔ خدا ہر جگہ ہے۔ ایک بچہ نے بے ساختہ کہا "کیا جیل خانہ اور قید خانہ میں بھی؟"

قبل اس کے کہ استاد کوئی جواب دے دوسرا بچہ بول اٹھا "بیشک خدا وہاں ہے لیکن وہ بدبخت اسے پہچانتے ہی نہیں۔"

اور بالکل اسی نتیجہ پر میں پہونچی۔ بیشک خدا ہر چہار طرف موجود ہے لیکن ہم کو اس کا ادراک ہی نہیں،

ہم دنیا کی ہر بھلائی کے مالک ہو سکتے ہیں اگر ہم اپنے وجود کو خدا کے ساتھ ہمساز کر سکیں۔ اور اپنی ہستی کو خدا سے ہمساز کرنے کا ذریعہ واحد ہماری خیالی قوت ہے۔ لیکن بعینہٖ بجلی کے سوئچ کی طرح اگر ہم اسے نہ دبائیں ہم بجلی سے کوئی فائدہ نہیں حاصل کر سکتے۔ اسی طرح ہم انعامات خداوندی سے بہرہ اندوز نہیں ہو سکتے تا وقتیکہ ہم اپنی خیالی قوت سے کام نہ لیں۔ اگر اس کے وجود سے باخبر نہ ہوں تو اس کے یہ معنی نہیں کہ سرے سے اس کا وجود ہی نہیں ہے۔ اگر اڈیسن اپنے معملات میں برقی روشنی کی تجربات نہ کرتا تو روشنی ہمارے مصرف میں نہ آتی۔ لیکن بجلی کا وجود پھر بھی تھا اور رہتا۔ اگر مارکونی عالم وجود میں نہ آتا تو بھی "وائرلیس" اپنی جگہ پر برقرار رہتا اگر الیگزنڈر گراہام نہ پیدا ہوتا تو بھی ٹیلیفون اپنی جگہ پر رہتا۔

لیکن ہم ان چیزوں کے فوائد سے محروم رہتے۔ محض اسلئے کہ ان سے ہم واقف نہ تھے۔ اسی طرح میں اس پر ایمان رکھتی ہوں اور اس کو ثابت بھی کر سکتی ہوں کہ خدائے برتر کا وجود یقیناً برحق ہے اور جب ہم چاہیں اس سے ہر وقت اور ہر جگہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ بشرطیکہ ہم اپنی صداقت خیال سے کام لیں۔ کم از کم ہم کوشش تو کریں، اس سے ہمارا کوئی نقصان نہیں۔ ممکن ہے کہ ابتداء میں ہمیں کامیابی نہ ہو۔ اور عرصہ تک نہ ہو۔ لیکن ہماری کامیابی کی وجہ یہ ہوگی کہ ہم اپنے آپ کو خدا تک پہونچنے کے لئے تیار نہ کر سکے ہونگے اور جس وقت ہم اپنے آپ کو اس تک پہونچنے کے لئے تیار کرلیں ہم اس تک پہونچ جائیں گے۔ جس طرح ایک "امپریز" بجلی کی مشینوں کو استعمال کرنے کی مہارت پیدا کرنے کے بعد ان کے استعمال پر خوب قادر ہو جاتا ہے برقی قوت کے سب سے بڑے ماہر چارلس اسٹین مٹز (Stein Mitz) سے راجر باپسن (Rodger Bopson) جو کاروباری اعداد و شمار کا ماہر ہے دریافت کیا تھا آئندہ پچاس سال کے اندر علمی تحقیقات کا کارنامہ کیا ہوگا بجائے اس کے کہ وہ برقی قوت کے سلسلہ میں کسی نئی دریافت کی خبر دیتا۔ اس نے کہا "سب سے بڑی دریافت علمی جو ہوگی وہ روحانی حیثیت سے حقایق کا انکشاف ہوگا" اس جواب کی وضاحت کرتے ہوئے اس نے کہا۔

"یہاں ایک عظیم الشان طاقت کارفرما ہے۔ اور انسانی تاریخ و تمدن اسی طاقت کا رہین منت ہے لیکن انسان اس سے کھیلتا رہا ہے۔ اس کو سمجھنے کی اس نے پوری قوت کے ساتھ کوشش نہیں کی لیکن ایک دن آئیگا جب انسان اس نتیجہ پر پہونچ جائیگا۔ کہ مادی وسائل حقیقی مسرت کو نہیں پیدا کر سکتے۔ اور مادی ترقیوں سے انسان میں تخلیقی قوتوں کا اضافہ نہیں ہوتا۔ اس وقت دنیا کے سائنس داں اپنی تجربہ گاہوں کو خدا، دعا، اور روحانی قوتوں کے مطالعہ اور تجسس کے لئے وقف کردیں گے جن کو انسان نے ابھی چھوا بھی نہیں ہے۔ اور اس وقت انسان کی ایک نسل اتنی ترقی کی منزلیں طے کرے گی کہ گذشتہ چار نسلوں نے بھی مجموعی طور سے اتنی ترقی نہ کی ہوگی" ہم خود ہی یہ کیوں نہ سمجھ لیں کہ وہ نسل ہم ہی ہیں۔ اور وہ وقت ہمارا ہی زمانہ ہے

زمانۂ جدید سے اس کے برخلاف ہم دوسرے طریقوں پر کاربند ہیں۔ ہم نے اب تک زمانۂ جاہلیت کے "تنازع للبقا" کے حیوانی اصول پر عملدرآمد کیا ہے۔

جنگیں، لڑائیاں، کشت وخون، بیرحمی، بربریت، اور ظلم وستم اپنے چاروں طرف دیکھتے ہیں۔ اور نتیجہ کیا ہے؟۔

مایوسی، بے اطمینانی، بے ایمانی، ناکامیاں، اقتصادی تباہیاں مصائب اور پریشانیاں۔ ہم میں سے ہر شخص اس قسم کے مصائب میں گرفتار ہے۔

ان حالات میں ہم خدا کی طرف کیوں نہ جائیں۔ اس کی طلب کیوں نہ کریں۔ کم از کم آزمائش ہی کے طور پر۔

ہم میں سے ہر شخص کی زندگی ایک تخیّل مسلسل کہی جا سکتی ہے اور یہی اس کا ماحصل ہے۔

یعنی جب ہم کسی شے کا خیال کرتے ہیں ہم اس کو عمل میں بھی لاتے ہیں۔ اور جب ہم اس کا خیال ہی نہیں کرتے تو ہم سے اس کا واسطہ ہی نہیں ہوتا۔

دنیا میں تمام خیر وشر نتیجہ ہے ہماری نیک خیالی یا بدخیالی کا۔ اور ہم میں سے ہر شخص خیر وشر کے مجموعہ میں اپنی طرف سے کچھ نہ کچھ اضافہ کرتا رہتا ہے۔

جب ہمارے خیال میں صداقت اور نیکی پیدا ہوتی ہے ہمارا خیال اس کی روشنی سے منور ہو کر انوار الہٰی کے لئے جلوہ گاہ بن جاتا ہے۔ اس وقت ہم اچھے نتائج دیکھتے ہیں۔ اور حقیقی مسرت، کامیابی، اور صحت سے ہمکنار ہوتے ہیں۔

لیکن جب ہم اپنے دماغ کو اس کے لئے اس طرح تیار نہیں کرتے تو مشکلات ومصائب سے ہم کو سامنا کرنا پڑتا ہے۔

کسی حکیم کا قول ہے:۔

"ہم اپنے خیالات ہی کو اپنے مشاہدات کی صورت میں پاتے ہیں اور یہی خیالات بیرونی صورت میں آکر ہمارے ماحول سے متعلق ہو جاتے ہیں اور یہی آگے چل کر ہمارے تجربات زندگی میں داخل ہو جاتے ہیں اس بنا پر ہمارا ماحول وہی ہے جو ہم اپنے دماغ میں پیدا کر چکے ہیں یہ کیسے ممکن ہے کہ ہمارا تخیّل کسی دوسری طرف ہو اور ہمارے تجربات زندگی کی سمت دوسری ہو"

خیال ہی ایک ایسی چیز ہے جس میں کوئی دنیاوی طاقت دخل انداز نہیں ہوسکتی۔
کوئی حکومت کوئی بنک، کوئی شخص، اور دنیا کی کوئی شے ہمارے خیال کے راستہ میں حارج نہیں ہوسکتی وہ راستہ جو ہم اپنے لئے پسند کریں، ہماری قوت خیال ایک ریڈیو سٹ کی طرح ہے آپ چاہیں تو اُسے کھول کر اس کو نیکی کے لئے تیار کردیں، یا آپ چاہیں بدی کی طرف اس کا رُخ پھیر دیں۔
دنیا میں کوئی شے تمہارے دل میں ناکامی اور پریشانی کا احساس پیدا نہیں کرسکتی جب تک تم خود اس کا خیال نہ کرو۔
جو شے ہمارے خیال میں موجود ہوتی ہے۔ وہی چیز حقیقت ہوکر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ اور وہی ہمارے تجربات زندگی میں شامل ہوجاتی ہے ایک قابل عزت خاتون (جن سے میں واقف ہوں) کے شوہر کا انتقال ہوگیا۔ ان دونوں میں آپس میں بیحد محبت تھی، اور دونوں باہم بہت خوش تھے۔ جب میں نے اس واقعہ کے چند ماہ کے بعد اس خاتون کو دیکھا تو میں نے اُس میں عجیب قسم کا اطمینان اور اعتماد پایا جو میرے لئے بھی بصیرت افروز تھا۔ میں نے اس سے دریافت کیا کہ یہ کیفیت اس کو کس طرح حاصل ہوئی۔
اس نے جواب دیا۔
"سمندروں کا تمام پانی ایک جہاز پر کچھ بھی اثر انداز نہیں ہوسکتا۔ جب تک اس کو اس میں داخل ہونے کی جگہ نہ مل جائے۔ اسی طرح دنیا کا تمام غم و الم انسان پر کوئی اثر نہیں ڈال سکتا جب تک وہ اس کے دماغ میں جگہ نہ حاصل کرلے۔"
"آدمی جیسا اپنے دل میں سوچتا ہے، وہ ویسا ہی ہے۔"
"اس لئے میں نے اپنے دماغ کو دوسرے اچھے اور خوشگوار خیالات میں اتنا مشغول کر رکھا ہے کہ اس میں غم اور رنج کے پہونچنے کی گنجائش ہی نہیں رہی ہے۔"
اس خاتون کے اس جواب کے بعد میں نے خود اسی اصول سے خوشی حاصل کی ہے اور میں نے اس کو کامیاب پایا ہے۔

میری زندگی عام عورتوں سے بہت مختلف ہے مجھے تنہائی میں اپنے مسائل حیات سے سابقہ نہیں پڑتا۔

میں جو کچھ کرتی ہوں تمام دنیا کے سامنے۔ میرا پیشہ مجھے اس پر مجبور کرتا ہے تمام دنیا جانتی ہے کہ میری ذاتی، خانگی، اور پیشہ کی زندگی کیا ہے۔ اس لئے میں بے بنیاد افواہوں، غلط الزامات اور عاجلانہ فیصلوں، اور رائے زنیوں کا ہدف بنی رہتی ہوں۔

لیکن میں نے اس پر قدرت حاصل کر لی ہے کہ یہ چیزیں میرے دماغ میں نہ پہونچنے پائیں اور جتنا سخت مرحلۂ زندگی میرے سامنے آتا ہے اتنی ہی زیادہ سخت کوشش میری ہوتی ہے کہ میں اس میں فیضان الہٰی کے عنصر کو پاؤں۔

میں لوگوں میں متعلقہ اشیاء میں خدائی عناصر کو تلاش کرتی ہوں۔ میں ان کا اسی طرح خیال کرتی ہوں جس طرح میری خواہش ہوتی ہے کہ وہ میرا خیال کریں۔

کچھ برس گذرے میں اور مسٹر فرنیک چین میں تھے۔ ہم چین کے ایک پروفیسر اور ان کی بیوی کے مہمان تھے۔ ایک دن پروفیسر صاحب نے ہم کو چین کا ایک مشہور قدیم دروازہ دکھانے کے لئے مدعو کیا۔

یہ دروازہ چین کی سب سے زیادہ قدیم اور خوبصورت عمارتوں میں سے ہے۔ ان کی بیوی نے کہا۔

"ان کو وہاں نہ لیجانا۔ دروازہ تو واقعی بہت خوبصورت ہے لیکن وہاں ایسے گندہ اور خراب لوگوں کا مجمع رہتا ہے کہ میں تو اس کو دیکھ ہی نہ سکی"۔

دونوں کے فکر رسا کے فرق کو دیکھئے۔

شوہر نے دروازہ کی خوبصورتی اور عظمت کو دیکھا۔ اور بیوی نے اس کے نیچے محض لوگوں کی گندگی اور غلاظت کو دیکھا۔

اسی طرح ہماری زندگی میں بعض نہایت حسین عناصر ہیں جن کو ہم نہیں دیکھتے ہم دیکھتے ہیں تو کیا۔ حقارت مشکلات۔ ناخوشگوار اشیاء۔ ہم ان کے تخیل میں ڈوب جاتے ہیں۔ یہی ہمارے خیال پر مسلط

ہو جاتے ہیں۔ اور پھر بھی ہمارے تجربات کی صورت میں ظاہر ہوتی ہیں۔

"آدمی جیسا اپنے دل میں سوچتا ہے وہ ویسا ہی ہے"۔ اگر تم بھی کوشش کرو تو اسی اصول کا تم کو بھی مشاہدہ ہو جائیگا اور تم کو اس کی صداقت پر یقین آ جائیگا۔ ممکن ہے کہ تم اس کو محض ایک دلچسپ تخیل سے زیادہ اہمیت نہ دو۔

کیا تم یہ سمجھ رہے ہو کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس وقت جو کچھ ہم پر گذر رہا ہے وہ نتیجہ ہے اس کا جو اب تک ہم اپنے دماغ میں لئے رہے۔

اور کیا تم یہ بھی سمجھ سکتے ہو کہ کل جو تم پر گذرنے والا ہے وہ نتیجہ ہوگا اس کا جو آج تم سوچ رہے ہو۔ ہم اپنے خیالات کے نتائج سے کبھی نہیں بچ سکتے اس لئے ہمارا تعلق بیرونی چیزوں سے اتنا نہ ہونا چاہیے جتنا کہ خود اپنے خیالات سے۔

آیئے ہم اپنے دماغوں کی تجربہ گاہوں کا تجربہ کریں۔

پہلی چیز جس کا تم اپنے دماغ میں احساس کرتے ہو "انا" کا وجود ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس وجود کا تمھیں احساس کیسے ہوا۔ جس وقت تم کو "انا" کا احساس مٹ جائے گا تمھارا وجود ہی ختم ہو جائیگا۔ اس کے وجود کے لئے سب سے پہلی چیز خیال ہے۔ یا قوت تخیل۔ انسان سے اس قوت کو علیحدہ کر دو۔ اور اس میں کچھ بھی نہیں رہ جاتا۔

تمھارا دماغ تمھارے وجود کا احساس رکھتا ہے۔ اور وہی تمھاری تعمیر کرتا ہے تمھاری قوت خیال ہی وہ ذریعہ ہے جس کی وساطت سے ہر چیز تم کو پہونچتی ہے۔ اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ گئی کہ خیال انسان کے قبضہ میں سب سے زیادہ طاقتور اور ضروری عنصر ہے۔ اور یہی وہ عنصر ہے۔ جو زندگی جیسی بیش بہا اور عجیب و غریب سمت سے ہمارا تعلق قایم رکھتا ہے۔ اس بنا پر اب آپ کیا "قوت خیال" کو ہر چیز سے مقدم نہیں سمجھیں گے۔ اور کیا یہ خیال "احمقانہ خیال" کہلائے جانے کا مستحق نہیں۔ کہ اتنی زبردست قوت اور اتنی اہم اور ضروری قوت کو اتنا کمزور سمجھ لیا جائے کہ اس کو جسمانی قوا، حالات اور بیرونی اسباب کے ماتحت سمجھ لیا جائے۔ اور جو قوت ہم کو حاصل ہے اس سے ہم کوئی کام نہ لے سکیں۔

ہماری مثل اس مسئلہ میں۔ اور زندگی کے اکثر معاملات میں بعینہ وہی ہے کہ گھوڑے کے سامنے گاڑی لیجائی جائے۔ یقیناً خیال کائنات کی سب سے بڑی قوت ہے سہ

"ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے"

اور اس حقیقت مسلمہ کی روشنی میں دیکھئے۔ آپ جہاں ہیں وہیں رہئے۔ خواہ آپ کی موجودہ حالت کتنی ہی مایوس کن، اور پر از محن کیوں نہ ہو کم از کم آپ کے لئے باعثِ اطمینان ایک چیز تو ہے جس کے آپ بھی مالک ہیں وہ آپ کی قوت خیال ہے۔ اور اگر ایک بار آپ کے خیال ہی نے آپ کو مصائب و مشکلات میں مبتلا کر دیا ہے تو پھر اسی کی مدد سے آپ ان مشکلات و پریشانیوں سے نکل بھی سکتے ہیں اور اگر کوئی چیز ان مشکلات میں سے آپ کو نکلنے نہیں دیتی تو وہ آپ کا خیال ہی ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ آپ کے خیال تک کسی کی دسترس نہیں۔ اپنی دنیائے تخیل کے آپ ہی قائد اعظم ہیں۔ اور یاد رکھئے کہ جو کچھ آپ خیال کر لیتے ہیں وہی دنیائے عمل میں نافذ ہوتا ہے۔

ہم خود اپنے قیود و حدود معین کرتے ہیں۔ ہم خود اپنے تخیل اور اپنے تجربات کے حدود وضع کرتے ہیں۔

ہم اس دلفریب کائنات کے متعلق جو ہم پر چھائی ہوئی ہے کسی قدر کم معلومات رکھتے ہیں۔

سر جیمز جینس (Sir James Jeans) جو ایک مشہور عالم سائنس ہیں۔ اور جنھوں نے علم ہیئت کے متعلق عجیب و غریب انکشافات کئے ہیں۔ ایک مرتبہ انھوں نے کہا تھا:۔

"یہ کائنات ایک بڑی مشین سے زیادہ ایک عظیم تخیل سے قریب ہے"

جب ان سے کہا گیا کہ کیا ان کی مراد اس سے یہ ہے کہ "یہ کائنات ایک خیال کا نتیجہ ہے" تو انھوں نے وضاحتہً کہا:۔ "اس کو ایک قیاس کے طور پر کہہ رہا ہوں۔ علمی حقیقت کے طور پر نہیں۔ کہ تمام کائنات اور اس کی تمام مادی اشیاء، اجزائے لاتیجزیٰ، ستارے، اور ستاروں کے مجموعے یہ سب صرف ایک عظیم الشان تخیل کی تخلیق ہیں۔ میرے اور آپ کے خیال کی نہیں بلکہ اس ہمہ گیر وسیع دماغ کی جو ہمارے دماغوں کو متوازن اور ایک دوسرے سے متعلق رکھے ہوئے ہے۔"

سائنس کا علم و مشاہدہ بھی اسی نقطہ کی طرف جا رہا ہے۔"

اس عالم سائنس نے ایک دوسرے موقعہ پر کہا تھا کہ :۔

"ہر انفرادی شعور و احساس ایک وسیع ترین اور ہمہ گیر عقل و دماغ کا جزو ہے۔ اب ماہرین سائنس تخلیق مادہ کی تحقیقات کرتے ہوئے اس نتیجہ تک پہونچے ہیں کہ مادہ کی تحلیل کرنے کے بعد ایک جزو لاتجزی ایسا باقی رہ جاتا ہے جو ایتھر یا فضائے لطیف سے مرکب ہے یہاں پر آکر علما رسائنس رک جاتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ کونسی طاقت ہے جو ایتھر کو ہمارے وجود میں داخل کر دیتی ہے۔ اور اس عظیم الشان مرتب و منظم، نظام کائنات کی اسی ایتھر سے تخلیق کرتی ہے جس میں انسان آباد ہیں۔ ستاروں کو کونسی قوت قائم رکھے ہوئے ہے جو ایک بیج سے شاہ بلوط کا عظیم الجثہ درخت پیدا کر دیتی ہے سورج کو افق پر ہر صبح کو کون نمودار کر دیتی ہے۔ تم جو چاہو اسے سمجھ لو لیکن یقیناً عقل سلیم کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اس نتیجہ پر پہونچیں کہ خدا ہی وہ عظیم الشان، باحس، ہمدرد، اور تخلیقی مرکزی قوت ہے۔ اس کے عقل و شعور میں تخلیقی قوت اور وسیع ہمدردی پنہاں ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ہمارا رشتہ خدا سے کیا ہے۔ ہمارے پاس وہ کونسی قوت ہے جس سے ہم اس طاقت عظمیٰ سے فائدہ اٹھا سکیں۔ جس نے اس کرۂ ارضی پر ہماری ضروریات کی تمام چیزیں جمع کر دی ہیں۔

خدا کی ذات ہر وقت حاضر و ناظر ہے، اگر تم اس کے فیضان سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہو تو اپنے خیال کو صداقت اور نیکی کے ساتھ اس کے لئے تیار کرو۔ تمہارے خیال میں ہمدردی ہو خود غرضی نہ ہو۔ تو تم کو اس کے لافانی خزانہ سے محبت ہمت اور سرگرمیٔ عمل اور مسرت حاصل ہو گی۔ خدا کے کرم و لطف سے تم بہرہ اندوز ہو گے۔

مجھے ایک کم عمر لڑکے کا واقعہ یاد ہے۔ اس بچہ کی تربیت سخت مذہبی ماحول میں نہیں ہوئی تھی۔ تاہم اس کو خدا سے لگاؤ تھا۔ اور خدا پر اس کو مضبوط اعتقاد تھا۔ اس کے کان میں ایک بار کچھ تکلیف پیدا ہو گئی۔ ڈاکٹروں نے کہا :۔ کہ کان کی حالت خراب ہو گئی ہے۔ اور اپریشن کی ضرورت ہے۔" خدا پر اعتقاد رکھنے والے لڑکے نے ڈاکٹر کو تو کوئی جواب نہیں دیا۔ لیکن اس نے بعد میں نہایت اطمینان سے کہدیا کہ اپریشن کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

"ماما"، اس نے اپنی ماں سے کہا۔ "خدا نے میرے کان کو بنایا تھا، اور اب کیا اس کی یہ قدرت نہیں کہ وہ اس کان کو معمولی مرض سے اچھا کردے۔" دوسری مرتبہ جب ڈاکٹر کو دکھایا گیا تو کان میں کوئی شکایت نہ تھی اس بچے کے قول کے مطابق خدا اگر وہی خدائے قادر توانا ہے جس نے ہم کو زندگی دی، ہمارے اعضا کو بنایا، ہمارے وجود کو مکمل کیا جس کا مقصد ہے کہ ہم دنیا میں زندگی بسر کریں۔ کیا وہی خدا ہماری صحت وسلامتی پر قادر نہیں ہے۔

لیکن ہم کو اس سے روحانی تعلق پیدا کرنا چاہیئے۔ اور اس کے لئے اپنے آپ کو ہموار کرنا چاہیئے تاکہ اس کے انوار وفیضان کے قبول کرنے کی صلاحیت ہم میں پیدا ہو جائے۔

ہم کو کسی وقت بھی اس سے اپنی حاجت طلب کرنے میں تامّل نہیں کرنا چاہیئے۔ یہ ہمارا حق ہے کہ ہم اس کے تمام افضال وعنایات سے بہرہ اندوز ہوں۔ آج ہی، اس لمحہ میں، ہم کو اپنی طلب کو ملتوی کرنے کی ضرورت نہیں ہم بہشت کا بھی کیوں انتظار کریں۔ جب وہ ہم کو اسی زندگی میں حاصل ہو جائے بہشت جب ہم کو یہیں مل جائے اور اپنے خیال کے حدود میں ہی۔ اگر ہم چڑچڑے مشکوک۔ خوفزدہ، غصہ ور اور متفکر ہیں۔ تو ہم شر اور برائی کے متوقع ہیں۔ ہم نے اس کے لئے دروازہ کھول دیا ہے۔ اور بالآخر یہ ہم تک پہونچ جائے گی کیونکہ یہ اصول اپنے نتائج کے اعتبار سے اٹل ہے اس کے برخلاف اگر ہم خوش ہمت، مسرور، فراخ دل، مخلوق خداوندی کی حیثیت سے اپنے حقوق پر متیقّن ہوں تو اس کا نتیجہ بھی خوشگوار ہوگا۔ ایمان نام ہے خیر اور بہتری کی توقع کا۔ اور خوف مرادف ہے شر کی توقع کا۔ اب توقع کا ذمّہ دار کون ہے؟ تم! تم جس چیز کی توقع رکھتے ہو اس کو اپنے دماغ میں جگہ دیتے ہو۔ اور جو چیز تمھارے دماغ میں جگہ حاصل کرلیتی ہے وہی تمھارے بیرونی ماحول پر اثر انداز ہوتی ہے اور کسی وقت وہی تمھارے تجربات کا جزو بن جاتی ہے۔ تاریخ ان ہی حقائق سے لبریز ہے۔

تو پھر آج ہی سے کیوں نہ اس کو شروع کردو۔ آج ہی سے صحت، بہتات، اور مسرت کی طلب کیوں نہ کرو۔ اب جبکہ آپ اپنے تخیّل کی مشین کو تیار کرکے، اور اپنے خیال میں راستی اور صداقت کی طاقتیں پیدا کرکے اس مرکز اور منبع فیوض سے اپنے آپ کو ہم ساز کرنے کے لئے تیار ہوں گے تو آپ کو چند تبدیلیاں

سے مقابلہ کرنا پڑے گا۔ میں آپ کو بتاؤں گی کہ وہ شیاطین کون کون سے ہیں۔ سب سے پہلی شیطان تو ایک صاحبہ ہیں جن کو میں نے میڈم فلٹ میگار[1] کا خطاب دیا ہے۔ ان کا عجیب عالم ہے۔ وہ کسی کو خوش خرم نہیں دیکھ سکتیں۔ وہ ہمیشہ دوسروں کے معاملات میں دخل درمعقولات کرتی رہتی ہیں جس وقت یہ حضرت یہ محسوس کرتی ہیں کہ کوئی شخص کسی اچھے کام کا ارادہ کر رہا ہے یا غیر معمولی طور پر مسرور ہے تو آپ ایسا رنجیدہ خیال اس کے دل میں پیدا کرتی ہیں کہ جس سے اس کی خوشی کا مطلع غبار آلود ہو جاتا ہے۔ یہی ذات شریف آپ سے کہینگی "آج تو آپ بیمار سے معلوم ہوتے ہیں۔ کیا واقعی آپ کی طبیعت ناساز ہے" اور یہی آپ سے کہیں گی "تم نے یہ ہیٹ کیوں خریدلی کیسی بھدّی، اور بری معلوم ہوتی ہے" بظاہر تو یہ آپ کی دوست بنیں گی لیکن یہی پھر آپ کا مذاق اڑائیں گی۔ یہ نہایت کمینہ خصلت اور بدخیال واقع ہوئی ہیں۔ ان کا کام یہاں پر ختم ہوجاتا ہے کہ وہ آپ کو متفکر، مغموم، اور رنجیدہ بنادیں۔ اس کے بعد ایک اور حضرت ہیں جن کا نام میں نے پروفیسر فنفو[2] رکھا ہے یہ تمام دنیا کے جھوٹوں کے بادشاہ ہیں۔ اصل میں یہ خود میری تخلیق خیال ہیں یہی میرے خیال میں شیطان کا مجسمہ ہیں۔

مجھے غور و فکر کے بعد یہ معلوم ہوا کہ ہم شیطان کے متعلق بھی اب تک غلط فہمی میں رہے۔ ہم نے شیطان کو بھی زیادہ اہمیت دیدی۔ میں جس چیز کو شیطان کہتی ہوں وہ ہماری جہالت اور ناواقفیت "خیر" اور "شر" میں ہمارا تمیز نہ کر سکتا ہے۔ میں نے کبھی بائبل میں پڑھا تھا کہ شیطان ایک نہایت مہمل اور جھوٹا ہے اور وہ ان ہی لوگوں کو نقصان پہونچاتا ہے جو اس کی مجلس میں بیٹھتے ہیں مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تاریخ نے شیطان کو زیادہ مہیب اور اہم بنادیا۔ اگر شیطان میرے قبضہ میں ہوتا تو میں اس کو مضحکہ خیز بنادیتی اور اس صورت میں پیش کرتی جس میں میں پروفیسر "فنفو" کو پیش کر رہی ہوں۔

پروفیسر "فنفو" کی حماقت ناقابل اظہار ہے۔ مگر تاہم میں آپ کو ان کے متعلق بتاؤں گی ان کو نیم ظریف کہنا

---

[1] میری کیفورڈ نے فلٹ میجیگار" Madam Flit Magigger نام رکھا ہے، میں نے سہولت کے لئے فلٹ میگار" کر دیا ہے۔

[2] اصل مضمون میں یہ نام پروفیسر "پون فنفو" Poon Finfoo ہے سہولت کیلئے پروفیسر فنفو کر دیا گیا ہے۔

بھی ان کی بیجا تعریف کرتا ہے ان کا دماغ ایک ایسے نقطہ تک پہونچتا ہے جہاں صرف تین پر ہیں اور کوئی تعقل نہیں۔ دراصل پروفیسر "فنفو" کے دماغ ہی نہیں آپ کی بینی مبارک نہایت لمبی اور چونچ دار ہے یہ خم جواب کی ناک میں پیدا ہوگیا ہے اس کا نتیجہ ہے کہ آپ خواہ مخواہ دوسرے لوگوں کے معاملات میں دخل در معقولات کرتے رہتے ہیں۔ آپ کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں ہیں جن میں کمینہ پن بھرا ہوا ہے۔ جو ہمیشہ چیزوں کو برعکس دیکھتی ہیں۔ چونکہ آپ میں کیرکٹر مفقود ہے۔ اس لئے آپ کی ٹھوڑی کی ساخت ہی کچھ عجیب بھیانک سی ہے آپ کا دہانہ نیچے کو مڑا ہوا ایک پکے جھوٹے آدمی کا دہانہ معلوم ہوتا ہے۔ آپ کے خاص قسم کے کان ہیں جو ہر چہار طرف کو گھوم سکتے ہیں۔ اور آپ اپنے چاروں طرف کی بری بری باتوں کو سن سکتے ہیں۔ آپ کے ایک سونڈ بھی ہے جو لوگوں کے متعلق ہمیشہ گرم ہوا سے پھولی ہوئی رہتی ہے۔ آپ کی سارس کی سی ٹانگیں ہیں۔ نہایت ہی بھدی، اور آپ کے پیر نہایت ہی بھدے اور بدشکل ہیں جن کے پنچے اوپر کو مڑے ہوئے ہیں۔ آپ کے دُم بھی ہے اور تمام شیطانوں کے دم ہونا لازمی ہے۔ پروفیسر صاحب نہایت غمزدہ، پست حوصلہ اور شکست خوردہ نظر آتے ہیں۔ کیونکہ بہت سے ذہن رسا رکھنے والے لوگوں نے ان کے لئے دروازہ بند کردیا ہے۔ پروفیسر "فنفو" ہر وقت اس فکر میں لگے رہتے ہیں کہ ہمارے دماغوں میں پہونچنے کے لئے ان کو جگہ مل جائے اور وہ کسی شخص کے متعلق آکر ہم سے جھوٹی اطلاع کریں۔ ان کی خواہش رہتی ہے کہ وہ ہم سے کہیں کہ خدا نے اس عالم کو مکمل نہیں پیدا کیا۔ اور نہ خدا اس کی رہبری کرسکتا ہے اور نہ ہماری آپ کی دستگیری کرسکتا ہے۔ اور ساری دنیا میں مصیبت، بدقسمتی اور بدحالی پھیلی ہوئی ہے۔

جس وقت ہم نیند سے بیدار ہوتے ہیں پروفیسر صاحب ہمارے قریب ہی چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔ اور اس فکر میں لگے ہوئے ہوتے ہیں کہ وہ ہمارے دل میں یہ بات اُتار دیں کہ آج کا دن کتنا برا ہے۔ اگر آپ اس سے پست ہمت ہوجائیں تو وہ آپ کے سر پر سوار ہوجائیں گے اور برابر آپ کے ذہن نشین کرتے رہیں گے کہ واقعی آج آپ ویسے چست اور محنتی نہیں ہیں اور آپ ویسے اچھے اور نیک نہیں ہیں پھر آپ ان کی بات کو مان لیں اور اپنے حال اور مستقبل کے متعلق مایوس ہوجائیں اور اپنی گذشتہ غلطیوں کو سوچنے لگیں تو آپ کو واقعی نڈھال کردیں گے۔ وہ آپ کو اتنا معذور و مجبور بنادیں گے کہ آپ اپنی ذات کے

لئے اپنے مستقبل کے لئے اور دُنیا کے لئے بیکار ہو جائیں گے۔ یہ میں کہہ چکی ہوں کہ وہ نہایت ہی جھوٹے اور دھوکہ باز ہیں وہ نہایت مفتری۔ وہ آپ سے یہی کہیں گے کہ تم ختم ہو چکے، تم کچھ نہیں کر سکتے۔ کیونکہ وہ آپ کی پس ماندگی کو محسوس کر رہے ہوں گے وہ آپ سے کہیں گے کہ تم بیمار ہو اور جب بیمار ہو تو بیمار ہی رہو گے وہ آپ سے یہ بھی کہیں گے کہ آپ بہت ہی بڈھے ہو گئے یا بہت بچے ہیں، بہت ناتجربہ کار ہیں آپ کے لئے بہت سی دشواریاں ہیں۔ آپ کے لئے یہ برائی ہے اور وہ برائی ہے اگر اس نے آپ کے دل میں ان خیالات کو راسخ کر دیا تو اس نے آپکو اپنے جال میں پھانس لیا لیکن آپ کو ہرگز اس کے جال میں نہیں پھنسنا چاہئے آئندہ جب کبھی آپکو کوئی مشکل پیش آئے بجائے اس کے کہ آپ اس کو اس صورت میں قبول کر لیں اور اپنی قسمت کا نوحہ کرنے لگیں تو فوراً سمجھ لیجئے کہ یہ پروفیسر فنفو صاحب کی کارستانی ہے۔ یہ آپکی خوشی اور آپ کے بہترین مفاد کے خلاف آپ پر ایک حملہ ہے جب آپ یہ خیال کریں گے تو نتیجہ آپ کو معلوم ہوگا اور آپ اس سے خود متعجب ہو جائیں گے آپ جو دلائل اس کے خلاف پیش کریں گے ان سے آپ خود ہنس پڑیں گے۔ اور جب آپ ہنس پڑیں گے تو آپ کی مشکلات خود بخود کم ہونے لگیں گی۔ اور جلد یا بدیر وہ غائب ہو جائیں گی کیونکہ اس بات کو یاد رکھئے کہ پروفیسر فنفو جھوٹوں کے پیر ہیں وہ کبھی سچ نہیں بولتے انھوں نے جو کچھ آپ سے کہا وہ مطلقاً جھوٹ ہے آپ تاریخ ماضیہ پر نظر ڈالئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ تمام بڑے بڑے آدمی اور عورتوں نے جنھوں نے دنیا میں کارہائے نمایاں کئے وہ محض اس بنا پر کئے کہ انھوں نے پروفیسر فنفو سے کوئی واسطہ نہیں رکھا انھوں نے اس کی بات کبھی نہیں سُنی وہ اپنے خیال و قول پر اس کا کوئی اثر نہ لیتے تھے جب پروفیسر فنفو نے کولمبس سے کہا کہ وہ نئی دنیا کو ہرگز نہ پا سکے گا اور یہ کہ وہ مجنوں ہے کولمبس نے اس کے جواب میں انگڑائی لی اور فنفو کو بالکل نظر انداز کر دیا۔

اسی طرح اگر ابراہیم لنکن نے پروفیسر کی باتوں کو سنا ہوتا اور شکست اور ناکامی کی تجاویز پر کان دھرا ہوتا تو دنیا اس کا نام بھی نہ لیتی۔ اس قسم کی مثالیں تمام تاریخ میں ملتی ہیں۔ فنفو ہر شخص کو مصیبت زدہ دیکھنا چاہتا ہے وہ کسی شخص کو کامیاب ہوتے نہیں دیکھنا چاہتا لیکن یہ یاد رکھئے کہ وہ ہمیشہ ایک ہی

دروازہ سے داخل ہوتا ہے اور یہ دروازہ ہماری مرضی سے اس پر کھلتا ہے۔

آپ ہمیشہ اس بات کو ذہن نشین رکھئے کہ آپ اپنی زندگی کے بادشاہ ہیں یا آپ اپنی زندگی پر خود حکمراں ہیں آپ اپنے خیالات کے ساتھ اپنے تجربات پر بھی حکومت کرتے ہیں یا یوں کہئے کہ آپ اپنی دنیا خیال خود تعمیر کرتے ہیں۔ آپ اپنی شعور اور احساس کے مطلق العنان حکمراں ہیں اور آپ اچھی حکومت کرتے ہیں یا بری اس کا فیصلہ آپ کی تخیل کرتی ہے جس راستہ پر بھی آپ اس کو لیجائیں۔ آپ کے دماغ کے لئے صرف ایک راستہ ہے وہ آپ کا تخیل ہے اور دماغ جس نے آپ کے لئے ہر چیز کو پیدا کیا ہے ہر چیز کی طرف آپ کی رہبری کرتا ہے ہر چیز کو برداشت کرتا ہے وہی آپ کے لئے کام کریگا وہی آپ کی مقصد برآری کرے گا وہی آپ کی دعاؤں کو در اجابت تک پہونچائیگا بشرطیکہ آپ بھی اپنا کام کریں۔ آج کا دن آپ کی زندگی میں نمایاں دن ہے آپ کو اس سے وہی ملے گا جو آپ نے اس کے لئے رکھ چھوڑا ہے۔

اگر آپ نے غلطیاں بھی کی ہیں اور بہت ہی اہم غلطیاں کی ہیں تو بھی آپ کو تلافی کا موقع ہے فرض کیجئے آپ نے کوشش کی مگر ناکام ہوئے تو پھر آپ کو آگے بڑھنے کا اور موقع ملے گا۔ کیونکہ ناکامی جس کا نام ہے وہ گر جانے کا نام نہیں بلکہ ٹھیر جانے کا نام ہے۔ ہم ہمیشہ اس خیال سے قوت حاصل کرتے ہیں کہ ہم خدا کی تخلیق کردہ کائنات کا ایک جزو ہیں۔ ہم اس کا شکار نہیں ہیں۔ ہم میں سے اکثر لوگوں کی توقع یہی ہوتی ہے کہ وہ اس دنیا میں زندگی بسر کریں جس میں بھلائی، محبت، دوستی، خوشی، قناعت، بہتات کامیابی، مسرت، اور تعلقات کی خوشگواری کا دور دورہ ہو اگر واقعی ہم سب اسی کے خواہشمند ہیں تو ہم کو سب سے پہلے اپنے دماغ میں ان چیزوں کی تخم ریزی کرنا چاہیئے کیوں کہ ایک پرانی مثل ہے کہ "جو بوتا ہے وہی کاٹتا ہے"۔

خدا کی بادشاہت کہاں ہے بادلوں کے اوپر، دیو پیکر پہاڑوں کے اس طرف، مابعد الموت؟ ہرگز نہیں، خدا کی بادشاہت خود تمہارے اندر ہے۔ کیا اس سے زیادہ بھی کوئی صاف حقیقت ہوسکتی ہے تمہارے لئے سب سے زیادہ پر جوش مسرت کا موقع وہ ہوگا جب تمھیں یہ محسوس ہو کہ تم کو کسی کام میں محض تمہاری راست خیالی کی وجہ سے کامیابی ہوئی ایک باخدا شخص ہزاروں پر بھاری ہے ہم نے اس قسم کے جملے پڑھے ہیں

اور ہم میں سے اکثر ان پر یقین بھی رکھتے ہیں لیکن کیا ہم نے اپنی روزمرہ کی زندگی میں ان پر عملاً تجربہ بھی کیا۔ سوچئے تو خدا کیا رہیگا اگر وہ اتنا بھی نہ کرے کہ ہم اس کی مدد سے اپنے مکان کا کرایہ ادا کر سکیں۔ اگر ہم کو ملازمت مل جائے تو ہم خوش رہ سکیں اگر وہ زندگی کے ہر لمحہ میں ہمارے ساتھ نہ ہو۔

یقین رکھئے کہ وہ عظیم الشان طاقت جس نے آپ کو پیدا کیا ہے جس نے آپ میں "انا" یا احساس ہستی کو پیدا کیا ہے۔ ہر وقت آپ کے لئے حاضر ہے۔ ہر وقت آپ کی حفاظت کر رہا ہے صرف آپ کے لئے ضرورت یہ ہے کہ بجائے پروفیسر ننفو کی پیروی کرنے کے آپ خدا سے رہبری حاصل کریں۔

اب میری سنئے اگر میں بھی پروفیسر ننفو کی باتوں میں آگئی ہوتی اگر ان کے ڈرانے یا دھمکانے سے متاثر ہوگئی ہوتی تو میں نہیں جانتی کہ میں آج کہاں ہوتی میں نے اپنے پیشہ کی زندگی میں کوئی کام ایسا نہیں کیا جس میں کہ اس نے مداخلت نہ کی ہو۔ یا اس کو تباہ کرنے کی تدبیر نہ کی ہو وہ ہمیشہ مجھے اپنی مقصد کی تکمیل سے روکتا ہے وہ ہمیشہ میرے کاروباری معاملات میں مداخلت کرنے کی باہر یا گھر میں بے چینی اور بے اطمینانی پیدا کرنے کی کوشش کرتا رہا اور وہ کسی حد تک کامیاب بھی ہوگیا میں مضمحل اور پست ہوگئی۔ پھر اس کے بعد میں نے تہیہ کر لیا کہ میں اپنی زندگی کی خود محافظت کروں گی اور میڈم میجگرا اور پروفیسر ننفو کو اپنی زندگی میں کسی دسترس کا موقع نہ دوں گی چنانچہ وہ نہایت ذلت کے ساتھ نکال دئے گئے۔ اب میں ہمیشہ چوکنا رہتی ہوں اور اس کی احتیاط رکھتی ہوں کہ وہ میرے دماغ میں نہ پہونچنے پائیں اور کوئی ناخوشگوار اثر نہ پیدا کریں میں ہمیشہ اس اصول پر عمل کرتی ہوں کہ ان کو ہمیشہ دروازہ سے باہر ہی رکھوں بجائے اس کے کہ وہ دروازہ سے اندر آجائیں اور پھر مجھے ان کو نکالنا پڑے۔

اس ظاہری چمک اور آب و تاب سے قطع نظر کر کے جو متحرک تصویروں نے میری ذات کے ساتھ پیدا کر دی ہے مجھے دیکھئے کہ میں ایک معمولی عورت ہوں۔ ایک پُر امید اور دعا گو عورت مجھے اپنی میری زندگی میں بھی آلام و مصائب سے سامنا کرنا پڑا۔ آزمائشوں کے دور بھی گذرے۔ میں نے ابتدا اس طرح کی جیسے کہ ہم عموماً کرتے ہیں۔ خوفزدہ پُر از مصائب، فکرمند، ایسے بار اٹھائے ہوئے۔ جن کا مجھے کوئی تعلق نہیں۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ میں ہی ہر چیز کی ذمہ دار ہوں۔ لیکن اس کے بعد میں نے یہ سیکھا کہ

مجھکو "اٹلس" کی طرح تمام دنیا کو اپنے کندھوں پر اٹھانے کی کوشش نہ کرنا چاہئے۔ اور بجائے خود ناخدائی کرنے کے خدا کو ناخدائی کرنے دینی چاہئے۔

میں نے جو کچھ کہا ہے کامل عجز و انکسار کے ساتھ کہا ہے اور جو کہا ہے اس کو ثابت کر دیا ہے میں نے اپنی زندگی کے تمام مسائل کو ابھی حل نہیں کیا ہے۔ لیکن مجھے اُمید ہے کہ میں کر لوں گی۔ کیونکہ میں نے اپنے خیال کی نگہداشت کرنا سیکھ لی ہے۔ اور میرا خیال زندگی کی تمام جزئیات میں میری نگہداشت کرتا رہے گا۔ اب بتایئے کہ کیا یہ چیز ایسی نہیں جس کی آپ کوشش کریں۔

ہندوستانی زبان اور معاشرت پر انگریزی اثرات

جناب عبدالباسط ایم اے، ایل ایل بی (علیگ)، ایم آر اے ایس (لندن)

پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور

ہندوستان میں شروع ہی سے ہر صوبہ کی بولی بالکل جدا رہی ہے لیکن غدر کے ہنگامے کے بعد سے دلی کے قلعہ معلیٰ میں اردو اور کلکتہ کے فورٹ ولیم میں انگریزی کا چرچا شروع ہو گیا۔ جب ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ختم ہوا اور ملک میں امن و امان قایم ہو گیا اور سلطنت مغلیہ کی جگہ حکومت برطانیہ قائم ہوئی تو انگریزی کو حسب عادت سیر سپاٹے کی سوجھی اور اسنے سوچا کہ اپنے فورٹ ولیم سے نکل کر ذرا اپنی راجدھانی کا چکر لگانا چاہیئے اور اپنی ہندوستانی سہیلیوں اردو، ہندی سے میل جول قائم کر کے تعلقات بڑھانا چاہیئے

انگریزی پہلے ہی سے بڑی ملنسار اور متمدن تھی فوجی چھاونیوں میں پڑے پڑے طبیعت اکتا گئی تھی پھر یہ بھی تجارت پیشہ تھی اپنے کاروبار اور بیوپار کے لئے بھی اس کو اپنے تعلقات وسیع کرنا تھے۔ اس کی ہندی سہیلی تجارتی واقفیت میں اس کی ہم پلہ تھی لیکن اردو گو حکومت ہاتھ سے گنوا چکی تھی۔ لیکن حکومت کی بو ابھی تک اس میں سے نہ گئی تھی۔

جب انگریزی دلی کے قلعہ معلیٰ پر پہونچی تو خیال تھا کہ جس طرح جگہ جگہ ہندی نے دونوں ہاتھ جوڑ کر اس کا استقبال اور آؤ بھگت کی ہے اور اپنا حاکم تصور کر کے ڈنڈوت کی ہے اسی طرح اردو کے یہاں بھی اس کی بہتری خاطر و مدارت ہو گی لیکن وہاں پہونچکر معلوم ہوا کہ گو رسی جل گئی مگر ابھی تک بل بدستور موجود ہیں۔ چند روز کے تجربہ کے بعد پتہ چلا کہ ان میں آپس میں نہ صرف بڑا اختلاف ہی ہے بلکہ ایک دوسرے کے بالکل ہی برعکس ہے ہندی کے اگر سیکڑوں دیوتا ہیں تو انگریزی کے تین خدا تھے لیکن اردو تو سوائے ایک کے دوسرے کا خیال بھی دل میں نہ لا سکتی تھی۔ مذہب کو چھوڑ کر تہذیب معاشرت طور طریقہ

لباس ہر چیز میں ہی ایک دوسری کی ضد تھیں ۔
انگریزی اگر آزاد خیال نمش تھی تو اُردو پرانی لکیر کی فقیر تھی انگریزی میں جدت پسندی اور ایجادات واختراعات کا مادہ تھا تو اُردو پر دقیانوسیت اور قنوطیت چھائی ہوئی تھی ۔ اگر ایک کے نزدیک بزرگوں کے سامنے ننگے سر جانا بدتمیزی میں شمار کیا جاتا تھا تو دوسرے کے لئے ہیٹ لگا کر کسی بڑے کے سامنے چلا جانا معیوب تھا ۔ ایک کے یہاں اگر کرتہ کو پاجامے اندر کر کے پہننا بدنما تھا تو دوسرے کے یہاں پتلون کے اندر قمیص کر کے پہننا داخل فیشن تھا ۔ وہاں اگر پیچھے کی طرف بال بڑھا کر پٹھے رکھنا اور سیدھی مانگ نکالنا شرفا کا دستور تھا تو یہاں پیچھے سے بالکل صاف اور آگے کی جانب بال بڑھا کر ٹیڑھی مانگ نکالنا داخل فیشن تھا ۔ وہاں اگر بوقت ملاقات دونوں ہاتھوں سے باطمینان مصافحہ کرنے کا طریقہ رائج تھا تو یہاں برخلاف صرف ایک ہاتھ کو دوسرے کے جھٹک دینا بالکل کافی تھا ۔ وہاں اگر داڑھی بڑھانے اور مونچھیں منڈانے کا قاعدہ تھا تو یہاں برعکس مونچھیں بڑھانے اور داڑھی منڈانے کا رواج عام تھا ۔ اسی طرح ایک کے یہاں زیادہ سے زیادہ حصہ جسم کو ڈھانپنا شرفا کی وضع میں داخل تھا تو دوسرے کے یہاں زیادہ سے زیادہ حصہ جسم کو ننگا کر دینا معاشرت میں داخل سمجھا جاتا تھا ۔

سب سے زیادہ برعکس معاملہ یہ تھا کہ انگریزی بالکل بے پردہ بے باک اور چڑ باک تھی اور اُردو اس کے برخلاف بڑی شرمیلی حیادار اور چہار دیواری کے اندر پردوں میں رہنے کی عادی تھی ۔ معاشرتی مغائرت تو قدم قدم پر ظاہر تھی یعنی اگر ایک کو فرش پر بیٹھ کر کھانے کی عادت تھی اور دوسرے کو میز کرسی پر بغیر کانٹے چھری کے لقمہ نہ توڑ سکتی تھی ۔ ایک طرف اگر کھڈی بلکہ جنگل کافی تھا تو دوسری طرف بغیر باتھ کام چلنا محال تھا ۔ یہاں اگر صرف ایک پلنگ یا چارپائی ہی ڈرائنگ روم ۔ ڈریسنگ روم ۔ ڈائننگ روم ۔ بیڈ روم اور بعض مرتبہ باتھ روم اور بحالت مرض لیو ڑھی تک کا کام دے سکتا تھا ۔ تو وہاں ہر کام کے لئے ایک جداگانہ مستقل مرصع و مزین کمرہ درکار تھا ۔

ایک جانب اگر ہر قسم کا گوشت شیر مادر تھا تو دوسری جانب چند خاص خاص جانور اور وہ بھی ذبیحہ کی مخصوص شرائط سے جائز تھے ۔



پروفیسر عبدالباسط صاحب ایم-اے- ایل ایل- بی (علیگ)
ایم- آر- اے- ایس (لندن)
سابق ایڈیٹر علی گڑھ میگزین (۱۹۲۵—۱۹۲۶)

غرض ہر ہر قدم پر اس قدر اختلاف تھا کہ کوئی صورت اس کے میل جول کی نظر نہ آسکتی تھی۔ ہندی انگریزی کو اُردو سے بھی زیادہ ملکش اور ڈشٹ خیال کرتی تھی چونکہ وہ ماس خور تھی لیکن اپنی فطری عادت کی بنا پر انگریزی کو اپنا حاکم سمجھکر دور سے ہی ڈنڈوٹ کرلیتی تھی باقی رہے معاشرتی اختلافات وہ سب اُردو کیطرح بدستور موجود تھے۔

ان حالات میں انگریزی کے لئے اُردو ہندی سے ملکر شیر و شکر ہو جانا بڑا مشکل تھا۔ نہ تو وہ شدہ ہوکر چوکے میں بیٹھ کر ساگ پات پر گذراں کرسکتی تھی نہ کلمہ پڑھ کر غیر ذبیحہ اور شراب سے ہی جو اس کی گھٹی میں پڑ چکی تھی پرہیز کرسکتی تھی۔ نہ دھوتی انگوچھے میں اس کا گذارہ تھا نہ کرتے اچکن اور پاجامے میں بسر کرسکتی تھی پھر یہ ہی اس کے لئے مناسب نہ تھا کہ ان حالات میں خواہ مخواہ میل جول بڑھائے۔ چونکہ اس طرح اس کی حاکمانہ خودداری کے جذبات کو ٹھیس لگنے کا اندیشہ تھا اس لئے ان تمام وجوہ کی بنا پر کچھ عرصہ تک اس کو الگ تھلگ سول لائنوں میں رہ کر حالات کا بغور مطالعہ کرنا پڑا۔

آخرکار وہ حاکم قوم کی چہیتی سائنس اور سیاست کی سان پر تیز کی ہوئی تھی وہ اُردو ہندی کی طرح زبان دراز نہ تھی اس نے ۱۸۵۷ء کا غدر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اسکو کارتوسوں والا قصہ بھی ابھی نہ بھولا تھا اس لئے بڑی دانائی اور فراست سے کام شروع کیا۔

سب سے پہلے اس نے اُردو کی کہانی اور ہندی کی کتھا علیحدہ علیحدہ سُنی اور پہلے حالات سُنے تو معلوم ہوا کہ یہ دونوں بچاری بڑی شریف اور سیدھی سادھی بھولی بھالی ہیں اور ہمیشہ ہی سے بڑی مہمان نواز رہی ہیں خاص کر ہندی تو اسقدر مہمان نواز ہے کہ جو بھی اس کے یہاں آیا اس نے سر آنکھوں پر بٹھایا۔ اور تن من دھن سے اس کی خدمت کرنا اپنا فرض سمجھا بشرطیکہ وہ بطور حاکم کے اس پر حکومت کرنے آیا ہو۔ پھر اس کو یہ بھی معلوم ہوا کہ اس ملک کی ہی صفت میں داخل ہے کہ ہر حاکم کے لئے وہ اپنی تہذیب۔ تمدن۔ معاشرت بول چال بلکہ مذہب تک قربان کردیتا ہے۔ اپنی تمام ترپیداوار تک اس کی سپرد کردیتا ہے۔ اور خود فاقے کشی کرتا ہے۔ شرط یہ ہے کہ اس سے کوئی کام نکالنے والا ہو۔

بس اس ذہنیت کو معلوم کرکے اس نے سب سے پہلے یہ دل میں ٹھانی کہ اس ہندی کو رام کرلے۔

چنانچہ اس کو معلوم تھا کہ ہندی کے یہاں صبح ہی صبح دکان کی گدی اور تجوری کی بھی اسی طرح پوجا پاٹ ہوتی ہے جس طرح مندر میں مورتی کی چنانچہ اس دکھتی رگ کو معلوم کرکے اور بڑی سیاسی تدبیر سے اس مقولہ پر عمل درآمد شروع کر دیا کہ "زر بر سر فولاد ہی نرم شود"

چنانچہ سودی بیوپار اور تجارتی کاروبار میں امداد کا وعدہ کیا کچھ سبز باغ دکھایا۔ پھر کیا تھا کلکتہ میں ہندی انگریزی میں سمجھوتہ ہوا آخر دونوں ہم پیشہ تھیں جب دیکھا کہ ہاتھ ڈھلتے ہی سرگم کے سروں سے آوازیں نکلنا شروع ہوگئی ہیں بخلاف اُردو کے کہ وہاں سے ٹکا سا جواب مل چکا تھا تو پھر کیا تھا دونوں ہاتھوں سے پوری سرگم بجائی جانے لگی اور جلب زر کا پردہ ساز بجنا شروع ہوگیا۔ ہندی نے رفتہ رفتہ انگریزی کو اپنا گرو ماننا شروع کر دیا۔ اور اس کے گُن گائے جانے لگے۔

اب اُردو کے کان بھی ان سروں سے آشنا ہونے لگے اور اس نے بھی "سرور خانۂ ہمسایہ" سے لطف اندوز ہونا شروع کر دیا۔ چونکہ اس میں چنداں مضائقہ نہ تھا۔ پھر اس کی للچائی نظر اُن جدید دنیاوی ترقیات پر بھی پڑی جو ہندی کو صرف انگریزی کی بدولت ملنا شروع ہوگئی تھیں لیکن اس کے لئے ایک طرف مشرقی روایات۔ مذہب۔ شرعی اور اخلاقی دباؤ تھا تو دوسری طرف جاذب نظر کرشمے طرح طرح کی مالی اور جاہی ترقیاں اور انواع واقسام کی لذتیں تھیں جو اپنا اثر کئے بغیر نہ رہ سکتی تھیں چند روز ہی بعد دیکھا گیا کہ جس کے یہاں بھی انگریزی براجمان ہوئیں اس نے دھوتی کھول پتلون اور ٹوپی پھینک ہیٹ چڑھایا۔ جو کل تک گوبر سے لپے ہوئے چوکے سے باہر ایک لقمہ نہ توڑ سکتا تھا سب کے ساتھ میز کرسی پر چھری کانٹے سے چھوٹا بڑا حاضری کھاتا ہے۔ دن میں اگر صاحب کے بنگلوں کوٹھیوں پر ڈٹے ہوئے ہیں تو شب کو ہوٹلوں اور کلبوں میں انواع واقسام کے اکل وشرب کے جلسے اور رقص وسرود کی محفلیں گرم ہیں۔ لالہ اور للبانی سر رائے صاحب اور رانی صاحبہ کہلائے جاتے ہیں ورنہ بابو صاحب کے نام سے باچھیں کھلتی ہیں۔ آخر اُردو بچاری کب تک ان چیزوں کو دیکھتی اور کلپتی دل ہی دل میں تڑپتی اور مچلتی۔ دنیا کی شرم آخرت کا ڈر اور خدا کا خوف کب تک اس کو اس خداداد جنت سے محروم رکھ سکتا تھا لیکن جب کبھی بھی قصد کرتی کوئی نہ کوئی مولوی لاحول پڑھ دیتا اور یہ بچاری سہم کر پھر اپنے گھر میں جا گھستی انگریزی نے یہ اچھی طرح محسوس کر لیا

کہ اب جبکہ ہندی پر کافی جادو چل چکا ہے اور اُردو پر بھی اثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا ہے مولوی مُلّا لوگ درمیان میں رخنہ ڈال رہے ہیں جو ان کو آپس میں ملنے نہیں دیتے۔ کسی طرح اس کو ان کی زد سے بچا لیا جائے پھر کام مار لیا ہے۔ چنانچہ یہ ترکیب سوچی کہ اس کو کسی ترکیب سے اُبھار و اور بھگا کر اپنے ملک انگلستان لے چلو وہاں نہ تو مولوی ہونگے نہ خوف رہیگا ذرا سی جھجک نکل جانے کی دیر ہے اور پھر کام مار ہی لیا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ وہاں چمک دمک دیکھ کر شیش محل اور کتّے والی مثل ہی صادق آجائے۔ چنانچہ ایک روز موقعہ پاکر اس کے کان میں پھونک دیا کہ ملّا ازم، بڑی خوفناک چیز ہے جس سے تمام دنیاوی ترقیات مسدود ہو جاتی ہیں۔ اور یہی وہ چیز ہے جو دنیاوی ترقیوں میں حائل ہے کیونکہ ؎

ہر ایک کام میں ان کے دیں کے اڑنگے ہر ایک بات میں انکے مذہب کی پخّر
یہ دنیا میں رہنے کے لچھن نہیں ہیں اٹھاؤ چلو تہ کرو اپنا بستر

اگر تم کو دنیا دیکھنی ہے تو ہمارا ملک دیکھو تو معلوم ہوگا کہ ترقی کس چیز کا نام ہے۔ یہ پٹی کچھ اس طرح پڑھائی گئی کہ ایکدم وہ صرف یہ کہتی ہوئی رخصت ہوئی کہ ؎

سدھاریں شیخ کعبہ کو ہم انگلستان دیکھیں گے
وہ دیکھیں گھر خدا کا ہم خدا کی شان دیکھیں گے

ساحل انگلستان پر قدم رکھتے ہی وہ جنت۔ حوریں اور غلمان جن کا صرف تصور ہی ہوا کرتا تھا اب اپنی آنکھوں سے چلتی پھرتی نظر آنے لگیں پھر وہاں کی صحبتیں اور بے تکلفیاں دیکھ کر بے ساختہ زبان سے نکلا کہ ؎

زفرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

وہاں قدم قدم پر اسکو محیر العقل کرشمے نظر آئے اور ان سب کے حصول کی کنجی روپیہ اور دولت معلوم ہوا اور یہی وہ چیز تھی جس کی اب تک اس کے نظر میں کوئی وقعت نہ تھی اب رفتہ رفتہ روحانیت کی جگہ مادیت نے دلمیں گھر کرنا شروع کر دی اور اس کو محسوس ہوا کہ دراصل اس کا وطن ہندوستان صرف ایک مٹی کا

کے تالاب سے زیادہ وقعت ہی نہیں رکھتا اور اس وجہ سے ہر ایک شخص پر قدامت اور دقیانوسیت سوار ہے۔ لہذا اس نے طے کیا کہ اس جیتی جاگتی دیکھی بھالی جنّت کو چھوڑ کر ایک خیالی جنّت کے تصور میں تمام عمر اُمید موہوم پر زندگی گذارنا کہاں کی عقلمندی ہے لہذا بہتر یہی ہے کہ نو نقد اور تیرہ ادھار کے مشہور مقولہ پر عمل کیا جائے اور بجائے اس ابدی جنت کے جو ابھی ادھار میں ہے اس نقد جنّت کو حاصل کرنے کی کوشش کیجائے لیکن معلوم ہوا وہ روحانیت اور مذہب کے معاوضہ میں مل سکتی ہے۔ بڑی دماغی کاوش کے بعد مذہب میں کاٹ چھانٹ اور قرآن میں تاویلیات کی ترکیب سوجھائی گئی تاکہ اس دنیا میں یہ جنّت بھی ملجائے اور آخرت میں اس جنت کے بھی دعویدار ہیں۔ گویا "ع رند کے رند رہے ہاتھ سے جنّت نہ گئی" کے مصداق بنجائیں اب ہندوستان میں واپس آکر انگلستانی جاذب نظر کرشموں کا تذکرہ کیا گیا۔ اور دنیاوی ترقیات کے حصول کے ذرایعہ بتائے گئے جن کو اکبر مرحوم نے اس طرح بیان کیا ہے کہ ؎

یوں ہوئی تاکید لندن جاؤ انگریزی پڑھو — قوم انگلش سے ملو سیکھو وہی وضع و قماش
جگمگاتے ہوٹلوں کا جاکے نظارہ کرو — سوپ و کاری کے مزے لو چھوڑ کر یخنی و آش
لیڈیوں سے مل کے دیکھو ان کے انداز و طریق — ہال میں ناچو کلب میں جاکے کھیلو ان سے تاش
بادۂ تہذیب یورپ کے چڑھاؤ خم کے خم — ایشیا کے شیشۂ تقویٰ کو کر دو پاش پاش

ان حالات میں سفر لندن کی واپسی پر بلا خوف لومۃ لائم اعلان کر دیا گیا کہ ہماری آئندہ قومی ترقیوں میں اگر کوئی چیز مانع اور حارج ہے تو وہ بھی "مذہب" کا دُم چھلا ہے اور اگر کچھ دن اور اسی طرح مذہب میں اجتہاد کا دروازہ بند رہا اور بسم اللہ کے گنبد میں پڑے رہے ہر ہر بات کو کٹھ مُلّوں کے کہنے کے مطابق کرتے رہے اور جائز ناجائز کے آلے سے جانچتے رہے مذہب میں آزادی نظر میں وسعت اور دل میں فراخی نہ پیدا کی تو ترقی یافتہ زمانے کا سیلاب ہم کو بہا کر لیجائیگا اور ہم اقوام دنیا کی جدید ترقیات کی دوڑ میں پیچھے رہ جائیں گے۔ عربی، فارسی، مشرق، مذہب روایات یہ سب بے وقت کی راگنیاں ہیں جن کو سننے کے لئے اب کوئی تیار نہیں ہے۔ اگر دنیاوی ترقیوں سے مسرور ہونا چاہتے ہو اور زمانے کے ساتھ ساتھ چلنا چاہتے ہو تو ان باتوں کو چھوڑو اور انگریزی سے موالات کرو۔ ہندی کو دیکھو کہ

اس موالات کی وجہ سے کس قدر جلد ترقیات میں گوئے سبقت لے جا چکی ہے۔ بعض لوگوں نے اس کو سنا اور اور سمجھنے کی کوشش کی مگر علما پر اس کا پھر بھی کچھ اثر نہ ہو سکا۔ وہ بھی کہتے رہے کہ اصل چیز روحانیت ہی مقصد حیات انسانی ان الفاظ سے ظاہر ہے کہ مَاخَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ۔

رہی مادی ترقی وہ عارضی ہے اور چونکہ روحانیت کو نیست و نابود کر کے ملتی ہے اس لئے درخور اعتنا نہیں ہے۔ اس لئے انھوں نے صاف صاف اعلان کر دیا کہ ؎

بگو بہ سیٹھ کہ اورا بھرم نخواہد ماند　　بگو بہ برہمن اورا دھرم نخواہد ماند
من ارچہ در نظر یار خاکسار شدم　　رقیب نیز چنیں محترم نخواہد ماند

ان کا اعتراض یہ تھا کہ یہ مادہ پرستی خدا پرستی کا خاتمہ کر دیگی اس کے بعد اگر عہدے اور خطاب ملے تو وہ کس کام کے ہونگے بقول اکبر ؎

نہ نماز ہو نہ روزہ نہ زکاۃ ہو نہ حج ہو
تو خوشی ہی اسکی کیا ہو کوئی جنت کوئی جج ہو

اس کے برخلاف دوسری طرف سے اس سب کا جواب یہ تھا کہ ؎

پنڈت بیٹھا ہے اپنی پوتھی لیکر　　بنیا بیٹھا ہے موٹھ موتی لیکر
سودا اس کا ہے جو سدھارا لندن　　وہ دولت و بخشش جو تھی لیکر

رہے مولوی ان کو بہ نظر حقارت کلانزم، کے خطاب دیکر کہدیا گیا کہ ؎

بحث میں مولوی نہ ہارینگے
جان ہارینگے جی نہ ہارینگے

لیکن اس کے علاوہ ان علما کو قابو میں لانے اور ان کے دقیانوسی مادہ کے ازالہ کے لئے علاج شمسی تجویز کیا گیا یعنی اُنکو علماے شمس العلما بنا کر تاویلات کرانیکی کوشش کی گئی۔ یہ ترکیب قدرے کارگر ہوئی لہذا جن کو چاہا ان پر تین حرف (ش۔م۔س) بھیجکر جو چاہا کہلوایا۔ چنانچہ سب سے پہلے اُنھوں نے تیری تلاش سے "طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ وَّمُسْلِمَةٍ۔ اُطْلُبُوا الْعِلْمَ [illegible]

الی اللحد اطلبوا العلم ولو بالصین" احادیث تلاش کیں اور العلم سے انگریزی کی تعلیم مراد لیکر اس کا پڑھنا خاص کر ولایت جا کر حدیث سے ثابت کر دیا۔ اور قوم کو درس تدریس کا فتویٰ دیدیا گیا۔ ان کی خطابی قابلیت سے بس اسی قدر کام لینا تھا لہذا وہ مذہبی پیچ جو کسا ہوا تھا قوم کے دماغوں سے قدرے ڈھیلا پڑ گیا بقولیکہ

پیچ مذہب کا کسی صاحب نے ڈھیلا کر دیا ۔۔۔ سادہ طبقوں کو بالآخر بھر رنگیلا کر دیا
شوق پیدا کر دیا بنگلے کا اور پتلون کا ۔۔۔ وہ مثل ہے مفلسی میں آٹا گیلا کر دیا

قوم وملت نے اور راسخ علمانے ہر چند سر پٹکا کہ اب بھی باز آجاؤ پاؤں پٹے مگر سب بیکار رہوا ہے

پاؤں کو بہت جھٹکا پٹکا انگریزی کے آگے کچھ نہ چلی ۔۔۔ تدبیر بہت کی لے اکبر تقدیر کے آگے کچھ نہ چلی
یورپ نے دکھا کر الگ اپنا اردو کو مرید بنا ہی لیا ۔۔۔ سب پیر دہے تو وہ پیچ نکلی اس پیر کے آگے کچھ نہ چلی

لہذا اندریں حالات قوم کے تمام بچوں کو فتویٰ دیدیا گیا کہ

الا یا ایھا الطفلات ابجو راحت نہ ناولہا ۔۔۔ کہ قرآن سہل بود اول وے افتاد مشکلہا
بکن قرتین پائے خود بہ بوٹ ڈاسن و پتلون ۔۔۔ کہ لیڈر بے خبر نہ بود ز راہ و رسم منزلہا

مدرسوں۔ مکتبوں اور خانقاہوں کی بجائے کالج بنائے گئے اور ہر طرح کوشش کرکے اس کی نقالی میں کمال پیدا کیا جانے لگا۔ پھر کیا تھا تھوڑے ہی زمانہ میں موالات کا سلسلہ انگریزی سے شروع ہوگیا۔ اور ہر طرح کوشش کرکے اس کی نقالی میں کمال پیدا کیا جانے لگا۔

وہی اردو جو انگریزی کو اچھوت خیال کرتی تھی اور اگر کبھی عالم سمجھ کر ہاتھ ملانے کا اس کو اتفاق بھی پیش آجاتا تھا تو کلمہ پڑھ پڑھ کر اس کو پاک کیا جاتا تھا اب خود انگریزی کی مدارات کے لئے بیر (Beer) اور بیکن (Bacon) کی فراہمی میں مصروف نظر آتی تھی بلکہ ہم نوالہ وہم پیالہ ہونے کا فخریہ اعلان کیا جانے لگا۔

ادھر ہندی جو پہلے ہی سے انگریزی کا گیت گارہی تھی اردو سے مقابلہ میں آگے بڑھنے کو تیار ہوگئی اور دونوں میں اس مسئلہ پر بحث شروع ہوگئی کہ کون سب سے زیادہ اچھی نقالی کرتا ہے۔ اس جذبہ حسد کو

محسوس کرکے بڑی دانائی سے ہندی کے کان میں یہ پھونک دیا گیا کہ ملک ہندوستان میں جس قوم کے افراد کی اکثریت ہو وہی ملکی بولی قرار دیجاتی چاہیئے اور دفاتر کی زبان بھی وہی تسلیم کی جائے چنانچہ ہندی کا پرچار شروع ہوگیا۔ اُردو ہمیشہ سے ہی تبلیغی کام کی عادی تھی ہندی نے اس کی حرص میں اپنی تعداد بڑھانے کے لئے شدھی ایجاد کردی اور اُردو سے نفرت دلانے کے لئے گئو رکشا کا ڈھونگ رچایا۔ اس طرح اب اُردو ہندی میں جوتی بیزار شروع ہوگئی ایک دوسرے پر فوقیت ثابت کرنے کے مختلف دلائل پیش کرنے لگیں جس میں دفتر کی زبان منتقل ہو اب آپکو اس کا بھی احساس کرا دیا گیا تھا۔ کہ ایک چیز لنگوا فرنیکا ، ہوتی ہے جس کے بغیر کوئی ملک ترقی کی شاہراہ پر گامزن نہیں ہوسکتا۔ اس لئے اب اس کا سوال بھی درپیش ہوگیا ہندی کی دلیل یہ تھی کہ یہ ملک ہندوستان ہے۔ یہاں کے رہنے والے ہندی کہلاتے ہیں چنانچہ عرب کے مسلمان تک آپکو ہندی بطال کہتے ہیں لہذا یہاں کی زبان بھی ہندی ہونا چاہیئے۔

اُردو کی یہ دلیل تھی کہ میں ہندوستان ہی میں پیدا ہوئی یہاں ہی پلی بڑھی۔ مجھے پروان چڑھانے والے سب ہندوستانی تھے جس پنڈت رتن ناتھ سرشار۔ برج نراین چکبست۔ سورج نراین مہر۔ منشی نولکشور۔ اور منشی پریم چند سے لیکر سید احمد خاں۔ الطاف حسین حالی۔ محمد حسین آزاد نے یکساں طور پر میری تربیت کی ہے۔ نہ صرف یہاں بلکہ غیر ممالک نے بھی مجھکو ہندوستان کی واحد زبان تسلیم کرلیا ہے چنانچہ ۱۸۹۹ء میں سینٹ پیٹرس برگ گزٹ میں مندرجہ ذیل مضمون شائع ہوا تھا۔

"وسط ایشیا میں۔ روسی تجارت کی آئندہ ترقی کے معاملہ میں اُردو زبان کو خصوصیت سے دخل ہے اور یہ ایک ایسی زبان ہے جسے ملکی فوائد کے لئے حاصل کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ہمیں اس زبان کی تعلیم کو ہر ایک صورت سے ترقی دینے کی کوشش کرنا چاہیئے اور اگر اسے لازمی قرار نہ دیا جائے تو پھر بھی وسط ایشیا کے اُمیدواراں ملازمت کے لئے اس کا جاننا ضروری ہونا چاہیئے چونکہ ایشیا میں سمرقند سے لیکر افریقہ میں زنجبار تک زبان مذکور کے بولنے والے پائے جاتے ہیں سرکاری خرچ سے اس زبان کی تعلیم کے لئے مدارس قائم ہونے چاہئیں جہاں کے کامیاب طلباء کو آئندہ زمانہ ملازمت میں وسط ایشیا کی اقوام اور لوگوں سے گفتگو اور بات چیت

کرنے میں سہولت ہو گی ۔ چینی زبان کے بعد اُردو زبان ہے جو دنیا کے بہت بڑے حصہ میں بولی جاتی ہے اور سرحد ترکستان سے افریقہ تک جہاں ہندوستانی بکثرت آباد ہو رہے ہیں یہی زبان حلال مشکلات خیال کی جاتی ہے ۔ اگرچہ میں صرف ذاتی اغراض سے ہندوستانی زبان کی تحصیل کو لازمی سمجھتا ہے تو روسی عہدے داروں کے لئے زبان مذکور کی تعلیم کتنی کچھ ضروری نہ ہو گی جو ہمارے ایشیائی مقبوضات اور ہندوکش کے ان دروں میں جو پنجاب کو جاتے ہیں بولی جاتی ہے ۔ تمام روسی یونیورسٹیوں ٹیکنیکل فوجی کالجوں اور وسط ایشیا کے خاص مدارس میں ادنیٰ و اعلیٰ سب طالب علموں کے لئے ہندوستانی زبان اُردو کا پڑھنا لازمی ہونا چاہئے ،،

(حوالہ کیلئے دیکھو پیسہ اخبار مورخہ ۱۲ جنوری سنہ ۹۹ نمبر ۱۲ جلد ۳ صفحہ ۵

اُردو ہندی کو اس طرح آپس میں دست و گریباں کر کے انگریزی نے اپنے تبلیغی اور ترویجی کام بھی بلیغ شروع کر دی اور سب کو اپنی اشاعت کی طرف مائل کر لیا ۔ ہر ملازمت کے لئے اول انگریزی مڈل کی شرط لازمی کر دی گئی چنانچہ تھوڑے ہی عرصہ میں مڈل پاس لوگ بھرتی ہونا شروع ہو گئے اس کے بعد انٹرنس ایف اے اور بی اے کی رفتہ رفتہ قدر و منزلت بڑھنا شروع ہو گئی اور گریجویٹ ہونے پر فخر کیا جانے لگا یہ قرار پا گیا کہ ؎

پنڈت ہو کر مولوی ہو دونوں بیکار
انساں کو گریجویٹ ہونا اچھا

ہندی اُردو تو دفتری زبان کے مسئلہ کے پھیر میں رہیں اور تمام کارروائیاں رفتہ رفتہ انگریزی میں ہونے لگیں اور کسی کو اس کا احساس تک بھی نہ ہو سکا ۔ چنانچہ عدالتہائے ماتحت سے عدالت العالیہ تک کی دفتری زبان حرف قلم یکسر انگریزی ہو گئے ۔ پہلے جہاں صدر و صدور جبّہ قبّہ اور دستاریں اُردو میں فیصلے صادر کیا کرتے تھے ۔ اب مولوی قدرت اللہ لالہ ہربنس لال اور اڈورڈ گھسیٹا ۔ کوٹ پتلون پہن کر میز کرسی پر انگریزی میں مثلیں مرتب کرنے کے عادی ہو گئے ۔ مولوی ایک بار پھر ہمت کر کے آگے بڑھے اور بڑی جسارت سے کہدیا کہ ؎

مِنَ العلم قلیلاً کو بھی دیکھو بعد مَا اُوتِیتُم
نہ مانو گے تو اک دن بھائیو کھاؤ گے جوتی تم

مگر اب ان کی کون سنتا تھا صرف انگریزی بطور زبان ہی پڑھنے پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ تمام علوم و فنون صنعت و حرفت از قسم ریاضیات ۔ فلکیات ۔ اقتصادیات ۔ ادبیات معاشیات بلکہ دینیات تک بزبان انگریزی پڑھائی جانے لگیں ۔ ہر شخص کو کالج کا ہی گرویدہ دیکھا گیا اور قوم نے یہ طے کیا کہ تمام علمی فوائد صرف انگریزی کی بدولت حاصل ہو سکتے ہیں اور اس کا خیال بھی نہ ہوا کہ دینی عقائد کا کیا حال ہو گا ۔ بقول اکبر

نظر ان کی رہی کالج میں بس علمی فوائد پر
گرا کیں چپکے چپکے بجلیاں دینی عقائد پر

جب اس طرح انگریزی کو اپنا تسلط قائم کرکے اطمینان قلبی حاصل ہو چکا اور یہ دیکھ لیا کہ اب تمام ملک میں اس قدر رائج ہو چکی ہے کہ اس کے دلدادہ اکثر سودیشی لوگ ہو چکے ہیں تو اس نے ہندی اُردو کے بھس میں چنگاری ڈال دی اور خود بی انگریزی دور شملہ کی چوٹی پر جا کھڑی ہوئیں ۔ ناگری رسم الخط اور ہندی زبان کے انتقال پر ملال کو عرصہ دراز ہو چکا تھا بلکہ اس کے بعد عربی فارسی کا بھی افسانہ ماضی اور قصہ پارینہ ہو چکا تھا ۔ لیکن اب اس کو یہ سمجھایا گیا کہ ہندی کے عقیدے کے عین مطابق مسئلہ تناسخ کی بنا پر اب سے کئی صدی پہلے کی مردہ ہندی بھاشا اور سنسکرت کی روح کسی جدید کالبد میں پھونک کر اس کو نیا جنم دلایا جائے حالانکہ ہر ہندوستانی اچھی طرح جانتا تھا کہ ؎

ہندی کی نجات ہے نہایت مشکل
سو مرتبہ مر کے وہ جنم لے تو کیا

اب ہندی اُردو آپس میں بھڑانے کے لئے اپنا وہی آزمودہ نسخہ تجویز کر دیا یعنی ہندوستان میں جب دو مختلف الخیال جماعتیں ہوں اور ایک کو دوسرے پر فوقیت دلانا منظور ہو تو اس کو مذہبی رنگ دیدیا جائے فوراً روئی کی طرح آگ لگ سکتی ہے ۔ جو حربہ خود انگریزی پر ۱۸۵۷ء میں کارتوسوں کے ذریعہ کارگر ثابت ہو چکا تھا اس کو پرانی بیاض سے نقل کر کے تجویز کر دیا گیا چنانچہ اُردو کو بیگم اُردو اور ہندی کو شریمتی ہندی بولی کا خطاب دیدیا گیا ۔ جب اُردو دُکھیا نے دیکھا کہ ایک طرف انگریزی کا ولایتی طوفان سات سمندر پار سے سائنس کو آلات کو لئے بڑھتا چلا آرہا ہے اور دوسری طرف خود اس کی بچپن کی سنبھلی ہندی اسکو

ایک منٹ چین نہیں لینے دیتی اور اس طرح نہ گھر چین ہے۔ اور نہ باہر چین ہے تو مجبور ہو کر ہجرت کی ٹھانی لیکن جائے تو کہاں جائے ہندوستان سے باہر تو کوئی اس کا روادار نظر ہی نہ آیا۔ افغانستان۔ ترکستان۔ عربستان۔ ایران و توران بھلا کیوں اس کو اپنے آزاد ملک میں داخل ہونے دیتے اور اس کی غلامانہ ذہنیت سے اپنے ملک کی آزاد فضا خراب کرتے۔ اس کے لئے نہ جائے رفتن اور نہ جائے ماندن کا مصداق تھا۔ آخر بڑے سوچ بچار کے بعد خیال آیا کہ قلعہ معلیٰ کا ساختہ پرداختہ ایک خاندان عرصہ ہوا کہ جنوبی ہندوستان چلا گیا تھا اس خاندان کا کوئی نہ کوئی فرد ضرور ہو گا کتنی ہی مغائرت کیوں نہ ہو آخر ایک خون ہے کیا تعجب ہے کہ اسی رشتہ سے پہچان کر اس اڑے وقت میں کام آجائے آخر کار وہاں تاجدار دکن کا بڑا گھرانہ مل گیا شاہی شان و شوکت اور کر و فر سے استقبال ہوا قرنوں کی بچھڑی گلے ملیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور بڑی آؤ بھگت سے شاہی مہمان کیا اس نے بھی اپنی ساری درد بھری داستان کہہ سنائی اور جو جو تکالیف اپنوں اور پرایوں سے اس کو پہونچی تھیں وہ بھی سب بیان کردیں اس کے جدید میزبان نے اس کی بڑی تسلّی کی اس کے قیام کے لئے جامعہ عثمانیہ نامی نیا محل لاکھوں روپیہ صرف کر کے تیار کرایا۔ اور خدمت کے لئے تمام ہندوستان کے بہترین معلم اور استادان فن بڑے بڑے مشاہروں پر مقرر کئے گئے۔ قلعہ معلیٰ کی تہذیب پر نظام شاہی ترتیب نے سونے پر سہاگے کا کام دیا۔ اور آخر چند ہی سال میں اردو نے اس قدر ہر دلعزیزی حاصل کرلی کہ پردیس کو بھی دیس ہی بنا لیا۔ وہ لوگ جو ٹامل۔ ٹیلیگو۔ ملایالم۔ کناری اور نہ معلوم کیا کیا بولیاں بولا کرتے تھے سب اپنی اپنی بولیاں بھول گئے اور اردو کے ہی گرویدہ ہو گئے اور سب نے مل کر اس کو اپنی مادری زبان تسلیم کرلیا۔ اور اس طرح اس مہاجر کو دکنی انصار نے ہر طرح کی مدد دی وہاں تمام دفتری کارروائیاں گفتگو۔ تحریر و تقریر خط و کتابت لین دین غرض سب ہی کچھ اردو میں ہونے لگا تصانیف۔ تالیفات تراجم کا بیش بہا ذخیرہ تھوڑے ہی عرصہ میں جمع ہو گیا۔ کل کوئی چیز یورپ سے "اپ ٹو ڈیٹ" آئی اور اس نے اس کو شیروانی پہنائی۔ یہ وہ ترقی تھی جو اس کو اپنی ددھیال اور ننھیال یعنی دلی اور لکھنؤ میں بھی میسر نہ آئی تھی۔ اول تو شاہی سرپرستی دوسرے سیاسی ہتکنڈوں سے بالکل الگ تھلگ ایک گوشہ میں مرنجاں و مرنج اپنا فطری فرض منصبی انجام

دے رہی تھی کہ

قسمت کی نارسائی سے ٹوٹی کہاں کمند — دو چار ہاتھ جب کہ لب بام رہ گیا

انگریزی نے شملہ پہاڑ کی چوٹی سے اُردو کے ان سب کرتوتوں کو بھانپ لیا۔ دل میں بہت کڑھی اس کو اس کی ترقی سے یہ اندیشہ ہوا لیکن پرائی راجدھانی پر اتنا قابو نہ تھا اندیشہ یہ تھا کہ دکن سے مسلح ہو کر کہیں شمالی ہندوستان میں آج دفتری زبان کا مسئلہ نہ چھڑ جائے۔ اس دوران میں ہندی انگریزی خوب گھل مل گئی تھیں اور ایک دوسرے کے بھید بھاؤ سے بھی بخوبی واقف ہو چکی تھیں۔ ہندی بھی کافی سمجھ دار ہو چکی تھی اور اس کا ڈر تک بھی انگریزی سے نکل گیا تھا میدان خالی تھا لہذا تمام اسکولوں میں لازمی قرار دیدی گئی تھی۔ اتفاق سے کسی بات پر آپس میں چل گئی ہندی نے انگریزی سے ترک موالات کا اعلان کر دیا۔ کوٹ پتلون ٹائی کالر بوٹ سوٹ اتار کر ان سے ہولی کھیلی ولایتی چیزوں کا بائی کاٹ بولا اور انگریزی کو جلانے کے لئے پھر جولاہوں کے ہاتھ کے بنے ہوئے گاڑھے کے اونچے اونچے کرتے اسی گاڑھے کی کشتی نما ٹوپی اور دھوتی دھوڑی کے سلیپر پہننا شروع کر دیئے۔ اور انگریزی کی چڑ' چرخہ اور کھدر ٹھہرا دیا۔ انگریزی دل ہی دل میں بہت جلی بھنی مگر سیاست سے کام لیا ادھر تو یہ کہلا کر بھیجا کہ ہماری بلی اور ہم سے ہی میاؤں وہ دن بھول گئی جب ماتھے پہ قشقہ لگا کر چوکے میں بیٹھا کرتی تھی اُدھر مس میو کو بلا کر شریمتی ہندی دیوی کے وہ بترے کھلوائے کہ چھٹی کا دودھ یاد آگیا۔ آخر گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے تمام برادری بلکہ سارے ملک میں وہ رسوا کیا کہ بیچاری کو منہ دکھانا دشوار ہو گیا۔ کچھ عرصہ تک "مدر انڈیا" اور "فادر انڈیا" کا چرچا رہا۔ انگریزی نے جب دیکھا کہ ہندی ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑ گئی ہے تو اس نے پھر اس کو اُردو سے بھڑا یا اُردو کی ہمہ گیری۔ اس کی ترقی اور آئندہ اصلاحات جدیدہ میں اُردو کی حمایت کا ہوا کچھ اس طرح بٹھایا کہ ہندی نے چرخہ کا تکلا جو انگریزی کی ناک میں کیا تھا نکالکر پھر نیچے جھاڑ اُردو کے پیچھے پڑ گئی اور طرح طرح کے آلات و اسلحہ تیار کئے کہیں تحریک ہر پہچن ایجاد ہوئی تو کہیں الکل بھارتیہ سمتہ پرشد بنا۔ غرض انگریزی نے تو ذرا سانس لیا۔ اور اُردو ہندی گلغپ ہو گئیں۔ الغرض ناگپور میں ساری برادری جمع کی گئی اور یہ طے ہوا کہ اُردو کو اب تمام ملک سے ہی نکالنے کی ہر امکانی کوشش کی جائے

بالخصوص جنوبی ہندوستان سے جہاں اس نے اس قدر ہردلعزیزی حاصل کرلی ہے۔ لہذا اس کے بائی کاٹ کی صلاح ہوئی جن کو نجس بلکہ انجس خیال کیا جاتا تھا اور جن کے ہاتھ کا پانی پینا تو درکنار ان کو اپنے کنوں کے پاس تک آنا بھی گوارہ نہ تھا۔ انکے ہاتھ سے پانی پیا گیا پوجا پاٹ میں شریک کئے گئے تاکہ اُردو کو یہ محسوس ہوجائے کہ اس کا درجہ ان سے بھی کمتر ہے۔

ہندی کی اشاعت اور ترویج کے لئے ایک مجلس ادبیات ہندوستان منعقد کی گئی جس کا واحد مقصد یہ قرار پایا کہ اُردو گردن زدنی ہے اور اس کی خطا اور قصور یہ ہے کہ اس نے اس قدر ترقی کیوں کرلی ہے کہ تمام ملک میں یکساں طور پر سمجھی اور بولی جاتی ہے۔ ہندو مسلمان۔ سکھ۔ عیسائی۔ پارسی۔ یہودی۔ غرض تمام ہندوستانی پشاور سے راس کماری تک اور کراچی سے رنگون تک آخر ہر شخص اس کو کیوں سمجھتا ہے۔ غصہ تو انگریزی پر تھا مگر زلہ بر عضو ضعیف می ریزد کے اصول پر وہی مثل صادق آئی کہ کمہار کمہاری میں لڑائی ہوئی کمہاری سے پار نہ بسی تو گدھی کے جا کان کھینچے۔

اُردو نے دیکھا کہ ایک گھر میں لڑائی بھڑائی اچھی نہیں مل جل کر جس طرح ہمیشہ رہتے چلے آئے ہیں رہنا چاہیئے اسلئے اس نے ہر چند مصالحت کی کوشش کی اس کے خوش کرنے کو کھدر بھی پہنا جس کپڑے کی اچکن اُسی کی ٹوپی بھی کانوں تک مڑھ لی۔ لال زری کا جوتہ بھی پہن لیا۔ ترویج و اشاعت کے لئے "پرچار" وقت کے لئے "سمے" مہربانی کی بجائے "کرپا" انجمن کی جگہ "سماج" خدمت کیلئے "سیوا" انتخاب کی بجائے "چناؤ" استعمال شروع کردیا۔ یہانتک کہ سوراج۔ سینہ گرہ۔ شانتی وغیرہ وغیرہ مستقل طور پر بولنا شروع کر دئے اصلاح دیہات کی جگہ دیہات سُدھار بھی کہنے لگی مگر ہندی کو تو اپنی ضد تھی۔ حالانکہ گاؤں سنسکرت کے گرام سے بنا کر اُردو میں ایک لفظ استعمال ہونے لگا تھا گویا آپس کے سمجھوتے سے نہ سنسکرت کا گرام نہ فارسی عربی کے دیہات اور مواضعات بلکہ ایک مشترکہ لفظ گاؤں بنالیا تھا جس کو سب بولتے چلے آئے تھے لیکن اب اس نے کہا کہ اب وہی لفظ گرام ہی بولا جا سکتا ہے۔

حیدرآباد کے مقابلہ پر بڑودہ کی سرپرستی تجویز ہوئی اور اپنے نظام شاہی کی حرص میں اپنا خزانہ ہندی کی ترویج کے لئے وقف کردیا۔ سب نے مل کر یہ بھی طے کیا کہ اب آپس میں گفتگو بھی خالص ہندی بلکہ سنسکرت

یں ہونا چاہئے تاکہ اُردو خوب جلے چنانچہ ہر ایک کے سامنے بجائے بے تکلفانہ گفتگو اور تقاریر کے اچھی خاصی کتھا پڑھی جانے لگی۔

خط وکتابت۔ دعوتی خطوط۔ کوٹھی بنگلوں کے نام دوکانوں کے سائن بورڈ سب ناگری رسم الخط میں تحریر ہونے لگے اخبار اور رسائل میں بھاشا اور سنسکرت کے غیر مانوس اور ثقیل بلکہ دماغ پاش الفاظ بولے جانے لگے۔ یہ تو سب کچھ ہو گیا لیکن سب سے بڑی دقت یہ تھی کہ اس کو سمجھے کون؟ لہذا سینما ٹاکیز کو اس کی اشاعت کا بہترین ذریعہ تجویز کیا گیا تاکہ شرتیوں کی شیریں مقالی کا اثر ہندوستان کے نوجوان قلوب پر نقش کالحجر ہو جائے اور دھرتی ماتا کے سپوت ان الفاظ کو سنکر ان کو ہمیشہ یاد رکھ سکیں اگر ان کے اقوال نہ سمجھ سکیں تو ان کے افعال سے ان کا مفہوم پورے طور پر واضح ہو جائے۔ یہ نسخہ ویدجی کا ایسا کارگر ہوا کہ بڑی جلدی وہ غیر مانوس الفاظ جن کو مذہبی کتابوں سے کبھی باہر نہ دیکھا گیا تھا رائج ہونا شروع ہو گئے گراموفون کے ریکارڈ۔ ڈرامے۔ افسانے اور مختلف اقسام کے گانے اس طرح سنائے جانے لگے کہ ہر شخص کے کانوں تک پہونچنے لگے۔

غرض ہندی کی نہایت شستہ۔ سجید سلیس اور صاف زبان ملک کی خدمت کے لئے تجویز ہوئی جس کی فصاحت وبلاغت کا مشتے نمونہ از خروارے سامعہ نوازی اور شیریں مقالی کو ثابت کرنے کے لئے پیش کیا جاتا ہے۔ یہ اقتباس رسالہ ہنس سے لیا گیا ہے جو ہندی ہندوستانی کی اشاعت کے لئے جاری کیا گیا ہے۔

> "برج بھاشا کے پرم پراسے پراپت بھاشہ ارم انترک روپوں وینجا وھی شبد بھنڈار بھا دآوی۔ کو انھوں نے اپنایا۔ بدبی آگے چل کر انھوں نے پردھانتہ برج بھاشا میں لکھی اس میں سندیہ نہیں جو برج بھاشا ہندی کاویوں کے دوارہ اُپلدہ ہوئی تھی اس میں پرچلت شبدوں کی توڑ مڑور اپرچلت۔ پرانتھ نتھا گرامیہ پریوگوں کی ابھرچی جیسی اس بھات کے سوا بھاوس وکاش میں بھادھک سوچھند ناوں کا پرشکار کیا اور کاؤ بھاشا کو سادھو سو بوستھ اور سوسنکرت روپ دے کر پرامتو پورن بھاشہ سنسکار کاریہ کیا"

یہ ہے وہ زبان جو حصول سوا راج یا حکومت خود اختیاری کے بعد ہندوستان کے ایوانوں، کونسل

اور اسمبلیوں کے اجلاس میں بولی جایا کریگی۔ تمام تقاریر۔ مباحث اور گفتگو اسمیں ہی ہوا کریگی۔ ہندی کا دعویٰ یہ ہے کہ یہ ہندوستان کی اکلوتی زبان ہے اور بلا شرکتِ غیرے تمام ملک میں مشترکہ طور پر بولی اور سمجھی جاتی ہے یعنی اینٹشنوں کے قلیوں سے لیکر مولانا ابوالکلام صاحب آزاد اور مولوی عبدالحق صاحب تک اس ہی زبان کو روزانہ اپنے گھروں میں استعمال کرتے ہیں اور اگر سوئے اتفاق سے بعض لوگ نہیں کرتے تو انکو کرنا چاہئیے

جب انگریزی نے دیکھا کہ گنگا اُلٹی بہنے لگی ہندی سے کچھ نجات ملی تو اس نے سوچا کہ یہ دوا بڑی مفید ثابت ہوئی ہے لہٰذا اسی قسم کی دوسری خوراک بھی دیدیجائے۔ لہٰذا بڑی کد و کاوش سے اُردو سے بھڑانے کے لئے ایک اور ایسی زبان کو ریسرچ کرکے ڈھونڈ نکالا جس کو پہلے کبھی دیکھا سُنا بھی نہ گیا تھا۔ وہ سیاسی باتوں سے بالکل علٰیحدہ تھی اور محض نابلد۔ وہ اپنے مذہبی روایات میں ہی ہمیشہ سے سرگرداں تھی۔ لمبے لمبے بالوں میں کنگھے سے کیس بنائے۔ کچھ کسے۔ کڑا پہنے اور کرپان لگائے امرتسر کے سنہرے مندر میں گرنتھ صاحب کی تلاوت میں بڑے خشوع و خضوع سے مصروف تھی۔ چنانچہ انگریزی نے جھٹ جلیان والے باغ میں ہوائی جہاز اتار کر اس کے کان میں جا پھونکا کہ تم کب تک یہ راہبانہ زندگی بسر کروگی اب زمانہ ترقی کرچکا ہے محض سگرٹ۔ حقہ اور تمباکو چھوڑ دینے سے دنیا میں کام نہیں چلا کرتا۔ دیکھو اُردو و ہندی آج کل ملک پر قبضہ کرنے کی فکر میں ہیں جب تک تم بھی اپنا وجود ثابت نہ کروگی اس وقت تک تم کو سیاست اور ملکی حقوق میں حصہ نہیں دیا جاسکتا۔ تمہارے اسلاف نے سرزمین پنجاب میں وہ وہ کارنمایاں کئے ہیں کہ ایک دفعہ کو سب کا ہی ناطقہ بند کردیا تھا اور اس وقت صرف تمہاری ہی طوطی بول رہی تھی۔ تمہارے ساتھ اُردو کی ہمیشہ سے ہی نوک جھونک چلی آتی ہے وہ دن یاد کرو جب قلعہ معلی سے آکر اس نے تم کو زندہ درگور کردیا تھا۔ یہ تو پرانے جھگڑے ہیں۔ اب تو تمام ملک میں سوال ہی زبان کا ہے اسی پر آئندہ ملک میں جو اصلاحات ہونگی حصے بخرے ملیں گے جس کی برادری اور کنبہ زیادہ ہوگا لامحالہ اس کو ہی زیادہ حصہ ملیگا۔ تمہاری اتنی گورمکھی زبان کس قدر شیریں ہے وہ تو بالکل جداگانہ حیثیت رکھتی ہے۔ اُردو ذبیحہ خور ہونے کی وجہ سے اچھی خاصی حلال خور ہوگئی ہے لیکن تم تو جھٹکا خور رہو۔ دور کیوں

جاؤ ایک لفظ پڑھا کو ان داں کو ٹھا ہی نے لو اُردو میں اس کے لئے کوئی لفظ ہی نہیں ملیگا۔ عربی کے دار الاقامت یا انگریزی کے بورڈنگ ہاؤس کو اُردو نے اپنا رکھا ہے۔ اسی طرح اُردو میں گیلڑ یا کڈھیلڑ کس قدر ثقیل اور دماغ خراش الفاظ ہیں کہ جن کو سُنکر بھی درد سر کا دورہ پڑ جانیکا اندیشہ ہے اس چکر سے بچنے کے لئے اس نے عربی کے ربیب کو لولنا شروع کر دیا ہے لیکن تمھارے یہاں "بچھ لگ" کس قدر لطیف اور با معنی لفظ موجود ہے کہ سنتے ہی فوراً اس کا مفہوم سمجھ میں آ جاتا ہے۔ یعنی وہ بچہ جو ماں کے پیچھے لگا ہوا چلا آئے۔ اگر اُردو کے لئے نظام حیدر آباد اور ہندی کے لئے مہاراجہ بڑودہ ہیں تو تمھاری سرپرستی کے لئے مہاراجہ پٹیالہ۔ کپورتھلا اور فریدکوٹ موجود ہیں۔

یہ سب باتیں کچھ اس انداز سے عین نصف النہار کے وقت گوش گذار کی گئیں کہ گورکھی نے یہ خطبہ مدحیہ اپنی شان میں سُنکر کان کھڑے کئے آخر دلیر۔ باہمت۔ قوی الجثہ اور حوصلہ مند تھی سوچا کہ بات تو بالکل چوکس اور معقول معلوم ہوتی ہے فوراً گریبان نکال میدان ادب میں آ کو دی۔ اور تمام ریاستہائے پٹیالہ۔ کپورتھلہ فریدکوٹ نابھہ وغیرہ میں دفتری کارروائی گورکھی میں شروع ہو گئی لہذا اب اس نے ہندی سے اپنا دور کا ناتا نکالا اور اُردو کے خلاف یہ طے کیا کہ ؎

سرحد یہ باغیوں کو سکھ ماریں گے　　گردن اُردو کی رام رکھ ماریں گے

اس کے بعد انگریزی نے اب صوبجاتی سوال شروع کر دیا تمام اسکولوں میں اجازت عام دیدی گئی کہ ہر طالب علم اپنی اپنی مادری زبان میں جوابات لکھ سکتا ہے یا انگریزی میں چنانچہ گجراتی۔ سندھی۔ پنجابی پشتو بنگالی وغیرہ وغیرہ کے اُردو کے مقابلہ کے لئے جداگانہ محاذ قائم ہو گئے۔ لیکن انگریزی کا اس قدر رعب رہا کہ اگر کسی کو تجارتی ضرورت سے بھی ہندوستان یا بیرون ہندوستان خط لکھنا ہوتا تو اگر کوئی خود انگریزی نہ جانتا تو کسی انگریزی داں سے ہی خواہ وہ غلط ہی کیوں نہ ہو انگریزی میں خط لکھوایا جاتا بلکہ اس کی سہولت کے لئے ٹائپ کا بھی خاص طور پر اہتمام ہوتا۔

جب انگریزی کو اچھی طرح محسوس ہو گیا کہ اب روئی کی طرح آگ لگ چکی ہے اور ہندوستان کے چڑیاخانہ میں بھانت بھانت کے جانور اپنی اپنی بولیاں الاپنے لگے ہیں اور کوئی ایک دوسرے کی

نہیں سنتا لیکن انگریزی کی نقالی میں ہر ایک دوسرے سے فوقیت لیجانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس بوزنہ ذہنیت کا بخوبی اندازہ ہو جانے کے بعد اس نے سب کو ایک ہی لکڑی ہانکنا شروع کردیا۔ اور ہر ہر جانور اپنی بولی چھوڑ اسی پڑھے ہوئے سبق کو ازبر سنانے لگا چونکہ بازار میں پڑھے ہوئے طوطے کی قیمت بہت زیادہ ہوتی ہے سب نے ایسی اچھی نقل اتاری کہ خود انگریزی حیران رہ گئی پھر جس کو بھی ایک مٹھی دانہ کا دورے لالچ دیا۔ اس نے جو پڑھا اس کو ازبر رٹ کر خوب سنایا۔ اور اپنے اپنے پر پرزے جھاڑ کر چولی بھی انگریزی کی بدل ڈالی مثل بعینہ وہی صادق آئی کہ کوا چلا ہنس کی چال اپنی بھی بھول گیا۔

اُردو ہندی تو آپس میں اس طرح ایک طرف گلغپ ہوتی رہیں اور دوسری طرف انگریزی نے دونوں پر اس ہوشیاری اور تدبیر سے تسلط حاصل کرلیا کہ ابھی تک کسی کو اس کا احساس بھی نہ ہو سکا۔ پتاجی۔ اور والد صاحب کی جگہ فادر اور پاپا۔ ماتاجی اور والدہ صاحبہ یا امی جان کی بجائے مدر یا ممی بولنے لگے۔ ع بی صاحب۔ چچا صاحب پھوپا میاں۔ خالو میاں۔ ماموں جان۔ تاؤجی سب کی بجائے صرف ایک 'انکل' استعمال ہونے لگا اور چچی۔ پھوپی مومانی۔ خالہ۔ تائی وغیرہ کے لئے 'آنٹی' بڑی آسانی سے کہلائی جانے لگیں۔ اسی طرح حقیقی اور مختلف رشتوں کی بھائی اور بہنیں مثلاً چچازاد۔ پھوپی زاد۔ خالہ زاد۔ برادرزاد۔ ماموں زاد سب کو ایک ہی 'کزن' کی لکڑی سے ہانکا جانے لگا اور ستم ظریفی یہ کہ خواہ وہ کوئی رشتہ سمجھے یا نہ سمجھے بہن بھائی دونوں کے لئے ایک ہی لفظ محض انگریزی کی تقلید بولا جانے لگا اور کسی کو اس کا احساس تک بھی نہ ہو سکا کہ آپنے اس قدر بامعنی الفاظ کو چھوڑ کر آخر ان کو کیوں بولا جاتا ہے۔

'ہمشیر' جو عام طور پر دودھ کی شرکت کیوجہ سے استعمال ہوتا تھا شاید اس وجہ سے اس کا استعمال معیوب ہو گیا ہو کہ اب دودھ کی شرکت ہی مفقود ہو گئی ہے اور اس کی بجائے گلیکسو کا استعمال داخل فیشن ہے۔ لہذا کیا تعجب ہے جو چند روز میں ہمشیر کی بجائے 'ہمگلیکسو' ایجاد کر دیا جائے۔

جس طرح اکثر لوگ لاڈ پیار میں بچوں کی زبان میں تتلا کر بعینہ ان کی نقل اتار کر خوش ہوا کرتے ہیں اور یہ قطعی بھول جاتے ہیں کہ وہ کس طرح اصلی زبان کو بگاڑ رہے ہیں اسی طرح اُردو ہندی کو بھی انگریزی لب ولہجہ میں بولنا داخل فیشن سمجھا گیا اور بڑے فخر اور حاکمانہ رعب کے ساتھ بولنے پر فخر کیا جانے لگا۔ مثلاً

ذرا یہاں تشریف لائیے کو — وَل تُم یاں آنا مانگتا ہے
آپ کیا فرمانا چاہتے ہیں کو — وَل تُم کیا کہنا مانگتا ہے
آپ کا مزاج گرامی بخیریت ہے کو — وَل تُم اچھا؟
میرا قصد علی الصباح جانے کا ہے کو — وَل ہم مارننگ میں جانا مانگتا ہے
کس وقت گاڑی چھوٹتی ہے کو — کس ٹیم گاڑی جاتا ہے

وقت کی بجائے ٹائم اور اس کا مخفف ٹیم زبان زد عوام ہو چکا ہے اسی طرح دیا سلائی کو ایک گنوار تک ماچیز کہتا ہے۔ بقول اکبر حضرت منصور تک کا قصہ انگریزی لہجہ میں کس فصاحت سے بیان کیا گیا ہے کہ

قصۂ منصور سنکر بول اُٹھی وہ شوخ مِس — کیا اُچک لوگ تھا پاگل کو پھانسی کیوں دیا

نائی اور حجام کی بجائے باربر ملتا ہے اور بجائے حجامت کرنے کے شیو کرتا ہے، درزی کی بجائے ٹیلر بلکہ ٹیلر ماسٹر دھوبن کی بجائے لانڈری۔ حلوائی کی بجائے کنفیکشنر وغیرہ کے سائن بورڈ نظر آنے لگے۔ الغرض فی زمانہ اگر وہ مہذب تعلیم یافتہ اصحاب کی بے تکلفانہ گفتگو سنکر اس کا کوئی بزرگ تجزیہ کرے تو یقیناً ۸۰ فیصدی الفاظ اس میں انگریزی کے ہوں گے جو اس طرح بولے جاتے ہیں کہ گویا ہندی اُردو کے ہی ہیں۔ اور ان کی استعمال اُردو ہندی کے باہم قطعاً کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس کی بعینہ یہی مثال ہے کہ اگر سال میں ایک روز سات مسلمان بلکہ شاذو نادر بعض بعض مقامات پر اتفاقاً اپنا مذہبی فرض سمجھ کر صرف ایک گائے کا ذبیحہ کرلیں تو تمام ملک میں ہنگامہ۔ فتنہ اور غدر برپا ہو جائے اور جب تک اس کا قصاص سیکڑوں انسانی خونوں سے نہ لیا جائے صبر نہ آئے اور انکو گئو بھکشک کا خطاب دیدیا جائے اور اگر ہندوستان اور بیرون ہندوستان روزانہ لاکھوں گئو ماتا کی گردنوں پر چھاونیوں میں چھری پھیر دی جائے تو کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگے بلکہ ان سبکو گئو رکھشک کا خطاب دیا جائے۔ اسی طرح اگر چند با محاورہ عام فہم اور کثیر الاستعمال عربی یا فارسی کے ایسے الفاظ کوئی لکھ دے کہ جن کا مترادف دوسری زبان میں موجود بھی نہ ہو گفتگو میں استعمال کرے تو جب تک اس کے جواب میں سنسکرت کے نامانوس دماغ پاش الفاظ سے جواب نہ دے لیا جائے صبر نہ آئے درآنحالیکہ اس سے کہیں زیادہ ثقیل اور ناقابل قبول پچاسوں الفاظ انگریزی کے صبح سے شام تک بولے

جاتے ہیں جن میں سے بعض کے ادا کرنے میں تمام چہرے ہونٹوں اور زبان کو مختلف طریقوں پر کرتب کرنے پڑتے ہیں۔

س۔ص۔ز۔ذ۔ظ۔ض قریب المخرج حروف پر بڑے زور شور سے اعتراضات کر دیئے جائیں۔ اور معرکۃ الآرا مباحث قائم ہو جائیں لیکن یہ کبھی نہ سوچا جائے کہ آخر Put پٹ کے مطابق But کا تلفظ بٹ کس طرح ہوگیا۔ اور Knife کو کنائف کی بجائے نائف کیوں پڑھا گیا اور Psychology جس کا سیدھا سا تلفظ اُردو زبان میں "پسائی کیا لوگی" ہوگا اس کو کون سے قاعدہ سے سائیکولوجی کہا جاتا ہے اور اس قسم کی صدہا بے قاعدگیاں محض اس وجہ سے برداشت ہوتی ہیں کہ وہ انگریزی کی ہیں۔

الغرض اگر آج کل مستند شعرائے اُردو کے لئے انگریزی داں طلبائے کالج سے بالخصوص بورڈنگ میں جاکر بے تکلفانہ گفتگو کا امکان پیدا ہو جائے تو یقین ہے کہ ان کو کسی ترجمان کی ضرورت پیش آ جائیگی۔ سوداؔ۔ میرؔ۔ ذوقؔ اور غالبؔ جیسے صاحب دیوان یہ کہنے پر مجبور ہوں گے کہ ؎

غریب شہر سخنہائے گفتنی دارد ۔۔۔ بیا ورید گر اینجا بود زباں دانی

سب کے سب نہ صرف انگریزی میں گفتگو کے ہی عادی ہو چکے ہیں بلکہ ایک دوسرے سے سلام وکلام نشست و برخاست۔ چلنا پھرنا۔ خرید و فروخت تجارتی خط و کتابت۔ آپس کے ملاقاتی دعوت نامے۔ نامہ و پیام استقبال و مشایعت غرض سب ہی کچھ انگریزی میں ہو چکا ہے۔ سلام علیک۔ خدا حافظ۔ شب بخیر۔ آداب تسلیمات۔ کورنس کی کہانیاں تو پرانی ہوئی چکی تھیں خود گڈ مارننگ اور گڈ ایوننگ تک کا دیوالہ نکل چکا ہے اب اس کے بجائے بھی "چیراو"۔ "آل۔ اوکے"۔ "بائی بائی" تازہ ترین وارداں یورپ زبان زد عام ہوئے ہیں جن کے بغیر دو دوستوں کا رابطہ اتحاد کا پتہ ہی نہیں چل سکتا ہے۔ غرض ہر وہ چیز جو کل یورپ اور امریکہ میں شروع ہوتی ہے۔ آج بذریعہ ریڈیو اور سینما ہندوستان میں اس طرح رائج ہو جاتی ہے کہ گویا وہ ان کے ہی باپ دادا کی تھی۔ پھر نقالی میں بھی وہ کمال کر دکھایا ہے کہ لب ولہجہ حرکات و سکنات اشارات وکنایات تک میں سر مو فرق نہیں آسکتا۔ نہ صرف تحریر و تقریر اور ان کا طرز ادا ہی انگریزی ہو چکا ہے۔ بلکہ جذبات انسانی تک بھی اس اثر سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔ مثلاً اظہار غم و غصہ۔ رنج و الم تفکرات

وتخیلات اور انقباضی کیفیات یا اظہار مسرت وخوشی بے فکری اور انبساطی کیفیات۔ یا تعشق وتملق غرض تمام وہ باتیں ہیں کہ جن کا تعلق محض دماغی احساسات سے ہوتا ہے وہ بھی بالکل انگریزی کے قالب میں ڈھل چکی ہیں مثلاً اگر دو انگریزی خواں انسانوں کو کسی بات پر غصہ آجائے تو بے ساختہ ان کی زبان سے کچھ عرصہ اردو میں گفتگو کے بعد جھٹکے کے ساتھ لفظ شٹ اَپ نکل جائیگا اور اس کے بعد کی تمام مزید کارروائیاں اظہار رنج وغم کے لئے انگریزی میں ہی ہونے لگیں گی۔ معاشقانہ منازل ومدارج طے کرنے کے لئے حالات بالکل بدل گئے ہیں۔ اس لئے محمل۔ ناقہ۔ دشت نوردی۔ کوہ کنی۔ جوئے شیر۔ کمند۔ دربانوں کی خوشامد در آمد رقیبوں سے عداوت یہ سب آلات محض بیکار ہو چکے ہیں اب ان کے برعکس ٹیلیفون۔ ٹیلیوژن۔ وائرلس سینما۔ تھیٹر۔ اوپرا۔ ڈانسنگ کلب۔ ڈنر۔ پارٹیز۔ پکنک۔ ڈرائیونگ۔ ایوننگ واکس کے بغیر کسی صنف کا کام بھی اس سلسلہ میں نہیں چل سکتا ہے۔

اگر ناموں کی طرف ذرا غور کیا ہے تو اس میں بھی انقلاب عظیم رونما ہو چکا ہے گویا بالکل ہی کایا پلٹ ہو گئی ہے۔ مثلاً مولوی ابوالحسن۔ مسٹر بلسان۔ مولوی کرامت اللہ خاں۔ مسٹر یو۔ کرامت۔ مرزا کریم حیدر لودھی۔ ایل۔ کے۔ حیدار۔ منشی غلام باری (کمبوہ) جی۔ بی۔ کیمبف۔ سید عبداللہ خاں۔ مسٹر۔ ایس۔ اے کھان۔ محمد فاصل صدیقی۔ ایم۔ الیف۔ صدیکوی۔ کامتا پرشاد۔ کے پرشاد۔ مکٹ بہاری لال بھارگو۔ ایم پی بھارگو۔ اخبارات ورسائل کے ناموں میں بھی تبدیلی ہوئے بغیر نہ رہ سکی مثلاً الندوہ اور المناظر جیسے ناموں کی بجائے کریسنٹ۔ اور رومان بدل گئے۔ دلی یا دہلی کی جگہ ڈلی۔ بمبئی کی جگہ بامبے۔ کلکتہ کی بجائے کیل کٹا بولا جانے لگا ہے۔ اور قلعہ بالکل کوٹہ ہو گیا ہے اور گل بیرغ عام طور پر گلبرگ ہو گیا ہے۔ اکثر نور جہاں۔ چاند بی بی۔ زیب النسا۔ رضیہ بیگم۔ جہاں آرا اور خالدہ ادیب خانم کی بجائے سلویا سڈنی (Sylvia Sidney) جیسی میتھیوز (Jessie Matthews) جان کرافورڈ۔ گریٹا گاربو۔ اینا نیگل اور نارما شیرر زبان زد عوام ہیں۔ بلکہ انکی سوانح حیات حفظ کرنا داخل فیشن سمجھا جاتا ہے۔

گلستاں۔ بوستاں۔ کریما۔ مامقیما۔ رومی۔ جامی۔ غزالی کی داستانیں بوسیدہ ہو چکی ہیں اور اب تو ان کی بجائے بقول اکبر ؎

دلوں پہ مارتے جاتے ہیں چھاپہ شیکسپیر — پڑھو گے حضرت سعدی کی بوستاں کب تک
رومی و غزالی کو بھلا کون سُنے گا... — محفل میں چھڑا نغمۂ اسپنسر و مل ہے
لیتھرج کی چاہئے ریڈر مجھے... — شیخ سعدی کی کریما کیا کروں

قیامت اور مفاد جیسی اساسی خبر کا مفہوم بھی اب اس وقت تک سمجھ میں نہیں آسکتا جب تک کہ ان الفاظ میں اس کو نہ بیان کیا جائے کہ ؎

زندگی اور قیامت میں ریلیشن سمجھو
اس کو کالج اور اسے کنوکیشن سمجھو

الغرض ہندی اور اُردو کی چپقلش اور آپس کی نا اتفاقی کا نتیجہ ظاہر ہے کہ ایک بالکل غیر زبان پورے طور پر مسلّط ہو چکی ہے۔ اور وہ زمانہ بہت قریب ہے جبکہ یہ دونوں ہی حرفِ غلط کی طرح فنا ہو جائیں گی۔ اُردو جو بہ حیثیت مشترکہ ملکی زبان تمام ملک میں رائج ہو چکی تھی وہ تقریباً معدوم ہوتی جا رہی ہے اور کوئی تعجب نہیں کہ عنقریب بقول شخصے اس کی یہ حالت ہو جائے کہ ؎

سُنا ہے رہ نہ جائیگا کہیں پرسانِ حال اس کا — وہ اُردو جو کبھی ممتاز تھی ساری زبانوں میں
وہ جس ٹہنی پہ بیٹھے ہیں اُسیکو کاٹے جاتے ہیں — یہ نادانی کی صورت کیوں ہوئی پیدا سیانوں میں

غرض اس ملک کی پیاری زباں کا اب خدا حافظ
کہ یس اور نو کا چرچا ہو رہا ہے نوجوانوں میں
(yes) (no)

پیغامِ عمل

جناب صدرالدین صاحب فضا (عالم) شمسی متعلم ایم اے مسلم یونیورسٹی

(۱)

بہت سو چکے نیند بیدار بیدار — جبینِ فلک پر ہیں شب خوں کے آثار
سنبھل جاؤ اٹھ بیٹھو ہو جاؤ ہشیار — کرو کچھ کرو آگیا وقت پیکار
نہ گفتار سے نام کردار سے ہے
زباں سے نہیں کام تلوار سے ہے

(۲)

کہاں ہے عمرؓ سی خلافت تمہاری — کہاں حیدرؓ سی زور و طاقت تمہاری
کہاں ہے سلیماں سی شوکت تمہاری — کہاں ہے سکندر سی سطوت تمہاری
بتاؤ تو وہ آبرو اب کہاں ہے
زمیں تو وہی ہے وہی آسماں ہے

(۳)

کہاں ہے وہ ایفائے عہد بلالی — کہاں ہے وہ جوشِ صدائے غزالی
کہاں ہے وہ مسلم کا پرچم ہلالی — عمل سے سمجھتے ہو مذہب کو خالی؟
اسی طور سے اندلس پر چڑھے تھے؟
کہ زیرنگیں مصر و روما ہوئے تھے؟

(۴)

اٹھو اور موجِ یم بے کراں ہو — بنو ابر اور برسرِ آسماں ہو
کرو وہ کہ برہم نظامِ جہاں ہو — جلا ڈالو اعدا کو برقِ تپاں ہو

جو سچ پوچھئے ہو تو جینا یہی ہے
زمانہ کی گردش کا ایسا ہی ہے

(۵)

بہت بڑھتی جاتی ہے اب سرگرانی
اُٹھو! حد سے گذرا ہے دردِ نہانی
جو کرنا ہو کر لو کہ دنیا ہے فانی
کہاں تم کہاں اب وہ ساعت سہانی
بہت ہنس چکے ہو ذرا اُٹھ کے رولو
جو دھونا ہو دفترِ گناہوں کے دھولو

(۶)

اُٹھو! پانؤں کی اپنے زنجیر دیکھو
ابھرنے کو ہے نقشِ تقدیر دیکھو
نہ ہو سعیِ پیہم میں تقصیر دیکھو
نکل آئیگی کوئی تدبیر دیکھو
گرہ جو غلامی کی ہے وہ تو کھولو
یہ دست اور بازو سے کچھ کام تو لو

(۷)

عمل ہی سے شانِ حجازی بڑھی تھی
عمل ہی سے تخلیص یونس ہوئی تھی
عمل ہی سے طوفاں میں کشتی بنی تھی
عمل ہی سے طارق کو عزت ملی تھی
عمل ہی سے یوناں پہ سکہ جما تھا
عمل ہی سے ہندوستاں سر ہوا تھا

(۸)

عمل جب نہیں تم ہو خوارِ غلامی
غلامی سے ہو شرمسارِ غلامی
ہے ترکِ عمل خارزارِ غلامی
اسی نے کہا سوگوارِ غلامی
یہ کایا پلٹ کیوں ہوئی کچھ خبر ہے؟
کبھی لاتغیر پہ مسلم نظر ہے؟

(۹)

چڑھو تم جو مقصد پہاڑوں میں پاؤ　　ضرورت ہو تو شیر کے منہ میں جاؤ
بیاباں میں صحرا میں ہمت دکھاؤ　　سمندر میں کودو تو کیوں خوف کھاؤ
امانت ہو اللہ کی بچ رہو گے
جو ایمان اس پر ہے سب کچھ کرو گے

(۱۰)

اٹھو! تم کو روزِ جزا کی قسم ہے　　ہو محو عمل مصطفیٰ کی قسم ہے
اٹھو! تم کو پہلی حیا کی قسم ہے　　کرو سعی پیہم خدا کی قسم ہے
قفس ہی کو رشک چمن اب بناؤ
اثر زورِ اسلام کا یوں دکھاؤ

(۱۱)

سنو! اس غلامی پہ خوش ہونے والو　　اٹھو! باغِ اسلام کے نونہالو
بڑھو! غرق ہوتی ہے کشتی سنبھالو　　عمل کر کے خوابیدہ قسمت جگا لو
کوئی کہہ رہا ہے سرِ راہ دیکھو
یہ افسوس کی جا ہے واللہ دیکھو

(۱۲)

جسے ہم نے درسِ تمدن دیا ہے　　وہی آج وحشی ہمیں کہہ رہا ہے
غضب ہے نہ احساس اب تک ہوا ہے　　زمانہ ہے کیا اور کیا چاہتا ہے
فضا از خزاں چمن گشت بیدل
کہ آشفتہ بے گل بماند عنادل

ہیوم

اور

"مسئلہ جبر و اختیار"

(جناب ظفر احمد صاحب صدیقی ایم۔ اے علیگ لکچرار شعبہ فلسفہ مسلم یونیورسٹی)

عام طور سے مادی واقعات کو پچھلے علل و اسباب کا لازمی نتیجہ سمجھا جاتا ہے اور انسانی ارادہ کو علل و
باب سے بے نیاز۔ ہیوم اس تفریق کا قائل نہیں۔ اس کے نزدیک انسانی اعمال اور مادی افعال یکساں ہیں۔
جبر و اختیار کی بحث کو محض لفظی سمجھتا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ بظاہر کوئی نہ مانے لیکن مفہوم میں ہر شخص اس
متفق ہے۔ اس ظاہری اختلاف کی وجہ ہیوم یہ بیان کرتا ہے کہ جب ہم مادی دنیا پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں واقعات
یک تسلسل نظر آتا ہے۔ ہمارا ذہن ان واقعات کو علت و معلول کے سلسلہ میں منسلک کرلیتا ہے اور علت میں
ایسی قوت فرض کرلیتا ہے جو علت و معلول کے درمیان لازمی واسطۂ اتحاد ہے۔ یعنی معلول کا واقع ہونا اس علت
لازمی نتیجہ ہے۔ اسی بنا پر ہم مادی واقعات کو جبر یا ضرورت کا پابند سمجھتے ہیں۔ اس کے بعد جب ہم ذہنی کیفیات پر
ڈالتے ہیں تو ہمیں خواہشات اور جذبات میں کوئی ایسی قوت نظر نہیں آتی جو ارادہ کو واقع ہونے پر مجبور کرے۔
لئے ہم ارادہ کو خواہشات وغیرہ کا نتیجہ ماننے سے انکار کر دیتے ہیں اور انسان کو مختار فرض کر لیتے ہیں۔

اگر ہم مادی دنیا میں جبر کا صحیح مفہوم سمجھ لیں تو انسانی اختیار کی گتھی بھی سلجھ جاتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ
ت اور معلول کے درمیان کوئی ضروری تعلق نہیں اور علت میں کسی قوت کا وجود نہیں۔ یہ ہمارے ذہنی
ضے ہیں۔ کیونکہ علت و معلول کا رشتہ ہم تجربہ سے اخذ کرتے ہیں لیکن تجربہ اس سے زیادہ کچھ ثابت
کرتا کہ دو واقعات اب تک یکے بعد دیگرے واقع ہوتے رہے ہیں۔ اس سے ہم یہ نتیجہ نکال لیتے ہیں کہ
قعات آئندہ بھی اسی طرح واقع ہونگے۔ حالانکہ تجربہ میں اس کی کوئی یقینی ضمانت موجود نہیں بلکہ تجربہ سے یہ

بھی ثابت نہیں ہوتا کہ ایک علت ہے دوسرا معلول یا یہ کہ علت میں کوئی ایسی قوت ہے جو معلول کے واقع ہونے کی ذمہ دار ہو زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ دو واقعات جو ہمیشہ ساتھ ساتھ واقع ہوتے ہیں ان میں سے اگر ہم ایک کو دیکھتے ہیں تو عادتاً ہمارا ذہن دوسرے کا منتظر رہتا ہے۔ غرض واقعات کا یہ مستقل اتحاد اور ذہن کا ایک واقعہ سے دوسرے کی توقع کرنا بس یہی مسئلہ جبر اور عقیدۂ علت و معلول کی ساری اساس ہے۔

پس اگر ثابت ہو جائے کہ ذہنی کیفیات کی حالت بھی یہی ہے کہ ایک کیفیت ہمیشہ دوسری کیفیت کے ساتھ ساتھ واقع ہوتی ہے اور ایک کے وقوع سے ہم دوسری کا وجود اخذ کر لیتے ہیں۔ تو لامحالہ ماننا پڑیگا کہ عالم مادی کی طرح عالم ذہن میں بھی قانون علت و معلول کارفرما ہے۔

ہیوم کے نزدیک تجربہ اس کی پرزور شہادت دیتا ہے۔ آغاز عالم سے آج تک انسانی افعال کی باگ محبت نفرت ہمدردی لالچ رحم غصہ اور اسی قسم کے جذبات و رجحانات کے ہاتھ میں رہی ہے۔ عالم میں بھی مقررہ اسباب ہمیشہ مقررہ نتائج پیدا کرتے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عملی زندگی میں جتنا زیادہ ہمیں انسانی خصلتوں اور عادتوں کا تجربہ ہوگا اتنا ہی زیادہ ہم صحیح نتائج اخذ کر سکیں گے۔

اگر ذہنی افعال کو اسباب و علل سے بے نیاز مانا جائے تو تعلیم و تربیت کے اثرات سے بھی انکار کرنا پڑے گا۔ لیکن تعلیم و تربیت کا اثر مسلم ہے اسلئے ذہنی افعال کو اسباب سے بے نیاز نہیں مانا جا سکتا۔

یہ صحیح ہے کہ بعض اوقات کسی شخص کے افعال ہمیں بالکل بے قاعدہ اور خلاف توقع معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اس سے ان کا اسباب سے بے نیاز ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ آخر مادی دنیا میں بھی تو بہت سے ایسے واقعات پیش آتے ہیں جن کے اسباب معلوم نہیں ہوتے۔ ان صورتوں میں ہم انھیں پوشیدہ نامعلوم اسباب پر محمول کرتے ہیں۔ اسی طرح اگر ہمیں کوئی انسانی فعل بے قاعدہ یا بے وجہ معلوم ہو تو یہ ہماری اصل سبب سے ناواقفیت کی دلیل ہے نہ کہ سبب نہ ہونے کی۔ ایک مریض دوا پیتا ہے لیکن اس کی تکلیف دور نہیں ہوتی کیا اس بنا پر دوا کی تاثیر سے انکار کیا جا سکتا ہے۔ ایک ہوشیار ڈاکٹر سمجھتا ہے کہ دوسرے اسباب موجود ہیں جنھوں نے دوا کے اثر کو زائل کر دیا۔ اسطرح اگر ایک نہایت خلیق بامروت شخص آپ سے ترشروئی

سے پیش آتا ہے تو یہ بھی اس کی دلیل نہیں۔ کہ اس کا فعل بے سبب ہے یعنی اس کا ارادہ مجبور نہیں بلکہ مختار ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی داڑھ میں شدت کا درد ہو یا اسے بہت سخت بھوک لگ رہی ہو اور اس سے وہ چڑچڑا ہو گیا ہو۔ اگر انسان کے مزاج میں باقاعدگی اور یکسانیت نہیں پائی جاتی تو یہ ایسا ہی ہے کہ جیسے بے وقت آندھی بادل یا مینہ آجائے جو عام باقاعدگی کے تو خلاف ہے مگر بلاشبہ اسباب وعلل سے بے نیاز نہیں۔

یہ ثابت کرنے کے بعد کہ بعض مقررہ ذہنی کیفیات ہمیشہ مقررہ افعال کے ساتھ واقع ہوتی ہیں، ہیوم یہ دکھانے کی کوشش کرتا ہے کہ ہمارا ذہن ان کے مابین بھی علت ومعلول کے رشتہ کو تسلیم کرتا ہے اور ایک سے دوسرے کو اخذ کرتا ہے۔

انسانی فطرت کا مقررہ قوانین کا تابع ہونا ہیوم کے نزدیک ایسی مسلمہ حقیقت ہے کہ آج تک کسی نے اس کا انکار نہیں کیا۔ ممکن ہے لفظی اعتبار سے کوئی نہ مانے لیکن دل سے ہر شخص اس کی صداقت کو تسلیم کرتا ہے اور اس پر عمل پیرا ہوتا ہے۔

ایک کاریگر اپنے ملازموں پر اسی قدر بھروسا کرتا ہے جتنا اپنے اوزاروں پر۔ اگر ملازم اس کا کہنا ماننے سے انکار کر دے تو اسے اتنا ہی تعجب ہوتا ہے جتنا اپنے اوزاروں کے کام نہ دینے سے۔ تاریخی بیانات پر کیوں یقین کیا جاتا ہے۔ اس لئے نہ کہ انسانی تجربہ کی بنا پر ہم مورخ سے غلط بیانی کی امید نہیں کرتے۔ ایک قیدی جس طرح جیل کی مضبوط دیواروں کو اپنی رہائی میں حائل سمجھتا ہے اسی طرح جیلر کی سخت طبیعت کو۔ اگر ایک خوشحال ایماندار آدمی روز روشن میں اور لوگوں کی موجودگی میں اپنے دوست کے مکان میں داخل ہو تو اس کی نیت پر قتل یا چوری کا شبہ کرنا اتنا ہی خلاف قیاس ہے جتنا کہ نئے اور مضبوط مکان کے گر پڑنے کا۔ ہم ایک شخص کی نسبت ایسے ہی یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ وہ آگ میں اپنا ہاتھ نہیں ڈالے گا جیسے ہم سمجھتے ہیں کہ اگر کوئی روک نہ ہو تو اس کا جسم ہوا میں معلق نہیں رہ سکتا۔

ان مثالوں سے واضح ہو جاتا ہے کہ ذہنی کیفیات اور انسانی افعال میں بھی وہ دونوں شرائط پائی جاتی ہیں جن کی بنا پر ہم مادہ کو مقررہ قوانین کا پابند مانتے ہیں۔ پس کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ ایک

کو مجبور اور دوسرے کو مختار مانا جائے۔

ہیوم بار بار اس دعوے کو دہراتا ہے کہ حقیقتاً کوئی شخص بھی جبر کے مفہوم سے اختلاف نہیں رکھتا۔ جو لوگ انسانی اختیار کے بڑے علمبردار ہیں وہ بھی یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ ہمارے افعال کا ہمارے رجحانات اور حالات سے کوئی باقاعدہ تعلق نہیں یا رجحانات سے افعال کا اور افعال سے رجحانات کا کوئی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ اختیار سے انکار صرف یہ مطلب ہو سکتا ہے کہ ہم چاہیں تو ایک کام کریں نہ چاہیں تو نہ کریں۔ اس معنی میں اختیار اور جبر میں کوئی فرق نہیں رہتا کیوں کہ ہمارا چاہنا نہ چاہنا بھی اسباب ہی پر منحصر ہے۔

بعض لوگ جبر کے خلاف یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ اس کے نتائج اخلاق کے لئے تباہ کن ہوں گے۔ اول تو یہ کوئی دلیل نہیں۔ اگر ایک چیز مضر ہے تو اس سے وہ غلط نہیں ہو جاتی۔ دوسرے یہ الزام خلاف حقیقت بھی ہے۔ اسلئے کہ جیسا ہم نے ابھی دکھایا ہر شخص جبر کے مفہوم کو پہلے ہی سے تسلیم کرتا ہے۔ اب رہا لفظ جبر سو اس کے استعمال سے نہ عقائد میں فرق آتا ہے نہ اخلاق پر کوئی اثر پڑتا ہے۔ جبر کو مان لینے سے انسانی افعال و ارادہ کی کوئی خصوصیت نہیں بدلتی اور ذہنی کیفیات کی نسبت ہمارا عقیدہ وہی رہتا ہے جو ہم مانتے چلے آئے ہیں یعنی وہ اسباب و علل کے پابند ہیں۔ البتہ ہمارے نظریہ سے مادّی حرکات کا تصور بدل جاتا ہے یعنی علت و معلول میں کوئی لازمی تعلق اور علّت میں کوئی پنہاں قوّت معلول کے پیدا کرنے کی نہیں لیکن اس ترمیم سے اخلاق کو کوئی ضرر نہیں پہونچ سکتا۔

جبر کو انسان سے منسوب کرنا اخلاق کے لئے نہ صرف بے ضرر ہے بلکہ بہت حد تک ضروری بھی۔ کیونکہ اگر افعال کو انسان کے رجحانات کیرکٹر اور شخصیت کا عکس نہ سمجھا جائے تو کسی انسان کو اس کے فعلوں پر ملامت یا تحسین نہیں کی جا سکتی۔ ایسی صورت میں نہ سزا و جزا کے کچھ معنی ہوں گے نہ تعلیم و تربیت کا کچھ فائدہ ہوگا۔

اتفاقی لغزش یا جلدی میں اگر کوئی خطا ہو جائے اس پر انسان کو زیادہ مورد الزام نہیں سمجھا جاتا۔ اس لئے کہ ایسے افعال اس کے مستقل کیرکٹر کا نتیجہ نہیں ہوتے۔

اگر ایک شخص اپنے گناہوں پر نادم ہو کر توبہ کر لے اور اپنے اخلاق و عادات کو سدھار لے تو

اس کے گناہ دھل جاتے ہیں۔کیوں۔ اسلئے کہ کسی فعل پر انسان کو قابل ملامت اسی وقت سمجھا جاتا ہے جب وہ فعل اسکے برے رجحانات اور پست کیرکٹر کو ظاہر کرے۔لیکن اگر (توبہ اور ندامت سے) اس کے کیرکٹر اور رجحانات میں تبدیلی آچکی تو اس کی پچھلی خطائیں اس کے موجودہ کیرکٹر کو ظاہر نہیں کرتیں اسلئے ان خطاؤں پر اس کو قابل ملامت بھی نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔

غرض انسانی افعال اسی وقت ملامت یا تحسین کے مورد ہوتے ہیں جب ان سے انسان کی ذہنیت کیرکٹر اور رجحانات وغیرہ کا اظہار ہو۔

ہیوم کی زبان سے یہ دلائل سنکر فلسفہ کا طالب علم تعجب میں پڑ جاتا ہے۔ایک طرف تو ہیوم انسانی علم کی حدود متعین کرنے میں سلسلۂ اسباب کی کڑی کڑی بکھیر دیتا ہے اور دوسری طرف اخلاق و مذہب کی بحث میں اپنی بنائی ہوئی عمارت کو خود ڈھا دینے پر تل جاتا ہے یعنی اول تو علت و معلول کو ایک غیر یقینی مفروضہ ثابت کرنے میں ساری کوششیں صرف ہو جاتی ہیں اور پھر اسی مفروضہ کو اختیار اور آزادی کی تردید میں بطور دلیل استعمال کیا جاتا ہے ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا۔

ہیوم کہتا ہے کہ علّت و معلول کے مابین کسی تعلق کا علم ہمیں نہ مادّی واقعات میں ہوتا ہے نہ ذہنی کیفیات میں۔تاہم ایک مادّی واقعہ کو ہم علّت اور دوسرے کو معلول فرض کر لیتے ہیں۔اسی طرح کیوں نہ ہم ذہنی کیفیات کو بھی علّت و معلول مان لیں۔

مگر عقلاً یہ ضروری نہیں کہ مادّہ اور ذہن میں ایک ہی اصول مانا جائے اگر ہم کسی وجہ سے مادّہ کو جبر کا پابند مانتے ہیں تو یہ لازم نہیں آتا کہ ذہن کو بھی اختیار سے محروم کر دیا جائے۔

ہیوم تسلیم کرتا ہے کہ خالصتہً عقل و استدلال کی رو سے تشکک ناگزیر ہے۔پس مادّی واقعات میں بھی علّت و معلول کا رشتہ عقلاً ضروری نہیں۔بلکہ ہم اس کو اسلئے مانتے ہیں کہ بغیر اس کو مانے ہماری فطرت کی تشنگی دور نہیں ہوتی۔یعنی ہماری طلب علم اس کی مقتضی ہے کہ تشکک کو ترک کریں اور علّت و معلول کو مان لیں لیکن ہیوم اس حقیقت کو فراموش کر دیتا ہے کہ علم یا سائنس ہی ایک ایسی چیز نہیں جسے ہماری فطرت طلب کرتی ہے۔

علم کی طلب کے ساتھ عمل کی تڑپ اور اخلاقی زندگی کی تمنا بھی ہماری زندگی کا جزو لاینفک ہیں۔ اگر علم کی طلب ہمیں مادی واقعات میں علت و معلول کا رشتہ ماننے پر مجبور کرتی ہے تو اخلاقی تشنگی کا تقاضا ہے کہ ہم نفس کو انسانی اعمال کا ذمہ دار قرار دیں اور مختار تسلیم کریں۔ جب دونوں فطرت کے حقیقی مطالبات ہیں تو ایک علمی اصول کی بنا پر اخلاقی معتقدات کی بیخ کنی کسی طرح جائز قرار دی جا سکتی ہے۔

اگر ہیوم کو اصرار ہے کہ دونوں کو کھینچ تان کر ایک ہی اصول کے ماتحت لایا جائے تو یہ بھی حق بجانب ہوگا کہ ہم اپنے اخلاقی معتقدات کے اصول پر مادی افعال کی توجیہ کریں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ علت و معلول کا تعلق نہ مادی واقعات میں ثابت ہوتا ہے نہ ذہنی افعال میں۔ لیکن ہماری اخلاقی فطرت کا تقاضا ہے کہ ہم ان افعال کو اپنے نفس یا روح سے منسوب کریں تو کیوں نہ مادی واقعات میں بھی ہم کسی نفس یا باشعور ہستی کو موجود قرار دیں اور ان واقعات کو اس کے افعال اور مختارانہ افعال سمجھیں۔

ہیوم نظریۂ جبر کو اخلاق سے ہم آہنگ ٹھہرانے کے جوش میں بار بار یہ دہراتا ہے کہ ہر شخص نظریۂ جبر کو تسلیم کرتا ہے۔ اور یہ جھگڑا محض لفظی ہے۔ کیونکہ اختیار کو ماننے والوں کا بھی مطلب اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ ہم چاہیں تو ایک کام کریں اور نہ چاہیں تو نہ کریں۔ لیکن ہمارا چاہنا نہ چاہنا بھی کسی نہ کسی سبب پر مبنی ہوتا ہے۔ اس طرح نام نہاد اختیار اصل میں جبر ہے۔

ممکن ہے بعض لوگ اختیار کے یہی معنی سمجھتے ہوں لیکن یہ کہنا صحیح نہیں کہ اس کے سوا اور کوئی مطلب ہو ہی نہیں سکتا۔ جبر اور اختیار کا صحیح فرق ایک مثال سے واضح ہو جائیگا۔ فرض کیجئے میری خواہش ہے کہ سینما دیکھنے جاؤں۔ اس کے ساتھ میری یہ خواہش بھی ہے کہ وقت کسی دوست کی تیمارداری میں صرف کروں۔ جبریوں کے نزدیک وہ خواہش میرے فعل کا باعث ہوگی جو دونوں میں سے قوی تر ہے۔ اختیاری کہتا ہے کہ فعل خواہ کسی خواہش کے مطابق ہو لیکن اس کا اصل باعث "میں" ہوں اور یہ ضروری نہیں کہ "میں" ہمیشہ قوی تر خواہش کے مطابق فیصلہ کروں۔ یوں سمجھئے کہ گویا میں ایک جج ہوں جس کے سامنے خواہش اپنا اپنا مطالبہ پیش کرتی ہیں۔ اب جج کے اختیار میں ہے کہ فیصلہ انصاف کے قوانین کے مطابق کرے یا کسی فریق کے اثر میں آکر۔

اس تشریح سے ہیوم کی ایک اور غلط فہمی کا بھی ازالہ ہو جاتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ مسئلہ اختیار کی تردید کرنے کے لئے یہ دکھا دینا کافی ہے کہ ہمارے ہر فعل اور ہر ارادہ کی تہ میں کوئی نہ کوئی خواہش ضرور موجود ہوتی ہے۔ لیکن محض خواہش کا ہونا کافی نہیں۔ جب تک یہ نہ ثابت کیا جائے کہ یہ خواہش ہمیشہ قوی تر خواہش ہوتی ہے۔ یعنی فعل قوی تر خواہش کے مطابق واقع ہوتا ہے جبر ثابت نہیں ہوتا۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک زبردست خواہش موجود ہے اور ہم اس کے خلاف عمل کرتے ہیں۔ ہیوم کہے گا ممکن ہے فعل کا سبب کوئی اور خواہش ہو جو اس سے بھی زیادہ زبردست ہے۔ لیکن یہی تو ثابت کرنا ہے محض امکان کو ثبوت نہیں کہا جا سکتا اور اس کی بنا پر اختیار کے خلاف استدلال نہیں کیا جا سکتا۔

ہیوم کا کہنا کہ اخلاق کے لئے جبر ضروری ہے یہ بھی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اگر ارادہ کو مختار مانا جائے تو انسان کے فعل کا کوئی تعلق اس کے جذبات اور رجحانات سے نہیں رہتا۔ لہذا اس کی ذات سے بھی نہیں رہتا۔ یعنی ہیوم کی نزدیک انسان کی ذات فقط مجموعہ ہے اس کے جذبات رجحانات وغیرہ کا۔ لیکن ذات، دراصل ان تغیر پذیر کیفیات سے ماورا ہے اور فطرت اخلاقی مصر ہے کہ اسے ان کیفیات سے ارفع سمجھا جائے یہی ذات وہ شے ہے جسکی بنا پر ہر انقلاب کے باوجود "میں" وہی "میں" ہی رہتا ہوں جو پہلے تھا۔ یہی ذات میرے افعال اور ارادوں کی ذمہ دار اور مختار ہے۔

ہیوم کے نزدیک اخلاقی اچھائی یا برائی بھی ایک ایسی ہی چیز ہے جیسے مادی حرکات جنھیں ہم اچھا یا برا کہہ دیتے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہمارا اخلاقی حس ان دونوں میں کوئی مناسبت نہیں پاتا۔ فرض کیجئے کسی دہقان کی لہلہاتی ہوئی کھیتی کو اولے تباہ کر دیں تو اسے غصہ بھی آئیگا اور تکلیف بھی ہوگی لیکن کوئی معقول آدمی اولوں کو اخلاقی اعتبار سے ملامت کا مستحق نہیں قرار دیگا۔ اس کے برخلاف اگر چند شریر پڑوسی رات ہی رات میں اس کے کھیت کا صفایا کر دیں تو وہ اپنی ذمہ داری خواہ کتنی ہی فطرت تربیت یا عادت کے سر تھوپنا چاہیں عقل اور اخلاق کی نگاہ میں ضرور موردالزام قرار پائیں گے ہیوم سزا اور جزا کو جبر کی تائید میں ایک زبردست دلیل سمجھتا ہے لیکن حقیقتاً اس سے اس کے

دعوے کی تائید نہیں ہوتی۔ اگر ایک شخص دیوانگی کے جوش میں کسی کو قتل کردے تو نہ اسے اخلاقاً مجرم سمجھا جاتا ہے۔ نہ قانوناً سزا کا مستحق۔ لیکن اگر جبر کو تسلیم کرلیا جائے تو ایک صحیح الدماغ قاتل اور ایک دیوانہ میں کوئی فرق نہیں رہتا اسلئے کہ دونوں اپنی فطرت رجحانات اور حالات سے مجبور ہیں اور سزا کے مستوجب یا غیر مستوجب ہونے میں برابر ہیں۔

مختصر یہ ہے کہ جبر و اختیار کی بحث محض لفظی بحث نہیں ہے مانا کہ ہر فعل کسی نہ کسی خواہش کے مطابق واقع ہوتا ہے۔ لیکن اصل سوال یہ ہے کہ آخر ایک خواہش یا جذبہ کیوں دوسرے پر ترجیح حاصل کرلیتا ہے۔ جبر کو ماننے والا فرض کرلیتا ہے کہ اس ترجیح کا سبب اس خواہش یا جذبہ کا قوی تر ہونا ہے۔ اختیار کو ماننے والا اعتقاد رکھتا ہے کہ اس کا باعث میری ذات کا فیصلہ یا ارادہ ہے۔

"ہر حال جب ایک شخص سے اختیار اور اخلاقی ذمہ داری کو منسوب کیا جاتا ہے تو اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ اس کے نفس کے لئے دو راستے کھلے ہوئے ہیں۔ نفس کو اختیار ہے خواہ وہ عقل و انصاف کی رو سے فیصلہ کرے یا محض جذبات و خواہشات کی تحریک پر عامل ہو۔ اگر پہلی صورت کا امکان نہ ہوتا تو انسان دوسرے حیوانوں سے ممتاز نہ ہوتا۔ اگر دوسری صورت ناممکن ہوتی تو انسان اور فرشتہ میں کوئی فرق نہ رہتا۔"

عصرِ باستان و نو

(جناب ضیاء احمد صاحب ایم۔ اے بدایونی لکچرار شعبہ فارسی مسلم یونیورسٹی)

عکرمہ ابنِ ابی جہل و سہیل و حارث
تھے جو اخلاقِ رسولِ عربی کے وارث

صحبتِ سرورِ عالم سے سرافراز تھے جو
زمرۂ مخلصِ اصحاب میں ممتاز تھے جو

گئے اکبار کسی غزوے میں شامل ہو کر
کھائے زخم اور گرے خاک پہ بسمل ہو کر

وہ تپش ریت کی۔ وہ دھوپ کی حدّت توبہ!
وہ گھڑی نزع کی۔ وہ پیاس کی شدت توبہ!

عکرمہ پیاس کے غلبے سے تھے بےتاب بہت
مضطرب تھے صفتِ ماہیِ بے آب بہت

جانکنی دیکھ کے اس دین کے شیدائی کی
بڑھ کے اک مردِ مسلماں نے مسیحائی کی

جا کے اک چشمے سے فی الفور وہ لایا پانی
خشک ہونٹوں سے مجاہد نے لگایا پانی

دیکھا پانی کی طرف یاس سے تکتے ہیں سہیل
چاہتے تو ہیں۔ مگر کہہ نہیں سکتے ہیں سہیل

آپ سیراب ہوں تنہا۔ یہ گوارا نہ کیا
جرعۂ آب کو احباب سے پیارا نہ کیا

یہ مروت تھی کہ لب تر نہ کیا پیشِ سہیل
ساغرِ آب معاً بھیج دیا پیشِ سہیل

اُن کے نزدیک جو وہ جام کو لیکر آیا
پاس ہی خاک پہ حارث کو تڑپتے پایا

جاں بلب وہ بھی ملے آب کی نایابی سے
ریت پر لوٹتے تھے شدّتِ بےتابی سے

کہا۔ حارث کو زیادہ ہے ضرورت مجھ سے
نہ پیا جائیگا پانی کسی صورت مجھ سے

بولے وہ۔ پیاس سے گو دل پہ قلق ہوتا ہے
ہو طلب جس کی مقدم وہ احق ہوتا ہے

الغرض عکرمہ کے پاس پھر آیا پانی
تھی مگر پیاسوں کی تقدیر میں ایذا پانی

جب یہ پہونچا تو وہ دم توڑ رہے تھے رن میں
عالمِ زشت سے منہ موڑ رہے تھے رن میں

یونہیں آخر ہوئے فردوس سدھارے تینوں
تشنہ لب ہی گئے کوثر کے کنارے تینوں

اس طرح اہلِ وفا جان دیا کرتے ہیں   شوق سے آبِ دمِ تیغ پیا کرتے ہیں

یہ وہ ایثار ہے۔ ثانی نہیں اصلا جس کا   کلمہ پڑھتی ہے انصاف کی دنیا جس کا
کس کی تعلیم سے یہ کارِ خدا ساز ہوا!   نبوم اخلاقِ الٰہی سے سرافراز ہوا!

گو جہاں چند صدی دور نکل آیا ہے۔   روز افزوں ہنر و علم کا سرمایا ہے
پھر بھی انسان کی آشفتہ نگاہی نہ گئی   روشنی پھیل گئی۔ دل کی سیاہی نہ گئی
اُمیوں نے جو زمانے کو پڑھایا تھا سبق   عصرِ نو کر نہ سکا اُس میں اضافہ مطلق
ان کی سادہ بدویّت پہ حضارت قرباں   اُن کی "بے علمی" پہ سو دانش و حکمت قرباں

ہو۔ اگر عقل ہے تہذیبِ نوی کی جویا
روح ہے پھر اُسی عصرِ بدری کی جویا

"شادؔ کا رنگِ تغزّل"

جناب سید شاہ محمد منظور الرحمٰن صاحب اخترؔ کاکوی

مرادیواں تو یثرب ہے جہانِ پاکبازی کا ✦ پڑھے کلمہ زبانِ فارس اس بانگِ حجازی کا (شادؔ)

تمہید۔ اُردو کے چندہی باکمال شعراء گذرے ہیں جنہوں نے اپنی شہرت کی بہار کا خود اپنی آنکھوں سے نظارہ کیا اور ملک و قوم سے اپنی محنت وسعی کی داد پائی، لیکن افسوس کہ اس چمن میں بھی بہار کو بہت کم حصہ ملا۔ صوبہ بہار کی ساری تاریخِ ادب کی ورق گردانی کیجئے ان میں دھندلے طور پر ایک دو نہیں بلکہ سیکڑوں ہستیوں کے نام نظر آئیں گے جو قابلِ ذکر ضرور تھے لیکن انکے کارناموں سے اسوقت تک دنیائے اُردو ناواقف ہے کتنے ایسے ہیں جن کے نام سے بھی دنیا واقف نہ ہوسکی۔ پھر اُنکے کارناموں کا کیا پوچھنا ہے۔ یہ حقیقت میں اس بدسلوکی کے سزاوار نہ تھے، لیکن ابنائے وطن کی بدمذاقی۔ بے حسی اور ناعاقبت اندیشی کا ایسا نشانہ بنے کہ ان کا آفتابِ کمال گمنامی کی بدلیوں میں پنہاں ہوکر اپنی درخشانی اور تابانی کی بہار نہ دے سکا۔ اب یہ نوجوانانِ وطن کا فرض ہے کہ وہ اپنے اسلاف کے کارناموں کو دنیا کے سامنے پیش کرکے اپنی اہلیت کا ثبوت دیں اور اپنی بدنامی کے اس داغ کو مٹانے کی کوشش کریں۔

اسوقت مجھے دنیائے اُردو کے جس مایۂ ناز اور سرمایۂ افتخار ہستی کے رنگِ تغزّل پر روشنی ڈالنی ہے وہ گو اب دنیا میں باقی نہیں رہی لیکن اسکے لازوال کارناموں کی وجہ سے اسکا نام یقینی قیامت تک زندہ رہیگا۔ اسکے خزینۂ ادب میں قصائد، رباعیات، قطعات، مثنوی، ہندی کلام، فارسی کلام، مراثی، غزلیات اور نثر میں تاریخ وادب غرض کسی چیز کی کمی نہیں، لیکن افسوس ہے کہ بہت کم حصہ روشناس قوم وملک ہوا اور عام طور پر اکثر صنفِ کلام پردۂ حجاب میں رہی۔ خود اُنکے وقت میں انکے گنجینۂ سخن پر کمبخت دوست نما رہزنوں نے چھاپا مارا اور آنکھ بند ہوتے ہی تو معلوم نہیں کیسے کیسے جواہر ریزی یوسفِ گم گشتہ کی طرح بازار میں کوڑیوں کے مول بک گئے یا بستوں میں پڑے سڑرہے ہیں۔ بہر حال اس قضیۂ نامرضیہ کو چھیڑکر اصل موضوع سے دور ہوا جاتا ہوں اس لئے "دیار زندہ صحبت باقی" پر عمل کرتے ہوئے اسوقت ملتوی، لیکن پھر کبھی یہ داستانِ الم مفصل چھیڑی جائیگی جو کچھ خود حضرتِ شادؔ اور کچھ میری زبانی ہوگی

حضرتِ شادؔ کی غزلیات حقائق ومعارف کا گنجینہ اور علم وحکمت کا خزینہ ہیں۔ جو عامیانہ، سوقیانہ اور بوالہوسانہ اندازِ بیان سے قطعاً پاک اور جذبات وکیفیات کا لازوال خزانہ سوز وگداز، درد وحسرت، ولولہ وشوق، امید وآرزو کا آئینہ ہیں۔ اس مجموعہ میں میرؔ کا تغزّل، دردؔ کا

تصوف، غالب کا فلسفہ، سودا کی قادر الکلامی، آتش کی خوش بیانی اور انیس کی شیریں زبانی کا لطف ملیگا۔ اب ہم خصوصیاتِ کلام کو دکھا کر رنگِ تغزل کو آشکار کرتے ہیں۔

نتیجۂ کلام حضرت شاد کے کلام عموماً وقتی اور ہنگامی نہیں ہوتے، ان کا مورد اکثر عام ہوا کرتا ہے، مفہوم بلند اور نتیجہ پائدار ہوتے ہیں مثلاً اس مضمون کو کہ کار برآری کیلئے ایسا طریقہ اختیار کرنا چاہیے کہ مطلب بھی حاصل ہو اور کوئی خرابی نہ پیدا ہو سکے، اسطرح ادا کرتے ہیں ؎

تکلف تب ہے اے مشاطہ زلفوں کے بنانے کا ❊ کہ سلجھیں گتھیاں اور بال بیکا ہو نہ شانے کا

عرصۂ حیات کے مخصوص اور کشمکشوں کی کتنی سچی تصویر کھینچی گئی ہے ؎

جذبِ بلبل کھینچتا ہے اک طرف، اک سو صبا ❊ دم گھٹا جاتا ہے کیا پھولوں کی بو مشکل میں ہے

اسی طرح:-

خدا کی شان کہاں میکدہ کہاں واعظ ❊ کدھر ہیں بادہ پرستوں سے احتراز ان کے؟

اب اشک ہیں ترے آتے نہیں لہو اے چشم! ❊ تجھی پہ کیا ہے زمانہ کا خوں سپید ہوا

کس قدر بلند اور نتیجہ خیز شعر ہیں۔

اشعار کی یہ بلندی اور پائداری ایسی ہے جسکی مثال غالب کے بعد زیادہ تر شاد ہی کے کلام میں ملے گی۔

خوش گوئی اور شیریں نوائی

اردو میں ایک دو نہیں بلکہ سیکڑوں ہزاروں شعراء گذرے ہیں لیکن ایسے معدودے چندہی ملیں گے جن کے مجموعہ کلام میں اچھے اشعار کی بہتات ہو۔ بعضوں کے دیوان سے تو نگاہ کو مایوس ہو کر واپس ہونا پڑے گا اور بعضوں کے اچھے اشعار ملیں گے بھی تو سیکڑوں میں دو چار دس۔ اس کے لئے خواجہ میر درد کے مختصر سے کلام کو چھوڑ کر غالب کے بعد غالباً شاد ہی کا دیوان دیکھنا پڑیگا۔ غزل کی غزل ہے کہ پختگی، صفائی، چستی اور طرزِ ادا کی خوبی کی وجہ سے مضامین رنگارنگ کا مجموعہ ہے۔ اس کا ثبوت تو آئندہ اوراق میں ملے گا لیکن دیکھنا یہ ہے شاعر خود اپنے

شاعر کا کلام خود اس کی نظر میں

کلام کو کس نظر سے دیکھتا ہے اور کس نقطۂ نظر سے دیکھنے کی دعوت دیتا ہے۔ مثال سے اس کا صحیح اندازہ ہو سکے گا ؎

یہاں کے نخل کی سب ہیں پھننگیں عرشِ اعظم پر ❊ مرے گلزار میں موقع نہیں دامن درازی کا

قلم اپنا مضامیں کہیں منسوخ کرتا ہے ۔ دماغ اپنا ہے تازہ محکمہ قانون سازی کا
دیکھ کلام شاد کا شعر کا ماحصل سمجھ ۔ جاگ کے ترشبیں بسر فکر کو عارفانہ کر
مری غزلوں کو رکھیں کیوں حقیقت بیں آنکھوں پر ۔ تتبع ہے مجھے داد دے کامل غزلخواں کا
دُرِ مضموں کوئی یوں گوندھ لے ای شاد مشکل ہے ۔ سلیقہ انتہا کا چاہئے موتی پرونے میں
شاد سخن کی تیرے قدر کوئی کیا کرے ۔ ایسے جواہر ہیں یہ خسلد ہے جن کی بہا

فارسی ترکیبیں فارسی ترکیبوں کے استعمال سے اُردو میں ایک عجیب حلاوت اور چستی پیدا ہو جاتی ہے ۔ حضرت شاد کی استعداد فارسی زبردست تھی ۔ اس زبان میں فارسیوں کی طرح شعر کہتے تھے ۔ پھر اُس کے لوازمات کو اُردو میں کیوں داخل نہ کرتے ۔ فارسی ترکیبوں کا استعمال متقدمین کے کلام میں بکثرت پایا جاتا ہے لیکن متاخرین کے کلام میں یہ خصوصیت کم ہوتے ہوتے تقریبًا گم ہوئی ۔ البتہ موجودہ دور میں اس کی طرف کافی اعتنا ہے ۔ حضرت شاد نے بھی اس خصوصیت کلام کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا اور اعتدال کے ساتھ کلام میں استعمال کیا ۔

دیر سے منتظر ہیں وہ عذر نہ کر خدا کو مان ۔ جان بلب رسیدہ آہ کون محل ہے ناز کا
کھلا ہے بام پر جوڑا صبا کس جعد مشکیں کا ۔ کہ مجھ تک بوئے گیسو کار وانِ فرکاروانِ پہنچی
بخش دیا تھا عشق کو صبرِ گریز پا اگر ۔ حسن کو تو نے کس لئے غمزۂ دلربا دیا

فارسی محاروں کے ترجمے قدما کا کلام بہترین خصوصیاتِ شاعری کا حامل تھا لیکن متاخرین اس سے بے بہرہ ہوتے گئے لیکن حضرت شاد کے کلام میں اگلی تمام خصوصیتیں امتیازی رنگ کے ساتھ پائی جاتی ہیں اس لئے فارسی محاروں کے ترجمے جو قدما کی خصوصیت تھی یہاں بھی موجود ہے ۔

کہیں تو جام لنڈھا ہے کسی جگہ ساغر ۔ کدھر جھکائے سر انساں کدھر نماز کرے
چمن میں آکے لے وحشت تماشا ہی رہی دل کو ۔ تماشا (تماشا کردن) گل و نسریں و سوسن کوئی دم کرتے

ترجمہ غیر زبان اخذ مطالب اردو زبان میں جدتِ تخیل پیدا کرنے کے لئے ضرور ہے کہ غیر زبانوں سے خیالات لئے جائیں اور اپنی زبان کے قالب میں ان کو ڈھالا جائے ۔ حضرت شاد نے ایک طرف بھی

توجہ کی ہے ۔ نظیری کا مشہور شعر ہے ؎

توبہ خویشتن چہ کردی کہ بما کنی نظیری ٭ بخدا کہ واجب آمد ز تو احتراز کردن

حضرت شاد اُردو میں اس کا ترجمہ پیش کرتے ہیں تاکہ اُردو دنیا اس اخلاقی مضمون سے واقف ہو ؎

ہم اپنے آپ نہیں جب تو ہونگے غیر کے کیا ٭ زمانہ شاد ہم ایسوں سے احتراز کرے

ترجمے کے علاوہ خاص فارسی رنگ میں بھی غزل لکھی ہے ۔ یہ غزلیں اس پایہ کی ہیں کہ نظیری و عرفی وغیرہ کے کلام سے ٹکر کھاتی ہیں، اندازِ بیاں، زورِ کلام اور الفاظ کا باموقع استعمال جادو کا کام کرتا ہے ؎

کہاں مفر کہ ہنوز اس نگہ کے قبضہ میں ٭ حسامِ سرمۂ دنبالہ دار باقی ہے

نہ رات کٹتی ہے کمبخت امیدواروں کی ٭ نہ دل کو حوصلۂ انتظار باقی ہے

چشم سیہ میں سرمہ دے زلفِ رسا میں شانہ کر ٭ قتلِ جہاں کے واسطے تازہ پھر اک بہانہ کر

کھلے تھے بال جنازے پہ کب مگر اب تک ٭ کفن میں نکہتِ گیسوئے یار باقی ہے

فارسی زبان کی شاعری کے لوازمات کو بھی نہایت خوبی سے حضرتِ شاد اُردو میں لائے ہیں اس لئے جس حد تک زورِ کلام اور پختگی کا تعلق ہے اُردو کا کوئی شاعر اِس خاص وصف میں حضرت شاد کا مقابلہ نہیں کرسکتا بلکہ ان کے دعوی کو " پڑھے کلمہ زبان فارس اس بانگ حجازی کا " دیکھ کر جب ان کے کلام کا اندازہ کیا جاتا ہے تو یہ لحاظ چستی، برجستگی، زور، پختگی اور قدرتِ کلام فارسی شعراء کے دوش بدوش نظر آتے ہیں لیکن یہ چیزان میں فارسی شعراء کے کلام کے تتبع سے پیدا ہوئی ہے، جیسا کہ اوپر کے اشعار سے ناظرین نے اندازہ کیا ہوگا ۔ فارسی کے خوش گو شعراء کے کلام نے حضرت شاد کے دل میں تحریک پیدا کی اور انھوں نے اس مخصوص طرزِ ادا کو مدِنظر رکھ کر کچھ نہ کچھ برجستہ لکھا : مثلاً حضرت سنائی کے قصیدہ کا مشہور شعر ہے ؎

مکن در جسم و جاں منزل کہ ایں دون است و آں والا ٭ قدم زیں ہر دو بیروں نہ، نہ ایں جا باش و نے آں جا

ہے تو یہ قصیدہ کا شعر لیکن حضرت شاد کو پسند آگیا۔ اسی طرز، اسی بحر اور اسی انداز میں یہ غزل لکھی ؎

کوئی پہنچا نہ تا مقصود سبحان الذی اسریٰ　　کھلا آئینہ دارِ لو کشف پر دمس ما اوحیٰ
اُمنڈ آیا ہے دریائے فنا اک شور ہے دل میں　　بچا لے اے امیدِ بے کساں اے عالم النجویٰ
نوا سنجو مرے نغموں کا غل ہے عرشِ اعظم پر　　خوش آواز و اسیر طوبیٰ یہ جاتا ہے مرا نالہ

اسی طرح ایک غزل خاص اسی رنگ کی ہے جس میں عارفانہ مضمون کی بلندی کے ساتھ پختگی، زورِ کلام، طرز ادا کا پتہ ملتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ ارد و میں حضرت سنائی سخن سنجی میں مشغول ہیں۔ چند دیگر اشعار ملاحظہ ہوں ؎

اے ازلی الوجود، اے ابدی البقا　　بے ادبانہ نہ چل حلقۂ طاعت میں آ
جان صداقت پہ دے، صدق ہے فطرت تری　　زیست کی پروانہ کر، زیست ہے دام فنا
فرشِ زمیں اے بشر ہے تری تعلیم گاہ　　جملہ شئونات کے، معنی و مطلب لگا
زندگی دائمی، کی جو تجھے ہے تلاش　　ذات میں اپنی فنا ہو کے طلب کر بقا

قرۃ العین طاہرہ ایک زبردست ایرانی شاعرہ گذری ہے۔ اس کے طرز میں بھی جیسا کہ خود حضرت اشاد نے مجھ سے فرمایا تھا ایک غزل لکھی تھی۔ ملاحظہ ہو ؎

تیرے مہماں ہیں جہاں بٹھا، سرِ عرش در روئے زمیں سہی
ہمیں بیٹھ رہنے سے کام ہے، کوئی جا نہیں تو نہیں سہی

زچہ رو "الست بربکم"، نہ زنی؟ بزن کہ بلا بلا
نہ بلا بلا ہو تو لا و لن، نہیں لا و لن تو نہیں سہی

ہمہ شب زخیل کروبیاں، رسد ایں صدائے مہیمنی
کہ محاسبہ سے مرے ڈرو، مری بخششوں کا یقیں سہی

صفِ اولیں تو ہے خاص صف، وہاں پاؤں جانہ کہاں شرف
صفِ آخریں سے بھی دور تر، جو اشارہ ہو تو وہیں سہی

درِ میکدہ کے شگاف سے مجھے جھانک لیں یہی تھی ہوس

یہ نہیں تو پھر درِ صومعہ جو قریب ہو تو وہیں سہی

لَمَعَاتُ وَجْهِكَ اَشْرَقَتْ وَشُعَاعُ طَلْعَتِكَ اعْتَلَا

سب اسی میں جل کے فنا ہوئے خسِ کفر و خرمنِ دیں سبھی

وَاِذَا مَرَرْتَ عَلَى الدِّيَارِ فَقُل لَهَا مُتَحَسِّرًا

کہ نہ آؤ نیست کدے میں جب جیں یاد کرلو وہیں سہی

اُسے کیا پڑی کہ الٹ کے وے اُسے اور موقع این و آں

ترا بندہ ہے ترے بس میں ہے وہ ہزار منکرِ دیں سہی

اسی طرح مختلف وقتوں میں مختلف تحریکیں حضرتِ شاؔد کی سخن گوئی کا باعث ہوتی رہی ہیں اور برجستہ غزلیں لکھی ہیں۔ خسرو کے کلام کے مطالعہ کے وقت اس غزل کی زمین پسند آگئی جس کا ایک ٹکڑا یہ ہے۔ "زلف چلیپا اک طرف" وہیں حاشیہ پر برجستہ اردو میں بائیں طرف یہ غزل لکھ ڈالی۔ ملاحظہ ہو ؎

میں شاؔد تنہا اک طرف، دنیا کی دنیا اک طرف	سارا سمندر اک طرف، آنسو کا قطرہ اک طرف
اس آفتِ جاں کو کبھی پردہ اٹھانا ہی نہ تھا	اک سمت عیسیٰ دم بخود، غش میں ہیں موسیٰ اک طرف
ساقی بغیر احوال یہ پہنچا ہے میخانے کا اب	جام اک طرف ہے سرنگوں، خالی ہے مینا اک طرف
یارب مفر اس حسن سے دل کو کسی جانب نہیں	ترچھی نگاہیں ایک سو، زلفِ چلیپا اک طرف

وہ تیغ ٹیکے کہتے ہیں دیکھوں تو حق پر کون ہے

میں اک طرف شاؔد اک طرف، سارا زمانہ اک طرف

فارسی ترکیبوں کے استعمال کے ساتھ عربی ترکیبیں، فقرے اور حافظؔ کی طرح مصرعے اور شعر بھی غزل میں خوبصورتی سے داخل کیے ہیں۔ یہ بھی ایک غیر معمولی خصوصیت ہے جس کا نمونہ یہ ہے ؎

جام مے پُر ساز ساقی قبل ان یاتی الصباح ٭ اُف اگر دل کھول کر پینے کا ارماں رہ گیا

سبق السعی منی کا بھلایا شاؔد کیوں تم نے ÷ گلہ کس کا تمہیں خود پائے خواب آلود نے مارا

کون کھولے گا مرے دل کی گرہ واسفا ÷ کون سلجھائے گا الجھا ہوا گیسو تیرا

ایک بے ۔ ردیف کی غزل میں جو بجائے خود ایک خصوصیت ہے عربی قافیہ تجویز کیا ہے اور فقرے بھی عربی ہیں ۔ فرماتے ہیں ؎

کٹے تیغ سے بھی اگر گلا، ترے ظلم کا نہ کروں گلہ ÷ کہوں وجد میں یہی بر ملا انا الشہید بکربلا
رہِ عشق میں جو رکھا قدم، چلے الطرح سے بجوف ہم ÷ چلے حاج جیسے سوئے حرم متساعیاً متضرعاً
مرا سر نہے جو سر سناں، مرا تن ہو خاک پہ خونچکاں ÷ لب زخم سے یہ کرو دل عیاں کہ انا لقتیل مرسلا

ایک غزل میں یہ التزام ہے کہ ایک مصرع عربی ہے تو دوسرا اردو ۔ بعض بعض شعر عربی کے موزوں ہوگئے ہیں جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ فارسی کی زبردست استعداد کے علاوہ حضرت شاؔد عربی سے بخوبی واقف تھے ؎

میکدے میں تو ہے یکتا ساقیا ÷ انما اللہ اللہ واحدا
انتبہ یا قلب واشرب جرعۃً ÷ عن صبوحی نزلا لا طیباً
ظلمۃٌ فی ظلمۃٍ فی ظلمۃ ÷ جب نہ کچھ سوجھے تو پھر بتلائیں کیا
آہ کم قیسٍ کئیب فی غمک ÷ پردۂ محمل تو اے لیلیٰ اٹھا
ایہا الشاد ایہا الشیخ الکبیر ÷ ہاں سنبھل جا عمر کا دھوکا نہ کھا

حضرت شاؔد جن کی طبیعت دردمند اور گداز واقع ہوئی تھی ۔ بھاشا اور ہندی کے جذبات سے کیونکر نا آشنا رہ سکتی تھی چنانچہ اس کی طرف بھی آپ نے توجہ کی اور اشعار لکھے اور اردو زبان کو اس سے آشنا کرنا چاہا ۔ مثلاً بھاشا کا شعر ہے ؎

(۱) مکتا وا کے کان میں کیہ کارن ٹکیائے ÷ ترچھی چتون سے ڈر کے پھر نہ بیدھا جائے

یعنی ۔ اس کے آویزۂ گوش میں موتی کیوں لٹک رہا؟ سوال کرنے کے بعد شاعر خود ہی جواباً کہتا ہے :۔

ترچھی نگاہ اور بانکی چتون سے کہیں پھر نہ اس کا سینہ چھیدا جائے ۔ (جذبات بھاشا)

حضرت شاد پہلے مصرع کو کس خوبی سے اُردو کا جامہ پہنا کر ایک نیا مضمون پیدا کر دیتے ہیں ؎

۔ موتی تمہارے کان کے تھرا رہے ہیں کیوں ٭ فریاد کس غریب کی گوش آشنا ہوئی

۲ ۔ ایک تو نینا مدھ بھرے دوجے بخن سار ٭ ارے باؤرے کیوں دیت ہے متوارن ہتھیار

یعنی ایک تو یونہی تیری آنکھیں نشیلی تھیں دوسری اس پر طرہ تحریر سرمہ۔ ارے دیوانے یہ کیا قیامت کی؟ کوئی متوالوں اور بدمستوں کے ہاتھ میں ہتھیار دیتا ہے۔ ہائے یہ مست انکھڑیاں یونہی کیا کم سفاک تھیں جو تیغ نگاہ پر اور سرمہ کی باڑھ رکھی گئی۔

ان تخیل کو حضرت شاد فارسی ترکیبوں اور بیساختہ رعایت لفظی کے ساتھ پر زور انداز میں (جذبات بھاشا) پیش کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو

؎ کہاں مفر کہ ہنوز اس نگہ کے قبضہ میں ٭ حسام سرمہ دنبالہ دار باقی ہے

۳ ۔ جلج بھیو کہیر بھیو سوان بھیو بھر آئے ٭ اب آباہ چاہت بھیو بر با بری بلائے

بھاشا کے اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ درد محبت بری بلا ہے۔ جس نے جونک شیر سوہان (سنگ) بن کر میرے جسم کے خون گوشت اور ہڈی کو باقی نہیں رکھا اور اب یہ تمنا کر رہا ہے کہ ہڈیوں کے ڈھانچہ کو بھی باقی نہ رکھے یعنی میرا وجود ہی باقی نہ رہے۔ نیاز صاحب جذبات بھاشا میں اس شعر کا مطلب لکھتے ہوئے دعوی کیا ہے کہ "یہ انداز مخصوص ہے بھاشا کیلئے، اُردو فارسی میں میری نگاہ سے نہیں گذرا۔" کاش کہ حضرت شاد کا یہ شعر نیاز صاحب کی نظر سے گذرا ہوتا تو پھر وہ غالباً اردو ادب سے اس قدر مایوس نہ ہوئے ہوتے

مرض کی دھیمی دھیمی آنچ کیا دھوکے میں رکھتی ہے ٭ مریض عشق کب جیتا کہ جب نوبت بجاں پہنچی

ہندی تخیل کے ساتھ ساتھ خاص ہندی طرز ادا میں بھی اردو اشعار لکھے ہیں ؎

کالی کالی یہ گھٹائیں یہ پپیہوں کی پکار ـــــ دھیمی دھیمی یہ پھوار ،
اب کے ساون بھی ہمارا یونہی رونیں کٹا ـــ کیا کہیں جیب کے سوا

فارسی میں موسم بہار کی طرح، ہندی میں ساون کا مہینہ ولولہ خیز ہوتا ہے۔ اس مہینہ کی خاص محاکات کے بعد "کیا کہیں جیب کے سوا" کے ٹکڑوں کو خیال کیجئے۔ صنف نازک محبوب کی یاد کے بعد اس سے زیادہ اور کیا کر سکتی ہے۔ کس قدر نفسیاتی اور جذباتی اجمال میں تفصیل مضمر ہے۔ حضرت شاد نے خاص ہندی الفاظ اور ترکیبوں اور تشبیہوں کو بھی نہایت خوبی سے استعمال کیا ہے، جس سے کلام میں خاص لوچ پیدا ہو گیا

رس بھری ہائے وہ آنکھیں تری کالی کالی ۔ بے پئے متوالی ٭ سانولا رنگ نمک ریز جراحات بقا ۔ اُف کہاں دیکھا تھا

رس بھری کالی کالی آنکھیں اور سانولا رنگ یہ سب خاص ہندی کی چیزیں ہیں۔ باکمال شاعر نے ہندی اور فارسی الفاظ اور مفہومات کو دست وگریباں کرکے عجیب دادِ بلاغت دی ہے۔ اسی طرح آئندہ اشعار میں جھولا، دھانی دوپٹہ، رات کو جوگن لٹ چھٹکائے اور بھونرا سے بال جو خاص ہندی تشبیہ ہے، استعمال کرکے عجیب کیف بھر دیا ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

کالی گھٹائیں، باغ میں جھولے دھانی دوپٹے لٹ چھٹکائے
مجھ پہ یہ قدغن آپ نہ آئیں اُف ری جوانی ہائے زمانے

رات چلی ہے جوگن بن کر، اوس سے اپنے منہ کو دھو کر
لٹ چھٹکائے بال سنوارے، اٹھ مرے کالی کملی والے

رات کو جوگن سے تشبیہ دینا کس قدر کیف آور ہے اور اوس سے مُنہ دھونا کتنا لطیف تخیّل ہے

؎ بہارِ باغِ حُسنِ یار کو کیا کیا بڑھاتی ہے ۔۔ چمک اس چمپئی رنگت کی ان بھونرا سی بالوں میں

بال کو بھونرا سے تشبیہ دینا کس قدر مناسب اور موزوں ہے۔

ہندی الفاظ کا متانت اور اعتدال سے استعمال اُردو میں کس قدر جان پیدا کر دیتا ہے ؎

دیکھنا تیرا کن انکھیوں سے آڑی برچھی ــــــ یار اس کی نہ سہی
کب کو گنتی میں ہے وہ "گھاؤ" جو اوچھا سا لگا ــــــ پھر کے پھر دیکھ ذرا

کالی کالی آنکھیں ہیں اور گوری رنگت ہے ۔۔ لمبے لمبے گیسو ہیں اور بھولی بھولی صورت ہے
آڑی آڑی چتون ہے اور ٹیڑھی ٹیڑھی ابرو ہیں ۔۔ نیچی نیچی نظریں ہیں اور کچھ کچھ دل میں الفت ہے

دیکھئے ہندی الفاظ کی تکرار نے کتنا لطف پیدا کر دیا ہے۔ اسی طرح کن انکھیوں کو آڑی برچھی قرار دینا اور زخم کے بجائے گھاؤ استعمال کرنا ہندی الفاظ کے موزوں استعمال کی دلپذیر کوشش ہے۔

پختگی کلام اور

حضرت شاد کے کلام میں جس قدر پختگی اور الفاظ کے استعمال پر قدرت نظر آتی ہے اس کا اظہار کسی قدر اوپر ہو چکا ہے لیکن مزید تفنیت کے لئے کچھ اور اضافہ کیا جاتا ہے۔ اس سے اس پر خاص

درجۂ استادی

روشنی پڑیگی۔ شاگردوں کے مختلف کلام پر اسی رنگ میں برجستہ اصلاح دینی آپ ہی کا حصّہ تھا۔ معمولی سی غزل کو ذراسی توجہ میں زمین سے آسمان پر پہنچا دینا آپ ہی کا کام تھا۔ تفصیلی طور پر اگر اس صفت کو بھی نمایاں کیا جائے تو مضمون کی طوالت کا اندیشہ ہے اس لئے کچھ اشعار نقل کر دیتے ہیں تاکہ زورِ کلام کا اندازہ ہو سکے ؎

میں جی میں خوش کہ دلِ داغدار باقی ہے ۔۔۔ وہ گھات میں کہ چوٹیلا شکار باقی ہے
نگاہِ ناز تو مستوں کو کر چکی مدہوش ۔۔۔ وہ آئے بزم میں جو ہوشیار باقی ہے
ترے اسیر چھٹے قیدِ جسم سے تو کیا ۔۔۔ ہنوز معرکۂ گیر و دار باقی ہے
ہنوز ثبتِ حق ہے یہ خامۂ دو زباں ۔۔۔ ہنوز معجزۂ ذوالفقار باقی ہے
مٹے ہوؤں کی طرح کیوں کشش ہی ہو دل کو ۔۔۔ یقیں ہے کچھ تو میانِ مزار باقی ہے
سمجھ کے دیتا ہے ساقی شراب رندوں کو ۔۔۔ ہنوز فرقِ یمین و یسار باقی ہے
چلے نہ جائیں وہ مقتل سے دھو کے خنجر کو ۔۔۔ پکار دو کہ اک امیدوار باقی ہے

اور اشعار ملاحظہ ہوں معلوم ہوتا ہے کہ الفاظ نگینے کی طرح اپنی جگہ پر جڑے ہوئے ہیں ؎

دہن سے دیر میں نکلی تھی کعبہ میں فغاں پہنچی ۔۔۔ پکارا تھا کہاں اس کو پکار آخر کہاں پہنچی
حریفوں نے بٹھا رکھے ہیں ہر سو پاسباں دَر پر ۔۔۔ یہ نوبت تیرے میخانے کی اے پیر مغاں پہنچی
پڑا بسمل کے روح و تن کا جھگڑا کس تذبذب میں ۔۔۔ رُکا کب دستِ قاتل جب چھری تا استخواں پہنچی
تم اس کوچہ کی حالت سالکوں سے پوچھتے کیا ہو ۔۔۔ ادھر رکھے قدم اور ناک میں لب تک جاں پہنچی
اثاثہ عمر بھر کا سب اسی پردیس میں چھوڑا ۔۔۔ وطن میں روح پہنچی ہاں مگر بے خانماں پہنچی

بلایا کوہ پر شیریں کو اے فرہاد کیا کہنا ۔۔۔ بڑے پتھر کو پانی کر دیا استاد کیا کہنا

نگاہِ سرسری میں کچھ نہیں سادہ مسلماں ہے ۔۔۔ صفِ کفّار میں کھلتا ہے جوہر مردِ غازی کا

یہ سب اشعار جو گزر چکے ان سے نہایت درجہ کی پختگی، روانی اور قدرت کلام ظاہر ہوتی ہے۔ اس خاص وصف میں حضرت شاؔد کا کوئی حریف نظر نہیں آتا۔ ان کی استادی کا درجہ ان اصلاحوں سے بخوبی واضح ہو سکتا ہے جو بکثرت اور برجستہ (یہ وصف انھیں کے لئے مخصوص تھا) شاگردوں کے کلام پر دی ہیں۔ کاش یہ اصلاحیں منظر عام پر آجائیں تو نومشق اور کہنہ مشق سب کے لئے دلیل راہ ہوں۔ بشرطیکہ لوگ کتمان حقیقت نہ کریں۔

اخلاقی مضامین ۔ غزل میں اخلاقی مضامین کا رواج غالبًا فارسی کے تتبع سے اُردو میں ہوا۔ کوئی اخلاقی بات اگر سادہ طور پر کہہ دی جائے تو اُس میں تاثیر نہیں ہو سکتی لیکن انداز بیان شاعرانہ ہے تو جادو کا اثر ہوگا۔ حضرت شاؔد کے کلام میں اخلاق کا کافی عنصر موجود ہے۔ قناعت پسندی، عزتِ نفس، آرزوئے ارتقا، صداقت، استغنا وغیرہ کی تعلیم شاعرانہ طرز ادا میں موجود ہے۔

قناعت پسندی :۔ شاعر کا دل اسباب تمدن سے گھبرا گیا ہے، فطرت کی سادگی مرغوب ہے پانی پینے کے لئے جام جم کی ضرورت نہیں کہ ٹوٹ جانے کے بعد نہ مل سکے، جام سفال بھی بیکار ہے کہ ٹوٹ جانے پر بار بار منگانا پڑے گا، البتہ جامِ خدا داد یعنی چلّو ہر وقت ساتھ موجود ہے جس کے لئے تردد کرنے کی ضرورت نہیں۔ فرماتے ہیں ؎

مانگنے کی نہ منگانے کی ضرورت ای رند ؛ شکر کر جامِ خداداد ہے چلّو تیرا

عرفان حقیقت انسانی یہی انسان ہے جو اپنے مرتبۂ انسانیت کو کھو کر زمرۂ حیوان میں داخل ہو جاتا ہے پھر یہی انسان ہے کہ عُلّو روح کی بدولت ملکوتی صفات کا مظہر بنتا ہے۔ ساری کائنات اس کے لئے مسخر کر دی گئی ہے، وہ خلیفۃ اللہ ہو کر ساری مخلوقات پر حکمرانی کر سکتا ہے۔ اسکی فطرت میں ساری صلاحتیں ودیعت کر دی گئی ہیں۔ کیا کچھ نہیں کر سکتا۔ حضرت شاؔد انسان کو اپنی بلند حقیقت پہچاننے کے لئے طرح طرح سے ترغیب دیتے ہیں ؎

خاک کے پتلے سنبھل اور خاک کا پتلا نہ بن ؛ تیری تو مسند ہے عرش خاک کجا اور تو کجا

عرصۂ کون و مکاں ہے تیری زنبیل میں ؛ فیض تو افزوں ز حصر جود تو فوق العطا

تیری حقیقت تلک کس کی رسائی ہوئی　　ہے ترے بچوں کا کھیل مسئلۂ ارتقا

در صفتِ برتری چوں تو فلک کے بود　　ذاتِ تو خالص لجیں دے بود اقلیما

مصائب کی برداشت :۔ انسان وہ ہے جو خندہ پیشانی سے مصائب برداشت کر لیتا ہے اور بڑی بڑی مصیبتوں کو جھیلتا ہے۔ زندگی درحقیقت اسی کی زندگی ہے۔ اس مضمون کو کس خوبصورتی سے بیان کرتے ہیں ؎

نگہ کی برچھیاں جو سہہ سکے سینہ اسی کا ہے　　ہمارا آپ کا جینا نہیں جینا اسی کا ہے

خاروں میں ہے گھرا ہوا چاروں طرف سے پھول ؛ اس پر کھلا ہی پڑتا ہے کیا خوش مزاج ہے

صداقت :۔ صداقت ملکۂ انسانیت کا مابہ الامتیاز وصف ہے اس کے قائم رکھنے میں جان بھی چلی جائے تو مضائقہ نہیں۔ دیکھئے اس کو کس خوش اسلوبی سے ادا کرتے ہیں ؎

جان صداقت پہ دے صدق ہے فطرت تیری ؛ زیست کی پروا نہ کر زیست ہے دام فنا

ظلم کا عدم اطاعت :۔ اظہار حق کی دعوت دیتے ہیں۔ مظلوم کے آگے سر نیاز جھکانے سے روکتے ہیں۔ اس کے لئے جان بھی چلی جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ واقعہ کربلا کو شہادت میں پیش کر کے بیان کو پُرزور بناتے ہیں ؎

موردِ آفات رہ، ظلم کا تابع نہ بن ؛ بھول نہ بھولے سے بھی واقعۂ کربلا

سوال سے عار :۔ طلب سے سخت عار ہے۔ فرماتے ہیں ؎

طلب کرتے نہیں ساقی سے گو افراط سو مے ؛ زباں روکے ہوئے ہیں رنگِ محفل دیکھنے والے

باطنی اصلاح :۔ ظاہری اصلاح پر باطنی اصلاح مقدم ہے۔ فرماتے ہیں ؎

شستگیِ زباں عبث دل میں بھری ہیں خار و خس ؛ چھوڑ ابھی برونِ در فکر درونِ خانہ کر

اہل غرض کو آشنا بھی نہیں پہچانتا

کتنا صحیح خیال ہے۔ اہل دنیا کی سچی حالت کا نقشہ ہے ملاحظہ کیجئے ؎

ایسا نہیں کہ پہلے سے وہ جانتے نہیں ؛ کچھ غرض جب سے کی مجھے پہچانتے نہیں

احسانمندی سے گریز۔ احسان اٹھانا کسی حال میں پسند نہیں۔ بلند تخیل سے بیان کو پُر زور بناتے ہیں ؎

نہ لوں کشتی کا بھی احسان سر بر عین طوفاں میں ٭ نہ پوچھوں خضرؑ تک سے وادیٔ پر ہول میں رستہ

حد یہ ہے کہ راستہ پوچھ کر بھی احسان لینا گوارا نہیں ؎

راستہ پوچھ کے دوں غیر کو تکلیفِ جواب ٭ روک لیتی ہے مجھے اس سے بھی غیرت میری

خود اعتمادی اس خیال کو کہ جب تک اپنے اندر صلاحیت نہ ہو اس وقت کوئی دوسرا بھی مدد نہیں دے سکتا۔ تمثیلی رنگ میں کس خوبی سے پیش کرتے ہیں ؎

کچھ اپنے پاؤں کی طاقت بھی چاہئے ای پیر ٭ یہی نہیں تو مددگاریٔ عصا معلوم

ردیف کس خوبصورتی سے مستعمل ہوئی ہے۔ اس مضمون کو اور بلند کر کے کہتے ہیں کہ کسی سے مدد کی توقع بیکار ہے۔ تو آپ اپنا مددگار اور چارہ گر ہے۔ حقیقت میں کتنی بلند تعلیم ہے۔ اگر انسان کے دل میں یہ جذبہ پیدا ہو جائے تو کیا کچھ نہیں کر سکتا۔ اس سے بڑھ کر خود اعتمادی کی تعلیم نہیں ہو سکتی ؎

چارہ گر کون زمانہ میں ہے چارہ کس کا ٭ آپ تو اپنا سہارا ہے سہارا کس کا!

دشمن کی بہی خواہی ۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تھا " تو دشمن کو بھی پیار کر" کتنا بلند خیال ہے حضرت شاؔد دل کش انداز میں فرماتے ہیں ؎

عدو تک کی بہی خواہی رہی مقصود باطن میں ٭ بظاہر ہو زباں پر بد دعا دل سے دعا نکلے

دنیا کی حالت ۔ شاعر نے دنیا کی کیفیت کو نہایت ہی لطیف انداز میں پیش کیا ہے۔ غفلت ہوئی اور سرمایہ غائب ؎

قمار خانہ ہے بزمِ دنیا، بڑے کھلاڑی کا سامنا ہے ٭ گرہ سے پونجی گنوائی اس نے، یہاں فرا بھی جو چال چوکا

جو مستعدی سے آگے قدم بڑھاتا ہے وہی کامیاب ہو کر رہتا ہے۔ کس خوش اسلوبی سے فرماتے ہیں ؎

یہ بزمِ مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی ٭ جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

اصلی رنگ ۔ حضرت شاؔد کی شاعری بوالہوسانہ اور سوقیانہ اندازِ بیان سے قطعاً پاک ہے۔ عارفانہ اور صوفیانہ مضامین کو شاعرانہ پیرایۂ بیان میں نہایت ہی خوبی سے ادا کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں غیر مہذب

اور مبتذل الفاظ اور مفہوم کا شائبہ بھی نہیں ہے۔ یہی وہ اصلی جوہر ہے جو ان کو سارے شعرائے اُردو کی صف میں ممتاز جگہ دیتا ہے لیکن مسلم ہے کہ عارفانہ رنگ سن و سال کی پختگی کے ساتھ نمایاں ہوتا گیا ہے۔ ابتدائی شاعری یعنی عنفوان جوانی میں عاشقانہ رنگ کا سراغ ملتا ہے لیکن اس زمانہ کے بھی جو جذبات ہیں ان میں ابتذال بالکل نہیں پایا جاتا بلکہ عشق و محبت کے حقیقی جذبات ہیں جو پاکیزگی کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔ مثلاً یہ غزل اس لحاظ سے عاشقانہ رنگ کا بہترین نمونہ ہے ؎

ایک ستم اور لاکھ ادائیں اُف ری جوانی ہائے زمانے
ترچھی نگاہیں تنگ قبائیں اُف ری جوانی ہائے زمانے

ہجر میں اپنا اور ہے عالم ابرِ بہاراں، دیدۂ پُر نم
ضد کہ ہمیں وہ آپ بلائیں اُف ری جوانی ہائے زمانے

کالی گھٹائیں، باغ میں جھولے، دھانی دوپٹے لٹ چھٹکائے
مجھ پہ قدغن آپ نہ آئیں اف ری جوانی ہائے زمانے

پچھلے پہر اُٹھ اُٹھ کے نمازیں ناک رگڑنی سجدوں پہ سجدے
جو نہیں جائز اس کی دعائیں اُف ری جوانی ہائے زمانے

شاؔد نہ وہ دیدار پرستی، اور نہ وہ بے نشہ کی مستی
تجھ کو کہاں سے ڈھونڈھ کے لاؤں اُف ری جوانی ہائے زمانے

یہ غزل ہے تو جوانی کا مرثیہ لیکن عاشقانہ جذبات کا عجیب عالم نظر آتا ہے۔ فراقِ یار میں روتے روتے جان پر بن گئی ہے لیکن عاشقانہ خودداری کا یہ عالم ہے کہ بلانے کے منتظر ہیں۔ وارداتِ عشق کی کتنی سچی تفسیر ہے۔ پھر پچھلے پہر اُٹھ اُٹھ کر جو جائز نہیں اس کی دعا مانگنا کچھ عجیب دلدوز کیفیت کا اظہار ہے جس کی تشریح ممکن نہیں۔ اس رنگ میں جہاں خارجی پہلو پر روشنی ڈالتے ہیں تو دوسری ہی کیفیت نظر آتی ہے۔ جب ہی تو مولانا عبدالسلام ندوی شعر الہند میں اہل لکھنؤ کو اس رنگ کا اظہار کر کے عبرت دلاتے ہیں۔

ملاحظہ ہو ؎

سر پہ کلاہِ کج دھری زلفِ دراز خم بہ خم ٭ آہوئے چشم ہے غضب ترکِ نگاہ ہے ستم
چاند سے منہ پہ خال دو ایک ذقن پہ رخ پہ ایک ٭ اس سے تباہیِ عرب اس سے خرابیِ عجم

غرض حضرتِ شاد اس رنگ میں گوناگوں جذبات و خیال خارجی اور داخلی مضامین کو نئے نئے انداز سے پیش کرتے ہیں ۔ عاشق کے بیباکانہ اقدام کے وقت تلملاہٹ اور معشوق کے پُر معنی حجاب کو دلکش طریقہ سے لکھتے ہیں ؎

قدم اٹھا کے مرا تلملا کے رہ جانا جھکا کے سر کو ترا مسکرا کے رہ جانا

اسی طرح یہ مطلع بھی کس غضب کا ہے ؎

چشمِ سیہ میں سرمہ دے، زلفِ رسا پہ شانہ کر ٭ قتلِ جہاں کے واسطے تازہ پھر اک بہانہ کر

اور جہاں جذبات و کیفیات کا اظہار کرتے تو الفاظ میں نقاشی نظر آتی ہے مثلاً ؎

ہے ہے مری چشمِ حیرت کا سب دردِ دل ان سے کہہ جانا
دانتوں میں دبا کر ہونٹ اپنا کچھ سوچ کے ان کا رہ جانا

اُف اُف وہ ہتھیلی سے ان کا، شرما کے چھپانا آنکھوں کو
برچھی کا ادا سے چل جانا، اس تیرِ نظر کا رہ جانا

ہم باغ میں ناحق آئے تھے، بلبل کی حکایت کیا کہئے
منقار کو رکھ کر کلیوں پر ، کچھ اپنی زباں میں کہہ جانا

مانا کہ فقط موہوم سہی ، ملنے کی ہمیں اک آس تو ہے
دیدار تو ہونے دیدۂ تر، بہنا ہو اگر پھر بہہ جانا

ایک دن حضرتِ استاد (شادؒ) کی خدمت میں حاضر ہوا اور بابا فغانی کا ذکر چھیڑا تو اس کا یہ شعر پڑھ کے رونے لگے ؎

دلے می باید و صبرے کہ آرد تابِ بیدادش فغانی گر دلے داری تو باش اینجا کہ من رفتم

اسکے بعد انہوں نے فغاں کا مطلع جو اسی زمین میں ہے پڑھا تو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ مطلع یہ ہے ؎

بہ بوئے مصحفم گریاں بہ گلگشت چمن رفتم — نہادم روئے بر روئے گل و از خویشتن رفتم

اور پھر فرمایا کہ اسی جذبہ کو میں نے بھی لکھا ہے اور اس کے بعد اپنا شعر "ہم باغ میں ناحق آئے تھے" پڑھا اور یاس و حسرت کی مجسم تصویر بنے ہوئے تھے۔

حضرت شاد کی طبیعت میں غضب کا درد اور سوز و گداز تھا دردانگیز شعر پڑھتے وقت آبدیدہ ہو جاتے غمناک واقعہ سنکر بے چین ہو جاتے۔ جس کی یہ کیفیت ہو اس کے شعر کا کیا پوچھنا۔ اپنی اسی حالت کا ایک جگہ اس طرح اظہار فرماتے ہیں ؎

جب کسی نے حال پوچھا رو دیا ؛ چشم تر تو نے تو مجھکو کھو دیا۔

ان کے کلام میں اس وصف کا اظہار ہوتا ہے تو بالکل میر کی زبان بولنے لگتے ہیں اور ان کے کلام پر میر کے کلام کا شبہ ہونے لگتا ہے۔ مثلاً ؎

رہ رہ کر گھبراتا ہے دل شام سے امڈا آتا ہے ؛ تازہ تازہ عشق ہوا ہے دھیمی دھیمی وحشت ہے

سوز و گداز اور حسرت و یاس کا رنگ جو میر کی ہمنوائی کر رہا ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

صدا کل رات سے الفت کا آزاری نہیں دیتا ؛ غریب آخر ہوا اب شاید کہ دل یاری نہیں دیتا

اور فرماتے ہیں ؎

میں ہوں اور باتیں شب غم میں دل ناکام سے ؛ سو رہے ہیں اپنے اپنے گھر میں سب آرام سے

میر بہار۔ کس قدر سچا، سادہ اور پُرحسرت مضمون ہے۔ غرض جذبات، کیفیات، سوز و گداز، اصلیت اور متانت کے لحاظ سے حضرت شاد میں میر کے بہت سے خصوصیات پائے جاتے ہیں۔ مرثیہ میں آپ انیس کے متبع تھے۔ اور غزل میں میر کے۔ چنانچہ ان دونوں کی یاد ان کے کلام میں پائی جاتی ہے ؎

انھیں دونوں سے عزت رہ گئی اے شاد اردو کی — انیس اپنے بدل پہ ہیں تصدق میر کے صدقے

اس لئے بقول علامہ سلیمان ندوی حضرت شاد کو میر بہار کہا جائے تو بجا ہے کیوں کہ بڑی اور چھوٹی دونوں بحروں میں اکثر وہی انداز بیان، وہی فقیرانہ صدا اور وہی سوز و گداز اور حقیقی جذبات ہیں۔ بحر طویل کے اشعار

ملاحظہ ہوں ؎

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم
تعبیر ہے جس کی حسرت و غم اے ہم نفسو وہ خواب ہیں ہم

ہے دل میں تڑپتے جی بھر کر پر ضعف نے مشکیں کس دی ہیں
ہو بند اور آتش پر ہو چڑھا سیماب بھی وہ سیماب ہیں ہم

میں حسرت و حیرت کا مارا خاموش کھڑا ہوں ساحل پر
دریائے محبت کہتا ہے آ کچھ بھی نہیں پایاب ہیں ہم

مرغانِ چمن کو پھولوں نے اب شادیہ کہلا بھیجا ہے
آ جاؤ جو تم کو آنا ہو ایسے میں ابھی شاداب ہیں ہم

بحرِ طویل کے کچھ اور اشعار ملاحظہ ہوں تاکہ قدرتِ کلام کے ساتھ ساتھ رنگِ تیر کا پتہ چل سکے ؎

اعضائے بدن سب مضطر ہیں اس دل کے شہادت پانے سے
لشکر میں تلاطم برپا ہے سردار کے مارے جانے سے

آنکھوں سے سدھاری بینائی سننے سے معطل گوش ہوئے
جب ہوش تھے تب مدہوش رہے جب ہوش نہیں تب ہوش ہوئے

دل اس کی طلب میں صادق تھا گھبرا کے سوئے مطلوب گیا
دنیا سے یہ موتی نکلا تھا دریا ہی میں جا کر ڈوب گیا

طاقت جو نہیں اب حیرت سے تصویر کا عالم رہتا ہے
وہ آخر شب کی آہ گئی وہ نعرۂ یا محبوب گیا

چھوٹی بحر ۔ چھوٹی بحر کے اعتبار سے بڑی بحر میں شعر کہنا آسان ہے لیکن اس میں کمال پیدا کرنا مشکل ہے۔ اس میں الفاظ کو اس طریقہ سے برتنے کی ضرورت ہے ۔گویا موتی کی لڑیاں معلوم ہوں۔ اس

بحر کا تو اندازہ کر چکے اب دیکھئے چھوٹی بحر میں کیا کہتے ہیں؟ حقیقت تو یہ ہے کہ مختصر سے الفاظ میں مطالب کثیرہ اور بلند خیالات کو ادا کرنا گویا دریا کو کوزہ میں بند کرنا ہے۔ اس بحر میں حضرت شادؔ نے بعض غزلوں میں صرف قافیہ پر قناعت کی ہے جو بجائے خود ایک وصف ہے۔ دیگر اساتذۂ متقدمین مثلاً حضرت دردؔ وغیرہ کی طرح میرؔ کا یہ خصوصی انداز بھی حضرت شادؔ کے کلام میں نمایاں ہے۔ ملاحظہ ہو۔ لطفِ زندگی کے ناپید ہونے سے موت کے بجائے طولِ حیات کو مہربانی کرنے کو کہنا نیا اندازِ بیان ہے اور قافیہ نے تو عجب انداز پیدا کر دیا ہے ؎

معدوم ہے لطف زندگانی　　بس طولِ حیات مہربانی

پیری کی ہیبت ناک شکل سے ڈر کر جوانی کا روپوش ہو جانا۔ جوانی کے غائب ہونے کی کتنی اچھی توجیہہ ہے۔ ؎

پیری ہے بلائے ناگہانی　٭　ڈر کر کہیں چھپ رہی جوانی

دنیاوی تمنائیں ناپائدار ہیں۔ لیکن پھر بھی انسان ان میں عمر بھر اُلجھا رہتا ہے۔ اس لحاظ سے اس کی مثال ٹھیک ایسی ہے گویا بچوں کو کھلونے دیکر بہلا دینا۔ تمنا سے کھلونے کی تشبیہ کتنی پر معنی ہے۔ بظاہر خوشنما اور بباطن بے حقیقت اور ناپائدار۔ ملاحظہ ہو ؎

تمناؤں میں الجھایا گیا ہوں　٭　کھلونے دیکے بہلایا گیا ہوں

مرتے وقت مُنہ کو ڈھانپ دینا اس کی کتنی اچھی توجیہہ کرتے ہیں ؎

لحد میں کیوں نہ جاؤں مُنہ چھپائے　٭　بھری محفل سے اٹھوایا گیا ہوں

شناخت محبت کو بتاتے ہیں کہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر کسی کی یاد میں آنکھیں بند کئے ہمہ تن مشغول رہنا ؎

بند آنکھیں ہیں کسی کا دھیان ہے　٭　مرنے والے کی یہی پہچان ہے

چھوٹی بحر کے دو چار شعر اور سن لیجئے ؎

ترے ہجر میں زندگی جاں گسل ہے　٭　یہی پھول سا دل کلیجہ پہ سل ہے

توقف نہ کر جام بھرنے میں ساقی　　کہ پیمانۂ عمر پیماں گسل ہے

زندگی تک ہجر کی حد ہو گئی   دیدیا صدقہ بلا رد ہو گئی

تکلّم کا مزہ دم میں ہوا ہے   خموشی تیری لذت دیر پا ہے

مسلسل غزل ۔ غزل میں عموماً ہر شعر علیحدہ علیحدہ مضمون پر مشتمل ہوتا ہے لیکن یہ بھی ایک وصف ہے کہ غزل مسلسل خیالات و مضامین کی حامل ہو۔ اردو میں اس کی مثال کم پائی جاتی ہے۔ حضرت شاد کے یہاں یہ وصف بھی نظر آتا ہے۔ ایک مسلسل غزل تقریباً چالیس شعر کی ہے جس میں بدیہات کی کیفیت صوفیانہ اور فلسفیانہ رنگ تخیّل کو لیتے ہوئے خالص شاعرانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ نمونہ کے لئے چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں ؎

نہ کر یہ دھیان کہ معدومِ محض تو ہوگا ٭ یہ رنگِ سبزۂ نوخیز پھر نمو ہوگا
زمیں سے اُگتی ہے جیسے نبات مٹ مٹ کر ٭ ترا ظہور یونہی اے خجستہ خو ہوگا
وہ جزو لا جو تخم ہے تیرا ٭ وہ تخم بڑھ کے ہی جسم ہو بہو ہوگا

آگے کہتے ہیں :۔ ؎

وہ جا ملے گی تجھے جس پہ سو بہشت نثار ٭ کہیں بہشت بہ شوق اے خجستہ خو ہوگا
اسی پہ ناز ہے زاہد! بہشت میں ہو کیا ٭ یہی کہ مجمعِ حورانِ ماہرو ہوگا
خیال دل سے ہٹا ایسی مادیت کا ٭ وگرنہ موردِ ایرادِ عقل تو ہوگا
خدا نہ کردہ رہا گر کثیف جامۂ تن ٭ لباسِ نفس بھی محتاجِ شست و شو ہوگا
تعصب و حسد و کینہ و دل آزاری ٭ اسی قبیل کا عصیاں ترا عدو ہوگا
یہی بنینگے ترے حق میں عقرب و افعی ٭ خود اپنی آگ میں خاک اے کینہ خو ہوگا

آگے چل کر کہتے ہیں ؎

عجب نہیں ہیں تو تبدیلیاں وہاں بھی ہوں ٭ پس از زمانۂ بسیار پاک تو ہوگا
سمجھ نہ اس کو تناسخ یہ وہ مسائل ہیں ٭ کھلیں گے اس پہ جو عرفاں کا راز جو ہوگا

معاف کر دے تجھے پہلے ہی یہ ممکن ہے ⁂ کہ آخر اس کا کرم بھی تو حیلہ جو ہو گا
کہے پکار کے یوں آ گناہگار مرے ⁂ کروں جو عدل تو رسوائے خلق تو ہو گا
جب اس بہشت میں اے دوست ہو گا تو داخل ⁂ سرورِ محض کا مرکز جو مو بہ مو ہو گا
بلند ہونگے کہیں نغمہ ہائے خیلِ طیور ⁂ کہیں ہجوم حسینانِ خوش گلو ہو گا
غرضکہ جتنے لذائذ ترے خیال میں ہیں ⁂ ہر ایک حاضر و موجود و پیشِ رو ہو گا
یہ استعارے ہیں سب تاکہ تو سمجھ لے جلد ⁂ کہ چکھ چکا متاثر ضرور تو ہو گا
غرض بہشت کی کیا خوبیاں بیان کروں ⁂ علی الخصوص مکیں جس مکاں میں تو ہو گا
جو اپنے شادؔ کو ڈھونڈیگا تو تو وہ بھی وہیں ⁂ غزل سرا کسی گوشہ میں قبلہ رو ہو گا
ٹھہر ٹھہر کے بصد درد و حسن میں پہلو کے ⁂ غزل یہ وردِ لبِ پاک باوضو ہو گا

دیکھئے مسلسل واقعات کو کس دلکش انداز سے بیان کر گئے۔ غالباً ناظرین کو اشتیاق ہو گا کہ حضرتِ شادؔ جو غزل جنت میں پڑھیں گے وہ کونسی ہے اس لئے میں اس کے دو چار شعر بھی سنائے دیتا ہوں ؎

ہزار مجمع خوبانِ ماہ رو ہو گا ⁂ نگاہ جس پہ ٹھہر جائے گی وہ تو ہو گا
خوشا وہ دور کہ ہر رند باوضو ہو گا ⁂ زباں پہ نام ترا ہاتھ میں سبو ہو گا
ہر ایک قطرہ کو گن گن کے خاک رکھ لیگی ⁂ نہ اس گلی میں مرا رائیگاں لہو ہو گا
کبھی ملیں گے نہ وہ اے خیالِ محرومی ⁂ شریک آ کے جو تو وقتِ جستجو ہو گا
لہو شہیدوں کا ہو رائیگاں معاذ اللہ ⁂ چمن میں پھول تو پھولوں میں رنگ و بو ہو گا
جو ہیں تلاش میں تیری یہ ان کو سمجھا دے ⁂ جہاں پہ بند ہو رستہ وہیں پہ تو ہو گا
شہید ناز تری لاش جب رواں ہو گی ⁂ ہجومِ سرو قدانِ کشادہ مو ہو گا

حقائق و معارف ۔ نوجوانی کے زمانہ کے اشعار رنگینی و رعنائی کی وجہ سے مجازی عشق کا بہترین جوہر ہیں۔ لیکن سن و سال کے ساتھ ساتھ خیالات میں پختگی اور عمق پیدا ہوتا گیا۔ عشق نے مجاز کے

دائرے سے نکل کر حقیقت کی سرحد میں قدم رکھا اور پھر شاعری حقائق و معارف کا گنجینہ ہوگئی۔ حقیقت میں کلامِ شاؔد کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ ان کا کلام ابتذال اور بوالہوسی سے قطعاً پاک ہے۔ نامہذب اور سوقیانہ اندازِ بیان سے انھیں قطعاً اجتناب ہے۔ یہ وہ خصوصیت ہے جس میں خواجہ میر دؔرد کے سوا دنیائے اردو کا کوئی شاعر حضرتِ شاؔد کا حریف مقابل نہیں ہوسکتا۔ اپنی شاعری کے اصلی رنگ کا پتہ وہ خود دیتے ہیں ؎

نہ آئینہ کا قصہ نہ حالِ شانہ کہتے ہیں ٭ حقیقت میں جمالِ یار کا افسانہ کہتے ہیں

ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

مرے شعروں میں جلوہ شاہدِ معنی کا پیدا ہے ٭ نظر آتا ہے لفظوں کا فقط ہلکا سا اک پردہ

اس لئے بادہ و ساغر، جام و مینا، خم و میخانہ، رند و ساقی وغیرہ سے مجازی رنگ مراد نہیں بلکہ اصلِ حقیقت بطور استعارہ متصور ہے اور بقول غالب اس کے بغیر چارہ کار بھی نہیں ؎

ہرچند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو ٭ بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

حضرت شاؔد کے کلام میں فلسفہ الٰہیات کا عنصر غالب ہے۔ اس کے علاوہ فلسفہ کی مختلف شاخوں پر ہلکی ہلکی روشنی پڑتی ہے۔ فلسفۂ حیرت اور نفسیات کی مختلف راہیں بھی خاص انداز سے نمایاں ہیں تصوف میں وحدت وجود کی جھلک شاعرانہ انداز میں پائی جاتی ہے۔ مثالوں سے اس کا پتہ چلے گا ؎

وہ عالم گیر جلوہ اور وہ حسنِ مشترک تیرا ٭ خدا جانے ان آنکھوں کو ہوا کس پر بھی شک تیرا

"حسنِ مشترک" کہہ کر تجلی کی عالمگیر حقیقت کو ظاہر کر دیا اور "شک" کا لفظ ظاہر کر رہا ہے کہ توحید میں فرق نہیں آیا کیونکہ مقصود بالذات ایک ہی ہستی تھی جو درجۂ یقین میں رہی۔ حسنِ مضمون کے علاوہ اندازِ بیان کتنا دلکش اور پُرزور ہے۔

مراقبہ کی کیفیت ظاہر کرتے ہیں ؎

سراپا مو قلم بن جاؤں بند آنکھیں اگر کرلوں ٭ اتاروں صفحۂ خالی پہ تیرا ہو بہو نقشہ

تصوف کا مدار عشق و محبت پر ہے۔ اس کے بغیر تصوف بے معنی ہے۔ اس لئے عطیۂ عشق پر شاعر

اظہارِ مسرت کرتا ہے ؎

دیا جو عشق حقیقت میں سرفراز کیا ٭ امید و یاس سے عاشق کو بے نیاز کیا

پھر فرماتے ہیں کہ اگر تو نے راہِ عشق میں قدم رکھا ہے تو بڑی خوش قسمتی ہے ۔ اس اظہارِ تشکر میں جبینِ نیاز جھکا دے ؎

کوئے نیازِ عشق میں آ جو پڑا زہے نصیب ٭ خاک پہ رکھ جبینِ شوق سجدۂ آستانہ کر

رازِ محبت کا کتمان عاشق پر فرض ہے اور اس کا اظہار جرمِ شدید ۔ دیکھئے حضرتِ شاد کس طرح اخفائے محبت حقیقی کرتے ہیں ؎

زباں پہ آہ بھی آئی تو ہنس کے ٹال دیا ٭ یہاں تلک بھی تو افشانہ میں نے راز کیا

زبان پر آئی ہوئی آہ کو اظہارِ محبت کے خوف سے ہنس ہنس کے ٹال دینا کتنا بڑا ظرف ہے ؎

اشک بھر آئے جس جگہ اٹھ گئے اس مقام سے ٭ آج تلک چھپائے ہیں عشق کی آبرو کو ہم

کسی جگہ آنکھوں میں آنسو بھر آئے تو رازداریٔ محبت کے لئے وہاں سے ٹل گئے ؎

کہاں یہ تاب طاقت ہے کہ ہم قفلِ دہن کھولیں ٭ خزانہ کی طرح دل میں لئے بیٹھے ہیں راز اس کا

نیازِ محبوب دیر میں حاصل ہوتا ہے ۔ فرماتے ہیں ؎

زمانہ چاہئے دل کو کہ حاصل ہو نیاز اس کا ٭ بہت دیر آشنا ہے اے جبینِ شوق ناز اس کا

ازدیادِ آرزو کے ساتھ التفاتِ محبوب ہوتا ہے ؎

جوں جوں بڑھا کرے گا تمنا کشوں کا شوق ٭ ووں ووں بدلتی جائیگی اس رخ کی شان بھی

محویت و استغراق :۔

در دوست پر یوں جھکائے سر مرے دل کو شغلِ نیاز ہے

نہ قیام ہے نہ قعود ہے یہ عجب طرح کی نماز ہے

آزمائش و ابتلا کے بعد شانِ تجلی نمودار ہوگی ؎

جلوۂ گرد کو ہوگا رخِ نورانی عشق ٭ پہلے اک شان بھیانک سی نظر آئیگی

محشر میں جمال باریتعالی کا دیدار ؎

شادؔ اہل شک یونہی شک میں پڑے رہجائینگے ٭ ہم انھیں آنکھوں سے اک دن دیکھ لینگے روئے دوست

کیونکر بھلا نہ وعدۂ فردا پہ ہو یقیں ٭ کافر وہ دل ہے جسکو نہ ہو اعتبار دوست

جنت و دوزخ کی صوفیانہ توجیہہ ؎

تری خوشی کا ہے نام جنت ترے غضب کا لقب جہنم

اسی میں تیری اگر رضا ہے تو مجھ کو جنت بھی پھر ارم ہے

عالمِ کائنات سے توحید کی توجیہہ ؎

صانع کو دیکھنا ہے تو عالم پہ کر نگاہ ٭ آئینہ آئینہ ہے خود آئینہ ساز کا

عالمِ اسباب میں اسباب کا علاقہ ؎

جکڑے ہوئے ہیں دونوں جہاں گیسوؤں کی طرح ٭ اللہ رے سلسلہ تری زلفِ دراز کا

فلسفۂ موت ؎

اجل سلا دیگی سب کو آخر کسی بہانے تھپک تھپک کر

نہ ہم رہیں گے نہ تم رہوگے نہ شادؔ یہ داستاں رہیگی

پانی ہوئے کہ خاک ہوئے یا ہوا ہوئے ٭ اے دل ابھی جو بول رہے تھے وہ کیا ہوئے

فلسفیانہ اور شاعرانہ انداز بیان ہے ؎

کائناتِ عالم کا نظارہ ازدیادِ حیرت کا باعث ہے اور لب کشائی محال۔ یہ فلسفۂ حیرت ایک جماعت کا اصل الاصول ہے۔ حضرت شادؔ فرماتے ہیں ؎

جہاں ہے مکتبِ حیرت سبق ہے چپ رہنا ٭ بڑا گناہ یہاں ہے الف سے بے کہنا

لاک سترھویں صدی میں یورپ کا ایک زبردست فلسفی گذرا ہے۔ اس کا فلسفہ یہ ہے

کہ انسان کا دل ایک سادہ ورق کی طرح ہے۔ مبدءِ فیاض کی طرف سے اس کو کچھ بھی عطیہ علم نہیں ہوتا معلمِ فطرت اسے کچھ نہیں سکھاتا بلکہ وہ خود عقل و خرد سے کام لے کر مشاہدات و موجودات کو نظرِ غور سے دیکھتا ہے اور خود ہی رفتہ رفتہ سب کچھ سیکھ جاتا ہے۔ حیرت ہے کہ صرف ایشائی تعلیم سے آشنا یورپ کے اس فیصلہ کی کیونکر ترجمانی کرسکا۔ ملاحظہ ہو ؎

مدرسہ وجود میں صفحہ سادہ بن کے آ ✤ پیرِ خرد سے لے سبق مسئلۂ شہود کا

اختتام۔ حضرتِ شادؔ کے رنگِ تغزل کو دکھانے کے لئے مختلف نمونوں کو مختصر طور پر پیش کیا کہ خوفِ طوالت مانع تھا۔ اگر مفصّل بحث کی جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہوسکتی ہے۔ بہر حال ناظرین سے معذرت خواہ ہوتے ہوئے حضرتِ شادؔ کے کلام کا انتخاب آخر میں شامل دیتا ہوں تاکہ اس یورپی شاعر کے کمال کا اظہار ہو سکے ؎

انتخابِ کلام

رسوائیاں غضب کی ہوئیں تیری راہ میں ✤ حد ہے کہ خود ذلیل ہوں اپنی نگاہ میں

ہم اور سیرِ لالہ و گل ہجرِ یار میں ✤ کیسی بہار آگ لگا دو بہار میں

آخر ہے عمرِ ضیق میں دل بھی ہے جان بھی ✤ مردانہ باش ختم ہے یہ امتحان بھی

تو بھی راحت نہ ملی ترک جو اسلام کیا ✤ کفر شاکی ہے کہ تو نے مجھے بدنام کیا

قابلِ بیاں کے ہجر کی روداد بھی نہیں ✤ سچ پوچھیے ہیں آپ تو اب یاد بھی نہیں

اپنی ہستی کو غم و درد و مصیبت سمجھو ✤ موت کی قید لگا دی ہے غنیمت سمجھو

اسیر جسم ہوں میعاد قید لامعلوم ٭ یہ کس گناہ کی پاداش ہے خدا معلوم
سُنی حکایتِ ہستی تو درمیاں سے سُنی ٭ نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

پس از معشوق مرنا عشق کو بدنام کرنا ہی ٭ خدا مجنوں کو بخشے مرگیا اور ہم کو مرنا ہی

خیالِ وصل کو اب رزو جھوٹے جھلاتی ہی ٭ قریب آنا دلِ مایوس کے پھر دور ہو جانا
شبِ وصل اپنی آنکھوں سے یہ سب اندھیر دیکھی ہیں ٭ نقاب انکا الٹنا رات کا کافور ہو جانا

لبوں پہ دم ہی تڑپتے ہیں دردمند ترے ٭ وہ اور کوئی نہیں، عاشقانِ چند ترے

خالی سمجھ کے پھینک دے موج رائیگاں ٭ ہر کیسہ حباب کے اندر خزانہ ہے

خوشی سے مصیبت اور بھی سنگین ہوتی ہے ٭ تڑپ اے دل تڑپنے سی ذرا تسکین ہوتی ہے

نگاہباں ہیں کچھ ایسے ادا و ناز اُن کے ٭ کہ بچتے جاتے ہیں لغزش سی پاکباز اُن کے

گزر گئے ہیں جوانی کے دن جو غفلت سی ٭ اب ایک ایک کا گنتہ تک رہے ہیں حسرت سی

یہاں نہ نشو و نما کا حاصل نہ کوئی ثمرہ ہے رنگ و بو کا
ہنسو گے خود اس چمن پہ غنچو! زمانہ آنے ذرا نمو کا
پکار کر وحشیوں سے کہدو خزاں کا بھی دور ہے غنیمت

قبا کے دامن کو ٹانک تو لیں اگر نہ موقع ملے رفو کا

قمار خانہ ہے بزمِ دنیا بڑے کھلاڑی کا سامنا ہے
گرہ سے پونجی گنوائی اس نے یہاں ذرا بھی جو چال چوکا

فلک کا ذکر تو کیا ہے زمیں کے بھی نہ رہے ⁂ ہم اپنی چال سے آخر کہیں کے بھی نہ رہے

پژمردہ ایک پھول لئے ہیں وہ ہاتھ میں ⁂ کیونکر کہیں کہ ہم بھی تو آفت رسیدہ ہیں

اکڑ کے دوش پہ کیونکر نہ زلف ناز کرے ⁂ اسی کے ہاتھ ہے یہ جس کو سرفراز کرے

اب بھی اس عمر پہ جینے کا نہ انداز آیا ⁂ زندگی چھوڑ دے پیچھا مرا میں باز آیا

ساقی کی چشمِ مست پہ مشکل نہیں نگاہ ⁂ مشکل سنبھالنا ہے دلِ بے قرار کا
قدرت اسی کی ورنہ یہ منہ آئینہ کا تھا ⁂ جھگڑا چکائے شانہ و گیسوئے یار کا
پیغام آ رہے ہیں تواتر وصال کے ⁂ ہر ہر نفس فراق میں قاصد ہے یار کا

یہ آرزو ہے تری جلوہ گاہ میں جا کر ⁂ ہزار آنکھیں ہوں اور سب سے یار ہم دیکھیں

ہے دل کی حکایت جائے عجب، کیا اوّل و آخر اس کا کہیں
اک خاک کا تودہ لائے تھے ہم صحرائے قیامت لیکے چلے

کسی پتے کے لب پر بھی اگر نامِ خزاں آیا ✤ نکالا باغباں نے اسکو سوائی چمن کر کے

عشوۂ دلگزار وہ، ذبح کرے جو بے چھری ✤ ناز وہ دشمنِ وفا، رحم کی جس کو ہے قسم

پھر گئے راستہ سے وہ گرد و غبار دیکھ کر ✤ رہ گئی میری بیکسی سوئے مزار دیکھ کر

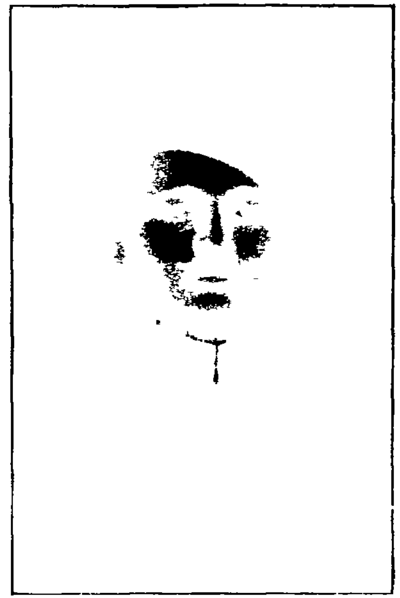
ہر طرف ہے وہی ہر شے میں ہے جلوہ اسکا ✤ ترکِ نعمت جو کروں ترک ہو گویا اس کا

غضب نگاہ نے ساقی کی بند و بست کیا ✤ شراب بعد کو دی پہلے سب کو مست کیا

دیر تک میں ٹکٹکی باندھے ہوئے دیکھا کیا ✤ چہرۂ ساقی نمایاں صاف پیمانہ میں تھا

کہاں سے لاؤں صبرِ حضرتِ ایوب اے ساقی ✤ خم آئیگا، صراحی آئیگی، تب جام آئیگا

جلوۂ حسن کی طرف دیکھ تو کچھ پتہ چلے ✤ جلنے سے ولولہ نہ پوچھ عاشقِ پرکا



جناب ظفر احمد صاحب صدیقی ایم۔اے (علیگ)
لکچرار فلسفہ مسلم یونیورسٹی
سابق ایڈیٹر علی گڑھ میگزین (۱۹۳۴—۱۹۳۵)



جناب رشید احمد صاحب صدیقی ایم۔اے (علیگ)
صدر شعبہ اردو، مسلم یونیورسٹی
سابق ایڈیٹر علی گڑھ میگزین (۱۹۲۰—۱۹۲۲)

سفر کا ماضی و حال

پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی (علیگ)

مجھے سفر کا وہ زمانہ تو یاد نہیں جب لوگ اُڑن کھٹولے پر سفر کرتے تھے اور کچنال کے درخت میں پوریاں پھلتی تھیں۔ اس کا حال تو وہ لوگ بتا سکتے ہیں جن کا ذہن اُڑن کھٹولا ہو یا جن کے دماغ میں تاریخی مواد ہو! میرا ذہن تو بسواری پیدل ہی سفر کرتا ہے اور دماغ میں وہی باتیں آتی ہیں جو خود مجھ پر گذر چکی ہیں۔ چنانچہ یہ اس عہد کا افسانہ ہے جب میں خود ملازم نہیں رکھتا تھا بلکہ میرے لئے ملازم رکھے جاتے تھے اور میں ملازموں پر نہیں بلکہ ملازم مجھ پر حکومت کرتے تھے!

میرا بچپن ایک نہیں بہت سی چھوٹی چھوٹی بستیوں میں گزرا ہے اور ظاہر ہے ایسی بستیوں میں کس قسم کی سواریاں اور کس قسم کے سفر کرنے والے نظر آسکتے تھے۔ میں اکثر اپنے ملازم کے کندھے پر سوار ہو کر اور سفر کا یہ وسیلہ بھی نظر انداز کئے جانے کے قابل نہیں ہے، بستی کے باہر جہاں اونٹ گاڑیاں کھڑی ہوتی تھیں جایا کرتا تھا۔ اس زمانہ کی یاد دُھندلی سی رہ گئی ہے اور مجھے صرف وہ بزرگ یاد رہ گئے ہیں جو نیم کی پتی اسی شوق اور مرنجاں مرنج طریقے سے کھڑے چبایا کرتے تھے جس شوق اور مرنجاں مرنج طریقے سے لوگ اکثر اپنے ہونٹھ اور دوسروں کے پان چبایا کرتے ہیں۔ انھیں بزرگ کے کوئی عزیز قریب کسی گاؤں میں نکل گئے تھے تو لوگوں کو بھگوان کا شبہ ہونے لگا تھا اور دوسرے بزرگ کو دوسرے گاؤں والوں نے رمضان شریف کے دھوکے میں افطار کر ڈالا تھا۔ معلوم نہیں آپ نے میرے ہیرو کو پہچانا یا نہیں۔ نہ پہچانا ہو تو یہ قصور میرے "حلیم و خوش خصال" ہیرو کا نہیں ہے آپ کا ہے۔ بہر حال کچھ ہی کیوں نہ ہو مجھے اونٹ کی جو چیز سب سے زیادہ پسند ہے اس کی تفسیر اس کہاوت میں ملتی ہے جہاں ان کے باب میں کہا گیا ہے اونٹ رے اونٹ تیری کونسی کل سیدھی۔ یا جب تک کسی کل بیٹھ نہ جائیں لوگوں کی قیاس آرائیوں کی چول نہ بیٹھے!

اس طور پر آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ میری طفولیت کی خیال آرائیاں اونٹ یا اونٹ بننے

کس طرح وابستہ ہیں۔ میں ڈرتا ہوں کہ کہیں اس قسم کی تمہید سے اصل مقصد ہی نہ فوت ہو جائے اس لئے میں براہ راست اونٹ گاڑی پر آجاتا ہوں۔ اونٹ گاڑی کے بارے میں مجھے اپنے ایک مشہور فاضل بزرگ کا قول یاد آتا ہے جنھوں نے اونٹ گاڑی کی تعبیر ان الفاظ میں کی تھی یعنی اونٹ گاڑی وہ سواری ہے جو ہر جگہ سے شام کو روانہ ہوتی ہے اور ہر جگہ صبح کو پہنچ جاتی ہے۔ اونٹ گاڑی عموماً دو منزلہ ہوتی ہے اور غالباً محض اس لئے کہ اونٹ سہ منزلہ نہیں ہوتا۔ یہ کبھی نئی نہیں دیکھی گئی۔ چونکہ اونٹ کے چلنے میں کوئی آواز نہیں آتی اس لئے اونٹ گاڑی میں اس کا التزام رکھا جاتا ہے کہ وہ اس کی کو پوری کرتی رہے۔ جیسے بعض موٹریں اور بائیسکلیں ہوتی ہیں جن میں ہارن یا گھنٹی کی یوں ضرورت نہیں پیش آتی کہ

ہر رگ ن ہارن گشت و حاجت گھڑیال نیست

بعض اعتبار سے بعض موٹریں اونٹ گاڑی سے مشابہ ہوتی ہیں۔ اونٹ گاڑی ہر شام ایک جگہ سے روانہ ہو جاتی ہے اور ہر صبح ایک دوسرے مقام پر پہنچ جاتی ہے۔ گاڑی بان، سواریاں، اسباب سب سوتے رہتے ہیں لیکن اونٹ گاڑی صبح کے وقت منزلِ مقررہ پر پہنچ ہی جاتی ہے۔ بعینہٖ یہی حالت میرے ایک بزرگ کے موٹر کی ہے یہ موٹر بہت پرانی ہو چکی ہے کوئی نہیں بتا سکتا کہ اس کی عمر یا اس کا رنگ کیا ہے۔ لوگوں کو بہت تعجب ہوتا ہے کہ یہ چلی کیونکر جاتی ہے۔ اب تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ یہ موٹر مشین یا پٹرول کے ذریعہ نہیں بلکہ محض عادت کے زور سے چلتی ہے اور صرف ایک مقررہ مقام سے چل کھڑی ہوتی ہے اور مقررہ ہی راستہ نشیب و فراز اور رفتار سے مقررہ جگہ پر پہنچ جاتی ہے۔ راستہ میں نہ رکتی ہے نہ روکی جا سکتی ہے۔ جہاں ٹھہرنے کی اس کی عادت ہے اس سے ایک انچ ادھر اُدھر ٹھہر نہیں سکتی۔ بعض لوگوں کو وہم سا ہونے لگا ہے کہ اگر اس پر کی سواریاں یا اس کا راستہ بدل دیا جائے تو اس گاڑی کی تاریخ اور اس کے متعلق جو توقعات ہیں وہ سب بدل جائیں گے یا کیا ہو گا۔

اونٹ گاڑی کی دوسری منزل پر بالعموم اسباب رکھا جاتا ہے اور نچلی منزل میں مسافر بیٹھتے ہیں اوپر کی منزل میں عموماً سواریاں نہیں ہوتیں۔ اس کا سبب مجھے نہیں معلوم اور معلوم بھی ہو تو اس کا تذکرہ میں ریڈیو پر نہیں کر سکتا معلوم نہیں وہاں کون اور کس کس قسم کے لوگ گوش بر آواز ہوں۔ اور ہاں یہ آپ اچھی طرح سے سن رکھیے کہ میں نے صرف گوش بر آواز کا فقرہ استعمال کیا ہے۔ ممکن ہے فضائی خلفشار یا بدنیتی سے لوگ

اسے کچھ کا کچھ سن لیں اور یہاں اس آواز کو اس آواز* سے کوئی تعلق نہیں جو آل انڈیا ریڈیو سے برآمد ہوتی یا ہوتا ہے!

اونٹ گاڑی پر سوار ہو جانے کے بعد مسافر عموماً سونے لگتے ہیں۔ اُن سے پہلے اونٹ گاڑی والا سوتا ہوتا ہے۔ اونٹ صرف ناک کی سیدھ میں جاتا ہے۔ ایک دفعہ کسی ستم ظریف نے جب سفر تقریباً نصف ختم ہو چکا تھا اور ہر شخص سو رہا تھا اونٹ گاڑی کا رُخ بدل دیا چنانچہ صبح لوگوں کی آنکھ کھلی تو تمام رات سفر کرنے کے بعد اپنے آپ کو صبح اسی مقام پر پایا جہاں سے وہ روانہ ہوئے تھے۔ اس سے آپ کو اونٹ اور اونٹ گاڑی دونوں کے بارے میں صحیح رائے قائم کرنے کا موقع مل گیا ہوگا۔ اگر آپ نے صحیح رائے قائم نہیں کی تو پھر آپ کو یقیناً اونٹ گاڑی پر سفر کرنا چاہئے!

اونٹ گاڑی کے ساتھ ساتھ بیل گاڑی کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔ جو چیز مہابھارت کے زمانہ میں رتھ کے درجہ پر تھی وہی چیز جنگ عظیم تک پہنچتے پہنچتے بیل گاڑی یا بہلی بن گئی۔ یا یوں سمجھ لیجئے کہ رتھ کا جاپانی ایڈیشن بہلی ہے اور بہلی کا گاؤں سدھار ایڈیشن ٹھیلا جس پر دہلی میں اسٹرائک ہوتا ہے۔

بہلی میں ذرا تکلیفات کو زیادہ دخل ہوتا ہے۔ دالان اور در دالان قسم کے شوالے سے بنے ہوتے ہیں اور بیل بھی بالکل اندر ہی بیل نظر آتے ہیں۔ گھنگرو گھنٹیوں اور سرخ سرخ پوششوں کو دیکھ کر میرا ذہن قدیم ہندوستان اور فالودہ کی ہانڈیوں کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ قدیم ہندوستان کی طرف یوں کہ اصلی ہندوستان قدیم ہی ہندوستان ہے اور فالودہ کی طرف یوں کہ ان دنوں اللہ تعالیٰ کو گرمی پسند ہے اور اس خاکسار کو فالودہ ناپسند نہیں ہے اس کے علاوہ یہاں سے بیٹھا ہوا میں اس وقت باتیں بنا رہا ہوں اور فالودہ کا ماتم کر رہا ہوں وہاں کا پنکھا بھی بند رکھا گیا ہے تاکہ پنکھے کے چلنے کی آواز بھی میری ہمنوا یا دمساز نہ بن سکے۔ چنانچہ میں بار بار دل ہی دل میں اقبال کا ایک شعر مسخ کرتا جاتا ہوں اور فالودہ کو یاد کرتا ہوں۔

یہ دستور ہوابندی ہے کیسا تیرے کمرے میں
یہاں تو بات کرتے خشک ہوتی ہے زباں میری

* آل انڈیا ریڈیو کا رسالہ جو مہینہ میں دو بار دہلی سے شایع ہوتا ہے۔

اور ڈرتا بھی ہوں کہ کہیں شاعر خود نہ سن رہا ہو

اب یکے اور تانگے کا نمبر آتا ہے۔ میرے دیار میں یکے الٹے ہوتے ہیں جیسے کمہار کا چاک جس میں لٹے سیدھے دو پہیے لگا دیئے گئے ہوں۔ اسے ایک قسم کی جوئے وھیل (Joywheel) کہنا چاہیے جس پر لوگ تفریحاً بیٹھتے ہیں اور جب اس کو چرخ دیا جاتا ہے تو لوگ تفریحاً ہی ایک دوسرے پر گرتے ہیں اور تفریحاً ہی ٹخنیاں کھاتے ہیں۔ اس یکے کو سپاٹ رکھنے میں مصلحت یہ رکھی گئی تھی کہ جتنی سواریاں چاہیں بٹھالیں لیکن سواریوں نے یہ کرنا شروع کیا کہ جتنوں نے چاہا راستہ میں گر گئے۔ مجبوراً اب یہ کرتے ہیں کہ جب سات آٹھ نفر بیٹھ لیتے ہیں تو کسی ایک کی پگڑی اتار کر سب کو ایک حلقہ میں باندھ دیتے ہیں اور سفر شروع کر دیتے ہیں۔ رسّی اور پگڑی نہیں ملتی تو پھر مجبوراً ایک دوسرے کا کان پکڑ لیتے ہیں اور جھولتے جھولتے منزل مقصود کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں اس قسم کا سفر ایک دفعہ کرنے کے بعد اکثر لوگ سفر کے نام سے کانوں پر ہاتھ دھرنے لگتے ہیں۔

تانگے مجھے پسند نہیں۔ اگر میں تانگے پر سفر کر رہا ہوں اور کوئی سواری پیچھے سے آتی ہوئی نظر آئے تو مجھے وہم سا ہونے لگتا ہے کہ مجھے روندتی ہوئی تانگے کے اندر سے نکل جائے گی۔ ہندوستان میں لوگ گدھوں پر سفر نہیں کرتے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ گدھے سفر نہیں کرتے لیکن یہاں اس کمی کی تلافی ایک قسم کے گھوڑوں سے کر لی گئی ہے جن سے مجھے ایک دفعہ کالکا سے کسولی جاتے سابقہ پڑا تھا۔ آپ یقین فرمائیے مجھے کسولی جانے کے بجائے کہیں اور جانے کا اتفاق یا ضرورت پیش آتی تو میں ان گھوڑوں یا مرز گدھوں پر کبھی نہ بیٹھتا۔ ان گھوڑوں کا خاصا یہ ہے کہ کالکا میں ان پر بیٹھ جائیے اور کسولی میں اتر جائیے۔ کسی ساتھی یا رہبر کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ شہسوار ہوں یا سواری سے بالکل واقف نہ ہوں یہ ناممکن ہے کہ آپ کسولی وقت سے پہلے یا بعد پہنچ سکیں۔

سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ نہ تو یہ گھوڑے ناہموار اور تنگ راستہ پر کہیں گرتے ہیں اور نہ باوجود آپ کی کوشش کے آپ کو گرنے دیتے ہیں۔ میں نے تو اکتا کر یہ ترکیب نکالی تھی کہ گھوڑے سے اتر کر گھوڑے کی دُم پکڑ لی اور اس کے سہارے کسولی جا پہونچا۔ گھوڑے کو مطلق نہیں محسوس ہوتا کہ اس کا مصرف کیا قرار دیا گیا ہے۔ البتہ میں اس کی ذمہ داری نہیں لیتا کہ باوجود اس کے کہ پہاڑ کی ہوا نہایت لطیف ہوتی ہے آپ بھی کسی وقت یہ نہ محسوس کر لیں کہ آپ گھوڑے کی دُم کے سہارے چل رہے ہیں۔



دي آنريبل سر شاهه محمد سليمان - جج فيڊرل هائي ڪورٽ
وائس چانسلر

پہاڑوں اور بعض دیگر مقامات پر لوگ ڈانڈی اور رکشا پر سفر کرتے ہیں ۔ ڈانڈی اور رکشا پر سفر کرنے والوں کو دیکھ کر مجھے کافی غصہ آتا ہے اور غصہ فرو ہونے پر میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ڈانڈی اور رکشا پر صرف جدید الخیال عورتوں اور مایوس العلاج مریضوں کو بٹھانا چاہیئے۔ ان کے علاوہ کوئی اور بٹھا لے تو ای کسی ترکیب سے سفر آخرت پر روانہ کردینا چاہیئے۔ یہ میری رائے ہے اور رائے کا حال یہ ہے کہ اس ترقی پذیر اور ترقی یافتہ زمانہ میں رائے دینے کی اتنی ہی آزادی ہے جتنی کہ اس پر عمل کرنے کی ممانعت ہے۔ اس لئے میری رائے پر عمل کرنے سے پیشتر آپ کو یہ اچھی طرح معلوم ہو جانا چاہیئے کہ کسی کو سفر آخرت پر بھیجنے سے اکثر خود آخرت کا سفر ادا کرنا پڑتا ہے اس لئے بہتر ہوگا کہ اس قسم کی حرکت کرنے سے پہلے آپ کسی وکیل اور ڈاکٹر سے بھی مشورہ کرلیں کیونکہ بغیر ان دونوں کی اعانت کے نہ آپ دوسروں کو بے وقوف بنا سکتے ہیں اور نہ خود پاگل بن جا سکتے ہیں ۔

پہلے زمانہ میں انھیں سواریوں پر اور انھیں طریقوں سے سفر ہوتا تھا۔ یہ حال تو خشکی میں سفر کرنے والوں کا تھا۔ تری کا سفر کشتیوں میں طے کیا جاتا تھا ایسی کشتیاں جو ہوا کے رخ پر چلتی تھیں ۔ اگر معمولی لوگ سوار ہوتے تھے تو یہ موجوں سے ہم آغوش ہو جاتی تھیں اور عشاق و شعرا موجود ہوتے تو ساحل سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتیں ۔

ان سواریوں کے علاوہ لوگ پاپیادہ بھی سفر کرتے تھے۔ راستہ میں ڈاکو ملتے تھے لوٹ مار ہوتی تھی جا بجا پڑاؤ بنے تھے جہاں لوگ شب باش ہوتے اور صبح منہ اندھیرے بوریا بستر باندھ دوسری منزل کے لئے روانہ ہو جاتے اس سفر میں جہاں دقتیں اور خطرات تھے وہاں یکجہتی اور ہم آہنگی بھی ہوتی۔ لوگ ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھتے، ان سے ہمدردی کرتے اور دکھ درد کے شریک ہوتے ۔

اب اونٹ گاڑی، بیل گاڑی، گھوڑا گاڑی اور آدمی گاڑی کے بجائے ریل گاڑی، ہوا گاڑی، جہاز اور طیارے یعنی ہوائی جہاز ہیں ۔ پہلے سب سے تیز سواری ہوا سمجھی جاتی تھی اور جلد بازوں سے سابقہ پڑتا تو لوگ کہتے دم تو لو تم تو ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو۔ اس زمانہ میں اس سواری پر شعرا، پھول کی مہک یا محبوب کی نافِ مشکیں کی خوشبو سوار کرایا کرتے تھے ۔اب یہ حال ہے کہ لوگ بجلی پر آواز کو سوار کرکے اِدھر سے اُدھر بھیجتے رہتے ہیں ۔ ریڈیو اسی کھیل کا دوسرا نام ہے ۔

پہلے زمانہ میں جو سفر ہفتوں، مہینوں اور برسوں میں طے ہوتا تھا! بالکل طے نہیں ہوتا تھا اب گھنٹوں

اور دلوں میں طے ہونے لگا ہے۔ پہلے صرف لوگوں کی آہیں آسمان کی طرف جاتی تھیں۔ اب لوگ خود جانے لگیں ہیں۔ پہلے آہوں کو خود سفر کرنا پڑتا تھا اب انھیں ریڈیو کے ذریعہ دور دور تک پہنچا سکتے ہیں۔ پہلے ممکن ہے کہ ان کا اثر ہوتا ہو یا نہ ہو۔ اب چاہیں تو محبوب تو در کنار محبوب کے اعزا و اقارب اور ہم وطن سب کو ان آہوں کے ذریعہ جلا کر خاک سیاہ کر ڈالیں۔ پہلے زمانہ میں لوگ امام ضامن باندھ کر سفر کیا کرتے تھے اب بیمہ کرا کے سفر کرتے ہیں۔ پہلے چور ڈاکو کا خطرہ تھا اب گاڑی لڑنے کا خطرہ ہے۔ پہلے بیماریاں کم سفر کرتی تھیں اب ان سے نچلا نہیں بیٹھا جاتا۔ پہلے لوگ سفر کے بارے میں کہتے تھے پا بر کاب ہوں اب ٹکٹ بدست کہتے ہیں پہلے لوگ آم کھانے لکھنؤ اور رام پور جاتے تھے اب لکھنؤ اور رام پور کے آم اپنے کھائے جانے کے لئے یورپ اور امریکہ کا سفر کرتے ہیں۔

پہلے زمانہ میں لوگ سفر کرتے تو بیوی بچوں سے اس طور پر رخصت ہوتے جیسے اب اللہ ہی ہے جو پھر ملنا ہو۔ اب دوسروں کی بیوی اور ضمناً بچوں سے ملنے اس طور پر سفر کیا کرتے ہیں جیسے دنیا سے شوہر اور اللہ دونوں اٹھ گئے ہیں۔

پہلے لوگ طلبِ علم کے سلسلہ میں تپتے ہوئے ریگزاروں کو گرتے پڑتے طے کرتے۔ پتیاں چباتے۔ بھوکے پیاسے بے یار و مددگار سرچشمۂ علم تک پہنچتے۔ اب طلبِ علم کے بہانے سے ان نعمتوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں جن کو نہ سفر سے کوئی تعلق ہے اور نہ علم سے سروکار۔ پہلے علم کی خاطر سفر کرتے تھے اب سفر کی خاطر علم گنواتے ہیں۔ پہلے لوگ دہلی سیکھنے اور سمجھنے کے لئے آتے تھے اب گانے اور بولنے کے لئے آتے ہیں۔ عربی کی ایک مثل ہے۔ مرنے سے پہلے مر جاؤ۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو لوگ اس مقولہ یا نصیحت پر عمل نہ کر سکیں ان کو اس مقولہ پر عمل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

خاموش کئے جانے سے پہلے خاموش ہو جاؤ۔

وہ عربی کی مثل تھی یہ ریڈیو کا مثل ہے۔ اور میں اصولاً ریڈیو ہی کے اصول پر کاربند ہوتا ہوں۔

(یہ تقریر ۶ رجون ۱۹۴۸ء کو آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن دہلی سے نشر کی گئی)

رتن ناتھ سرشار

جناب آل احمد صاحب سرور ایم۔ اے (علیگ)

شیکسپیر کے متعلق ایک عام خیال یہ ہے کہ اس نے اپنی تصانیف بہت جلدی میں اور بے تکان لکھی ہیں اس کے ڈرامے ایک بے حد صرف زمانے کی یادگار رہیں جبکہ وہ اداکار بھی تھا اور ڈراما نویس بھی، شاعر بھی تھا اور منیجر بھی، اور اس کے ساتھ ساتھ بلکہ الیزبتھ کے زرین دور کی ہنگامہ خیز سکون ناآشنا رومانوی فضا میں شریک بھی تھا۔ اس کی عظمت کا ایک بڑا راز یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ جو جواہر پارے اس قدر عجلت میں لکھے گئے تھے اُن کی آب و تاب امتداد زمانہ کے بعد اب بھی قائم ہے۔

اُردو ادب میں ایسے بہت سے حضرات کے نام گنائے جاسکتے ہیں جن کے جوہر قابل سدا بے اصولی اور بے پروائی کے شکار رہے۔ اُنہوں نے نہ تو اپنا کوئی ادبی نصب العین متعین کیا اور نہ ساری دنیا کو چھوڑ کر اسی نصب العین کے ہولئے اور باوجود اس کے ایسی ایسی یادگاریں چھوڑیں کہ اُن کا دامن دامن قیامت سے بندھا ہوا ہے۔ فہرست طویل ہے مگر اس فہرست میں سب سے ممتاز نام پنڈت رتن ناتھ سرشار کا ہے۔

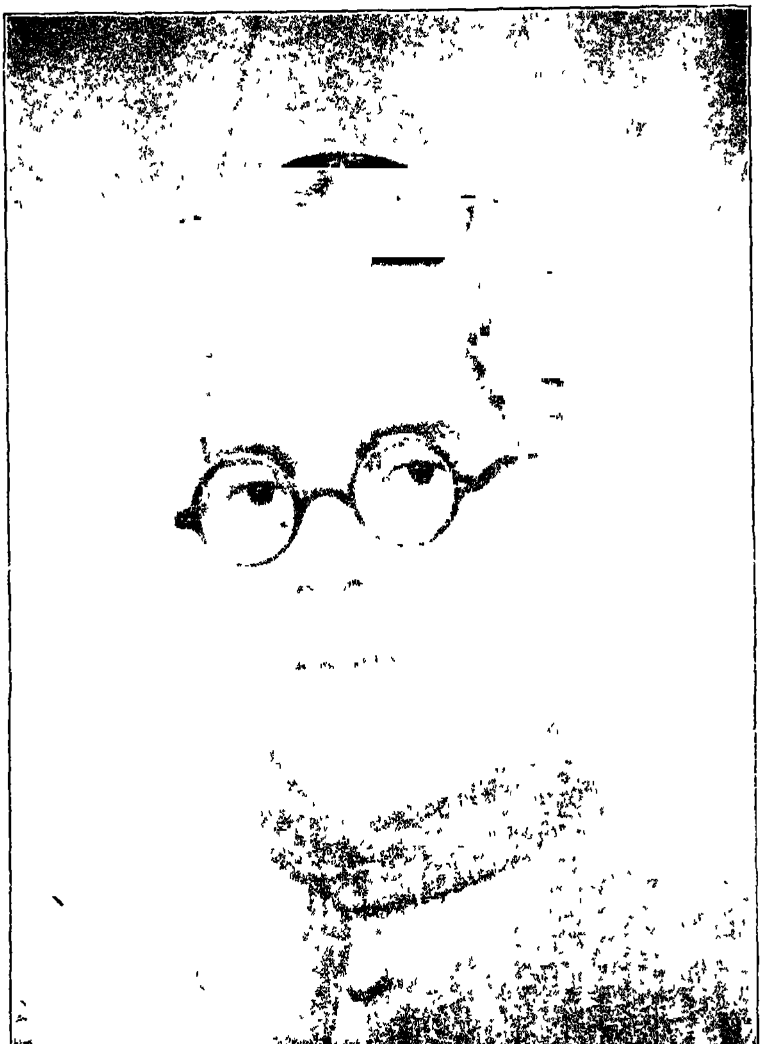
سرشار ایک کشمیری خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ہمارا سماج اپنے خزانوں کو آسانی سے نہیں اُگلتا۔ ایک مشرقی ادیب کے حالات زندگی پردۂ خفا میں رہ جاتے ہیں اور باوجود کوشش کے دستیاب نہیں ہوتے۔ جو یامر چودھویں صدی میں گزرا تھا مگر اُس کی زندگی کی تمام اہم کڑیاں مل جاتی ہیں، سرشار نے اُنیسویں صدی پائی مگر اُن کے حالات زندگی پھر بھی اچھی طرح معلوم نہ ہوسکے۔ گوئٹے کے دانت کے درد کے متعلق مغرب میں اس قدر تفصیلات فراہم ہوجاتی ہیں کہ اُس پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری دی جاسکے، ہماری یونیورسٹیاں جب اُردو میں پی۔ ایچ۔ ڈی ہی کی قابل نہیں تو پھر یہ گوہر گراں بہا کیسے برآمد ہوں۔ بہرحال رتن ناتھ کی پیدائش کا سال ٹھیک معلوم نہیں لیکن غالباً وہ ۱۸۴۲ء یا ۱۸۴۶ء میں پیدا ہوئے۔ کشمیری ہونے کی وجہ سے ان کی تعلیم مروجہ دستور کے مطابق ہوئی اُس زمانے میں عربی۔ فارسی کی تعلیم شرفا کے لئے ضروری سمجھی جاتی تھی۔ اس کے بغیر نہ تعلیم مکمل تھی نہ تہذیب۔ سرشار نے یہ سب سیکھا اور اس کے بعد انگریزی کی تحصیل کے لئے کیننگ کالج لکھنؤ میں داخل ہوئے مگر

اس میدان میں زیادہ آگے نہ بڑھ سکے۔ شروع ہی میں ہمت ہار دی۔

سرشار اول اول کچہری اسکول میں مدرس ہوئے۔ اور چونکہ آدمی ذہین اور طباع تھے اور ادب سے فطری دلچسپی تھی اس لئے مراسلہ کشمیر اور اودھ اخبار میں مضامین لکھنا شروع کئے۔ اسی زمانے میں اُنہوں نے ایک ہیئت کی کتاب کا سلیس اردو میں ترجمہ کیا اور موضوع کی رعایت سے شمس الضحیٰ نام رکھا۔ صوبہ کے ڈائرکٹر تعلیم اُن کے ترجموں کے بڑے مداح تھے اور اُنہیں کی سفارش سے سرشار کو ۱۸۷۸ء میں اودھ اخبار کی ایڈیٹری مل گئی۔ فسانہ آزاد اسی اخبار میں بالاقساط نکلا اور ۱۸۸۰ء میں علیحدہ کتابی صورت میں شائع ہوا۔ یہ فسانہ جب اودھ اخبار میں چھپتا تھا تو اُس کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ لوگ دوسرے پرچے کے منتظر رہا کرتے تھے۔ چک بست کا بیان ہے کہ اُس کے لکھنے کے لئے کبھی مصنف نے کوئی خاص زحمت گوارا نہیں کی۔ کاتب بیٹھا ہوتا تھا اور یہ نوجوان افسانہ نویس کوئی داستان یا داستان کا ٹکڑا قلم برداشتہ گھسیٹ دیتا تھا۔ یہ لکھنے والے کی خوبی اور فسانہ کی خامی دونوں کی دلیل ہے۔ فسانہ آزاد کے شائع ہوتے ہی سرشار کی شہرت دور دور تک پہنچ گئی۔ چنانچہ اُن کی دوسری تصانیف کا جو اس پائے کی نہ تھیں بہت پُرجوش خیر مقدم ہوا۔ اسی زمانے میں اُن سے اور اودھ پنچ سے معرکے رہے۔ اودھ پنچ کا معیار صنعتی تھا۔ اُس کے سارے قلمی معاون اسی میدان کے مرد تھے۔ فسانہ آزاد کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس میں لکھنؤ کی بیگماتی زبان کے لازوال مرقعے پیش کئے گئے ہیں۔ اودھ پنچ کو اس سے اختلاف تھا۔ اس اختلاف میں شخصی اور ذاتی رنگ بھی شامل ہو گیا تھا۔ آخر یہی چیز اس پرچے کو لے ڈوبی۔

سرشار کی آزاد منشی و لاابالی طبیعت اُن کو کہیں جمنے نہیں دیتی تھی۔ آخر عمر میں وہ تلاش معاش میں حیدرآباد گئے اور "دبدبۂ آصفی" نکالا۔ شروع میں اُن کی بڑی قدر ہوئی لیکن چونکہ وہ ملازمت کی بندگی و بے چارگی برداشت نہیں کر سکتے تھے اس لئے بعد میں اُنہیں بڑی دشواریاں اُٹھانی پڑیں۔ شراب نوشی کی کثرت نے اُنہیں وقت سے بہت پہلے بجھا دیا اور ۱۹۰۳ء میں وہ تپ دروں میں انتقال کر گئے۔

سرشار کی ذہانت و طباعی کے دشمن بھی قائل تھے۔ اس شخص نے اپنی خداداد قابلیت کو دونوں ہاتھوں سے لٹایا، کبھی اس کی قدر نہ کی۔ امریکہ کا مشہور سائنس داں اڈیسن فطانت کو ۹۹ فی صدی



جناب آل احمد صاحب سرور صدیقی ایم۔اے۔ (علیگ)
لکچرار شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی
سابق ایڈیٹر علیگڑھ میگزین (۱۹۳۲—۱۹۳۴)

پسینہ اور ایک فی صدی وجدان کہتا ہے اور اس کی ساری زندگی اس مقولے کی ایک مثال ہے۔ سرشار کی ساری زندگی اس کے برخلاف ایک قہقہہ ہے۔ وہ زندگی اور مسائل زندگی کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ اس پر خون پسینہ ایک کیا جائے، وہ اس کا مذاق اُڑاتا ہے۔ خود ہنستا ہے اور دوسروں کو ہنساتا ہے اور اس ہنسی سے زندگی کی بہت سی تلخیوں کو گوارا کر لیتا ہے۔ اُس نے کبھی اپنی تصانیف پر نظر ثانی نہیں کی۔ بہت لکھا، بے خیالی سے لکھا اور بے تکان لکھا۔ اور یہ جانتے ہوئے جب ہم اُس کی تصانیف پر نظر ڈالتے ہیں تو اُن کے سُتھرے پن اور فطری رنگ پر حیرت ہوتی ہے۔

افسوس ہے کہ ہمیں سرشار کی زندگی کے ایسے واقعات نہ مل سکے، جہاں وہ اپنے بے تکلف احباب کے مجمع میں ظرافت کے دریا بہایا کرتے ہوں گے۔ چک بست جیسا قدرداں بھی جو سرشار کا ذکر نہایت محبت بھرے الفاظ میں کرتا ہے، صرف اشارات سے کام لیتا ہے۔ مگر یہ قیاس غلط نہیں ہو سکتا کہ فسانہ آزاد کا مصنف اپنے دوستوں کی محفل میں جو پھلجڑیاں چھوڑتا ہوگا اُن کی بہار بڑی نظر فریب ہوتی ہوگی۔

بعض کتابیں ایسی ہوتی ہیں کہ وہ مصنف سے الگ اپنی حیثیت قائم کر لیتی ہیں۔ کوئی اُن کے مصنف کو جانے یا نہ جانے، اُنہیں ضرور جانتا ہے۔ اور ان کتابوں کی جگہ اُس کے نظام زندگی میں ویسی ہی مستقل ہوتی ہے جیسی روزمرہ کی دوسری چیزوں کی۔ فسانہ آزاد کی یہی کیفیت ہے۔ ممکن ہے بہت سے ایسے ہوں جو سرشار کو نہ جانتے ہوں، لیکن ایسے کم نکلیں گے جو آزاد اور خوجی حسن آرا اور اللہ رکھی، ہمایوں فر اور شہسوار سلار وا ور وکیل صاحب، نواب صاحب اور اُن کے مصاحبین کو نہ جانتے ہوں اور اپنی گفتگو میں اُن کا ذکر نہ کرتے ہوں۔
فسانہ آزاد ہر معنی میں اردو کے ادب العالیہ میں شمار کئے جانے کے قابل ہے۔ یہ ایک آزاد فسانہ ہے، جو آجکل کے آزاد ترجموں سے بہت بہتر ہے۔ اگرچہ اسمیں فسانے کے تمام اُصولوں کی پوری طرح پابندی نہیں کی گئی مگر پھر بھی اس کے بلند پایہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا۔

ایک اچھا شاعر، یا ایک اچھا مصور، بہت سی اچھی تصویریں کھینچتا ہے، بہت سی اچھی نظمیں لکھتا ہے، لیکن اُن میں سے ایک تصویر یا نظم اُس کے کمالات کا آئینہ اور اُس کے فن کی معراج ہوتی ہے۔ وہ ایک ہی دفعہ اپنے آپ کو پاتا ہے۔ ایک ہی بار اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے۔ بعضوں کی ابتدائی تصانیف میں صرف اس کے اشارے ملتے ہیں۔

پہلے ہلکا ہلکا دھندلکا نظر آتا ہے پھر صبح ہوتی ہے تب جاکر خیال اور زبان کا توازن، شخصیت اور فنی شعور کا کامیاب اتصال ہوتا ہے، یہ لوگ عمر کے ساتھ شعور فنی میں ترقی کرتے ہیں۔ خود بڈھے ہو جاتے ہیں مگر ان کا کمال جوان رہتا ہے۔ یہ حال غالب اور اقبال کا ہے۔ سرشار اس زمرے میں نہیں آتے، عمر کے ساتھ اُن کے کمال میں بھی ضعف آگیا۔ شرر شعلۂ شب تاب نہ بن سکا، خاکستر میں تبدیل ہو گیا۔ سرشار نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں مگر فسانہ آزاد ہی اُن کا شاہکار ہے اسی کی وجہ سے وہ زندہ ہیں، اُن کی دوسری کتابیں اُن کی وجہ سے زندہ ہیں۔

اُردو میں قصے کہانیوں اور افسانوں کی کمی نہیں ہے اور یہ قصے کہانیاں اپنے رنگ میں منفرد بھی ہیں۔ پھر فسانہ آزاد کی مقبولیت کا کیا راز ہے در آں حالیکہ یہ ناول کے اصولوں پر بھی پورا نہیں اُترتا۔ اور تنقید کے جدید نظریات کی رو سے اس میں بڑی بڑی خامیاں ہیں۔ اس سے پہلے کے قصے خلاف فطرت سہی، دلچسپ ضرور ہیں۔ طلسم ہوشربا کو لے لیجئے۔ اُس کے ناپسند ہونے کی یہ وجہ نہیں ہو سکتی کہ وہ دلچسپ نہیں کیونکہ خاص خاص مقامات کو چھوڑ کر اُس کے اکثر حصے اپنے رنگ میں انوکھی دلچسپی رکھتے ہیں۔ تخیل کی اُن میں کمی نہیں، زبان بھی چنداں بُری نہیں، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اپنے طرز میں لاجواب ہے۔ مگر سچی بات یہ ہے کہ محض خیالی طوطا مینا بنانے سے کام نہیں چلتا۔ خیال بندی و خیال آفرینی بہت اچھی چیز ہے مگر جب آدمی اس کے پھیر میں پڑ جاتا ہے تو کسی کام کا نہیں رہتا۔ طلسم ہوشربا میں سب کچھ ہے۔ ناول اور افسانہ کا پہلا اور بنیادی اصول ان میں پایا جاتا ہے۔ یعنی تفریحی پہلو۔ اس میں کردار نگاری کی بھی کوشش ہے اگرچہ دھندلی سی سہی۔ اس میں اُس زمانے کی معاشرت کے عکس بھی مل جاتے ہیں۔ ان میں طرز بیان کی خوبی بھی ہے۔ اُن کا ایک اخلاقی پیغام بھی ہے، مگر جو کچھ ہے بے جان ہے اسلئے کہ زندگی سے اُسے علاقہ نہیں۔ اب حقیقت نگاری کی ضرورت ہے۔ واقعیت درکار ہے اور بنتی اور بگڑتی، پھیلتی اور بڑھتی ہوئی زندگی کی عکاسی ادب کے ہر شعبے میں ہونا لازمی ہے۔ اب ضرورت ہے کہ خیالی تصویروں کے بجائے ایسی تصویریں ہوں جنہیں پڑھنے والے پہچان لیں۔ اور ان میں انہیں جیتی جاگتی، چلتی، پھرتی، روزمرہ ملنے والی، جانی پہچانی شکلیں دکھائی دیں۔ فسانہ آزاد کی کامیابی کا سب سے بڑا راز یہی ہے۔ اسے پڑھتے وقت پلاٹ کے تناسب، سیرت نگاری کے اسلوب اور قصہ کی تدریجی ترقی کو ذہن میں رکھنا ضروری نہیں، بلکہ اسے تھوڑی دیر کے لئے نظر انداز کر دیا جائے تو بہتر ہے۔ اس میں لکھنؤ کی لٹی ہوئی تہذیب کا نقشہ دکھایا گیا ہے اور یہ نقشہ زندگی کے عین مطابق ہے۔ نواب اپنے مصاحبین کے جھرمٹ میں گھرے کبھی بٹیر کے اُڑ جانے پر ماتم کرتے

ہیں۔ کبھی جنگ روم و روس میں اُس کے کارناموں پر خوش ہوتے ہیں، کبھی اُس کا مقبرہ بنواتے ہیں، کبھی کھُدوا دیتے ہیں، کبھی فوجی کو گالی دیتے ہیں، کبھی خلعت سے سرفراز کرتے ہیں۔ مہریاں کہیں نوابوں سے آنکھیں لڑاتی ہیں کبھی کہاروں سے ضلع جگت میں طاق ہیں، زبان تڑاق پڑاق چلتی ہے۔ بوٹی بوٹی پھڑکتی ہے۔ نوجوان لڑکیاں آپس میں چہلیں کرتی ہیں، شعر پڑھتی ہیں اور لطف اُٹھاتی ہیں، چھیڑتی ہیں اور گدگداتی ہیں، مارے ہنسی کے لوٹی جاتی ہیں، محرم کا مہینہ ہے۔ عیش باغ کے جلسے ہیں۔ آم اور خربزے کی فصل میں شہر پر بہار ہے۔ سارا شہر آم پورا اور خربزہ نگر بنا ہوا ہے، نوکر آقا سے فقرے بازی کرتا ہے، آقا نوکر سے نہیں چوکتا، بوڑھے، جوان، بچے، مرد، عورتیں، نواب، امیر، رئیس، سپاہی، فقیر، چور، ڈاکو، قاتل، شہسوار، ریفارمر، شاعر، بانکے، خوتین، لنگے، سیار، سب کی بھیڑ ہے، اس پردے پر لکھنے والے نے اس کثرت سے تصویریں کھینچی ہیں کہ سب کا پہچاننا اور یاد رکھنا دشوار ہے۔ یہ سب آپس میں دست بگریباں ہیں، محبت، دوستی، رشک و حسد، میل ملاپ، جنگ و خونریزی، ہنسی مذاق، معصومیت، شیطنت، سب ہی سے تو واسطہ پڑتا ہے، اور سب نے مل کر پوری تصویر کو گڈمڈ بھی کر دیا ہے اور اس میں ایک عجیب فقید المثال واقفیت بھی بھر دی ہے جسے آسانی سے بھلایا نہیں جا سکتا۔

سرشار شاعر کا دماغ اور مصور کی آنکھ اپنے ساتھ لائے تھے۔ وہ جب فضا میں پرواز کرتے ہیں تو بھی اُن کے قدم زمین پر ٹکے رہتے ہیں۔ اُن کی تصویروں میں وسعت بھی ہوتی ہے اور گہرائی بھی۔ وہ جب کوئی واقعہ یا منظر بیان کرتے ہیں تو اُس کی جزئیات کو نظر انداز نہیں کرتے، وہ عام طور پر اچھائیاں اور بُرائیاں بیان کرنے پر قانع ہیں۔ جہاں کہیں اُنھوں نے ایسا کیا ہے وہاں وہ سرشار نہیں رہے، اخلاقی مسائل بھی سرشار کے بس کے نہیں، چنانچہ جب کبھی اُنھوں نے تھیاسوفی کے متعلق وعظ و پند سے کام لیا ہے وہاں وہ اپنے اصلی میدان سے دور جا پڑے ہیں۔

اس کے علاوہ وہ ایک بہت بڑے ہنسوڑ ہیں۔ اُن کی سب سے بڑی کامیابی یہی ہے کہ تقریباً ڈھائی ہزار صفحات کے باوجود گرمی کلام میں ذرا فرق نہیں آیا۔ سرشار کی ظرافت ایک تندرست دل و دماغ کی ظرافت ہے جو ہنسنے کے لئے زندہ رہتا ہے۔ اُن کی ظرافت کسی خاص اخلاقی مقصد کے لئے نہیں ہے، وہ سب پر ہنستے ہیں یہاں تک کہ اپنے اوپر بھی۔ اُن کے انداز بیان کی شوخی، ظریفانہ چٹکلے، فقرے بازیاں۔ اجنبی اشخاص کے نقشے، بدتمیز نوکر اور بدتوفیق آقا کے مکالمے، محل سرا کی تصویریں، سب ایسی ہیں کہ انسان کو ایک سیلاب تبسم میں بہالے جائیں۔

فطرت انسانی کے علم اور نیچے چلتے کے افراد سے واقفیت کے لحاظ سے سرشار اردو کے ڈکنس ہیں اور ظرافت کے لحاظ سے والٹیر۔ مکالے نے والٹیر کے متعلق کسی جگہ لکھا ہے کہ وہ جب لوگوں کو ہنسانا چاہتا ہے تو خود ہنسنے لگتا ہے۔ سرشار بھی یہی کرتے ہیں۔

فسانہ آزاد کے علاوہ سرشار کی تصانیف میں سے خدائی فوجدار اور سیر کہسار ممتاز ہیں۔ خدائی فوجدار مشہور کتاب ڈان کوئکزاٹ کا آزاد ترجمہ ہے۔ اس میں بھی سرشار نے اپنی طبع رسا کے جوہر دکھائے ہیں۔ سیر کہسار میں وہ ہندو خاندانوں کے حالات بھی بیان کرتے ہیں مگر یہاں اُن کی معلومات بہت بلند نہیں۔ فسانہ آزاد کی داستان طویل نہیں معلوم ہوتی، سیر کہسار، پڑھتے وقت یہ احساس ضرور ہوتا ہے۔ پی کہاں۔ کڑم دھڑم، ہشو نسبتاً پست ہیں۔

سرشار کا مقابلہ ایک طرف رجب علی بیگ سرور سے کیا جاتا ہے، دوسری طرف شرر سے۔ درحقیقت سرشار دونوں کے درمیان کی کڑی ہیں۔ سرور کی انشا کی جھلک سرشار کے یہاں بھی ملتی ہے۔ بس زمانے کا فرق ہے۔ شرر اور سرشار کا زمانہ اگرچہ ایک ہی ہے مگر دونوں میں فرق بہت ہے۔ سرشار کے افسانے ایک طرح ایڈیسن کے کورلی پیپرس (Coverly Papers) سے ملتے جلتے ہیں الگ الگ واقعات وخیالات کو ایک رشتہ میں گوندھا گیا ہے۔ شرر کے افسانے قصے کے لحاظ سے مکمل اور ممتاز ہیں۔ سرشار کے افراد اپنی ذاتی خصوصیات کی وجہ سے علیحدہ علیحدہ نمایاں معلوم ہوتے ہیں، شرر کے سب ہیرو اور ہیروین ایک ہی سانچے میں ڈھلے ہیں۔ منصور، عزیز، اور کوئی فرق نہیں، نام اور مقام الگ ہیں۔ قوت مشاہدہ کا استعمال شرر کے یہاں کم ہے مگر اُن کے پلاٹ مکمل ہوتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ادب بھی ایک قسم کی صورت گری ہے اور کسی صورت کے بنانے کے لئے پہلے اُس کا ڈھانچہ بنانا ضروری ہے۔ سرشار اس نکتہ سے واقف نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ فسانہ آزاد آزاد فسانہ ہو کر رہ گیا ہے۔
غرض سرشار کے فسانوں میں فن کے لحاظ سے کئی نقائص موجود ہیں۔ لیکن ان کی دلچسپی اور ادبیت میں آج سے کوئی فرق نہیں آیا۔ اور غالباً اس کی سب سے بڑی وجہ یہی ہے کہ وہ زندگی کے عین مطابق ہیں۔

بہت سے نقاد اب تک سرشار کو اردو کا پہلا افسانہ نویس اور فسانہ آزاد کو اردو کی اس رنگ کی پہلی کتاب کہتے ہیں۔ یہ صحیح نہیں۔ فسانہ آزاد ۱۸۸۰ء میں شائع ہوا۔ اس سے بہت پہلے ۱۸۶۹ء میں مولوی نذیر احمد کی

مراۃ العروس اور ۱۸۷۱ء میں توبۃ النصوح شائع ہو چکی تھی۔ نذیر احمدؒ اردو کے پہلے افسانہ نگار ہیں۔ یہ تو ایک تاریخی حقیقت ہے مگر اس سے سرشار کے افسانوں کی اہمیت کم نہیں ہوتی اس لئے کہ فنی نقطۂ نظر سے اور افسانوں کی غایت اور اصلیت کو مدنظر رکھتے ہوئے سرشار نذیر احمدؒ سے بلند درجے پر ہیں۔

کسی ادیب کی سب سے بڑی تعریف یہ ہے کہ اُس کے کارناموں میں دیوزادوں کی سی وسعت خیال اور جوہریوں کی سی مینا کاری دونوں کی جھلک نظر آئے۔ یہ چیز سب کے بس کی نہیں اور سب کے لئے اس کی ضرورت بھی نہیں۔ جین آسٹن مشہور ناول نویس نے اپنے لئے زندگی کا ایک بہت چھوٹا سا کونا انتخاب کیا تھا مگر اس دنیا کے چپہ چپہ سے اُسے اچھی طرح واقفیت تھی اور اس کی تمام ناولیں اس کی شاہد ہیں۔ سرشار کی تصانیف میں دیوزادوں کی وسعت خیال پائی جاتی ہے۔ مینا کاری اُن کے بس کی نہیں۔ یہی اُن پر سب سے بہتر تبصرہ ہے۔

غزل

جناب اشفاق حسین صاحب بیخود بی۔ اے (علیگ)

تری الفت کا قصہ ہوگیا وردِ زباں مجھکو
عجب کیا یاد بھی آئے نہ اپنی داستاں مجھکو

خدا کے واسطے اے بیخودی لے چل وہاں مجھکو
کہ حسنِ یار کی دنیا نظر آئے جہاں مجھکو

اُڑانے دے گریبانِ نفس کی دھجیاں مجھکو
جنوں! تیری ہی کرنا ہے مکمل داستاں مجھکو

مری منزل نہ مجھ سے پوچھ وہ آوارہ منزل ہوں
کہ اپنے ساتھ لایا ہے غبارِ کارواں مجھکو

سناؤں کیا تجھے اے ہمنفس جب سانس لیتا ہوں
تو یاد آتی ہے اپنی زندگی کی داستاں مجھکو

ترے صدقے مٹایا امتیازِ غیر بھی تو نے
تجھے بھی دیکھ کر ہوتا ہے اپنا ہی گماں مجھکو

خدا جانے اب اس کے بعد کیا انجام ہونا ہے
مبارکباد دیتی ہیں مری بربادیاں مجھکو

تری رنگینیاں تو ذرے ذرے سے جھلکتی ہیں
یہ دھوکہ دے رہے ہیں کیوں زمین و آسماں مجھکو

وہ کافر کیش ہوں بیخود کہ بت بھی میرے قائل ہیں
نہ بھولا ہے نہ بھولے گا کبھی ہندوستاں مجھکو

انقلاباتِ اسپین

محمد معین الدین دردائی بی۔ اے آنرز (علیگ)

[اس مقالہ کی ترتیب میں میں نے مجبوراً بہت زیادہ اختصار سے کام لیا ہے۔ ایک طرف مضمون کی وسعت اور واقعات کی اہمیت بہت زیادہ شرح و بسط کے ساتھ لکھنے پر مجبور کر رہی تھیں تو دوسری طرف میگزین کی تنگ دامانی اس سے زیادہ کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ اس کشمکش میں مجبوراً۔ مجھے "ہرچہ گیرید مختصر گیرید" پر ہی عمل پیرا ہونا پڑا۔ لیکن پھر بھی اس کا میں نے ضرور خیال رکھا ہے کہ اس مضمون کا پڑھنے والا اسپین کی موجود بغاوت، اس کے اسباب اور اسی طرح کے اور اسپین سے متعلق دوسرے اہم واقعات سے ناواقف نہیں رہے۔ ارادہ ہے کہ اس مقالہ کو ذرا تفصیل کے ساتھ علیحدہ بہت جلد کتاب کی شکل میں شائع کیا جائے۔ مگر اس کی تکمیل میں ہمارے ارادہ سے زیادہ کسی "اور چیز" کو دخل ہے۔ اس درمیان میں اگر کوئی باوقار ادارہ یا مطبع اپنے اہتمام سے اسے شائع کرنا چاہے تو مجھے اجازت دینے میں کوئی عذر نہیں ہوگا۔]

دردائی

(۱)

سپید

کوہ پائرینیز (Pyrenees) نے جس قدرتی طور پر اسپین کو تمام یورپ سے علیحدہ کر دیا ہے اس سے عام طور پر یہ خیال گذرتا ہے کہ اسپین میں سب ایک ہی طرح کے لوگ بستے ہوں گے جو اپنی ذہنیت اور شکل و صورت کے لحاظ سے بالکل یکساں ہوں گے۔ ان میں ذات پات، قومیت اور مذہب کسی طرح کا کوئی اختلاف نہ ہوگا۔ ان کا دامن تمام سیاسی اور اقتصادی الجھنوں سے پاک ہوگا اور ان میں تمام یورپ کی طرح سیاسی اور سماجی انتشار نہ ہوگا۔ لیکن حقیقت اس سے بالکل مختلف ہے۔ وہاں نہ ایک شکل و صورت کے لوگ ہیں اور نہ ایک ذہنیت اور طبیعت کے۔ غور سے دیکھا جائے تو پورا اسپین مختلف چھوٹے چھوٹے حصوں میں منقسم معلوم ہوگا جہاں کے باشندے اپنی قومیت، معاشرت اور ذہنیت کے اعتبار سے ایک دوسرے سے بالکل جدا ہیں۔

اسپین کو دیکھ کر سب سے زیادہ جس چیز کا گمان ہوتا ہے وہ اس کا افریقہ سے کسی زمانہ میں الحاق اور قرب

تعلق ہے اور آج بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ افریقہ ہی کا ایک حصہ ہے جیسا کہ ایک جگہ مسٹر ہیوک ایلس نے اس بارہ میں اپنے خیال کا اظہار کیا ہے: "اسپین کے لوگوں میں ابھی تک وہی غیر معمولی بربریت اور درندگی پائی جاتی ہے جو ان کو اہل افریقہ سے بالکل ملا دیتی ہے"

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے بہت عرصہ پہلے فونیشین (Phoenicians) تجار اور سوداگر ٹائر Tyre سے روانہ ہو کر جنوبی اسپین میں آباد ہو گئے تھے وہ کوئی فوجی اور لڑاکو قسم کے لوگ نہ تھے اور نہ ان کا مقصد ملک گیری اور جہانبانی ہی تھا۔ وہ یہاں تجارت کی غرض سے آئے تھے اور اسی حیثیت سے وہ یہاں رہنا چاہتے تھے۔ ان لوگوں نے آتے ہی فوراً گاڈس اور دوسری جگہوں میں اپنی تجارتی منڈی قائم کر لی۔ اور وحشی مگر کسی حد تک متمدن ایبیرین (Iberian) سے خرید و فروخت بھی شروع کر دیا۔

۲۴۲ قبل مسیح میں جب کہ رومیوں نے پہلی جنگ پونک (Punic War) میں، جسے ہم خالص میدانی قوت کی زور آزمائی کہہ سکتے ہیں، کارتھیجنین (Carthaginians) کو شکست دی تو ان کے مشہور جنرل حملکار بارکا (شہرہ آفاق سپہ سالار ہنی بال کا باپ) نے اس شکست کی کوفت کو مٹانے کے لئے یہی مناسب سمجھا کہ کسی طرح آئبریا فتح کر لیا جائے۔ چنانچہ اس نے اپنی توجہ اسی طرف مبذول کر دی۔ اس کے بعد اسی کے داماد اور بیٹے ہسدروبال اور ہنی بال نے بھی اسی کی متابعت کی۔ لیکن رومی جن کے حوصلے بہت بڑھے ہوئے تھے اس آسانی سے اپنے مفتوح کو چھوڑنے والے نہ تھے۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ اگر کارتھیجنین کو اسپین پر قابض چھوڑ دیا گیا تو پھر جنگ پونک کی فتح بالکل لاحاصل ثابت ہوگی کیونکہ اسپین پر قبضہ گویا بحیرہ روم پر قابض رہنا ہے حالانکہ جنگ پونک کی اصل بنا یہی تھی۔ چنانچہ رومیوں نے اسپین پر بھی بہت جلد حملہ کر دیا اور اپنی خداداد صلاحیت اور غیر معمولی شجاعت کی وجہ سے وہاں اپنا پورا تسلط جما لیا۔ ان کی خارا شگاف تلوار اور حیرت ناک فوجی تنظیم کے سامنے فونیشین، کارتھیجنین اور یونانی بالکل خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے۔

اس زمانہ کی تمدنی اور معاشرتی حالت کا پتہ یوں تو ہمیں اکثر رومی مورخوں کی تحریر سے چلتا ہے لیکن پہلی صدی قبل مسیح کے ایک مشہور یونانی جغرافیہ داں مسٹر اسٹرابو نے جس وضاحت سے اس زمانہ کا نقشہ کھینچا ہے وہ بعض حیثیت سے بہت زیادہ اہم ہے۔ جہاں اس نے آئبرین قوم کا ذکر کیا ہے وہاں اس نے ان کی ہمت، جرأت اور خاندانی غرور کا بہت زیادہ اعتراف کیا ہے۔ برخلاف اس کے مشہور رومی مورخ لیوسے (۵۹ ق م) کا خیال آئبرین کے متعلق بہت خراب ہے وہ ان لوگوں کو "شورش پسند، وحشی اور باغی" لکھتا ہے۔

اگر ہم اہل اسپین کے عادات و خصائل کا جائزہ لیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ ان پر رومیوں کا بہت گہرا اثر پڑا ہے۔ اور اکثر جگہ یہ رومیوں سے خلط ملط ہو کر بالکل ان ہی کے یک فرد ہوگئے ہیں۔ لیکن اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ رومی اپنے مفتوحین کے رسم و رواج اور عادات و خصائل سے متاثر ہوئے بغیر رہ گئے ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ فاتح کے مقابلہ میں مفتوحین نے بہت زیادہ اثر قبول کیا اور یہ تقاضائے فطرت بھی ہے۔ لیکن ساتھ ہی اس چیز کو ہرگز فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ مفتوحین میں قومیت اور پیدائشی ساخت کے اعتبار سے کبھی بھی کسی قسم کی تبدیلی نہیں واقع ہوئی۔ ایک موجودہ ہسپانوی موجودہ اطالوی سے اپنی شکل و صورت طبیعت اور مزاج کے لحاظ سے اتنا ہی مختلف ہے جتنا ایک آئرلینڈ کا باشندہ انگلینڈ کے باشندے سے ہو سکتا ہے۔

رومی سلطنت کا زوال دراصل آخر چوتھی صدی ہجری سے شروع ہوگیا تھا۔ قوم بربر کی ٹڈی دل فوج جنوبی مغرب کے جانب رہائن کے پار فرانس سے ہوتے ہوئے پائرنیز (Pyrenees) آمیں داخل ہوگئی تھی۔ ان میں بنڈال قوم اسپین کے جنوبی ساحل پہنچے اور رفتہ رفتہ جبرالٹر سے گذر کر افریقہ میں گھس گئے۔ ان لوگوں کے پیچھے پیچھے ویسا گوتھ، گوتھ اور دوسری جرمنی قومیں بھی داخل ہوئیں۔ یہ اپنی طبیعت کے لحاظ سے بہت زیادہ وحشت پسند، جاہل، گنوار اور اُجڈ تھے جو رومیوں اور ہسپانیوں کے لئے ایک مصیبت بن گئے۔ ان فاتحین کی فطری جہالت اور بربریت نے ان کو مفتوح قوموں کے ساتھ اچھی طرح خلط ملط

نہ ہونے دیا۔ اور اس طرح فاتح و مفتوح کے اندر ایک طرح کی مذہبی اور معاشرتی کشمکش جاری ہوگئی جس نے آہستہ آہستہ رومی چرچ کی طاقت کو بہت زیادہ بڑھا دیا۔ آخر کار ان کے ایک لیڈر نے اس کشمکش سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے خود عیسائی مذہب قبول کر لیا۔ اور اس طرح گوتھ سلطنت کی بنیاد پڑ گئی۔ زمانہ نے اب نیا پلٹا کھایا۔ جو غیر عیسائی تھے ان کے ساتھ ظلم و جور شروع ہوگیا۔ یہودی تجار اور باشندے دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکے گئے۔ جو سُرخرو تھے وہ زرد رو ہوگئے اور جو زرد رو تھے وہ سر چڑھے۔ ملک میں ایک کہرام مچ گیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب کہ مسلمانوں کا ستارہ اقبال عروج پر تھا۔ ان کے نام سے دنیا تھراتی تھی۔ گوتھ سلطنت سے ذرا دور افریقہ میں اس وقت ایک چھوٹی سی سلطنت مسلمانوں کی بھی قایم تھی جسے شاہان گوتھ کے ستائے ہوئے لوگ اپنا نجات دہندہ تصور کرتے تھے۔ وہ اس گھڑی کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہے تھے جب کہ مسلم علاقہ کا نیک دل سردار مظلوموں کی حمایت کے لئے کھڑا ہوگا اور ان کو شاہان گوتھ کے آہنی پنجوں سے نجات دلائے گا۔ آخر وہ نیک گھڑی بھی آپہنچی، مسلمانوں کی مٹھی بھر فوج نے ساری عظیم الشان گوتھ سلطنت کا تختہ اُلٹ دیا۔ یہ نئے فاتح عرب اور بربر قوم پر مشتمل تھے۔ رفتہ رفتہ یہ دونوں قومیں مل جل کر شیر و شکر ہوگئیں۔ ان کا دوسرا متحدہ نام مورز تھا۔

گیارھویں صدی ہجری سے جب کہ مسلمانوں کا ستارہ اقبال عروج کی آخری منزلیں طے کر رہا تھا، اسپین کی سیاسی حالت میں ایک خاص انقلاب رونما ہوا جس نے وہاں کی تہذیب و تمدن اور سیاست پر بہت گہرا اثر ڈالا۔ قرطبہ کی مرکزی خلافت ٹوٹ کر چھوٹی چھوٹی کئی اسلامی سلطنتوں میں منقسم ہوگئی تھی جو ہر دم آپس ہی میں کٹنے مرنے پر تلی رہتی تھیں۔ عیسائی قومیں مغلوب ہونے کے بعد ہر وقت موقع کے تاک میں لگی رہتی تھیں۔ مسلمانوں کے اس انتشار کو دیکھ کر ان کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھانے کے لئے وہ فوراً تیار ہوگئے اور منظم ہو کر مسلمانوں کے خلاف مذہبی جنگ کا اعلان کر دیا۔ یہ جنگ ۱۴۹۲ء تک جاری رہی۔ آخر وہ دن بھی آپہنچا جب کہ فرڈی ننڈ اور ملکہ ازابلا کی متحدہ فوج نے غرناطہ کی فتح کے بعد

مسلمانوں کی قسمت کا قطعی فیصلہ کر دیا۔ ناعاقبت اندیش مسلمان اپنے ہزار سالہ ایوان حکومت کو چھوڑ کر غربت و جلاوطنی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کئے گئے اور ان کی تمام اگلی شان و شوکت اور عزت و حشمت مٹی میں مل گئی۔ فرڈی ننڈ اور ازابلا کی اس یادگار فتح نے ہسپانیہ کو ایک متحدہ سیاسی قوت کی شکل میں منقلب کر دیا۔

(۲)

ہسپانوی شہنشاہیت کا عروج وزوال

قاعدہ ہے جب کبھی کسی ملک میں دولت آتی ہے تو اس سے حقیقی فائدہ اٹھانے والے غریب نہیں ہوتے بلکہ امیر اور طاقتور ہوتے ہیں۔ اسپین کا حال بھی یہی ہوا۔ ۱۴۹۲ء میں کولمبس نے امریکہ دریافت کر کے اور ۱۵۴۰ء تک مالدیپ نے قریب قریب پورا جائل دولت ہسپانیہ کے زیرنگین کر کے ممکن ہے ملک کی وسعت اور دولت میں زیادتی کر دی ہو لیکن غریبوں کی مصیبت میں ذرہ بھر بھی کمی نہیں کر سکے۔ ایک طرف ہسپانیہ کے ایوانوں میں دولت کا سیلاب امنڈ رہا تھا تو دوسری طرف اس کی جھونپڑیوں میں سینکڑوں فاقہ کش مزدور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اور ہزاروں عورتیں اور بچے بھوک کی شدت سے بلک بلک کر دم توڑ رہے تھے۔ یہ وہ وقت تھا جب شہنشاہیت اور چرچ کا پورے ہسپانیہ میں دار و دورہ تھا۔

چارلس سوم (۱۷۵۹-۱۷۸۸) کا زمانہ پھر بھی غنیمت تھا اس سے پہلے تو اسپین کی عجب افسوسناک حالت تھی۔ شہنشاہیت اور مطلق العنانی نے ملک کو برباد اور ذلیل کر دیا تھا۔ اس زمانہ پر نظر کرنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہاں سب بیوقوف اور ناسمجھ قسم کے لوگ بستے تھے۔ تعلیم کی کہیں بوباس نہ تھی۔ کالج اور یونیورسٹی سے کیا واسطہ یہ سب چیزیں تو وہاں خواب وخیال تھیں۔ سائنس سے کسی کو لگاؤ نہ تھا۔ شاعری اور ڈراما دونوں کی مٹی پلید تھی اسے کوئی سمجھنے والا تک نہ ملتا تھا۔

چارلس دوم کے عہد میں سلطنت متحدہ امریکہ کا انگریزی تاج سے علیحدہ ہو جانا اسپین کے لئے بہت مفید ہوا۔ اسپین کے زیرنگیں امریکہ میں اور بھی جو علاقے تھے انھوں نے بھی دیکھا دیکھی اپنی آزادی کی جدوجہد شروع کر دی نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ اسپین کے تمام علاقوں میں آزادی حاصل کرنے کا احساس پیدا ہو گیا اور ساتھ ہی آزادی کی تحریک بھی جاری ہو گئی۔

اتفاق سے اسی زمانہ میں انقلاب فرانس رونما ہوا - یہ وہ زمانہ تھا جب یورپ کے کسی شہنشاہ کے سر پر اس کا زرین تاج محفوظ نہ تھا - نپولین کی نظر عرصہ سے اسپین کی طرف لگی ہوئی تھی موقع پاتے ہی فوراً حملہ آور ہوا - لیکن یہاں آکر اس کو بہت جلد معلوم ہوگیا کہ "دشمن را حقیر نتواں شمرد" وہی اہل اسپین جن کو نپولین ہمیشہ بودا کمزور اور ذلیل سمجھتا رہا تھا مقابلہ ہونے پر شیر سے زیادہ بہادر اور لومڑی سے زیادہ عقلمند ثابت ہوئے۔ وقت پڑنے پر اپنے تمام اگلے اور پچھلے بغض وعناد کو پس پشت ڈال کر ایسا جم کر لڑے کہ نپولین جیسا نبرد آزما بھی ان کی جرأت وطن پرستی اور استقلال کو دیکھ کر دم بخود تھا - نپولین اپنی فوجی تنظیم کے بوتہ پر انہیں بار بار شکست دیتا تھا لیکن ان کے پائے استقامت میں ذرا لغزش نہ ہوتی تھی - پہلے سامنے آکر لڑتے تھے جب بہت کمزور ہو گئے تو چھاپہ مارنے لگے - اس وقت کے ایک مشہور جنرل نے ہسپانیوں کے جوش وخروش کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے : - "عورتیں ہر مورچہ پر اپنی جانیں دینے کے لئے تیار رہتی ہیں گویا ان کے نزدیک جان کی کوئی قیمت ہی نہیں"۔

آخرش فرانسیسیوں کا قدم اسپین میں نہ جم سکا - وہ لوگ وہاں سے بدر ہوئے تو آزادی کی تحریک کا اور بھی بول بالا ہوا - گاڈس میں (۱۸۱۱ - ۱۸۱۲) ایک "قومی مجلس" کی بنیاد رکھی گئی جس نے "حقوق انسانی کی محافظت" کا بیڑا اٹھایا اس جماعت نے شاہی اقتدار کو بہت محدود کرتے ہوئے نئے آئین تیار کئے۔ ایسا معلوم ہونے لگا جیسے وہ ہسپانوی قوم جس نے مدت دراز تک غلامی کی زندگی گذاری ہے اب ہمیشہ کے لئے غلامی کا جوا کاندھے سے اُتار پھینکے گی - لیکن یہ ایک غلط فہمی تھی - ادھر نپولین پر زوال آنا تھا کہ فوراً فرڈی نند ہفتم نامی ایک دوسرے بادشاہ نے اسپین پر (۱۸۱۴) قبضہ جمایا - اس نے اپنی سلطنت اور طاقت کو مضبوط بنانے کے لئے بہت سی انسانیت سوز اور وحشت انگیز حرکتیں کیں - اس کے حکم سے بے شمار مصلح قوم اور وطن پرست اشخاص نیست ونابود کر دئے گئے اور ان کے بنائے ہوئے آئین کو پرزے پرزے کر کے نذر آتش کر دیا گیا ان کے معصوم بچے اور بے گناہ عورتیں زندہ آگ میں جلادی گئیں

غرض دنیا نے وہ تمام اخلاق سوز اور عبرت ناک مناظر دیکھے جن کی یاد آج بھی لوگوں کے دلوں میں کپکپی پیدا کر دینے کو کافی ہے ۔ اس طرح ایک مرتبہ پھر شہنشاہیت کی جڑ مضبوط ہو گئی ۔ لیکن عجب اتفاق کہ اس زمانہ میں فوج کی بڑی تعداد حریت پسند سرداروں کے ماتحت تھی ۔ ان لوگوں نے ایک مرتبہ پھر شہنشاہیت کے خلاف بغاوت کی اور اپنے وہی قدیم بنائے ہوئے آئین کا مطالبہ کیا ۔ حریت پسند جماعت کے جوش و خروش اور ان کی سرفروشانہ جدوجہد کے سامنے شہنشاہیت کو جھکنا پڑا ۔ اور اس نے ان کے تمام مطالبات پورے کر دیئے ۔ لیکن اس عجب انقلاب سے روس، آسٹریا، اور پروشیا کے اقتدار پسند بادشاہوں کے دلوں میں کھلبلی پڑ گئی ۔ یہ لوگ گھبرائے کہ کہیں یہ حریت پسند جماعت کا فروغ آگے چل کر ان کی سلطنت میں بھی زلزلہ نہ پیدا کر دے ۔ چنانچہ فرانسیسی فوج کے ایک زبردست دستہ کو فوراً پائرنیز عبور کرنے کا حکم نافذ کیا گیا اس نے وہاں پہنچکر شہنشاہیت کی جڑ پھر سرے سے مضبوط کر دی ۔ اس شہنشاہیت پسند جماعت نے اپنے جذبۂ انتقام کو بجھانے کے لئے وہی اپنا پرانا اخلاق سوز رویہ اختیار کیا ۔ چالیس ہزار آئین پسند اشخاص قید خانہ میں ٹھونس دیئے گئے ۔ اور قتل و غارتگری کا تو کوئی حساب ہی نہیں ۔ اب وہاں مستقل دو جماعتیں قایم ہو گئیں ۔ ایک کا لیڈر دان کارلس تھا اور دوسری جماعت شہزادی میری کرسٹینا کے ماتحت تھی ۔ رفتہ رفتہ اسپین کی سیاسی حالت بہت خراب ہوتی گئی ۔ اس سے متعلق جتنے علاقے تھے سبھوں نے آزادی کے لئے ایک ساتھ جدوجہد شروع کر دی ۔ انگلینڈ کے وزیر اعظم کیننگ نے جو کہ اپنی رقیب سلطنت کی بربادی کا دل سے خواہاں تھا موقع کو غنیمت جان کر حریت پسندوں کا ساتھ دیا ۔ اور اس جنگ آزادی میں ان کی پوری پوری مدد کی ۔ اس طرح رفتہ رفتہ ہسپانوی شہنشاہیت کا خاتمہ ہو گیا ۔ مگر جنگ کا سلسلہ برابر قائم رہا ۔ اور ۱۹۳۶ء والی خانہ جنگی کو دراصل اسی پچھلی خونی داستان کی صدائے بازگشت سمجھنی چاہیئے ۔

آگے کے تمام معاملات کو سمجھنے کے لئے ہمیں اہل اسپین کے عادات و خصائل کا مختصر سا خاکہ بھی دماغ میں رکھنا بہت ضروری ہے ۔ لیکن دقت یہ ہے کہ ان کے کیرکٹر کے متعلق آج تک کسی نے بھی ہمیں

صحیح خبر نہیں دی ہے۔ ہر شخص نے ان کے عادات وخصائل کو اپنے مصلحت وقت کی بنا پر مختلف روشنی میں پیش کیا ہے۔ انگریز مصنّفین نے انہیں بے رحم اور درندہ خصلت لکھا ہے۔ بعضوں نے بے رحمی اور درندگی کے ساتھ قسمت پر شاکر رہنے کی خصوصیت کا بھی اضافہ کر دیا ہے۔ ہیوک ایلس نے ان کے عادات وخصائل پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنی مشہور کتاب (Soul of Spain) میں مزدور ڈاکو کا ایک بہت دل چسپ قصّہ لکھا ہے جس سے ہسپانیوں کی فیاضی اور رحمدلی کا پتہ چلتا ہے لیکن ہماری ذاتی رائے ہسپانیوں کے خصائل کے متعلق ان سب سے ذرا جدا ہے۔ ہمارے خیال میں وہ جنگجو، بہادر، جفاکش، خوددار اور کسی حد تک وحشت پسند ہوتے ہیں انگریز مورخین کا انہیں بے رحم اور جنگلی لکھنا ہمارے خیال میں قطعی غلط ہے۔ ان کی طبیعت کا اگر تجزیہ کیا جائے تو وہ رحمدل ثابت ہونگے۔ ان کے یہاں انگریزی قاعدہ کی پھانسی، قید، کوڑے سے پیٹنا اور لومڑی کا شکار بے رحمی میں داخل ہے ان کے یہاں مجرم کو بہت ہلکی سزا دی جاتی ہے۔ یہ سب ان کی رحم دلی پر دال ہے۔

(۳)

"آزادی کے لئے حریت پسندوں کی سرفروشانہ جدوجہد"

اب دیکھنا چاہیئے کہ آخران جلاوطنوں کا کیا حشر ہوا جو فرڈی نند ہفتم کی سیاسی بے رحمیوں کے شکار ہوئے تھے۔

عام طور پر یہ دیکھا جاتا ہے کہ سیاسی دشمنوں کے جلاوطن کرنے سے بجائے فائدہ کے الٹا اور نقصان ہی پہنچتا ہے۔ یہ لوگ جلاوطن ہو کر تمام گھومتے پھرتے ہیں، انہیں مختلف شہروں میں مختلف خیالات کے لوگوں سے ملنے اور نوع بہ نوع کی سیاسی انجمنوں کے دیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ اور اس طرح ان لوگوں کا دل و دماغ اور بھی سیاسی معاملات کو سمجھنے اور اس کے لئے جدوجہد کرنے کے لائق ہو جاتا ہے۔

فرڈی نند ہفتم کے دربار سے نکالے ہوئے ہسپانیوں کا بھی یہی حال ہوا۔ یہ لوگ اپنے وطن سے نکل کر سیدھے فرانس اور انگلینڈ پہنچے جہاں ان لوگوں کو اپنے سے بہت زیادہ روشن خیال، مہذب تجربہ کار سیاست داں اور مدبروں سے ملنے جلنے کا موقع ملا۔ اپنی ہمسایہ قوموں کو اس قدر پرامن، آزاد، خوش اور مطمئن زندگی گذارتے دیکھ کر ان لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں۔

اسپین کی سیاسی حالت دن بدن بدلتی گئی۔ ہم ابھی دیکھ چکے ہیں کہ فرڈی نند ہفتم کے عہد حکومت (۱۸۳۲) تک وہاں دو جماعتوں کے اندر مستقل کشمکش تھی۔ اس کے بعد ملکہ زابلا کا دور ہوا جو بعض حیثیت سے نرم رہا۔ اب اسپین میں ایک عام بدامنی پھیل چکی تھی۔ ہر شخص شہنشاہیت کے خلاف برسرپیکار نظر آتا تھا۔ چنانچہ ۱۸۵۴ء میں بار عام ایک جماعت نے اسپین میں جمہوری حکومت کا اعلان کر دیا یہ اعلان اس وقت کچھ زیادہ اہم تو نہ معلوم ہوا لیکن آگے چل کر یہی جمہوریت کا پودا اتنا سخت جاں ثابت ہوا کہ شہنشاہیت کے آتشیں تھپیڑے بھی اُسے جلد کر خاک سیاہ نہ کر سکے۔ ۱۸۶۸ء میں اسی پودے نے ایک نئی کونپل پھینکی جو دیکھتے دیکھتے ریک

عظیم الشان درخت بن گیا۔

شہنشاہیت پسندوں کے اندر اب دو جماعتیں ہو گئی تھیں۔ اور یہ دونوں جماعتیں اپنے خیالات میں اس قدر مختلف تھیں کہ ۱۸۷۰ء میں جب یہ سوال پیش ہوا کہ وقتی طور پر کون بادشاہ بنے تو یہ آپس میں بالکل طے نہ کر سکے۔ آخرش لوگوں نے وکٹر امنڈ ثانی کے دوسرے بیٹے اماد یو کو سلطنت پر بٹھلا دیا۔ اماد یو کی نام نہاد بادشاہت صرف ۱۸۷۳ء تک رہی جس نے وہاں کے باشندوں پر ایک مصیبت نازل کر دی۔ ۱۲ فروری کو اماد یو نے اپنا تاج اُتارا اور سلطنت سے دست بردار ہو کر دوسرے ملک کی راہ لی۔ یہ ایک خود غرض اور ناعاقبت اندیش انسان تھا۔ اس نے مذہبی پیشواؤں کے بے پناہ اختیارات میں روک تھام کی دھمکی دے کر اپنے حق میں اپنے ہاتھ سے کانٹے بوئے۔ لیکن اسی کے ساتھ ہی اس میں ایک صفت بھی تھی۔ وہ خود بھی حریت پسند تھا اور حریت پسندوں کو پسند کرتا تھا۔ اس کے دماغ میں ملک کے اندر ہر طرح کی اصلاح کرنے کا بہت زیادہ شوق تھا۔ اور وہ اس بارہ میں ہر وقت کوشاں بھی رہتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اس نے اپنی جماعت اور ہمدردوں کے اندازہ لگانے میں بہت سخت دھوکا کھایا۔ اس کی سطحیں نظریں ہمیشہ یہی سمجھتی رہیں کہ پارلیمنٹری کثرت تمام لوگوں کے جذبات کی ترجمان ہے حالانکہ ماحول بتلا رہے تھے کہ یہ اس کی سخت غلطی تھی۔

آئینی کورٹس نے طے کیا کہ اسپین میں جمہوری حکومت رہنا چاہئے۔ چنانچہ انتخاب ہوا اور سب سے پہلی جمہوری حکومت کی بنیاد پڑی۔ کیٹلا نیا اس زمانہ میں خود مختار ریاست کی حیثیت رکھتا تھا۔ شمالی صوبے روایات کی بنا پر کارلسٹس (Carlists) کے ہاتھ میں رہے اور اس طرح ایک نئی فضا انارکزم کی پیدا ہونے لگی۔ جیسا کہ سب لوگ جانتے ہیں "انارکزم" کا سب سے بڑا مسلک انفرادی آزادی ہے۔ انہیں قوم اور ملک کی آزادی سے زیادہ اپنی ذاتی آزادی کی فکر دامن گیر رہتی ہے۔ انارکسٹ جماعت کے نزدیک فیاض سے فیاض سلطنت بھی ایک دشمن سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی۔ اور اسپین کی

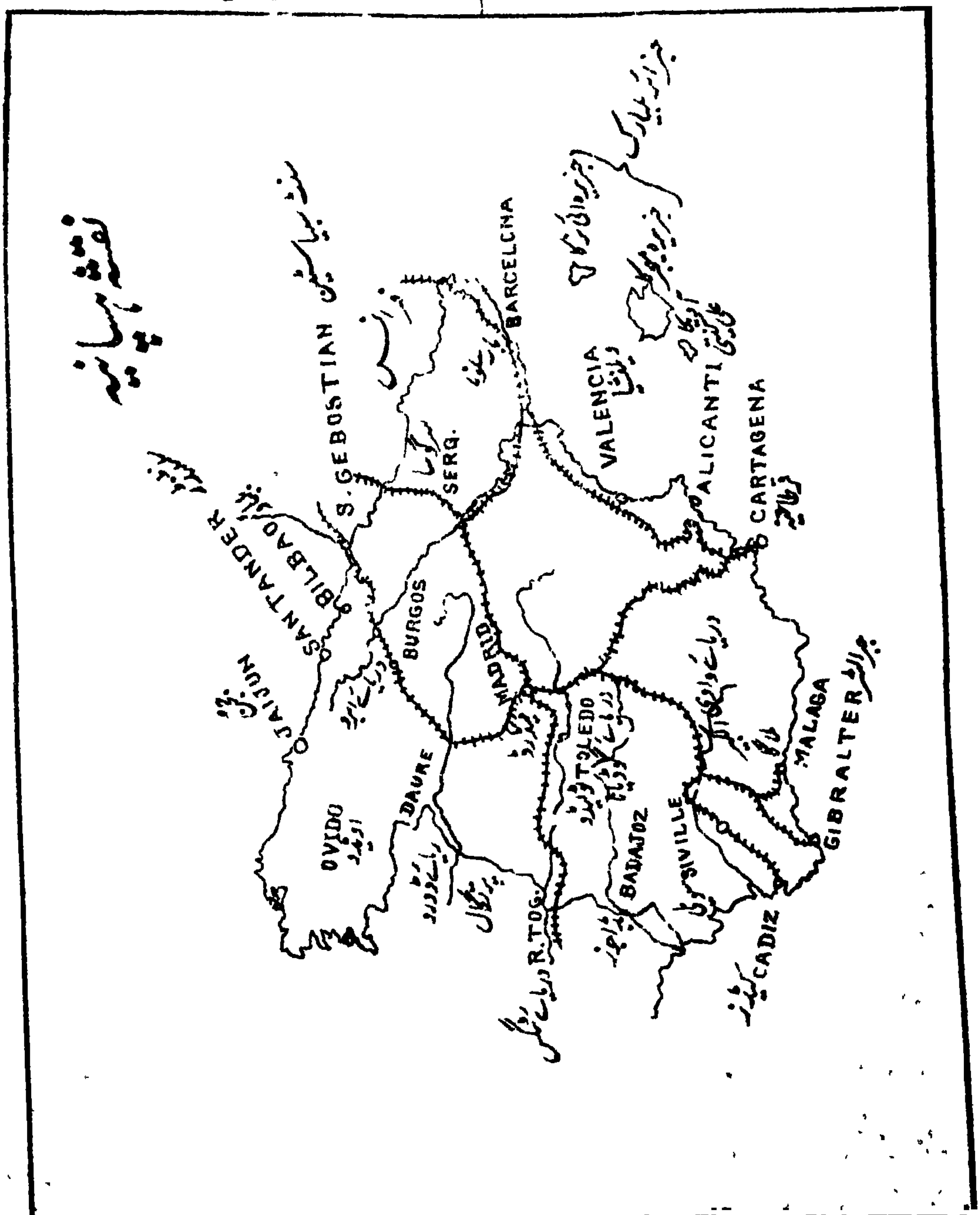
سلطنت تو ہمیشہ استبداد و تعدی کے لئے مشہور رہی ہے۔ اس جمہوریت حکومت کا صدر پائی مارگل Pi-Margell منتخب کیا گیا۔ اس نے اپنے پروگرام میں سب سے پہلی چیز جو داخل کی وہ جمہوری حکومت کی بنیاد کو غیر معمولی طور پر مضبوط کرنا اور سیاسی خیال رکھنے والی فوج کی تادیب و تربیت تھی۔ یہ دونوں اسکیمیں اپنی جگہ پر خود کیا کم خطرناک تھیں کہ اس نے چرچ کے اختیارات میں مداخلت کر کے اپنے اوپر اور بھی ستم کیا۔ چرچ اور فوج کو ایک ساتھ چھیڑ کر سالم اور مطمئن رہنا بالکل ناممکن ہے۔ آج تک جن حکمرانوں نے ان دونوں طاقتوں سے سر ٹکرایا وہ فوراً پاش پاش ہو گئے۔ پائی مارگل کی قسمت بھی اس سے دیکھتے دیکھتے پھر گئی اور یہ ایک مصیبت میں مبتلا ہو گیا۔ بقول ایک انگریز مورخ مسٹر بٹلر کلرک کے جمہوری انقلاب کا اصل مقصد ہی مرکزی حکومت کا فقدان، انفرادی آزادی اور لوکل اٹانمی ہے۔ تین مہینے کے اندر اندر کارلسٹ بغاوت نمودار ہوئی۔ اور تمام لبرل شہر ابروتک اپنی ہمت اور جرأت کے سہارے بالکل آزاد چھوڑ دئے گئے۔ کیٹلانیا کی حالت اور بھی خراب تھی۔ جمہوری حکومت کا اعلان ہونا تھا کہ یہاں کی "علیحدگی پسند" جماعت نے فوراً ہی کیٹلانیا کو خود مختار ریاست اعلان کر دیا۔ اندلس کے لیڈروں کا سیاسی خیال سوئس فیڈریشن تھا جیسے ہی اسپین نے شہنشاہیت کے خلاف آواز بلند کی نئی سیاسی جماعت کے مرکز مالگا میں فوراً جمہوریت قایم ہو گئی۔ حریت پسندوں کی ایک مسلح جماعت نے تمام سول حکام کو شہر بدر، قلعہ کی فوج کو منتشر اور تمام پرانے رسم و رواج کا خاتمہ کر دیا۔ ساتھ ہی میڈرڈ سے مساوات کے اصول پر فیڈریشن (حکومت وفاق) کی گفت و شنید شروع کر دی۔ اس طرح کارٹجنا اور سولر جمہوری رقیب لیڈروں کے اندر آپس ہی میں ناچاقی کا سامان ہو گیا۔ سوائل، کاڈس اور کئی دوسرے شہر بالکل اسی طرح کے مرض میں مبتلا تھے۔ الکوائے اور غرناطہ کے لوگوں کی عجب حالت تھی یہ لوگ اپنی وحشت اور بربریت میں درندوں کو بھی مات کرنے لگے۔ سوائل کے باشندوں نے اور بھی تماشا کیا اچھے بھلے شہریوں سے کمینہ خصلت ڈاکوؤں کی جماعت میں تبدیل ہو گئے۔ شہر پناہ کی دیوار مضبوط کر کے

مسلح ہوکر اپنے ہمسایہ شہروں پر چھاپہ مارنے لگے۔ غرض پورے اسپین میں عجب لوٹ کھسوٹ مچی ہوئی تھی۔ غریب و امیر سب پناہ مانگ رہے تھے۔

آج سے ساٹھ برس پہلے اسپین کا جو منظر تھا، کیا آج ان ہی مناظر کا اعادہ نہیں ہو رہا ہے۔

ان تمام سیاسی انتشار، بدامنی اور معاشرتی تنزلی کے باوجود بھی اس وقت اسپین میں کئی ایسی باتیں موجود تھیں جو اس زمانہ کو بہت درخشاں کر دیتی ہیں۔ اور یہ مزدور اور کاشتکار دونوں جماعت کی سیاسی بیداری ہے۔ ان لوگوں نے بھی دوسری کام کرنے والی جماعتوں کے ساتھ مل کر سیاست میں دل چسپی لینی شروع کر دی تھی۔ ان لوگوں نے اس کو اچھی طرح محسوس کر لیا تھا کہ ان کے وہ حقوق جو ان کے حکمراں ان کو کبھی نہیں بخش سکتے ان کو وہ اپنی سچی قربانی اور ایثار سے بہت جلد حاصل کر سکتے ہیں انقلاب پسند لاکھ برے سہی لیکن ان خفتہ کسان اور مزدوروں کو جگانے والے دراصل یہی تھے۔ لوگوں کو یاد ہوگا ۱۸۹۸ء والی ہسپانوی امریکن جنگ کے بعد جس میں اسپین کو، کوبا، پورٹریکو، اور فلپائن سے دست بردار ہونے پر مجبور کیا گیا تھا مصنفین، ماہر تعلیم اور ترقی پسندوں کی ایک زبردست جماعت پیدا ہو گئی تھی۔ ان لوگوں کو بھی تعلیم دینے والے دراصل یہی انقلاب پسند تھے۔ حسن اتفاق سے اسی زمانہ میں کچھ لوگ ایسے بھی پیدا ہو گئے جن کے دماغ میں یہ بات اچھی طرح سما گئی کہ اہل اسپین اپنی سیاسی اور اقتصادی آزادی اس وقت تک ہرگز نہیں حاصل کر سکتے جب تک کہ شہنشاہیت اور رومی چرچ کا قلع قمع نہ کر دیا جائے۔ اس خیال کے پیدا ہوتے ہی ملک میں سخت سیاسی بے چینی پھیل گئی۔ اسپین کے نئے بادشاہ الفانسو سیزدہم پر پے در پے متعدد قاتلانہ حملے ہوئے۔ الفانسو سیزدہم ایک دوربین، معاملہ فہم بیدار مغز بہادر اور شجاع بادشاہ تھا۔ دشمنوں کے قاتلانہ حملوں کے باوجود بھی اس کے پائے استقامت میں ذرا لغزش نہ ہوئی۔ دشمنوں کے نیزے اور گولیاں اس کے شاہی وقار اور سنجیدگی میں ذرا بھی فرق نہ ڈال سکیں اپریل ۱۹۱۳ء میں اس پر پے در پے تین گولیاں چلیں لیکن اس کا بال تک بیکا نہ ہوا۔ اس موقع پر اس نے اپنے

حملہ آوروں کے ساتھ فیاضانہ سلوک کرکے تمام ملک میں مقبولیت حاصل کرلی۔



(۴)

"شہنشاہیت کا خاتمہ"

ڈکٹیٹر شپ کے متعلق ہسپانیہ کے ایک اہلِ نظر نے بہت اچھا جملہ کہا ہے :۔ "اس طریقہ حکومت کی مثال بالکل بائیسکل کی سی ہے۔ جب تک اس میں تیز رفتاری رہے گی یہ اپنے توازن کو قائم رکھ سکے گا جہاں اس کی رفتار سُست ہوئی وہیں اس کے گرنے کا اندیشہ ہوا"۔ ۱۹۳۱ء کے موسم بہار تک ملک کے انتظامی امور میں بڑی گڑبڑی رہی۔ یہاں تک کہ جمہوری اصول پر لوکل کونسل کی دوبارہ تعمیر کے لئے میونسپل الکشن کا ہونا قرار پایا۔ اور بلا شبہ یہی فیصلہ اسپین کے ابسلوٹسٹ (Absolutists) عہدِ حکومت کی سب سے بڑی غلطیوں میں شمار کئے جانے کے لائق ہے۔ اس میونسپل الکشن کے موقع پر قریب قریب تمام لوگ جمہوریت کے موافقت میں نظر آنے لگے۔ اور دیکھتے دیکھتے الفانسو کی مقبولیت عام نفرت سے بدل گئی۔ رفتہ رفتہ اس نیک دل بادشاہ کے خلاف لوگوں کی نفرت اس درجہ بڑھ گئی کہ اس کے پاس شہر چھوڑ کر بھاگ جانے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں رہا۔ چنانچہ ایک رات کو نہایت دلشکستگی اور حسرت ویاس کے عالم میں اس نے اپنے دارالسلطنت میڈرڈ کو ہمیشہ کے لئے الوداع کہا۔

اس کے بعد اسپین میں دوسری جمہوری حکومت قائم ہوئی۔ اس جمہوریت کی بنیاد ملک کے باشندوں کے جوش وخروش اور مسرت کے درمیان رکھی گئی۔ اسی نئی جمہوری حکومت میں تین اعتدال پسند سوشلسٹ شامل تھے اور بقیہ اعتدال پسند جمہوریت کے طرفدار تھے۔ سنرالکال زمرا اس کا صدر منتخب ہوا۔ یہ شخص بہت ہی سرگرم کیتھولک تھا۔ اور ساتھ ہی ایک بڑی جائداد کا مالک بھی تھا۔ اس لئے "حق پسند" اس سے اچھائی کی بہت کم امید رکھتے تھے اور ایک گونہ بدگمان تھے۔ اسی نئی

حکومت کا سب سے پہلا کام ایک آئین کا منضبط کرنا تھا۔ چنانچہ یہ نیا آئین ۹ ستمبر ۱۹۳۱ء کو شائع بھی ہوگیا اس کے بعض جملے اور الفاظ بڑے دلچسپ اور بصیرت افروز تھے۔ مثلاً اس کا سب سے پہلا جملہ تھا:۔
"اسپین میں مزدوروں کی ڈموکریٹک جمہوریت ہے۔ جس کی تشکیل انصاف اور حریت کے اصول پر ہوئی ہے"
اس نئے آئین کے مطابق چرچ اور سلطنت دو جدا چیزیں ہوگئیں۔ مذہبی امور میں طرح طرح کی رکاوٹیں ڈالی جانے لگیں۔ لوگوں کی بڑی بڑی جائدادیں عام طور پر سماجی فائدے کے لئے ضبط کرلی گئیں۔ اس نئے آئین کے رو سے جاگیرداری کا قاعدہ قطعی اٹھا دیا گیا اور اس کے ساتھ ہی کسان سدھار سے متعلق خاص خاص چند ایسے قانون منضبط کئے گئے جن کا اگر نفاذ کیا جاتا تو پوری سلطنت کسانوں کے اندر تقسیم ہوجاتی۔

قریب قریب تمام کارخانہ داروں نے جمہوریت کو منظور کرلیا۔ اور اسی کے ماتحت اپنا اپنا کام بھی شروع کردیا۔ لیکن ملک میں ابھی دو ایسی طاقتیں باقی رہ گئی تھیں جو حریت پسند جمہوری حکومت کے سامنے سر اطاعت خم کرنے کے لئے کسی حالت میں تیار نہ تھیں۔ اور ہمیشہ اس نئی حکومت کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتی تھیں۔ یہ دونوں طاقتیں چرچ اور بڑے زمینداروں کی تھیں۔ کچھ عرصہ تک تو یہ شہنشاہیت پسند جماعت بالکل خاموش رہی کیونکہ رائے عامہ ان کے خلاف تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ ان لوگوں نے بھی اپنا پروپگنڈا شروع کردیا۔ اور قہوہ خانوں اور ہوٹلوں میں بیٹھ بیٹھ کر جمہوریت کے خلاف زہر اگلنے لگے۔ عام طور پر لوگوں کے جذبات کتھولک مذہب کے خلاف بہت زیادہ برانگیختہ تھے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات عوام مسلح ہوکر چرچ کو برباد کرنے تک کے لئے نکل کھڑے ہوتے۔ اس نئی جمہوری حکومت نے اس لغو طریقہ کے خلاف روک تھام شروع کیا اور حتی الامکان اس طرح کے بلوائیوں پر قدرت حاصل کرنے کی کوشش کی۔

دوسری مرتبہ جو جمہوری حکومت قائم کی گئی خدا جانے اس کی بنیاد کس ساعت میں رکھی گئی تھی

کہ اسے کبھی چین نصیب نہیں ہوا۔ اس حکومت نے جو ذرا سختی اختیار کی تو متوسط الحال طبقہ بہت زیادہ خائف اور بدگمان ہوگیا۔ اور اس کی وجہ ان لوگوں کے دماغ میں جاگیرداری کی بو تھی۔ ان لوگوں کی عام چیخ و پکار کی وجہ سے ہر شخص اس جمہوری حکومت سے بدظن ہوگیا۔ لیکن اس صدائے احتجاج بلند کرنے میں سب سے آگے آگے چرچ اور متوسط الحال طبقہ تھا۔ اسی ہڑبونگ کے زمانہ میں میکائیل ازانا عوام میں بہت زیادہ مقبول ہوا۔ اس سے پہلے یہ ایک مصنف اور مترجم کی حیثیت سے تو کچھ ضرور مشہور تھا لیکن ایک سیاست داں کی حیثیت سے اسے کوئی نہیں جانتا تھا۔ لیکن کون جانتا تھا کہ جارج بورو کی کتاب ' (Bible in Spain) ' کا یہ پست قد کامیاب مترجم قدرت کی جانب سے اتنا بہتر سیاسی دل و دماغ بھی لے کر آیا ہے کہ سیاست کے میدان میں اپنے اکثر حریفوں سے سبقت لے جائے گا۔ یہ شخص دل سے "ڈموکریٹک جمہوریت" کا خواہاں تھا اور اشتراکیت اور سوشلزم دونوں کو ناپسند کرتا تھا۔

سب سے پہلی بغاوت ڈموکریٹک جمہوریت کے خلاف ستمبر ۱۹۳۲ء میں ظاہر ہوئی جس میں فوج کا ایک بڑا دستہ پرانے نواب خاندان اور سرمایہ داروں کی قیادت میں میدان کارزار میں اترآیا لیکن یہ بغاوت فوراً ہی دبا دی گئی۔ اسی زمانہ میں چرچ نے جل روبل (Gil Robiles) کی اہمیت کو محسوس کیا۔ اس نے خیال کیا کہ اگر اس کو اپنے ساتھ کر لیا جائے تو یہ بہت زبردست معاون اور مددگار ثابت ہوگا۔ چنانچہ چرچ نے ملا جلا کر جل روبل کو اپنی پارٹی میں شامل کر لیا۔ جل روبل فاشسٹ پروگرام کے ساتھ میدان سیاست میں اترا۔ شہنشاہیت کے خلاف عام لوگوں کے جذبات اس قدر برانگیختہ تھے کہ اپنے پروگرام میں اس کا دوبارہ احیاء داخل کرنے کی ہمت جل روبل کو نہیں ہوئی۔

۱۹۳۳ء میں ایک عام الکشن ہونے کی تجویز ہوئی۔ اس موقع پر سرمایہ دار، شہنشاہیت پسند، زمیندار، چرچ اور متوسط الحال طبقہ، جو اس ڈموکریٹک جمہوریت کی تہ میں بالشوزم قائم ہو جانے سے خائف تھے، سبھوں نے مل کر عہد کیا کہ اس الکشن میں کسی ایسے شخص کو کامیاب ہونے نہ دیا جائے جس کے

دماغ میں جمہوریت کا ذرا بھی سودا ہو۔ نتیجہ اس کا ظاہر ہے یعنی پھر وہی پہلی جماعت برسر اقتدار آئی۔ اور اس طرح بغاوت کے خلاف بغاوت پھوٹ پڑی۔

۱۹۳۴ء میں کاشتکاروں اور مزدوروں کی ایک کثیر جماعت نے اپنی غلطی کا احساس کیا وہ چونکے کہ اس پرانی جماعت کو برسر اقتدار لا کر ان لوگوں نے اپنے پاؤں میں آپ کلہاڑی ماری۔ ان لوگوں کی مزدوری ہر جگہ چالیس سے ساٹھ فی صدی تک کم ہو گئی تھی۔ عام مزدوروں اور کاشتکاروں کی پشیمانی نے ایک عام بغاوت کی صورت اختیار کر لی۔ یہ بغاوت تمام بغاوتوں سے زیادہ ہولناک تھی اس میں بغاوت کرنے والے نہ صرف اپنی آزادی کے لئے قربانی کرنے پر تیار تھے بلکہ اپنی پچھلی غلطی کی اس طرح مکافات بھی کرنا چاہتے تھے۔ اکتوبر کے مہینہ میں استوریا میں معدنیات کے اندر کام کرنے والے مزدوروں نے بہت زبردست بغاوت کی۔ برسر اقتدار حکومت کے ہاتھ میں فوج کافی تھی۔ اس نے اس سے کام لینا شروع کیا اور بات کی بات میں ان غریبوں کو جو صحیح معنوں میں اس نئی حکومت کو برسر اقتدار لانے کے باعث تھے اور سوائے اپنی جائز مزدوری اور انصاف کے کسی اور چیز کے خواہاں بھی نہ تھے ظلم وجور کی چکی میں پیس ڈالا۔ ان حق پسند مظلوموں کو کچلنے کے لئے میڈرڈ کے گورنر نے مراکو سے ایک دستہ حبشی فوج کا روانہ کیا اور اس کے علاوہ کچھ اور فوجیں غیر ممالک سے بھی امداد کے لئے منگوائی گئی تھیں۔ اتنی زبردست فوج کے سامنے باغیوں کی غیر منظم فوج کا قائم رہ جانا مشکل تھا۔ بغاوت فرو ہوئی۔ لیکن کب، جب حق کی قربان گاہ پر ملک کے پانچ ہزار غریب مزدور اور حریت پسند اشخاص بھینٹ چڑھ گئے۔ حکومت کی یہ بہیمانہ سفاکی، اور اخلاق سوز رویہ ہی غریب مظلوموں کے دل کو چھلنی کر دینے کے لئے کیا کم تھا کہ حکومت کی امداد کے لئے غیر ممالک سے موزا افواج کی آمد نے ان کے جذبہ خودداری پر اور بھی ضرب کاری لگائی۔ حکومت کی سفاکی اور اپنے جذبہ خودداری کی اس طرح توہین ہوتے دیکھ کر وہ تلملا گئے۔ اور برسر اقتدار حکومت کے خلاف ایک ہولناک جنگ کے لئے بالکل تیار ہو گئے۔

اور اس طرح اسپین میں ایک نئی جماعت پوپلر فرنٹ (Popular Front) کی بنیاد پڑی جس کی اصل پیدائش اُس وقت سے شمار کرنی چاہیے جب کہ اسٹوریا میں (۱۹۳۴ء) معدنیات کے مزدوروں کی بغاوت نمودار ہوئی تھی۔

(۵)

ہسپانیہ کے مظلوم کاشتکار

عام طور پر لوگوں کو تعجب ہوگا کہ آخر اسپین میں آج کل مسلسل بے چینی اور بدامنی کی وجہ کیا ہے۔ وہ کون سے ایسے غیر معمولی اسباب ہیں جو وہاں امن وامان قائم نہیں ہونے دیتے؟ ہماری رائے میں اس کی وجہ جاگیر داروں اور رومن کیتھولک چرچ کی ہوسناکیوں اور ریشہ دوانیوں کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوسکتی۔ سنہ ۱۹۳۱ء میں جب شہنشاہیت کا خاتمہ نہیں ہوا تھا ہزار میں دس کاشتکار ایسے تھے جن کو زمیندار کی طرف سے زمین کے چند چھوٹے چھوٹے ٹکروں سے زیادہ جوتنے کی قطعی اجازت نہیں تھی۔ سنہ ۱۹۳۴ء کے آخر میں رائٹ گورنمنٹ (.Right Govt) نے کاشتکاروں سے وہ سب بھی چھین لیا۔ اور انہیں نان و قوت کو محتاج ایڑیاں رگڑ رگڑ کر دم توڑنے کے لئے چھوڑ دیا۔ اکتوبر سنہ ۱۹۳۴ء میں مزدوروں، کاشتکاروں اور معدنیات میں کام کرنے والوں کی بغاوت دراصل حکومت کے اسی مذموم رویہ کا ردعمل تھی۔

تمام مزدوروں میں سب سے اہم جماعت ان مزدوروں کی ہے جو زراعت سے متعلق ہیں۔ اور جن کی تعداد کام کرنے والوں کے اندر اس وقت اسپین میں قریب ساٹھ فی صدی کے ہے۔ جغرافیائی حالت کو جاننے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ وہاں کثرت سے ایسی زمینیں ہیں جو بارش کے پانی کے علاوہ اپنی سیرابی کے لئے اور مزید انتظام کی محتاج ہیں۔ مورز عام لوگوں کی بہبودی کے کاموں میں بہت سرگرم اور فیاض تھے۔ اپنے ہزار سالہ دور حکومت میں انھوں نے مفاد عامہ کے لئے جو جو کام کر دیا ہے اس کا جواب آج تک کسی سلطنت اور حکومت سے نہیں ہوسکا۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ ہسپانیہ جب تک ان کے زیر نگیں رہا۔ وہاں آبپاشی کا اتنا معقول انتظام رہا کہ پیدا وار کے لحاظ سے اسپین اپنے تمام ہمسایہ ملکوں

میں رشک کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہا۔ جب موروں پر زوال آیا اور ان کی جگہ دوسری قوم برسر اقتدار آئی تو ان میں وہ سرگرمی اور جوش نہ تھا۔ ان میں بعض کوتاہ بیں اور کاہل تھے تو بعض بے پرواہ اور نالائق۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ ملک کی ساری شادابی غائب ہوگئی۔ یہ نئے حکمراں ملک کے انتظام سے زیادہ غریب مزدوروں اور کاشتکاروں کو لوٹنے کی فکر میں رہتے تھے۔ ان کی بے اعتنائی اور بدنظمی کے باعث ملک ہمیشہ غرقی اور خشکی کی مصیبت میں مبتلا رہنے لگا۔ مسٹر کارلس پریٹو ایک ہسپانوی مصنف کا بیان ہے کہ وہ ایک مرتبہ اندلس کے گاؤں میں عام کاشتکاروں کی حالت کا معائنہ کرنے کے لئے پھرا تو ہر شخص کو پریشان حال اور فاقہ مست پایا۔ ان لوگوں سے جب کاشتکاری کے متعلق کچھ سوال کیا جاتا تو وہ اشک آلود آنکھوں اور کپکپاتے لبوں سے ''مصیبت'' کہہ کر خاموش ہوجاتے۔

اسپین کے کاشتکار زراعتی ترقی اور اصلاح سے بالکل ناواقف ہیں۔ وہاں نہ آبپاشی کا کوئی معقول نظم ہے اور نہ ان کا بڑھا ہوا افلاس ان کو کسی قسم کے سائنٹفک ایجادات سے مستفید ہونے کا موقع دیتا ہے۔ لوگوں کو آئرلینڈ کے کاشتکاروں کی وہ مصیبت یاد ہوگی جس سے تنگ آکر انہوں نے تمام زمینداروں کو گولی کا نشانہ بنادینے کا مصمم ارادہ کرلیا تھا۔ اس زمانہ میں ٹھیک یہی حالت اسپین کے کاشتکاروں کی بھی ہے۔

اسپین میں اراضی کی تقسیم بہت ہی غیر منصفانہ طور پر ہے۔ تقریباً ۹۵ فی صدی زراعت کا کاروبار ۵ ملین ہکٹر[۵۱] پر مشتمل ہے ۳۵ فی صدی ۹ ملین ہکٹر پر مشتمل ہے۔ اور تقریباً تین ملین ہکٹر ایک ہزار پانچ سو کاشتکاروں کے درمیان منقسم ہے۔ جنوبی اسپین میں ۹۰ فی صدی ہر صوبہ کا بڑی بڑی زمینداریوں پر مشتمل ہے[۵۲]۔ لیکن دراصل وہاں کے کاشتکاروں کے لئے سب سے بڑی مصیبت کاسک زمینداروں کے

---

۵۱ یہ لفظ اسپین میں بولا جاتا ہے۔ نصف ملین کھیت کو ایک ہکٹر [Hectares] یا اس سے کچھ کم اراضی کہتے ہیں۔

۵۲ دیکھو [Spain to Day (1936) By Edward Conze.]

کارندے (جن کو ہم عملہ بھی کہتے ہیں) کا ناپاک وجود ہے ۔ یہ بڑے ظالم ہوتے ہیں اور ان کے لامتناہی اختیارات غریب کاشتکاروں پر اور بھی قیامت ڈھاتے ہیں ۔ یہ اپنی معمولی جنبش نظر سے سب کچھ کر سکتے ہیں ۔ یہ جب چاہیں الکشن کے موقع پر اپنے نالائق امیدواروں کے لئے غریب کاشتکاروں کے ضمیر کے خلاف ان سے ووٹ حاصل کر لیں، ان سے ناجائز ٹیکس اور زبردستی جرمانہ وصول کر لیں ۔ ان کے خلاف کوئی داد فریاد نہیں ۔ اس طرح غریب کاشتکاروں پر دنیا تنگ ہے ۔ اس سلسلہ میں اسپین کی سیاسی حالت کا بھی جائزہ لیتے چلیں ۔

———— ○ ————

(۶)

"سنہ ۱۹۳۶ء میں ہسپانوی سیاست"

۷ جنوری سنہ ۱۹۳۶ء کو کورٹس (Cortes) کے توڑ دینے کا اعلان کر دیا گیا۔ اور اس کے بعد ہی ۱۶ فروری کو ایک عام الکشن ہوا اس نئی منتخب شدہ پارلیمنٹ کا اعلان ۱۶ مارچ کو کیا گیا۔ کورٹس کے خاتمہ کے دوسرے ہی دن اڈیٹروں کی سہولت کے لئے سنسرشپ (Censorship) کی تمام پابندیاں اٹھا کر انہیں ہر طرح کی آزادی دے دی گئی وہ جو چاہیں لکھیں اور جس طرح چاہیں اپنے خیالات کا اظہار کریں پارلیمنٹ کے اس رویہ نے سچ پوچھئے تو مدیران اخبار کو ایک دوسری مصیبت میں ڈالدیا۔ پہلے وہ اپنے خیالات کا اظہار کر سکتے تھے لیکن اجازت نہ تھی اور اب انہیں اجازت تھی لیکن اظہار نہیں کر سکتے تھے۔

کاش کہ اسپین میں پریس کو پہلے سے یہ آزادی ہوتی تو پھر غالباً اسپین اپنے موجودہ عبرت ناک حالت میں نہ ہوتا۔ پریس کی آزادی سے ممکن ہے حکومت کو کچھ نقصانات بھی ہوتے ہوں لیکن ساتھ ہی اس سے ملک کی تمام خرابیاں بھی دور ہوتی رہتی ہیں اور ان کی بے لاگ اور کڑوی تنقید سے حکومت کو ملک کی اصلاح کرنے کا اچھا موقع ملتا ہے۔

سنہ ۱۹۳۳ء میں اسپین کے رائے دھندگان کی تعداد تیرہ ملین سے زیادہ تھی جن میں نصف سے کچھ زیادہ عورتیں تھیں۔ سنہ ۱۹۳۳ء میں بہت سی عورتوں نے ووٹ دیا اندازکیا جاتا ہے کہ ان میں سے بہتوں نے سنہ ۱۹۳۶ء میں حق معافی سے فائدہ اٹھایا۔

اس وقت ۴۷۳ جگہ کے لئے ۱۹۸۷ امیدوار تھے۔ ان کے مخصوص گروپ درج ذیل ہیں:۔

(۱) سی۔ای۔ڈی۔اے	(C. E. D. A.)	۱۹۰
(۲) فاشسٹ	(Fascists)	۴۰

(۳) شہنشاہیت پسند	(Monarchists)	۸۵
(۴) درمیانی	(Centre)	۱۰۵
(۵) سوشلسٹ	(Socialists)	۱۲۰
(۶) ریڈیکل	(Radicals)	۷۰
(۷) اشتراکیت پسند	(Communists)	۲۰

ہر صوبہ میں ۵۰۰۰۰ باشندوں پر ایک ڈپٹی کا ہونا قرار پایا۔ اور ہر شہر جس کی آبادی ۱۴۰۰۰۰ ہو اس کو انتخاب کا بالکل علیحدہ حق دیا گیا لیکن ساتھ ہی ۲۳ برس سے کم عمر رکھنے والوں کو رائے دھندگی کا حق نہیں دیا گیا۔ ۱۶ فروری کو ایک عام الکشن ہوا جس کا نتیجہ درج ذیل ہے:-

لفٹ (Left):-

(۱) سوشلسٹ	(Socialists)	۸۵
(۲) جمہوریت پسند یونین	(Republican Union)	۳۲
(۳) جمہوریت پسند لفٹ	(Republican Left)	۷۵
(۴) کیٹلان اسکوائرا	(Catalan Esquerra)	۲۰
(۵) اشتراکیت پسند	(Communists)	۱۴
(۶) متفرق پارٹی	(Various)	۳۰
	میزان کل	۲۵۶

سنٹر (Centre):-

(۱) پورٹلسٹا	(Portelistas)	۱۹
(۲) کیٹلان لیگا	(Catalan Lliga)	۱۱
(۳) ریڈیکل	(Radicals)	۸

(۴) ترقی پسند	(Progressists)	۶
(۵) متفرق پارٹی	(Various)	۱۱
		میزان کل ۵۵
رائٹ	(Right)	
(۱) سی-ای-ڈی-اے	(C. E. D. A.)	۹۴
(۲) زراعت پیشہ	(Agrarians)	۱۲
(۳) شہنشاہیت پسند	(Monarchists)	۱۲
(۴) آزاد جماعت	(Independent)	۱۱
(۵) روایت پسند	(Traditionalists)	۱۱
(۶) متفرق جماعت	(Various)	۳
		میزان کل ۱۴۳

انفرادی طور پر نئے ہاؤس کی سب سے مضبوط جماعت سی-ای-ڈی-اے پارٹی ہوئی جس کا لیڈر جل روبل اپنے ۹۴ ڈپٹیوں کے ساتھ بڑی اہمیت کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔اس کے بعد سوشلسٹ کا درجہ تھا جن کی تعداد ۵۸ تھی۔اشتراکیت پسند ۱۴ اور شہنشاہیت پسند صرف ۲۳ تھے۔

ریڈیکل پارٹی کے تجربہ کار لیڈر سنر لیروکس (Senor Lerroux) کو شکست ہوئی، جل روبل گرچہ میڈرڈ میں کامیاب نہ ہو سکا لیکن سلامنکا میں منتخب ہو گیا۔سنر ازانا میڈرڈ میں سب سے اوپر تھا۔ کیٹلانیا میں لفٹ پارٹی نے زبردست فتح حاصل کی تھی۔اس نے آگے چل کر گاڈس، سیوائل، مالگا، اسٹوریا، اراگون، سراگوسا، ویلنشیا اور مورسیا وغیرہ میں بھی فتح حاصل کر لی۔

۱۹ فروری کو وزیراعظم سنر پورٹلا نے استعفیٰ داخل کیا۔اس کی جگہ پر سنر ازانا وزیراعظم منتخب ہوا۔ فوراً منسٹری بنائی گئی اور اسی روز سنر ازانا کی نئی حکومت کا اعلان کر دیا گیا۔

نئی وزارت کا انتخاب اس طرح کیا گیا تھا:۔

(۱) وزیر اعظم	...........سنزا زانا	(Republican Left)
(۲) وزیر عدل	........۔۔انٹونی لارا	(Republican Union)
(۳) وزیر سلطنت	...........اگسٹو بارسیا	(Republican Left)
(۴) وزیر جنگ	...........جنرل ماسکولٹ	(Republican Left)
(۵) وزیر طاقت بحری	........جوزجبرالٹ	(Republican Left)
(۶) وزیر داخلہ	...........اماس سلوڈر	(Republican Left)
(۷) وزیر مالیات	...........گبریل فرانکو	(Republican Left)
(۸) وزیر ہدایات	...........مارسلن ڈومنگ	(Republican Left)
(۹) وزیر مفاد عامہ	...........سنٹیاگ قیصر قیراگ	(Republican Left)
(۱۰) وزیر مزدور پیشہ	...........انرق راموس	(Republican Left)
(۱۱) وزیر صنعت و تجارت	...........الوریز بیلا	(Republican Left)
(۱۲) وزیر زراعت	...........میرین رزفن	(Republican Left)
(۱۳) وزیر مراسلات	...........مینل بلیک گرزن	(Republican Union)

وزرا کی یہ تفصیل خصوصیت کے ساتھ ہم نے اس لئے کر دی ہے کہ اس سے ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ ان میں کوئی بھی انتہا پسند جماعت سے تعلق نہیں رکھتا تھا۔ ان لوگوں کے نام کے مشتہر ہوتے ہی عوام میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ لوگوں کا عام خیال تھا کہ اسپین کو بہت عرصہ کے بعد اس مرتبہ ایسی معقول وزارت نصیب ہوئی ہے۔ اس وزارت کا سب سے پہلا کام ۳۰۰۰۰ سیاسی قیدیوں کی رہائی کا اعلان تھا جس پر فوراً ہی عمل کیا گیا۔

اس وزارت کی سب سے پہلی مجلس ۲۰ فروری کو منعقد ہوئی۔ اس موقع پر وزیر اعظم سنیر ازا لاسلکی کے ذریعہ ملک میں اپنی افتتاحیہ تقریر کی تشہیر کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ تمام پروگرام جو انتخاب سے قوم کے سامنے پیش کیا گیا تھا اس پر عمل کرنا اس نئی وزارت کا فرض ہے۔ اس وزارت نے کسی جماعت سے مخالفانہ رویہ نہیں اختیار کیا۔ اس کا اصل مقصد جمہوریت کی مدافعت، اس کا دوبارہ احیا اور ملک میں عام خوشحالی اور امن عامہ کا قائم کرنا تھا۔

اسپین کے کسی حصہ میں انتخابی کامیابی اتنی صاف نہیں ظاہر ہوئی جیسی کہ کیٹلانیا میں ہوئی۔ اس لحاظ سے کیٹلانیا سب سے اوّل رہا۔ انتخاب کے فوراً ہی بعد وزیر اعظم نے اپنا خاص آدمی قید خانہ بھیجا جہا سے کیٹلانیا کے سابق صدر سنر کمپنی کو بہت ہی عزت و تکریم کے ساتھ چھڑا کر لانے کا حکم دیا گیا تھا۔

یکم مارچ کو ایک الحاقی الکشن ہوا جس کے بعد کورٹس کی تکمیل اس طرح ہوئی:۔

لفٹ پارٹی کے	۲۶۶	نمائندے
رائٹ پارٹی کے	۱۴۲	نمائندے
سنٹر پارٹی کے	۶۵	نمائندے
میزان کل	۴۷۳	

۱۵ اپریل کو کورٹس میں تقریر کرتے ہوئے وزیر اعظم نے ملک کی حالت پر بہت عمدہ تبصرہ کیا تو اس سلسلہ میں ان مسئلوں پر بھی روشنی ڈالی گئی تھی جو ملک کو عنقریب پیش ہونے والا ہے۔ اس نے صیغہ مالیات پر روشنی ڈالتے ہوئے صاف لفظوں میں بتایا کہ حکومت کی مالی حالت حد درجہ خراب ہے اور یہ کہا کہ بے روزگاری کا مسئلہ ملک کے لئے عنقریب بہت زیادہ تکلیف دہ ہونے والا ہے۔ اس نے مجلس بین الاقوام کے ساتھ شریک ہوجانے کی رائے دی اور ملک میں اندرونی بدامنی کے تدارک پر زور دیا۔ شہنشاہیت پسند جماعت کے چالاک لیڈر کالوسوطلو نے ملک کی ان تمام بدامنیوں اور بےچینیوں

ایک طویل فہرست شائع کی جو اس نئی وزارت کے بعد وقوع پذیر ہوئی تھیں یہ صورت اس نے صرف اس وزارت کو بدنام کرنے کی نکالی تھی۔

چند ہی دنوں بعد ملک میں امن و امان قائم کرنے کے لئے ایک مسلح فوج کی ضرورت لاحق ہوئی اسپین کے ہر حصہ میں پولس نے فاشسٹ جماعت پر چھاپہ مارنا اور گرفتار کرنا شروع کر دیا۔ اسی زمانہ میں ایک بل پاس کیا گیا جس میں ان تمام فوجی سرداروں کو جنہوں نے (۱۹۳۱ء) اپنی چند رعایات کے ضبط ہو جانے کی وجہ سے استعفیٰ داخل کر دیا تھا متنبہ کرتے ہوئے بتلایا گیا تھا کہ اگر ان کا کوئی فرد بھی حکومت کے خلاف کسی جماعت کے ساتھ مل کر سازش کرنے میں پکڑا گیا تو اس کی سزا بہت ہی عبرت ناک ہوگی۔ ساتھ ہی اراضی کی اصلاح سے متعلق ایک ایکٹ بھی پاس کیا گیا تھا۔

ازانا گورنمنٹ کے قائم ہونے کے بعد سنرا لکالا زمورا نے اپنے کو چند در چند دقتوں میں محصور پایا۔ یہ شخص رائٹ اور لفٹ دو میں سے کسی پارٹی کے ساتھ نہ تھا۔ اس نے اپنے اقتدار کے زمانہ میں برابر سنٹر پارٹی کو مضبوط بنانے کی کوشش کی تھی اسی لئے اب وہ بہت زیادہ نا امید ہو گیا تھا۔ اسی اثنا میں لفٹ پارٹی نے اس سے استعفیٰ داخل کرنے کا مطالبہ کیا۔ کیونکہ اس نے بہت ہی خود غرضی کے ساتھ سابق کورٹس کو معطل کیا تھا۔ ۷ راپریل کو سوشلسٹ اور کمیونسٹ پارٹی کا متحدہ رزولیشن پاس ہوا جس میں اس کے خلاف شدید ناپسندیدگی ظاہر کی گئی تھی۔

زمورا کے استعفیٰ داخل کرنے کے بعد اسی شام کو سنر مارٹن بیریو صدر منتخب کیا گیا۔ دوسرے روز صبح کو اس نئے صدر نے اپنے عہدہ کا چارج قومی محل (نیشنل پیلیس) میں لیا۔

اپنی صدارت کے زمانہ میں جیسی مشکلات زمورا کو ہوئی تھیں شاید ہی کسی صدر کو ہوئی ہوں ۱۹۳۱ء میں اس کے صدارت کے چارج لیتے ہی جمہوریت پسند جماعت کے اندر آپس ہی میں تفریق پیدا ہو گئی۔ چونکہ یہ بذاتہ کتھولک مذہب کا پیرو تھا اس لئے فطری طور پر اس نے آئین کے ان تمام دفعات سے

اختلاف ظاہر کیا تھا جس میں چرچ کی طاقت کو کمزور کرنے کا بیان تھا۔ اس نے جسوئٹس کے شہر بدر کرنے پر بھی اپنی ناراضگی کا اظہار کیا تھا۔ ۱۹۳۳ء میں ایک بل مذہبی امور کی ادائیگی کے خلاف پاس ہوا تھا جس کا نفاذ کچھ عرصہ کے لئے اس نے اپنی ذمہ داری پر روک لیا تھا۔ اور اسی وقت سے اس کی طبیعت وزیر اعظم سنیر ازانا سے بھی کھٹی ہو گئی تھی۔

صدر کا انتخاب کچھ ہنسی کھیل نہیں۔ اس میں بہت سی مشکلات ہیں سب سے پہلے تو ایسے آدمی کا جس کے سیاسی خیالات میں اعتدال ہو اور جو اپنی دانشمندی سے سیاسی توازن قائم رکھ سکتا ہو ملنا بھی بہت مشکل ہے۔

۲۶ اپریل کو پارلیمنٹ کے ممبروں کی ایک جماعت صدر کے انتخاب کے لئے مقرر ہوئی۔ جس نے ۱۰ مئی کو سنیر ازانا کو حکومت کا افسر اعلیٰ مقرر کیا۔ اس پورے دور کی سیاسی حالت میں سب سے اہم اور نمایاں چیز لفٹ ونگ پارٹی کے طاقت کی روز افزوں ترقی ہے۔ فاشسٹ جماعت کے ساتھ حکومت کی سرد مہری اور سختی گویا لفٹ پارٹی کے ساتھ کھلم کھلا ہمدردی کا اظہار تھا۔

ایک موقع پر کمیونسٹ پارٹی کے سکریٹری نے ازانا گورنمنٹ کے خلاف اعتراض کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہ دراصل لفٹ جمہوریت کی حکومت ہے جو مزدور اور کاشتکاروں کے ساتھ کوئی ہمدردی اور دلچسپی نہیں رکھتی حالانکہ یہ جماعت ملک کی بڑی آبادی پر مشتمل ہے۔ اس نے اپنے پیروؤں کو صاف لفظوں میں ہدایت کی تھی کہ وہ حکومت کا صرف اس وقت تک ساتھ دیں جب تک کہ حکومت عہد و پیمان پر قائم رہے۔

اپریل کے دوسرے ہفتہ میں کمیونسٹ جماعت کے کچھ لوگ روس سے اسپین واپس ہوئے۔ میڈرڈ کے ٹاؤن ہال میں ان لوگوں کا سرکاری طور پر بہت پُرجوش خیر مقدم کیا گیا تھا۔ عورتوں اور مزدوروں کی بہت بڑی جماعت ان لوگوں کے استقبال کے لئے اسٹیشن پر موجود تھی بلکہ اس میں سب سے زیادہ سرگرم وہ عورتیں ہی نظر آ رہی تھیں جو اپنے کتھولک مذہبی عقائد میں بہت زیادہ مشہور ہوتی ہیں۔ اس نیلی قمیص پہننے والی کمیونسٹ پارٹی نے اس خیر مقدم کے موقع پر اتنی اچھی تنظیم کا مظاہرہ کیا کہ رائٹ پارٹی والوں کے

پیٹ میں چوہے کودنے لگے ۔

لفٹ پارٹی کی طاقت کا سب سے ہنگامہ خیز مظاہرہ صوبہ باجازیں ہوا جہاں ۶۰۰۰۰ زراعت سے متعلق مزدوروں نے کیونسٹ ڈپٹی کے ماتحت پورے صوبہ پر قبضہ جما لیا ۔ ان لوگوں نے بڑی بڑی زمینداریوں کو تجزیے تباہ کر کے تمام جائداد کو آپس میں تقسیم کر لیا ۔

یہ تحریک قریب قریب اسپین کے ہر حصہ میں جاری تھی ۔ اس نے آخر میں گورنمنٹ کے بھی کان کھڑے کئے اور وہ بہت جلد ۱۹۳۵ء والے قانون زراعت کے تمام ان دفعات میں جو لفٹ پارٹی کے لئے ذرا بھی قابلِ اعتراض تھے ترمیم کر دینے کے لئے تیار ہو گئی ۔ کیٹلانیا میں لفٹ پارٹی کی طاقت کا بہت زبردست مظاہرہ ہوا ۔ کیٹلان کے صدر سنیر کمپنی کی جیل سے رہائی نے وہاں کے لوگوں میں کافی جوش پیدا کر دیا ۔ "لوکل خود انتظامی" کے نفاذ میں پے در پے کئی اعلانات شائع ہوئے ۔ سترہ مہینہ بند رہنے کے بعد ۲۶ مارچ کو لوکل کورٹس کا دوبارہ افتتاح ہوا ۔ اس کے بعد پارلیمنٹ نے ان تمام قوانین کو جو کیٹلانیا کے لئے ذرا بھی مضر تھے منسوخ کر دیا ۔ کیٹلانیا کی لوکل طاقت خطرناک حد تک بڑھ رہی تھی لیکن میڈرڈ کی مرکزی حکومت کو اس بڑھتے ہوئے سیلاب کے اندر قدم رکھنے کی ہمت ہی نہیں ہوتی تھی ۔ میڈرڈ اس وقت اپنے کو بالکل بے بس پا رہا تھا ۔

صدارت کی جگہ پر سنیر ازانا کا انتخاب گویا سیاسی میدان سے ایک ایسی بیدار مغز شخصیت کو ہٹا دینا تھا جو لفٹ ونگ کی بڑھتی ہوئی غیر معمولی طاقت پر ہر وقت قابو پا سکتا تھا ۔ انتہا پسند لفٹ پارٹی کے لیڈر سنیر لارگو کے راستہ میں اب کوئی چیز حائل نہ تھی ۔ وہ اب بغیر کسی اختلاف کے اپنا کام کر سکتا تھا ۔

اس حالت نے وہاں کے سرمایہ دار باشندوں کو بہت زیادہ گھبرا دیا ۔ ملک کے اکثر حصّوں میں اب یہ افواہ پھیلنی شروع ہو گئی تھی کہ اسپین میں سوویٹ گورنمنٹ قائم کرنے کے بہت لوگ حامی ہیں ۔ اور یہ واقعہ بھی تھا لیکن ساتھ ہی باشندوں کی انفرادیت کو دیکھتے ہوئے بعض تجربہ کار مدبر ایسے بھی تھے

جو مارکسین کمیونزم (Marxian Communism) کے خلاف زبردست طور پر صدائے احتجاج بلند کر رہے تھے۔ اس طرح اسپین میں آئین پسند جمہوریت اور منظم لفٹ پارٹی کے درمیان، جو ہر وقت ایک نئے طرز کی حکومت قائم کرنے کے لئے کوشاں تھے ایک زبردست کشمکش جاری ہوگئی۔ رائٹ پارٹی ان دونوں سے مختلف الخیال تھی لیکن اچھی طرح تیار نہ تھی۔

(۷)

"خانہ جنگی سے پہلے"

صدارت کی جگہ پر سنیر ازانا کے انتخاب نے نہ صرف اس کے طرفداروں بلکہ عام پبلک کی جانب سے بھی غلط فہمی پیدا کر دی کہ مبادا ملک کے آئین وضوابط کو کسی قسم کا نقصان پہنچے۔ عام طور پر لوگوں کو خوف تھا کہ یہ وزارت ایک آزاد خیال جمہوریت پسند جماعت کی طرح انتہا پسند رائٹ پارٹی اور با اقتدار لفٹ پارٹی کے درمیان سیاسی توازن قائم نہ رکھ سکے گی۔ لیکن ساتھ ہی ازانا کی جگہ کسی اور ایسے دوسرے آدمی کا ملنا جو ایسی مشکل گھڑی میں اپنی صلاحیت اور اقتدار سے کابینہ کو اپنے قابو میں رکھ سکے بھی مشکل تھا۔

دوسری کابینہ کا تقرر کچھ عرصہ کے لئے ملتوی کر کے وقتی طور پر وزیر خارجی سنیر بارسیا کو وزیر اعظم مقرر کیا گیا۔ اس کا جانشین قیصر قیروگا ہوا جس نے ۱۳ مئی کو ایک نئی ڈموکریٹک جمہوری وزارت کا اعلان کیا۔ ۱۹ مئی کو نئے وزیر اعظم نے کورٹس کو مطلع کیا کہ موجودہ کابینہ، جیسا کہ انتخاب سے پہلے اعلان کیا جا چکا ہے، پوپلرز فرنٹ (Popular's Front) کے پروگرام پر عمل درآمد کرے گی۔ اس کا سب سے پہلا کام یہ ہوگا کہ مفاد عامہ سے متعلق جو کچھ بھی اس نے وعدہ کیا ہے اس کو جلد از جلد پورا کرے اور خصوصیت کے ساتھ زراعتی اصلاح اور مسئلہ بے کاری کی طرف بہت زیادہ زور دے۔ اس نے حکومت کے تمام دشمنوں کو عبرتناک سزاؤں سے ڈراتے ہوئے بہت ہی صاف لفظوں میں بیان کیا کہ فاشسٹ پسندوں کو موجودہ کابینہ کے ہر قانون کے سامنے سر اطاعت خم کرنا ہوگا۔ اس کے جواب میں مخالف پارٹی کے لیڈر جل روبل نے لفٹ پارٹی سے حکومت کو متنبہ کرتے ہوئے کہا کہ اس جماعت پر گورنمنٹ کو اعتماد نہیں کرنا چاہئے۔ یہ صرف موقع اور محل کی منتظر ہے۔ جس وقت اسے موقع ملے گا یہ گورنمنٹ اور جمہوریت دونوں کا قلع قمع کرنے سے باز نہیں آئے گی۔

رائٹ پارٹی کے لئے یہ بہت نازک موقع تھا۔ اگر وہ خاموش رہتی ہے تو لفٹ پارٹی کی طاقت کا بڑھتا ہوا سیلاب اسے بہت جلد خس وخاشاک کی طرح بہا دیتا ہے۔ اور اس وقت کھلم کھلا بولنا بھی خطرہ سے خالی نہیں تھا۔ رائٹ پارٹی کے سرگرم حامی شہنشاہیت پسند، زراعت پیشہ اور روایت پسند تھے۔ ان کے علاوہ کیلا وسوٹلو کے پیرو اور فوجی ڈکٹیٹر شپ (آمریت) کے طرفدار بھی اپنی پوری طاقت سے اس کا ساتھ دیرہے تھے۔ فوج میں ان لوگوں کا بہت کافی پروپگنڈا تھا اور عام طور سے افسروں میں فاشسٹ اور شہنشاہیت پسندوں کی تعداد ۸۵ فی صدی سے کم نہیں سمجھی جاتی تھی۔ اگرچہ سیاسی حیثیت سے یہ لوگ بہت زیادہ مشتبہ نگاہ سے دیکھے جاتے تھے لیکن پھر بھی رائٹ پارٹی کے لیڈر اس پر یقین رکھتے تھے کہ اگر معقول پروپگنڈا کر دیا جائے تو فوج نازک گھڑی میں اپنے افسروں کا ساتھ نہ چھوڑے گی اور ان کے حکم پر چلے گی۔ سنہ ۱۹۳۶ء کے موسم بہار میں فاشسٹ پسندوں کی طرف سے بہت سے پمفلٹ شائع کئے گئے۔ فوج میں ان کی بہت اچھی طرح تشہیر ہوئی۔ خصوصیت کے ساتھ افسروں میں اس کی سب سے زیادہ اشاعت ہوئی۔ جیسا کہ ہم آگے دیکھیں گے اس پروپگنڈا کا نتیجہ بہت ہی ہولناک ثابت ہوا۔

مئی کے تیسرے ہفتہ میں افسروں کی ایک جماعت نے انکالا پہنچ کر ہر قسم کے حکم کے ماننے سے انکار کر دیا۔ ان لوگوں کو فوراً طلب کر کے کورٹ مارشل کیا گیا۔ اور جو اس تحریک کے لیڈر تھے ان کے ساتھ اور بھی سختی کا سلوک کیا گیا۔ جس بے رحمی اور بے جگری سے یہ فوجی بغاوت فرد کی گئی۔ اس نے عوام کو نئے وزیراعظم کے آئندہ رویہ سے اچھی طرح آگاہ کر دیا۔

رائٹ پارٹی کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ اس نے اب تک کسی ایک پروگرام پر عمل کرنیکا پورا تہیہ نہیں کیا تھا۔ اس کے برخلاف لفٹ پارٹی کے سامنے صرف ایک پروگرام تھا جس پر ان کی پارٹی کے تمام افراد اپنے تمام اختلاف وتفریق کو پس پشت ڈال کر متحدہ طور پر کام کرنے کے لئے تیار ہو گئے تھے۔

مزدور اور کاشتکار طبقہ اپنی جہالت کی وجہ سے اب تک سیاست سے بالکل بے خبر تھا۔ لیکن مصیبت اور ظلم سہتے سہتے آخر ش انہیں اتنی سمجھ ضرور ہو گئی کہ وہ اپنے دوست دشمن میں اچھی طرح تمیز کرسکیں۔ وہ لوگ اچھی طرح سمجھ گئے تھے کہ وہ زمیندار اور سرمایہ دار جو ان لوگوں کا خون چوس کر جیتے ہیں ان کے دوست کبھی بھی نہیں ہو سکتے۔ ان کی کمائی ہوئی دولت پر عیش کرنے والے ان کے دشمن ہیں اور دشمن ہی رہیں گے۔

اندلس، اکسٹرمدرا، کاشائل وغیرہ میں کاشتکاروں نے بغیر کسی ہنگامے اور خونریزی کے تمام اراضی پر قبضہ کرلیا۔ اس امید میں کہ زراعت پیشہ کی خوشحالی سے ان کی بھی خوشحالی ہوگی مزدوروں نے بھی ان کا پورا پورا ساتھ دیا۔ اس طرح مزدور اور کاشتکاروں کے اندر ایک خاص قسم کا اتحاد پیدا ہوگیا جس نے ان کو اور ان کی تحریک دونوں کو بہت زیادہ اہم بنا دیا۔ اسپین کی تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا جس میں اسپین کی اتنی بڑی آبادی ایک سیاسی پروگرام پر متفق ہو گئی تھی۔

لفٹ پارٹی مختلف سیاسی جماعتوں کا مجموعہ تھی۔ اس میں مزدور، انقلاب پسند، اشتراکیت پسند، اور سوشلسٹ سب ہی شامل تھے۔ مندرجہ ذیل شمار سے ہمیں لفٹ پارٹی کے ممبروں کی تعداد کے علاوہ یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ اس میں مختلف سیاسی جماعت کے کتنے کتنے افراد شامل ہیں:۔

انقلاب پسند	۱۵۰۰۰۰۰
اشتراکیت پسند	۱۰۲۰۰۰
سوشلسٹ	۶۰۰۰۰
مزدور پیشہ	۲۰۰۰۰۰۰
میزان کل	۳۶۶۲۰۰۰

۱۰ مئی کو سراگوسا میں انار کو سنڈکلسٹ کانگریس نے سوشلسٹ جنرل لیبر یونین کے ساتھ مل کر ایک سیاسی انقلاب کرنے کی تجویز پیش کی۔ اس تجویز میں موجودہ سماجی اور سیاسی طرز حکومت کو برباد کر دینا بھی

داخل تھا۔ گرچہ اس کو جنرل لیبیرونین نے فوراً ہی منظور نہیں کیا لیکن اسپین کے لفٹ پارٹی کے مخصوص لیڈر لارگو کیبلروسنے (Largo Caballero) اس تجویز کا بہت پُرزور خیر مقدم کیا۔ اس نے صاف الفاظ میں بیان کیا کہ اگر تمام لفٹ تحریک متحد ہو جائے تو پھر کوئی منظم طاقت حتیٰ کہ سلطنت بھی مل کر اس کے بڑھتے ہوئے سیلاب کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

لفٹ پارٹی میں سب سے بہتر مرتب اور منظم جماعت کیمونسٹ کی تھی۔ لفٹ پارٹی کے دماغ میں یہ بات سما گئی تھی کہ اس کے مفاد کے لئے ایک زبردست انقلاب کا ہونا ضروری ہے۔ عجب اتفاق کہ اس وقت ملک کے ہر حصہ میں انقلابی خیالات بہت زوروں پر جاری اور ساری تھے۔ شعرو شاعری، نغمہ وسرود، اور گانے بجانے غرض ہر چیز میں انقلاب کی بو آتی تھی۔ اسپین کے چھاپہ خانے عام پبلک کے مطالبات کے مطابق کثرت کے ساتھ (Proletarian) ادب شائع کرتے۔ عوام اسے ہاتھوں ہاتھ لیتے، پڑھتے اور پڑھ کر آپس میں تبادلہ خیالات کرتے۔ اس طرح آہستہ آہستہ عوام سیاست سے بہت اچھی طرح واقف ہو گئے۔

یہ زمانہ عوام کے لئے بڑی مصیبت کا زمانہ تھا۔ قریب قریب ملک کے ہر حصہ میں مزدوروں اور سرمایہ داروں کی کشمکش جاری تھی اس کا نتیجہ لازمی طور پر اسٹرائک ہوتا اور کبھی کبھی بے روزگاری بھی۔ اس ہڑتال سے ٹراموے اور ریلوے تک متاثر ہو جاتیں۔

۱۶ جون کو سنیر جل روبل نے رائٹ موشن کی مدافعت کرتے ہوئے حکومت سے امن و امان قائم کرنے کا پُرزور مطالبہ کیا۔ اس سلسلہ میں اس نے کورٹس کو بہت سی تازہ مالی اور جانی نقصانات سے آگاہ کرتے ہوئے ان کی ایک طویل فہرست بھی شائع کی تھی جس کے رو سے ۱۶۰ چرچ مسمار، ۲۵۱ چرچ ضرر رسیدہ، ۲۶۹ آدمی قتل اور ۱۲۸۷ زخمی ہوئے تھے۔ نقصان رسیدہ عمارتوں کی تعداد ۳۸۱، اسٹرائک کی تعداد ۱۱۳، اور جزوی اسٹرائک کی تعداد ۲۲۸ بتائی گئی تھی۔ ۴۳ اخبار کے دفتر بھی برباد کر دیئے

گئے تھے۔ اس طویل فہرست کو پیش کرنے کے بعد جل روبل نے بے خوف ہو کر کہا کہ یہ سب پوپلر فرنٹ کی فتح کے بعد کا واقعہ ہے۔ اس لئے یقینی طور پر موجودہ گورنمنٹ دیانت داری سے ہرگز حکومت نہیں کر رہی ہے۔

جون ہی کے مہینہ میں اس افواہ سے کہ فاشسٹ جماعت موجودہ گورنمنٹ کا تختہ الٹ دینے کی تدبیر میں مشغول ہے میڈرڈ میں زبردست سنسنی پھیل گئی تھی۔ اس اثنا میں اتفاق سے ایک فوجی افسر کی گرفتاری عمل میں آئی جس پر یہ الزام تھا کہ اس نے بھیس بدل کر سول گارڈ کے ممبروں میں شامل ہونے کی کوشش کی اور اس تہ میں گویا موجودہ طرز حکومت کے خلاف شہنشاہیت پسندوں کی بغاوت مضمر تھی۔ اس واقع سے تھوڑے ہی عرصہ بعد پولس نے اس بھیس بدلنے کے کام کی بہت سی وردیوں پر قبضہ کیا جو سراگوسا سے میڈرڈ اسی کام کے لئے بھیجی گئی تھیں۔

مئی اور جون کے مہینہ میں بہت سے وہ تعلیمی ادارے جو چرچ کے زیر نگرانی تھے مستقل طور پر بند کر دیئے گئے۔ اس رویہ کے خلاف بہت سے طالب العلم، ان کے والدین اور اُستادوں نے صدائے احتجاج بلند کیا۔ والدین آپس میں جو کچھ بھی سیاسی خیالات رکھتے ہوں لیکن قطعی تعلیم نہ دلانے سے اس بات کو سب ترجیح دیتے تھے کہ ان کے بچے مذہبی معلموں کے زیر نگرانی تعلیم حاصل کریں۔

جون کے مہینہ میں صوبہ گلیشیا کے مطالبہ کے بعد "اختیار خود انتظامی" دینے پر مباحثہ ہوا جس کا نتیجہ کٹالن اور اندلس کو "اختیار خود انتظامی" بخشنے کی مطابقت میں نکلا۔ ویلنشیا میں بھی اختیار خود انتظامی کی تحریک شروع ہو گئی تھی۔

اصلاحی پارٹی اور ڈموکریٹک جمہوری گورنمنٹ دونوں رائٹ پارٹی سے خطرہ محسوس کر رہی تھیں۔ اور ساتھ ہی یہ بھی سمجھ رہی تھیں کہ اگر ایسی نازک حالت میں ان کا کوئی مددگار ہو سکتا ہے تو وہ صرف لفٹ پارٹی ہے۔

پورا اسپین ایک عجب سراسیمگی کے عالم میں مبتلا تھا۔ اسٹرائک، شورش، اور بدامنی نے باشندوں کا ناطقہ بند کر رکھا تھا۔ شروع جولائی میں فاشسٹ جماعت کے اشتعال پر قریب قریب اسپین کے ہر حصّہ میں "غول بندی" کی جنگ شروع ہو گئی تھی۔

ہر شہر میں اسوشین اور انجمنیں قائم ہونے لگیں۔ ۱۲ جولائی کی شب کو شاک پولس کا ایک لفٹیننٹ جوز کسٹلو نامی ایک فاشسٹ کے ہاتھ سے قتل کیا گیا۔ اسی صبح کو کچھ آدمیوں کا ایک گروہ شاک پولس کی وردی پہن کر رائٹ پارٹی کے ممتاز لیڈر سنر کلاؤ سوٹلو کے مکان میں گھس گیا اور اسے بڑی سفاکی سے قتل کر دیا۔ اس رویہ نے رائٹ اور لفٹ پارٹی کی جنگ کو انتہائی درجہ پر پہنچا دیا۔ گورنمنٹ نے فوراً کورٹس بند کر کے کابینہ کی ایک غیر معمولی مجلس طلب کی جس میں رائٹ پارٹی کے مددگاروں اور طرفداروں کے خلاف بہت سی تجاویز پیش کی گئیں۔ اور اس کے بعد ان لوگوں کی سیکڑوں گرفتاریاں عمل میں آئیں۔

(۸)
"خانہ جنگی"

۱۷ جولائی کو یکایک اخباروں سے معلوم ہوا کہ اسپین سے باہر تمام ٹیلیفون اور مراسلات کے ذرائع کسی اہم سیاسی وجہ کی بنا پر منقطع ہو گئے ہیں۔ بعد کو اس کی وجہ یہ معلوم ہوئی کہ مراکو میں فاشسٹ جماعت کے اشتعال پر ایک منظم فوجی بغاوت شروع ہو گئی ہے۔ بارسلونا، سوائل، اور دوسرے کئی شہروں کی قلعہ کی فوجوں کو پہلے ہی باغیوں نے بہکا کر اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ مراکو، غرناطہ، الجزیرا (باغیوں کا ہیڈ کوارٹر) قرطبہ، مریڈا، ولادولڈ، برگس (باغیوں کا شمالی ہیڈ کوارٹر) پمپلونا، اودیدو، اور سراگوسا پر دیکھتے دیکھتے گورنمنٹ کے خلاف جماعتیں چھا گئیں۔ اسپین کے بقیہ شہروں پر گورنمنٹ اور اس کے معاونین کا قبضہ تھا۔

اسپین چونکہ ایک پہاڑی ملک ہے اس لئے اس کے بعض حصوں میں جنگ میں کافی دشواری تھی۔ بہر حال زمانہ کی سیاسی کشمکش بالآخر ایک بے ترتیب جنگ کی شکل میں نمودار ہوئی۔ اس جنگ کی رفتار کچھ بہت زیادہ تیز تو نہ تھی لیکن اس کے نتائج بہت ہی ہولناک اور مصیبت خیز نکل رہے تھے۔ لوگوں کا تخمینہ ہے کہ ۱۸ جولائی سے ۱۳ ستمبر تک کے قلیل عرصہ میں ۔۔۔۔۔ ۴ آدمی جنگ میں کام آئے۔

باغیوں نے باجاز پر قبضہ کرنے کے بعد گورنمنٹ کے ۱۵۰۰ مددگاروں کو نہایت بے رحمی سے قتل کر دیا۔ اسٹوریا کے کان کھودنے والوں نے جب اسلحجات کے بارہ میں اپنے کو بہت زیادہ مجبور پایا تو اپنی قابلیت سے ایک خاص قسم کی ڈائنا مائٹ چھڑی ایجاد کی جو اپنے استعمال کرنے والوں کے لئے انتہائی خطرناک ہونے کے باوجود بھی تربیت یافتہ فوج کے توپ، بندوق اور رائفل سے زیادہ کامیاب ثابت ہوئی۔

بغاوت کے شروع ہوتے ہی گورنمنٹ نے یہ سب سے بڑی چالاکی کی کہ فوراً عام باشندوں کو مسلح ہونے کا حکم دیدیا۔ گورنمنٹ کے اس دانشمندانہ رویہ سے نہ صرف اس کی فوجی طاقت بڑھ گئی بلکہ عوام کی

ہمدردی بھی اس کے ساتھ ہوگئی عام لوگ باغیوں کے سخت دشمن ہو گئے۔ میڈرڈ اور بارسلونا تنظیم، دولت اور خبر رسانی کی سہولتوں کے لحاظ سے پورے اسپین میں بہت زیادہ اہم سمجھے جاتے تھے۔ گورنمنٹ نے بہت جلد ان دونوں پر قبضہ کرکے اپنی طاقت میں اضافہ کیا۔

باغیوں کی افواج کے ممتاز لیڈروں میں جنرل فرانکو (جنوبی حصہ میں)، مولا (شمالی حصہ میں)، جنرل غونزال قیپو (سوائل کے علاقہ میں) خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ ہسپانوی افواج کا ۹/۱۰ حصہ باغیوں کی معاونت کر رہا تھا لیکن فوج کی بحری اور ہوائی طاقتیں گورنمنٹ کی وفادار رہیں۔

میڈرڈ کی ڈیموکریٹک جمہوری گورنمنٹ کے خلاف اس بغاوت کی تنظیم دراصل رائٹ پارٹی کی طرف سے ہوئی تھی جس میں شہنشاہیت پسند، فاشسٹ، زمیندار، چرچ اور سرمایہ دار سب ہی شامل تھے۔ حقیقت میں اسپین کی لبرلزم اور ابسلوٹزم (Absolutism) پارٹی کے درمیان پرانی کشمکش تھی جو بھیس بدل کر موجودہ لفٹ اور رائٹ پارٹی کی سیاسی جنگ کی شکل میں نمودار ہوئی۔ جس وقت بغاوت شروع ہوئی تھی میڈرڈ میں کمیونسٹ یا انتہا پسند سوشلسٹ جماعت کا ایک فرد بھی صاحب اقتدار نہ تھا۔ قیروگا کا کابینہ تمام اعتدال پسند جمہوریوں پر مشتمل تھا۔ جو اپنے خیالات میں بہت زیادہ آزاد اور عمل میں بہت زیادہ پس و پیش کرنے والے تھے۔

گورنمنٹ کے مددگاروں میں سب سے زیادہ مضبوط اور صاحب لیاقت صدر ازانا تھا۔ ٹریڈ یونین کا لیڈر لارگو کیبلرو جس کی مقبولیت اور طاقت نے عوام میں اس کی ممتاز شخصیت بنا دی تھی گرچہ کوئی عہدہ دار نہ تھا لیکن گورنمنٹ کا سچا معاون تھا۔ یہ ڈیموکریٹک لبرلزم سے ہٹ کر مارکسزم (Marxism) کی طرف مائل ہوگیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ لوگ اسے اسپین کا لینن کہتے ہیں۔

ایک ایسا کابینہ بنانے کے لئے جو اس نازک وقت میں اپنی صلاحیت سے عوام کو قابو میں لا سکے سنر ازانا نے جولائی اور اگست کے درمیان متواتر کوششیں کیں لیکن برابر ناکامیاب رہا۔

اسپین کی پبلک لارگو کبلرو کو چاہتی تھی لیکن چونکہ یہ انتہا پسند لفٹ پارٹی کا ایک ممبر تھا اس لئے ازانا اس کے ہاتھ میں ملک کے اعلیٰ اختیارات حوالہ کر دینے سے ڈرتا تھا۔ بہت ردوکد کے بعد آخر ملے وہی ہوا جو پبلک چاہتی تھی۔ ستمبر کے شروع میں ایک نئی کابینہ قائم ہوئی جس کا صدر کبلرو کو بنایا گیا۔

سنر یورب (Uribe) اور نرمانڈز (Nermandez) (دونوں کیمونسٹ) وزیر زراعت اور وزیر جنگ مقرر ہوئے۔ سنر پریٹو (Preto) ڈل ویو (Del Vayo) اور نگرن (Negrin) (سوشلسٹ) وزیر خارجہ۔ وزیر مالیات اور امیر البحر مقرر ہوئے۔ ڈی۔ جوز۔ جیرالٹ (De-Jose Giralt) بھی اس کابینہ میں شامل تھا۔ اس طرح گویا پوری کابینہ لفٹ پارٹی کی تھی جن کو پوپلر فرنٹ کا بھی نمائندہ کہا جا سکتا ہے۔ در پردہ بلوائی بھی ان ہی لوگوں کی معاونت کر رہے تھے۔

جنرل فرانکو نے جو بیانات پریس کے نامہ نگاروں کو دیئے ہیں۔ ان سے ہمیں اس باغی جنرل کے مقاصد اور مدعا کا اچھی طرح اندازہ ہوتا ہے۔ اس نے پریس کے نامہ نگاروں کو اپنے بیانات دیتے ہوئے ایک موقع پر کہا تھا:۔ (الف) اس کا مقصد امن عامہ کے قیام، جان و مال کی حفاظت، حکومت اور روایات کی بقا کے لئے ایک فوجی آمریت قائم کرنا ہے تاکہ قوم کی اقتصادی حالات کی درستگی کے ساتھ ساتھ اسپین کا پہلا وقار اور اس کی شان و شوکت پھر لوٹ آئے۔ (ب) مدبرین کو کسی حالت میں آمریت میں دخل در معقولات کی اجازت نہ دی جائے۔ (ج) ملک کا انتظام صرف تجربہ کاروں کے ہاتھ میں ہو۔ (د) حکام اعلیٰ فوجی جنرلوں کی حمایت میں رہیں گے (ہ) رائے شہادت کا حق بالکل اٹھا دیا جائے۔ (و) آخر میں جنرل فرانکو نے کہا کہ جو طرز حکومت وہ قائم کرنا چاہتا ہے اس کی بنیاد مادی طریقہ بر اٹلی اور جرمنی کے بالکل مطابقت میں ہوگی لیکن ساتھ ہی ہسپانوی روایات کی تمام خصوصیات کی محافظ بھی ہوگی۔

اسپین کی شعلہ زنی اب بہت نمایاں ہوگئی تھی اور اس کا ہر شعلہ تمام دول یورپ کو جلا کر خاکستر کر دینے کی دھمکی دینے لگا تھا۔ بڑی سے لے کر چھوٹی حکومتیں تک دل ہی دل میں اس کے انجام کار سے سہمی جا رہی تھیں۔

اب ہر شخص واقف ہو چکا تھا کہ ہسپانوی باغیوں کو باہر کی بہت زبردست امداد حاصل ہے۔ ساتھ ہی یہ چیز بھی اب بالکل عیاں ہو گئی تھی کہ باغیوں کی فتح کے بعد (جو صرف جرمن اور اطالیہ کے بل بوتہ پر ہو گی) یقینی ایک ایسی حکومت قائم ہو گی جس سے بحیرہ روم (Mediterranean) میں برطانیہ اور فرانس کو بہت سخت نقصان پہنچے گا۔

یکم اگست کو فرانسیسی حکومت نے یورپ کی کئی اہم حکومتوں سے اس بات کی اپیل کی کہ تمام حکومتیں اس بات پر ایک ساتھ رضامند ہو جائیں کہ اس جنگ میں کسی قسم کی مداخلت نہ کی جائے۔ فرانس کی اس اپیل پر سب سے پہلی کان دھرنے والی حکومت برطانیہ تھی جس نے فرانس کے اس مشورہ کی تائید کرتے ہوئے عدم مداخلت پر بہت زیادہ زور دیا تھا۔

۹ اگست کو یہ بات مشتہر ہو گئی کہ قریب قریب تمام ممالک یورپ نے عدم مداخلت کے معاہدہ پر دستخط کر دئے ہیں لیکن پرتگال، اطالیہ اور جرمنی اس پر دستخط کرنے میں ٹال مٹول کر رہی ہیں۔

اس درمیان میں مختلف ذرائع سے سامانِ جنگ باغیوں کے پاس بہت کثرت سے پہنچ رہے تھے۔ اس طرح اسپین میں مصیبت اور ہولناکیوں کے اضافہ کے ساتھ باہر کی قوموں کے اندر آپس میں غیر اعتمادی بھی پیدا ہو رہی تھی۔ ایک طرف بیرون اسپین سے باغیوں کو پوری مدد مل رہی تھی اور دوسری طرف عدم مداخلت کی پابندی نے میڈرڈ گورنمنٹ کو ڈموکریٹک اصول پر کاربند حکومتوں کی امداد و اعانت سے بھی محروم کر دیا گیا تھا۔

ان خطرناک حالات پر نظر کرتے ہوئے برطانیہ نے ۱۹۔اگست کو ہر طرح کے سامانِ جنگ کا چالان اسپین میں ممنوع قرار دیا۔ برطانیہ کے اس فیصلہ نے اطالیہ اور جرمنی کو بھی عدم مداخلت کی پابندیاں منظور کرنے پر مجبور کیا۔

پرتگال نے مہینہ کے آخر میں کچھ رکاوٹ کے ساتھ عدم مداخلت کی اسکیم کو منظور کیا۔ لیکن اس

وقت تک باہر کے اکثر اخباروں کے ذریعہ یہ بات مشتہر ہوگئی تھی کہ چونکہ باغیوں نے باہر کے معاونین کے ساتھ کچھ خفیہ معاہدہ کرلیا ہے اس لئے پرتگال باغیوں کی ہر طرح فوجی امداد کررہا ہے۔ آسٹریا، بلغاریا، بلجیم، ڈنمارک، ترکی اور البانیا نے بالاتفاق اسپین کے معاملہ میں بے سروکاری اور عدم مداخلت رضامندی ظاہر کی۔ اس طرح فاشسٹ اور غیر فاشسٹ حکومتوں کے درمیان کھلم کھلا صف آرائی ہوگئی

بغاوت کے رونما ہونے کے بعد گورنمنٹ کی مالی حالت کے متعلق کوئی صحیح خبر معلوم نہیں ہوسکی لیکن اتنا ضرور ظاہر ہے کہ میڈرڈ پر حکومت کے قابض ہونے کی وجہ سے حکومت پر بینک کے ذرائع مسدود نہیں تھے۔ ۔ ۔ ۔ ۲ ملین پزیٹا (Peseta) سونا اور ایک ہزار ملین پزیٹا (Peseta) چاندی جو بینک میں جمع تھا وہ حکومت کے قبضہ میں آیا اس طرح گویا انگلینڈ اور فرانس کو چھوڑ کر اس وقت ہسپانوی حکومت کے قبضہ میں تمام دول یورپ سے زیادہ سونے کا ذخیرہ موجود تھا۔ فرانس کے بینک کے ساتھ اسپین کے بینک کے بہت اچھے تعلقات تھے اس لئے اسپین کا بہت کافی سونا فرانس کے بینک میں جمع تھا۔ حسن اتفاق سے سیاسی حالت ہسپانوی حکومت کے موافق تھی۔ فرانس چونکہ اسپین کا ہمدرد تھا اس لئے ہسپانوی گورنمنٹ کو فوجی دقت کے علاوہ اور کسی قسم کی پریشانی اور گھبراہٹ نہ تھی۔ چونکہ "بینک آف اسپین" کے ۷۱ شاخوں میں ۴۳ شاخیں باغیوں کے قبضہ میں تھیں اس لئے اپنے مقبوضہ علاقہ میں ان لوگوں نے "بینک آف اسپین" قائم کرنے کی کوشش کی۔ باغیوں کو ان کے ہمدرد زمیندار اور سرمایہ داروں سے جن کے پیشِ نظر اب صرف "دو ورنہ دئے ہوئے سے بھی ہاتھ دھو" تھا بہت زیادہ مالی امداد پہنچ رہی تھی۔ گورنمنٹ حلقہ میں باغیوں کے ہمدرد بہت زیادہ تھے لیکن چونکہ گورنمنٹ نے عام پبلک کو مسلح کرکے اپنی مدد پر آمادہ کردیا تھا اس لئے اس حلقہ میں باغیوں کے ہمدردوں پر اوس پڑی ہوئی تھی۔ باغیوں کے علاقہ میں ۱۸۰۰۰ (جو بعد میں ۲۵۰۰۰ تک پہنچ گئی تھیں) مراکو کی فوج نے شائستہ لوگوں پر قیامت ڈھادی تھی۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ بہت سے وہ لوگ بھی جو جنرل فرانکو اور مولا کا ساتھ دینے کے لئے

تیار تھے اب برگشتہ خاطر ہو گئے تھے ۔

(۹)

"عدم مداخلت اور انجام کار"

ع۔ کوئی معشوق ہے اس پردہ زنگاری میں

سیاسی نقطہ نگاہ سے اس بغاوت کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ باغیوں کے ساتھ جرمنی، اطالیہ، اور پرتگال کی امداد تاریخ میں سب سے پہلی مرتبہ فاشسٹ جماعت کو ایک زبردست بین الاقوامی طاقت میں بدل رہی ہے۔ باغیوں کی بیرونی معاونت کا مسئلہ ہر شخص پر بالکل واضح ہو گیا ہے۔ اخبار کے نامہ نگاروں نے اپنی آنکھوں سے جرمنی کا بنا ہوا آہنی خود شمال میں باغی سپاہیوں کے سروں پر دیکھا۔ اطالیہ اور جرمنی کا بنا ہوا ہوائی جہاز، بیڑول، بمب، اور دیگر مختلف قسم کے سامانِ جنگ باغیوں کے استعمال میں ہر شخص دیکھ سکتا ہے۔ کچھ دنوں کے بعد پرتگال کی معاونت کی فیصلہ کن شہادت بھی بہم پہنچ گئی اور پھر ہر شخص کے دل میں یہ خطرہ پیدا ہو گیا کہ کہیں فاشسٹ پرتگالی جمہوریت باغیوں کی طرفداری میں کھلم کھلا جنگ کا اعلان نہ کر دے۔ خود اسپین میں یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی تھی کہ دس ماہ قبل جب جل روبل وزیر جنگ تھا اس نے جنرل فرانکو اور مولا کے ساتھ مل کر خانہ جنگی کی پوری اسکیم تیار کر لی تھی لیکن گورنمنٹ کی خوش قسمتی سے اس راز سے بہت سے وفادار افسران باخبر تھے۔ میڈرڈ کے مونٹانا بارک میں ایک دستاویز کے ملنے سے فاشسٹ سازش کا پورا کچا چٹھا کھل گیا۔ ساتھ ہی منادی عام کی ہزاروں کاپیاں ملیں جو فاشسٹ پسند جماعت نے میڈرڈ پر حملہ کرنے کے بعد تقسیم کرنے کے لئے رکھ چھوڑا تھا۔

تھوڑی دیر کے لئے اب ہمیں پرتگال کی طرف نظر ڈالنی چاہئے جس نے اس ناخوشگوار جنگ میں سب سے زیادہ شیطانی حصہ لیا تھا۔ جنرل گارمونا اور اس کے وزیر اعظم اولیورسلازار کے صاحب اقتدار

ہونے کے بعد پرتگال میں آمریت کا دور دورہ ہوا۔ سلازار ایک عیار آدمی تھا۔ اس نے پرتگالیوں کے دلوں پر قبضہ جمانے کے لئے مختلف قسم کی عیاریوں سے کام لیا۔ مثلاً پرتگال کے قومی بجٹ کو بہت حسن وخوبی سے پورا کر دینے کے بعد اس نے عوام کے دماغ میں اپنے متعلق یہ بات اچھی طرح جما دی کہ حکومت کی مالی مشکلات کو حل کرنے میں وہ ایک جادوگر کی سی قوت رکھتا ہے۔ متواتر کئی سال تک یہ برابر شعبہ مالیات کی رپورٹ شائع کر کے یہ دکھاتا رہا کہ حکومت کے پاس ملکی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے کافی پسماندہ ہے حالانکہ یہ سب صرف حساب وکتاب کا گورکھ دھندا تھا۔ اس رپورٹ نے بہت کافی لوگوں کو دھوکے میں رکھا لیکن لیگ آف نیشن (مجلس بین الاقوام) کے تجربہ کار ممبروں سے یہ بات کب تک پوشیدہ رہ سکتی تھی۔ ان لوگوں نے بہت جلد سلازار کے بیانات کی پردہ دری کر کے حقیقت حال سے مطلع کر دیا۔ اس وقت اس کا پورا حساب وکتاب نقل کرنا تو دشوار ہے لیکن پھر بھی اس سلسلہ میں اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ جہاں ۱۹۳۴ - ۳۵ء کے بجٹ میں سلازار نے ۱۵۰۰۰ پونڈ کا پسماندہ دکھلایا تھا وہاں مجلس بین الاقوام کے تجربہ کار ممبروں نے اس میں ۸۰۰۰۰۰ ۲ پونڈ کا خسارہ دکھلا دیا۔ ع بہ بین تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا۔

سلازار کی آمریت کے دوران میں پرتگال کو بہت بڑی بڑی مصیبتیں اٹھانی پڑیں۔ لوگوں کی رہائش ۴۰ فی صدی گر گئی۔ تعلیم کی طرف غایت بے اعتنائی اور مفاد عامہ کے کاموں میں حد درجہ بے توجہی برتی گئی۔ جسوٹ (Jesuits) جو کہ (۱۹۱۰ء) جمہوریت کے زمانہ میں ملک سے جلاوطن کئے گئے تھے سلازار کے زمانہ میں پھر واپس آکر اپنا پچھلا اقتدار حاصل کرنے لگے۔ پرتگال میں فاشسٹ حکومت جاسوسوں کے بل بوتہ پر تھی جن کی ذات میں سالانہ قریب ایک ملین پونڈ کے خرچ کیا جاتا تھا۔ سب سے زیادہ قابل ملامت حرکت اس کا ایک نئی سیاسی آزمائش گاہ کا قائم کرنا ہے۔ جس میں سیاسی قیدیوں پر عجیب عجیب اخلاق سوز مظالم ڈھائے جاتے ہیں۔* اُن کے تلووں کے نیچے جلتے انگارے

*ڈالے جاتے ہیں ان کے سر کو شکنجہ میں کسا جاتا ہے یہاں تک کہ مغز نکل آئے۔ برف کی تیار کی ہوئی کوٹھریوں میں انہیں ڈالا جاتا ہے۔ اور اس طرح طرح طرح کی مصیبتوں سے مار ڈالنے کے بعد قیدی کے خودکشی کرنے کا اعلان کر دیا جاتا ہے یہ دردناک بیان ان لوگوں کے ہیں جنہوں نے ایک قیدی کی حیثیت سے خود ان مظالم کو برداشت کیا ہے یا دیکھا ہے۔ ہم اس وقت اس سے اور زیادہ مظالم کا تذکرہ کر کے ایک اور نئی مصیبت کا اضافہ نہیں کرنا چاہتے ورنہ دنیا دیکھتی کہ کیتھولک مذہب کے سرگرم پیرو مسٹر سلازار نے اسٹار چیمبر وغیرہ کی شکل میں غریب قیدیوں پر کیسے کیسے مظالم ڈھائے ہیں۔

اس بیہودہ ڈکٹیٹر شپ کے متعلق باہر کسی کو خبر نہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ پرتگال کی حکومت بالعموم خارجی سیاست سے بہت زیادہ کنارہ رہی۔ باہر کے اخبار سیاسی حیثیت سے پرتگال کے بہت زیادہ غیر اہم ہونے کی وجہ سے اس کی طرف توجہ ہی نہیں دیتے۔ اسپین کی بغاوت شروع ہونے کے بعد چونکہ اس نے باغیوں کی کھلم کھلا مدد کرنی شروع کر دی تھی اس لئے یہ منظر عام پر آیا۔ فرانکو کی بغاوت دراصل سلازار کی جنگ تھی۔ اخباروں کے نامہ نگار اچھی طرح واقف تھے کہ پرتگال کی سڑکیں باغیوں کے لئے سامان جنگ لے جانے والی گاڑیوں سے ہر وقت بھری رہتیں۔ تاریخ میں بین الاقوامی قانون کی ایسی توہین آمیز خلاف ورزی آج تک نہیں ہوئی تھی اور یہ سب عدم مداخلت اور بے سروکاری کے پرفریب پردہ میں ہو رہا تھا۔

اطالیہ نے باغیوں کی جتنی امداد کی ان سب میں اطالوی فاشسٹ جنرل کانٹے۔ ڈی راس کی حرکت سب سے زیادہ اشتعال انگیز تھی۔ اخبار التماہورا (Ultima Hora) کے بیان کے مطابق ستمبر کے آخر میں مجارکا میں وہ باغیوں کے افواج کی قیادت کر رہا تھا۔ پالما میں سامان جنگ سے بھرے ہوئے

---

* See the A. ticle in Time End Tide (Sept. 12, 1936)
by H. G. Dobby.

اطالوی جہاز اور طیارے برابر پہنچ رہے تھے ۔ ۲۹ ستمبر کے اخبار نیوز کرانکل (News Chronicle) میں لکھا تھا:۔ "۲۷ اگست کو ۴ بجے شب کے وقت ایک گم نام جہاز جس کے مانجھی اطالوی تھے پالما میں لنگر انداز ہوا اور ۶۰۰ ٹن سامان جنگ اتار کر چلا گیا۔" اس سے بہتر عدم مداخلت کی اور کیا صورت ہوسکتی تھی ۔

اسپین کے باغی فاشسٹ جماعت نے دوران جنگ میں ڈموکریٹک گورنمنٹ کے ساتھ جو جو سلوک کیا ہے اس کا مختصر سا حال ہمیں کئی انگریزی اخباروں سے معلوم ہوسکتا ہے ۔ ۶ اگست کے اخبار ٹائمز نے لکھا تھا:۔ "فاشسٹ جنرلوں نے اباست میں لفٹ پارٹی کے تمام آدمیوں کو نیست ونابود کر دیا" ۷ اگست کے اخبار نیوز کرانکل کا بیان ہے:۔ "سوائل کے قریب لاکیانا میں سیکڑوں سیاسی قیدی جیل میں زندہ جلا دئے گئے ۔ باغی فوجوں نے وہاں کی پوری آبادی مشین گن سے اڑا دیا ۔ اور قرب وجوار کے بہت سے گاؤں کو جلا کر خاک کر دیا"

ایک پرتگالی جرنلسٹ جو بجاز (Badajoz) میں باغیوں کے قبضہ کے فوراً بعد داخل ہوا تھا اپنی رپورٹ میں ایک جگہ لکھتا ہے:۔

"کمانڈنشیا* (Commandancia) میں ایک خون سے رنگی ہوئی اور گولیوں سے چھدی ہوئی دیوار اس جگہ کا پتہ دیتی تھی جہاں دو ہزار بے گناہ انسان باغیوں کے ہاتھ سے انتہائی سفاکی کے ساتھ قتل کئے گئے تھے۔"

یہی جرنلسٹ آگے چل کر ایک دوسری جگہ اس خونریزی اور بربادی کا نقشہ اس طرح کھینچتا ہے:۔

"خون سے لالہ زار سڑکیں ان مصیبت زدہ عورتوں اور بچوں سے بھری ہوئی تھیں جو انتہائی وحشت

* Manchester Guardian 17th August.

اور رنج و غم کے عالم میں اپنے پیاروں کی لاشیں ڈھونڈھتی پھرتی تھیں۔"

۸ر اگست کو رپوٹر کے نامہ نگار نے لسبن (Lisbon) سے مندرجہ ذیل تار بھیجا تھا: "گورنمنٹ کے طرفداروں کا قتل مورزا فواج کے ہاتھوں بڑی بے رحمی سے ہوا۔ مقتولین کے لاشیں ایک جگہ ڈھیر کرکے صرف اس لئے جلادی گئیں کہ ان کے تجہیز و تکفین میں وقت کی بربادی تھی۔"

فرانسیسی پریس کے نامہ نگاروں نے اپنا عبرتناک بیان اس طرح دیا ہے: "بہت سے آفت رسیدہ جوجان بچانے کے لئے بڑے گرجا کے عبادت خانہ میں پناہ گزیں ہوگئے تھے باغیوں کے ہاتھوں انتہائی سفاکی کے ساتھ ہیں متبرک قربان گاہ پر ذبح کردئے گئے۔" یہ رویہ ان لوگوں کی طرف سے ظاہر ہو رہا تھا جو اپنے کو عیسائی کہتے تھے۔

۱۴ر ستمبر کو پوپ نے اسپین کے باغی فراریوں کی ایک جماعت کو جس میں چرچ کے معاونین اور زمیندار وغیرہ شامل تھے مخاطب کرکے ایک طویل وعظ دیا جس میں آپ نے جنگ اور خصوصیت کے ساتھ خانہ جنگیوں کی ہولناکیوں کو بتلاتے ہوئے اس سے بچنے کی ہدایت فرمائی۔ لیکن سب سے آخر میں تقریر ختم کرتے وقت "روحانی باپ نے" فاشسٹ جماعت کی طرفداری کرتے ہوئے اسپین کی جنگ کو "مقدس جنگ" سے تعبیر کیا۔

۲۹ر ستمبر کو ونچسٹر کے اسقف اعظم نے اپنے علاقہ کی کانفرنس (Diocesan Conference) کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا: "میں ایسی تحریک کو جس میں لیڈروں نے مسلم موروز کو اپنے ہم وطنوں کے خلاف لاکر کھڑا کردیا ہو ایک عیسائی تحریک سمجھنے سے مجبور ہوں۔ ایسی جماعت کو جو ملک کے مظلوم باشندوں کو صرف اس جرم میں کہ وہ اپنے عہد وپیمان کے مطابق حکومت کی وفادار ہے گولی کا نشانہ بنادینے میں دریغ نہ کرے ایک برحق جماعت تسلیم کرنا سراسر ظلم ہے۔"

اکتوبر کے ایک ماہانہ خط میں یارک کے اسقف اعظم نے ان لوگوں کا جو اس فوجی بغاوت کو

"عیسائیت اور دہریت کے خلاف جنگ" کہہ کر انگریزوں کو اپنا ہمدرد بنانے کی ناکام کوشش کرتے ہیں بہت زوروں پر مذاق اڑایا تھا۔

۲ اکتوبر کو جنرل فرانکو نے خود سے اپنے کو باغی افواج کے سپہ سالار اعظم اور حکومت ہسپانیہ کے سردار کے دو معزز خطابات سے سرفراز فرمایا۔ اس کے فوراً ہی بعد ایک پُرجوش مجمع کے سامنے تقریر کرتے ہوئے اس نے بیان کیا کہ:۔ "ہماری جماعت جسے دنیا باغی سمجھ رہی ہے دراصل اسپین کی حفاظت اور مدافعت کے لئے ہے۔"

اس کے دوسرے دن جنرل فرانکو نے ایک فرمان شائع کیا جس میں اس نے عوام کو یقین دلایا تھا کہ وہ ایک ایسی سلطنت قائم کرنا چاہتا ہے جس میں عدالت، تجارت صنعت وحرفت، زراعت، تعلیم اور مفاد عامہ کے شعبوں کا بہت بلند پیمانہ پر انتظام کیا جائے گا۔" ان تمام اعلانات اور فرمان کا مقصد صرف یہ تھا کہ عوام کے دلوں میں باغیوں کا وقار قائم ہو جائے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہسپانوی حکومت کے نمائندوں کی آواز کو، جو جنیوا میں جرمنی، اطالیہ اور پرتگال کی ناجائز امداد کے خلاف بلند کی جارہی ہے، دبا دیا جائے۔

انگلینڈ میں عوام کے اندر اختلاف رائے پیدا ہو گیا تھا۔ ایک جماعت تھی جو باغیوں کو برحق سمجھ رہی تھی اور ان کے ساتھ ایک گونہ ہمدردی رکھتی تھی۔ اس کے برخلاف دوسری جماعت باغیوں کے ہر رویہ کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتی تھی اس کے نزدیک ایک مستحکم گورنمنٹ کا صرف اتنی سی خطا پر کہ وہ کیتھولک چرچ کو سیاست کے اندر دخل دینے سے روکتی ہے اکھاڑ پھینکنا اور اس کے ہمدردوں کو طرح طرح سے ستانا قطعی نازیبا اور قابل نفریں فعل تھا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ فاشسٹ اور جمہوریت کی آویزش خونفشاں اب صرف اسپین ہی تک محدود نہیں بلکہ اس نے تمام شائستہ قوموں میں ایک ہیجانی کیفیت برپا کردی ہے۔ قریب قریب دنیا کی ہر متمدن قومیں اپنی رایوں کے اختلاف کی بنا پر دو جماعتوں میں منقسم ہو گئی ہیں۔ موقع کی نزاکت

ہر شخص کو ایک عالم گیر جنگ کی دھمکی دے رہی ہے۔

ابھی تک اس خانہ جنگی کا کوئی فیصلہ نہیں ہوا ہے اور نہ ابھی کوئی شخص یہ بتا سکتا ہے کہ "اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا" لیکن تمام سیاسی حالات کا بہ نظر غائر مطالعہ کرنے کے بعد ہم جس نتیجہ پر پہنچتے ہیں وہ درج ذیل ہے:۔

ہر جنگ اپنے انجام کے لحاظ سے مشتبہ ہوتی ہے۔ اس جنگ کی بھی دو صورتیں ممکن ہیں یا تو حکومت کی فتح ہوگی یا شکست۔ اگر شکست ہوئی تو پھر موجودہ حکومت کی جگہ پر فاشسٹ گورنمنٹ کا قیام یقینی ہے جس کا رشتہ اطالیہ اور جرمنی کے ساتھ بہت دوستانہ اور مخلصانہ ہوگا۔ اس کے مطلب یہ ہوئے کہ نہ فرانس کا ہسپانیہ سے آئندہ کوئی تعلق باقی رہے گا۔ اور نہ برطانیہ اور فرانس کے درمیان جو فوجی روابط ہیں وہی باقی رہیں گے۔ جیسا کہ مسٹر بلڈون نے ایک موقع پر کہا تھا: "چونکہ انگلینڈ کا سرحد رہائن (Rhine) پر ہے اس لئے اگر فرانس نے پائرنیز (Pyrenees) کے برابر اپنی مستقل فوج رکھی تو پھر انگلینڈ کا سرحد بہت زیادہ کمزور ہو جائے گا" علاوہ ازیں اسپین کی فاشسٹ حکومت کا اطالیہ کی فاشسٹ حکومت کے ساتھ اتحاد کے معنی یہ ہیں کہ بحیرہ روم سے برطانوی اور فرانسیسی قوت کا خاتمہ ہو جائے۔ جو لوگ واقعات عالم سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ ایسی صورت میں ایک عالم گیر جنگ ناگزیر ہے۔

دوسری طرف اگر میڈرڈ گورنمنٹ کی فتح ہوئی اور باغیوں کی خاطر خواہ سرکوبی ہوگئی تو پھر اسپین میں سوویٹ طرز کی حکومت کی بہت زیادہ امید ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ اس میں کچھ دیر لگے لیکن ایسا نہ ہونا باعثِ تعجب ہے۔

اس سلسلہ میں ایک بات اور بھی خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔ اگر جنرل فرانکو ایک فوجی طرز کی حکومت قائم کرنے میں کامیاب بھی ہوگیا تو یہ یقین ہے کہ اسپین کے عام باشندے اس کو تسلیم نہیں کریں گے۔

ایسے لوگوں کو جن کے ہاتھ میں رائفل، دماغ میں احساس ذلت، اور دل میں انتقام کی آگ موجود ہو مغلوب کر لینا کچھ ہنسی کھیل نہیں۔ اسپین کے باشندوں نے اکثر گذشتہ جنگوں میں دکھلا دیا ہے کہ وہ ہارتے ہارتے بھی دشمنوں کو ہرا دیتے ہیں۔ وہ بے ترتیب لڑائی میں بڑے ماہر ہیں۔ اور شائد اس میں ان سے کوئی نہیں جیت سکتا۔ اگر فرانکو نے اسپین پر قبضہ بھی کر لیا تو یہ ناممکن ہے کہ وہ اپنی طاقت سے ملک کے تمام باشندوں کو جھکا دے۔

اسپین کی سیاسی حالت جرمنی اور اطالیہ سے بالکل جداگانہ ہے۔ ہٹلر نے اگر جرمنی میں طاقت حاصل کی تو اس کی وجہ کچھ اور تھی اس نے جرمن کی عام پبلک کو اپنی لیاقت اور صلاحیت سے یقین دلا دیا تھا کہ وہ جرمنی کی تمام کھوئی ہوئی عزت وسطوت کو پھر واپس لا دے گا۔ اور اپنی طاقت سے دول یورپ کو تسلیم کرا دے گا کہ یورپ کے سیاسی نقشہ پر جرمنی کی بھی کوئی مخصوص جگہ ہے۔ اس نے عوام کے سامنے عہد کیا تھا کہ وہ جب تک جرمن قوم کی پیشانی سے معاہدہ ورسیلا کے بدنما داغ کو نہ مٹائے گا چین سے نہ بیٹھے گا یہی وہ باتیں تھیں جن سے متاثر ہو کر وہاں کے لوگوں نے اسے اپنا سردار منتخب کیا تھا۔

اسی طرح مسولینی کے برسر اقتدار ہونے کی وجہ اس کی غیر معمولی جسمانی اور دماغی برتری تھی۔ وہ اپنی قوم کی نفسیات سے اچھی طرح واقف ہو گیا تھا۔ ایسے موقع پر جب کہ ملک میں ابتری پھیلی ہوئی تھی اسے اپنے ذی وقار رویہ اور حوصلہ افزا طریقوں سے قوم کا دل جیت لیا تھا۔

لیکن ان میں سے ایک بات بھی اسپین پر صادق نہیں آتی۔ جنرل فرانکو نہ مسولینی ہی ہے اور نہ ہٹلر بن سکتا ہے۔

یہ جنگ جتنے دنوں تک بھی جاری رہے۔ جتنا بھی قتل و غارتگری ہو فاشسٹ کی فتح ہو یا جمہوریت کی لیکن انجام سب کا ایک ہے اور وہ معلوم۔ اسپین کے عام لوگ اپنا پیدائشی حق کبھی اور کسی حال میں بھی نہیں چھوڑ سکتے۔ وہ لوگ اپنی قومیت اور نسل کے بارہ میں بہت زیادہ مغرور واقع ہوئے ہیں اور ان میں

اس کی صلاحیت بھی ہے کہ وہ اپنے حقوق کی پوری حفاظت کر سکیں۔

"نذرِ علیگڈھ"

(جناب محمد حبیب الرحمٰن صاحب حبیب متعلم بی۔ اے)

اے علیگڈھ مرکزِ تعلیم ماضی و جدید　　نقش پیشانی پہ تیری آیۂ حبل الورید
تیرے ہونٹوں پر بہارِ صبحِ عشرت کی نوید　　ہو رہی ہے آسمانوں میں تری گفت و شنید
آگ ہے سینہ میں پنہاں جلوہ گاہ طور کی
شان ہے نغموں میں پیدا نعرۂ منصور کی

اے فروغِ علم و حکمت رحمت اللعالمیں　　اے جمالِ رنگِ فطرت جانِ گلزارِ یقیں
اہلِ حکمت چومتے ہیں تیری چوکھٹ کی زمیں　　قبلہ گاہِ قوم تیری طبعِ وقتِ آخریں
لالہ رو نغمہ ترا تقریر تیری آتشیں
آنِ واحد میں بدل دیتے ہیں رسمِ کفر و دیں

اے ضیائے ملک و ملت آسمانِ فخرِ قوم　　اے دبستانِ سیاست عزّ و شانِ فخریہ قوم
اے بہارِ بے خزاں اے گلستانِ فخرِ قوم　　اے نوائے حریت اے ترجمانِ فخرِ قوم
کانپتا ہے آسماں تیری نوائے ساز سے
زلزلہ قصرِ حکومت میں تری آواز سے

قرطبہ کی یاد ہے بغداد کی عظمت ہے تو　　ملتِ مرحوم کی عزت ہے تو غیرت ہے تو
پھول کی نکہت ہے تو گلزار کی رنگت ہے تو　　مادرِ علمی مری گہوارۂ جنت ہے تو
جھانکتے ہیں قصرِ گردوں سے ملائک بار بار
کس قدر تیرے تبسم میں ہے حسنِ لالہ زار

ترانۂ ارادتمند

۱۳ ھ ۵۶

یعنی

شکر عنایات آصفِ سابع خلد اللہ سلطنتہ و ملکہ

۱۳ ھ ۵۶ ۱۳ ھ ۵۶

(جناب مولانا احسن صاحب مارہروی)

[اس نظم کی مختصر تاریخ یہ ہے کہ ایک منظوم مثنوی موسوم بہ شاہکار عثمانی جس کو حضرت مولانا احسن صاحب مارہروی اُستاد شعبۂ اُردو مسلم یونیورسٹی نے تالیف کی تقریب تالیف یہ ہوئی کہ اعلیٰ حضرت خسرو دکن خلد اللہ ملکہ نے ایک قرآن مجید کے سادہ ورق پر چند سطریں فارسی زبان میں لکھ کر بطور یادگار اپنی ۲۵ سالہ جشن سیمیں کے پولین میں رکھنے کا حکم دیا، اس فارسی عبارت کے متعلق جناب ہوش بلگرامی نے ایک مضمون لکھا اور اخبار رہبر دکن میں چھپوایا اُس اُردو مضمون کا ترجمہ فارسی زبان میں شہریار دکن نے فرمایا، اردو بھی اخبار مذکور میں شائع ہوا یہ دونوں ترجمے عالی جناب ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی کے پاس بھیجے گئے ڈاکٹر صاحب نے ان نثر (فارسی و اُردو) ترجموں کو نظم کرنے کے لئے مولانا احسن صاحب کے حوالے کیا، اس نثر کو مصنف شاہکار عثمانی نے جس کامیابی اور روانی کے ساتھ نظم کے قالب میں ڈھالا ہے اس کا اندازہ ذیل کی تمہید سے ہو سکتا ہے جو مثنوی مذکور کی تاریخ بھی ہے:-

بحمد اللہ ایک کار اہم — مختتم ہوگیا بہ سعی اتم
گو وہ کندن سے کم نہ تھا یہ کام — لطف حق سے مگر ہوا انجام
محترم ڈاکٹر ضیاء الدین۔ — بزم علم و ہنر کے صدر نشیں
ایک خط ہوش بلگرامی کا — شہرہ ہے جن کی نیک نامی کا
آیا موسوم ڈاکٹر صاحب — جس میں لکھتے ہیں اس طرح کاتب
ایک اخبار کے تراشے دو — بھیجے جاتے ہیں دیکھئے ان کو

ہو چکے جب شنید و دید ان کی
بھیج دی جائے اک رسید ان کی

وہ تراشے دیے گئے مجھ کو
یوں ودیعت کیے گئے مجھ کو

بحر سے دُر نکال کر لاؤ
نظم میں نثر ڈھال کر لاؤ

جب پڑھیں میں نے دونوں تحریریں
کھنچ گئیں حیرتوں کی تصویریں

کیوں نہ میں شکلِ نقش ہوں خاموش
حضرتِ ہوش نے کیا بے ہوش

اُن کے ذہن و ذکا کا کیا کہنا
ان کی طبعِ رسا کا کیا کہنا

نکتہ رس نکتہ یاب و نکتہ شناس
عقل مند و مدبر و حساس

حضرتِ بندگانِ عالی کی
خوش بیانی و خوش مقالی کی

خوب تشریح کی جزاک اللہ
خوب تصریح کی حماک اللہ

ہے اُنھیں خوبیوں کا اک یہ اثر
اُنھیں گل ریزیوں کا ہے یہ ثمر

کہ ہوئے شاد بندگانِ حضور
اور کی یہ عنایت موفور

لکھدیا فارسی میں اُردو کو
کر دیا آفتاب جگنو کو

میں کہ اک نقشِ بے حقیقت ہوں
کم لیاقت ہوں بے بضاعت ہوں

کام کوئی نہیں ہے مستحسن
ہوں فقط نام کے لئے احسن

زینتِ تخت و تاجدارِ دکن
آصفِ سابع آبروے زمن

حق رس و حق پژوہ و حق آگاہ
رحمتِ کردگار و ظلِّ اللہ

حامیِ دیں و ماحیِ الحاد
سامعِ داد و قامعِ بیداد

منبعِ جود و معدنِ الطاف
مرجعِ خلق و مرکزِ انصاف

مصدرِ علم و بادشاہِ علوم
ہادی و رہبرِ جہول و ظلوم

جن کے ہوں یہ محاسن واخلاق — جن پر ان خوبیوں کا ہو اطلاق
اُن کی تعریف اور میں توبہ — اُن کی توصیف اور میں توبہ
مور کیا واصفِ سلیماں ہو — قطرہ کیا بحر کا ثنا خواں ہو
اُن کی تعریف و مدح کیا کی جائے — ہے مناسب کہ اب دعا کی جائے
عالم الغیب! تیرے دفتر میں — اہلِ تقدیر کے مقدر میں
جتنی عزت کی سربلندی ہو — جتنی قسمت کی ارجمندی ہو
جس قدر سر فروز ہو اقبال — جس قدر وجہِ ناز ہو اجلال
جتنی ممکن ہو کثرتِ دولت — جتنی ممکن ہو وسعت عشرت
جتنا امکان میں ہو لطفِ حیات — جتنے ہوں خلق بہترین اوقات
رحمتیں جس قدر ہیں قدرت کی — نعمتیں جس قدر ہیں فطرت کی
مرحمت ہوں وہ سب کی سب اُن کو — سحر و شام و روز و شب اُن کو
آل و اولاد شاد کام رہے — ہر طرح فائز المرام رہے
یا الٰہی دعائیں ہوں یہ قبول — بطفیلِ رسول و آلِ رسول
بندگانِ حضور کی تحریر — چوں کہ رکھتی نہیں مثال و نظیر

اُس کی تاریخ بھی ہے لاثانی
ہے یہ القائے نطقِ ربانی

۵۶ ھ ۱۳

طباعت کے بعد جناب ڈاکٹر صاحب (وائس چانسلر) نے یہ ۱۰۰ منظوم ترجمہ اعلیٰ حضرت شہریار دکن کی خدمت میں جوش صاحب کی وساطت سے بھیجا، جس کو ملاحظہ فرمانے کے بعد بندگان عالی نے اپنے دست و قلم سے ایک سرفرازنامہ

تحریر فرما کر مصنف کے نام بذریعہ رجسٹری عطا فرمایا، جس کی نقل بحرفہ یہ ہے:۔

احسن بلگرامی صاحب ثم مارہروی اُستاد شعبۂ اُردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
میری فارسی نثر کا اُردو میں تم نے جو منظوم ترجمہ کیا ہے جس کو کہ ڈاکٹر ضیاء الدین
صاحب وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی نے میرے ہاں بھیجا تھا، بتوسط ہوش
بلگرامی جس کا نام نامی شاہکار عثمانی ہے، میں نے بغور دیکھا۔ اور تمھاری محنت
کی داد دیتا ہوں کہ یہ رائگاں نہیں جائے گی بلکہ صفحۂ عالم پر جہاں تک
کہ علمی دنیا کا تعلق ہے باقی رہے گی۔

۲۳ - ربیع الثانی ۱۳۵۵ھ (دستخط) آصف سابع

اس عزت افزائی اور قدر فرمائی کے بعد مولانا احسن صاحب نے بطور شکریہ یہ نظم دربار شاہی میں جناب ہوش کی وساطت سے پیش کی، اس شکریئے کے عنوان میں جو فقرات لکھے گئے ہیں ان سب سے علیحدہ علیحدہ ہجری سنہ برآمد ہوتے ہیں۔ یہ نظم بھی اپنی روانی اور سلاست کے لحاظ سے مصنف کی قادر الکلامی اور اُستادی کا بہترین نمونہ ہے۔" (ادارہ)

جزو و کُل خلق ہوئے وسعتِ عرفاں کے لئے — قطرہ دریا کے لئے ذرہ بیاباں کے لئے
کیوں نہ ادنیٰ کو ہو اعلیٰ سے تعلق، فطری — دانہ مخلوق ہوا خرمن دہقاں کے لئے
ہو گئی شہرت و نام آوریِ مور ضعیف — جب قدم اُس نے ذرا بڑھے سلیماں کے لئے
اس طرح لازم و ملزوم ہیں سب خُرد و کلاں — جس طرح غنچہ و گل ہیں چمنستاں کے لئے
الغرض شکل بدیہی ہے یہ صغریٰ کبریٰ — تشکّل ہو جہاں کیوں نہ جہاں باں کے لئے
بے نوا ہو کے عجب کیا جو نوا سنج ہوں میں — مدحتِ خسرو عثمانِ علی خاں کے لئے
وہ فلک جاہ مَلک خو مَلِکِ مُلکِ دکن — سایۂ رحمتِ حق ہے ہر اک انساں کے لئے
جس کا منشا ہے رہے دین کو دنیا میں فروغ — جس کا ایما ہے اُٹھو خدمتِ ایماں کے لئے

ہند ہی کیا ہے رواں بحرِ کرم ہی اس کا
لندن و روم و عراق و عربستاں کے لئے

سیکڑوں ایسی مثالیں ہیں جو پوشیدہ نہیں
درجِ تاریخ ہیں آگاہیِ دوراں کے لئے

میری اک خدمتِ ناچیز کو بخشا وہ شرف
جو ہوا موجبِ نازش دلِ نازاں کے لئے

خود لکھا دستِ مبارک سے کرامت نامہ
سازِ عزت ہے جو مجھ بے سر و ساماں کے لئے

اس کے الفاظ جو یکسر ہیں جواہر ریزے
طرۂ فخر بنے فرقِ ثنا خواں کے لئے

"رائگاں جائے گی ہرگز نہ تمھاری محنت"
اک کنایہ ہے یہ افزائشِ ارماں کے لئے

شبہ و شک ہو اس ارشاد میں توبہ توبہ!
ہے یہ توقیع مری وقعتِ ایقاں کے لئے

یہ توجہ یہ تخاطب یہ تلطف گویا
باعثِ فرحت و راحت ہے دل و جاں کے لئے

نسل در نسل یہ اعزاز رہے گا قائم
میری اولاد میں ہر تابعِ فرماں کے لئے

مجھ سے کہتی ہے یہ تدبیرِ مساعد میری
سوئے تقدیر نہ اب خوابِ پریشاں کے لئے

پا کے فیضِ کرم و مرحمتِ و رحمتِ خاص
نذرِ احسن ہے یہ شکرانۂ احساں کے لئے

شرحِ اوصافِ مبارک کی جو لکھنے بیٹھوں
سو دفاتر ہوں تمام ایک ہی عنواں کے لئے

ہے خطا پوش، عطا پاش، بصد رحم و کرم
شاہ کا لطفِ عیاں کلفتِ پنہاں کے لئے

خوبیاں حسن و محاسن کی جہاں ہیں، جتنی
منطبق ہیں وہ سب اس خسروِ خوباں کے لئے

کہیں آمین، سرِ سدرہ سے جبریلِ امیں
ہاتھ اٹھاتا ہوں دعا خوانیِ سلطاں کے لئے

دل سے نکلی ہوئی یارب یہ دعائیں ہوں قبول
انبیا و رسل و خاصۂ خاصاں کے لئے

رعب و علم آصفِ سابع کا بٹھاتا رہے دھاک
شہِ مرداں کے لئے شاہِ شہیداں کے لئے

کوئی مد، کوئی عدد چھوٹنے پائے نہ کہیں
دولت و منزلت بے حد و پایاں کے لئے

نام کو کام کو اس کے رہے اتنا ہی قیام
جتنی ممکن ہے بقا عالمِ امکاں کے لئے

شاہ بانو ہوں کہ شہزادہ و شہزادی ہوں　　سب کے سب وقت رہیں عیشِ فراواں کے لئے
ربعِ مسکوں میں ہو جتنا بھی سکوں، جمع رہے　　اُن کے قصرِ محل و کوشک و ایواں کے لئے
ہے یہ آخر میں دعا جامع دما نع احسنؔ　　شہریارِ دکن و خسروِ دوراں کے لئے
شہ عثماں ہوں پئے لُطف و عطائے دنیا
اور دنیا ہو ثنا ئے شہِ عثماں کے لئے

نقد و تبصرہ

ندیم

(اڈیٹر جناب سید ریاست علی صاحب ندوی چندہ سالانہ للعہ ملنے کا پتہ دفتر ندیم خانقاہ منعیہ رام ساگر روڈ۔ گیا)

اردو رسائل کے بارہ میں صوبہ بہار کی سرزمین برابر سنگلاخ رہی ہے۔ اس طرف پانچ سات سال کے عرصہ میں دیکھتے دیکھتے کتنے رسالے نکلے اور بلبلے کی طرح فنا ہو گئے۔ رسالہ ندیم کو اس کا امتیاز حاصل ہے کہ اپنے صوبہ کی سنگلاخ زمین اور ابنائے وطن کی بے اعتنائیوں کے باوجود بھی یہ آٹھ سال سے برابر ایک طرح پر اپنے ادبی اور علمی فرائض کو انجام دینے میں منہمک ہے۔ زمانہ کی ناموافق ہوانے اکثر اس کے ہمدردوں کو اس کی جانب سے سہما دیا لیکن اس کی بنیاد ہی کچھ ایسی شبھ گھڑی میں رکھی گئی تھی کہ اس کے پائے استقامت کو ذرا بھی لغزش نہیں ہوئی۔ اس سال اگست کے مہینہ سے اس کی ادارت میں تبدیلی ہوئی ہے اور ساتھ ہی اس کے معیار اور مقاصد میں بھی فرق آگیا ہے۔ پہلے انجم صاحب اس کے مدیر تھے جو ایک ادیب سے زیادہ ایک کامیاب تاجر کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ اب اس کے اڈیٹر ریاست علی صاحب ہیں جو ایک ادیب کی حیثیت سے روشناس ہیں اور صرف اسی حیثیت سے مشہور ہونا چاہتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے ندیم ریاست علی صاحب کے دور ادارت میں ہندوستان کے کامیاب پرچوں میں شمار ہو گا اور اس کی سابق بعض خامیاں بھی دور ہو جائیں گی۔

اس وقت ستمبر کا پرچہ ہمارے سامنے ہے۔ جس سے ہمارے خیال کو اور بھی تقویت ہوتی ہے مقالات کے سلسلہ میں علامہ سلیمان ندوی کا مقالہ "دو ہفتے میسور اور مدراس میں" بعض لحاظ سے بہت زیادہ اہم اور وقیع ہے۔ قاضی عبدالودود صاحب کا مقالہ "بشارۃ الامامہ" ایک تحقیقی مضمون ہے جس میں صاحب موصوف نے بارھویں صدی کی مشہور مثنوی بشارۃ الامامہ پر تحقیقی نظر ڈالی ہے۔ قاضی صاحب کی تحقیقی نظر بڑی

اچھی ہے لیکن عام طور پر وہ اپنے خیالات کو کمزور الفاظ میں پیش کر کے مضمون کو پھس پھسا کر دیتے ہیں۔

عبدالسلام صاحب ندوی کا علمی اور ادبی مقالہ "دورِ عباسیہ کا اخلاقی اثر علوم و فنون پر" بہت زیادہ قابلِ قدر ہے۔

اس مرتبہ افسانوں کا معیار بھی اچھا خاصا ہے۔ "میرا نامۂ اعمال" اور "اہنسا" اپنے اپنے طرز میں بہت خوب لکھے گئے ہیں۔ "اہنسا" ایک سماجی افسانہ ہے اور اس قابل ہے کہ سب لوگ اس سے عبرت حاصل کریں۔

نظم کا معیار بھی کافی اچھا ہے۔ تصویر کے انتخاب میں بھی بڑی پاکیزگی مذاق اور سلیقہ کو راہ دیا گیا ہے۔ ہماری رائے ہے کہ آئندہ بھی تصاویر کے انتخاب میں اسی طرح احتیاط اور سلیقہ کو راہ دیا جائے۔

(م - د)

خضرِ راہ

(چیف اڈیٹر حکیم محمد یوسف حسن صاحب۔ اڈیٹر محمد یعسوب الحسن صاحب۔ چندہ سالانہ دو روپے ملنے کا پتہ دفتر رسالہ خضرِ راہ بارود خانہ اسٹریٹ لاہور)

یہ رسالہ ابھی ستمبر کے مہینہ سے ایک خاص مقصد کے ماتحت نکلنا شروع ہوا ہے جیسا کہ ادارہ کے نوٹ سے پتہ چلتا ہے۔ اس کی غرض و غایت عام ادبی و علمی رسائل سے ہٹ کر فلسفہ گناہ پر مختلف پہلوؤں سے روشنی ڈالنا ہے۔ "گناہ کے علاوہ سکسول سائنس یعنی انسان کی نوعی زندگی کو بے نقاب کرنا یا تعلقات مرد و زن پر محققانہ علمی مقالات لکھنا اس رسالہ کے ضروری مقاصد میں داخل ہیں۔" یہ خوشی کی بات ہے کہ اردو ادب میں بھی اب مختلف مقاصد کے ماتحت رسائل نکلنے شروع ہو گئے ہیں۔ ہر رسالہ کی غرض و غایت اگر صرف علمی اور ادبی خدمت ہی ہو جائے تو ظاہر ہے اس سے ادب کو بہت زیادہ فائدہ نہیں پہنچ سکے گا۔ دوسرے ادبیات کی طرح اردو ادب کو بھی اسی کی ضرورت ہے کہ اس کے رسائل جرائد اور تصانیف مختلف مقاصد کے ماتحت شائع ہوا کریں۔ مغربی تہذیب نے سکسول سائنس کی اہمیت جس قدر

زیادہ بڑھادی ہے اسی قدر ہم دیکھتے ہیں ہمارا اردو ادب اس بارہ میں بالکل بے مایہ ہے۔ اس دور میں بے شک اس کی ضرورت ہے کہ اردو ادب میں بھی انسانوں کی عام ضروریات کی تکمیل کے لئے لٹریچر مہیا کیا جائے۔

حکیم یوسف حسن صاحب کو سکشول سائنس کے متعلق بہت اچھی واقفیت ہے اور اس لئے ہمیں امید ہے کہ خضر راہ جس مقصد کے ماتحت نکلنا شروع ہوا غالباً اس میں کامیاب رہے گا۔

دور اندیش

(چیف اڈیٹر مسٹر طاہر بی۔ اے۔ ایل ایل بی علیگ اڈیٹر رضی نظامی چندہ سالانہ ایک روپیہ)

یہ رسالہ ابھی جولائی کے مہینہ سے شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ اور قیمت کا لحاظ کرتے ہوئے غنیمت ہے۔ دنیا کے ہر ادب میں اس طرح کے پرچوں کی بھی ضرورت ہے جس کا چندہ برائے نام اور خبریں عام مذاق کی ہوں۔ اردو ادب میں رسالہ دور اندیش بھی غالباً اسی طرح کی چیز ہے۔ اس کے ہر پرچہ میں حسن نظامی صاحب کا ایک نہ ایک چٹکلا سا مضمون ضرور رہتا ہے اور یہی غالباً لے دے کر اس رسالہ کی جان ہے۔

ملنے کا پتہ دفتر دور اندیش جنگپورہ۔ دہلی۔

انبساط روح

(از جناب حاجی محمد عبد الغفور صاحب مشتاق و شوق تقطیع چھوٹی ۸۰ صفحات قیمت ۸ ملنے کا پتہ مولوی محمد منظور صاحب فاضل الہ آباد)

یہ مختصر سا مجموعہ جناب عبد الغفور صاحب مشتاق کے کلام کا انتخاب ہے جس میں مختلف عنوان پر لکھی ہوئی اچھی اچھی نظمیں اور بقیہ غزلیں ایک جگہ جمع کر دی گئی ہیں۔ آج کل عام طور پر دیوان مرتب کرنے کے بجائے شعرا اپنے منتخب کلام کا مجموعہ شائع کرنا زیادہ پسند کرتے ہیں میری رائے میں یہ طریقہ قابل

پسند ہے۔ اس سے شعرا کے اچھے اچھے کلام شائع ہوتے ہیں۔ انبساط روح میں حمد و نعت اور منقبت وغیرہ کے علاوہ اکثر نظمیں فلسفیانہ اور صوفیانہ رنگ کی چیزیں ملتی ہیں۔ اس سے شاعر کی لیاقت کا پتہ چلتا ہے۔ غزلیں بھی اچھی خاصی ہیں۔ (م۔ د)

رباعیات احقر

(از حضرت حاجی بشارت حسین صاحب احقر بہاری مرحوم قیمت غیر مجلد ۴؍ ملنے کا پتہ محلہ شیر پور بہار شریف)

رباعی نظم کی ایک مشکل قسم ہے اور یہی وجہ ہے کہ بہت کم شعرا اس میں کامیاب ہو سکے ہیں۔ شبلی نعمانی مرحوم کی رائے رباعی کے متعلق یہ ہے: ۔"صوفیانہ اور اخلاقی مضامین کے اظہار کے لئے سب سے موزوں چیز رباعی ہے اور یہی وجہ ہے کہ جن شعرا مثلاً خیام، سلطان ابوسعید ابوالخیر نے ان مضامین کو اپنا موضوع شاعری قرار دیا تھا۔ انھوں نے رباعی کے سوا تمام عمر میں کچھ اور نہ لکھا"۔

رباعیات احقر کی اشاعت اب سے کئی سال پہلے ہوئی تھی لیکن چونکہ اب تک اس پر کوئی معقول تبصرہ نہیں ہوا تھا اس لئے یہ منظر عام پر نہیں آ سکی۔ آج سے تین سال پہلے دسمبر ۱۹۳۴ء کے رسالہ معارف میں معین الدین صاحب دردائی نے احقر بہاری مرحوم کی مجموعہ شاعری پر ایک مختصر سا مضمون لکھا تھا لیکن چونکہ وہ بہت زیادہ مختصر تھا اس لئے اس میں رباعیات احقر پر کما حقہ روشنی نہ پڑ سکی آج کی صحبت میں چاہتا ہوں کہ ان کی رباعیات پر ایک آزادانہ اظہار خیال کروں۔

رباعی کی اصل خوبی ناقدین کے نزدیک یہ ہے کہ شاعر نے چار مصرعوں میں اپنے مافی الضمیر کو بہت ہی صاف ستھرے اور سادہ انداز میں مکمل طور پر ظاہر کر دیا ہو۔ آیئے اسی روشنی میں احقر کی رباعیوں کا بھی جائزہ لیں۔

احقر کی رباعیوں میں ہمیں تصوف، فلسفہ، اخلاقیات اور ساتھ ساتھ شباب و شراب کے مضامین

بکثرت ملتے ہیں۔ فلسفہ وحدت الوجود کو کتنے اچھے انداز میں بیان کیا ہے :۔

باہر ہے سمجھ سے قدرت تیری　　　کثرت میں جھلک رہی ہے وحدت تیری
اب حشر میں دیکھنا ہے اے داورِ حشر　　　بڑھتی ہے مری خطا کہ رحمت تیری

ایک جگہ تصوف کے ایک پیچیدہ مسئلہ کو کتنے پیارے انداز میں سلجھایا ہے :۔

آنکھیں جو کھلیں تو اک تماشا دیکھا　　　کعبہ دیکھا کہیں کلیسا دیکھا
سب کچھ دیکھا مگر نہ دیکھا کچھ بھی　　　دیکھا نہ تجھی کو جب تو پھر کیا دیکھا

اخلاقیات قریب قریب ہر شاعر کا موضوع سخن ہوتا ہے۔ لیکن احقر جس موثرانہ انداز میں اس کو پیش کرتے ہیں اس کی مثال مشکل سے ملے گی :۔ ۵

سچ کہتے ہیں ہم کہا ہمارا مانو　　　کچھ ہوش بھی ہے تمہیں ارے دیوانو
اے دیدو بہاؤ اشک نادم ہو کر　　　فرصت کا جو وقت ہے غنیمت جانو

سخاوت کی صفت اور بخل کی مذمت ہم نے اکثر اخلاقی شاعر کی زبانی سُنی ہے۔ اب ذرا احقر کا بھی انداز ملاحظہ ہو :۔

دینے کے لئے دست سخا بڑھتا ہے　　　لینے کے لئے دست گدا بڑھتا ہے
رتبے میں ہیں کس طرح یہ دونوں یکساں　　　یہ گھٹتا ہے وہ پیش خدا بڑھتا ہے

شراب و شباب سے قریب قریب ہر شاعر کو سابقہ پڑتا ہے احقر بھی اس سے محفوظ نہیں رہ سکتے تھے لیکن جس حد تک ان دونوں سے یہ متاثر معلوم ہوتے ہیں وہ کہیں اور مشکل سے ملتا ہے۔ ان کے یہاں اس موقع کے لئے کیف و مستی بھی ہے اور پشیمانی و ندامت بھی۔ لکھتے ہیں :۔

احقر عہد شباب توبہ توبہ　　　وہ ضبط وہ اضطراب توبہ توبہ
کچھ ہم سے نہ پوچھئے جوانی کا حال　　　توبہ توبہ جناب توبہ توبہ

شراب و ساغر سے متعلق ایک دوسری رباعی ہے :-

لا مجھ کو شراب ناب ساقی دیدے　　اس ابر میں آفتاب ساقی دیدے

کل روز حساب خیر دیدینگے حساب　　لے آج تو لے حساب ساقی دیدے

احقر کا مجموعہ کلام عنقریب شائع ہونے والا ہے۔ امید ہے شائع کرنے والوں کی محنت بارآور ثابت ہوگی۔

(سرمد جمالی)

مخدوم الملک

(مرتبہ جناب رشید احمد بہاری تقطیع چھوٹی لکھائی چھپائی اچھی قیمت ۸؍)

یہ مختصر سا رسالہ حضرت مخدوم الملک شیخ شرف الدین احمد یحیٰی منیری رحمۃ اللہ کے سوانح حیات پر مشتمل ہے۔ سیرۃ الشرف اور وسیلہ الشرف حضرت مخدوم الملک کی سوانح حیات پر دو بہت جامع اور معتبر کتابیں ہیں۔ مرتب نے ان ہی دونوں کتابوں کو پیش نظر رکھ کر یہ مختصر سا رسالہ مرتب کر دیا ہے جس میں بہت ہی مختصر طور پر مخدوم الملک کی سوانح حیات سے متعلق چند اہم باتوں کا تذکرہ ہے عام واقفیت کے لئے اس طرح کی چیزیں بہت ہی اچھی اور مفید ہوتی ہیں ہمیں امید ہے اس سے بہت سے خدا کے نیک بندے مستفید ہوں گے۔ اور مرتب کی آرزو کے مطابق ان کو بھی دعائیں دیں گے۔

ملنے کا پتہ رشید اینڈ کمپنی او پٹیشن اینڈ واچ ڈیلرس۔ بہار شریف ضلع پٹنہ۔

چائے نامہ

یہ چھوٹا سا منظوم رسالہ شاہ غفور الرحمٰن صاحب حمد کاکوی کے فکر کا نتیجہ ہے۔ جیسا کہ اس لے

عنوان سے ظاہر ہے اس میں حمد صاحب نے چائے کی تعریف و توصیف کے علاوہ اس کے نفع اور نقصان کو بہت ہی اچھے پیرایہ میں بیان کیا ہے۔

حمد صاحب صوبہ بہار کے ایک کہنہ مشق اور پرگو شاعر ہیں۔ ضلع گیا میں کاکو ایک بستی ہے وہیں آپ کا وطن ہے۔ آپ اس طرح کی چٹکلی چیزیں لکھنے کے بہت زیادہ شائق ہیں اور حق یہ ہے کہ خوب لکھتے ہیں۔ یہ رسالہ لائبریرین کتب خانہ بزم کمال کاکو ضلع گیا سے دو آنہ کا ٹکٹ پہنچنے پر مل سکتا ہے۔

(م - د)

تحفہ عید

یہ منظوم رسالہ جناب شاہ منظور الرحمٰن صاحب اختر کاکوی کے حدت طبع کا نتیجہ ہے۔ اختر صاحب صوبہ بہار کے نوجوان شعرا اور ادبا میں ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ بیان میں روانی، خیالات میں بلندی اور طبیعت میں جدت پائی جاتی ہے شاد کی شاگردی نے انہیں اور بھی چمکا دیا ہے۔ یہ رسالہ جیسا کہ انھوں نے شروع صفحہ میں خود ہی لکھدیا ہے ایک خاص مقصد کے تحت لکھا گیا ہے:-

"۱۳۴۶ھ میں جب میں تحصیل علم میں مشغول تھا تو قصبہ کاکو ضلع گیا کی خطابت عیدین میرے سپرد کی گئی۔ کتابی خطبہ کو بالائے طاق رکھ کر دو سال تک اپنا تحریری خطبہ پیش کرتا رہا یہ طریق عمل اثر افزا ثابت ہوا تو پھر تقریری خطبہ کی ابتدا کی چنانچہ بحمد اللہ اس وقت تک یہی صورت قایم ہے یعنی زبانی مختصر عربی خطبہ کے بعد جو باتیں ضروری معلوم ہوتی ہیں ان کو اردو میں بیان کرتا ہوں۔ اس سال (۱۹۳۳ء) عید میں یہ نظم پیش کی گئی تھی جس کو ناظرین تحفہ عید کے نام سے ابھی ملاحظہ کریں گے"!

دو چار اشعار بطور نمونہ درج ذیل کئے جاتے ہیں:-

بصد آرام سوئے اب خدارا دور غفلت ہو
سروں پر پھر وہی اپنا پرانا تاج وحمت ہو

بروت تابکے رگ رگ میں پھر پیدا حرارت ہو
کہ جس سے بزم عالم میں وقار آدمیت ہو

جو یچ پوچھو عمل سے پاؤں کی بیڑی بھی کٹتی ہے
یہ وہ شے ہے بری تقدیر بھی جس سے پلٹتی ہے

یہ رسالہ بھی بزم کمال کاکوی کی طرف سے شائع کیا گیا ہے۔ لائبریرین بزم کمال کاکو ضلع گیا سے ایک آنہ کا ٹکٹ بھیج کر منگوایا جا سکتا ہے۔

(م - د)

مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ — ۲۲۴ — ۲۷-۷-۳۷-۱۵۰۰

علی گڑھ میگزین

تعطیلات نمبر	بابت اگست سنہ ۱۹۳۸ء	جلد ۱۶ نمبر ۳

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا علمی و ادبی سہ ماہی رسالہ

نگران

جناب ضیاء احمد صاحب بدایونی - ایم - اے (لکچرار شعبہ فارسیہ)

مدیر:-

محمد ابو اللیث صدیقی البدایونی

بی - اے - آنرز - ایم - اے (علیگ)

معاون مدیر:-

چودھری آفتاب احمد صدیقی (ردولوی)

آنرز (فائنل)

فہرست مضامین

حادثہ جانکاہ

میگزین کی طباعت کے آخری لمحات میں اطلاع ملی کہ ہمارے ہونہار نوجوان مضمون نگار یوسف رضا صاحب ۲ ستمبر کی شب میں سوا گیارہ بجے ایکسپریس ٹرین کی زد میں آگئے۔ مرحوم گزشتہ سال وسطانیہ (Intermediate) کے امتحان میں یونیورسٹی بھر میں اوّل رہے تھے۔ ان سے ہماری بہت کچھ اُمیدیں وابستہ تھیں، افسوس ایسا قابل اور ہونہار فرزند جامعہ سے رخصت ہوگیا۔

آپ کا آخری مضمون جو اس اشاعت میں شامل ہے اس کی آخری کاپی آپ کی حیات میں چھپ چکی تھی۔

قَالُوا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن ؎

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم

علی گڑھ میگزین

جلد ۱۶ نمبر ۳	اگست سنہ ۱۹۳۸ء	تعطیلات نمبر

شذرات

اس سال کا سب سے بڑا حادثہ علاّمہ اقبالؔ کی ناوقت موت ہے۔ قرونِ اولیٰ سے قطع نظر کیجئے تو ایسے مکمل مسلمان کی نظیر مشکل سے ملے گی جس نے مغرب کی سم آلودہ فضاؤں میں رہ کر بھی اپنے ایمان کو مستحکم اور برقرار رکھا اور فلسفہ کی انتہائی تعلیم کے بعد بھی اسلامی تعلیم میں سکون حاصل کیا۔ علاّمہ کی ذات اسلام کی بہترین خوبیوں کی حامل تھی۔ وہ ایک عظیم المرتبت شاعر تھے اتنے عظیم المرتبت کہ ہندوستان کی خاک سے ایسا دوسرا شاعر نہ پیدا ہوا اور نہ پیدا ہونے کی اُمید ہے، جن شعراء کے متعلق کہا گیا ہے کہ تلامیذ الرحمٰن ہوتے ہیں، جن کے شعر میں حکمت اور بیان میں جادو ہوتا ہے، جن کا تخیل محدود سے نکل کر لامحدود پر چھا جاتا ہے جو شاعر بھی ہوتے

ہیں اور صاحب الہام بھی، جو ساحر بھی ہوتے ہیں اور راہبر بھی، جو مفکر بھی ہوتے ہیں اور واعظ بھی۔ اقبالؔ ان کا مکمل نمونہ تھے۔

سرورِ رفتہ باز آید کہ نہ آید | نسیمے از حجاز آید کہ نہ آید
سر آمد روزگار ایں فقیرے | دگر دانائے راز آید کہ نہ آید

وہ واقعی یکتائے روزگار تھے اور کون کہہ سکتا ہے کہ اُن کا جانشین پیدا ہوگا۔

ان کی وفات پر ملک نے جن جذبات کا اظہار کیا وہ اس کے مستحق تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ ملک و ملّت کا کوئی بڑا محسن اُٹھ گیا جس سے بہت کچھ اُمیدیں وابستہ تھیں۔ لیکن وہ اس اعلیٰ مقام پر جا پہنچے جہاں ہمارے گریہ وزاری کی صدائیں کبھی نہیں پہنچ سکتیں۔ وہ وہاں ہیں جہاں ہماری عقیدتمندانہ نذریں اور پُرخلوص ہدیے بھی رسائی نہیں پا سکتے۔

لیکن ان کا کلام زندہ جاوید ہے۔ دن اور مہینے۔ برس اور صدیاں گذرتی رہیں گی لیکن یہ چمن ہمیشہ شاداب رہیگا۔ ان پھولوں کی نکہت، ان گلوں کی رنگت، ان کلیوں کی مہک، ان غنچوں کی چٹک، ہمیشہ قائم و برقرار رہے گی۔ ان کے کلام کی تفسیریں لکھی جائینگی۔ لوگ اسے آنکھوں سے لگائیں گے اور دل میں جگہ دینگے۔ اپنے غم کے لمحات میں اس سے سکون حاصل کرینگے، نااُمیدی کی گھڑیوں میں اس کا سہارا لینگے، جب کوئی راہبر اور راہ نما نہ ہوگا وہ اسی کی مدد سے اپنی راہ تلاش کریں گے، "آہ! صحرا بھیانک اور تاریک ہے۔ راستہ پُرخطر اور خاردار، نہ منزل نظر آتی ہے نہ میر کارواں ہے لیکن دور سے کچھ روشنی معلوم ہو رہی ہے۔ اسی کے سہارے ہم منزل پر جا پہنچیں گے۔"

علامہ موصوف کے مقبرے کی تعمیر کا اہم مسئلہ درپیش ہے۔ علامہ کے پرستار اُن کی آخری نشانی چاہے کتنی شاندار تعمیر کریں مرحوم کی روح اس سے شاد نہ ہوگی۔ وہ اپنے معتقدات میں خالص حجازی تھے اور یہ چیز عجمی ہے۔ اس سے زیادہ مناسب تو یہ ہوگا کہ اقبالؔ اکیڈیمی کے خیال کو عملی جامہ پہنا کر ان کی تعلیم اور فلسفہ کے سلسلہ کو جاری رکھا جائے۔ یہ فلسفہ اور ادب، ملک اور ملّت کی سب سے بڑی

خدمت ہوگی۔

موسم گرما کی تعطیلات کے بعد ہماری جامعہ ۱۲؍ جولائی کو کھلی، جامعہ کے نئے عہدہ داروں میں آنریبل سر شاہ محمد سلیمان، جج فیڈرل کورٹ وائس چانسلر اور ہز ہائنس نواب صاحب رامپور پرو چانسلر منتخب ہوئے۔ شاہ صاحب موصوف ہندوستان کے مسلمانوں میں مسلمہ قابلیت اور صلاحیت کے مالک ہیں۔ سائنس، لٹریچر، قانون ہر چیز پر قدرت کے ساتھ انتظامی معاملات میں بہترین شہرت رکھتے ہیں۔ آپ کا انتخاب جامعہ کے مفاد کے لئے ایک نیک فال ہے۔

نواب صاحب رامپور کے انتخاب نے علی گڑھ اور رامپور کے علم دوست فرمانرواؤں کے قدیم تعلقات کی تجدید کی ہے۔ نواب صاحب کی علم نوازی اور علی گڑھ سے ہمدردی کے پیش نظر ہمیں یقین ہے کہ یونیورسٹی کی اکثر مشکلات حل ہو جائینگی۔

ہمارے ہر دل عزیز پرو وائس چانسلر پروفیسر اے۔ بی۔ اے حلیم صاحب بھی دوبارہ منتخب ہوئے آپ طلبا اور اساتذہ دونوں کے حلقوں میں عزیز ہیں۔ اور مسلمانوں کی اس مرکزی درسگاہ کے تعلیمی نظم و نسق کے ذمہ دار ہونے کے پوری طرح اہل ہیں۔ حلیم صاحب جس محنت اور انہماک سے بغیر کسی معاوضہ کے یونیورسٹی کی یہ خدمت انجام دے رہے ہیں وہ اُن اصحاب کے لئے قابل غور ہے جو مسلمانوں پر اور اس درسگاہ پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ یہاں ایثار اور قربانی کرنے والوں کی کمی ہے۔

ہم ان سب کی خدمت میں میگزین کی جانب سے مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

بیجا نہ ہوگا اگر ہم میگزین اور مضمون نگاروں کے بارے میں ایک مرتبہ پھر اپنے خیالات کا اظہار کر دیں تاکہ وہ حضرات جو پہلی مرتبہ ہماری بزم میں شریک ہوئے ہیں ہمارا ساتھ دے سکیں۔ یہ میگزین مسلمانوں

کی واحد مرکزی علمی درسگاہ کا علمی رسالہ ہے۔ اسے محض مشق اور تفریح کا ذریعہ سمجھنے والے بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ اس کا معیار ہندوستان کے عام ماہانہ رسالوں سے بہت بلند ہے اور اہل الرائے حضرات نے اس کے معیار پر اظہار اطمینان فرمایا ہے۔ ان سب باتوں پر نظر کرتے ہوئے ہمیں اپنی بڑی ذمہ داری کا احساس ہوتا ہے۔ ایک طرف میگزین کے معیار کا خیال دامنگیر ہے دوسری طرف مضمون نگاروں کی دل شکنی کا خوف ہے۔ ہمارے اکثر کرم فرما فرصت کے لمحات میں دل بہلانے کی خاطر قلم برداشتہ چند سطریں چند شعر یا چند صفحے لکھ کر چاہتے ہیں کہ ان کو میگزین میں جگہ دی جائے۔ ان کی یہ محنت ہمارے سر آنکھوں پر۔ لیکن ہم اور آپ دونوں اس کے ذمہ دار ہیں کہ علی گڑھ سے اُردو کا جو رسالہ نکلے اس میں صحت مذاق کے ساتھ صرف ایسے مضامین شائع ہوں جن پر اغیار کو طعنہ زنی کا موقع نہ ملے۔ ظاہر ہے ایسی معیاری چیزیں بغیر محنت اور زحمت کے لکھنا ناممکن ہیں۔ ہمارے ایسے کرمفرما جن کے مضامین میگزین میں درج نہیں ہوئے اگر غور کریں تو یہی نتیجہ نکالینگے کہ مضمون محنت سے نہیں لکھا تھا ورنہ ضرور شائع کیا جاتا۔

یہ بات نظموں اور افسانوں کے سلسلہ میں سب سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔ چند نظموں اور غزلوں کو چھوڑ کر باقی جس قدر چیزیں اشاعت کے لئے موصول ہوئیں وہ معیار سے فروتر تھیں اور ناقابل اشاعت۔ میر تقی کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اُنھوں نے اپنے پست اشعار اس وجہ سے قلمزد نہیں کئے کہ ان کو تکلیف ہوتی ہوگی، اگر کوئی لڑکا ناخلف ہو جائے تو والدین اس کو خارج نہیں کر دیتے۔ یہ سب کچھ درست ہے لیکن کوئی دوسرا شخص اس ناخلف بیٹے کو نمونہ بنا کر دوسروں کے سامنے پیش نہیں کر سکتا۔

افسانوں کا معیار روز بروز گرتا جارہا ہے۔ شاید اس وجہ سے کہ لوگ لکھتے وقت افسانہ کے آرٹ اور مقصد کو قطعاً نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اگر ہمارے کرمفرما بکثرت معیاری افسانے پڑھیں اور اس فن پر بعض کتابیں دیکھیں اور مسلسل مشق کے بعد جب اپنے افسانوں کو اعلیٰ معیار کے قریب پہنچا لیں اس وقت اشاعت کا خیال کریں تو ان کے اور میگزین دونوں کے لئے شہرت اور عزت کا باعث ہوگا۔

ہمیں خود افسوس ہے کہ اس مرتبہ نظموں اور افسانوں کا حصّہ بہت کم ہے۔

اس کے ساتھ ہی ہمیں مسرت ہے کہ تنقیدی اور تحقیقی مضامین کے اعتبار سے ہمارا رسالہ نہ صرف تعلیمی اداروں کے رسالوں سے بہتر ہے بلکہ ملک کے بہترین رسائل میں شمار ہوتا ہے ہمارے میگزین کی تنقیدیں اور تحقیقی مقالات عام طور پر بہت مقبول ہیں۔ اگر یہی روش قایم رہی تو وہ دن دور نہیں جب یہ چیزیں ہمارے میگزین کا طرۂ امتیاز بن کر ہمارے اور ہماری مادر درسگاہ کے لئے باعث فخر ثابت ہونگی۔

کسی چیز کا بار بار کہنا اکثر سننے والوں کے لئے تکلیف دہ ہوجاتا ہے۔ لیکن بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ ان کا اعادہ ناگزیر ہوتا ہے۔ چنانچہ اُردو ہندی کا مسئلہ اسی قبیل کا ہے۔ کئی سال سے اس اختلاف نے ہنگامی صورت اختیار کرلی ہے اور شدتِ اختلاف سے تباہ کن نتایج کا امکان ہے لیکن اس کی طرف سے آنکھیں بند کرلینا بھی اب ناممکن ہوگیا ہے۔

وہ لوگ جو ہندی کی آڑ میں سنسکرت کو زندہ کرکے قدیم ہندو تہذیب کو حیات نو بخشنے کی فکر میں ہیں اُردو کو قربانی کا بکرا سمجھتے ہیں۔ اُنھیں اس سے غرض اور مطلب نہیں کہ اُردو مسلمانوں کی فرقہ وارانہ زبان ہے یا ہندوستان کی مختلف قوموں اور فرقوں کے باہمی ربط وارتباط سے ظہور میں آئی ہے ان کو تو صرف اپنے حلوے اور مانڈے سے کام ہے، مردہ چاہے جنت میں جائے یا دوزخ میں۔ ان کو اب یہ یقین ہوگیا ہے کہ ہندوستان میں صرف اُردو ہی ایسی لچکدار اور وسیع زبان ہے جو یہاں کی عام ملکی زبان ہوسکتی ہے اور اس صورت میں ہندی کی راہ میں حایل ہوگی۔ چنانچہ ہندوستان کی تمام بولیوں کو چھوڑ کر وہ صرف اُردو کی جڑ کاٹنے پر آمادہ ہیں۔

ہندی کے اس پروپیگنڈے کو حکومت کی امداد حاصل ہے اس کا ثبوت یہ ہے کہ یو۔پی میں گذشتہ سال ستمبر کے بجٹ میں جو روپیہ Preservation and Publication of Ancient Manuscripts

و

کی مد میں رکھا گیا تھا وہ سنسکرت کالج بنارس اور چوکھمبا سنسکرت سیریز کے لئے تھا۔ مدارس میں ہندی کے خلاف جو مظاہرے ہوئے وہ قانوناً ناجائز قرار دیدیئے گئے اور بیچارے تامل والوں پر جبر و قہر کی بجلیاں گرائی گئیں۔ اگر ملکی حکومت کے ابھی سے یہی لیل و نہار ہیں تو آئندہ جو کچھ اُمید ہونا چاہیئے وہ ظاہر ہے۔

کانگریس کے سالانہ اجلاس کے موقع پر جو خطبہ سبھاس چندر بوس کے نام سے پڑھا گیا تھا اس میں اس قدر سنسکرت کی ثقالت تھی کہ خود صدر صاحب کو پڑھنے میں دقت محسوس ہو رہی تھی اور شاید آچاریہ نرندر دیو لقمہ دیتے جا رہے تھے۔

رسالہ ہندوستانی کی زبان اب خاص طور پر ہندی والوں کی اس ذہنیت کی ترجمان ہے۔ ڈاکٹر تاراچند جو اس اکیڈیمی کے سکریٹری ہیں اب جو ہندوستانی زبان استعمال کرتے ہیں اس کو عام اُردو بولنے والا تو درکنار اچھی خاصی ہندی جاننے والا بھی نہیں سمجھتا۔ اس کا مقابلہ آپ ڈاکٹر صاحب کی چند سال قبل کی تحریروں سے کیجئے اور پھر خود فیصلہ کر لیجئے۔

ان چیزوں سے ہٹ کر ایک اور طرف آیئے جو سب سے کارآمد اور سب سے خطرناک ہے۔ میری مراد سینما سے ہے۔ پریس اپنے تمام ذرائع اور وسائل کے باوجود اس قدر طاقت کا مالک نہیں ہے جو سنیما کو حاصل ہے اس کا قبضہ ہزاروں کے دلوں اور زبانوں پر ہے۔ اس بازار کا جو حال ہے وہ بھی بیحد عبرتناک ہے۔

یونیورسٹی کھلنے کے بعد اس مرتبہ قصداً روزانہ فلم دیکھا گیا اور صرف اس خیال سے کہ زبان کا مطالعہ اور تجزیہ کیا جائے یقین مانئے ۹۰ فیصدی الفاظ خالص سنسکرت کے استعمال ہوتے ہیں فلم ہندوستانی کہلاتے ہیں اور زبان ہندوستانی۔ جو الفاظ استعمال ہوتے ہیں ان کی جگہ بہت آسانی سے اُردو کے

بہترین لفظ جو فارسی اور عربی سے کوسوں دور ہیں مل سکتے ہیں۔ لیکن یہاں تو ہندی نہیں سنسکرت کے زندہ کرنے کا سوال درپیش ہے۔ اور ہم سب جو اُردو بولنے پر ناز کرتے ہیں ان تصویروں کو دیکھتے ہیں۔ ان سے محظوظ ہوتے ہیں اور رفتہ رفتہ زبان کے اثر کو قبول کر رہے ہیں۔

فاعتبروا یا اولی الابصار

اس کی صرف ایک صورت ہے کہ اب ہم بھی منظم ہو کر مدافعانہ جنگ کے لئے تیار ہو جائیں۔ اسلامی تعلیم بھیڑ کے لئے تھیٹر اور گھونسنے کے لئے گھونسا ہے، اگر یہ خیال ہو کہ ہم جماعتی حیثیت سے کمزور ہیں اور اس جنگ کے لایق نہیں تو یقین رکھئے کہ آپ کی اسی کمزوری کی بنا پر آپ کی جماعتی حیثیت ایک دن فنا ہو جائیگی اور آپ "عبداللہ" کی بجائے "ایشور داس" نظر آئینگے۔

اس جنگ کی کیا صورت ہوگی، اس پر زیادہ غور و فکر کی انفرادی ضرورت نہیں، گذشتہ سال جب انجمن ترقی اُردو کے زیر اہتمام علی گڑھ میں اُردو کانفرنس ہوئی تھی تو یہ اہم کام انجمن کے سپرد کیا گیا تھا۔ انجمن کے معتمد اور اُردو کے دیرینہ خادم مولوی عبد الحق صاحب نے اس کے متعلق تجاویز تیار کرلی ہیں اور ان پر عمل بھی شروع ہو گیا ہے۔ انجمن کا مرکزی دفتر عنقریب دہلی آجائیگا اور پھر یہ سلسلہ پورے نظم و اہتمام سے چلے گا۔ اس وقت آپ کو اپنا فرض ادا کرنا ہے۔ وقت کی اہمیت اور اپنی ذمہ داری کا احساس کیجئے اور برائے خدا تیار ہو جائے۔

گذشتہ سال شعبہ اُردو نے تعلیم بالغان کا ارادہ کیا تھا، لیکن یہ تجویز بعض وجوہ سے آج تک عملی جامہ نہ پہن سکی۔ اس میں کس کا تساہل تھا؟ اس کے متعلق ہم اپنے خیالات کا اظہار مناسب نہیں سمجھتے، اس وقت ضرورت کام کرنے کی ہے۔ گھر میں پھوٹ پڑی تو سنبھلنا دشوار ہے۔ بہرحال

مسلم ارادہ ہے کہ تعلیم بالغان کا سلسلہ شروع کیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی دیہات اور قرب وجوار میں اُردو لکھنے پڑھنے کا کام شروع کیا جائیگا۔ اس کے لئے بعض ایثار کرنے والے طلباء کی ضرورت ہے جو اپنا تھوڑا سا تفریحی وقت اس اہم خدمت کے لئے نکال سکیں ہم ایسے ہمدردوں سے ملنے کے لئے چشم براہ ہیں۔

کوائف جامعہ کا سلسلہ ہم نے انسٹیٹوٹ گزٹ کے لئے مناسب سمجھا ہے۔ صرف بعض اہم باتوں کا تذکرہ میگزین میں مناسب ہے۔ گذشتہ ماہ میں انجمن اسلامی تاریخ وتمدّن کے زیر اہتمام ہمارے محترم ڈاکٹر امیر حسن صاحب صدیقی بی۔اے۔آنرز۔ پی۔ایچ۔ڈی (لنڈن) کی کوشش سے اسلامی ہفتہ منایا گیا اور باہر سے علمائے کرام اور مقررین نے تشریف لاکر اپنے مقالات اور تقاریر سے طلباء کو مستفید فرمایا۔ اس سلسلہ میں ایک نعتیہ مشاعرہ بھی ہوا تھا جو بخیر وخوبی ختم ہوا۔

نئے سشن کی ابتدا میں ہمارے Proctorial Department کو بہت کام کرنا پڑتا ہے۔ اس سال کے سینئر جناب حبیب الرحمٰن صاحب حبیب بی۔اے (علیگ) جس قدر تن دہی اور جانفشانی سے کام کر رہے ہیں قابل ستائش ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ نئے اور قدیم طلباء دونوں کے حلقوں میں اس انتخاب کو پسند کیا گیا ہے۔

اپنی بعض مصروفیتوں کی وجہ سے میگزین کی تمام ذمہ داری معاون مدیر آفتاب احمد صاحب کے سر ڈالنا پڑی۔ سوائے بعض انتظامی معاملات کے میں اس اشاعت میں میگزین کی کوئی خدمت نہیں کرسکا، مضامین کے انتخاب کے بعد میں نے طباعت اور اشاعت کے تمام مراحل آفتاب صاحب کی ذمہ داری پر چھوڑ دیئے، اور آفتاب صاحب نے بھی جس ذوق وشوق سے اس کو انجام تک پہنچایا اُس کا شکریہ مجھے اور آپ دونوں کو ادا کرنا ہے۔ آنرز فائنل کی محنت کے ساتھ یہ مزید بار جس میں آفتاب احمد صاحب کو دلچسپی

بھی رہی اور مصروفیت بھی (اور کبھی کبھی گھبراہٹ بھی) اُٹھانا انھیں کی ہمت تھی جو میگزین اس ضخامت کے باوجود وقت پر نکل آیا۔

میگزین کی اس اشاعت میں جو خوبی ہو اس کے شکریہ کے مستحق آفتاب صاحب ہیں اور خامی ہو تو میرے حساب میں لکھ دیجئے اور اگر از سر تا پا ناپسند ہو تو آپ اپنے ذوق کی داد دیجئے۔

اگست ۳۸ء

لیث

مرثیہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ

از قاضی غلام سجاد صاحب بسمل

اے گریہ خون نمائے یکے آب دیدہ را — اے آہ شعلہ زن دل دوری کشیدہ را
زنہار دل بسینہ بجز خون مردہ نیست — گر آب و رنگ نو ندہد آب دیدہ را
امشب کہ رفتہ ز انجمن ما کہ - آفتاب — داغ دل است صبح گریباں دریدہ را
نے نے کجا است صبح کہ صد پارہ دل ز آہ — بشگافت سینہ فلک سر کشیدہ را
اقبال چیدہ دامن خویش از دیار ما — وستم رساد دامنِ آن برگزیدہ را
چوں اضطرابِ عشق نیا موختیم از او — از ما رمید و برد دلِ آرمیدہ را
دلہا بہ گریہ رفت و بدلہا تو بودہٗ — جوئیم قطرہ قطرہ اشکِ چکیدہ را

رفتی مگر کہ پیش از ایں دل نباختیم
باز آ کہ اضطرابِ غمے شیوہ ساختیم

باز آ کہ بے تو روے بحرماں نہادہ ایم — اُمید را عدوے دل و جاں نہادہ ایم
باز آ کہ بے تو درسِ تو از یاد رفتہ است — صد اخگر اشک یاس بہ داماں نہادہ ایم
باز آ کہ بے تو شکِ شبِ تیرہ روزِ ما است — گوہر ہا بچاک گریباں نہادہ ایم
باز آ کہ بے تو راہ بجائے نمی بریم — گامے بہ اتباع تو آساں نہادہ ایم
باز آ کہ ما ہنوز نفہمیدہ کارِ عشق — چوں مرگِ قلب دردِ فراواں نہادہ ایم
ایں دردِ دل بہ ہمتِ ما سازگار نیست — نسیان درد صورتِ درماں نہادہ ایم
از ما اگر رمیدہٗ از یاد ما مرم — یادِ تو خویش را سر و ساماں نہادہ ایم

سیل سرشک یاس رود خوش بروئے ما
کاں آب رفتہ باز نیاید بجوئے ما

تا بودهٔ بدهـر تو لا نمودهٔ | باخویش و غیر مهر و مدارا نمودهٔ
دلها ز زنگ کینه مکدر نخواستی | عمرے جلائے آئینهٔ ما نمودهٔ
میخواستی که پائے ببام فلک نهیم | دل را بخویشتن رسی ایما نمودهٔ
راز درون پرده نپوشیده ز ما | ربط خدا رسی و خودی وانمودهٔ
ما را بطور همت عالی کشیده | تا بوده همیں ید بیضا نمودهٔ
دیگر ز رفتن تو زپا افتاده ایم | دانی چه فتنه است که برپا نمودهٔ
ما و هزار کاوش پنهاں و آرزو | تو مرگ را بسم پیدا نمودهٔ

آرے نیاز شکستن دلها زیاں نیست
آں مے که خم شکست و نریزد ازاں نیست

در ماتمت فریب ز خود خورده ایم ما | با مردنت چه کار مگر مرده ایم ما
مرگ است زیستن به ادائے که زیستیم | خیر است تا ز زیستن آزرده ایم ما
ایں خیر را به پلهٔ میزان خود نهیم | پرسند اگر ز ما که چه آورده ایم ما
باشد که عهدِ فتنه هم اینجا بسر رسد | چوں عهد خود به فتنه بسر برده ایم ما
باشد بحشر روے به افروختن دهد | صهبائے اشک کاں ز دل افشرده ایم ما
زاں دردِ دل که داشته بخشِ ما نما | زاں رو که هم به درد تو پے برده ایم ما
گاهے نگر بزمرهٔ لم یلحقوا بهم | بشنو ز ما نگوئے که افسرده ایم ما

زاں بزم هم نگاه به قلبِ حزیں فگن
یک جرعه زاں شراب خودی بر زمیں فگن

هاں اے عزیز رفته خدایت کفیل باد | در خلد بهره تو عطائے جزیل باد
با ما هر آنچه کرده از لطف و مرحمت | بدلش ترا ز صد نعم بے عدیل باد

تو ہر چہ خواستی بیقین یافتی بخلد | بر تو مزید رحمتِ ربِ جلیل باد
نقش قدم کہ ہست ترا در رہ طلب | دائم جہاں راہ رواں را دلیل باد
جاوید ہمچو تو بجہاں نام آورد | مقسوم او سعادت و عمر طویل باد
بر روئے خلق ور چمنستانِ زندگی | چوں گل شگفتہ روئے ز خلقِ جمیل باد
وردہر فارغ از غم دنیائے دوں بود | غمخوار اہل ملت پاک خلیل باد

ما ہم چو عہد زندگی خود بسر بریم
خط از معیت تو بعمر دگر بریم

بربست رخت خویش چو اقبال ازیں جہاں | صبرم ز دل ربود غمِ جاں گداز من
گفتم بنالہ غمے از دل بروں کنم ! | دل خود بیاد رفت و غمش جاں نواز من
جانم ز خویش رفتہ بخلد بریں رسید | تا باز اردش بفسوں نیاز من
سعی نیاز بیں چہ قدر کارِ پیش برد | پیشش نہاد آئینہ از سوز و ساز من
زاں سوز و ساز من نگہش بر من اوفتاد | ہم زاں نگاہ کرد دلش میل راز من
گفت ترا کہ راہ نمود است سوئے ما | گفتم مگر ہمیں نگہ امتیاز من !
گفتا را متیاز بخود بے بری اگر | از من بود کہ واہی اے ہرزہ تاز من
سلطاں بدست آرو بیر تا حریم ناز | دل را چہ بستہ تو بزلفِ ایاز من
گفتم فسردگی دلم را علاج چیست | گفت از نسیم شوق نگر اہتزاز من
گفتم کہ شوق با غم دل سازگار نیست | گفتا بیاد آر ادائے نیاز من
غمہا فزود - ماند نہادم نیاز عشق | ہم آں نیاز و فطرت عشق است ناز من

۱۸۷۶ء سال پیدائش علامہ مرحوم | سنہ ۱۹۳۸ء سال رحلت

از آب دیدہ بر سر آتش نشستنے　　　بودے رہیں ہر نفس من گداز من

دانستنے ز رہبری شوق مضطرب　　　روزے شود قرین حقیقت مجاز من

نامم درایں دیار بہم اقبال ثبت شد　　　تا شد ہوائے مرحمتے کارساز من

۱۳۴ + ۱۸۰۴ ۱۹۳۸ء

گفتم ز بزم دل شدگان چوں رمیدہ　　　اے یاد تو انیس شباں دراز من

گفتا کہ شعر حضرت حافظ شنیدہ　　　کاں فاش کرد در ہمہ آفاق راز من

زاں شعر گر برقص در آیم عجب مکن　　　کز ہم گسستہ دام غم دلگداز من

۱۲۴۱ تخرجہ

بالا بلند عشوہ گر سرو ناز من　　　کوتاہ کرد قصہ عمر دراز من

۲۵۹۸ — ۱۲۴۱ = ۱۳۵۷ھ

بس شنیدہ بمن اقبال تاچہ گفت　　　داغم کہ پا بروں نکشی از مجاز من



پروفیسر ابوبکر احمد حلیم
پرو وائس چانسلر

بیرا

پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

میرے حافظہ کا عجیب حال ہے یعنی میں جس چیز کو یاد رکھنا چاہتا ہوں وہ یاد نہیں رہتی اور جو کچھ پہلے سے یاد ہوتا ہے اسے عین وقت پر بھول جاتا ہوں۔ ایسی حالت میں جب الجھن بڑھتی ہے تو پھر کوئی ایسی بات یاد آجاتی ہے جس کو قطعاً یاد نہ آنا چاہیئے تھا لیکن موقع ایسا ہوتا ہے کہ کچھ نہ کچھ کہنا ہی پڑتا ہے اسلئے میں کہہ گذرتا ہوں۔ یہ تو میری کمزوری ہوئی ممکن ہے آپکی بھی کوئی ہو، اس قسم کی کمزوریاں ایک دوسرے سے ٹکراتی ہیں تو نتائج عموماً نہایت سنگین ہوتے ہیں اسلئے میری درخواست ہے کہ اگر مجھ سے کوئی ناواجب بات سرزد ہو جائے تو آپ بُرا نہ مانیں۔ میں بھی بُرا نہ مانوں گا۔ لیکن اگر آپ سے بغیر بُرا مانے رہا نہ جائے تو پھر مجھ سے رجوع کر لیجئے گا۔ بہت ممکن ہے ہم آپ اپنی اپنی غلطیوں پر نادم ہو جائیں اور بات جہاں کی تہاں رہ جائے۔

تو میں بات یہ کہنا چاہتا تھا کہ مجھے عرصہ سے ایک انگریزی مثل یاد تھی جسے میں بھول گیا ہوں لیکن وہ غالباً کچھ اس قسم کی تھی۔

A 'Sahab' is known by the 'beara' he keeps.

اگر میری یاد دوبارہ غلطی نہیں کرتی تو اس کا مفہوم یہ ہے اور بقول ریڈیو والوں کے ہمارے دیہاتی بھائیوں نے اپنا اپنا باجا بند نہ کر لیا ہو تو اس مثل کو یوں سمجھ لیں کاٹھ کے میاں پورا کا گلیچا یعنی کاٹھ کے میاں ہونگے تو غالیچہ بھی پیال کا ہوگا۔ اسی کو عربی میں جیسی روح ویسے فرشتے بھی کہتے ہیں۔

یہاں آپ جائز طور پر مجھ سے یہ توقع رکھتے ہونگے کہ بیروں کے ساتھ ساتھ 'صاحب' کے بارے میں بھی مجھے کچھ بتا دینا چاہئے۔ اگر آپ یہ توقع نہیں رکھتے تو یہ آپ کا قصور ہے میں اپنے فرض سے کیوں باز آؤں مجھے یہ نہیں معلوم کہ آپ کا کبھی صاحب یا بیروں سے سابقہ بھی پڑا ہے یا نہیں بشرطیکہ آپ خود صاحب یا بیرا نہ ہوں۔ ورنہ ممکن ہے میں بتاؤں کچھ اور آپ سمجھیں کچھ۔ اور یہ تو آپ جانتے ہیں کہ اسی قسم کی غلط فہمی میں مبتلا ہو کر اکثر لوگ شادیاں کر لیتے ہیں اور بعضے اس سے بھی آگے بڑھ جاتے ہیں یعنی شادی منسوخ کر لیتے

ہیں۔ لیکن آپ لوگوں کے پرائیوٹ معاملات سے مجھے کیا سروکار تو بھائی رام لال' اصل بات تمھارا سمجھنا ہے نہ کہ میرا سمجھانا' اللہ اللہ خیر سلا!

تو میں کہنے یہ جا رہا تھا کہ صاحب اور بہرہ میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے معزز بہرہ صاحب' کہلاتا ہے اور ادھوڑی اسٹر صاحب' بہرہ۔ 'صاحب آپ نے بہت سارے دیکھے ہونگے۔ ان کی بہت سی اقسام ہیں جن پر علیحدہ علیحدہ اظہار خیال کرنا ناممکن ہے۔ ایک قسم البتہ عام ہے جس کو آپ یوں سمجھ لیجئے جیسے

"صاحب' میڈ ان جاپان"

لیکن یاد رکھئے اور گواہ رہیئے کہ میں جاپانی صنعت پر اظہار خیال کرکے جاپان کی دشمنی مول لینا نہیں چاہتا کیونکہ مجھے بھی زیادہ عقلمند لوگوں کا خیال ہے کہ جاپان کی ہر چیز سستی ہوتی ہے الا اس کی دشمنی۔ یہی سبب ہے کہ آج بڑی سے بڑی طاقت والا بھی جاپان کی اس پیداوار کی قیمت ادا کرنے پر آمادہ نہیں ہے۔

بہرحال ہم کو تو اپنے 'صاحب' سے سروکار ہے جاپان اور آپان سے خواجہ صاحب نپٹیں۔ ہاں تو آمدم برسر صاحب'۔ 'صاحب' عام طور پر ان لوگوں کو کہتے ہیں جو صبح آنکھ کھلتے ہی بغیر کلی کئے چائے پی لیتے ہیں اور دوسروں کی بیوی کا اپنے باپ سے زیادہ خیال رکھتے ہیں۔ جتنا بڑا صاحب ہوگا اتنا ہی اس کا بیت الخلا اس کی چارپائی سے قریب تر اور بھائی بند دور تر ہونگے۔ میرے ایک دوست تھے صاحب کا ڈفنیشن یا تعریف ان الفاظ میں کرتے تھے۔

خود نالائق ہیں۔ بیوی پردہ نہیں کرتیں

لیکن آپ مجھے معاف کریں' مجھے اندیشہ ہوتا ہے کہ میں کچھ بہکنے لگا ہوں اسلئے صاحب کو تو میں ان کے حال پر چھوڑتا ہوں اور بہرے پر آجاتا ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ بہرہ کو سمجھنے کے لئے 'صاحب' کو پہچاننا ضروری تھا۔ اسلئے میں نے صاحب کا تذکرہ کردیا ورنہ آپ یقین مانئے مجھے صاحب سے دور دور کا واسطہ نہیں۔ اگر کوئی صاحب' میری تقریر سن رہے ہوں تو میں ان کو یقین دلاتا ہوں کہ میری نیت بخیر ہے کیونکہ بزرگوں کا قول ہے نیت شب بخیر!

معلوم نہیں کیا سبب ہے کہ جہاں کہیں کوئی پٹھہ یا پیٹی والا بہرہ موجود ہو وہاں میں کچھ ایسا محسوس کرتا ہوں

جیسے یا تو کوئی تصور کر کے آیا ہوں اور چاہتا ہوں کہ قبل اس کے سزا بھگتنی ہو میں معافی مانگ لوں یا پھر کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میں کسی ایسے مقام پر ہوں جہاں بھوت پریت کا دخل ہے اور بہت ممکن ہے میں جن صاحب کا مہمان ہوں یا جن سے بات کر رہا ہوں وہی بھوت ہوں یا پھر میں خود بھوت ہوں لیکن آدمی ہونے کا شبہ بھی دل میں ہے۔

لیکن میں اب قطع کلام کرتا ہوں۔ آپ کا نہیں اپنا۔ بات یہ ہے کہ میں بات کرنے کا ذرا زیادہ عادی ہوں اور مجھے ریڈیو اسلئے اور زیادہ پسند ہے کہ اس میں بات کرنے کا خوب موقع ملتا ہے۔ آرام سے بیٹھکر بغیر کسی خوف و خطر یا شرم و حیا کے گفتگو کیۓ جائیے۔ نہ قطع کلام کا اندیشہ نہ پٹ جانے کا خطر۔ تو میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تنہائی میں خود بخود گفتگو کیۓ جانا کچھ اچھی علامت بھی نہیں ہے۔ لیکن اگر گفتگو کرنے کی بدعادت پڑہی جائے تو خیر اسی میں ہے کہ لوگ موجود نہ ہوں ورنہ یہ عادت اس قسم کی ہے کہ اکثر بدقسمت گفتگو کرنے والے کو یہ محسوس کرنے کی بھی مہلت نہیں ملتی کہ کب بات ختم ہوئی اور کب کچھ اور شروع ہو گیا!

اچھا اس قصے کو چھوڑئیے اور ایک دفعہ پھر بیرے پر آجائیے اصل یہ ہے کہ بیروں کے ساتھ مجھے کچھ ایسے واقعات پیش آئے ہیں کہ اب مجھے ان کا تذکرہ کرتے ہوئے بھی ڈر معلوم ہوتا ہے اور باوجود اس کے کہ مجھے اس کا یقین ہے کہ اس وقت میرے آس پاس کوئی بیرا نہیں ہے بلکہ میرے مکرم اناؤنسر صاحب ہی ہیں جن کے بارہ میں مجھے یہ اندیشہ نہیں ہے کہ ان کو بیروں کے ساتھ کچھ ایسی ہمدردی ہوگی کہ وہ حقوق میزبانی فراموش کر جائیں گے۔ پھر بھی ڈرنے والا ڈرتا ہی ہے اس کے لئے ضروری نہیں ہے کہ کوئی ڈرانے والا بھی موجود ہو۔ بہرحال میں اپنا قصہ شروع کرتا ہوں، سب سے پہلا سابقہ مجھے اپنے بچپن میں ایک بیرے سے پڑا۔

مجھے سول سرجن سے ایک سارٹیفکٹ لینا تھا۔ ڈرتے ڈرتے سول سرجن کی کوٹھی پر پہونچا۔ اندر سے ایک شخص برامد ہوا، سفید صافا، کمر میں خوب چوڑی پیٹی، دونوں میں R.I.E قسم کا پیتل کا طغرا لگا ہوا۔ داڑھی چڑھی ہوئی، مونچھیں گری، پیٹ نکلا، چہرا بھرا۔ میں نے سمجھا سول سرجن نہیں تو انکے حقیقی قسم کے کوئی بزرگ ہیں۔ ابھی میں ان سے پورے طور پر ڈرنے بھی نہ پایا تھا کہ جھک کر انھیں سلام کیا اور گلا صاف کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بولا،

مجھے ایک سارٹیفکٹ چاہیئے انھوں نے غالباً اس قسم کے تماشے اکثر دیکھے تھے اسلئے بغیر کسی جھجک کے فرمایا "ٹکٹ لاؤ"، میں نے کہا میں تو پیدل آیا ہوں جھنجلا کر بولے "کارڈ" میں نے کہا آج اتوار ہے۔ اس پر وہ مسکرا پڑے اور کہا بیٹھ جاؤ ابھی صاحب حاضری پر ہے۔ میں نے سوچا الٰہی خیر، وہ صاحب کیسے ہونگے جن کو یہ (ج.ا.م.) قسم کا بڑا صاحب بھی صاحب کہتا ہے اور یہ صاحب لوگ کیسے ہوتے ہیں جو اتوار کو بھی حاضری دیتے ہیں۔

میں بیٹھ گیا، کہنے لگے میری فیس لاؤ، سول سرجن کے لئے میں جو فیس لایا تھا ان کے نذر کردی انھوں نے اس میں سے ایک روپیہ نکال کر بقیہ مجھے واپس کردیا اور کہا باقی فیس ۱۱ بجے ہسپتال میں لانا۔ میں ہسپتال پہنچا تو انھوں نے دروازہ ہی پر میرا خیر مقدم کیا۔ میں سول سرجن سے نہ مل پایا لیکن انھوں نے نام وغیرہ پوچھ کر سارٹیفکٹ لاکر دیدیا اور بقیہ فیس بھی نہ لی۔ میں نے بغیر فیس کا سارٹیفکٹ لینے میں تامل کیا لیکن مارے ڈر کے واپس آیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ سارٹیفکٹ بالکل کھرا تھا البتہ جن کو میں سول سرجن سمجھتا تھا وہ ان کے بیرے تھے!

دوسرا واقعہ سنئے، ایک بہت بڑے رئیس تھے جو افیوں کھاتے تھے اور بیرا رکھتے تھے۔ خود کبھی باہر نہیں جاتے تھے دن رات اپنے محل میں دنیا کی بے ثباتی اور افیون کی گھلاوٹ پر غور کیا کرتے تھے۔ ان کا بیرا بھی عجیب قسم کا تھا ہر وقت ایسا معلوم ہوتا تھا گویا مرچیں کھائے ہوئے ہے یا بیوی کے قتل کرنے کے منصوبے میں غلطاں پیچاں ہے۔ عید کا دن تھا چار پانچ اصحاب بیک وقت رئیس صاحب سے ملنے آئے سب نے اپنے اپنے ٹکٹ دئے اور بیٹھکر انتظار کرنے لگے بیرا اندر گیا اور کوئی پندرہ بیس منٹ بعد تاش کے پتوں کی مانند سارے ٹکٹ انگلیوں میں لئے ہوئے برامد ہوا۔ ٹکٹ پڑھکر ایک صاحب کا نام پکارا وہ بڑھے، اسنے کہا، سرکار سیر کرنے باہر گئے ہوئے ہیں دوسرے کا نام پکارا وہ بڑھے، بولا سرکار غسل خانہ میں ہیں، تیسرے صاحب کا نام پکارا وہ آگے بڑھے بولا سرکار سو رہے ہیں چوتھے کو آواز دی وہ بڑھے تو اسنے کہا، سرکار رفع حاصات نا دل فرما رہے ہیں پانچویں کو پکارا وہ بڑھے تو اس نے کہا سرکار نے فرمایا ہے کہ سرکار مرگئے۔

ایک دفعہ مجھے اپنے ایک عزیز دوست کا جو پولیس میں ایک معزز عہدہ پر مامور تھے مہمان ہونا پڑا ان کے

ہاں ایک بیرا تھا۔ اس نے میری شکل دیکھکر کچھ ایسے تیور کا اظہار کیا جس سے ممکن ہے آپ کا خون اُبلنے لگتا کچھ ایسے بھی ہیں جن کا خون جوش مارنے لگتا میرا تو صرف خشک ہونے لگا۔ پولیس افسر کے بیرے اور دیہاتی زمیندار کے گھوڑے ایسی چیزیں نہیں ہیں جن سے کسی کو ہر روز سابقہ پڑے اور وہ ریڈیو پر تقریر کرنے کے قابل رہ جائے۔ میں جب تک مہمان رہا اس بھلے مانس بیرے نے میرا ایک کام نہیں کیا اور یہی نہیں بلکہ جب کبھی میرا سامنا ہو جاتا تو یہ بھنگی بہشتی اور دوسرے نوکروں کو یوں ڈانٹتا اور برا بھلا کہتا گویا روئے سخن میرے ہی جانب ہے۔ آپ جانیں انسان کی جان پر آبنتی ہے تو وہ بزدلی اور شرافت دونوں کو خیرباد کہدیتا ہے خواہ وہ یا اس کی بیوی کتنی ہی تعلیم یافتہ کیوں نہ ہوں۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ مجھ میں بزدلی اور شرافت اتنی موجود ہے کہ اتلے تللے خرچ کرنے پر بھی باقی بچ رہیں لیکن یہ میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ اس بیرے سے نبٹنے کے لئے مجھے ان صفات میں سے کم سے کم ایک کو ضرور خیرباد کہنا پڑے گا اور ضرورت آن پڑی تو دونوں سے ہاتھ دھوؤں گا۔ ایک دن میں نے ان کو اپنے پاس بلایا کہا بھائی میں تمھاری مستعدی وفاداری اور دیانت کا قائل ہوگیا۔ مجھے یقین نہیں ہے کہ تمھاری قابلیت یا کارگذاری کے مطابق تمھیں معاوضہ بھی ملتا ہوگا، آخر تمھیں کیا ملتے ہیں انھوں نے فرمایا ۱۵؎ ۔ میں نے کہا خیر، اگر کبھی تم یہاں کی نوکری چھوڑنے پر مجبور ہو جاؤ تو میرے ہاں آجانا میں تم کو ۲۵؎ اور کھانا دوں گا، سال میں چار جوڑے کپڑے اور آمدرفت کا کرایہ۔ اس گفتگو کے بعد میری ان کی بڑی گہری دوستی ہوگئی۔ جب تک مقیم رہا انھوں نے میزبان سے زیادہ میری خاطر مدارات کی۔ میں واپس آگیا۔ ہفتہ عشرہ ہی کے اندر کیا دیکھتا ہوں کہ یہ صاحب میرے ہاں وارد ہیں۔ اس کے بعد ان سے مجھ سے کیا بات ہوئی اس کا دہرانا بیکار ہے قصہ کوتاہ ہم دونوں ایک نہایت مختصر انٹرویو کے بعد ایک دوسرے سے رخصت ہوگئے اور انھوں نے غالباً میرے بارہ میں وہی رائے قائم کی جو میں نے ان کے بارہ میں پہلے سے قائم کر رکھی تھی۔

ایک دفعہ شب برات کے موقع پر میں اپنے بڑے حاکم کو سلام کرنے گیا۔ ان کے ہاں عجیب عجیب قسم کے بیرے تھے، کوئی موٹا، کوئی پتلا کوئی بڑھا کوئی جوان کوئی نیچا کوئی اونچا لیکن وہ اے آئی آر والی قسم کی چیز مینک کے سامنے اور بیٹھی میں نصب تھی۔ دوسرے یہ کہ اچکن دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ ہر ایک نے دوسرے کی پہن رکھی

ہے یعنی یا تو بہت زیادہ تنگ تھی یا بہت ہی ڈھیلی، بہت زیادہ نیچی یا ضرورت سے زیادہ اونچی، سہ پہر کا وقت تھا اور سب کے سب آتشبازی چھوڑنے میں مصروف تھے، غل غپاڑہ سے ساری کوٹھی سر پر اٹھائے ہوئے۔ میرا حلیہ کچھ ایسا ویسا بھی نہیں ہے کہ لوگ دیکھتے ہی ہنس پڑیں یا خواہ مخواہ بدظن ہو جائیں یہ اور بات ہے کہ تیوہار کے موقع پر لٹھے کا کورا پاجامہ، جاپانی قسم کی شیروانی اک ذرا روغنی چہرہ تھوڑی بہت خود اعتمادی نیا دبا تا ہوا انگریزی وضع کا جوتا جس کو پہنکر یوں بھی لوگ قدم چلنے لگتے ہیں راستہ کنکریلا ہوا ور ہر قدم پر یہ اندیشہ ہو کہ اب گرے اور گھٹنا پھوٹا یا تھوڑی لہولہان ہوئی لیکن اس کے یہ معنی تو نہیں ہیں کہ کوئی بیرا آپکو وہ سمجھے جو آپ بالکل نہ ہوں۔ مجھے اس طرح آتے دیکھکر ان بیروں میں سے ایک جو سب سے جغادری تھا آگے بڑھا، قریب سے دیکھکر میرے اوسان ہی خطا ہو گئے۔ پہلے تو میں نے ذرا اُچک کر اور پھر مڑکر دیکھا کہ کہیں اس کے دونوں طرف پانسات منہ اور اتنے ہی ہاتھ تو نہیں ہیں کیونکہ اس قسم کے لوگ میں نے بعض تیوہاروں کے موقع پر بچپن میں دیکھے تھے چھوٹتے ہی بولا ابھی فاتحہ نہیں ہوئی ہے مغرب بعد حلوا تقسیم ہوگا اس وقت آنا۔ میں نے کچھ احتجاج کرنا چاہا تو بولا صاحب آرام کر رہے ہیں، شور نہ مچاؤ۔ حالانکہ آپ کو میں بتا چکا ہوں کہ یہ سب خود آتشبازی چھوڑ رہے تھے اور شور شغب سے کوٹھی سر پر اٹھائے ہوئے تھے۔ میں نے کچھ اور گفت شنید کرنی چاہی تو اس نے ایک اپنی ہی جیسی کتے سے کچھ سرگوشی شروع کر دی میں اپنی طبیعت سے صلح پسند واقع ہوا ہوں، تیوہار کا دن تھا میں نے یہ نہ چاہا کہ معاملہ کو طوالت دیجائے اور یہ کچھ اچھی بات بھی نہیں ہے کہ کسی ایسے مناقشہ کی چارہ جوئی میں وقت اور روپیہ صرف کیا جائے جس میں فریق ثانی صرف کتا ہو۔ چنانچہ میں نے شاندار پسپائی اختیار کی میرے ایسا کرنے سے گو شور و شغب میں کافی اضافہ ہو گیا تھا لیکن میں نے مڑکر نہ دیکھا کیونکہ کتابوں میں پڑھتا آیا تھا کہ ایسی حالتمیں کوئی مڑکر دیکھتا ہے تو پتھر کا ہو جاتا ہے یا کوئی اور آفت آجاتی ہے۔

میرا خیال ہے کہ یہ مستثنیٰ حالتوں کے سوا بیرا اور بیویوں سے زیادہ مزاج داں کوئی اور نہیں ہوتا فرق صرف یہ ہے کہ بیرا کے مزاجداں ہونے سے مالک کو آرام اور نفع حاصل ہوتا ہے، بیوی کے مزاج داں ہونے سے ذرا شوہر کچھ یوں ہی سا رہ جاتا ہے بیرا کے مزاج داں ہونے سے دنیا میں راحت ملتی ہے اور بیوی کے مزاج

شناس ہونے سے عقبیٰ سنورتی ہے بشرطیکہ عقبیٰ کو بیوی پر ترجیح دیجائے۔

مشکل یہ ہے کہ انسان تنہائی میں بیٹھکر معلوم نہیں کیا کیا سوچتا ہے اور دل سے باتیں کرتے کرتے کہاں پہونچ جاتا ہے۔ ایسی حالت میں بہت ساری باتیں ایسی بھی مُنہ سے نکل جاتی ہیں جو خاصی نازک اور کافی خطرناک ہوتی ہیں ریڈیو نے اُس لطف کو تو زائل کر ہی دیا جو تنہائی میں بیٹھکر دل سے باتیں کرنے میں آتا تھا۔ اب اندیشہ یہ ہے کہ کسی دن مار کھانے کی نوبت نہ آجائے ریڈیو اسٹیشن پر نہیں بلکہ ایسے موقع پر جہاں اکثر کمزور قوی پر غالب آتا ہے۔

میرے موسومہ نواب سر مسعود جنگ (سید راس مسعود مرحوم) کے چند خطوط

(از جناب نصیر الدین صاحب ہاشمی)

سر سید راس مسعود مرحوم کو ملک و قوم سے جیسی کچھ ہمدردی تھی وہ اظہر من الشمس ہے، وہ کون ہے جو ان کے کارناموں سے واقف نہیں اور وہ کون ہے جو ان کی خدمات سے چشم پوشی کر سکے۔

مرحوم کو "ہندوستانی" زبان سے بھی بڑی دلچسپی تھی، اس کی ترقی کی فکر ہمیشہ ان کی دامن گیر رہی، انجمن ترقی اُردو کی صدر نشینی کی حیثیت سے مرحوم نے انجمن کی جو گراں قدر خدمت انجام دی ہے وہ بھولی نہیں جا سکتی، انجمن کی مالی حالت کے بہتر بنانے میں مرحوم نے جو سعی فرمائی وہ ہمیشہ یادگار رہے گی، حق تو یہ ہے کہ انجمن کی مالی حالت مرحوم ہی کی بدولت بہتر سے بہتر ہو گئی۔

مرحوم نے "انتخاب زریں" کی تالیف اور مراثی انیس وغیرہ کی خوشنما اشاعت کی سرپرستی سے اُردو شاعری کی جو خدمت انجام دی ہے وہ فراموش نہیں ہو سکتی، سر سید کے خطوط کی اشاعت بھی آپ کا ایک ادبی کارنامہ ہے، بہر حال اُردو زبان کے محسنوں میں سر راس مسعود مرحوم کا نام جلی حروف میں نظر آتا ہے۔

مولانا عبد الحق بی اے معتمد انجمن ترقی اُردو نے رسالہ اُردو کا مسعود نمبر شائع کر کے ایک ضروری کام کی تکمیل کی ہے، اگر اس میں مرحوم کے خطوط وغیرہ بھی شامل کر دئے جاتے تو بہت اچھا ہوتا۔

جہاں تک میرا خیال ہے مرحوم مسعود اکثر و بیشتر انگریزی میں خط لکھا کرتے تھے، اس طرح ان کے اُردو خطوط نایاب حیثیت رکھتے ہیں، میرے پاس مرحوم کے چند اُردو خط ہیں جن کو یہاں پیش کیا جاتا ہے، اُمید ہے کہ موجب دلچسپی ہونگے۔

سید مسعود مرحوم کے نام اور ان کی تصویر سے میں پہلے پہل اس وقت واقف ہوا تھا جبکہ وہ کان پور

کی مسجد کے مشہور ہنگامہ میں دیگر بیرسٹروں کے ساتھ میدان میں آئے تھے، اس کے ایک عرصہ بعد مرحوم کا تعلق سلطنت آصفیہ کے سررشتہ تعلیمات سے ہوا، اور وہ حیدرآباد تشریف لائے۔

یہاں پہلی مرتبہ میں نے مرحوم کو اس وقت اسٹیشن حیدرآباد پر دیکھا جبکہ ڈاکٹر اے لطفی ناظم تعلیمات حیدرآباد سے رخصت ہو رہے تھے، اس زمانہ میں (۱۳۲۵ف) میں مدرسہ دارالعلوم کی جماعت "مولوی" زیر تعلیم تھا۔ اور دارالعلوم کی انجمن ثمرۃ الادب کی معتمدی کے فرائض بھی مجھ سے متعلق تھے،

انجمن ثمرۃ الادب کے سالانہ جلسہ کی صدارت کی درخواست کے ضمن میں مجھے مرحوم سے پہلی مرتبہ ملاقات کا شرف حاصل ہوا، اس پہلی ملاقات سے جو نقش ان کی محبت اور ہمدردی کا میرے دل پر قائم ہوا وہ کبھی مٹ نہیں سکتا۔

میرے نانا مولوی حسین عطاء اللہ مرحوم کو سرسید احمد خاں علیہ رحمۃ اور سید محمود مرحوم سے ملاقات تھی، جب میں نے اس کا ذکر کیا تو مرحوم نے فرمایا اب اس سلسلہ کی تجدید ہوگئی ہے اس پہلی ملاقات کے بعد میں کبھی کبھی ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا۔

۱۳۲۶ف میں جامعہ عثمانیہ سے متعلق مدرسہ دارالعلوم میں انگریزی تعلیم کا انتظام کیا گیا، اس زمانہ میں میں "عالم" کی جماعت میں زیر تعلیم تھا۔ مرحوم نے مجھے مشورہ دیا کہ میں انگریزی جماعت میں شریک ہو کر میٹرک کا امتحان دے لوں اور پھر جامعہ عثمانیہ کے انٹرمیڈیٹ میں شریک ہو جاؤں، اگر انٹرمیڈیٹ پاس کرلوں تو سب سے پہلے مجھے جامعہ عثمانیہ کی جانب سے یورپ روانہ کیا جائیگا۔

بدقسمتی سے یہ صورت پیدا نہ ہو سکی، بعض وجوہ سے میرا تعلیمی سلسلہ موقوف ہوگیا، اور میں انٹرمیڈیٹ پاس نہ کرسکا، لیکن مرحوم نے ایک دوسرے طریقہ سے مجھے یورپ روانہ کیا،

مرحوم کی کوشش سے مجھے جامعہ عثمانیہ نے "دکن میں اردو" کی تالیف کے صلہ میں یورپ روانہ کرنا منظور کیا اور مرحوم نے سررشتہ تعلیمات سے میرے اخراجات ادا کئے،

میری یورپ کی واپسی کے بعد مرحوم کا تعلق حیدرآباد سے باقی نہیں رہا تھا، چونکہ وہ حیدرآباد سے باہر

تھے اس لئے خط وکتابت کا سلسلہ جاری رہا، اس طرح اس وقت چند خطوط جو محفوظ ہیں وہ ناظرین کی ضیافت طبع کے لئے درج کئے جاتے ہیں،

علی گڑھ

۱۰ر دسمبر ۱۹۲۹ء

ڈیر نصیر الدین

بعد دعا کے معلوم ہو کہ تمھارا خط مورخہ ۴ر دسمبر ۱۹۲۹ء معہ یورپ کے صداقت ناموں کی نقول کے ملا، مجھے یہ دیکھکر نہایت خوشی ہوئی کہ وہاں تمھارے کام کی بابت لوگوں نے اس عمدگی سے تمھارا شکریہ ادا کیا، جس دن سے کہ میں نے یہاں اپنا کام شروع کیا ہے کثرت کار کی وجہ سے ناممکن ہوگیا ہے کہ میں کسی کے خط کا بھی جواب وقت پر دے سکوں۔ لہذا اُمید کرتا ہوں کہ تمھارے خط کے جواب میں جو دیر لگی ہے اس کو معاف کرو گے۔

بد قسمتی سے ہمارے کتب خانہ کی حالت یہاں ایسی عمدہ نہیں ہے جیسی کہ مسلمانوں کے مرکزی درسگاہ کے کتب خانہ کی ہونی چاہئیے، تاہم تم جو کچھ دریافت کرنا چاہتے ہو وہ (Librarian) لائبریرین مسلم یونیورسٹی لائبریری علی گڑھ کو لکھکر دریافت کر سکتے ہو،

مجھے خود اس کا علم ہے کہ جناب نواب سر حیدر نواز جنگ بہادر کو تم میں کافی دلچسپی ہے، اور میری رائے یہ ہے کہ تم اُن سے گاہے گاہے ملتے رہو، اور صاف طرح سے جو کچھ بھی تمھارے مشکلات ہوں اُن کا اظہار اُن کے سامنے کرو، مجھے پورا یقین ہے کہ جس وقت موقع نکلے گا نواب صاحب ممدوح تمھاری مدد کرنے سے دریغ نہ فرمائیں گے۔

خاکسار

سید راس مسعود

بھوپال

۲۲ نومبر ۱۹۳۴ء

ڈیر نصیر الدین ہاشمی

بعد دعا کے معلوم ہو کہ تمہارا عنایت نامہ و کتاب مجھے کل ملے، جب وقت ملے گا تو تمہاری جدید تصنیف کو ضرور پڑھوں گا۔ تم ان چند لوگوں میں سے ہو جو حیدرآباد میں مجھے ابھی تک بھولے نہیں،

یہاں کا نظام تعلیم میں بدلنا چاہتا ہوں، خواہش یہ ہے کہ اس ریاست میں سچی قومی تعلیم جاری ہو جائے افسوس کہ میری صحت ایسی خراب ہوگئی ہے کہ میں اب چار گھنٹے سے زیادہ کام نہیں کر سکتا، جرمنی و اسٹریا علاج کرانے گیا تھا۔ لیکن قلب کی بیماری کا سوا آرام کے اور کوئی علاج نہیں ہے، جو کچھ بھی میری صحت تھی وہ علی گڑھ کے نذر کر چکا۔ یہ صرف نواب صاحب بھوپال کی محبت تھی کہ وہ مجھے یہاں کھینچ لائی، یہ ایک نہایت دانشمند بادشاہ ہیں اور خدا نے چاہا تو ان سے مسلمانوں کو بہت فائدہ پہونچے گا۔ یہ ریاست بھی انشاء اللہ جلد علم کا مرکز بن جائیگی۔

مجھے یہ بتاؤ کہ اب تم کیا کام کرتے ہو اور کیا تنخواہ پاتے ہو، عبدالسلام مرحوم کے والد کو میرا سلام کہدینا، خدا کرے اس مرحوم کے بچے خیریت سے ہوں،

میں ہوں تمہارا سچا خیر طلب

سید راس مسعود

نوٹ:۔ مندرجہ صدر خط خاص سید مرحوم کا قلمی ہے، کیونکہ عموماً وہ اردو خط لکھوایا کرتے تھے۔

بھوپال

۸ دسمبر ۱۹۳۵ء

ڈیر نصیر الدین ہاشمی

تمہارا عنایت نامہ مورخہ ۴ دسمبر ۱۹۳۵ء مجھے ابھی ملا، یہ پڑھکر بڑی خوشی ہوئی کہ ہندوستانی اکیڈیمی

میں اپنا ایک مقالہ پڑھ رہے ہو، خدا مبارک کرے۔

افسوس کہ جس زمانہ میں کہ تم ادھر سے گذرو گے میں بھوپال میں نہ ہوں گا، یہاں سے ۸ دسمبر کو روانہ ہو رہا ہوں اور دوسری تیسری جنوری سے پہلے واپس آنا نہ ہوگا۔ والسلام

میں ہوں تمہارا سچا خیر طلب

سید راس مسعود

بھوپال (سی آئی)

۱۵ اکتوبر ۱۹۳۶ء

برخوردار نصیر الدین ہاشمی۔ تسلیم

تمہارا عنایت نامہ مورخہ ۱۵ ستمبر ملا، کتابوں کی پارسل بھی پہونچی، لیکن انتہائی مصروفیت کی وجہ سے اُن کو ابھی پڑھ نہ سکا۔ اس کا یقین ہے کہ جو کچھ تم نے لکھا ہوگا وہ نہایت قابل قدر ہوگا۔ میری دعا قبول کرو۔ اور میرا سلام عبدالسلام مرحوم کے والد کو پہونچا دو۔

میں ہوں تمہارا خیر طلب

سید راس مسعود

لسانیات

بہ سلسلہ میگزین جولائی ۳۷ء

باب ششم

تخلیطی ساخت کی مشہور زبانیں

محمد ابواللیث صدیقی بی۔ اے۔ آنرز۔ ایم۔ اے (علیگ)

سامی السنہ عالم کی اس قسم میں سب سے مشہور اور قدیم سامی خاندان ہے جس کی نسبت سام بن نوح سے کی جاتی ہے سام اور نوح کے واقعات انجیل اور قرآن میں قصوں کے پیرائے میں مذکور ہیں، اسی قسم کے واقعات ہندوؤں کی مقدس کتابوں میں بھی ملتے ہیں، حال کے ماہرین السنہ ان مختلف کتابوں کے مختلف ناموں کو لسانی اصولوں پر جب پرکھتے ہیں تو اختلاف دور ہو جاتا ہے اور اگر قدرتی لسانی تبدیلیوں کو جو ہمیشہ خاص اصولوں پر ظاہر ہوتی رہتی ہیں نظر انداز کر دیا جائے تو یہ سب نام ایک ہی معلوم ہوتے ہیں اور اس طرح اس قصہ کی اصل کا سراغ ملجاتا ہے۔

بہر نوع طوفان نوح کے بعد جب ان کے بیٹے سام نے دنیا میں دوبارہ آبادی کی بنیاد ڈالی تو بسنے والوں کو قدرتی طور پر زبان کو بھی کام میں لانا پڑا، یہی زبان ان زبانوں کی اصل ہے جو آج سامی کہلاتی ہیں اور جن کے بولنے والے سام کے اولاد میں شمار ہوتے ہیں۔

سامی خاندان میں کچھ مرحوم زبانیں مثلاً آشوری بابلی، عبرانی اور فنیقی اور کچھ زندہ مثلاً شامی عربی اور حبشہ کی بعض بولیاں خاص طور پر قابل ذکر ہیں، عبرانی اور عربی زبانوں نے دنیا کے مذہبی سرمایہ میں معتدبہ اضافہ کیا ہے، یہود، نصاریٰ اور مسلمانوں کے مذہبی صحائف پر یہ زبانیں جس قدر ناز کریں کم ہے۔

ان سامی زبانوں کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ تمام مادّے عموماً سہ حرفی ہوتے ہیں اور یہ تینوں حروف صرفی تبدیلی کی زد میں آکر بھی بدلتے نہیں بلکہ تبدیلی کے بعد مادہ کی یہ شکل بجنسہ قایم رہتی ہے لیکن اسکی تفصیل اور گردان بہت مشکل اور دقیق ہے اور ان مادوں کو معنی پہنانا بھی مشکل معلوم ہوتا ہے۔

ہندیائی یورپی تخلیطی قسم کا دوسرا بڑا خاندان ہندیائی یورپی ہے جو سامی زبانوں سے زیادہ اہم اور زیادہ وسیع رقبہ کی زبانیں ہیں انگلستان، ہالینڈ، ڈنمارک، جرمنی، اسکنڈنیویا، فرانس، اسپین، پرتگال، اطالیہ، والاخیہ روس، یونان، البانیہ، ایران، بخارا، ارمنیا اور ہندوستان میں جو لاتعداد زبانیں اور بولیاں رائج ہیں جن کو وقت اور تاریخی وجغرافیائی ماحول نے ایک دوسرے سے اس درجہ مختلف اور بیگانہ بنادیا ہے اصل میں ان چند زبانوں کی اولاد ہیں جو کبھی ایک دوسرے سے ربط اور تعلق رکھتی تھیں اور آج ناپید ہوچکی ہیں۔ مثلاً ایران کی ژند، قدیم لاطینی، سنسکرت، یونانی۔ تعجب تو یہ ہے کہ ان چند مردہ زبانوں کا مطالعہ بھی یقین دلادیتا ہے کہ وہ سب ایک ہی درخت کی شاخیں ہیں جس کی اصل ایک ہے اور جو اس مضبوطی سے زمین میں جگہ کر چکی ہے کہ جب تک دنیا قائم ہے اس کا وجود بھی قایم ہے۔ یہ اصل زبان مختلف ناموں سے یاد کی جاتی ہے، ہندیائی یورپی، ہندیائی جرمنی، اور آریائی، پہلا نام جغرافیائی حیثیت سے بخشا گیا ہے یعنی وہ زبان جس کی وسعت ہندوستان سے یورپ تک ہے، یہ نام اگرچہ ایک حد تک صحیح ہے لیکن اس زبان کی اصلی ماہیت پر روشنی نہیں ڈالتا دوسرا نام جرمنی میں خصوصیت سے مستعمل ہے اور لفظ آریہ چند ایشیائی قوموں کے ساتھ مخصوص سا ہو کر رہ گیا ہے اور اس وجہ سے لفظ آریائی یقیناً ناکافی ہے، تیسرا نام غلط ہے کیونکہ اس کا اطلاق اس زبان کی صرف ایشیائی شاخ پر ہوسکتا ہے اور اس وسیع رقبہ کو نظر انداز کردیتا ہے جو یورپ اور روس پر مشتمل ہے، بہرکیف ہندیائی یورپی نسبتاً غنیمت ہے اور ہم اسی کو استعمال کرینگے اس خاندان کی بہت سی زبانیں رفتار زمانہ نے فنا کردیں اور اکثر ایسے ممالک میں مستعمل ہیں جہاں دوسری زبانیں زیادہ برسر عروج ہیں۔ پھر بھی اکثر مشہور زبانیں قابل ذکر ہیں ان میں سب سے قدیم اور اہم سنسکرت ہے جو آریاؤں کی مقدس تہذیب کی آئینہ دار ہے اور جس میں ان کی معاشرت کی تاریخ اور تمدن کے خزانے پنہاں ہیں۔ کیونکہ یہی ایک زبان ہے جسمیں قدیم ہندیائی یورپی زبان کے مادے، لاحقے،

سابقے اور اشتقاقی اصول نسبتاً دوسری ہم خاندان زبانوں سے بہت زیادہ محفوظ اور برقرار ملتے ہیں محقق لسانیات کے لئے اس زبان کی اہمیت یوں اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ اس کے مادے، لاحقے اور وہ اصول جن پر الفاظ بنتے ہیں دوسری زبانوں کی نسبت (جو اسی ہندیائی یورپی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں) زیادہ واضح اور نمایاں نظر آتے ہیں، اس خاندان کے دوسرے افراد میں یہ لسانی اصول سب دھندلے پڑ چکے ہیں اور اصل زبان سے بظاہر بہت دور جا پڑے ہیں سنسکرت زبان میں قصے کہانیاں، ناٹک اور فلسفہ کے بہترین مسائل موجود ہیں جو خیال انسانی کی ایک بلند اور ارفع منزل کے ترجمان ہیں، لیکن لسانی نقطہ نظر سے سنسکرت کا سب سے اہم سرمایہ منتروں کا وہ زبردست مجموعہ ہے جو ویدوں کے نام سے مشہور ہے، اگرچہ ان کی تصنیف و ترتیب کے متعلق کسی زمانہ کا تعین یقین کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا لیکن اس میں شبہ کی گنجائش نہیں کہ ہندیائی یورپی زبانوں میں یہ سب سے قدیم نمونہ ہیں یہی مقدس وید ویدک دھرم کے منضبطہ اصول ہیں اور اس نظر سے مذہب کی ارتقا و تاریخ کے طالب علم کے لئے ان کا مطالعہ ناگزیر ہے بالکل اسی طرح زبان کا محقق ان کو نظر انداز نہیں کر سکتا یہ ایک قدیم زبان کا نمونہ ہیں جو اب بولی نہیں جاتی اور جو کالیداس کے عہد کی علمی و ادبی سنسکرت سے مختلف ہے۔

اس خاندان کی دوسری بیٹی قدیم فارسی یا ژند ہے جس کی تاریخ سنسکرت کی طرح بہت قدیم ہے اور جس طرح قدیم ترین سنسکرت کے نمونے وید کے منتروں میں ملتے ہیں، قدیم ژند کے نمونے Gathas کے منتروں میں ملتے ہیں جن کی تصنیف کی تاریخ سنسکرت کی طرح اب تک تحقیق نہیں ہوئی، یہ ایران کے آتش پرستوں کی قدیم ترین تصنیف ہیں اسی مجموعہ کو (Zandavesta) کہا جاتا ہے، یہی زبان ذرا سے فرق سے (Behis-tun) اور (Persepolis) کے کتبوں میں ملتی ہے جن میں دارا اور کیخسرو Xerxes کے واقعات بیان کئے گئے ہیں یہ پیکانی رسم الخط میں تحریر تھے جو شاید آشوریوں سے حاصل ہوا تھا آشوری خود سامی النسل تھے اور تحریر کی مختصر تاریخ

ملاحظہ ہو[1]	Eng.	Zend.	Skt.
	Wist = to Know ; wisdom = Knowledge	Vesta.—	Veda —

کے سلسلہ میں اس مسئلہ پر روشنی ڈالی جا چکی ہے

اسی زبان کی ایک خاص صورت پہلوی ہے جو تاریخی نقطہ نظر سے اس قدر قدیم نہیں اس کے نمونے ساسانی فرماں رواؤں کے سکوں پر مضروب ہیں جو تیسری صدی اور ما بعد کے زمانے کے بتائے جاتے ہیں، اس زبان میں ایک نمایاں فرق یہ ہے کہ اکثر سامی الاصل الفاظ شامل ہو گئے ہیں اور یہ عرب و فارس کے تجارتی تعلقات کی بنا پر آپس میں گھل مل گئے۔

پارسی جو فارسی جدید سے زیادہ مختلف نہیں شاہنامہ کی زبان ہے اور موجودہ زبان سے صرف اس امر میں مختلف ہے کہ عربی کی وہ کثیر آمیزش جو مسلمانوں کا عروج اپنے ساتھ لایا اس میں نہیں ملتی، یہ زبان تقریباً دسویں صدی عیسوی کی ہے۔

ژند کی بڑی اہمیت یہ ہے کہ وہ سنسکرت سے بہت ملتی جلتی ہے اور ان دونوں زبانوں کے باہمی تعلق اور رشتہ کو بڑی خوبی سے ظاہر کرتی ہے۔

ژند اور سنسکرت کو ہندیائی یورپی خاندان کی ایشیائی شاخ سے متعلق کہنا زیادہ مناسب ہے اور یہ شاخ یورپی شاخ سے اکثر صوتی اصولوں میں جدا ہے۔

یورپی شاخ میں سب سے پہلے یونانی کو لیا جا سکتا ہے اور اسی شمار میں وہ سب بولیاں بھی ہیں جو یونانی کی ہی مختلف مقامی شکلیں ہیں اور یونان میں کسی نہ کسی وقت بولی جاتی تھیں، اس زبان میں اصل زبان (ہندیائی یورپی) کے الفاظ بکثرت بجنسہ موجود ہیں اور اکثر قواعد صرفی میں بھی اسی قدیم گرامر پر عمل کیا جاتا ہے ہندیائی یورپی زبان میں اصل حروف صحیحہ کے علاوہ جو نئے حروف داخل ہو رہے تھے یونانیوں نے اُن کو ترک کر دیا اور برخلاف اس کے انھوں نے حروف علت کو زیادہ اہمیت دی اور نہ صرف اُن کی تعداد میں اضافہ کیا بلکہ ان کے استعمال کے بھی جدید محل وضع کئے مثلاً واحد سے جمع بنانے کے لئے اصل ہندیائی یورپی زبان میں حروف صحیحہ سے کام لیا جاتا تھا یونانیوں نے اس قسم کی صرفی تبدیلیوں کے لئے حروف علت کو استعمال کرنا شروع کیا مثلاً Bacilus, Bacillu; Radius, Radiii اسی کی پیروی یورپ کی دوسری

زبانوں نے بھی کی مثلاً انگریزی man-Feet دوسرا نمونہ لاطینی زبان کا ہے جس کے ساتھ اطالیہ کی قدیم زبانوں کا تعلق ہے اور یہ سب بڑی آسانی سے اس اصل ہندیائی یورپی زبان سے متعلق کی جاسکتی ہیں یہی زبانیں آج ترقی یافتہ صورت میں فرانسیسی، اطالوی، ہسپانوی، پرتگالی اور (Provencal) (جواب متروک ہے) کہلاتی ہیں اسی سلسلہ میں وہ زبانیں ہیں جو عام طور پر گمنام ہیں لیکن محقق لسانیات ان کو بھی نظرانداز نہیں کر سکتا میری مراد (Grisons) اور (Wallachi) کی زبانوں سے ہے جو ان علاقوں میں روم کی فوجوں کے ساتھ آئیں۔

مذکورالصدر دونوں زبانوں کی اہمیت کے متعلق کچھ بیان کرنا بیکار ہے یونانی اور لاطینی علوم وفنون قدیمہ کی حامل ہیں جن پر جدید سائنس اور فلسفہ کی شاندار عمارت تعمیر کی گئی ہے اور جو ان قدیم اقوام کے بلند خیالات اور فلسفیانہ مسایل کی آئینہ دار ہیں۔

ہندیائی یورپی زبان کی ان دونوں زبانوں کے علاوہ جنوبی یورپ کی اکثر زبانوں کو ایک علیحدہ شاخ سمجھا جاتا ہے جس کو کلتانی (Keltic) کہتے ہیں اس کی چار قسمیں قابل ذکر ہیں (Kymric) کمری جو اب بھی ویلس میں بولی جاتی ہے اور جو کسی زمانہ میں کارنوال (واقع جنوبی مشرقی انگلستان) میں مستعمل تھی اور اب بھی (Brittany) واقعہ شمالی مغربی فرانس میں کہیں کہیں اس کے آثار پائے جاتے ہیں، دوسری زبان (Godhelic) ہے جسے آئرستان میں (Erse) کہتے ہیں (Scotch Highlands) کی (Gaelic) اور (Isle of Man) کی (Manx) زبان بھی اسی شمار میں ہیں۔

یورپی شاخ کی یہ چھ زبانیں یعنی یونانی، لاطینی ایک طرف اور مذکورالصدر چار کلتانی بولیاں جو ایک دوسرے سے مختلف ہیں دوسری طرف دو خاص مجموعوں میں تقسیم کر سکتے ہیں جو آپس میں بالکل اسی طرح متفرق ہیں جیسے یونانی اور لاطینی زبانیں ہیں، یہ دونوں مجموعے ایسے لوگوں کے استعمال میں رہیں جو سیاسی واقعات کی بنا پر دوسری اقوام سے ملتے جلتے رہے اور ان کے آپس کے اختلاف کا سبب یہ ہے کہ یہ ایسے رقبوں میں مستعمل تھیں جن میں آمدورفت اور گفت وشنید کے براہ راست ذرائع مفقود تھے۔

افسوس کہ اس ہندیائی یورپی خاندان کی اکثر زبانیں رفتار زمانہ کے ساتھ فنا ہوگئیں اور رفتہ رفتہ ہوتی جارہی ہیں، سنسکرت، یونانی، لاطینی سب مردہ زبانیں ہوچکی ہیں اور مقامی بولیاں تو بکثرت پیدا ہوئیں اور فنا ہوگئیں جن کا نام بھی علم الالسنہ کے محقق کے علاوہ کسی کو معلوم نہ ہوگا۔

یورپی زبانوں کا تیسرا مجموعہ شمالی یورپی کہا جاسکتا ہے جس میں ذیل کی زبانیں شامل ہیں۔

(Lithuanian) وہ زبان جو آج مختلف شکلوں میں روس اور (Prussia) کے بالٹی صوبوں میں مستعمل ہے، اس کی اہمیت محقق لسانیات کے لئے یہی ہے کہ اس میں تمام قدیم صرفی تبدیلیاں آج تک بجنسہ موجود ہیں نہ صرف فعلی لاحقے (Verb Suffixes) مکمل طور پر موجود ہیں بلکہ تمام وہ صورتیں بھی ہیں جو دیگر یورپی قدیم اور جدید زبانوں میں نہیں پائی جاتیں یا اگر موجود ہیں تو نہ ہونے کی برابر ہیں، لیکن کلتانی جو اس زبان کو بولنے والے تھے عرصہ ہوا اپنی انفرادیت ختم کرچکے ہیں اور آج بحیثیت جدا قوم اُن کا کوئی وجود نہیں

(Slavonic) مختلف صورتوں میں روس، بلغاریہ، سرویا، اسٹیریا (Croatia) (Styria) اور اُس کے نواح اور بوہیمیا میں بولی جاتی ہے، اہل سرویا نے کچھ شعر و ادب کا سرمایہ بھی جمع کرلیا ہے اور یہی حال بوہیمیا والوں کا ہے لیکن زبانوں کے محقق کی دلچسپی تمام تر کلیسائی (Slavonic) کی طرف مبذول ہے جس میں نویں صدی کے اوائل میں انجیل کا ترجمہ کیا گیا تھا، اس کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ یہ زبان اور (Lithuanian) اسی طبقہ کی آخری اور سب سے اہم زبان طیوطانی سے کس قدر قریبی تعلق رکھتی ہیں،

طیوطانی طبقے میں کئی زبانیں شامل ہیں، ان میں (High German) سب سے پہلے قابل ذکر ہے جو آٹھویں صدی سے اب تک ارتقا کی بہت سی منازل سے گذر چکی ہے اور جو جنوبی جرمن کی عام زبان بن گئی ہے اور ایک طرح پر جرمن کو وسیع سلطنت کی واحد زبان ہے، اس کے عروج کا سبب یہ ہے کہ مارٹن لیوتھر نے اس کو اپنی تبلیغ کے لئے استعمال کیا تھا اور اسی زبان میں نئے عقیدے والوں کے لئے بائبل کا ترجمہ کیا گیا تھا۔

اسی طیوطانی طبقہ میں (Scandinavian) زبانیں شامل کی جاتی ہیں جو سوئیڈن ڈنمارک، ناروے اور آئس لنڈ میں بولی جاتی ہیں، آئس لنڈ کو نویں صدی عیسوی میں ناروے والوں نے بسایا تھا اور وہاں (Norse) یا ناروے والوں کی زبان مروج ہوئی اور عجیب امر تو یہ ہے کہ جب سے ابتک اس زبان میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہوئی جیسا کہ (Eddas) نامی کہانیوں کے مجموعوں سے ظاہر ہے جو (Scandinavia) کے دیوتاؤں اور سورماؤں کے کارناموں کو بیان کرتے ہیں، ان ہی دیوتاؤں اور سورماؤں کے قبول عام نے زبان کو بجنسہ قائم رکھنے میں بڑی مدد دی ہے۔

طیوطانی کی تیسری بڑی شاخ (Low German) ہے جس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس کے بولنے والے بحر جرمن (German ocean) اور بحر بالٹک کی طرف آباد ہیں، یہ زبان اپنی (Gothic) صورت میں سب سے زیادہ قائم اور مروج رہی جس کا استعمال (Dacia) کے صوبہ میں ہوتا تھا جو کسی زمانہ میں رومیوں کے قبضہ میں تھا، اسی زبان میں چوتھی صدی عیسوی میں پادری (Ulfilas) نے (جو باعتبار نسل (Gothic) تھا) انجیل مقدس کا ترجمہ کیا تھا۔ اسی زبان میں قدیم ترین جدید عہد نامے (New Testament) سے بڑا حصہ نثر صورت میں موجود ہے، اسی بنا پر طیوطانی زبانوں کی قدیم ترین شکلیں قدرتاً اس زبان میں پائی جاتی ہیں

آج (Gothic) نسل ناپید ہے لیکن اس قسم کی اور زبانیں آج بھی اپنی جدید صورتوں میں موجود ہیں قدیم فریسی (Old Frisia) جس کا رواج اب بھی (Sleswick Holstian) اور (Weser) کے مغرب کے سواحل پر ہے، قدیم سکسنی (Old Saxon) جس میں (Heliand) تصنیف ہوئی تھی جو نظم میں انجیل کا لفظی ترجمہ ہے، انکے علاوہ ڈچ (Flemish) اور سب سے اہم انگریزی ہے جو برطانوی اقتدار کی بدولت دنیا کی لنگوا فرینکا یعنی عام کاروباری زبان بن گئی ہے، انگریزی نے خود جدید یورپی زبانوں پر اثر ڈالنا شروع کردیا ہے جس کا مفصل ذکر ہم کسی دوسرے باب میں کرینگے۔

غزل

(از آفتاب احمد صدیقی صبحی (ردولوی) آنرز فائنل (معاون مدیر)

مائل پرواز ہیں رعنائیاں آہ وہ مستی بھری انگڑائیاں

کس نے دیکھیں حسن کی رعنائیاں وہ تو وہ اُسکی نہیں پرچھائیاں

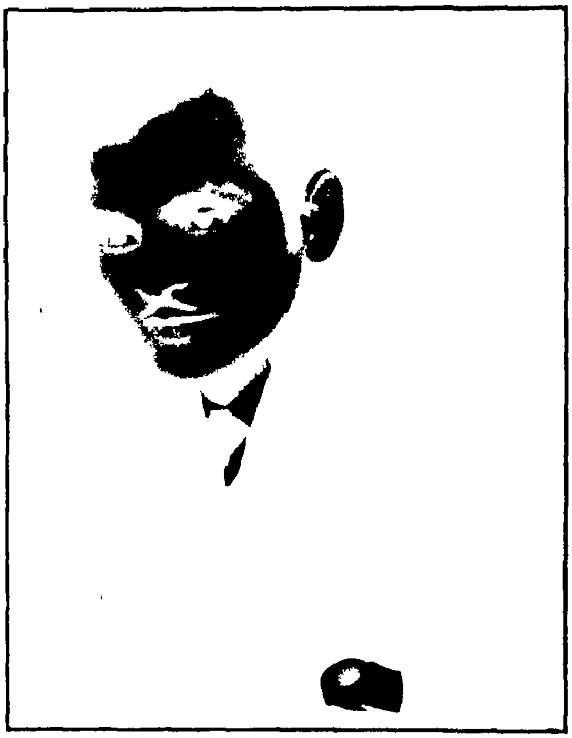
مست آنکھوں کا تصور آگیا آرہی ہیں بار بار انگڑائیاں

بن گئیں خود اُنکی شہرت کا سبب کیا مزے کی ہیں مری رسوائیاں

اب نہ جاؤ اور اگر جاتے ہی ہو ساتھ لیجاؤ مری تنہائیاں

ایک ناکامِ تمنا مرمٹا آپ لیتے ہی رہے انگڑائیاں

صبحیؔ دیوانہ اب ہم ہیں نہیں
کون دیکھے آپکی انگڑائیاں



آفتاب احمد صدیقی صاحب ردولوی (آنرز فائنل)
(معاون مدیر)

جوشؔ کی شاعری کی معنوی خصوصیات[1]

اور

اس کا فلسفۂ حیات

(یوسف رضا صاحب بدایونی متعلم مسلم یونیورسٹی)

ورڈسورتھ کا قول ہے کہ "ہر عظیم المرتبت شاعر ایک معلّم کی حیثیت رکھتا ہے۔ میری تمنا ہے کہ مجھے بھی ایک معلّم متصوّر کیا جائے۔ وگرنہ دنیائے ادب میں میرا تذکرہ ہی نہ کیا جائے۔" حقیقت امر یہ ہے کہ اس سے زیادہ جامع الفاظ میں ایک شاعر کے فرائضِ لازمہ کا لبّ لباب نہیں پیش کیا جاسکتا۔ ایک حقیقی شاعر کو صرف اس اہم فرض کا احساس ہونا چاہئے بلکہ اس تصوری نظریہ کو حتی الوسع عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرنا چاہئے۔

چونکہ ہماری شاعری کی بنیاد ہی فارسی شاعری کی کورانہ تقلید پر ڈالی گئی لہذا اس دفترِ بے پایاں میں اس عنصرِ حقیقی کا فقدان کوئی استعجاب انگیز امر نہیں۔ اُردو شعرا کے ضخیم دواوین میں ہر قسم کے رطب ویابس کا وفور ہے لیکن ان کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے سے اس تلخ حقیقت کا شدید احساس ہوتا ہے کہ ہمارے شعرا (بہ استثنائے چند) متذکرۂ بالا فرضِ منصبی کے احساس سے بیگانہ نہیں تو بے پروا ضرور رہتے۔ بجز ہجر وفرقت کی بوست آمیز داستانوں کے آپ کو ان کے کلام میں بمشکل کسی دوسرے مسئلہ کا ذکر نظر آئیگا۔ اور اس داستانِ فرقت سے بھی سراسر بوئے تقلید آتی ہے جوشؔ نے صحیح کہا ہے:-

ان غزل گویوں کا ہے معشوق ایسا نازنین　　　نام جس کا دفترِ مردم شماری میں نہیں

---

[1] یوسف رضا صاحب کا یہ مضمون اشاعت کے لئے موصول ہوا ہے۔ مضمون محنت سے لکھا گیا ہے اور کامیاب ہے لیکن اکثر غیر متعلق [illegible] ہیں جن سے ہمیں اختلاف ہے مثلاً جہاں علامہ اقبال کے متعلق اُن کے مشہور مخالف کا بیان سند میں پیش کیا ہے، نوجوان مضمون [illegible] کو اصولاً زیادہ احتیاط مدنظر رکھنے کی ضرورت ہے)

ان کی سیرت ہی انوکھی، ان کی غیرت ہے عجیب
گو نہیں جاتے حیا سے اب وجد کے یہ رقیب

آج تک غالب ہے ان پر وہ رقیب روسیاہ
کر چکا ہے زندگی جو میر و مومن کی تباہ

پائی ہے ترکے میں ان لوگوں نے ہر نے، ہر صدا
ان کے لب پر بھی وہی ہے جو ولی کے لب پہ تھا

اس کے بعد اپنے مخصوص انداز میں لکھتا ہے :-

شاعری ان کی نہیں ہم رشتۂ پیغمبری
دیر تک چلتی نہیں الفاظ کی بازی گری

سلسلہ ان کے سخن کا دور تک ہوتا نہیں
کون ہے انیس جو بالآخر "کڑک" ہوتا نہیں!

قلب ان کا قطرۂ شبنم تو ہے، پھالا نہیں
کوئی ان میں زندگی کا دیکھنے والا نہیں!!

دورِ جدید میں متقدمین کی اس فرسودہ روش کے خلاف کسی قدر احتجاج کیا جا رہا ہے۔ لیکن ہمارے ابنائے زمانہ کے دماغوں پر قدماء کے نام سے اس قدر مرعوبیت چھائی ہوئی ہے کہ اکثر لوگ متقدمین کے مسلک سے انحراف کرتے ہوئے یک گونہ جھجک محسوس کرتے ہیں۔

جوشؔ کے فلسفۂ حیات پر بحث کرنے سے پیشتر ہم کو چاہئے کہ اس کے نظریۂ شاعری پر مجمل لیکن جامع نظر ڈال کر دیکھیں کہ اس کے نزدیک ایک شاعر میں کن خصوصیات کا جمع ہونا لازمی ہے اور اُس کے فرائض کیا ہیں۔

شاعر کی خصوصیات | نظیری نیشاپوری نے اپنے احاطۂ شاعری کی وسعت اس طرح بیان کی ہے :-

بزیرِ ہر بنِ مو چشم روشنیست مرا
بروشنائیِ ہر ذرّہ روزنیست مرا

لیکن جوشؔ کے دنیائے شاعری اس سے بھی وسیع تر ہے۔ اس کے نزدیک ایک شاعر کو نہ صرف جمیع عالم کا مطالعہ کرنا ناگزیر ہے بلکہ فی الحقیقت تمام دنیا و مافیہا اس کے زیرنگیں ہے اور وہ اپنی حسبِ طبع مطالعہ گاہِ فطرت میں سے انتخاب و اقتباس کرتا رہتا ہے :-

رقص کرتا ہے نظامِ دیر میرے ساز پر
کاروانِ روح چلتا ہے مری آواز پر

ہنا زے گلشن میں چلتی ہے ہوا میرے لئے
جھوم کر آتی ہے ساون کی گھٹا میرے لئے

حسن کو بخشے گئے ناز و ادا میرے لئے ساز سے باہر نکلتی ہے صدا میرے لئے

صبح کے رنگین غنچوں میں ترنم مجھ سے ہے

چاندنی راتوں میں اندازِ تبسم مجھ سے ہے!

ایک دوسری جگہ اسی مضمون کو ذرا مختلف الفاظ میں اس طرح پیش کیا ہے

وہ کون منظرِ قدرت ہے آج عالم میں جو میرے واسطے آغوش وا نہیں کرتا؟

خلاصہ یہ ہے کہ جوش کے نظریۂ شاعری کے بموجب تمام موجوداتِ عالم اور جمیع مطالعہ گاہِ فطرت، شاعر کے زیر فرمان ہے اور وہ اپنی مرضی کے مطابق ان کا مطالعہ و انتخاب کرتا رہتا ہے۔

شاعر کے فرائض یورپین مصنفین نے لٹریچر کی یہ تعریف کی ہے کہ وہ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں حیاتِ انسانی منعکس نظر آتی ہے۔ بالفاظ دگر، ادبیات کو فی الاصل حوادثِ زمانہ کا آئینہ دار ہونا چاہئے۔ جوش کو اس نکتہ کا بخوبی احساس ہے۔ چنانچہ شاعر کی تعریف یوں کی ہے:۔

جس کے دفتر میں ہو اُس کے عہد کی ہر ایک بات موسم و ماحول و رسم و راہ و آئینِ حیات

جو اک ایسا آئینہ ہو شاہراہِ وقت پر چہرۂ ہستی کے خال و خد ہوں جسمیں جلوہ گر!!

انسانی جذبات و احساسات مختلف النوع ہیں۔ خوشی و مسرت، غم و اندوہ، لذت و کیف اور کلفت و اضطراب کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں۔ اور ان میں سے ہر کیفیت کی جزئیات اس قدر وفور کے ساتھ جمع کی جاسکتی ہیں کہ شاعری کا میدان بے حد وسیع نظر آتا ہے لیکن سوئے اتفاق سے ہمارے شعراء نے صرف عشق و محبت کا التزام کیا ہے اور اُس پر لاتعداد دواوین مرتب کر ڈالے ہیں۔ دیگر احساساتِ انسانی کے بارے میں "ان تلامذ الرحمٰن" کے ارشادات میں ایک حرف بھی مشکل سے ملیگا۔ جوش اس امر کے سخت خلاف ہے، چنانچہ شاعر کی تعریف کے ضمن میں اس بات کی جانب بھی اشارہ کر دیا ہے:۔

چند شعبوں ہی میں گم ہونے نہ پائے جسکی ذات جس کا موضوعِ سخن ہو کل نظامِ کائنات

راستے کا ذرہ ذرہ جس کو دیتا ہو صدا نظم کرتا جا مجھے بھی، شاعرِ رنگیں نوا !!"

ایک اس سے بھی زیادہ دلچسپ امر ملاحظہ فرمائیے؛ یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ ہر بشر کی ذہنیت دوسرے بشر سے مختلف ہوتی ہے اس لئے اس کے احساسات بھی دیگر بنی نوعِ انسان سے مختلف ہونے چاہئیں لیکن ہماری شاعری چونکہ متغزلین کی مقلدانہ ذہنیت کی آئینہ دار ہے اس لئے آپ کسی اردو شاعر کے کلام کے مطالعہ سے یہ نہیں اندازہ لگا سکتے کہ اس کے رجحانات اور اس کے دیگر معاصرین کے رجحانات میں کیا مابہ الامتیاز تھا؛ اس کے نظریئے کیا تھے؛ اور اس کی زندگی کن حوادث کے ماتحت بسر ہوئی؛ لیکن جوشؔ اس لایعنی تقلید کا قائل نہیں۔ اس کے نزدیک ایک شاعر ایسا ہونا چاہئیے کہ:۔

ہر بن کہ جس کے ہر نقطہ سے جھلکے اس کا نام جس کی سیرت کو مدون کر سکے اس کا کلام

جوشؔ کا فلسفۂ حیات متذکرۂ بالا بحث سے یہ تو ظاہر ہو گیا ہو گا کہ جوشؔ کے ذہن میں شاعر کا جو تصور ہے وہ یہ ہے کہ اس کو حیاتِ انسانی کے مختلف پہلوؤں کا بنظرِ تعمق مطالعہ کرنا اور ان پر فلسفیانہ محاکمہ کر کے ابنائے زمانہ کے لئے مشعلِ ہدایت روشن کرنا اپنا فرضِ منصبی متصور کرنا چاہیئے۔ جوشؔ کی شاعری پر ایک غائر نظر ڈالنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں اس شاعری کے تخیل کی مادی تشکیل میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے۔ اور اپنی شاعری میں ہماری زندگی کے ہر ممکن پہلو پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ جوشؔ نے حیاتِ انسانی پر جس قدر سلجھی ہوئی بحث کی ہے حقیقتاً اس کی مثال اردو شعراء میں مفقود ہے۔ اس کے نظریۂ حیات پر مفصل بحث کی جائے تو ایک ضخیم کتاب مرتب ہو سکتی [illegible]ست ہمارا ارادہ ہے کہ مختلف عنوانات کے ماتحت اس کے پیغام کی روح اور اس کے تصورِ حیات پر ایک [illegible]مالی نظر ڈالی جائے۔

[illegible]یت حقیقت یہ ہے کہ قدیم روش پر مقلدانہ انداز سے عامل رہنا کوئی مشکل کام نہیں، ہر وہ شخص جس میں معمولی درجہ کی صلاحیت [illegible] ایسا کر سکتا ہے انسان کا عیارِ قابلیت، تجدید اور انقلابیت پر منحصر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ

دُنیائے تاریخ میں مجدّدینِ فن کو جو اہمیت دی گئی ہے، مقلدین اس سے یکسر محروم رکھے گئے ہیں۔ اُردو شاعروں میں نظریۂ انقلابیت پیش کرنے کا سہرا اقبال کے سر ہے۔ اس نے فخریہ انداز میں کہا:۔

تراش از جادۂ خود، جادۂ خویش   براہِ دیگراں رفتن حرام است

قُدما کا نظریہ تھا کہ "زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز"۔ اقبال نے اس سے قطعاً انحراف کرتے ہوئے کہا:۔

گفتند "جہانِ ما آیا بتو می سازد"؟   گفتم کہ "نمی سازد" گفتند کہ "برہم زن"!

اس کے نزدیک حیاتِ انسانی اور انقلابیت لازم ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں:۔

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی   روحِ اُمم کی حیات کشمکشِ انقلاب

بے خلشے ہا زیستن نا زیستن   باید آتش در تہِ پا زیستن

لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کے لئے ایک امر باعثِ کلفت تھا جس کا شکوہ، بارگاہِ رب العزت میں اسطرح کیا ہے:۔

من مثالِ لالۂ صحرا استم   درمیانِ محفلے تنہا استم
خواہم از لطفِ تو یارے ہمدمے   از رموزِ فطرتِ من محرمے

جوشؔ نے دراصل اس کمی کو پورا کر دیا ہے جس کا اعتراف خود اقبالؔ نے ان الفاظ میں کیا ہے:۔

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں   یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

جوشؔ اس تصورِ انقلابیت میں نہ صرف اقبالؔ کا ہمدم و ہمنوا ہے بلکہ واقعۃً الامر یہ ہے کہ بعض مقامات پر پیش پیش ہے۔ اُس کا قول ہے:۔

نگاہ میں ہے جوانانِ برق رو کی روش   اب اقتدائے حریفانِ نرم گام کہاں

اس کی مختص صفت یہ ہے کہ وہ محض تجدید و اصلاح نہیں چاہتا بلکہ مکمل انقلابیت کا خواہاں ہے

نیا نظام جزا و سزا مقرر ہو   نیا تخیلِ روزِ شمار پیدا کر!!

نظامِ کہنہ، نسلی رواق، وہم و فریب! | نیا تصوّر لیل و نہار پیدا کر
کلاہِ خواجگیٔ کائنات کج کر کے | نیا زمانہ، نیا روزگار پیدا کر

ایک دوسرے مقام پر رقمطراز ہے:۔

کام ہے میرا تغیر، نام ہے میرا شباب | میرا نعرہ، "انقلاب" و "انقلاب" و "انقلاب"

Genius (جس کو اُردو میں "طبّاع" یا "نابغ" کہنا چاہئے) دو قسم کے ہوتے ہیں۔ نابغین کی پہلی قسم وہ ہے جو نظامِ کائنات میں اپنی ذات کا اِنضمام کرنے کے بعد، سوسائٹی کی روش کے ساتھ ساتھ چل کر، دیگر افراد کی اصلاح و تبدیلی کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اسطرح دو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ اوّل تو یہ کہ وہ اپنی انفرادیت کو محو کر دیتے ہیں۔ ثانیاً وہ حیاتِ ملّی میں کوئی معتدبہ تبدیلی پیدا کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ طبّاعوں کی دوسری قسم وہ ہے جن کے پیشِ نظر یہ مقولہ رہتا ہے کہ "زمانہ با تو نسازد، تو با زمانہ ستیز!" جن کا مقصدِ اولین یہ ہوتا ہے کہ اصلاحِ معاشرت کی بجائے، جمعیتِ عالم کو یکسر منقلب کر دینا چاہئے اور نئے سرے سے سوسائٹی کا نظام مقرر کیا جائے۔ جوش اصلاً دوسری قسم کا نابغ (Genius) ہے۔ وہ "مصلحانہ ذہنیت" (Reformist Trend) کی بجائے مکمل انقلاب کا قائل ہے۔ اُس کا دعویٰ ہے کہ:۔

شعارِ تازہ کو بخشوں گا آب و رنگِ جمعیت | رسومِ کہنہ کی محفل کو ویراں کر کے چھوڑوں گا
مری حکمت بشر کو دعوتِ نو دیکے دم لیگی | میں اس بھٹکے ہوئے انساں کو "انساں" کر کے چھوڑونگا

علّامہ اقبال مرحوم کے متعلق اُردو کے ایک مشہور انشا پرداز نے یہ انتہا پسندانہ نظریہ پیش کیا تھا:۔

"ڈاکٹر اقبال نے کیا پیغام مسلمانوں کو پہونچایا؟ اس کا بہتر اندازہ خود ڈاکٹر اقبال کی زندگی سے ہو سکتا ہے۔ اور اس پیغام سے قوم کو کیا فائدہ پہونچا؟ اس کا حال مسلمانوں اور خصوصیت کے ساتھ پنجابی مسلمانوں کی سیاسیات سے معلوم ہو سکتا ہے۔" [۱]

اگرچہ یہ طریقۂ استدلال سراسر غیر منطقیانہ ہے۔ "ماقال" سے ہٹ کر "من قال" پر بحث کرنا اصولاً صحیح نہیں لیکن جوشؔ پر یہ اعتراض بھی نہیں وارد کیا جا سکتا۔ دراصل اس کا نظریہ ہی مختلف ہے۔ وہ خود کہتا ہے:۔

زباں کی بزم میں گلکاریوں سے کیا حاصل! عمل کی راہ میں گرد و غبار پیدا کر!!

اور اس نظریہ کی صداقت کا بیّن ثبوت جوشؔ کی زندگی سے مل سکتا ہے جو اس کے پیغامات کی عملی تشکیل ہے۔ لطیف الدین احمد اکبرآبادی کا قول ہے کہ "جوشؔ کی شاعری ان کے کردار و سیرت کا آئینہ ہے اور اگر کسی سبب سے ان کے حالاتِ زندگی ناپید ہو جائیں تو آئندہ کسی کے لئے بھی ان کے کلام سے اُن کا تذکرہ مرتب کر لینا دشوار نہ ہوگا۔" [1]

شعرا کے متعلق قدیم نظریہ یہ ہے کہ ان کا کلام تنہا نشینی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ وہ سوسائٹی سے بے نیاز ہو کر، دیگر اہلِ زمانہ کے جذبات و حسیات کی پروا نہ کرتے ہوئے، اپنے ذاتی حوادثِ قلب کو شعر کے سانچے میں ڈھالتے ہیں، اور بس یہی کمالِ شاعری ہے درحقیقت یہ نظریہ متغزلین پر صادق آتا ہے جو محض احساساتِ باطنی سے بحث کرتے ہیں۔ قومی شاعر کے لئے لابدّا اور لازمی ہے کہ وہ اپنے ماحول کا بغور مطالعہ کر کے دیگر ابنائے جنس کے لئے ایک قابلِ عمل طریقۂ کار پیش کرے۔ جوشؔ چونکہ ہندوستان میں پیدا ہوا ہے لہٰذا اس کا مطالعہ گاہِ اصلی یہی ملک ہے اور اس نے ہندوستانیوں ہی کو اپنا مخاطب اول متصور کیا ہے۔ انقلابیت کے ضمن میں بھی یہ نکتہ ملحوظ رکھنا چاہئے کہ اس کا خطاب فی الاصل اہلِ ہند سے ہے۔ مثلاً:۔

اے ہند کے ذلیل غلامانِ روسیاہ! شاعر سے تو ملاؤ خدا کے لئے نگاہ

اس خوفناک رات کی آخر سحر بھی ہے؟ تو پیں گرج رہی ہیں سرِ ن پر خبر بھی ہے؟

اے امتِ شکستہ دل وائے گروہِ شل کب سے بلا رہا ہوں میں تجھ کو سوئے عمل!

---

[1] نقش و نگار ص۸

تجھ پر مرے کلام کا ہوتا نہیں اثر
چونکا رہا ہوں کب سے میں شانے جھنجھوڑ کر!

ایک دوسرے مقام پر یہی پیغام اس طرح پیش کیا ہے:۔

قسم اس روح کی جو عرش کو رفعت سکھاتی ہے　　کہ راتوں کو مرے کانوں میں یہ آواز آتی ہے
"اٹھو، وہ صبح کا غرفہ کھلا، زنجیرِ شب ٹوٹی!　　وہ دیکھو پو پھٹی، غنچے کھلے۔ پہلی کرن پھوٹی
اٹھو چونکو، بڑھو، منہ ہاتھ دھو، آنکھوں کو مل ڈالو!!
ہوائے انقلاب آنیکو ہے ہندوستاں والو!!!"

کہیں کہیں وہ بنظرِ تعمیم بجائے ہندوستان کے جمیعِ مشرق کو اپنا مخاطب متصوّر کرلیتا ہے مثلاً:۔

یہ مشرق محو ہے صبحِ تجلی زار ہونے میں　　یہ روحِ ایشیا مصروف ہے بیدار ہونے میں!

بغاوت جوشؔ کے کلام کا مطالعہ کرنے سے انقلابیت ہی کے ضمن میں جس خاص جذبہ کا احساس ہوتا ہے وہ اس کی شاعری کی بغاوت آمیز روح ہے تاریخِ عالم شاہد ہے کہ جب کسی بیکس و مظلوم طبقہ پر ظالموں کا جبر و استبداد ایک مقرّرہ حد سے متجاوز ہو کر ناقابلِ برداشت ہوجاتا ہے تو قوم میں ایسے لوگ پیدا ہوتے ہیں جو اس گروہِ مظلوم کی اعانت و امداد کرنا اپنا فرضِ اولین سمجھ لیتے ہیں۔ جوشؔ کے حسّاس دل میں بھی مظلوم و مجبور کے آلام و مصائب سن کر ایک ہمدردانہ ارتعاش پیدا ہوجاتا ہے۔ لیکن وہ اس داستانِ غم کا آنسوؤں سے استقبال نہیں کرتا۔ برخلاف اس کے، وہ ان حوادث کے مالہٗ اور ماعلیہ پر غور کرنے کے بعد موثر ترین الفاظ میں اُن کا دفعیہ پیش کرتا ہے۔ وہ دفعیہ کیا ہے؟ "بغاوت!"۔ اپنی شاعری میں وہ شروع سے آخر تک مظلوم کو ظالم کے خلاف برانگیختہ کرتا ہوا نظر آتا ہے بعض مثالوں سے یہ مطلب واضح ہو جائیگا۔

بغاوت کے بارے میں جوشؔ کا نظریہ ہے کہ اس کی تکمیل و تشکیل کے روحِ رواں فی الحقیقت تشنہ و گرسنہ عوام الناس ہی ہوتے ہیں۔ چنانچہ "بغاوت" یوں گویا ہوتی ہے:۔

گودیں ناداریوں کی پرورش پاتی ہوں میں بے زری کے بازوؤں پر زلف بکھراتی ہوں میں
دیکھنے سے جن کے پتھر کا بھی دل ہو جائے شق مجھ کو وہ اُترے ہوئے چہرے پڑھاتے ہیں سبق

ایک جگہ اسی مسئلہ پر نہایت پُر جوش الفاظ میں اس طرح محاکمہ کرتا ہے:۔

مچلتا ہے گدا کے دل میں آزادی کا جب شعلہ لرز اُٹھتا ہے پھنک جانے کے ڈر سے تاجِ سلطانی

ہندوستان کے مزدور اور کسان کو وہ انقلابیت کا عنصرِ حقیقی قرار دیتا ہے اور اس کا عقیدہ ہے کہ انہیں کے زورِ بازو سے مغربی استبدادیت کا چراغ گُل کیا جا سکتا ہے:۔

دہمک پیدا ہے پھر چھوٹی ہوئی نبضوں میں مشرق کی کلیجہ خون ہے پھر مغربی "تیمارداری" کا
نظر ہے کلبۂ مزدور پر معمارِ فطرت کی تلاطم میں ہے قصرِ آہنی سرمایہ داری کا
شہانِ کج کُلہ پر تنگ ہے عالم کی پہنائی
درِ دہقاں پہ دستک دے رہی ہے شانِ دارائی

جوش کا عقیدہ ہے کہ جب تک صفحۂ عالم پر ملوکیت و استبدادیت کا وجود باقی ہے، ظلم اور غریب آزاری کا خاتمہ نہیں ہو سکتا:۔

جہاں بانی دہکتی آگ ہے، گرتی ہوئی بجلی ہمیشہ اس نے دنیا میں کئے دورِ محن پیدا
ہزاروں تجربوں کے بعد اب انساں یہ سمجھا ہے کہ شاہی سے نہیں ہوتا شرافت کا چلن پیدا

اس کے بعد ایک تشبیہ کا اضافہ کر کے اس بحث کو زیادہ پُر اثر بنا دیتا ہے:۔

اُمید اس سے نہ رکھ، نادان، ہرغانِ خوش الحاں کی ہمیشہ جس بیاباں سے ہوئے زاغ و زغن پیدا

ملوکیت کے ہوا خواہ سے استفسار کرتا ہے:۔

ترا، اے حامیِ تاج و علم! کیا یہ عقیدہ ہے کہ ہو سکتا ہے نافِ گرگ سے مشکِ ختن پیدا؟

سلاطینِ عالم کے کبر و نخوت کی داستانیں زبان زدِ خاص و عام ہیں۔ شیخ سعدی کا "گاہے بہ سلامے برنجند" والا فقرہ

ایک تاریخی حقیقت تسلیم کر لیا گیا ہے۔ ان حقایق کی روشنی میں فیصلہ کیجئے کہ کیا جوشؔ کا یہ بیان حرف بہ حرف صحیح نہیں ہے:۔

سمجھتا ہے کہ وہ حق بات کی تلخی کو سہ لیگا؟   خوشامد سے بھی جن ہاتھ پہ ہو اکثر شکن پیدا !!

اس منطقیانہ استدلال کے بعد وہ غربت زدہ مزدور کو غیرت دلا کر دعوتِ انقلاب دیتا ہے:۔

اُٹھائے گا کہاں تک جوتیاں سرمایہ داری کی   جو غیرت ہو تو بنیادیں ہلا دے شہریاری کی

اُس کو مزدور کی مجبوری، بیچارگی اور کمزوری کا احساس ہے لیکن وہ کہتا ہے:۔

تنِ نازک پہ تیرے رحم آتا ہے مجھے لیکن   نہ دوں دعوت تجھے کسطرح قوت آزمانے کی

خاتمہ پر وہ دیرینہ مصائب کی جانب اشارہ کرتے ہوئے غربت زدہ مخلوق کے مستقبل کے لئے ایک لائحہ عمل پیش کرتا ہے:۔

گئے وہ دن کہ تو زنداں میں جب آنسو بہاتا تھا   ضرورت ہے قفس پر اب تجھے بجلی گرانے کی

گئے وہ دن کہ تو محرومئ قسمت پہ روتا تھا   ضرورت ہے تجھے اب آفتوں پر مسکرانے کی

تڑپ! ہاں ہم تڑپ! اتنا تڑپ بجلی کا پیتاں بن جا

خدارا! اے زمینِ بے حقیقت! آسماں بن جا!!

اس ضمن میں ایک نہایت اہم نکتہ قابل لحاظ ہے۔ بعض سیاسی حضرات انقلاب انقلاب پکارا کرتے ہیں۔ لیکن جب کبھی اس خیالی تصور کی عملی تشکیل کا موقع آتا ہے تو عدم تشدد، امن پسندی اور قیام صلح کا بہانہ ڈھونڈنے لگتے ہیں۔ جوشؔ کا خیال ہے کہ بغاوت اور انقلاب کے تخیل کو عملی جامہ پہنانے کے لئے خونریزی ایک لازمی امر ہے چنانچہ وہ اپنے مخصوص طرز میں رقمطراز ہے:۔

منقش ہو نہ جبتک دیدۂ خونبار سے چہرہ   نہیں کھلتی عروس رنگ و بو کی جبینِ پیشانی

گزر جاتی ہے جب افتادگی میں جوئے خوں سر سے   کہیں جب تخم کو ملتا ہے فرمانِ گل افشانی

"بغاوت" کے عنوان سے جوشؔ نے جو نظم لکھی ہے اس میں بھی اسی انقلابیت آمیز جذبہ کی جھلک پائی جاتی ہے۔

بغاوت نعرہ زن ہے کہ:-

بستۂ قرطاس ہو سکتی نہیں میری کتاب — خون کی چادر پہ چھپتا ہے مرا رنگیں نصاب
برق کے سانچے میں ڈھل جاتی ہیں گفتاریں مری — میان سے باہر اُبل پڑتی ہیں تلواریں مری

موت بن کر زندگی کے سر پہ چھا جاتی ہوں میں
سب سے پہلے بڑھ کے غدّاروں کو کھا جاتی ہوں میں

مزدور اور کسان | شاعر کی ہمدردانہ فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ جب کوئی شخص موردِ آلام و مصائب نظر آئے تو بیساختہ اس کے ترحم آمیز جذبات برانگیختہ ہو جائیں۔ لیکن اِن جذباتِ انسانی کے مرکوز ہونے کا انحصار صاحبِ نظر کے زاویۂ نگاہ پر ہوتا ہے۔ جوش کی مابہ الامتیاز صفت یہ ہے کہ اس کی توجہات کا خاص مرکز اعلیٰ طبقہ کے سربرآوردہ حضرات نہیں ہیں بلکہ اُس کو اُن ننگے بھوکے عوام سے دلبستگی ہے جو شب و روز محنت و مشقت کر کے اپنی زندگی کاٹتے ہیں، پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے مستقلاً تمازتِ آفتاب کا شکار ہوتے ہیں اور جن کو "دال روٹی" کا تو ذکر ہی کیا، روٹی، چٹنی اور چبینا بھی بمشکل اتنا میسر ہوتا ہے کہ اپنی شکم سیری کر سکیں۔ جوش کی یہ وہ تخصیص ہے جو ہمارے اکثر اُدبا اور شعراء میں یکسر مفقود ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ جوش نے خود طبقۂ اعلیٰ میں پرورش پائی، اس کا ذہنی ارتقار جس فضا میں ہوا وہ سراسر متمولانہ تھی لیکن باوجود اس کے، جہاں کہیں کسان کا ذکر آتا ہے تو اس کے منہ سے بیساختہ نکل جاتا ہے کہ "ارتقار کا پیشوا، تہذیب کا پروردگار!"

ڈاکٹر اقبال نے "نوائے مزدور" میں مزدور کی عظمت کو اس طرح ثابت کیا ہے:-

زمزدِ بندۂ کرباس پوش و محنت کش — نصیبِ خواجۂ ناکردہ کار رختِ حریر
زخونِ من چو زلو فربہی کلیسا را — بزورِ بازوئے من دستِ سلطنت ہمہ گیر

خرابہ رشکِ گلستاں زگریۂ سحرم
شبابِ لالہ و گل از طراوتِ جگرم!!

لیکن جوش کے دل میں مزدور اور کسان کی عظمت و وقعت اس سے بھی فزوں تر ہے۔ وہ لکھتا ہے:-

جس کے ماتھے کے پسینے سے پئے عزّ و وقار
کرتی ہے دریوزۂ تابش کلاہِ تاجدار
سرنگوں رہتی ہیں جس سے قوتیں تخریب کی
جس کے بوتے پر لچکتی ہے کمر تہذیب کی
جس کے بازو کی صلابت پر نزاکت کا مدار
جس کے کس بل پر اکڑتا ہے غرورِ شہریار

انسان کو جس شے سے دلبستگی ہوتی ہے اس پر وہ غور و فکر کرتا رہتا ہے اور مستقلاً اس کا غائرانہ مطالعہ کیا کرتا ہے۔ اور اس کی تفصیل وہ باحسنِ طریق پیش کر سکتا ہے۔ جوش نے جن الفاظ میں کسان کا نقشہ کھینچا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ فنِ محاکات کی تکمیل کے لئے استقصائے جزئیات کس قدر ماہرانہ انداز سے کرتا ہے محاکات کی خوبی اس نکتہ میں مضمر ہوتی ہے کہ شئے مذکورہ کا ہوبہو نقشہ نگاہوں کے سامنے پیش ہو جائے۔ بقولِ کسے۔

وَاِنَّ اَشْعَرَ بَیْتٍ اَنْتَ قَائِلُہٗ
بَیْتٌ یُقَالُ اِذَا اَنْشَدْتَہٗ صَدَقَا ”

(یعنی بہترین شعر وہ ہے کہ جس کو سنتے ہی سامعین
پکار اٹھیں کہ ”واقعی یہی بات ہے!“)

غالباً کسان کا فوٹو دیکھکر بھی ذہن میں آپ اس کا اس قدر صحیح خاکہ نہیں تیار کر سکتے جیسا اس شعر کے ذریعہ پیش کیا گیا ہے:۔

ٹوکرا سر پر، بغل میں پھاوڑا، تیوری پہ بل!
سامنے بیلوں کی جوڑی، دوش پر مضبوط ہل!!

لیکن یہ ملحوظ رہے کہ جوش کو محض غریب و مفلس کی ذات سے ہی دلبستگی نہیں بلکہ جس قدر اشیا اس سے متعلق ہیں ان سب کو وہ بنظرِ استحسان دیکھتا ہے اور ان پر اپنی کامل توجہ مبذول کرتا ہے۔ ظاہر بین نظروں کے لئے ایک کسان کا ہل کوئی خاص وقعت نہیں رکھتا لیکن جوش کا نظریہ ہے:۔

کون ہل؟ ظلمت شکن، قندیلِ بزمِ آب و گل
قصرِ گلشن کا دریچہ، سینۂ گیتی کا دل
دھار پر جس کی چمن پرور شگوفوں کا نظام!
شامِ زیرِ ارض کو صبحِ درخشاں کا پیام

جس کے چھو جاتے ہی مثلِ نازنینِ مہ جبیں　　کروٹوں پر کروٹیں لیتی ہے لیلائے زمیں

جس کا مَس خاشاک میں بنتا ہے اک چادرِ مہین

جس کا لوہا مان کر سونا اُگلتی ہے زمین!

ایک مفلوک الحال مفلس کی بے سروسامانی کی تصویر ان الفاظ میں پیش کی ہے:۔

طاق پر رکھا ہوا تھا ایک سویا سا چراغ　　طاق کے نیچے تھے کڑوے تیل کے دو ایک داغ

تیل بہنے کا نشاں دیوار پر اصلا نہ تھا　　ایک دن بھی وہ دیا شاید کبھی چھلکا نہ تھا!!

پھر اس کی کس قدر پُراثر تعلیل کی ہے:۔

اس حقیقت کو سمجھ سکتے نہیں اہلِ فراغ　　اور ظلمت کو بڑھا دیتا ہے مفلس کا چراغ

اس کے بعد دیگر اشیاء کی تفصیل اس طرح بیان کرتا ہے:۔

سرد چولھے کے قریب اُڑتا ہوا پھیکا غبار　　الگنی پر چند کپڑے اور وہ بھی تار تار

جا بجا سے پپڑیاں دیوار کی چھوٹی ہوئی　　دھنیاں گنتی کی تھیں انہیں بھی کچھ ٹوٹی ہوئی

ایک گوشے میں تھا بستر کے عوض تھوڑا پیال　　جس پہ دو ٹکڑے دری کے اور اک صد پارہ شال

جوشؔ کو جس طرح کسان سے اُلفت ہے بعینہٖ اسی طرح وہ دیگر مزدور پیشہ عوام کا خیر خواہ ہے۔ کسی نازک بدن لڑکی کو مصروفِ مشقت دیکھ کر اس کا دل بھر آتا ہے اور اس کے دل سے یہ صدا نکلتی ہے:۔

اف! یہ ناداری! امرے سینے سے اُٹھتا ہے دھواں　　آہ اے افلاس کے مارے ہوئے ہندوستاں

حسن ہو مجبور کنکر توڑنے کے واسطے!!　　دستِ نازک اور پتھر توڑنے کے واسطے!!!

اہلِ دُوَل کی بارگاہ میں مزدور کا اظہارِ عجز و عبودیت کرنا وہ منظر ہے جس کا مشاہدہ ہماری نگاہیں روزانہ کیا کرتی ہیں اور ہم کو اس امر کا احساس بھی نہیں ہوتا کہ ہم نے مساواتِ اسلامی کی روشِ حسنہ کو کیوں ترک کر دیا ہے اور

فی زمانناپہ طریقہ کیوں رائج ہے کہ جو شخص اقتصادی و اجتماعی حیثیت سے فروتر ہے، اسلام میں سبقت کرنا اس کا فرض متصوّر کرلیا گیا ہے۔ لیکن جوشؔ کو اس امر کا نہ صرف احساس ہے بلکہ وہ اس رسمِ قبیح کو بنظرِ استحقار دیکھتا ہے کہ کسی غریب شخص کو محض اس کی کم مایگی اور مفلسی کے باعث اس کا قلب سلام میں پیش قدمی کرنے پر مجبور کرے!! ۔اگر کوئی مزدور اس کو سلام کرلیتا ہے تو وہ اپنے احساسات کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:۔

جاگے ہوئے لطیف خیالات سو گئے   کانپی نگاہ، رونگٹے سب جھن سے ہو گئے
مزدور اور خفتہ دلوں کو کرے سلام!   شاہ اور گدائے خاک نشیں کو کہے امام
قوت کا اور ضعف کے سر پر سرِ نیاز   صحت اٹھائے اونگھتی بیماریوں کے ناز

اونچی زمیں کے سامنے چرخِ بریں جھکے
فاقے کے آستاں پہ غذا کی جبیں جھکے

غربت زدہ عوام کی دردانگیز کیفیت کا جب وہ رؤسا اور امراء کی شاہانہ طرزِ رہائش سے موازنہ کرتا ہے تو بیساختہ اس کا دل بھر آتا ہے:۔

ذرّوں کی ڈوبتی آنکھوں میں فاقوں کے نقوش   اہلِ دولت کی جبینوں پر شقاوت کے نشاں
حیف اے ہندوستاں ، صد حیف اے ہندوستاں!!

ڈاکٹر اقبال مرحوم نے سرمایہ داری کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے مزدور سے اس طرح خطاب کیا ہے:۔

اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارِ حیلہ گر   شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
اٹھ! کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے   مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

لیکن جب اسی موضوع پر جوشؔ قلم اٹھاتا ہے تو انداز ہی دوسرا ہوتا ہے، ہر لفظ کیفِ الم میں ڈوبا ہوا، حرف حرف سے دردانگیزی مترشح ہوتی ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

ایک دل اور یہ ہجوم سوگواری، ہائے ہائے   یہ ستم اے سنگدل سرمایہ داری، ہائے ہائے

بیکسوں کے خون میں ڈوبے ہوئے ہیں تیرے ہات کیا چباڈالیگی او کمبخت! ساری کائنات

دیکھکر تیرے ستم اے حامیٔ امن و اماں!
گرگ رہ جاتے ہیں دانتوں میں دبا کر انگلیاں!

بالآخر سرمایہ داری کو پیغام فنا دیتا ہے:۔

ہاں سنبھل جا اب کہ زہرے اہل دل کے آب ہیں کتنے طوفاں تیری کشتی کیلئے بے تاب ہیں

اور یہ وہ عنصر ہے جو جوشؔ کے کلام میں جابجا پایا جاتا ہے مثلاً:۔

پڑ نہیں جاتے الٰہی سینۂ دولت میں داغ بجھ نہیں جاتے شبستانِ امارت کے چراغ

اپنی تابِ زر سے اے سرمایہ دارو، ہوشیار! اپنی تاجوں کی چمک سے تاجدارو، ہوشیار!

نیلم و یاقوت سے شعلے بھڑک اٹھنے کو ہیں!
سُرخ دنیاروں میں انگارے دہک اٹھنے کو ہیں!!

اسی مفہوم کو اس شعر میں بیان کیا ہے:۔

آج جس رعب سی ہے رفتۂ امارت پہ شکوہ کل وہ مزدور کے چہرے سے نمایاں ہوگا!

یہاں تک ہم نے ایک مخصوص طبقہ کے بارے میں جوشؔ کے نظریات سے بحث کی ہے لیکن اسی سلسلہ میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جوشؔ جمیع اہلِ عالم کو کس نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے اور ان کے متعلق اس کا کیا نظریہ ہے۔ اس مسئلہ پر ہم مختلف عنوان کے ماتحت روشنی ڈالیں گے۔

بین الاقوامیت | جوشؔ کو علی العموم ایک وطن پرست شاعر مانا جاتا ہے۔ لیکن اس مختلف فیہ مسئلہ کا اس نے خود فیصلہ کر دیا ہے "شعلہ و شبنم" میں صفحہ ۸۴ (حاشیہ) پر لکھتا ہے:۔ "میں تمام بنی نوع انسانی کو ایک خاندان سمجھتا ہوں اور دیکھنا چاہتا ہوں اور وطنیت کے اس ناپاک تخیل کو جو خود غرضی، تنگ نظری، منافرت اور ابنِ آدم کی تقسیم چاہتا ہے، انتہائی حقارت کی نظر سے دیکھتا ہوں۔" آگے چل کر لکھتا ہے۔

"لیکن اس قدر وطنیت میرا ایمان ہے کہ اپنے گھر کو غاصبوں کی دَرندگی سے محفوظ رکھا جائے"

میں سمجھتا ہوں کہ بین الاقوامیت اور وطنیت کے مذکورۂ بالا تصوّر سے بہت کم حضرات کو اختلاف ہوگا۔ دیگر مظلومین اور مستحقین امداد کے مقابلہ میں اپنے اہل وطن کو خواہ مخواہ ترجیح دینا کسی سنجیدہ مذہب نے جائز نہیں سمجھا ہے۔ اگر کسی دوسرے ملک کی باشندے مصائب و آلام کا شکار ہو رہے ہوں اور انکی حالت ہمارے اہلِ وطن سے سقیم تر ہو تو ایک انسان کی حیثیت سے ہمارا فرض ہوگا کہ امداد کرنے میں اپنے ہم وطنوں پر اُن کو ترجیح دیں، کیونکہ فی الحقیقت دوسرے ممالک کے باشندے بھی اسی انسانی برادری کے افراد ہیں جن کا ایک جزو ہمارے اہل وطن ہیں۔ بقول اقبال:۔

من اوّل آدمِ بے رنگ و بویم ازاں پس ہندی و تورانیم من

علاّمہ موصوف دوسری جگہ فرماتے ہیں:۔

نہ افغانیم و نے ترکِ تتاریم چمن زادیم و ازیک شاخساریم
تمیزِ رنگ و بو برما حرام است کہ ما پروردۂ یک نوبہاریم

جیسا کہ بیشتر تحریر کیا جا چکا، جوشؔ بھی بین الاقوامیت کو وطنیت پر ترجیح دیتا ہے "لیڈر" سے خطاب کرتا ہے کہ:۔

تو سر میں رنگ و نسل کا سودا لیے ہوئے میں حُبِّ کائنات سے پیماں کئے ہوئے
بد ہی کوئی نظر میں تری کوئی نیک ہے میری نظر میں جلوۂ کونین ایک ہے!!

اسی خیال کی مزید تصریح یوں کرتا ہے:۔

رنگِ وطن ہے تیری جبینِ حیات پر میری نظر ہے جلوہ گہِ کائنات پر

جوشؔ کا عقیدہ ہے کہ بین الاقوامیت درحقیقت لازمۂ انسانی ہے اور اس کے حصول کے لئے یہ ضروری ہے کہ قوم و ملّت کے لایعنی امتیازات کو یکسر مسترد کر دیا جائے۔

نہاتی ہیں بہاریں جب لہو میں حُبِّ قومی کی تو ہوتا ہے شگفتہ لالہ زارِ حُبِّ انسانی

وطنیت لیکن جیسا کہ جوشؔ نے متذکرۂ بالا بیان میں اشارہ کیا ہے کہ "اسی قدر وطنیت میرا ایمان ہے کہ اپنے گھر کو غاصبوں کی درندگی سے محفوظ رکھا جائے" ہم کو اس کے بعض اشعار جذبۂ قومیت سے بھی لبریز نظر آتے ہیں۔ لیکن ان میں عصبیت اور تنگ نظری کا عنصر مفقود ہے۔ جوشؔ صرف وقتی ضرورت کو مدّنظر رکھتے ہوئے وطن کی حمایت کرتا ہے ورنہ اگر ہندوستان بھی ایک آزاد اور خود مختار ملک ہو جائے تو غالباً بلکہ یقیناً جوشؔ وطن پرستی کو بھی خیرباد کہہ دیگا۔ بصورتِ موجودہ اس کی وطنیت بھی فی الحقیقت اس کے جذبہ انسانیت کا جزو ہے۔ وہ لکھتا ہے۔

اے وطن! جوش ہی پھر قوت ایمانی میں　　　خوف کیا دل کو سفینہ ہے جو طغیانی میں
دل سے مصروف ہیں ہر طرح کی قربانی میں　　　محو ہیں جو تری کشتی کی نگہبانی میں!

غرق کرنے کو جو کہتے ہیں زمانے والے
مسکراتے ہیں تری ناؤ چلانے والے!

پھر ایک جذبۂ بے اختیار کے ماتحت کہتا ہے:۔

ہم زمیں کو تری ناپاک نہ ہونے دیں گے　　　تیرے دامن کو کبھی چاک نہ ہونے دیں گے
تجھ کو، جیتے ہیں، تو غمناک نہ ہونے دیں گے　　　ایسی اکسیر کو یوں خاک نہ ہونے دیں گے

جی میں ٹھانی ہے یہی، جی سے گزر جائینگے
کم سے کم وعدہ یہ کرتے ہیں کہ مر جائینگے!!

انسان کی فطرت کا تقاضا ہے کہ جب کبھی وہ مستقبل کے متعلق غور و فکر کرتا ہے تو عہدِ ماضی کے تصوّرات اُسکے ذہن میں تازہ ہو جاتے ہیں۔ جوشؔ بھی جب ہندوستان کے مستقبل کے لئے کوئی لائحہ عمل پیش کرتا ہے تو اس کے شاندار ماضی کی طرف ضرور اشارہ کر دیتا ہے:۔

حُسن برستا تھا کبھی دن رات تیری خاک پر　　　سچ بتا، اے ہند! تجھ کو کھا گئی کس کی نظر؟

باغ تیرا کیوں جہنّم کا نمونہ ہو گیا ؛ آہ، کیوں تیرا ابھرا اور بار سونا ہو گیا ؛
اے خدا! ہندوستاں پر یہ نحوست تا کجا ؛ آخر اس جنّت پہ دوزخ کی حکومت تا کجا ؛
دستِ نازک کو رسن سے اب چھڑانا چاہیئے
اِس کلائی میں تو کنگن جگمگانا چاہیئے

بیشتر عرض کیا جا چکا ہے کہ جوش کا حساس قلب، ہندوستان کے غربت زدہ طبقہ کی مفلوک الحالی سے بہت بے چین رہتا ہے وطنیت کے ضمن میں اس امر کا بھی حوالہ دینا فنی حیثیت سے ناگزیر ہے:۔

آہ، اے ہندوستاں، اے مفلسوں کی سرزمیں اس کرہ پر کوئی تیرا پوچھنے والا نہیں
آہ، اک دل بھی ترے افلاس پر ہلتا نہیں اب تو اک روٹی کا ٹکڑا بھی تجھے ملتا نہیں

اس افلاس کی توجیہہ بھی ملاحظہ فرمایئے:۔

آہ، اے ہندوستاں، اے کشورِ زار و نزار تیرے بچے بھی بلکتے ہیں، جواں بھی بے قرار
تیرے مردوں کا کفن تک لے گئے چالاک چور شق ہوائے تاریک، جیتے جاگتے مردوں کی گور
تیرے اوپر آکے ٹھہرا ہے ٹھگوں کا قافلہ جھوم کر بیٹھ، اے بھیانک دیو، بیٹھ اپنی ہلا!!

غربت و افلاس کے اسباب بیان کرنے کے بعد وہ ہندوستان کو تلقینِ بیداری کرتا ہے:۔

اے بھڑکتی آگ، ٹھنڈی راکھ کی تہ سے نکل! اے رگِ غیرت ابھر، اے خون کی چھینٹے اُبل!
گردنیں طوقِ غلامی سے ہوئی جاتی ہیں کج اے گرجتی برق گر، اے جھومتے بادل گرج
تا کجا یہ خواب اے ہندوستاں، آ ہوش میں!
آج بھی ہیں سینکڑوں ارجن تری آغوش میں

کسی شے کی تعبیر کرنا درحقیقت ہمارے زاویۂ نگاہ پر منحصر ہوتا ہے۔ جوش کو "شاعرِ انقلاب" کہا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہر

کہ وہ ہر شے کو انقلابی نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے۔ اس کو موجودہ زمانہ کی فضا میں انقلابیت کے عناصر کارفرما نظر آتے ہیں اور اس کی خواہش ہے کہ ہندوستان بھی اس تحریک میں اپنا جائز حصّہ لے سکے۔ اسی غرض سے وہ اپنے وطن کو برانگیختہ کرتا ہے:۔

زندہ ہے تو اے وطن دیتا نہیں پھر کیوں جواب　　آ رہی ہے کب سے رہ رہ کر صدائے انقلاب
وہم ہوتا ہے مجھے، آواز دے، آواز دے!!　　زندہ ہے تو میری ہمّت کو پرِ پرواز دے

یہ اجل کی بے حسی ہے یا فقط خواب گراں
بول اے ہندوستاں، ہندوستاں، ہندوستاں!

شفقتِ پدر اس امر کی مُتقاضی ہوتی ہے کہ اس کے ذہن میں مکمل ترین انسان کا جو تصوّر ہے اس کی تشکیل اس کے فرزند کی ذات کر سکے۔ جوشؔ اپنے بیٹے سجّاد کو نصائح و اشارات تلقین کر رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ اپنے لختِ جگر کا اُن اوصاف سے مُتصف ہونے کا مُتمنّی ہوگا جو اس کے نزدیک ایک "آئیڈیل" انسان میں ہونے چاہئیں۔ لیکن جوشؔ کا مطمحِ نظر کیا ہے؟ ملاحظہ ہو:۔

سر کٹانا ہند کو آزاد کرنے کے لئے　　قبر میں روحِ پدر کو شاد کرنے کے لئے

اس کے بعد نہایت حسرت آمیز الفاظ میں تلقین کرتا ہے:۔

قبر پر دو پھول لے آنا چڑھانے کے لئے　　باپ کی سوتی ہوئی قسمت جگانے کے لئے

باغِ ہستی کے لئے وہ باغِ جناں کے پھول ہوں
خردۂ آزادیِ ہندوستاں کے پھول ہوں!!

سیاسیات انسان کی موجودہ عمرانی زندگی کے دو لوازم نہایت اہم شمار کئے جاتے ہیں۔ ۱۔ مذہب ۲۔ سیاسیات۔ اوّل الذکر موضوع پر تو ہمارے شعرا بالعموم طبع آزمائی کرتے رہتے لیکن سیاسیات ایسا موضوع ہے جس کو ہمارے شعرا "حلقۂ بیرونِ در" متصوّر کرتے رہتے

حتیٰ کہ ڈاکٹر اقبالؔ مرحوم بھی اس کو "شجرِ ممنوعہ" سمجھتے تھے جیسا کہ خود اعتراف کیا ہے کہ:-

یہ عقدہائے سیاست تجھے مبارک ہوں — کہ فیضِ عشق سے ناخن ہے میرا سینہ خراش!!

جوشؔ کی مختص صفت یہ ہے کہ اس نے نہ صرف سیاسی مضامین پر محاکمہ کیا ہے بلکہ حقیقتاً اس یبوست آمیز موضوع کو پُر لطف اور دلچسپ بنا دیا ہے۔

مرحوم مولانا محمد علی کے متعلق جوشؔ نے جو نظم لکھی ہے اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ اُس کی ذہنیت کس قدر سیاسیانہ ہے اور ملک وقوم کے محسنین کو وہ کس درجہ عظمت ووقار کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ قارئین کو خواہ مخواہ احساس ہونے لگتا ہے کہ شاعر کا قلب محبت والفت اور عظمت واستحسان کے جذبات سے معمور ہے۔ بعض اشعار ملاحظہ فرمائیے:-

اے متاعِ بُردۂ ہندوستان والشیا!! — اے کہ تھا ناخن پہ تیرے عقدۂ حق کا مدار
تجھکو بخشی تھی مشیت نے اک ایسی زندگی — جس بہادر زندگی کو موت پر آتا ہے پیار
تیرے آگے لرزہ براندام تھی روحِ فرنگ — اے دلِ ہندوستاں کے عزمِ تند واستوار!
ڈوب جاتی تھی دلِ باطل میں لہراتی ہوئی — تیرے لہجے میں لچکتی تھی وہ تیغِ آبدار
تجھ سے آتا تھا پسینہ افسر و اورنگ کو — اے کہ ہمت تھی تری قوت شکن، یزداں شکار!

آئینِ جدید کے متعلق جوشؔ کی مشہور ومعروف نظم اہلِ نظر سے خلعتِ پسندیدگی حاصل کرچکی ہے، ہندوستان کے جملہ سیاسی اداروں نے متفق اللفظ ہو کر اس فعل کو بنظرِ استکراہ دیکھا ہے کیونکہ برطانوی پارلیمنٹ نے ہندوستانیوں کے مشورے کے بغیر اس آئین کو مرتب کیا ہے۔ جوشؔ اس کو اس طرح ادا کرتا ہے:-

یہ ہی نیا نکاح کہ دولھا تو ہے خموش — قاضی یہ کہہ رہا ہے کہ "دل سے قبول ہے"

آئین کا نفاذ یکم اپریل ۱۹۳۶ء کو ہوا تھا۔ جوشؔ کی مزاحیہ توجیہ ملاحظہ ہو:-

ناداں سمجھ رہے ہیں کہ حاصل ہوا وفاق — دانا یہ کہہ رہے ہیں کہ "اپریل فول" ہے

ہندوستان کی موجودہ محکومیت کے بارے میں اس نے بالتصریح اپنی رائے کا اظہار کر دیا ہے یعنی :۔

پست سے پست ہو جو چیز وہ بن جا لیکن	مر کے بھی جنسِ غلامی کا خریدار نہ بن!

ایک دوسری جگہ اسی مفہوم کو اس طرح ادا کرتا ہے :۔

دورِ محکومی میں راحت کفر، عشرت ہے حرام	مہوشوں کی چاہ، ساقی کی محبت ہے حرام
علم ناجائز ہے، دستارِ فضیلت ہے حرام	انتہا یہ ہے غلاموں کی عبادت ہے حرام

کوئے ذلت میں ٹھہرنا کیا، گذرنا ہے حرام
صرف جینا ہی نہیں، اس طرح مرنا ہے حرام

اقبال نے اہلِ ہند سے طنزیہ خطاب کیا ہے کہ :۔

یورپ کی غلامی پہ رضامند ہوا تو	مجھ کو تو گلہ تجھ سے ہے یورپ سے نہیں ہے

لیکن جب جوشؔ اسی موضوع پر قلم اٹھاتا ہے تو چیز ہی اور ہو جاتا ہے :۔

اے جوانمردو یہ ذلت کس لئے سہتے ہو تم	مرد ہو کر ٹھوکروں کی زد پہ کیوں رہتے ہو تم
سچ کہو تم ننگِ محکومی سے شرماتے نہیں	کیا تم اپنی عورتوں کے سامنے جاتے نہیں
کب نکالو گے تمنّائیں دلِ برباد کی	کیا ہوئیں تیغیں تمھارے نامور اجداد کی
اے جوانمردو، خدارا باندھ لو سر سے کفن	سر برہنہ پھر رہی ہے عزّتِ قوم و وطن

پاؤں میں تا چند زنجیرِ غلامی کی خراش
صرف اک جنبش، ابھی ہوتی ہیں کڑیاں پاش پاش

ایک نظم کا عنوان ہے "ملکوں کا رجز" اس میں جوشؔ نے مختلف ممالک کی ذہنیات کو واضح کرکے دکھایا ہے
بعض قطعات قابلِ ملاحظہ ہیں :۔

انگلستان:۔ مری روحِ عمل پر تنگ ہے عالم کی پہنائی — مرے پائے تجارت پر جلالِ تاجِ دارائی
مری مٹھی میں ہے خورشیدِ خاور، بحرِ بے پایاں — مری جودت کے آگے سرنگوں قوموں کی دانائی
معاذ اللہ! مرے پنجۂ ہمت کی گیرائی!!

جرمنی:۔ خرابی سے ہمیشہ درسِ استحکام لیتا ہوں — حریفوں کی نزاعِ باہمی سے کام لیتا ہوں
عروسِ ارتقا کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا — جو چھٹ جاتا ہے تو پھر بڑھ کر دامن تھام لیتا ہوں
خدا چاہے تو پھر اب تیغِ خوں آشام لیتا ہوں

روس:۔ رواں ہے تیغ میری گردنِ غفلت شعاری پر — مرا دل خون ہے مزدور کی فریاد و زاری پر
جھکے ہیں کشتِ دہقاں پر مرے امڈے ہوئے بادل — تپاں ہے برق میری خرمنِ سرمایہ داری پر
عرق ہے میری ہیبت سے جبینِ شہریاری پر

ترکی:۔ مرے افکار میں تہذیبِ نو کی کارفرمائی — پڑی ہے اک نئی صورت سے طرحِ بزم آرائی
"مریضِ جاں بلب" سمجھے ہوئے تھی جس کو اک دنیا — خدا کا شکر، اب ہے محشرِ زور و توانائی
توانائی کے پردے میں ہے اعجازِ مسیحائی

جوشؔ نے جاپان کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ نہایت افسوس ہے کہ وہ اب تقویمِ پارینہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے لکھتا ہے:۔

رہِ علم و عمل میں دیر سے ہنگامہ آرا ہوں — طلسمِ کاروبارِ شوق و طوفانِ تمنا ہوں
قسم کھائی ہے میری سعی نے بیدار بختی کی — میں ہر بازار کا یوسف ہوں، ہر صنعت کا دولہا ہوں
غرورِ ایشیا ہوں، محرمِ امروز و فردا ہوں

دیگر حقائق کی صداقت سے تو خیر انکار نہیں لیکن یہ بحث طلب امر ہے کہ جاپان کو بصورتِ موجودہ "غرورِ ایشیا" کہا جا سکتا ہے یا نہیں۔ ساتھ ہی ساتھ بیچارے ہندوستان کا رجز بھی سُن لیجئے:۔

[illegible]وں کا سمندر ہوں، درندوں کا بیاباں ہوں — عدو سے کیا غرض، اپنوں ہی سے دست و گریباں ہوں
خدا کے فضل سے بدبخت ہوں، بزدل ہوں، ناداں ہوں — مری گردن میں ہے طوقِ غلامی، پا بجولاں ہوں

درِ آقا پہ سر ہے، کفش برداری پہ نازاں ہوں!!

ہندو مسلم اتحاد | سیاسیات کے ضمن میں جوشؔ نے جس امر پر مخصوص روشنی ڈالی ہے وہ ہندو مسلم اتحاد کا مسئلہ ہے۔ ہمارے سیاسی زعماء عرصہ سے اس عُقدۂ لاینحل کو سلجھانے میں کوشاں ہیں اور بہت ممکن ہے کہ مستقبل قریب میں اس کا دلخواہ حل بھی ہو سکے۔ بہرحال یہ امر مسلّم ہے کہ سیاسی نقطۂ نظر سے یہ نہایت اہم مسئلہ ہے اور ایک سیاسی شاعر کے لئے اس کا التزام ناگزیر ہے۔ علاوہ ازیں چونکہ جوشؔ کے احساسات میں محبّت اجزاءِ اعظم کی حیثیت رکھتی ہے اس لئے اس امر کی خاطر سعی کرنا اس کے واسطے تقاضائے فطرت ہے۔ وہ خداوندِ عالم سے ملتجی ہے کہ:۔

دل ملتے ہیں جس نے سے امعبود وادہ نے ٹپکا
پیمانۂ ہندو میں، مینائے مسلماں میں

"دردِ مشترک" جوشؔ کی وہ نظم ہے جس میں یہ جذبہ بدرجۂ اتم کارفرما نظر آتا ہے:۔

سنتے ہیں طوفاں میں ڈوبا ہوا تھا اک درخت
جس کی چوٹی پر ڈرے بیٹھے تھے دو آشفتہ بخت

ایک انہیں سانپ تھا اور ایک سہما نوجواں
دو ضدوں کا ایک بھیگی شاخ پر تھا آشیاں

سچ ہے دردِ مشترک میں ہے وہ روحِ اتحاد
عشق میں جس سے بدل جاتے ہیں آئینِ نہاد

لیکن اے "عاقل" مسلمانو، "مدبّر" ہندوؤ!!
ہند کے سیلاب میں اک شاخ پر تم بھی تو ہو!!

"ہندو مسلم فساد" وہ المناک منظر ہے جو روزانہ ہمارے پیشِ نظر رہتا ہے۔ حقیقتاً اس قابلِ نفرین خصلت نے ہماری سیاسی زندگی کو منغّص کر دیا ہے۔ جوشؔ کو اس مضحکہ خیز حرکت سے نہ صرف افسوس ہوتا ہے بلکہ وہ اس کے کامل انسداد کی پُرزور تلقین کرتا ہے۔ علاوہ اس امرِ قبیح کے مضرت رساں نتائج کی بھی اشارہ کرتا جاتا ہے:۔

بہرِ خوشنودیٔ اغیار یگانوں کو نہ چھیڑ — اپنے ہی سر پہ جو چلتی ہے وہ تلوار نہ بن
متحّد عزم سے کر سدِّ سکندر تعمیر — باہمی جنگ سے گرتی ہوئی تلوار نہ بن

ایک دوسرے مقام پر اسی نظریہ کی تصریح کی ہے:۔

ابر بن بن کر برستی ہیں خبر بھی ہے تجھے؟ — گلشنِ اعدا پہ تیری باہمی خونریزیاں
حیف اے ہندوستاں، صد حیف اے ہندوستاں!!

ہندو مسلم فساد کی مابہ الامتیاز خصوصیت یہ ہے کہ اہم اختلافات کو ملحوظ رکھنے کی بجائے، ذبیحۂ گاؤ اور باجہ جیسے لایعنی وجوہات کی بنا پر یہ فسادات وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ مذہب کے نام پر اس قسم کی غیر معقول حرکات کرنے سے جوشؔ کو سخت کوفت ہوتی ہے۔ وہ لکھتا ہے:۔

یہ ستم کیا اے کنیزِ کفر و ایماں کر دیا — بھائیوں کو گائے اور باجے پہ قرباں کر دیا

ہندوستان کے سنجیدہ اور باخبر زعماء کو اس امر کا شدید احساس ہے کہ ہمارا ملک مختلف النوع اہم مشکلات میں مبتلا ہے اور ان مشکلات کا دلخواہ حل کرنے کے لئے، لابُد اور لازمی ہے کہ غیر ضروری اور لایعنی اختلافات کو محو کر کے اپنی توجہات اہم مسائل پر مرکوز کی جائیں۔ جوشؔ بھی اسی نظریہ کا مؤید ہے۔ ہندوستان سے خطاب کرتا ہے:۔

ہندو و مسلم نہیں اُٹھتے تری امداد پر — تُف ہے ایسی بے حمیّت، ناخلف اولاد پر
ہائے کیا کرنا تھا ان کو اور کیا کرتے ہیں یہ — گائے اور باجے پہ لڑنے کیلئے مرتے ہیں یہ

اس کے بعد ان غیر اہم امور کا شدید ترین ضرورت سے موازنہ کرتے ہوئے "گائے اور باجے" کو ذہنیت کا استخفاف کرتا ہے:۔

اس طرف ہے "خوبیٔ قسمت سے" باجا اور گائے — اُس طرف افلاس کے مارے ہوؤں کی ہائے ہائے

ناخلف بچے تری جانب نظر کرتے نہیں　　اُن کو جس میدان میں مرنا چاہیئے مرتے نہیں!!

اس کے بعد وہ کہتا ہے کہ فرقہ وارانہ مُناقشات سے نہ صرف ہماری تحریک آزادی میں جُمود و تعطّل پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے بلکہ اس سے فی الحقیقت یہ "حلقۂ عبودیت" تنگ تر ہوتا جاتا ہے:۔

سخت ہو جاتی ہے اس سے ہر کڑی زنجیر کی　　مار گرانیوں کو مرنا موت ہے خنزیر کی
اِن سے کہدے تا کجا بربادیاں؟ آباد ہو!　　یا گلے خود کاٹ کر مر جاؤ یا آزاد ہو!!

فلاسفۂ عالم کا خیال ہے کہ ہر شے کے دو پہلو ہوتے ہیں، روشن اور تاریک۔ رجائیت پسند حضرات (Optimists) کا وطیرہ یہ ہوتا ہے کہ وہ روشن پہلو پر اپنی نگاہیں مرکوز کر دیتے ہیں۔ برخلاف اس کے قنوطیت پسند (Pessimists) اشخاص صرف تاریک اور ظلمت آمیز رُخ کو ملحوظ رکھنا ہی اپنا فرض تصور کرتے ہیں۔ لیکن ایک غیر جانبدار شخص کو چاہیئے کہ دونوں پہلوؤں پر منصفانہ طریقے سے روشنی ڈالے۔ اب تک جوشؔ نے ہندو مسلم فساد کے تاریک پہلو پر نہایت سیر حاصل بحث کی ہے لیکن اس مسئلہ کے روشن رُخ پر بھی روشنی ڈالنا ازبس لازمی تھا۔ چنانچہ "بہتے ہوئے خون کی برادری" کے عنوان سے لکھتا ہے:۔

مژدہ باد، اے ایشیا، اے سرزمینِ زرفشاں!　　آگئی وہ ساعتِ بیدارئِ ہندوستاں
مژدہ باد! اے سرزمینِ ہند، اے جنّت سواد　　میان سے باہر نکلنے ہی پہ ہے تیغِ فساد
سُرخ پرچم کھولنے پر ہے سقاوت کا جنوں　　تیرے ذروں پر بہیگا ہندو و مسلم کا خون

آگے چل کر وہ اس تہنیت کی وجہ بیان کرتا ہے:۔

لیکن اس سے تو ہراساں ہو نہ اے ارضِ مراد　　خون کا سیلاب دھو دیتا ہے ہر بغض و عناد
رشتہ کٹ جاتا ہے بہتے خون سے اوہام کا　　خانہ جنگی غسلِ صحت ہے علیل اقوام کا
یاد رکھو جذبۂ غیرت میں جوش آ جائے گا　　خوں بہا تو ہندو و مسلم کو ہوش آ جائیگا
غنچۂ امیدِ اربابِ وطن کھِل جائے گا　　خاک پر بہتے ہی دونوں کا لہو مل جائے گا!!

جوشؔ کے بین الاقوامی، قومی اور سیاسی نقطۂ نظر پر بحث کرنے کے بعد ہم کو دیکھنا چاہیئے کہ اُس نے حیاتِ انسانی کی مشکلات اور مہمات کے دفعیہ کے لئے کیا لائحہ عمل پیش کیا ہے، اُس کا فلسفۂ حیات کیا ہے، اور اُس کے نظریات موجودہ حالت میں ہمارے لئے کس حد تک مفید ثابت ہو سکتے ہیں:۔

تحریکِ عمل انقلابیت کے ضمن میں یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ جوشؔ جمود و تعطّل کو بنظرِ استحقار دیکھتا ہے۔ بالفاظِ دگر اس کے نزدیک زندگی اور سعیٔ عمل، لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ انسان کی کامیابی کا راز مسلسل سرگرمِ عمل رہنے میں مضمر ہے۔ یعنی ہر شخص کو اپنے مدِّ نظر یہ مقولہ رکھنا چاہیئے کہ "لیس للانسان الّا ما سعیٰ"، ہر بشر کو حصولِ مقاصد کے لئے حتی الوسع ساعی رہنا چاہیئے جیسا کہ قرآنِ مجید میں مذکور ہے کہ "لها ما کسبت وعلیها ما اکتسبت"۔ جوشؔ کی شاعری میں اس نظریہ کی متعدد مقامات پر تلقین کی گئی ہے۔ مثلاً:۔

ہر شے کو مسلسل جنبش ہے، راحت کا جہاں میں نام نہیں
اس عالمِ سعیٔ و کاوش میں انساں کیلئے آرام نہیں

اس بزمِ ملش کا ہر ذرہ بیچینوں کے انبوہ میں ہے
اک رعشۂ پیہم کاہ میں ہے، اک لرزشِ پنہاں کوہ میں ہے

اقبالؔ مرحوم نے بھی اسی نظریہ کی تائید کی ہے:۔

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

"ہستیٔ بیتاب" میں جوشؔ نے اسی خیال کو اس طرح ادا کیا ہے:۔

سکوں نہ ڈھونڈ کہ صبحِ ازل سے ہے اب تک
ضمیرِ ارض و سما، روحِ مرد و زن بیتاب

بالآخر لکھتا ہے:۔

غرض کہ شرح کہاں تک ہو، مختصر یہ ہے
کہ انجمن کی ہے اے جوشؔ انجمن بیتاب

دنیا کی تاریخ کا بغور مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ جتنے انقلابیت پسند مصلحین دنیا کی مختلف

ممالک میں رونما ہوئے وہ سب نہ صرف خود باعمل تھے بلکہ مُحرّکینِ عمل بھی تھے یعنی دیگر ابنائے زمانہ کو سخت کوشی اور اعلائے ہمت کی تعلیم دیتے تھے۔ جوشؔ بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں۔ اسکا بھی قول ہے:۔

نظر ہے اوج پہ جنبش میں ہے پرِ پرواز　　بساطِ خاک پہ لب فرصتِ قیام کہاں
تغیرات کی روسے گذر رہی ہے نگاہ　　اب اہتمامِ تماشائے حسنِ بام کہاں
نگاہ میں ہے جوانانِ برق رو کی روش　　اب اقتدائے حریفانِ نرم گام کہاں

"حریفانِ نرم گام" کی آہستہ خرامی سے جوشؔ کو فی الحقیقت دلی اذیت ہوتی ہے لیکن پھر بھی وہ ساعی ہے کہ کم ازکم اس کے مخاطبین ہی اِس وبائے تعطّل سے محفوظ رہ سکیں:۔

فسردہ گامیٔ اہلِ جہاں کے حلقے میں　　جواں خرامیٔ ابرِ بہار پیدا کر
ضمیرِ اہلِ مناجات کے تعطّل میں　　خروشِ جذبۂ تکمیلِ کار پیدا کر
جمی ہوئی ہے دماغوں پہ برف مدّت سے　　دلوں میں دولتِ برق و شرار پیدا کر

پیغامِ بیداری کن ولولہ انگیز الفاظ میں ادا کیا ہے:۔

دم بھر تو کبھی غور کر اے خفتہ مقدر　　مادہ تجھے قدرت نے بنایا ہے کہ ہے نر
یا اوڑھ لے اے زہرہ جبیں مقنع و چادر　　یا کھینچ لے اے مردِ خدا میان سے تلوار

بیدار ہو بیدار ہو بیدار ہو بیدار

مقاومت مصائب | اس تمام بحث سے یہ تو ثابت ہو گیا ہو گا کہ جوشؔ سعیٔ پیہم کی تلقین کرتا ہے لیکن اس سلسلہ میں ایک خاص امر کی جانب اشارہ کر دینا ضروری ہے۔ جوشؔ کے نزدیک زندگی نام ہے تحریکِ مسلسل کا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ انسان کو چاہئے کہ ابتلائے آلام کی حالت میں اپنی سعیٔ و کاوش میں مزید اضافہ کر دے اور دنیا کو دکھا دے کہ رنج و مصائب میں جوہرِ بشریت کس طرح نمایاں ہوتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے:۔

نوجوانی میں مصائب سے ڈرتا ہے مجھے — ناصحِ ناداں! یہ ہے وہ موسمِ برق و شرر
عالمِ کیف و جنوں میں مارتی ہے قہقہے — زندگی جب موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالکر

عیش و انبساط کی زندگی گذارنا فی الاصل حد درجہ آسان ہے۔ ہر وہ شخص جس میں اوسط درجہ کی صلاحیت موجود ہو ایسا کر سکتا ہے۔ انسان کا عیارِ لیاقت فی الحقیقت ابتلائے رنج و مصیبت میں منصۂ شہود پر آتا ہے۔ جوشؔ کے پیغام کا عنصرِ مخصوص یہ ہے کہ وہ ہم کو ان صبر آزما لمحات میں بھی تحریکِ عمل کی تلقین کرتا ہے اور کہتا ہے کہ:۔

بہار میں تو زمیں سے بہار اُبلتی ہے — جو مرد ہے تو خزاں میں بہار پیدا کر

قرانِ مجید میں شعرار کے متعلق مرقوم ہے کہ انھم یقولون ما لا یفعلون۔ بالفاظِ دگر ان کے قول و فعل میں تطابق نہیں ہوتا امرِ واقعی بھی یہ ہے کہ شعرا محض زبانی لن ترانیاں کیا کرتے ہیں، وہ عملی تحریکات کے مردِ میدان نہیں ہوتے۔ لیکن جوشؔ کا نظریہ اس نوع کے شعراء سے قطعاً مختلف ہے۔ وہ کہتا ہے:۔

زباں کی بزم میں گلکاریوں سے کیا حاصل — عمل کی راہ میں گرد و غبار پیدا کر

لطیف الدین احمد اکبر آبادی کا یہ قول بیشتر نقل کیا جا چکا ہے کہ "جوشؔ کی شاعری اُن کے کردار کا آئینہ ہے اور اگر کسی سبب سے اُن کے حالاتِ زندگی ناپید ہو جائیں اور کلام محفوظ رہے تو آئندہ کسی کے لئے بھی اُن کے کلام سے اُن کا تذکرہ مرتب کر لینا دشوار نہ ہوگا۔" ان حقائق کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم جوشؔ سے یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے:۔

وَاَرَاكَ تفعل ما تقول وبعضهم — مذِق اللسانِ یقول ما لا یفعلُ

(یعنی تو جو کہتا ہے اس پر عمل کر کے دکھاتا ہے، برخلاف اسکے دیگر شعرا محض فضول گو ہیں، ان کے قول و فعل میں مطابقت نہیں)

شکوۂ روزگار کچھ عجیب اتفاق ہے کہ دنیا میں جتنے باکمال حضرات گذرے ہیں سب اپنے ابنائے زمانہ سے

غیر مطمئن اور فلکِ کج رفتار کے شاکی رہے ہیں ۔ واقعۃ الامر یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے دورِ حیات میں مستقلاً مورد آلام رہے۔ جوش کے کلام سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تکالیفِ زمانہ کے باعث بیحد شکوہ ریز ہیں علی الخصوص "فکرِ روزگار" سے اُس کو اذیتِ قلبی ہوتی ہے۔ لکھتا ہے:۔

آہ اے دورِ فلک تیرا نہیں کچھ اعتبار — مٹ کے رہتی ہے ترے جورِ خزاں سے ہر بہار
نوعِ انساں کو نہیں تیری ہوائیں سازگار — فکرِ دنیا اور شاعر! تف ہے اے لیل و نہار!

موج کو ترو توقف ہو اور تشنہ کامی کے لئے!
خواجگی رختِ سفر باندھے غلامی کے لئے!

ایک جگہ اپنے طرزِ خاص میں یہی مفہوم اس طرح بیان کیا ہے:۔

ڈالتا ہے بار کوئی شاعرِ مدہوش پر — حُسن کے بکھرے ہوئے ہیں بال میرے دوش پر

پھر اس کی شکوہ سنجانہ تصریح کی ہے:۔

بجلیاں جس نخل پر رقصاں ہوں پھل سکتا نہیں — تیری اس دنیا کا مجھ سے کام چل سکتا نہیں
میں پروں کو تولتا ہوں آشیانے کو سنبھال — یہ ہے دنیا اور اپنے کارخانے کو سنبھال

"چراغِ عظمت" کے عنوان سے جو نظم لکھی ہے وہ بھی انہیں خیالات کی آئینہ دار ہے:۔

یہ ہے تیرا ہی چراغ اے شاعرِ رنگیں صفات — لیکن اس سے فیض اُٹھا سکتی نہیں تیری حیات
اس کو پا سکتا نہیں تو بزمِ عشرت کے لئے — یہ تو ہے ناداں تیری لوحِ تربت کے لئے

ہو گی تیری تیرہ قسمت زندگی جب خواب میں
جگمگائے گا یہ تیری موت کی محراب میں

غم کوشی و ایذا پسندی لیکن جوش ان تکالیفِ روزگار سے تنگ آ کر مائل فریاد نہیں ہوتا بلکہ ان میں یک گونہ تلذذ محسوس کرتا ہے۔ اس کو احساس ہے کہ جمیع عالم اس کے درپئے آزار ہے لیکن وہ متبسمانہ انداز سے ان تمام مصائب کا خیر مقدم کرتا ہے وہ اس عقیدہ میں اقبال کا ہم آہنگ ہے کہ:۔

درماں ز درد ساز اگر خستہ من شوی — خوگر بخار شو کہ سراپا چمن شوی

بالکل اسی طرح جوشؔ کا پیغام بھی یہی ہے کہ انسان کو چاہیئے کہ اپنی فطرت کو غم واندوہ کا خوگر بنانے میں کوشاں رہے تاکہ درد خود دوا ہو جائے، زخم کی کرب و تکلیف کا احساس ہونے کی بجائے اس کے منہ سے یہ نکلے کہ:۔

اُٹھی جاتی ہے دل سے ہیبتِ آلامِ روحانی — جراحت بہرِ قلبِ زار مرہم ہوتی جاتی ہے!

پیشتر عرض کیا جا چکا ہے کہ جوشؔ "فکرِ روزگار" کا شاکی ہے۔ لیکن اس سے یہ نہیں مستلزم نہیں ہوتا کہ وہ ان مصائب سے گھبرا جاتا ہے۔ نہیں!۔ بلکہ اس کے اس شکوہ سے بھی ایک قسم کی "لذّت" مترشح ہوتی ہے۔ "خشونتِ انتقام" کا جذبہ سراسر مفقود ہے۔ بالفاظِ دگر زمانہ کی کلفتوں کا احساس اس کو ضرور ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ کہتا ہے:۔

مانوس ہو چکا ہوں غمِ روزگار سے — اب ذکرِ آب و رنگِ تمنّا نہ کیجئے

سینہ مآلِ ذوقِ طرب سے ہے چاک چاک — اب فتنۂ نشاط کا در، وا نہ کیجئے!

ذرا مختلف الفاظ میں یہی مضمون لکھتا ہے:۔

اب اے خدا! عنایتِ بیجا سے فائدہ — مانوس ہو چکے ہیں غمِ جاوداں سے ہم

معشوق کی بے التفاتی اور اس کے ظالمانہ رویّہ کی شکایت اور ہجر و مفارقت میں آہ و زاری کرنا دنیائے تغزّل میں درحقیقت "داخلِ فیشن" ہو گیا ہے۔ لیکن جوشؔ کا نظریہ ان "رسمی مقلّدین" سے مختلف اور ساتھ ہی ساتھ مستحسن ہے۔ وہ کہتا ہے:۔

سنتا ہوں دردِ عشق ہے ہر درد کی دوا — آ، اور میرے دردِ جگر کو دوچند کر

بے نیازی اور مستغنی المزاجی اس کی صفتِ مخصوص ہے:۔

اب خانۂ اُمید میں ظلمت ہی نور ہے — تکلیفِ اہتمامِ چراغاں نہ کیجئے

اب دل کو بزمِ ناز کی حسرت نہیں رہی — اب عذرِ بدمزاجیِ درباں نہ کیجئے

اس طرف بے رُخی ہے درماں سے　　　اس طرف ہے پرستش آزار!

فلسفۂ عالم | جوشؔ کے نظریۂ شاعری کے ضمن میں بیان کیا جا چکا ہے کہ ایک شاعر کا فرض ہے کہ حیاتِ انسانی کے مختلف پہلوؤں کا بنظر تعمق مطالعہ کرے اور ان کی نسبت ذمہ دارانہ رائے قایم کرے۔ شاعری چونکہ اصلاً جذباتِ انسانی میں تاثر پیدا کرنے کا بہترین آلہ ہے اسلئے اگر بعض حکیمانہ نکات کسی شاعر کی زبان سے سُنے جائیں تو اس کا اثر نسبتاً فلاسفہ کے یبوست ریز اشارات سے کہیں زیادہ ہوگا۔ جوشؔ نے فلسفۂ عالم پر جس سنجیدگی سے اظہار خیال کیا ہے اور جس لطیف و دلاویز پیرایہ میں اِن مُتعلق مسائل کا استقصار کیا ہے اس کی داد دینا ہر اہلِ نظر کا فرض ہے۔ ایک محدود مقالہ میں ان مسائل کو بالتفصیل بیان کرنا تو اصولاً مناسب نہیں، لہذا ہم حتی المقدور مختصر لیکن جامع بحث کریں گے۔

بے ثباتیٔ عالم | مفکرینِ عالم نے متفق اللفظ ہو کر دنیا کی بے ثباتی کو تسلیم کیا ہے اور موجوداتِ عالم کی ناپائداری اور دیانت کو بنظرِ استحقار دیکھا ہے۔ جوشؔ نے حقایقِ عالم کی روشنی میں اس مسئلہ کو اس طرح پیش کیا ہے:۔

یہ کیا نظام ہے، معبود! باغِ ہستی کا　　　کِھلے جو صبح کو وقتِ غروب کملا جائے

جب ایک دم میں ہو تعمیر ماہ و سال خراب　　　تو کوئی کس لئے آخر فریبِ ہستی کھائے

بعض اشیاء اس قدر غیر معروف ہوتی ہیں کہ جب تک ان کے سلسلۂ تبئین میں بعض اشیائے معروفہ کا حوالہ نہ دیا جائے ذہنِ انسانی آسانی سے ان کی جانب نہیں منتقل ہوتا۔ تشبیہ کا اصل مقصد یہی ہوتا ہے۔ معہذا بیان میں ایک قسم کی لطافت و ندرت پیدا کرنے کے لئے بھی تشبیہات استعمال کی جاتی ہیں، جوشؔ کو ان اُمور کا کامل احساس ہے چنانچہ مسئلۂ متذکرۂ صدر کو اس طرح بیان کرتا ہے:۔

سبق عبرت کا اے، ناداں، بالوں کی سفیدی سے　　　کفن اوڑھا ہے جیتے جی نگارِ زندگانی نے

نظر کر جھرّیوں سے شیب کے سمٹے ہوئے رخ پر　　یہ وہ بستر ہے دم توڑا ہے جس پر نوجوانی نے

یہی حقیقت ایک دوسری جگہ اس طرح بیان کی ہے:۔

آج خاکستر ہے کہتے تھے جسے کل تک حیات!　　زندگی کیا تھی تری لے دے کے اتنی کائنات؟
آہ اے موجِ نفس پر کانپنے والے حباب　　منحصر ہے چند سانسوں پر ترا شیب و شباب

بے ثباتیٔ عالم وہ حقیقت ہے جس کو تاریخی تجربات نے بالتواتر ثابت کر دیا ہے۔ چنانچہ جوشؔ نے اسی بحث کو تاریخی حقایق کے حوالہ کے ساتھ اس طرح پیش کیا ہے:۔

نظر کی ہے غلطی تختِ قیصر و جمشید!　　سراب کی ہے چمک تاجِ نادر و پرویز!!

جدّتِ ادا، ندرتِ بیاں اور رنگینی، جوشؔ کی مختص صفات ہیں چنانچہ ان محاسن کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہتا ہے:۔

بتاؤ اے شعلہ خو شعاعو، یہ رنگ کیا ہو گیا چمن کا　　ابھی تو یاں بادِ صبح گاہی کلوں کو جھولا جھلا رہی تھی
نظر اٹھی تو گلاب دیکھا، پلک جو جھپکی تو خار پایا!　　سنا کہ فصلِ گل آ رہی ہے، چمن میں پہونچے تو جا رہی تھی

بڑھے لپکتے ہوئے خوشی میں، دکھایا دریا جو تشنگی نے　　قریب پہونچے تو ریگ صحرا شعاعوں سے جگمگا رہی تھی
اٹھی جو میداں میں گرد پیہم، اٹھے کہ لیلیٰ کی ہے سواری
گئے امیدیں لئے تو دیکھا، ہوا بگولے اڑا رہی تھی!!

تلوّنِ زمانہ | اہلِ زمانہ کا دستور ہے کہ معزز اور کامیاب افراد کی ہمنوائی کرتے ہیں لیکن جب تقدیر منہ موڑ لیتی ہے اور ان صاحبانِ تموّل و تنعّم کی جاہ و ثروت روبہ انحطاط نظر آتی ہے تو جمیع اہلِ عالم مغائرت و بے اعتنائی برتنے لگتے ہیں۔ جوشؔ نے مذکورۂ ذیل قطعہ میں اسی حقیقت کی جانب اشارہ کیا ہے:۔

ہنسا میں اور زمانہ کی خوشی کا چڑھ گیا پارہ
معاً دنیا نے میرے قہقہے پر قہقہہ مارا

مگر کھنچی جب آہِ سردِ قلبِ ناشکیبا نے
تو غمخواری کجا! مڑ کر نہ دیکھا مجھ کو دنیا نے

کہا میں نے کہ اے وہ زلف اجو برہم نہیں ہوتی
شریکِ عیش ہوتی ہے اشریکِ غم نہیں ہوتی

یہ سنتا تھا کہ دنیا نے کہا نیچی نگاہوں سے
کہ مجھ کمبخت کو فرصت نہیں خود اپنی آہوں سے!

اجتماعِ رنج و مسرت جیسا کہ پیشتر بیان کیا گیا ہے، مسائلِ حیات کی مطالعہ کن نگاہیں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ (۱) رجائیت پسند (Optimist) اور قنوطیت پسند (Pessimist)۔ اوّل الذکر زاویہ نگاہ کا یہ مقصد ہوتا ہے کہ ہر مسئلہ کے روشن پہلو کو ملحوظ رکھا جائے اور اس کے تاریک رخ کو نظر انداز کر دیا جائے۔ برخلاف اس کے، قنوطیت پسند حضرات اپنی توجہات کسی شے کے تاریک و ظلمت آمیز رخ پر ہی مرکوز کر دیتے ہیں اور اس کے معائب و اسقام کا مدنظر رکھنا ہی اپنا فرض متصور کرتے ہیں۔ جوشؔ کو بالعموم "قنوطیت پسند" شاعر کہا جاتا ہے۔ تقریباً تمام ناقدین نے اسی نظریہ کی تائید کی ہے لیکن اس کے کلام کا بنظرِ استیعاب مطالعہ کرنے سے احساس ہوتا ہے کہ مبصرین کا یہ نظریہ خود اپنی جگہ پر قنوطیت آمیز ہے! جوشؔ بدرجۂ اوّل رجائیت پسند شاعر ہے و گرنہ حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک غیر جانبدار مبصر کی حیثیت سے ان دو انتہا پسند نظریوں میں توازن قایم رکھنا چاہتا ہے۔ جوشؔ کی رجائیت پسندی (Optimism) پر ہم آگے چل کر بحث کریں گے یہاں اس کے اس "توازنِ رجائیت و قنوطیت" پر سرسری ڈالنا لازمی ہے۔

سب سے پہلے وہ دکھاتا ہے کہ دنیا میں مسرت و انبساط کو مستقبل کے مصائب و آلام کا پیش خیمہ سمجھنا چاہیئے کیونکہ عیش و غم درحقیقت لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں:۔

تیرگی لپٹی ہوئی ہے دہر میں ہر ضو کے ساتھ
عربدہ کرتا ہے یاں ہر راستہ رہرو کے ساتھ

حسنِ شیریں و غرورِ تاج کے ہوتے ہوئے
تیشۂ فرہاد کا دھڑ کا بھی ہے خسرو کے ساتھ

انجمن میں رات کو چپکے سے پا جاتا ہے بار ‏ ‏ ‏ فتنۂ ظلمت نشاں بھی روشنی کی ضو کے ساتھ

اِس نوع کے اشعار کی بنا پر بعض ظاہر بیں نگاہیں جوشؔ کو قنوطیت پسند سمجھنے لگتی ہیں۔ لیکن اِس کے بعد والی نظم میں ہی وہ تصویر کا دوسرا رُخ بھی پیش کر دیتا ہے:۔

صرف ظلمت ہی نہیں ہے، دیکھ تنویریں بھی ہیں ‏ ‏ ‏ کاوشِ تخریب کی ہلچل میں تعمیریں بھی ہیں
جس جگہ مایوسیاں ہیں گردشِ تقدیر سے ‏ ‏ ‏ واں کہیں اُمید کی پوشیدہ تدبیریں بھی ہیں
جس جگہ پانی میں ہے زہرِ ہلاہل کا اثر ‏ ‏ ‏ واں ہوا میں چشمۂ حیواں کی تاثیریں بھی ہیں
جس جگہ دوڑی ہوئی ہیں سنگِ خارا کی رگیں ‏ ‏ ‏ واں درخشاں جوہروں کی نرم تحریریں بھی ہیں

رجائیت پسندی انسان فطرتاً اطمینانِ نفس چاہتا ہے۔ اور اطمینانِ نفس نام ہے ذہن و عقل کے اطمینان کا۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ذہنِ انسانی مختلف ذرائع مُرتب کرتا ہے۔ جن میں سے ایک نہایت کامیاب طریقہ یہ ہے کہ وہ ہر شے کے روشن ترین اور دل خوش کن پہلوؤں کا التزام کرتا ہے اور برخلاف اس کے تاریک اور ظلمت آمیز رُخ کو نظر انداز کرنے کی کوشش کرتا ہے اس سے قبل ہم نے جوشؔ کے رجائیت پسندانہ (Optimistic) زاویۂ نگاہ پر مختصر روشنی ڈالی ہے۔ یہاں ہم اُس کے وہ اشعار نقل کرتے ہیں جو بالتصریح اُس کے نظریۂ رجائیت کی تائید کرتے ہیں:۔

ہر نقص کی بزمِ کاوش میں تکمیل کا شعلہ لرزاں ہے ‏ ‏ ‏ ہر موجِ تباہی کے اندر جبروتِ حیاتِ انساں ہے

کس قدر آئینۂ تائیدِ ہر تردید ہے ‏ ‏ ‏ شرک بھی دیکھا تو اک بھٹکی ہوئی توحید ہے

اس جنگ و جدل کے حیلے سے بیچین ہیں قومیں ملنے کو ‏ ‏ ‏ پژمردہ دلوں کے سینوں میں بیتاب ہیں غنچے کھلنے کو
جتنی بھی یہ دنیا اپنی شرارت حد سے بڑھاتی جاتی ہے ‏ ‏ ‏ اُتنی ہی حدودِ نیکی سی نزدیک تر آتی جاتی ہے

سینے سے اندھیری راتوں کی چھنتی ہے ضیا انسانوں میں   فطرت کا نظامِ تعمیری ہے گرمِ عمل طوفانوں میں
بادل کی گرج ہو یا نغمہ، شب ہو کہ صباحِ نورانی
ہر چیز میں ہے سرگرم تپش، خورشیدِ عروجِ انسانی

سارق بھی فرشتوں ہی کی طرح تسکین و طرب کا جویا ہے   ہر چند کہ اُس نے قسمت سے تسکین کا رستہ کھویا ہے
رہبر ہو کہ رہزن دونوں میں تسکیں کی خواہش یکساں ہے   ہر چند وہ سیدھی راہ پہ ہے، یہ راہ بھٹک کر حیراں ہے!

عارف نے یہ سمجھا آسائش اشکوں کو گرا کر ملتی ہے   قاتل نے یہ سمجھا، انساں کا وہ خون بہا کر ملتی ہے
پس ذوقِ طرب میں جو انساں رہتا ہے سدا میخانوں میں   ہے اصل میں وہ بھی دُنیا کے معصوم ترین انسانوں میں

جتنے بھی زمیں پر مجرم ہیں خواہش ہی کے زیرِ فرماں ہیں   ہر جرمِ سیہ کے محضر پر خواہش ہی کی مہریں تاباں ہیں
المختصر ان تشریحوں سے ہم پر یہ حقیقت کھلتی ہے
کہتے ہیں جسے دنیا میں "بدی" بھٹکی ہوئی وہ اک "نیکی" ہے

سرگرم ہے روحِ جنگ و جدل تیغوں کے مُعطّل کرنے میں   مصروف ہیں سارے نقص یہاں انساں کو مکمّل کرنے میں
دُھن، خونِ دلِ امروز کو ہے گلکاریِ فردا بننے کی   تیزاب کے دل میں کھولن ہے تریاق کا دریا بننے کی

خونریز فضا سے طیّارے غاروں میں اُترنے والے ہیں   پستی کے دُھوئیں سے چمکیلے مینار اُبھرنے والے ہیں

کہتا ہے حوادث کو جو بُرا، ہمدرد نہیں ہے ظالم ہے!!   در اصل وہ روحِ عالم کی ہمّت شکنی کا مجرم ہے

انساں کو خبر دو فطرت کے ارمان نکلنے والے ہیں
لوہے کی جبیں سے چاندی کے فوّارے چلنے والے ہیں

فکرِ امروز جوش نے دنیوی آلام و مصائب کا جو پُر درد شکوہ کیا ہے اس پر ہم کافی بحث کر چکے ہیں۔ لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کے نزدیک ان مصائب و تکالیف کا علاج کیا ہے؟ کیا انسان کو لازم ہے کہ ان مصیبتوں پر مستقلاً غور و فکر کیا کرے اور ہمیشہ تصویرِ غم بنا رہے؟ جوش نے اس مسئلہ کا حل یہ پیش کیا ہے کہ "فکرِ فردا" کو لایعنی متصوّر کریں اور صرف "امروز" کو لائقِ توجہ سمجھیں۔ اس طرح نہ صرف ہماری مشکلات میں معتد بہ کمی ہو جائیگی بلکہ ہمارے قلب کو کامل سکون اور اطمینان نصیب ہو سکیگا۔ چنانچہ لکھتا ہے:۔

چہرۂ "امروز" ہے میرے لئے ماہِ تمام — خوفِ "فردا" ہے مری رنگیں شریعت میں حرام

اسی نظریہ کے ماتحت ایک دوسرے مقام پر رقمطراز ہے:۔

دورِ مینی و جوانی، یہ تماشا کیسا؟ — عیشِ "امروز" کے طوفاں میں "فردا" کیسا؟

ذرا مختلف الفاظ میں اسی نظریہ کا انتہا پسندانہ رُخ ملاحظہ فرمائیے:۔

اک مضحکہ ہے پرسشِ عقبیٰ مرے آگے — اک وہم ہے اندیشۂ فردا مرے آگے!

فلسفۂ تلذّذ "فکرِ امروز" کا فلسفہ جب منتہائے غلو پر پہونچ جاتا ہے محض "فکرِ اینِدم" اور بعدہٗ "ذکرِ کی" کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یہ وہ کیفیت ہے کہ جب انسان دُنیا و مافیہا سے بے تعلقی کا اظہار کرتے ہوئے صرف عیش کوشی کی تلقین کرنے لگتا ہے۔ فلسفۂ تلذّذ (Epicurean Philosophy) اسی کا نام ہے۔ اس نظریۂ حیات کا مقصد ہے کہ صبح و شام "کلوا واشربوا" میں مصروف رہنا چاہئیے اور "خوش باش دمے کہ زندگانی اینست" کے نظریہ پر عمل کرنا چاہئیے۔ بالفاظِ دیگر انسان اپنے مدِّ نظر صرف یہ مقولہ رکھ کر۔

نوروز و نو بہار و مے و دلبر با خوش است — بابر بہ عیش کوش، کہ عالم دوبارہ نیست!!

شدّتِ آلام کو زائل کرنے کیلئے جوش نے یہی علاج تجویز کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

اُٹھا کہ تعمیرِ حیاتِ گذراں کچھ بھی نہیں / جز مئے ناب، سروبرگِ جہاں کچھ بھی نہیں
آنکہ یہ وسوسۂ ارض و سما ہے بیکار / اُٹھ کہ یہ واہمۂ سود و زیاں کچھ بھی نہیں

اس کے بعد صاف صاف کہتا ہے کہ:۔

مرضِ زیست کا اے جوشؔ، زمانے میں علاج / جز مئے کہنہ و معشوقِ جواں کچھ بھی نہیں!!

اشعارِ ذیل میں بھی اسی فلسفۂ تلذذ (Epicurean Philosophy) کی تلقین کی گئی ہے:۔

شرابِ ناب طلب کر کہ تجھ پہ کھل جائے / کہ آسماں گہر افشاں، زمیں ہے نکہت بیز
انڈیل ساغرِ زریں میں آتشِ سیّال / جو چاہتا ہے کہ ہو نبضِ شادمانی تیز

کسے نصیب یہ دو نعمتیں زمانے کی / شرابِ کہنہ و گلبانگِ ساقیِ نوخیز

عیدِ گل ہو اور ہجومِ ساقیانِ سیم ساق / ایسی اک گردش بھی ہاں اے گنبدِ فیروزہ طاق
یوں بساطِ عیش پر ہو چنگ و بربط کا خراش / لحن میں تبدیل ہو جائے فغانِ اشتیاق
جھوم کر چھا جائیں مستی کی گھٹائیں روح پر / کیسی دنیا؟ بلکہ خود عقبیٰ کو بھی دیدیں طلاق
خرمنِ حکمت جلا دے مُطربوں کی برق سے / صولتِ عصمت مٹا دے میکشوں کا طمطراق

محوِ عشرت ہو بہ فرمانِ شبابِ عشوہ کار / گرم جلوت ہو بہ زعمِ زاہدِ خلوت نشیں
اس بھری برسات میں طوفان بن کر مے پلا / کھول دے پُرپیچ و خم زلفیں، اُلٹ دے آستیں

فرصتِ عشرت غنیمت ہے خدارا ہوشیار / زندگی ہے تیغ در دست و کفن در آستیں

صراحی اُٹھا اور دھومیں مچا دے — گلابی اُٹھا اور گل افشانیاں کر
مٹا داغِ ہوش اور مدہوش بن جا — اُٹھا جامِ زر اور سلطانیاں کر
علم کھول کر جوشؔ بدمستیوں کے — جہاں داریاں کر، جہاں بانیاں کر

کیا دین ہے؟ کیا دنیا؟ شاعر کی بلا جانے — گردن میں ہیں وہ باہیں، گردش میں ہیں پیمانے!!

مذہب | مذہب، انسان کی حیاتِ اجتماعی کا مخصوص جزو ہے۔ کسی مفکر کے فلسفۂ حیات پر بحث و تبصرہ کرتے ہوئے اس کے مذہبی رجحانات کا تذکرہ کرنا ناگزیر ہے۔ جوشؔ کے مذہبی عقائد ایک سلسلۂ ارتقاء میں منسلک نظر آتے ہیں۔ امتدادِ زمانہ کے ساتھ ہی ساتھ ہم اُس کے عقیدوں میں بھی ایک خاص تبدیلی محسوس کرتے ہیں۔ جوں جوں زمانہ گذرتا جاتا ہے جوشؔ کے مذہبی رجحانات میں تدریجی انقلابیت رونیر ہوتی جاتی ہے۔ ابتدائی دور میں وہ فلسفۂ تشکیک (Scepticism) سے متاثر نظر آتا ہے لیکن آخرالامر یہی تشکیک ایک مستقل نظریۂ مذہب کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ جوشؔ کے مذہب کے بارے میں لطیف الدین احمد اکبرآبادی کا قول ہے :۔ "جوشؔ کی رندی، کفر والحاد کی حد تک ہے لیکن اس کفر والحاد میں نیکی و پاک نفسی شامل ہے، کیونکہ مذہب کی روح محبت و احترامِ انسانیت ہے اور اُس کی جوشؔ کے یہاں کمی نہیں"۔

میں نے جوشؔ کے اس مذہبی ارتقاء کو تین ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ اور یہ تقسیم اس قدر بیّن اور صریح ہے کہ کسی مزید تبصرہ کی گنجائش نہیں۔ لہٰذا محض اشعار نقل کرنے پر اکتفا کی جاتی ہے جس سے قارئین جوشؔ کے مذہبی نقطۂ نگاہ کا خود بخود اندازہ لگا سکیں گے۔ یہ ضرور ہے کہ بعض مقامات پر طرزِ ادا میں غیرسنجیدگی پیدا ہو گئی ہے جس کو میں ذاتی حیثیت سے پسند نہیں کرتا۔ لیکن چونکہ سلسلۂ بیّن میں جوشؔ کے مذہبی نظریات کا ذکر بھی ناگزیر تھا اس لئے میں وہ اشعار علی الترتیب نقل کئے دیتا ہوں۔ ان سے اتفاق و اختلاف کرنا

ہر شخص کے ذوقِ نظر پر منحصر ہے۔

دورِ اوّل | ۱۔ "آے خدا"!:۔

صبحِ اسلام پہ ہے تیرہ شبی کا پرتو　　لبِ مُسلم سے ہٹا تشنہ لبی کا پرتو
کانپ کر ماند ہو راحت طلبی کا پرتو　　ڈال سینوں پہ رسولِ عربی کا پرتو
عُمل ہو وہ حوصلۂ شوق دوبارہ نکلا
وہ چمکتا ہوا اسلام کا تارہ نکلا

۲۔ مومنو، اسلام کی تائید کی تم کو قسم　　بُت پرستی چھوڑ دو، توحید کی تم کو قسم
۳۔ آب آستانِ کفر پہ ہیں سجدہ ریزیاں　　اے کردگار، مردِ مسلماں کو کیا ہوا!
قبضوں پہ ہاتھ ہیں نہ جبین ہیں خاک پر　　ذوقِ جہاد و جذبۂ عرفاں کو کیا ہوا!
۴۔ "اے مومنانِ لکھنؤ!":۔
یہ نہیں کہتا کہ شاہنشاہ پر تم روئے کیوں!　　آنسوؤں سے نامۂ اعمال تم نے دھوئے کیوں!
دل پہ حالت کیوں ہوئی طاری غم آورد قوم کی　　چوڑیاں کیوں کی گئیں ٹھنڈی عروسِ قوم کی
سخت حیراں ہوں مگر اے اُمتِ بدرِ حُنین　　دنیوی تصویرِ غم کا شیشہ ہو خونِ حُسینؑ
پختگی ایمان کی ہو مجروح وہمِ خام سے
خون کی بوندیں ٹپکتی ہیں دلِ اسلام سے!

دورِ دوم | ۱۔ ذاکر سے خطاب:۔

خانۂ برباد ہے دولت سرا تیرے لئے　　اک دفینہ ہے زمینِ کربلا تیرے لئے

کیا بتاؤں کیا تصوّر تو نے پیدا کر دیا　　غیرتِ حق کو زمانہ بھر میں رُسوا کر دیا

کربلا و خونِ مولا کو تماشا کر دیا　　"آبِ رُکنا باد و گلگشتِ مُصلّےٰ" کر دیا

مشقِ گریۂ عیشؑ کی تمہید ہے تیرے لئے
عشرۂ ماہِ محرم، عید ہے تیرے لئے!!

سازِ عسرت ہے تجھے ذکرِ امامِ مشرقین　　ڈھالتا ہے تیرے سکّے بستگانِ غم کا بین
تیری دار الضرب ہے اہلِ عزا کا شور و کین　　سر جُھکا لے شرم سے اے تاجرِ خونِ حسینؓ

ذہن میں آتا ہے جس کا نام تلواروں کے ساتھ
اُس کا ماتم اور ہو سکّوں کی جھنکاروں کے ساتھ

ہاتھ ہو ماتم میں تیرا سینۂ افگار پر　　اور حسینؓ ابنِ علیؓ کا ہاتھ تھا تلوار پر
ذہن کو بیچارگی سے اُنس پیدا ہو گیا!!　　اشجعِ عالم کے پیرو! یہ تجھے کیا ہو گیا!

۲۔ "ہوشیار":۔

خانقاہوں سے بچا دامن کہ یاں ہیں پُرتکار　　بیٹھے ہیں دبکے کمیں گاہوں میں نقلی دیندار
شیعہ و سُنّی میں ابتک صرف ان کی فیض سے　　ایک ننگِ پنجتن ہے ایک ننگِ چار یار
جُرم کی تاریخ کہتی ہے بآوازِ بلند　　مجرموں سے بڑھ کے اس فن میں ہیں مُفتی پختہ کار

۳۔ "خانقاہ":۔

الاماں خانقاہ کی دُنیا　　معصیت کی، گُناہ کی دُنیا
یاں قناعت سے عارفانِ خدا　　کام لیتے ہیں سکّہ سازی کا
ہر ادا میں ہے تاجرانہ کمال　　ہر بُنِ مو ہے ایک دستِ سوال
دل سے ہے بند رسم و راہ یہاں　　صرف جیبوں پہ ہے نگاہ یہاں
ہر حکایت ہے یاں زر و گوہر　　خُلد ملتی ہے یاں کرائے پر
یاں دعاؤں کی فیس ملتی ہے　　زر سے تو زبان ہلتی ہے

یاں مجالس میں بہرِ دلداری　　جلتی ہے شمعِ حُسنِ بازاری
ایک دریائے ناز رہتا ہے　　امردوں کا ہجوم رہتا ہے
کون بہتر ہے ایزدِ باری
ان کا تقویٰ کہ میری میخواری

۴۔ "پندارِ عبادت":۔

کیا عبادت کا ہے یہی مقصود　　رحم کی راہ دل پہ ہو مسدود!
کیا یہی رسم ہے کہ بعدِ وضو　　سرد ہو جائے عابدوں کا لہو!
لب پہ ہو ذکر دین و ایماں کا　　دل ہو مُہرہ بساطِ شیطاں کا!!
کیا بناتِ بہشت کی تخئیل　　دل کو کرتی ہے سنگ میں تبدیل!
کیا اثر ہے یہ پارسائی کا　　خاک دعویٰ کرے خدائی کا!!
موسمِ گل خزاں کی رُت بن جائے　　بُت شکن خود ہی ایک بُت بن جائے
ذوقِ تقویٰ میں دل کا نام نہ آئے
آدمی، آدمی کے کام نہ آئے!!

دورِ سوم اس مقالہ کی تدوین کے سلسلہ میں جنابِ جوشؔ سے میں نے چند استفسارات کئے تھے۔ چنانچہ مذہبی نقطۂ نظر کے بارے میں اپنے گرامی نامہ مورخہ ۷ دسمبر ۱۹۳۷ء میں تحریر فرماتے ہیں:۔
"اپنی مذہبی نظموں کے باب میں صرف اس قدر کہنا کافی سمجھتا ہوں کہ یہ میری پرانی نظمیں ہیں جنھیں میرے موجودہ رجحانات و نظریات سے کوئی تعلق باقی نہیں رہا ہے"۔

اس دور کے اشعار بھی ملاحظہ فرمائیے:۔

۱۔ نوجوانو! توڑ ڈالو سبحہ و زنّار کو　　تا کجا یہ احمقانہ دار و گیرِ کفر و دیں!!
۲۔ توڑ، اس جال کو جکڑے ہے جو بازو تیرے　　بستۂ کشمکشِ سبحہ و زنّار نہ بن

۳۔ کوثر و گنگا کو اک مرکز پہ لانے کے لئے — اک نیا سنگم بناؤں گا زمانے کے لئے
ایک دینِ نو کی لکھوں گا کتابِ زرفشاں — ثبت ہوگا جس کی زرّیں جلد پر ہندوستاں

اس نئے مذہب پہ سارے تفرقے واروں گا میں
تجھ پہ پھر گردن ہلا کر قہقہے ماروں گا میں!

۴۔ اگر یہ کفر ہے جو کچھ زباں پر میری جاری ہے — تو میں اس کفر کو گلبانگِ عرفاں کر کے چھوڑونگا
اگر عصیاں ہی پر موقوف ہے انساں کی بیداری — تو میں دُنیا کو غرقِ بحرِ عصیاں کر کے چھوڑونگا

۵۔ تیری باتوں سے پڑ جاتی ہے کانوں میں خراش — "کفر و ایماں" "کفر و ایماں" تا کجا خاموش باش
تیرے جھوٹے "کفر و ایماں" کو مٹا ڈالوں گا میں — ہڈیاں اِس "کفر و ایماں" کی چبا ڈالوں گا میں

ولولے میرے بڑھیں گے ناز فرماتے ہوئے
فرقہ بندی کا سرِ ناپاک ٹھکراتے ہوئے

۶۔ بے تعارف بھی کہن سالِ مسلماں اب تک — آتے ہی روبرو میرے مجھے کرتے ہیں سلام!
سخت حیراں ہوں کہ اس مشقِ گنہ کے باوصف — ثبت اب تک ہے میری شکل پہ مُہرِ اسلام!!

تہذیبِ جدید | تقلیدِ مغرب فی الحقیقت آزاد خیالی کے لوازم میں سے متصوّر کی جاتی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ہماری قوم کا نوجوان طبقہ اہلِ مغرب کی فنّی ترقی سے مرعوب ہو کر ان کے عوائد و رسوم کی تقلید کرنا باعثِ نازش و افتخار سمجھنے لگا ہے۔ دراصل یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جب کسی قوم کا سرمایۂ تمدّن روبہ اضمحلال ہوتا ہے تو اس کے افراد کے دماغوں میں خواہ مخواہ یہ عادت مرتسم ہو جاتی ہے کہ وہ دیگر متمدن اور ترقی یافتہ اقوام کی تقلید کرنے لگتے ہیں۔ بصورتِ موجودہ ہندوستان کے تعلیم یافتہ طبقہ کی مقلدانہ ذہنیت ہمارے اس نظریہ کی تائید کرتی ہے۔ لیکن جوشؔ کا دعویٰ ہے کہ:۔

سرِ تقلید کو مغزِ تفکر سے جِلا دیکر — چراغِ مُردہ کو مہرِ درخشاں کر کے چھوڑونگا

اس کے یہاں ہم کو یہ خاص بات نظر آتی ہے کہ باوجود انقلابیت پسند اور آزاد خیال ہونے کے مغربی تہذیب کو نظرِ پسندیدگی نہیں دیکھتا اُس کا قول ہے:۔

کھلونا تو نہایت شوخ و رنگیں ہے تمدّن کا ‌ ‌ ‌ ‌ مُعتَرف میں بھی ہوں لیکن کھلونا پھر کھلونا ہے!!

اقبالؔ مرحوم نے اسی مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے:۔

اس سرابِ زندگی کو گلستاں سمجھا ہے تو ‌ ‌ ‌ ‌ آہ، اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو!

لیکن انصاف یہ ہے کہ جوشؔ کے یہاں طرزِ ادا لطیف تر ہے۔

"خاتونِ مشرق" جوشؔ کی مشہور و معروف نظم ہے جس میں نہایت نازک اور طنزیہ انداز سے تہذیبِ جدید کے پرخچے اُڑائے گئے ہیں اور مغربی عادات و رسوم کا دل کھول کر استہزار و استخفاف کیا گیا ہے۔ اس خصوص میں جوشؔ کو جو کمال حاصل ہے نکتہ رس نگاہیں اس سے بخوبی واقف ہیں۔ بعض اشعار قابلِ دید ہیں: "خاتونِ مشرق" سے خطاب کرتا ہے:۔

عورتیں اقوامِ عالم کی بھٹک جائیں گی جب ‌ ‌ ‌ ‌ تو رہیگی بن کے اس طرح فاں میں اک موجِ طرب
حُسن ہو جائیگا جب اوروں کا وقفِ خاص و عام ‌ ‌ ‌ ‌ دیدنی ہو گا تیرے دولت کدے کا اہتمام
عورتیں بیچیں گی جب اسٹیج پر بارقص و چنگ ‌ ‌ ‌ ‌ اپنی آنکھوں کی لگاوٹ، اپنے رخساروں کا رنگ
اُن کے آگے ہر نیا میدان ہوگا جلوہ گاہ
اور تیرا اسٹیج ہوگا صرف شوہر کی نگاہ

تمدّنِ موجودہ کے قبیح اختراعات کو جوشؔ جس نظرِ تذلیل سے دیکھتا ہے اس کا بہتر اندازہ ان اشعار سے ہو سکتا ہے۔

گودیاں پھیلا کر جب مانگیں گی باصدق و صفا ‌ ‌ ‌ ‌ عورتیں اولاد کے پیدا نہ ہونے کی دعا
مژدہ باد اے ایشیا کی دخترِ پاکیزہ تر ‌ ‌ ‌ ‌ آنچ آئیگی نہ تیرے مادرانہ ذوق پر

تعلیم نسواں کے مفید ہونے میں شک نہیں لیکن اس سے لاتعداد معائب بھی ہماری حیاتِ اجتماعی میں رونما ہوتے ہیں۔ منجملہ دیگر قابلِ تاسّف معائب کے ایک یہ بھی ہے کہ جونہی بیگم صاحبہ نے بی، اے کی ڈگری حاصل کی معاً وہ خود کو مافوق البشریت تصوّر کرنے لگتی ہیں اور دیگر امورِ خانہ داری کے انتظام کا تو ذکر ہی کیا، انتہا یہ ہے کہ زعمِ علمیت میں نگہداشتِ اطفال کو بھی باعثِ اہانت سمجھنے لگتی ہیں۔ جوشؔ اس امرِ قبیح کا استخفاف کرتے ہوئے "خاتونِ مشرق" سے خطاب کرتا ہے:۔

ماؤں کی غفلت سے جب بچّوں کو پہونچے گا گزند
جب فغاں بے تربیت اولاد کی ہوگی بلند
صرف اک تیرا تبسّم اے جمالِ تابناک
سینۂ اطفال میں پیدا کرے گا روحِ پاک
وہ حرارت تیرے ہونٹوں کی نہ ہوگی پائمال
جن کے شعلوں سے نکھر جاتا ہے رنگِ نونہال
وہ تری معصوم رعنائی نہ ہوگی مضمحل
بخشتی ہے نسلِ انسانی کے پہلو کو جو دل
وہ بھی دن آئیگا جب تجھ کو ہی اے مستِ حجاب
زیب دے گا مادرِ اولادِ آدم کا خطاب!

پردہ شکنی، تعلیم نسواں کے عناصرِ لازمہ میں سمجھی جاتی ہے۔ خیر اس حد تک تو مضائقہ نہیں۔ لیکن یہی پردہ شکنی جب چند گام آگے بڑھتی ہے تو "عریانیت" (Nudism) کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ جوشؔ کی دور بیں نگاہوں نے اس خطرہ کا اندازہ کر لیا ہے اور وہ نہایت برمحل تنبیہ کرتا ہے۔ مشرقی عورت سے مخاطب ہے:۔

جب کرے گی صنفِ نازک اپنی عریانی پہ ناز
صرف اک تو اس تلاطم میں رہے گی پاکباز
اُن کی راتیں خوفِ رسوائی سے جب ہونگی دراز
تیرے سینے میں کسی شب کا نہ ہوگا کوئی راز
جب اُڑے گی اُنکی چشمِ دام پروردہ میں خاک
نرم ڈورے تیری آنکھوں کے رہیں گے تابناک
چھاؤں بھی ہوگی نہ تیری بزمِ ناؤنوش میں
تیرا پرتو تک رہیگا شرم کی آغوش میں

آخری بند میں نصیحت کرتا ہے:۔

تو نہ کرنا مغربی متوالیوں کی ریس، دیکھ! گھات میں تیری لگا ہے فتنۂ ابلیس، دیکھ!
تو نہ ان کی طرح بھرنا عرصۂ فن میں چھلانگ کو کھ، تا ٹھنڈی رہے بچوں سے، اور صندل سی مانگ!

دختران مغربی کو دے نہ عورت کا خطاب یہ مجسم ہو گئے ہیں کچھ گنہگاروں کے خواب
پھر رہی ہیں یا تری نظروں کے آگے پرُ فضا عورتوں کے بھیس میں شیطان کی سرتابیاں
علم حاصل کر فقط تدبیرِ منزل کے لئے!
وہ دماغوں کیلئے ہیں اور تو دل کے لئے!!

ایک دوسری نظم میں "خاتونِ مغرب" سے خطاب کیا ہے۔ یہاں بھی تہذیبِ جدید کا استخفاف مدِّنظر ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

اپنے سینے کا خزانہ، اپنی فطرت کا جمال مرد بننے کی ہوس میں کر دیا ہے پائمال
یوں ہوا آمادہ، فطرت سے بغاوت پر شباب پڑ گئے رخسار پھیکے، جل گئی چہرے کی آب
زلف چھوٹی ہو گئی اور دست و پا بڑھ کر طویل بجھ گئی برنائی، روڑھا ہو گیا روئے جمیل
جلد کی سختی کے اندر لوچ پنہاں ہو گیا ایک سیٹھاپن سا ہونٹوں پر نمایاں ہو گیا
ہو گیا سنگِ خرد سے شیشہ بھولے پن کا چور مر گیا دیدے کا پانی، اُڑ گیا چہرے کا نور
نازکی، عزّت، محبّت آبرو، کچھ بھی نہیں
نام تو ہے پھول لیکن رنگ و بو کچھ بھی نہیں!

مادّیت سے بیزاری | شعریت و حسیات کا فقدان، اور مادّیت اور یبوست کا وفور، تہذیب

جدیدہ کی ما بہ الامتیاز خصوصیات ہیں۔ لیکن ایک شاعر فی الاصل محبّت، اُلفت، شعریت، لطافت، نفاست اور حسّیات کا شدید پرستار ہوتا ہے۔ جوشؔ بھی اس کُلیّہ سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ وہ مادّیت سے سخت نالاں ہے اور اپنے کلام میں جا بجا شکوہ ریز ہے کہ:۔

جہاں دردِ دل کا مخالف ہے عالم　　وہاں دردِ دل کا اثر بیچتا ہوں

اس کی شاعری کا عمیق مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مادّیت کے خلاف اُس نے اکثر مقامات پر احتجاج کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتا ہے:۔

سڑک، غُلغلہ، شور، ہلچل، غُبار　　دورویہ درختوں کی سیدھی قطار

کوئی ہے؟ کہ از راہِ سوز و گداز　　سُنے ان درختوں کی کلیوں کی ساز!

اسی طرح اِس مادّی عہد میں
کہاں دل؟ کہ شاعر کے نغمے سُنیں!!

ایک جگہ عہد مادّیت میں شاعری کی کساد بازاری پر اس طرح نالاں ہے:۔

مادّی عہد میں یہ ناداری　　کون اپنی کرے گا غمخواری؟

کس طرف جائیں، کس سے بات کریں؟　　ہر طرف اک جمود ہے طاری!!

قدر داں کون ہے زمانے میں؟　　علم و فن کی ہے سرد بازاری

اس تلاطم میں ہم ادیبوں کی
کیا ضرورت تھی ایزدِ باری؟

خاتمہ اُردو شاعری کے مُعترضین نے جوشِ تفریط میں ہر قسم کے معائب کو ہماری زبان سے منسوب کیا ہے جن کا خلاصہ یہ ہے کہ ہماری شاعری اعلیٰ خیالات ادا کرنے سے قطعاً قاصر ہے، اس میں ایسے شعراء سراسر مفقود ہیں جنھوں نے کوئی مستقل فلسفۂ حیات پیش کیا ہو۔ اس سے بھی زیادہ استعجاب

انگیز امر یہ ہے کہ جو حضرات اُردو کے مُمد و معاون کہلاتے ہیں وہ بھی اس قسم کا اعتراض کرنے میں مخالفین اُردو کی ہم نوائی کرتے ہوئے نظر آتے ہیں ؂۔

بمن چنداں گنہ از بدگمانی می کند نسبت   کہ من ہم در گماں افتادہ پندارم گنہگارم

لیکن جوشؔ نے ان لایعنی نظریات کا یکسر استرداد کر دیا ہے۔ اُس نے دکھا دیا ہے کہ ہماری شاعری میں اعلیٰ مضامین بیان کرنے کی کس حد تک وسعت ہے۔ غالباً اسی وجہ سے جناب نیازؔ فتحپوری کو بھی اعتراف ہے کہ "جوشؔ کے کلام کے متعلق کچھ لکھنا ایسا ہی ہے جیسے دن کے وقت یہ کہنا کہ آفتاب نکل آیا ہے[1]"

جوشؔ کا فلسفۂ حیات ہماری زبان کا وہ مایۂ ناز سرمایہ ہے جو انسانی زندگی کے ہر شعبہ میں مفید ثابت ہو سکتا ہے یہ ضرور ہے کہ اس کے نظریات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے جیسا کہ بعض مقامات پر میں خود اس سے متفق العقیدہ نہیں ہوں گو یہ اختلاف اس قدر اہم نہیں کہ اس جگہ اُس کے اظہار کی ضرورت ہو بہرحال اس میں شک نہیں کہ جوشؔ کا تصورِ حیات اپنی جگہ پر نہایت مُکمل حیثیت رکھتا ہے اور ہماری حیاتِ اجتماعی کے ہر ممکن پہلو پر مفصل روشنی ڈالتا ہے اور فی الحقیقت علم و ادب کا یہ بیش بہا سرمایہ دنیا کی کامل ترین زبانوں کے لئے باعثِ رشک ہو سکتا ہے۔ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفیؔ نے صحیح فرمایا ہے کہ:-

"جوشؔ کی شاعری نے ہمیں اس قابل بنا دیا ہے کہ آنکھیں نیچی کئے ہوئے بغیر، اپنی شاعری کو دنیا کی ترقی یافتہ شاعری کے مقابلہ میں رکھ سکتے ہیں[2]"

عمرہا در کعبہ و بُت خانہ می نالد حیات
تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید بروں

---

[1] نگار، جولائی ۱۹۳۶ء

[2] نقش و نگار ص ۲

قطعہ

در ماتم علامۂ اقبال ؒ

ضیاء احمد صاحب ایم۔ اے بدایونی

آوخ شرابِ صافِ طرب چشم داشتیم — تقدیر ریخت دُردِ کدورت بجام ما
دردا کہ شربت از عسلِ ناب خواستیم — گردوں چکاند زہرِ ہلاہل بکام ما
واحسرتا کہ زیرِ زمیں آرمیدہ است — اقبالِ ما سخنورِ گردوں مقام ما
نے نے۔ غلط۔ محال بود آرمیدنش — چوں داند اضطرابِ دلِ خاص و عام ما
آں دردمندِ ملّتِ اسلام و مسلمین — آں عاشقِ پیمبرِ خیر الانام ما
آں مصلح و مجدّدِ قوم و مفکرے — آں فیلسوف و شاعرِ شیریں کلام ما
رفت از میاں و رفت قرار و شکیبِ دل — شد زیں جہاں و شد متغیّر نظام ما
شام است شامِ غربت و صبح است صبحِ حشر — در ہجر دیدنی ست چہ صبح و چہ شام ما
تاریک شد جہاں کہ ز آفاق شد نہاں — آں مہرِ جلوہ گستر و ماہِ تمام ما
از دستِ چرخ داد کہ بر خاک اوفتاد — آں میرِ ما۔ و آں سپر و آں حسام ما
بس قرنہا گذشت کہ از لطفِ کردگار — آمد ہمائے اوجِ سعادت بدام ما
صد عمرہا بباید کز یاریِ سپہر — گردد دوبارہ شاہدِ مقصود رام ما
اقبال اگرچہ رفت ز گیتی ولے ہنوز — فیضش ہمی رسد بخواص و عوام ما
آں کارنامہ ہا کہ ازو یادگار ماند — شد مایۂ صیانتِ ناموس و نام ما
اقبال را مگوئے کہ مقلوبِ لا بقاست — بشنو چہ گفت حافظِ عالی مقام ما
ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق — ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما
گویند ہست زندۂ جاوید نام او — گویم ازوست زندۂ جاوید نام ما

اُردو شاعری کی مختصر تاریخ

سیّد اعجاز احمد صاحب
سہسوانی

اُردو ریفریشر کورس کے علمی جلسوں میں جن کا سلسلہ ۱۹ اپریل سے ۸ مئی ۳۵ء تک نارمل اسکول فیض آباد میں قایم رہا تھا، حکیم سیّد اعجاز احمد صاحب معجز سہسوانی سکنڈ ماسٹر وثیقہ اسکول نے حسب ذیل تقریر فرمائی:۔

حضرت اورنگ زیب عالمگیرؒ کے مبارک عہد کی ایک زندہ یادگار ہمارے شمالی ہند کی اُردو شاعری ہے اس عہد سے قبل تمام شاعر، ادیب، منشی اور اہل قلم فارسی نظم و نثر لکھتے تھے۔ یہی ان کی تحریری زبان تھی۔

اُردو کا اصلی وطن جنوبِ ہند یعنی ملک دکن ہے۔ وہاں اس کی نشو و نما، تربیت و پرداخت امراء و سلاطین کی زیر نگرانی ہوتی تھی۔ اس نے تمام ملک میں روزمرہ کی بول چال پر قبضہ کرنے کے بعد ۹۱۶ھ ہجری میں جو ابراہیم عادل شاہ اوّل کا سال جلوس ہے بیجاپور میں دفتری و درباری زبان ہونے کا فخر حاصل کیا۔ اور اس کا نام دکنی زبان مشہور ہوا۔ اور بعہد سلاطین قطب شاہی گولکنڈہ اس زبان کا بول بالا یہاں تک ہوا کہ فارسی شعراء نے بھی اس میں طبع آزمائی کی۔ اور ہندی گو دوسری زبانوں کی طرح اُردو میں اشعار موزوں کرنے لگے وہاں کے نواح میں زمانہ قدیم سے تلنگی، مرہٹی اور کنڑی زبانیں بولی جاتی تھیں۔ اب یہ دکنی زبان (اُردو) عربی۔ فارسی کے ناثر و ناظم اور علماء و شعراء و ادباء کی زیر تربیت ترقی پذیر ہوئی۔ اور فارسی کے دوش بدوش چلنے لگی۔ ہر قسم کے خیالات اس میں ادا ہوئے۔ مختلف اصناف نظم۔ اوزان و بحور فارسی سے اُردو میں آ گئے۔

قلی قطب شاہ جو اپنے والد ابراہیم قطب شاہ کی بجائے گولکنڈہ میں ۹۸۸ھ میں تخت نشین ہوئے وہ پہلے شخص سمجھے جاتے ہیں جنھوں نے اپنے اُردو کلام کا مجموعہ ایک دیوان بلکہ کلیّات کی صورت میں مرتب کیا۔ الفاظ و ترکیبات فارسی کا غلبہ دکنی اُردو زبان میں نمایاں ہے۔ اور ملکی زبانیں درجہ بدرجہ اپنا رنگ جمائے ہوئے ہیں۔ ان کے حقیقی بھتیجے محمد قطب شاہ اپنے چچا کے داماد اور جانشین تھے وہ بھی علاوہ فارسی کے دکنی زبان کے بڑے شاعر پُرمایہ تھے۔ دونوں بادشاہوں کے دیوان حیدرآباد

ہیں موجود ہیں۔ پہلے دیوان پر ایک تبصرہ انجمن ترقی اُردو نے شائع کیا تھا۔ ان دیوانوں میں تمام اصناف سخن قصیدہ، غزل، مرثیہ، رباعی، قطعہ وغیرہ موجود ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دکنی زبان میں اُردو شاعری پایۂ کمال پر پہونچی تھی اور شعراء عام طور پر اس زبان میں دادِ سخن سنجی دیتے تھے۔ غالباً ان کے دواوین کثیر التعداد مدوّن ہوئے ہوں گے جو ہم تک نہیں پہونچے۔ قطب شاہی عہد کا کلام زبان کی متانت و پختگی کے ساتھ بتاتا ہے کہ یہ ادبی زبان تھی اور شعراء دکن اس میں جوہر شاعری دکھاتے اور تفنن طبع سے رنگینیاں پیدا کرتے تھے۔ اور اس عہد میں اُردو کا قدم کہیں سے کہیں پہونچ گیا تھا سلطان قلی قطب شاہ اُردو میں معانی تخلص کرتے تھے۔ ان کے کلام کا نمونہ شعر ذیل ہے ؎

بخشا فصیح شعر معانی کے تئیں خدا　　　کرتے ہیں دعویٰ شعر کا سب اپنی طبع سوں

ان کے جانشین سلطان محمد قطب شاہ کہتے ہیں ؎

لے بھیک رنگ عقیقاں رنگیں ہوئے مین میں　　　دو لب ترے رنگیلے یاقوت کو دئے رنگ

ان اشعار کا مقابلہ متاخرین میں ولی اور آبرو کے کلام سے کیجئے۔ بہت کم تفاوت پائے گا حالانکہ بلحاظ زمانہ بہت فرق ہے۔

محمد قطب شاہ کے بیٹے عبداللہ قطب شاہ جو سلسلہ قطب شاہی کے چھٹے بادشاہ تھے ان کا سال جلوس ۱۰۲۰ھ ہے وہ بھی اپنے باپ اور نانا کی طرح فارسی۔ اُردو کے گرانمایہ شاعر تھے۔ عہد شاہجہاں بادشاہ دہلی میں گولکنڈہ دکن کے فرمانروا تھے۔ اور آخر زمانہ میں شاہجہاں بادشاہ کے باجگذار ہو گئے تھے۔ قدردان علم و ہنر تھے۔ ان کا دربار بھی علمی دربار تھا۔ ان کے فارسی اُردو دونوں دیوان دستیاب ہو گئے ہیں جو اصناف نظم کے جامع ہیں۔ زبان صاف و شیریں اور اشعار فصیح و دلکش ہیں نمونہ یہ ہے ؎

کرتے ہیں مجھ سے خضر علیہ السلام بحث　　　آبِ حیات سے ہے زیادہ یہ لب ترا

سو مخفی نہیں اس پہ ہیں آشکار　　　جو کچھ راز پردے میں ہیں غیب کے

ان کے درباری شاعر نشاطی مشہور ہیں۔ جنھوں نے دکنی زبان (اُردو) میں ایک مثنوی ۱۰۶۶ھ میں تصنیف کی ہے۔ اور ان سے پہلے عہد جہانگیری میں غواصی شاعر نے "طوطی نامہ" لکھا ہے۔ ان کا ذکر میر حسن دہلوی نے اپنے تذکرہ میں کیا ہے۔

ابوالحسن تانا شاہ گولکنڈہ کا آخری تاجدار عہد عالمگیری میں عبداللہ قطب شاہ مذکور کا داماد تھا۔ اس کا دربار بھی علمی و ادبی قدرشناسی سے خالی نہ تھا۔ وہ بھی اُردو شاعر تھا۔ ایک شعر تذکرہ گلشن ہند میں ان کے نام پر درج ہے سرزمین دکن میں بیجاپور بھی زبان اُردو کا گہوارہ تھا۔ وہاں عادل شاہیوں کے دورِ حکومت سے پہلے اُردو زبان عام ہوگئی تھی اور سلاطین بہمنیہ عادل شاہی دفتر بھی اسی زبان میں منتقل کردیا تھا۔ پھر ابراہیم عادل شاہ اوّل نے جیسا کہ ہم اوّل بیان کرچکے ہیں تجدید کی اور اُردو کو معزول ہوجانے کے بعد بحال کیا۔ اور دفتر حکومت میں جگہ دی۔ اس کے بعد کچھ سکتے اور وقفے پھر پیش آئے یہاں تک کہ ابراہیم عادل شاہ ثانی عہد اکبری ۹۸۸ھ میں تخت نشین بیجاپور ہوا جو علم موسیقی کا اُستاد ماہر تھا اس نے ایک کتاب اُردو دکنی میں نورس نام نظم لکھی۔ ملا ظہوری نے اس کے تین دیباچے فارسی میں تحریر کئے جو سہ نثر ظہوری کے نام سے مشہور ہیں۔ اس خاندان کے دامن دولت سے بھی اہل علم و ادب وابستہ رہے ہیں۔ اُردو شاعری کا چرچا یہاں بھی گولکنڈہ سے کم نہ تھا۔ شعراء اس زبان میں خوب طبع آزمائی کرتے تھے۔ دکنی تذکروں میں ان کے نام پائے جاتے ہیں۔ اور بہت سے نام تذکرہ میر حسن میں بھی ملتے ہیں۔ سیّد میراں ہاشمی بیجاپور میں صاحب دیوان شاعر تھے۔ سنہ ۱۰۹۹ھ میں اُردو مثنوی یوسف زلیخا تصنیف کی جس میں چھ ہزار ابیات ہیں۔ دیوان اُردو میں قصائد، غزلیات، مراثی، قطعات اور رباعیات ہیں شاہ امین بیجاپور کے اولیائے کبار سے علی عادل شاہ کے زمانہ میں تھے سنہ ۱۰۷۵ھ میں وفات پائی فصیح البیان درویش صوفی شاعر تھے۔ اکثر استغراق کی کیفیت طاری رہتی تھی۔ اسی حالت میں اشعار موزوں کرتے تھے مریدوں نے ایک مجموعہ آپ کے کلام کا جمع کرکے "جواہر الاسرار" نام مرتب کیا۔

اُردو زبان، اُردو شاعری کا گلزار سرزمین دکن میں صدیوں سے سرسبز و شاداب تھا۔ لیکن شمالی ہند اس کی ترقی اور قدر افزائیوں سے محض لاعلم رہا۔ عام تحریروں اور دفتروں پر فارسی زبان قابض تھی۔ آخر عہد

عالمگیری میں بھی ارباب فضل وہنر کا مجمع اورنگ آباد میں ہوا۔ اور تمام اہل علوم وفنون حیدرآباد وبیجاپور وغیرہ سے سمٹ کر وہاں آگئے۔ ہندوستان کے اطراف و دہلی سے امراو علما ومشائخ دکن پہونچے۔ شعرا واُدبا نے اُردو زبان نظم ونثر میں اظہار کمال کرتے تھے۔ اس عہد کے بہت سے دکنی شاعر چمنستان شعراء لچھمی نرائن شفیق بہار وخزاں۔ میر بہار الدین عروج تحفۃ الشعرا۔ محمد افضل۔ تذکرہ موسوی خاں۔ تذکرہ میر حسن میں مذکور ہیں۔ الغرض زبان اُردو اور اس کی شاعری کی تربیت ونشو ونما وارتقا، وسعت دکن کی سلاطین قطب شاہیہ وعادل شاہیہ کی توجہ اور ان کے عہد کی برکات کی مرہون منت ہے۔

دکن کی طرح زبان اُردو کا عام رواج ہمارے ملک شمالی ہند میں بھی قطب شاہی وعادل شاہی عہد سے ہوا۔ اور جس طرح دکنی ریختہ میں تلنگی اور مرہٹی الفاظ کی کثرت تھی یہاں کی ریختہ اُردو میں بھاشا زیادہ مخلوط تھی اور فارسی کا تسلط دونوں جگہ برابر تھا۔ عہد شاہجہانی میں یہ زبان عام بول چال میں مستعمل تھی۔ لیکن اس کی وقعت وعزت روزمرہ ہی تک محدود تھی۔ کسی نثر ونظم کا اس میں پتہ نہیں ہے عہد عالمگیرؒ تک عام شعرا وادبا نے اسے جولانگاہ فکر نہیں بنایا۔ لوگ خال خال اس میں اشعار موزوں کرتے تھے۔ دفتری ودرباری زبان فارسی تھی۔ ادبی وعلمی وتاریخی تصانیف اور تمام نثر ونظم سب پر فارسی کا قبضہ تھا۔ اُردوئے ریختہ کی کوئی قدر وقیمت نہ تھی۔ اسی مبارک عہد کے آخر میں ملک دکن کا ایک شاعر وَلی تخلص اورنگ آباد سے دِلی آیا۔ ان بزرگ صوفی کا نام شمس الدین تھا۔ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے اور اُردو میں بھی۔ شاعری ان کی طینت وسرشت کا جزو تھی۔ شاہ سعد اللہ گلشن کے معتقد اور شاگرد ہوئے۔ انھوں نے خاص طور پر ان کو ریختہ کی طرف متوجہ کیا۔ اس کے بعد ولی ۱۱۴۷ھ محمد شاہ بادشاہ کے عہد حکومت میں دوبارہ سید ابوالعالی کے ساتھ دلی آئے اور اپنا اُردو دیوان بھی ساتھ لائے جس کی نہایت قدر ہوئی۔ ہمعصر شعرا، نے ان کی غزل وغیرہ کا تتبع کیا۔ اور اُردو کو مستقل طور پر اپنے جذبات وخیالات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ اور اُردو شاعری زور شور کے ساتھ شروع ہوگئی۔ وَلی نے اس دلچسپی کو اپنے انداز میں ظاہر کیا ہے۔

دل وَلی کا لے لیا دلی نے چھین　　　　جا کہو کوئی محمد شاہ سوں

ولی ۱۱۴۴ھ میں اپنے وطن اورنگ آباد واپس گئے۔ اور آخر ۱۱۵۵ھ میں بمقام احمد آباد گجرات وفات پائی

پروفیسر آزاد مرحوم نے تذکرہ آبِ حیات میں اُردو شاعری کی ابتدا اسی زمانہ سے قایم کی ہے۔ وہ دکن میں اس کی ترقی و رواج عام و تربیتِ ملوکانہ و وسعت و ہمہ گیری سے بالکل غافل تھے۔ اُنھوں نے ولی کو اُردو شاعری کا باوا آدم کہا اور ان کو احمد آباد گجرات کا باشندہ بتایا۔ ان کے دیوان کو شعر اُردو کا پہلا دیوان خیال کیا۔ ایک مورخ کا فرض ہے کہ تاریخ کی روشنی میں واقعات و آثار اور موجودات کا سراغ لگائے ہر طرف نگاہ دوڑائے۔ اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ مورخ کی ذمہ داری نہایت اہم و نازک ہے۔ آزاد کا یہ قصور اگرچہ محققین کی نظر میں بجائے خود خاص اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ کتاب کا موضوع تاریخ زبان اُردو ہی ہے۔ لیکن کاتب سطور یہ معذرت (مرحوم کی جانب سے) پیش کرنے پر مجبور ہے کہ وہ اپنے فن میں پہلی کتاب ہے جواب سے تقریباً ساٹھ سال قبل تصنیف ہوئی ہے۔ اس نے آنے والوں کے لئے تحقیق و تفتیش کا دروازہ بند نہیں کیا۔ البتہ شعرار کے حالات اور شخصی واقعات میں اُنھوں نے سخت غلطیوں کا ارتکاب کیا ہے۔ اور علاوہ غلطی روایات کے ورایت کی بھی مخالفتیں ان کے تذکرہ میں جا بجا نظر آتی ہیں۔ با ایں ہمہ وہ مفید معلومات سے بھی خالی نہیں ہے۔ ناظرین اس سے فوائد حاصل کرتے ہیں۔

ولی کا دیوان دکنی اُردو کا آئینہ ہے۔ مرہٹی، تلنگی زبانوں کے الفاظ جو وہاں کی اُردو میں مخلوط تھے اس میں موجود ہیں۔ اس کے ساتھ ولی کی سادگی بھی نمایاں ہے ان کے ہمعصر دلی اور اس کے نواح کے اُردو شعرا جو فارسی دواوین کے مالک تھے ولی کے اندازِ سخن کے فریفتہ تھے۔ اور ان کو خاص وقعت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ولی کی صوفیت اور متصوفانہ شاعری کا اثر بھی معاصرین پر چھایا ہوا تھا۔ مسائل تصوف وحدۃ الوجود کے معارف سے اس عہد کی غزلیں مالا مال ہیں۔ مراعات لفظی کے نمونے بھی زیادہ پائے جاتے ہیں۔

بعض اشعار بالکل آج کل کی زبان میں ہیں ؎

شرابِ شوق سے سرشار ہیں ہم — کبھی بیخود کبھی ہشیار ہیں ہم

اے ولی رہنے کو دنیا میں مقامِ عاشق　　کوچۂ زلف ہے یا گوشۂ تنہائی ہے

دیکھنا تجھ قد کا اے نازک بدن　　باعثِ خمیازۂ آغوش ہے

ولی کے معاصرین میں حاتم اور آبرو نے اُردو شاعری میں کمال دکھایا۔ آبرو سے کہیں زیادہ حاتم نے زبان کی صفائی اور ترکیبوں کی شستگی کا خیال کیا۔ اُن کو کثرت کلام میں خاص امتیاز تھا۔ نہایت پُرگو تھے۔ اس لئے عمر بھر کی کمائی میں سے ایک دیوان زادہ انتخاب کر کے سرمایہ شاعری ارباب نظر کے سامنے رکھا جو بحد مقبول ہوا۔ ایہام گوئی کا طریقہ بہ نسبت دوسرے شعراء کے ان کے یہاں کم نظر آتا ہے۔ ان کی زبان ولی سے زیادہ فصیح و شستہ ہے۔ مضامین میں بلندی بھی ہے۔ ان کی ولادت عہد عالمگیری میں ۱۱۱۲ھ ہجری اور وفات ۱۱۶۹ھ میں ہوئی۔ سودا ان کے شاگرد تھے۔ لیکن یہ کہنا کہ استاد کو شاگرد پر فخر تھا" اس عہد کے لحاظ سے کچھ اصل نہیں رکھتا۔ کلام کا نمونہ یہ ہے۔

پیری میں حاتم اب نہ جوانی کو یاد کر　　سوکھے درخت بھی کہیں ہوتے ہیں پھر ہرے

اے خردمندو! مبارک ہو تمھیں فرزانگی　　ہم ہوں اور صحرا ہو اور وحشت ہو اور دیوانگی

تو اذیت پیشہ دشمن ہے بغل میں دل نہیں　　دور ہو پہلو سے صحبت کے مرے قابل نہیں

ایک دن ہاتھ لگا یا تھا ترے دامن کو　　آج تک سر ہے خجالت سے گریباں کے بیچ

طرز تغزل کی سنجیدگی داد طلب ہے۔ ان کے بعد شاہ آبرو ہیں۔ یہ بھی عہد عالمگیری میں پیدا ہو کر محمد شاہ کے زمانہ میں استاد سخن تسلیم کئے گئے۔ ان کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ ولی کا اتباع ان کو مرکوز خاطر تھا۔ دونوں کے کلام میں باعتبار زبان و الفاظ و محاورات اتحاد اور بہ لحاظ مضامین کھلا ہوا تفاوت ہے لیکن سرسری

نظر میں باہم فرق نہیں معلوم ہوتا۔ ایہام پر فریفتہ ہیں۔ مضامین میں پستی زیادہ اور بلندی کم ہے۔ خیالات سادہ اور زبان ثقیل ہے۔ ان کی شاعری کا نمونہ یہ ہے ؎

آج پھر ہم سے کر دیا ہے اُداس اُن رقیبوں کا جائے ستیاناس

سر سے لگا کے پانوں تلک دل ہوا ہوں میں یاں لگ ہنر میں عشق کے کامل ہوا ہوں میں

قدر پوچھو دلِ خونخوارۂ عاشق کی اگر سر چڑھا گل کی طرح زینتِ دستار کرو

اس عہد کے عام شعرا طرز ایہام گوئی پر زیادہ مائل تھے۔ نازک خیالی و مضمون آفرینی کی جگہ اپنے اشعار کو اسی صنعت سے زینت دیتے تھے۔ لیکن چونکہ ہر کیش و آئین کے لئے ہر قرن کے بعد ایک مجدد کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کی اصلاح فساد کرتا ہے۔ اسی طرح اُردو شاعری بھی اس کی محتاج تھی کہ اس کے گلزار پر بہار کو کریہہ و نامانوس الفاظ اور بھدی ترکیبوں کے خس و خاشاک سے پاک و صاف کیا جائے۔ ابعد ایہام و توریہ کی پیچ در پیچ گھاٹیاں بھی سدّراہ نہ ہوں۔ حضرت مرزا مظہر جان جاناں قدس سرّہ کی لطافت پسند طبیعت نے اس کی اصلاح کی جانب اپنی توجہ مبذول فرمائی۔ اور اس ناہموار اندازِ بیان و طرزِ ایہام کو یک قلم صفحۂ ہستی سے مٹا دیا۔ اس اصلاح سے شعر میں جاذبیت کا اضافہ ہوا۔ تاثیر بڑھ گئی۔ سنجیدہ خیالات سادگی کے ساتھ ادا ہونے لگے۔ خواجہ میر درد علیہ الرحمۃ مرزا صاحب ممدوح کی طرح فارسی و اُردو کے شاعر کامل تھے۔ انھوں نے تصوف کے حقائق و معارف کو اُردو اشعار میں اس طرح ادا کیا ہے جو آج تک کسی سے نہ ہو سکا۔ غزلیت کے قواعد اور رنگینی و تاثیر میں سابق الاقدام ہیں۔ میر و سودا اور سوز نے ان کے مضامین کا تتبع کیا۔ اور ان کو شعر ریختہ کا رکن اعظم تسلیم کیا۔ زبان کی شستگی فصیح محاورات، سلاست بیان اور سنجیدگی مضامین ان کے کلام کے عناصر ہیں۔ آپ کے دیوان کا امتیاز خصوصی یہ ہے کہ کلام اوّل سے آخر تک حشو و زوائد اور پست و عامیانہ الفاظ و مضامین سے منزہ ہے۔

چنانچہ میر حسن اپنے تذکرہ میں ان کی بابت لکھتے ہیں "دیوانش اگرچہ مختصر لیکن مثل کلام حافظ سراپا انتخاب" میر تقی میر نے تذکرہ نکات الشعراء میں نہایت جوش وخروش سے آپ کے کمالات صوری ومعنوی اور فن شعر میں آپ کی بلند پائیگی کا ذکر کیا ہے۔

مرزا رفیع سودا بھی آپ کے مقابلہ میں آنا اسارت ادب خیال کرتے ہیں مختصر بحروں میں جو غزلیں ہیں وہ دلکشی واثر میں لاجواب ہیں۔ آپ کی وفات ۶۱ سال کی عمر میں ۱۲۹۹ھ میں ہوئی۔ آپ درویش کامل عالم فاضل قانع مستغنی اور مرجع ارباب کمال وامراء وسلاطین تھے۔ ان کے معاصروں میں مرزا سودا اور میر تقی میر تھے۔ سودا اُردو شاعری میں مرتبہ عالی رکھتے تھے۔ ان کو تمام اصناف سخن پر یکساں قدرت تھی۔ ان کے دم سے شعروشاعری کا بازار دہلی سے لکھنؤ تک گرم تھا۔ انواع شعر کے تمام مروجہ نمونے ان کے کلیات میں موجود ہیں۔ فارسی دیوان بھی خوب ہے۔ مرزا ہر صنف میں نہایت خوب کہتے تھے۔ قصیدہ، غزل، مثنوی وغیرہ میں جو زور صرف کیا ہے وہ مبصر سے پوشیدہ نہیں۔ انھوں نے اُردو شاعری کو معراج کمال پر پہونچا دیا۔ مدح وہجو میں ان کو ید طولیٰ حاصل تھا مشہور ہے کہ اُن کا قصیدہ غزل سے بہتر ہے" لیکن ارباب سخن کے نزدیک یہ لغو ومہمل فیصلہ ہے ان کا قصیدہ اور غزل دونوں بلند پایہ ہیں۔ لکھنؤ میں ۱۱۹۵ھ میں بعہد نواب آصف الدولہ انتقال کیا۔ اور ان کے بعد میر تقی میر ۱۱۹۷ھ میں لکھنؤ پہونچے میر تقی میر غزل گو شاعر اور استاد مسلم الثبوت ہیں۔ سوز وگداز اور عشقیہ راز ونیاز مؤثرانہ انداز بیان میں ان کے اشعار کا جوہر ہے۔ اور یہی تغزل کی روح رواں ہے قصائد ومثنویات قابل التفات نہیں ہیں عموماً ہر شاعر کے کلام میں رطب ویابس اور بلند وپست نظر آتا ہے۔ اس سے بڑے بڑے اساتذہ کے دیوان خالی نہیں ہیں۔ خواجہ میر درد کو جانے دیجئے اور بقیہ اُردو کے تمام دواوین پر نظر کیجئے کوئی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہ نکلے گا۔ ؎

شعر گر اعجاز باشد بے بلند وپست نیست
در ید بیضا ہمہ انگشتہا یک دست نیست

لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ میرؔ صاحب کے بلند اشعار بہت کم ہیں اُردو میں آپ کے چھ دیوان ہیں۔ اور غالباً صرف اسی کثرت کلام کی وجہ سے ان کا تقدم تسلیم کیا جاتا ہے۔ پست اشعار کی کثرت نے آپ کے کلام کے بڑے حصّہ کو ردّی کا ذلیل لقب دیا۔ آپ کے صرف منتخب اشعار جو تذکروں میں درج ہو چکے ہیں ضرور لاجواب، تیرو نشتر ہیں۔ باقی تمام کلام نہ دیکھنے سننے کے لائق نہ دکھانے سنانے کے قابل بقول آزادؔ مرحوم "میر صاحب کا تبرک ہے" پست خیالی و ناسنجیدگی اور فحش و ہزل سے تمام دواوین مملو ہیں۔ نسبتاً کسی قدر مہذب اشعار میں سے دو شعر انتخاباً یہاں نقل کرتا ہوں ؎

میرؔ کیا سادے ہیں بیمار ہوئے جس کے سبب   اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں

ترش رو بہت ہے وہ زرگر پسر   پڑے ہیں کھٹائی میں مدت سے ہم

غزل میں امرد پرستی میر صاحب کا خاص انداز ہے۔ وہ اس شیوہ میں بھی اپنے حریفوں سے بہت آگے ہیں خواجہ میر دردؔ کے متعلق آزادؔ کا مشہور فقرہ کہ "میر صاحب نے انھیں آدھا شاعر شمار کیا ہے" آب حیات میں اس کو کئی جگہ ذکر کیا ہے میر صاحب پر صریح افترا ہے جو حقیقت سے بہت دور ہے۔ ایک سیرت نگار یا تذکرہ نویس کا فرض ہے کہ بحیثیت ایک مورخ کے ہر واقعہ کو نقد و تحیص کے بعد قلمبند کرے۔ لیکن افسوس کہ حضرت آزادؔ نے اکثر اس نظریہ کو نظر انداز کر کے لطائف و ظرائف کی بنیاد قایم کی ہے اور واقعات صحیحہ سے چشم پوشی کر کے بازاری چٹکلوں کو واقعات کی کڑیوں میں الجھا دیا۔ تذکرے کو رنگین و دلفریب بنانے کی کوشش میں عام پسند گلکاریوں اور پھلجھڑیوں سے سادہ لوحوں کے خوش کرنے کا اہتمام بلیغ فرمایا۔ اور مورخانہ ذمہ داری کا احساس مطلق نہیں کیا نہ کہیں اپنے اختلاف بیان و تناقض کا لحاظ فرمایا جو ایک واقعہ نگار کا اوّلین فرض ہے میر تقی کی عبارتیں جو نکات الشعرا سے ہم نقل کر چکے ہیں ان کو پڑھنے کے بعد یہ گنجائش نہیں باقی رہتی کہ ایسا رکیک و توہین آمیز کلمہ میر صاحب کی جانب منسوب کیا جا سکے۔ اب بحیثیت

واقعہ نگاری کے غور کرنا چاہیئے میر تقی کے ذکر میں آزاد تحریر کرتے ہیں۔

لکھنؤ میں کسی نے میر صاحب سے پوچھا کہ کیوں حضرت آج کل شاعر کون کون ہے؟ کہا ایک تو سودا دوسرا یہ خاکسار ہے۔ اور کچھ تامل کر کے کہا۔ آدھے خواجہ میر درد (افسوس! اس سے کئی سال پہلے سودا کا انتقال ہو چکا تھا)

آب حیات میں خواجہ صاحب کا ذکر کرتے ہوئے ایک لطیفہ یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ "خواجہ صاحب کے والد مرحوم کے زمانہ میں شاہ عبدالعزیزؒ صاحب عالم طفولیت میں تھے ایک مرتبہ ایک جلسہ میں چلے گئے اور خواجہ صاحب کے پاس جا بیٹھے۔ ان کی مرید بہت سی کنچنیاں بھی تھیں جو جلسہ میں بے پردہ موجود تھیں۔ شاہ صاحب نے اس پر اعتراض کیا خواجہ صاحب نے جواب دیا کہ فقیر کے نزدیک یہ ماں بہنیں ہیں۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ "ماں بہنوں کو باہر بے پردہ لے کر بیٹھنا کب روا ہے" کس قدر مضحکہ انگیز لطیفہ ہے اگر خواجہ صاحب کی ولادت کا سال ۱۱۳۰ھ تھا جیسا کہ تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے یعنی آپ کی وفات بالاتفاق ۱۱۹۵ھ ۲۴ صفر کو ہوئی ہے۔ اور عمر شریف اس وقت اکسٹھ سال کی تھی۔ اور جب آپ کے والد کی وفات ہوئی ہے تو اس کو آزاد نے بھی تسلیم کیا ہے کہ خواجہ صاحب کا سن اس وقت ۲۶ سال کا تھا۔ لہذا ان کے والد ماجد کا سال رحلت ۱۱۵۹ھ سے زائد نہیں ثابت ہوتا۔ اور مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا سال ولادت بھی یہی ۱۱۵۹ھ ہے۔ جیسا کہ آپ کے تاریخی نام غلام حلیم سے ظاہر ہے۔ اس صورت میں خواجہ صاحب کے والد کے سامنے شاہ صاحب موصوف کا جلسہ میں شرکت کرنا کہاں تک صحیح ہو سکتا ہے؟ شاہ صاحب کا مذکورہ مکالمہ و مناظرہ ایک سال یا چھ ماہ کے بچّہ کا مباحثہ کس قدر قرین عقل ہے اس واقعہ نگاری کی داد جو کچھ دی جائے کم ہے۔ حق یہ ہے کہ آزاد کا قلم بھی آزاد ہے فاعتبروا یا اولی الابصار

اس دور سے میر حسن اور میر سوز بھی اتصال رکھتے ہیں۔ اور دونوں نے اُردو زبان اور اُردو شاعری کی ترقی و توسیع میں بڑا حصہ لیا ہے۔ اس دور کے بعد دہلی سے اُردو شاعری نے لکھنؤ کو رخت سفر باندھا۔ اور ارباب کمال ایک ایک ترک وطن کر گئے دلّی میں شاہی دربار سرد ہو گیا اور سلاطین مغلیہ کے شہزادے بھی ترک وطن ہو کر لکھنؤ وغیرہ چلدئے۔ قدردانی بھی ان کے ساتھ رخصت ہوئی۔ میر و سودا لکھنؤ جا کر دنیا سے

سفر کر چکے۔ ان کے بعد مصحفی، انشاء، جرأت اور میر حسن وغیرہ لکھنؤ گئے، شاعری کا چرچا عام ہوا قدر شناسی نے جوہر دکھائے، امراء نے توجہ کی۔ انشاء اور جرأت نے اپنا اپنا رنگ جمایا لیکن استادی کا سکہ صرف مصحفی کے نام سے چلا۔ ان کے فیض تربیت نے ناسخ، آتش، تنہا، بیمار اور اسیر پیدا کئے۔ اور لکھنؤ شاعری کا مرجع بن گیا۔ یہاں آکر زبان اردو میں ایک خاص لطافت و نزاکت پیدا ہوگئی۔ ملکی نفاست ذہنیت کچھ اصلاح کی۔ بھدّے اور ثقیل الفاظ بہت کچھ خارج ہو گئے۔ اور بہتوں کی صورت تبدیل ہوگئی۔ نئے محاورات بھی داخل زبان ہوئے۔ مصحفی، انشاء اور جرأت اپنی اپنی آن بان میں رہے۔ لیکن ان کے بعد آنے والوں نے تکلفات کے دلچسپ مناظر دکھائے۔ تلامذۂ شیخ مصحفی نے لکھنؤ کی شاعری کا ایک پُرلطف معیار قایم کرکے ایک زمانہ کو اپنی جانب متوجہ کرلیا۔ ناسخ اپنی روش کے اُستاد قرار پائے۔ زبان کی اصلاح کے ساتھ غزل کا رنگ پلٹ دیا۔ چونکہ شوکتِ الفاظ ان کی طبیعت کا خاصہ تھا غزل میں قصیدے کی شان نظر آنے لگی۔ مضامین حُسن و عشق اور واردات واحساسات کی جگہ غیر متعلق چیزوں کو غزل کا جزو بنایا واحساسا[redacted] اور شعر کی تاثیر کو بالکل مٹادیا۔

آتش کے کلام میں اکثر زبان کی سادگی کے ساتھ تغزل کا اصل مقصد موجود ہے تاثیر کا رنگ جھلکتا ہے لیکن ناسخ کا زورِ کلام اور صفائی بندش بھی ایک خاص امتیازی حالت میں ہے۔ انھیں کے عہد میں دہلی کے آخری اربابِ کمال ذوق، مومن اور غالب نے اردو شاعری کو ازسرِ نو تازہ کیا اور محمد شاہی زمانہ کی یادگار آخر سلاطین تیموریہ ابوظفر بہادر شاہ کے دم سے قلعہ میں قایم ہوئی۔ شیخ محمد ابراہیم ذوق اُستاد بادشاہ خاقانیِ ہند کے خطاب سے سرفراز ہوئے۔ قصیدہ گوئی میں یکتائے زمانہ اور غزل میں خاص طرز کے مالک تھے۔ مثالیہ مضامین کے ساتھ محاورات و ضرب الامثال ان کا مخصوص رنگ ہے۔ محاورات و امثال کا محل استعمال ان کے کلام سے معلوم ہوتا ہے۔ زباندانی کا کمال دکھاتے ہیں۔ انھوں نے زبان اُردو کی بڑی خدمت انجام دی ہے قصائد میں سودا کے سوا ذوق کے مقابلہ میں کوئی پیش نہیں کیا جاسکتا۔

۱۲۷۱ھ میں انتقال کیا۔

مومن حکیم مومن خاں ایک معزز و ذی علم خاندان کے نہایت غیور و مستغنی المزاج نازک خیال شاعر تھے۔ طباعی و ذکاوت کا جوہر خدا داد تھا۔ اصناف سخن میں یکساں کمال دکھایا ہے۔ قصائد اگرچہ امرا و سلاطین کی مدح میں نہیں کہے۔ لیکن حمد و نعت و منقبت میں نہایت بلیغ قصیدے لکھے جن کی شان سب سے جدا ہے۔ اکثر تشبیہیں تغزل کے مضامین میں شعرائے عرب کی طرح لکھی ہیں۔ مدح میں بے حد زور اور جوش اخلاص کا رنگ ہے۔ غزل میں تغزل کا حق ادا کیا ہے۔ اور نفسیاتی شاعری کے بےمثل نمونے دکھائے ہیں جن کو خالص غزل کہا جا سکتا ہے۔ معاملات حسن و عشق کو غزل میں محدود کرکے اس میں نازک خیالی کے معجزات دکھائے ہیں۔ تغزل کے دائرہ کو انھوں نے دوسرے مضامین سے بالکل محفوظ رکھا۔ یہاں تک کہ ساقی، میکدہ، شراب، اور ساغر کا بھولے سے بھی نام نہیں لیتے۔ پانچ مثنویاں بحور خمسہ میں نہایت زوردار لکھیں اور ان میں اپنی ہی عاشق مزاجی و وارفتگی کا رنگ دکھایا ہے۔ تاریخ گوئی میں اعجوبہ روزگار تھے۔ بڑے حاذق طبیب اور کامل منجم بھی تھے۔ مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے خاندان کے فیض یافتہ اور مولانا شہید دہلویؒ کے انصار و رفقا سے تھے۔ ۱۲۶۸ھ میں راہی دار البقا ہوئے۔ اب تک ان کے طرز کی کوئی کامل تقلید نہ کر سکا۔

مرزا غالب تیغ اصفہانی کے گھائل تھے اور نظم و نثر اردو کو موجب کسر شان اور اردو شاعری کو ننگ و عار سمجھتے تھے۔ آخر زمانہ میں خطوط اردو میں لکھنے لگے تھے اور پہلے جو ریختہ رشک فارسی کہتے تھے اس کی جگہ چند غزلیں بہ اتباع میر لکھ کر اردو شعرا میں بھی معدود ہوئے۔ فارسی نظم و نثر میں مرزا کا پایہ بیدل و ناصر علی کے بعد سب سے بلند ہے اور اکثر غزلیات و قصائد میں وہ عرفی و ظہوری کے ہمدوش نظر آتے ہیں۔ فارسی کا ذوق ان کی طبیعت کا خمیر تھا۔ وہ اردو شعرا کی صف میں بیٹھنا نہیں چاہتے تھے۔ چنانچہ ایک ریختہ گو حریف سے خود خطاب فرماتے ہیں۔ ع انچہ در گفتار فخر تست آں ننگ من ست

اور اپنے اردو دیوان کی بابت کہتے ہیں ؎

فارسی بیں تا بہ بینی نقشہائے رنگ رنگ   بگذر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگ من ست

کس قدر حیرت انگیز واقعہ ہے کہ مرزا کے کمالات کا آئینہ اس جدید دور میں صرف اُردو نظم ہے اور کل شہرت وقبولیت اسی کی بدولت ظہور پذیر نظر آتی ہے۔ حالانکہ نہ انھوں نے کوئی معتدبہ خدمت زبان اُردو کی انجام دی۔ نہ اُردو شاعری میں اظہار کمال کیا۔ وہ بہت قلیل المقدار سرمایہ کے مالک ہیں، نثر اُردو میں ان سے کہیں زیادہ سرسید مرحوم اور ڈپٹی مولوی نذیر احمد خاں مرحوم رہنمائی کر چکے ہیں اور مرزا کے مکتوبات کی عام اشاعت بہت بعد کو ہوئی ہے۔ انھوں نے غیر ضروری القاب و آداب کو خطوط میں حذف کر کے سہولت پیدا کی ہے اور مکاتبات میں مکالمات کی شان دکھائی ہے۔ آپ کا سال رحلت ۱۲۸۵ھ ہے۔ لکھنؤ میں شاعری کی مقبولیت اور لوگوں کے تفنن طبع نے اُردو شاعری کی ایک عجیب وغریب صنف پیدا کی جس کا نام "مرثیہ" ہے۔ اب تک واقعہ کربلا اور مصائب شہدا تذکرہ نظم کر کے نوحہ وبکا کی ترغیب سامعین کو دی جاتی تھی۔ طویل روایتیں اور مناظر بزم ورزم، قدرتی سین اور سراپا وغیرہ لاذ کر بلکہ تلوار اور گھوڑے کے اوصاف بھی اس کے اجزا میں داخل نہ تھے۔ اسی کو مرثیہ کہتے تھے۔ اس میں شاعری کا حصّہ بہت کم ہوتا تھا۔ اودھ کی حکومت شیعہ تھی۔ مجلس، تعزیہ، علم، گریہ اور سینہ کوبی مذہبی مراسم ہیں۔ مجلسوں میں ذاکر حدیث خوانی کرتے اور روایات جو کتابوں میں منقول ہیں ان کو سُنا کر روتے رلاتے تھے ان کی عزّت ووقعت بہت کی جاتی تھی۔ جب میر انیس اور مرزا دبیر کا زمانہ آیا تو انھوں نے شاعری سے ذاکری کا بھی کام لیا اور مشاعرہ کی دلچسپی بھی مجالس میں پیدا کر دی اور مذہب کے پیرایہ میں شاعری کے کمالات دکھائے۔ انھوں نے ذاکروں سے ممبر چھین لئے۔ مرثیہ کا قالب بدل دیا۔ واقعات میں حسب ضرورت موثرانہ تصرفات بھی کئے۔ اس سے مرثیہ اصناف سخن کا مجموعہ بن گیا۔ میر انیس اور مرزا دبیر نے اس فن میں کمالات دکھا کر مذہب اور شاعری کے دربار سے داد حاصل کی لیکن یہ فن لکھنؤ میں محدود رہا۔ اور اب وہاں بھی ختم ہوگیا۔ مذہبی جوش میں ترقی ہے لیکن شاعری قدر شناسی و حوصلہ افزائی کی محتاج ہے۔

ع پراگندہ روزی پراگندہ دل

زوال سلطنت کے بعد امرا بھی غیر مطمئن ہوگئے۔ بغرض ثواب نوحہ وسلام اور ماتم اب بھی نظم کئے جاتے ہیں

مرثیہ کی بدولت شاعرانہ تخئیل بھی داخل مذہب ہو گئی۔

قدیم شاعری کا آخری دور امیر، داغ، جلال اور تسلیم پر ختم ہوتا ہے۔ ان حضرات نے صفائی زبان و شستگی بندش کو زیادہ ترقی دی۔ امیر مرحوم کسی طرز کے موجد نہ تھے لیکن شعر ایک ترشا ہوا نگینہ ہوتا ہے اور باعتبار مضامین لکھنؤ کے بگڑے ہوئے رنگ کا آئینہ ہے۔ پہلا دیوان مرآۃ الغیب ناسخ کے تتبع کا پتہ دیتا ہے۔ اور دوسرا دیوان صنم خانۂ عشق کجروی و بے اعتدالی کا نمونہ ہے۔ نعتیہ دیوان میں کوئی قابل ذکر چیز نہیں ہے جو ذریعہ امتیاز ہو۔

مرزا داغ غزل میں اُستاد قیامت کار تھے۔ اگرچہ کلام میں بلندی و پستی جمع بین الضدین کا منظر رکھتی ہے لیکن تغزل کا رنگ عاشقانہ احساسات اور حسن کی ادائیں بدرجہ کمال موجود ہیں۔

جلال نے اپنے لکھنوی انداز کو بدل کر دہلی کا اتباع کیا۔ اور ایک حد تک کامیاب ہوئے۔ تسلیم کے کلام میں خاندان مومن کی ترکیبیں مزہ دے جاتی ہیں۔ لیکن مجموعہ کلام پھیکا اور سادہ ہے۔ قصیدہ غزل سے اچھا کہتے تھے۔ ان اُستادوں کے تلامذہ میں کوئی اپنے اُستاد کو نہیں پہونچا۔

اسی عہد میں جدید شاعری کا دور آغاز ہوا۔ اور ملک و قوم کی نگاہیں مولانا حالی۔ اکبر الٰہ آبادی، ڈاکٹر سر اقبال کی طرف اُٹھنے لگیں۔ عاشقانہ جذبات نے قومیات اور وطنیات کا جامہ پہنا۔ نظموں کی گرمی بازار ہوئی۔ لیکن حق یہ ہے کہ اس ایجاد کا سہرا مسدس حالی کے سر ہے وہ رہنمائے اول اور حالی کے کمال شاعری کا آئینہ ہے۔ حالی نے مسلمانوں کو جدید ترقی کی طرف بڑھایا اور قدیم غفلت سے متنبہ کر کے ان کو تعلیم و تہذیب جدید کی روشنی کے فوائد بتلائے۔ قدیم طرز سخن کو ترک کر دیا۔

اکبر نے مغربی تہذیب و تعلیم کے خراب نتائج قوم کے سامنے پیش کئے۔ اور سیلاب الحاد و تقلید کو روکنے میں پُرزور کوشش کی۔ ظرافت سے کلام میں تاثیر کا رنگ پیدا کیا اور ایک حد تک کامیاب ہوئے۔ اس رنگ میں کوئی ان کا تتبع نہ کر سکا۔

اقبال نے اسلامی حقائق و معارف کے ساتھ فلسفیانہ رنگ میں قوم کی ہمت و جرأت بڑھائی۔

شاعری سے جذبات قوم کو مشتعل کیا۔ فارسی زبان کا مذاق جو عموماً معدوم تھا لوگوں کو اس کی جانب متوجہ کیا اور مردہ ذوق میں نئی روح پھونکی۔ کلام کی تاثیر میں کلام نہیں ہو سکتا۔

افسوس! یہ آخری صاحب کمال بھی آج مسلمانوں کے اقبال کی طرح قوم سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن ؕ

ان حضرات کے بعد کوئی ہستی تاریخی حیثیت سے قابل ذکر نہیں نظر آتی۔

غزل

(از جناب شکیل احمد صاحب قادری شکیل بدایونی متعلم سکنڈ ایر)

عہدِ فردا پر حسینوں کے گماں رکھتا ہوں میں
یعنی اُمیدِ حیاتِ جاوداں رکھتا ہوں میں

جذبِ دل میں عشق کی سرگرمیاں رکھتا ہوں میں
بند اک کوزہ میں بحرِ بیکراں رکھتا ہوں میں

نقدِ اُلفت اپنے سینہ میں نہاں رکھتا ہوں میں
مجھکو کیا غم دولت کون و مکاں رکھتا ہوں میں

اللہ اللہ چشمِ ساقی میں ہیں وہ رنگینیاں
جیسے شیشہ میں شرابِ ارغواں رکھتا ہوں میں

دوست اظہارِ خطا سے مجھکو شرمندہ نہ کر
ابنِ آدم ہی تو ہوں کچھ خامیاں رکھتا ہوں میں

ہاں مجھے بھی دیکھنا ہے اے دلِ صبر آزما
تا کجا یہ ہمتِ ضبطِ فغاں رکھتا ہوں میں

میرا ذوقِ میکشی ہے عام رندوں سے جدا
امتیازِ بیعتِ پیرِ مغاں رکھتا ہوں میں

ہو گیا پارینہ گو افسانۂ اظہارِ شوق
دل میں اب تک اک اُمیدِ نوجواں رکھتا ہوں میں

سجدہ پائے یار پر ہے اور دماغ افلاک پر
یہ زمیں رکھتا ہوں میں یہ آسماں رکھتا ہوں میں

ذرہ ذرہ کو حرم بردوش پاتا ہوں شکیلؔ
ہر سجدہ بیخودی میں سر جہاں رکھتا ہوں میں

عقیدت کے آنسو

جناب حبیب الرحمٰن صاحب حبیبؔ متعلم
ایم - اے - ایل ایل - بی

آہ اے اقبال اے زینت دہ بزمِ سخن — رو رہی ہے آج تجھکو انجمن کی انجمن
دل گرفتارِ بلا ہے جان ہے وقفِ محن — ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا ہے پیرہن کا پیرہن

آج وہ اگلی سی رونق جام و ساغر میں نہیں
کیفِ نظارہ جمالِ روح پرور میں نہیں

حُسنِ دلکش تھیں تری تحریر کی زیبائیاں — کیف پرور تھیں تری تخئیل کی رعنائیاں
بحرِ بے پایاں ترے افکار کی گہرائیاں — ہم سفر جبریل کی تیری فلک پیمائیاں

اب مگر اپنی جگہ پر رنگِ محفل ہی نہیں
کیا پئیں میکش کہ اب پینے کا حاصل ہی نہیں

بادۂ سرشار ہے تیرا کلامِ زندگی — حسنِ خود بیں ہے ترا ماہِ تمامِ زندگی
نغمۂ بیدار ہے تیرا پیامِ زندگی — رازِ ہستی ہے ترا درسِ دوامِ زندگی

"جاوداں ہردم رواں ہپم رواں ہے زندگی"
گردشِ ایام میں آبِ رواں ہے زندگی

کس قدر بدمست تھی محفل میں صہبائے سخن — کس قدر پُرجوش تھی محفل میں مینائے سخن
کس قدر پُرکیف تھی چشمِ تماشائے سخن — کس قدر رنگین تھی بزمِ تمنائے سخن

اب مگر ذوقِ تماشا دیدہ و دل میں نہیں
شاعرِ ہندوستاں رندوں کی محفل میں نہیں

کر رہی تھی کام ساقی کی نگاہِ فتنہ گر — مست ہو ہو جا رہے تھے میکدہ کے بام و در
چل رہی تھی کشتیِ مئے نازنیں انداز پر — لگ رہی تھی ہر طرف اٹھتی جوانی کو نظر

زہر تھا شامل مگر جامِ مئے انگور میں
ظلمتیں پنہاں تھیں آغوشِ ردائے نور میں

تجھکو رہنا چاہیئے تھا اس زمانہ میں ابھی   رنگ بھرنا چاہیئے تھا اس فسانہ میں ابھی
آگ بھرنی تھی تجھے قومی ترانہ میں ابھی   تجھکو رہنا تھا زباں کے آشیانہ میں ابھی

"گیسوئے اردو ابھی منّت پذیرِ شانہ ہے"
بادۂ پُر جوش سے خالی ابھی پیمانہ ہے

رونے والے روکہ یہ پیرِ مغاں کی موت ہے   جادۂ ہستی میں میرِ کارواں کی موت ہے
لالہ زارِ رنگ و بو میں باغباں کی موت ہے   سالِ آغازِ جوانی میں زباں کی موت ہے

سسکیاں لیتی ہے آزادی قبائے تنگ میں
خونِ گشتہ آرزوئیں ہیں شفق کے رنگ میں

اُردو کے موجودہ مزاح نگار

از محمد مبشّر علی صدیقی۔ بی۔ اے

انگریزی لٹریچر کو آج لیوکاس اور مارک ٹوئین کی ظرافت پر ناز ہے۔اسی طرح اُردو ادب بھی موجودہ دور میں رشید احمد صدیقی۔ فرحت اللہ بیگ اور پطرس کی ظرافت پر فخر کر سکتا ہے کسی مہذب زبان کے لٹریچر میں سنجیدہ مضامین کے ساتھ مزاحیہ مضامین کا بھی عنصر ہونا لازمی ہے۔ بالفاظ دیگر مزاحیہ مضامین اسی قدر ضروری ہیں جتنے کہ سنجیدہ خدا کا شکر ہے کہ اُردو میں بھی ہمیں اس وقت کئی قابل مزاح نگار نظر آتے ہیں اور اس مضمون میں ہمیں ان کی ظرافت پر ایک تنقیدی نظر ڈالنا ہے۔ یہ بالکل سچ ہے کہ موجودہ لکھنے والوں پر قلم اُٹھانا نہ چاہیئے۔ اوّل تو انکی تصانیف مکمل نہیں ہوتیں اور پھر بعض اصحاب تصویر کا تاریک رُخ دیکھنا بالکل گوارا نہیں فرماتے۔ لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ جن مزاح نگاروں کا میں آئیندہ سطور میں ذکر کرنے والا ہوں وہ کافی کام کر چکے ہیں اور اب وقت آگیا ہے کہ ان کو تنقید کے آئینہ کے سامنے لا کھڑا کیا جائے۔

مزاح نگاری کیا ہے؟ اور اس کا پڑھنے والے پر کیا اثر ہونا چاہیئے۔ کچھ حضرات غلط فہمی سے یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ اگر پڑھنے والے نے قہقہہ لگا دیا تو مضمون بہت کامیاب ہے مسکرا دیا تو بھی غنیمت ہے ورنہ مضمون نگار نالایق اور مضمون بے کار۔ لیکن اصل حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ جواں مرگ ادیب مولوی عظمت اللہ خاں مرحوم نے کیا خوب کہا تھا کہ ہنسی کے معنی یہ نہیں کہ آدمی قہقہہ کا بم ہی اُڑائے یا کھل کھلا کر بند وقوں کی باڑھ ہی سے داغ دیے۔ ہنسی ایک ذہنی کیفیت ہے۔ ایک طرح کی بشاشت یا زیادہ صحت کے ساتھ یوں کہیئے کہ ایک نفسی انبساط ہے یعنی دل و دماغ پر ایک شگفتگی کی کیفیت چھا جائے اور کبھی کبھی لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ کھیل جائے۔ ناقدین فرنگ نے مزاح کے تین درجے رکھے ہیں۔ خوفناک۔ طنزیہ اور لطیف۔ ان تینوں اقسام کے مذاق ایک کامیاب مزاح نگار کے یہاں موجود ہونے چاہئیں۔ باتوں باتوں میں ایسی گہری طنز کر جائے کہ سمجھنے والا کلیجہ مسوس کر رہ جائے۔ ہنستے ہنستے ایسا خوفناک فقرہ بول جائے کہ سمجھنے والا ڈرنے لگے اور جب لطافت پر اُتر آئے تو وہ لطیف جملے لکھ جائے جن کو سنہری حرفوں میں لکھوا کر

عمدہ فریم میں جڑوا کر کوئی ڈرائنگ روم کی زینت کے کام میں لا سکے۔ لیکن اس کے علاوہ اور بھی کئی باتیں ہیں جن پر ایک کامیاب مزاح نگار کا پورا اُترنا ضروری ہے۔ ادب کی اور اقسام میں دوسرے تیسرے درجہ کی چیزیں بھی گوارا کی جاسکتی ہیں لیکن جہاں تک مزاح اور غزل کا تعلق ہے ذوقِ سلیم صرف درجہ اوّل کی چیزیں قبول کرسکتا ہے۔ لہٰذا ہماری رائے میں اگر ایک مزاحیہ مضمون اوّل درجے کا نہیں تو وہ کچھ بھی نہیں۔ عجیب و غریب پلاٹ یا واقعات سے جو ظرافت پیدا کی جائیگی وہ ہمیشہ ناکامیاب رہیگی۔ مزاح نگار کا یہ فرضِ اوّلین ہے کہ زبان سے ظرافت پیدا کرنے کی کوشش کرے۔ واقعات سے ظرافت پیدا کرنا ایک افسانہ نگار یا ناول نویس کا کام ہے مزاح نگار کا ہرگز نہیں۔ ان اصولوں کو مدّنظر رکھ کر اگر فیصلہ کیا جائے تو اس میدان میں رشید و پطرس کی کامیابی اور عظیم بیگ چغتائی و ملّا رموزی کی ناکامی ظاہر ہے۔ اس کے علاوہ ایک کامیاب مزاح نگار کے لئے بہت زیادہ ذاتی (Personal) چیزیں پیش کرنا بھی مناسب نہیں ہے۔ غیر ذاتی (Impersonal) چیزیں بھی کامیابی کے ساتھ پیش کی جاسکتی ہیں۔ اب ہمیں ہر ایک مزاح نگار کے مزاح پر علیحدہ علیحدہ روشنی ڈالنا ہے۔

رشید احمد صدیقی

مزاح نگاری کے تمام اصولوں کو مدّنظر رکھکر اگر دیکھا جائے تو کہنا پڑتا ہے کہ رشید اپنے تمام ہمعصروں سے بازی لے جاتے ہیں۔ اگر آپ کو فلسفہ۔ ریاضی۔ سیاسیات۔ تاریخ۔ جغرافیہ اور منطق کا ایک ساتھ مطالعہ کرنا ہو تو رشید کے مضامین کا مطالعہ کیجئے۔ ابتدا میں آپ کے مضامین بہت فلسفیانہ ہوتے تھے مگر اب رنگ نکھر گیا ہے۔ رشید زیادہ تر غیر ذاتی چیزیں پیش کرتے ہیں اور ہمیشہ زبان سے ظرافت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسلئے کامیاب ہیں۔ اپنے ایک مضمون "کچھ کا کچھ" کی ابتدا اس طرح کرتے ہیں "عشاق اور انگریز دو ہی قومیں ایسی ہیں جو نہ تعزیرات ہند سے ڈرتی ہیں اور نہ میونسپلٹی سے۔ انگریز تو ممکن ہے یوں نہ ڈرتے ہوں کہ تعزیرات ہند اور میونسپلٹی دونوں ان کی اولاد

ہیں۔ اور ظاہر ہے عشاق یوں نہیں ڈرتے کہ رزق اور موت دونوں سے آزاد ہیں۔ انگریزوں کو آئی سی ایس نے خراب کیا اور عشاق کو شعرا نے۔ چنانچہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اگر ہندوستان کو شعرا اور آئی سی۔ ایس کے اثر سے آزاد کردیا جائے تو بہت ممکن ہے کہ سوراج مل جائے۔" روزانہ استعمال کی معمولی چیزوں پر مضمون لکھنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس خاص چیز میں رشید اور پطرس کو ید طولیٰ حاصل ہے رشید نے چارپائی پر ایک مضمون لکھا ہے۔ چند سطور ملاحظہ ہوں: "چارپائی ہندوستان کی آب وہوا۔ تمدن ومعاشرت اور ضرورت وایجاد کا آخری اور بہترین نمونہ ہے۔ ہندوستان اور ہندوستانیوں کے مانند شکستہ حال، داغ دار، ڈھیل ڈھال بے سروسامان لیکن ہندوستانیوں ہی کی طرح غالبؔ حکمران کے لئے ہر قسم کا سامان راحت فراہم کرنے کے لئے آمادہ رہتی ہے۔ کوچ اور صوفے کے مریض اور ڈرائینگ روم کے اسیر اس راحت اور عافیت کا کیا اندازہ لگا سکتے ہیں جو بانوں کی کھرّی چارپائی پر میسّر آتی ہے۔"

رشید اگر انتہائی ظرافت کی کوشش بھی کرتے ہیں تو وہ بھی زبان سے واقعات سے ہرگز نہیں۔ ملاحظہ ہو۔ "مولانا سہیل سے میری ملاقات ۱۹۱۵ء میں ہوئی۔ اس زمانہ میں مولانا شاعری کرتے تھے۔ یونین کے الیکشن لڑاتے تھے اور معجون کھاتے تھے۔ اب سنتے ہیں صرف مقدمے لڑاتے ہیں اور بچے پیدا کرتے ہیں۔ جس کی ابتدا ایسی ہو اس کا انجام یہ کیوں نہ ہو۔" رشید کے مضامین کا ایک مجموعہ "مضامین رشید" کے نام سے گذشتہ سال منصّۂ شہود پر جلوہ گر ہو چکا ہے۔ لیکن ہماری نظر میں ان کے وہ بقیہ مضامین بھی ہیں جو کہ مختلف رسائل کے اوراق پر منتشر ہیں۔ "ارہر کا کھیت"، "شیطان کی آنت" مرشد وغیرہ وہ غیر فانی نشتر ہیں جو ناظرین سے ہمیشہ خراجِ تحسین وصول کرتے رہیں گے۔

پطرس

پطرس نام ہے ادبی دنیا میں سید احمد شاہ بخاری کا جو کہ آج کل لاسلکی نشرگاہ دہلی کے ڈپٹی ڈائرکٹر ہیں۔ آپ کی ظرافت زیادہ تر مغربی قسم کی ہوتی ہے۔ اور آپ کبھی یہ کوشش نہیں کرتے کہ پڑھنے والا زیادہ

مسکرائیے یا قہقہہ لگائیے۔ محض اسلوب بیان سے ظرافت پیدا کرنا آپ کا طرۂ امتیاز ہے۔ چھوٹے چھوٹے فقرے اور عام فہم الفاظ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صفحۂ قرطاس پر موتی بکھیر دیئے ہیں۔ روزمرّہ کی معمولی چیزوں پر مضمون لکھنے میں آپ کو ید طولیٰ حاصل ہے۔ مثلاً سائیکل اور بچے وغیرہ۔ زبان کی سلاست اور لوچ ایسی چیز ہے جس نے پطرس کی ایک مستقل جگہہ مزاح نگاری میں قائم کردی ہے۔ آپ ان کے مضامین پڑھکر شاید کہہ اُٹھیں کہ ان کا لکھنا تو بہت آسان ہے لیکن بڑے سے بڑا اہل قلم بھی جس وقت لکھنے کے لئے قلم اٹھائیگا اپنے کو عاجز پائیگا۔ اور یہی مضمون نگار کا کمال ہے۔ پطرس کے یہاں واقعات کی رنگ آمیزی بہت ہی مناسب اور موزوں کی جاتی ہے۔ وہ عظیم بیگ چغتائی کی طرح کوئی عجیب وغریب پلاٹ پہلے سے تیار نہیں کرتے بلکہ روزمرّہ کے واقعات عام فہم اور سلیس زبان میں ادا کردیتے ہیں۔ ان کی مشہور کتاب "پطرس کے مضامین" صرف چند مضامین پر مشتمل ہے لیکن مضامین کتنے دلچسپ اور رنگین ہیں۔ پھر صحیح مزاح نگاری کے معیار پر سب پورے اُترتے ہیں۔ اس کتاب کے آگے ہمارے ملّا رموزی اور چغتائی کی درجنوں کتابیں ہیچ ہیں۔ فرمائش پورا کرنے کے لئے بہت زیادہ لکھنا درحقیقت معیار کو پست کردیتا ہے ان کے یہ مضامین شاید ناظرین کو پسند آئیں مرید پور کا پیر۔ ہوسٹل میں پڑھنا۔ سویرے جو کل آنکھ میری کھلی۔ بائیسکل اور بچے وغیرہ۔ پطرس کی منظرکشی ملاحظہ ہو۔ "بائیسکل" کے مضمون میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔ "دس قدم بھی چلنے نہ پایا تھا کہ اب کی بار ہینڈل یکلخت نیچا ہوگیا۔ اتنا کہ گدی اب ہینڈل سے کوئی فٹ بھر اونچی تھی میرا تمام جسم آگے کو جھکا ہوا تھا۔ تمام بوجھ دونوں ہاتھوں پر تھا جو ہینڈل پر رکھے تھے اور جو برابر جھٹکے کھا رہے تھے۔ آپ میری حالت کو تصوّر میں لائینگے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ میں دور سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی عورت آٹا گوندھ رہی ہو۔" "بچے" پر پطرس نے ایک مضمون لکھا ہے اور اس کی ابتدا اس طرح کی ہے۔ "یہ تو آپ جانتے ہوں گے کہ بچّوں کی کئی قسمیں ہیں مثلاً بلی کے بچے۔ فاختہ کے بچے وغیرہ۔ مگر میری مراد صرف انسان کے بچّوں سے ہے جن کی ظاہراً تو کئی قسمیں ہیں۔ کوئی پیارا بچہ ہے اور کوئی ننھا بچہ ہے۔ کوئی چاند سا بچّہ ہے اور کوئی پھول سا بچّہ ہے۔ لیکن یہ سب اس وقت تک کی باتیں ہیں جب تک برخوردار پنگوڑے میں سویا پڑا ہے۔ جہاں بیدار ہوئے

بچّے کے پانچوں حواس کام کرنے لگے بچّے نے ان سب خطابات سے بے نیاز ہوکر ایک الارم کلاک کی شکل اختیار کرلی۔

مرزا فرحت اللہ بیگ

تمکین کاظمی لکھتے ہیں کہ فرحت صاحب نے ادبِ اُردو میں ایک نئی چیز کا اضافہ کیا ہے۔ ایک مستقل باب کھول دیا ہے۔ ایک نئی روشنی پیدا کردی ہے۔ آنے والی نسلیں اس چیز کو پیشِ نظر رکھ کر اور چیزیں بنائیں گی اس باب میں متن اور حواشی کا اضافہ کیا جائیگا۔ اس روشنی میں ہزاروں چیزیں بن جائیں گی۔ ہماری رائے میں یہ محض کاظمی صاحب کا خیال ہی خیال ہے۔ مزاح نگاری فرحت اللہ بیگ کے لکھنے کے بہت پہلے سے رائج ہے۔ اور فرحت صاحب نے ادب اُردو میں کسی نئی چیز کا اضافہ نہیں کیا۔ اور نہ کوئی مستقل باب کھولا ہے۔ البتہ آنے والی نسلیں انھیں ایک کامیاب مزاح نگار ضرور تصور کریں گی اور ان کے مضامین کو قدر کی نگاہ سے دیکھیں گی۔ فرحت کا بڑا کمال تشخص نگاری (Personal Sketch) میں ظاہر ہوا ہے۔ مثال کے طور پر ان کے مضامین "ڈاکٹر نذیر احمد کی کہانی۔ کچھ ان کی کچھ میری زبانی" اور "۱۲۶۱ھ میں دہلی کا ایک مشاعرہ" ملاحظہ ہو۔ آخر الذکر سے اردو داں طبقہ اچھی طرح واقف ہے۔ آپ کو محسوس ہوگا کہ غالب ذوق۔ مومن اور بہادر شاہ ظفر آپ کے سامنے چل پھر رہے ہیں۔ "مضامین فرحت" کے بقیہ دلچسپ مضامین یہ ہیں۔ ایک نواب صاحب کی ڈائری۔ کل کا گھوڑا۔ ہم اور ہمارا امتحان۔ بڑا مزہ اس ملاپ میں ہے وغیرہ فرحت اپنے مضامین میں مصوّری غضب کی کرتے ہیں اور پھر اس پر کوثر و تسنیم سے دُھلی ہوئی دلّی کی پاکیزہ زبان اور قیامت ڈھاتی ہے۔ لیکن جہاں وہ واقعات سے ظرافت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں ٹھوکر کھاتے ہیں مثلاً ان کا مضمون پرائمری مڈل اور ہائی اسکول کی شرارتیں ملاحظہ ہو۔ اس کے برعکس جس مضمون کے لئے وہ کوئی خاص پلاٹ تیار نہیں کرتے انھیں کافی کامیابی ہوتی ہے ان کا مضمون "اونھ" خاص طور پر بہت دلچسپ اور رنگین ہے نتیجہ بھی بہت اچھا مرتب ہوتا ہے۔ سب سے پہلے وہ آخری مغل بادشاہوں کی "اونھ" کو لیتے ہیں پھر ہندوستان کے جمود کا تنہا ذمہ دار "اونھ" کو قرار دیا جاتا ہے۔ جلسوں کی

کارروائی کی بے ثباتی کا اصلی سبب بھی "اونہہ" ہے۔ پھر طالب علم کی "اونہہ" کی باری آتی ہے۔ اور پھر "گھر والی اور میاں" کی "اونہہ" کی۔ اس مضمون کے کچھ اقتباسات ملاحظہ ہوں:- "ہندوستان میں اس "اونہہ" کا کچھ کم زور نہیں رہا ہے۔ نادر شاہ چڑھا چلا آرہا ہے۔ محمد شاہ بادشاہ رنگ رلیاں منا رہے ہیں۔ پرچہ لگتا ہے کہ نادر لاہور تک آگیا۔ بادشاہ سلامت "اونہہ" کر دیتے ہیں جس کا فارسی ترجمہ تاریخوں میں "ایں دفتر بے معنی غرق مئے ناب اولیٰ" کہا گیا ہے لیجئے ان کی ایک اونہہ سے دلی لٹ جاتی ہے۔ خزانہ خالی ہو جاتا ہے۔ تخت طاؤس اُڑ جاتا ہے۔"

"ہاں یہ ضرور ہے کہ میاں بیوی کی "اونہہ" بعض دفعہ وہ کام کر جاتی ہے جو بڑے بڑے افلاطون صلاح کار بھی نہیں کر سکتے۔ بیوی کو غصہ آیا میاں نے "اونہہ" کر دی۔ چلو لڑائی کا خاتمہ ہو گیا۔ میاں کسی بات پر بگڑے بیوی نے "اونہہ" کر دی۔ میاں کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔"

"میری طرف سے کوئی ہندوستان کے لیڈروں کو سنائے کہ سوراج حاصل کرنا ہے تو پہلے اپنے بھائیوں میں سے اس "اونہہ" کو نکالو۔ اس کے بعد ہندوستان کیا ساری دنیا تمھاری ہے۔ اگر یہ نہیں ہو سکتا تو خواہ مخواہ چیخ چیخ کر کیوں اپنا گلا پھاڑتے ہو۔ ہم "اونہہ" کر دیں گے اور تم چیختے چیختے مر جاؤ گے۔"

شوکت تھانوی

صفِ دوم کے مزاح نگاروں میں شوکت اوّل نمبر پر آتے ہیں۔ گو شوکت کے مزاح میں وہ بات نہیں جو رشید اور پطرس کا طرّہ امتیاز ہے۔ لیکن ان کا طرزِ نگارش اور اسلوب بیان جاذبِ نظر ضرور ہے۔ لکھنؤ میں عرصۂ دراز تک رہنے سے ان کی زبان خوب نکھر گئی ہے۔ شوکت بھی الفاظ کی بندش سے مزاح پیدا کرنا چاہتے ہیں لیکن زیادہ کامیاب نہیں ہوتے۔ جہاں وہ افسانے مزاحیہ رنگ میں لکھتے ہیں ٹھوکر کھاتے ہیں۔ ان کے سامنے ترقی کا ایک وسیع میدان ہے اور اگر وہ لکھنا کچھ کم کر دیں اور موجودہ معیار کو ذرا اور بلند کریں تو وہاں تک ان کی رسائی بھی ہو سکتی ہے۔ لیکن شوکت اور چغتائی کی یہ کوشش کہ ہر رسالہ

ہیں ان کا نام فرور ہوان کی مزاح نگاری کے لئے سم قاتل ہے۔ زیادہ لکھنے کی بجائے موجودہ معیار کو بلند کرنے کی ضرورت ہے۔ اور یہ شاید ان کے بس کی بات نہیں۔ شوکت جزئیات کے مطالعہ کے بہت دلدادہ ہیں اور اس کے اظہار میں کچھ حد تک کامیاب بھی ہیں۔ ان کے مزاحیہ مضامین کے مجموعے موج تبسم۔ بحر تبسم۔ سیلاب تبسم اور دنیائے تبسم شائع ہو چکے ہیں۔ بعض دلچسپ مضامین یہ ہیں۔ میٹھے چاول۔ سودیشی ریل۔ دوست۔ مطلب۔ مٹھو بیٹے۔ چالیسواں۔ اور ہم زلف وغیرہ۔ یہاں ہم ان کے مضمون "مٹھو بیٹے" میں سے چند سطور نقل کرتے ہیں۔
مٹھو کو بلّی نے دبوچ لیا ہے اور بیگم صاحبہ ناراض ہو رہی ہیں "ارے اب کیوں دوڑ رہے ہو کمبخت نے میرے مٹھو کو چبا بھی ڈالا ہوگا۔ اللہ کرے اس کو بھی اس طرح موت آئے۔ ارے میں تو پہلے ہی جانتی تھی کہ اگر مٹھو کا پنجرہ درست نہ کرایا گیا تو ایک دن یہی ہوگا۔ پنجرہ کی کھڑکی جس دن سے ڈھیلی ہوئی لاکھ لاکھ کہا لیکن کسی نے درست نہ کرائی۔ اب تو سب کے کلیجے میں ٹھنڈک پڑ گئی ہوگی۔ اب تو وہ بولنے بھی لگا تھا۔ میں نے اس کو تو لی ایسا ے کر پالا تھا۔ اب کیسا موٹا تازہ ہو گیا تھا۔ بیگم صاحبہ نے الگ گھر سر پر اٹھا رکھا تھا اور مٹھو بیٹے الگ بلّی کے منہ سے "ٹیں ٹیں" کر رہے تھے۔ شوکت بعض بعض جگہ بہت جھک گئے ہیں جہاں انھوں نے ذاتی رنگ آمیزی سے کام لیا ہے ان کے بعض مضامین انگریزی کے موجودہ مزاح نگار ایلفا آف دی پلاؤ (Alpha of the Plough) کے مضامین سے ایک حد تک ملتے جلتے ہوتے ہیں۔

ملّا رموزی

ملّا رموزی عرصہ سے مزاح نگاری کر رہے ہیں اور مذاق ہی مذاق میں بڑے کام کی باتیں کہہ جاتے ہیں اس لئے رموزی کے مضامین میں اصلاحی پہلو بہت نمایاں ہوتا ہے۔ رموزی کے چند الفاظ اور فقرے مخصوص ہیں جو کہ قریب ہر مضمون میں یکے بعد دیگرے دہرا دیئے جاتے ہیں۔ مثلاً علی گڑھ کالج۔ ننھے میاں کی والدہ دیگر احوال یہ ہے کہ یہاں سب خیریت ہے وغیرہ۔ رموزی ذاتی Personal چیزیں بہت پیش کرتے ہیں۔ آپ ایک درجن کتابوں سے زائد کے مصنف ہیں۔ کچھ کتابوں کے نام یہ ہیں۔ شادی۔ صبح لطافت۔ زندگی۔

عورت ذات - لاٹھی اور بھینس وغیرہ - رموزی فطرتاً قدامت پسند واقع ہوئے ہیں لہذا ہر نئی چیز کو شبہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ بعض اوقات وہ تصویر کا دوسرا رُخ دیکھنا کسی طرح گوارا نہیں کرتے - اور یہ انکی بڑی کمزوری ہے - رموزی کو مزاحیہ خطوط لکھنے میں کمال حاصل ہے - چنانچہ اکثر مدیروں کے نام وہ اس قسم کے خطوط لکھتے رہتے ہیں - رموزی دورازکار باتیں بہت زیادہ سپرد قلم کرجاتے ہیں - ان کی بعض کتابوں کو اگر نظر ثانی کرکے دوبارہ شائع کیا جائے تو ان کا حجم پہلے سے بہت کم رہ جائیگا - مثال کے طور پر ان کی کتاب "شادی" ملاحظہ ہو ایک مہمل سہرا کتاب کے آخر میں بلا وجہ درج ہے - سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کے شائع کرنے کی کیا ضرورت تھی ہرکیف رموزی کا ذہن مزاح نگاری کے لئے بہت رسا ہے - اور اگر بعض جملوں اور لفظوں کو وہ بار بار نہ دہرایا کریں تو اچھا ہے - یہاں ہم ان کے ایک خط میں سے چند سطور نقل کرتے ہیں - اصلاحی پہلو ملاحظہ ہو: " افسوس ہے کہ جناب کے رسالہ میں نہ نظم ہوتی ہے نہ غزل - حالانکہ آپ امام الشعراء حضرت غالب کے مزار کے ناظم ہیں یا خزانچی - مگر پھر بھی آپ کا پرچہ نظمی اور غزلی افکار سے پاک ہے - ورنہ میں اپنی شاعری کا نمونہ ارسال خدمت کرتا - میرے اس نمونہ سے آپ کو ایک فائدہ یہ ہوتا کہ آپ کے پرچہ کے خلاف سیکڑوں شعراء ہجو لکھتے - اور رُباعیاں کہتے - وہ یوں کہ میں نے ایسی غزل کی طرح ڈالی ہے جس کے ہوتے ہوئے اُردو سے آج تک کی ممتاز غزل گوئی کافور ہو جاتی ہے - یعنی میری غزل میں نہ عاشق مینا فاختہ بن کر گھونسلہ میں بیٹھتا ہے نہ قبر کے اندر سے لاسلکی کا پیام دیتا نہ بسمل بن کر مقتل میں تڑپتا نہ بھری محفل سے محبوبہ کی گالیاں کھا کر نکالا جاتا ہے - پس جب میری اس قسم کی غزل آپ کے پرچہ میں شائع ہوتی اور شعراء آپ کے پرچے کے خلاف ہجو لکھتے تو اس کے سیکڑوں خریدار پیدا ہو جاتے جیسا کہ ایک رسالہ محض اس لئے اسلام اور اعاظم اسلام کے خلاف لکھا کرتا ہے کہ مسلمان یوں نہیں تو مارنے تاڑنے ہی کے اس رسالہ کے خریدار تو ہوں - مگر میں نہیں چاہتا کہ آپ کے پرچہ میں ایسی غزلیں ہوں جن میں رونے رُلانے ہجر و فراق کے مصائب و آلام اور محفل سے نکالے جانے کے ذلیل واقعات ہوں - کیونکہ آجکل کے اچھے سے اچھے صدر الشعراء اور بدر الشعراء کی غزل اُٹھا کر دیکھ لیجئے ایسے ہی دور از عقل و فطرت واقعات سے لبریز ہوگی - کیونکہ وہ تو ان

اتنی لغو و لایعنی غزل آئی ہے اِدھر اپنے ہندوستانیوں کو ذاتی عقل ملی نہیں تقلید دی عقل پر گذر کرتے ہیں۔"

مرزا عظیم بیگ چغتائی

چغتائی مزاحیہ ناول نویس زیادہ ہیں اور مزاح نگار بہت کم۔ وہ بغیر عجیب و غریب پلاٹ تیار کئے شاید ایک سطر نہیں لکھ سکتے۔ خود انھیں اس بات کا اعتراف ہے اور وہ شوکت تھانوی کی کتاب "سیلاب تبسم" کے مقدمے میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ میری مزاح نگاری کا دار مدار سے دے کر صرف پلاٹ پر ہے اس لئے چغتائی بجز افسانوں کے اور کچھ نہیں لکھ سکتے۔ فی الواقع ان کے ایسے مضامین جو کہ افسانے نہیں بہت کم ہیں۔ اس قسم کے مضامین میں "چنڈیل" والا مضمون خاص طور پر کامیاب اور دلچسپ ہے۔ یہاں ہم ان کی ناولوں مثلاً کولتار۔ ویمپائر۔ کھرپا بہادر وغیرہ کے متعلق کچھ عرض کرنا نہیں چاہتے کیونکہ ان کا ذکر اس مضمون سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔ مگر کولتار (جو کہ ان کا شاہکار سمجھا جاتا ہے) کے متعلق صرف اتنا عرض کرینگے کہ جس سوسائٹی کا انھوں نے نقشہ کھینچا ہے وہ امریکہ اور یورپ کی ہو تو ہو ہندوستان کی تو ہے نہیں۔ معاف فرمائیگا کوئی ہندوستانی لڑکی اتنی بے شرم نہیں ہو سکتی کہ گلاب جامن دوسروں کے منہ پر دے مارے۔ بہت ممکن ہے مغرب میں ایسا ہوتا ہو۔ اُن کے بعض افسانہ نما مزاحیہ مضامین یہ ہیں ممتحن کا پان چلّہ۔ ٹیلیفون۔ بیوی کا خط۔ یکہ وغیرہ صرف "الشذری" میں انھوں نے زبان سے ظرافت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور ایک حد تک وہ اس میں کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ بہرکیف اگر افسانوں ہی کے پیرایہ میں مزاح نگاری کرنا مقصود ہو تو وہ مارک ٹوین کی مزاح نگاری کی طرح ہونا چاہیئے۔ مثال کے طور پر مارک ٹوین کا ایک مختصر مزاحیہ انگریزی افسانہ "Punch Brothers Punch" پیش کیا جا سکتا ہے

غرض مزاح نگاروں میں قسم اوّل کی چیزیں پیش کرنے والے صرف گنتی کے دو چار آدمی ہیں ورنہ دو ایک اچھے مضمون تو ہر ایک کے یہاں نکل آئینگے۔ مندرجہ بالا مزاح نگاروں کے علاوہ تمکین کاظمی۔ فخر نظامی۔ ایم اسلم۔ ابو تمیم۔ نکارہ۔ سلطان حیدر۔ میر ولی اللہ ایبٹ آبادی وغیرہ نے بھی کچھ مزاحیہ مضامین

لکھے ہیں۔ آخر الذکر کو چھوڑ کر بقیہ تمام حضرات کے مضامین مزاح نگاری کے اعتبار سے بالکل سطحی ہیں۔ اس لئے انہیں کامیاب مزاح نگاروں کی فہرست میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ تمکین کاظمی کی ظرافت بہت ہی ادنیٰ درجہ کی ہے۔ میر ولی اللہ کے مضامین گو تعداد میں کم ہیں لیکن بہت دلچسپ اور مزاح کے لحاظ سے قابل قدر ہیں۔ اُن کے مضامین کا ایک مختصر سا مجموعہ "ماہ و پروین" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ کچھ مضامین کے نام یہ ہیں۔ ذو الاسپیٹن۔ آڑو۔ گرما دسرما۔ وغیرہ۔ لیکن انھوں نے کچھ عرصہ سے اس طرف توجہ بہت کم کر دی ہے۔ ورنہ اس میدان میں ان کے لئے کافی گنجائش تھی۔ آخر میں ہم اس سلسلہ میں ایک ناقد کی رائے لکھکر مضمون ختم کرتے ہیں "چغتائی صاحب کی مزاح نگاری اکثر و بیشتر منحصر ہوتی ہے صرف پلاٹ یا واقعات پر۔ یعنی وہ حالات ایسے پیش کرتے ہیں جو مشاہدے کے بعد یوں بھی ہر شخص کو ہنسا سکتے ہیں ۔ رموزی کی مزاح نگاری منحصر ہے اس امر پر کہ وہ الفاظ یا فقروں کا استعمال اُن کے عام منبا و رمعنی سے ہٹ کر کرتے ہیں۔ رشید کی مزاح نگاری فلسفیانہ مزاح نگاری کا بہترین نمونہ ہے۔ کوئی نہ کوئی سنجیدہ نتیجہ اُن کی تحریر سے ضرور پیدا ہوتا ہے۔ پطرس کی مزاح نگاری بڑی حد تک مغربی رنگ کی ہے جس میں واقعہ و انداز بیان دونوں سے مضحک کیفیات پیدا کی جاتی ہیں۔ لیکن نتیجہ کے لحاظ سے ہمارے لئے یہ کہنا دشوار ہو جاتا ہے کہ اُن میں واقعی کسی تلخ حقیقت کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ حالانکہ ایک مزاح نگار کا حقیقی کمال یہی ہے۔ شوکت کی مزاح نگاری بھی اس خصوصیت سے معرّا ہے۔ اور وہ بھی سطحی طور پر اپنے موضوع سے گذرنا چاہتے ہیں۔"

"رودادِ غم"

جناب محمد حبیب الرحمٰن صاحب حبیب متعلم ایم اے ال ال بی
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مری بزمِ مسرت بزمِ ماتم ہوتی جاتی ہے
شعاعِ جلوۂ امید مدھم ہوتی جاتی ہے
نگاہِ لطف میرے حال پر کم ہوتی جاتی ہے
مری رنگیں نوائی نالۂ غم ہوتی جاتی ہے

"بھلا دو مجھکو تم پیارے بھلا دینا ہی اچھا ہے
مری شمعِ محبت کا بجھا دینا ہی اچھا ہے"

غرض کیا تمکو میری شامِ غم شامِ مصیبت ہے
مرے ارمان، میری آرزوئے، میری حسرت ہے
مری آشفتہ حالی سی، جنوں سی، جوشِ وحشت سے
مری رودادِ الفت سی مرے دردِ محبت سے

"بھلا دو مجھکو تم پیارے بھلا دینا ہی اچھا ہے
مری شمعِ محبت کا بجھا دینا ہی اچھا ہے"

سنی جاتی نہ تھی تم سے کبھی آہ و فغاں میری
نہ تھی یوں آشنا فریاد سے ہرگز زباں میری
تغافل سی تمھارے آگئی گو لب پہ جاں میری
مگر تم بھول کر سنتے نہیں اب داستاں میری

"بھلا دو مجھکو تم پیارے بھلا دینا ہی اچھا ہے
مری شمعِ محبت کا بجھا دینا ہی اچھا ہے"

کبھی میں آہ کرتا ہوں کبھی فریاد کرتا ہوں
یہی صورت ہے جس سے شکیب [illegible]
تصور سے دلِ ناشاد کو میں شاد کرتا ہوں
خدا شاہد ہے میں اب تک [illegible]

"بھلا دو مجھکو تم پیارے بھلا دینا ہی اچھا ہے
مری شمعِ محبت کا بجھا دینا ہی اچھا"

مختار الحسن زنجانی دھامپوری

علی گڑھ میگزین

نمبر ۱	بابت جنوری سنہ ۱۹۳۸ء	جلد ۱۶

طلباء مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا علمی و ادبی سہ ماہی رسالہ

نگران

جناب ضیاء احمد صاحب ایم۔ اے (لکچرار شعبہ فارسیہ)

ایڈیٹر

محمد ابواللیث صدیقی البدایونی۔ بی۔ اے۔ آنرز (علیگ)



جناب ضیاء احمد صاحب - ایم- اے
(لکچرار شعبہ فارسیہ)
نگران

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

علی گڑھ میگزین

جلد ۱۶ | جنوری ۱۹۳۸ء | نمبر ۱

شذرات

علی گڑھ میگزین کا معیار کبھی ایسا نہیں رہا جس کے لئے ہم باہر والوں سے شرمندہ ہوں یا اپنوں کے استحقار کے لائق ٹھیریں، جو لوگ اس کے مطالعہ سے ہماری علمی اور ادبی صلاحیتوں کا اندازہ لگاتے ہیں اُنھیں بھی مایوسی کا موقع نہیں ملا، رہے وہ حضرات جن کا مقصد ہی "چھیڑ چھاڑ" ہے، ان کی خدمت میں بھی ہم شکایت پیش نہیں کرتے، وہ جو کر رہے ہیں کرتے رہیں، میگزین بھی اپنی استعداد بھر کچھ نہ کچھ کر ہی لیگا۔

میگزین مسلم یونیورسٹی کا علمی رسالہ ہے، ایک دار العلوم سے شائع ہونے والا مجلہ جو کسی باخبر شخص کی ادارت میں مرتب ہو اور جس کی ترتیب و تدوین میں مدیر کے خون جگر کے ساتھ ملک و قوم کے ان نونہالوں کی کاوشیں شریک اور شامل ہوں جن کو علم و ادب کے آسمان پر مستقبل کا آفتاب اور ماہتاب بنکر چمکنا ہے اگر کسی اعتبار سے بھی اپنے معیار میں پستی کا امکان رکھے تو قابل گرفت ہے، اصولاً ایسے رسائل میں صرف [illegible] شائع ہونے چاہئیں جو مفید دلچسپ اور قابل قدر ہوں۔ جن کے لکھنے میں مضمون نگار نے تحقیق مطالعہ اور [illegible]

ثبوت دیا ہو اور جن کے پڑھنے کے بعد ناظرین جب رسالہ کو بند کریں تو اطمینان کی سند رہے، ایسے مضامین جو "چائے کی ایک پیالی" یا "سگرٹ کی ایک کش" کی مدد سے انجام پا جاتے ہیں ان کے لئے اردو کے بہت سے رسائل موجود ہیں۔ کیونکہ ہم میں بفضل الٰہی پیشہ ور اور شوقیہ اڈیٹروں کی بھی کمی نہیں، بلکہ اب تو یہ سلسلہ یہاں تک دراز ہو چکا ہے کہ "شبابیات" اور "جنسیات" سے گذر کر محض "خرافات اور لغویات" کی اشاعت کے لئے رسالوں کو جاری کیا جا رہا ہے۔

اِن حالات میں میگزین کو "خشک" کہدینا بالکل عام ہے اور ہم اس "خطاب" کو بخوشی قبول کرتے ہیں علی گڑھ میگزین "خشک" ہے اور "خشک" رہیگا، اس کو یوسیت زدہ دماغوں کی تفریح کے لئے چھوڑ دیا جائے تو ہرج نہیں، ملک میں ایسے لوگ کم ہیں لیکن ہیں ضرور جو ناچنے گانے والی عورتوں کی تصویریں یا ادب لطیف رسالوں میں دیکھکر گھبرا جاتے ہیں، میگزین ان کے ذوق کی تکمیل کرتا ہے اور کریگا۔

اس اعتبار سے میگزین کی ادارت بھی "کار طفلاں" نہیں، اسے بھی بار امانت سمجھنا چاہئے، مدیر کے سلیقہ اور نظر کا اثر براہ راست رسالے کے معیار اور پالیسی پر پڑتا ہے، علی گڑھ میگزین کے مدیر سے جو توقعات باہر والوں کی وابستہ ہوتی ہیں کچھ بیجا نہیں، لیکن بیچارہ مدیر اپنی مجبوریاں سنائے بھی تو پڑھنے والے "سنت دیرینہ" سمجھکر گذر جاتے ہیں، لہٰذا اس کا نہ کہنا ہی مناسب ہے ورنہ ہم کہیں اور آپ فرمائیں لغو تو پھر بات کہاں سے کہاں پہنچے، لہٰذا اس منزل سے ہم بھی بغیر کچھ کہے ہی گذرے جاتے ہیں، البتہ ایک چیز کا اعتراف ضروری ہے، ہم نہیں کہہ سکتے کہ ہمارے ناتواں بازو ادارت کے اس اہم بار کو اٹھانے میں کہاں تک ہمارے معین و مددگار ثابت ہونگے، بہر حال ہماری پیہم کوشش یہی ہوگی کہ میگزین کو تابناک ماضی اور "روشن مستقبل" میں ہمارا دور بدنما داغ بن کر نہ رہے، ہم نہیں جانتے ہماری کوششیں کہاں تک بار آور ہونگی کیونکہ اس کا دار و مدار آپ کے اشتراک عمل، مضمون نگاروں کی بے نیازی، پریس کی عنایت اور سب سے بڑھکر حکم الٰہی پر ہے، ہم صرف اس پر اکتفا کرتے ہیں۔

السعی منی والاتمام من اللہ

اس مرتبہ میگزین کی زندگی میں ایک اہم تبدیلی نظر آئیگی، ہمارے کرم فرما جناب خواجہ منظور حسین صاحب جن کا تعلق میگزین سے بہت دیرینہ تھا اور جو عرصے اس کے نگراں بھی تھے اس مرتبہ اپنی ذمہ داریوں سے دست بردار ہوگئے اور یہ نازک فرض مولانا ضیاء احمد صاحب ایم۔اے، لکچرار شعبہ فارسیہ کے سپرد ہوا۔ خواجہ صاحب کی نگرانی میں میگزین نے جو ترقی کی اس کے ہم سب معترف ہیں اور جس دلچسپی اور انہماک سے انھوں نے اپنا یہ خوشگوار فرض انجام دیا اس کے لئے موصوف کے بدل ممنون ہیں، ہم ان کی جدائی کے موقع پر افسوس کرتے ہیں لیکن

رموز مملکت خویش خسرواں دانند

ہمیں یقین واثق ہے کہ ہمارے نئے نگراں کے دور میں میگزین نہ صرف اپنی قدیم بلند روایات کو قایم و برقرار رکھے گا بلکہ ضیاء احمد صاحب کے ذوق علمی اور وسعت نظر سے ہمیں امید ہے کہ میگزین کا معیار بلند تر سطح پر پہنچ کر دم لیگا۔

ہمارے افتتاحیہ جملوں نے ہمارے معیار اور آئندہ کے متعلق ہماری پالیسی کو واضح کردیا ہوگا، اگر ہمارا رسالہ ایسا تابناک نہ ہوگا جس کے سامنے دنیائے ادب کا ہر کارنامہ بے نور ٹھرایا جاسکے تو ایسا بھی نہ ہوگا جس کے لئے ہم شرمندہ ہوں ہم صرف معیاری مضامین شائع کریں گے البتہ تنوع کا ضرور لحاظ رکھا جائیگا۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم پست مذاق کی تسکین کا بھی وعدہ کرتے ہیں اس سے میگزین آجتک معذور رہا ہے اور اب بھی معذور ہے، تاہم اس میں ایسے مضامین اور مقالات بھی شائع ہونگے جن پر ملک کے اچھے اچھے ادیب اور انشا پرداز بھی بجا طور پر ناز کرسکتے ہیں، ان کے پہلو بہ پہلو بعض مبتدیوں کی کاوشوں کو بھی جگہ ملے گی جو اردو کی خدمتگذاری کا شوق رکھتے ہیں، اُن کی تحقیق اور اصابت رائے سے پختہ مشق اور پرانے لکھنے والے متفق نہ ہونگے لیکن ان میں جو کمی ہوگی وہ زمانہ کے اتار چڑھاؤ کے خراد پر اتر کر خود درست ہوجائیگی، میگزین ان ہی کا رسالہ ہے مالی اعتبار سے بھی اس کا قیام ان ہی کا مرہون منت ہے، اس کی غایت اصلی ان کے ذوق کو ابھارنا

کرنا اور ان کی ادبی صلاحیتوں کو بیدار کر کے منظر عام پر لانا ہے، اس کا منشا ان کو اہل ملک سے متعارف کرانا ہے جن کی محفل میں ایک دن اُنھیں چمکنا ہے اور جن کی پُرخلوص تنقیدیں اور ہمدردانہ مشورے انکی راہ میں بہت کچھ آسانیاں پیدا کر دینگے، اگر اس وقت میگزین کا دامن ان کے لئے تنگ کر دیا جائے تو ان کی حق تلفی میگزین کی زیادتی، ہماری بدمذاقی، اور زبان و ادب کی بدنصیبی ہوگی۔

ہمارے اکثر دوست استفسار کرتے ہیں کہ علی گڑھ اردو کی خدمت کے لئے کیا کر رہا ہے، اس کا جواب دینا اُتنا ہی دشوار ہے جس آسانی سے ہم اس سے فرار چاہتے ہیں، سرسید اور ان کے ادبی رفقار کی کوششوں نے علی گڑھ کی سرزمین کو زبان و ادب کی جدید تحریکات کا مرکز بنا دیا تھا، یہاں کا ذرہ ذرہ ان کی بے لوث اور پُرخلوص خدمات کا اعتراف کر رہا ہے۔

ع خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

مرکزیت کا یہ دعویٰ عرصہ تک قائم رہا۔ لیکن امتداد زمانہ نے ایسا رنگ بدلا کہ لوگوں کو اس کی صداقت میں شبہ ہونے لگا اور شبہ سے گذر کر اب تو یہ خیال یقین کی حد میں داخل ہو چکا ہے کہ علی گڑھ والے "حرف برخود غلط" ہو کر رہ گئے ہیں، ممکن ہے مسلمانوں کی تعلیمی بیداری میں بہت سے لوگ اس سے مطمئن ہوں لیکن اردو کی ہر جدید تحریک میں اس کا قدم جو سب سے آگے ہونا چاہئے تھا سب سے پیچھے نظر آتا ہے۔

علی گڑھ کے در و دیوار سے اپنے کارناموں کو اُجاگر کرنے کی صدائیں ہنوز بلند ہو رہی ہیں لیکن اس آواز میں بھی اب رفتہ رفتہ اضمحلال پیدا ہو رہا ہے، ہم میں سے بعض ہٹ دھرم ابتک چیختے اور چلاتے رہے سمجھتے تھے کہ اس نقارخانہ میں جو سب سے زیادہ چیخے اسی کی سنی جائیگی، لیکن یہ بڑی غلط فہمی تھی، دنیا کام کرنے کی جگہ ہے آپ جس چیز پر چاہئے پردہ ڈالدیجئے لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہر چہرہ پر سے کبھی نہ کبھی نقاب اُٹھ ہی جاتی ہے اور سارے جلوے بے پردہ نظر آنے لگتے ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ عرصہ کے بعد نقاب اُٹھ کر ایسی مہیب اور بھیانک صورت نظر آنے لگتی ہے کہ انسان ڈر جائے، اگر ہم نے اب بھی نہ سمجھا [illegible]ل ایسا ہی ہوگا، اب بلند آہنگی اور ڈینگ مارنے کا وقت نہیں۔ وقت کی آواز کو سمجھنا اور سمجھکر قدم

اٹھانا ہے، ورنہ اب کہیں پیچھے رہ گئے تو پھر کوئی چارہ نہیں رہیگا۔

لوگ پوچھتے ہیں کہ علی گڑھ کو اردو کی مرکزیت اور مسلمانوں کی واحد درسگاہ ہونے کا دعویٰ ہے لیکن سال بھر میں اردو کی کتنی کتابیں علی گڑھ سے شائع ہوتی ہیں، کتنے مقالات اشاعت پذیر ہوتے ہیں، ملک کے دیگر اخباروں اور رسالوں میں یہاں والوں کے کتنے مضامین شائع ہوئے، اس کا جواب باہر والے ہم سے پوچھتے ہیں اور ہم یہاں کے ذمہ دار اصحاب سے۔

حیرت تو یہ ہے کہ یہ یونیورسٹی جو "ورنیکولر یونیورسٹی اسکیم" کہہ کر شروع ہوئی تھی، جہاں سرسید نے اردو کے جدید ادب کی بنا ڈالی تھی آج اردو سے اسقدر بے اعتنائی پر آمادہ ہے، باہر والوں کے اعتراضات یقیناً بات کو بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں لیکن یہ حقیقت اور آہ کتنی دلخراش حقیقت ہے کہ ابتک اس جامعہ میں جہاں کا سالانہ بجٹ آٹھ نو لاکھ روپیہ ہوتا ہے، جہاں بہت سے ضروری اور غیر ضروری کاموں کے لئے روپیہ پانی کی طرح بہا دیا جاتا ہے وہاں اردو ڈپارٹمنٹ میں صرف تین استاد ہیں اور ابتک بی۔ اے میں اردو بطور اختیاری مضمون داخل نہیں ہے سنا ہے کہ فی الحال یہاں کے ارباب حل وعقد نے اس کی ضرورت کو محسوس کر کے اصلاح کا وعدہ فرمایا ہے۔ ہم ان وعدوں کی ایفا کی امید میں چشم براہ ہیں۔

بعض اور اسی قسم کے مسائل غور طلب ہیں اور اس سلسلہ میں ہم بہت کچھ لکھنا بھی چاہتے ہیں لیکن

یہاں تو بات کہنے میں بھی کٹتی ہے زباں میری

اس سے میری مراد یہ ہرگز نہیں کہ ہمارے جو استاد اردو کے شعبہ میں موجود ہیں ان میں اردو کی خدمتگزاری کا شوق نہیں رہا۔ انفرادی طور پر وہ سب اردو کے بہی خواہ ہیں اور کچھ نہ کچھ کر رہے ہیں اس اجڑے گلشن میں اگر کچھ بہار ہے تو انھیں کے دم سے ہے اور وہ اردو سے ذوق رکھنے والے طلباء کی ہر وقت ہر ممکن امداد کے لئے تیار رہتے ہیں، اور بعض نوجوان جو ادبی حلقوں میں ابھی روشناس ہوئے ہیں انھیں کے ممنون کرم ہیں۔ تعلیم بالغان کے سلسلہ میں بھی اس شعبہ والوں نے

پیش کی ہیں اور طلبار اور اساتذہ کے اشتراک سے یہ مفید کام جلد از جلد شروع ہو جائیگا، یونیورسٹی کی انجمن اردوئے معلیٰ نے بھی اس تحریک سے دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے ہر ممکن مالی امداد کا وعدہ کیا ہے۔

انجمن اردوئے معلیٰ کا نام آتے ہی ہمارے دل کو ٹھیس لگتی ہے اور حسرت ہوتی ہے، کسی زمانہ میں یہی انجمن زندہ تھی اور شباب پر تھی مقالات پڑھے جاتے تھے، تقریریں ہوتی تھیں، بحث و مباحثہ کی مجلسیں گرم رہتی تھیں، اردو کے خدمتگذار دور دراز مقامات سے چل کر آتے اور اپنے گرانقدر ارشادات سے مستفید فرماتے اب سے کچھ عرصہ پہلے جب ہم اس انجمن کے معتمد اعزازی تھے انجمن کا رسالہ سہیل بھی شائع ہونے لگا تھا، بعض ادبی مطبوعات کا سوال بھی درپیش تھا اور مقالات اردو کے عنوان سے چند بیش بہا مقالات شائع بھی ہوئے لیکن

آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

اب تو انجمن میں حیات کے آثار بھی نہیں، نہ معلوم کس ہوا نے اسے مفلوج اور بیکار کر دیا۔ خدا کرے کہ یہ ناخوشگوار موسم جلد گذر جائے اور پھر بہار کی آمد کا مژدہ ہو۔

اس کی ذمہ داری نہ یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد پر ہے اور نہ اراکین شعبہ اردو پر، اس میں جو کچھ قصور ہے وہ خود طلبار کا ہے جو دوسری ہنگامہ آرائیوں سے فرصت نہ پانے کے باعث اس سے بے نیاز ہوتے جا رہے ہیں۔

انھیں معلوم نہیں کہ دریا کا بہاؤ کس سمت کو ہے اور ہوا کا رُخ کیا ہے، ابھی وہ جامعہ کے چہار دیواری میں ہر تحریک کو اپنے خیال کے مطابق جامہ پہنا دیتے ہیں لیکن جب دنیا کے تلخ تجربوں سے دوچار ہونگے تو ان کی یہ [illegible] گی ایک شیریں خواب سے زیادہ معلوم نہ ہوگی جس کی تعبیر بیحد تلخ ہو۔

اُس وقت معلوم ہوگا کہ دنیا اور اس کے معرکے ایسے خوشگوار نہیں جتنے کالج کی فضا میں نظر آتے ہیں، زندگی نام ہے مسلسل جد و جہد کا، سعی پیہم کا جس سے عہدہ برا ہونے کے لئے معقول تربیت کی ضرورت ہے۔

درسگاہوں اور تعلیمی اداروں خصوصاً کالجوں اور یونیورسٹیوں کی ذمہ داری اس نظر سے اور بھی بڑھ جاتی ہے، جو آج کالج کے 'خوش فکر' نوجوان ہیں وہی کل ملک کے لیڈر اور قوم کے رہنما ہونگے، ملت کی کشتی کی ناخدائی ان کے سپرد ہوگی اپنے زور بازو سے وہ اسے معراج کمال پر لیجائینگے اور اپنی ہمت سے اس کے نصب العین تک رسائی کرائینگے،

سیاسیات میں ان کا حصہ لینا ضروری بھی ہے اور مفید بھی، اس سے ان میں تجربہ اور وسعت نظر پیدا ہوگی، وہ سیاست کے بازار میں کھرے کھوٹے کی پرکھ جھوٹے اور سچے کی تمیز کرنا سیکھیں گے، لیکن اگر انھوں نے اس میدان میں ابتدا ہی خود غرضی اور وقتی جذبات کے ماتحت کی تو اس کا انجام بخیر ہونا مشکل نظر آتا ہے۔ ان میں انتہا پسندی جو لیڈروں کی قابل ستائش صفت ہوسکتی ہے ایک عیب ہے اور ہنگامہ آرائی تو کسی حالت اور کسی صورت میں شریفوں کا شیوہ نہیں۔

باہر والوں کی یہ شکایت ایک حد تک درست ہے کہ علی گڑھ میں یہ ہنگامے آئے دن ہوتے رہتے ہیں لیکن اسے یونیورسٹی کی پالیسی اور ارباب حل و عقد کی ذمہ داری سے کوئی تعلق نہیں، اس ہنگامہ کا سب سے بڑا اکھاڑا یونین ہے جو طلباء کی اپنی مجلس ہے، جس کے عہدہ دار طلباء کے منتخب کئے ہوئے اور طلباء کو جوابدہ ہوتے ہیں۔ اس کی پالیسی بھی عموماً کابینہ کی مجوّزہ ہوتی ہے۔ اکثر یوں بھی ہوا ہے کہ ایک خیال رکھنے والی جماعت برسر اقتدار ہوگئی ہے اور اس قسم کی تجویزیں پیش ہو کر منظور ہوگئی ہیں کہ مسلمانوں کو کانگریس میں شامل ہو جانا چاہئے، کبھی ایسا دیکھنے میں آیا ہے کہ مسلم لیگ کا جھنڈا یونین کی عمارت پر لہرا دیا گیا ہے جہانتک موجودہ حالات کا تعلق ہے مسلم لیگ کے حامی اور معاون فی الحال اکثریت میں ہیں۔

ہمارے پیشرو نے جب اپنا آخری پرچہ نکالا تھا اس وقت سے ابتک بہت سے اہم

رونما ہوئے، عموماً کوائف جامعہ کے سلسلہ میں ان کا ذکر ہوتا تھا، ہم اسے غیر ضروری سمجھتے ہیں، یہ مقصد انسٹیٹوٹ گزٹ سے حاصل ہوتا ہے جو یونیورسٹی کے ہفتہ بھر کی خبروں کا خلاصہ پیش کرتا ہے، میگزین کا تعلق اس درسگاہ کے ادبی رخ سے ہے جس میں یہ چیز بالکل ان میل اور بے جوڑ معلوم ہوتی ہے، البتہ بعض خاص واقعات کے متعلق اگر مدیر اپنی رائے کا اظہار کرنا چاہے تو کوئی ہرج نہیں۔

نیوایرس ڈے کے سلسلہ میں ہمارے ہردل عزیز وائس چانسلر ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب کو "سر" کا اعزازی خطاب ان کی تعلیمی خدمات کے اعتراف میں ملا۔ ہم اس موقع پر ڈاکٹر صاحب کو مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ رہا پریزی ڈنڑ وہ ابھی واجب ہے۔

ہماری درسگاہ کے نامور فرزند سید حسین صاحب جو اب سے بہت عرصہ پہلے ہندوستانی صحافت اور سیاست میں بڑا نام پیدا کر چکے ہیں اور فی الحال امریکہ میں اسلامی تاریخ اور معاشرت کے پروفیسر ہیں علی گڑھ تشریف لائے اور عالم اسلامی پر تین بصیرت افروز خطبے ارشاد فرمائے، موصوف خود تمام ممالک اسلامی کی سیر کرتے ہوئے آئے ہیں اور چشم دید واقعات اور حالات کی روشنی میں آپنے اسلامی سلطنتوں کی ترقی اور اسلامی حکومت کے شاندار مستقبل کی پیشین گوئی کی۔

یونیورسٹی کے تقسیم اسناد کے جلسہ میں اس مرتبہ ہز ہائنس سر آغا خاں پرو چانسلر اور ہز ہائنس نواب صاحب آف رامپور تشریف لائے اور خطبہ جلسہ تقسیم اسناد لارڈ لوتھین نے پڑھا، اسی ہفتہ میں ٹیکنیکل کالج کی افتتاح کی رسم ادا ہوئی اور ہز اگزالٹیڈ ہائنس نظام دکن اور ہز ہائنس آغا خاں، ہز ہائنس نواب صاحب آف رامپور، نواب بہادر سر محمد مزمل اللہ خاں صاحب نے اپنے گرانقدر عطیات کا اعلان فرمایا۔

یہ حالات بہت کچھ امید افزا ہیں اور اگر قوم نے بھی اس طرف توجہ کی تو مسلم یونیورسٹی بہت جلد بہتر درسگاہ ہو کر مسلمانوں کی جسمانی اور ذہنی تعلیم و تربیت کی ضامن ہو سکے گی۔

یونیورسٹی کے کھیل کود کی مختلف ٹیمیں جو اکثر مقابلوں اور میچوں میں شامل ہوئیں کامیاب واپس ہوئیں، ہاکی ٹیم میں شکور نے بالخصوص بڑا نام پیدا کیا اور عام طور پر امید کی جا رہی ہے کہ یونیورسٹی کلر اس سال حاصل کریں گے، ہم شکور صاحب کو مبارکباد دیتے ہیں اور کلر ملنے پر دعوت کی اُمید رکھتے ہیں۔

میگزین میں جو کچھ غیر معمولی تعویق ہوئی اس کی ذمہ داری تمام تر یونیورسٹی پریس پر ہے، مسودات ۴ جنوری کو پریس بھیجے گئے لیکن ہمارے مسلسل تقاضوں اور مستقل طواف کے باوجود فروری کے وسط تک میگزین نہیں مل سکا ہمارا ارادہ تھا کہ پہلا پرچہ جنوری کے آخر تک نکل جائے اور باقی دو پرچے مارچ اور اپریل میں شائع کر دیے جائیں لیکن

ع اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

آئندہ پرچہ اقبال نمبر ہوگا جو پریس جا چکا ہے، لیکن نہیں کہہ سکتے کہ پریس والے کب تک اجازت دینگے کہ آپ کی خدمت میں پیش کر سکیں۔ ان کو یہ شکایت ہے اور ایک حد تک بجا ہے کہ اب تک ان کے معاملات یونیورسٹی سے طے نہیں ہوئے، اس وجہ سے وہ پریس میں اپنی تجاویز کو عملی جامہ پہنانے سے معذور ہیں، علاوہ بریں یونیورسٹی کا جو اور کام ارباب حل وعقد وقت اور بے وقت (Urgent) کر کے بھیجدیتے ہیں وہ بھی انکو چھاپنا پڑتا ہے۔ بہر حال یہ مجبوریاں ان کی ہیں۔ اور یہ ذمہ داریاں ہماری۔

لیث

اِمتحانات کا مسئلہ

پروفیسر حبیب الرحمٰن صاحب ایم۔اے۔(علیگ) ایم۔ای۔ڈی (برمنگھم) وائس پرنسپل ٹریننگ کالج

(ذیل کا مضمون حبیب الرحمٰن صاحب کے اُس طویل مقالہ سے ماخوذ ہے جو برمنگھم یونیورسٹی میں ایم، ای، ڈی، کی ڈگری کے لئے پیش کیا گیا تھا، موصوف کو اس مقالہ پر نہ صرف ڈگری ملی بلکہ آپ کو کیڈبری پرائز کا بھی مستحق قرار دیا گیا اور مشاہیر ماہرین تعلیم نے آپ کے اس مقالہ کی تعریف کی، ہم موصوف کے شکر گزار ہیں کہ آپ نے اس کو اُردو میگزین کے لئے عنایت فرمایا، مقالہ اصل میں انگریزی میں تھا جس کا خلاصہ موصوف کے مشورہ سے میں نے کیا ہے۔ اسے عام طور پر دلچسپ بنانے کے لئے زیادہ اصطلاحی الفاظ سے پرہیز کیا گیا ہے اور اعداد و شمار کی کثرت بھی نظر انداز کر دی گئی ہے، کیونکہ اس کا مقصد ماہرین تعلیم کو نہیں بلکہ ہمارے نوجوانوں کو اس مسئلہ کی طرف متوجہ کرنا ہے۔ "لیث")

امتحانوں کی ضرورت

کچھ عرصہ سے امتحانات کے موجودہ نظام کے خلاف شکایات سنی جا رہی ہیں اور امتحانوں سے بیزاری کی آج یہ کیفیت ہے کہ ماہرین تعلیم مثلاً ڈاکٹر نارووڈ (Dr. Norwood) ڈاکٹر بوائڈ (Boyd) پروفیسر (Compagnac) اور تعلیمی مسائل کی تحقیق کرنے والے ادارے مثلاً (New Education Fellowship) بعض امتحانوں کو سرے سے بند کرنے کے قائل ہیں، اکثر سمجھدار لوگ اسے مناسب سمجھتے ہیں کہ امتحانوں کو باقی رکھا جائے لیکن یہ وہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ موجودہ طریقوں میں سے اکثر غلط اور ناکافی ہیں اور ان میں معقول تبدیلی کی ضرورت ہے۔

لیکن سب سے پہلا قابل غور سوال یہی ہے کہ امتحانات کی حاجت بھی ہے یا نہیں، اس ضرورت پر

پہلوؤں سے بحث کرسکتے ہیں، سب سے پہلے سوسائٹی کو لے لیجئے۔ ہر مہذب اور متمدن سوسائٹی کے افراد کسی نہ کسی قسم کی تعلیم کو قومی ضروریات کے لئے ناگزیر خیال کرتے ہیں، اُن کے نزدیک تعلیم ایسی ہو جو اُن کے قوائے عقلی اور رجحانات فطری کے مطابق ہونے کے ساتھ سماج کے قیام اور بقا کے لئے بھی مفید ہو، اس تعلیم کے لئے سوسائٹی اسکول، کالج اور صنعتی ادارے قایم رکھتی ہے لیکن اس کو یہ بھی حق ہے کہ کبھی کبھی وہ سوال کرے کہ یہ ادارے اسکول اور کالج اپنا کام صحیح طریقے پر انجام بھی دے رہے ہیں یا نہیں اس کی ایک صورت تو یہ ہے کہ معائنہ کرنے والوں کی ایک جماعت مسلسل اُن کی ترقی اور فعل کو بغور مطالعہ کرتی رہی اور صحیح مشورہ دیتی رہے دوسرا طریقہ یہ بھی ہے کہ ایسے اسکول اور کالج وغیرہ ہر سال یا اور کسی مخصوص مدت کے بعد اپنے دامن سے نکلنے والوں کو ایسے ماہرین کی خدمت میں پیش کرے جو قوم میں معتبر سمجھے جاتے ہیں اور وہ ماہرین اُنکی قابلیتوں اور صلاحیتوں کے امتحان سے اداروں کے کام کا حساب لگائیں۔

علاوہ بریں سوسائٹی کو ضرورت ہے کہ افراد ایسے کام کریں جو سماجی زندگی کے لئے مفید ہوں، اس لئے سماج کی خدمت کرنے والوں کو ایک بڑی جماعت میں سے مختلف صلاحیتوں اور رجحانات کی بنا پر منتخب کیا جاتا ہے اور یہ ناممکن ہے اگر کسی قسم کا امتحان انفرادی قابلیت کو ظاہر کرنے کے لئے موجود نہ ہو۔

ایک اور جماعت اُن لوگوں کی ہے جو دوسروں سے کام لیتے ہیں اور اس کام کے نفع اور نقصان کی ذمہ داری خود اُن کی ذات پر عائد ہوتی ہے، ایسی صورت میں بغیر اس یقین کے کہ کوئی خاص شخص اس ضروری صلاحیت کو رکھتا ہے یا نہیں جو اس کی جگہ کے لئے درکار ہے اپنے فرائض کی ادائیگی میں کامیاب نہیں رہیگا۔ اُسے یہ معلوم کرنے کی اشد ضرورت ہے کہ کون سے افراد کس قسم کے کام کے لئے مفید ہو سکتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ امتحانات سے اس قسم کی اطلاع مل سکتی ہے، لہذا اس جماعت کے نقطہ خیال سے بھی امتحانات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

اس کے علاوہ خود افراد کو عموماً یہ علم نہیں ہوتا کہ وہ کس کام اور کس پیشہ کے لئے سب سے زیادہ موزوں ہیں، اس سبب سے پہلے وہ کشمکش حیات کا مقابلہ کرنے کیلئے خود کو عام تعلیم سے آشنا کراتے ہیں اور اس کے بعد کسی خاص شعبہ زندگی میں کمال پیدا کرکے اپنی جگہ تلاش کرتے ہیں اُن کے زاویہ سے بھی امتحان بیحد

ضروری ہیں۔

والدین بھی امتحانوں کے مسئلہ میں دلچسپی کا اظہار کرنے کا حق رکھتے ہیں، وہ اپنے بچوں کو اسکول میں زندگی کا مقابلہ کرنے کے لئے سامان مہیا کرنے بھیجتے ہیں، اگر انہیں صرف اُس فیصلہ پر قناعت کرنے کو کہا جائے جو بعض اُستاد اپنے شاگردوں کے متعلق صادر کرتے ہیں تو شاید وہ ایسے دیانت داری سے قبول نہ کریں، ممکن ہے بعض اُستادوں کے ذاتی رجحانات اور خواص کی بنا پر ان کا فیصلہ اتنا معقول نہ ہو جتنا اُسے ہونا چاہیئے۔

والدین کے علاوہ خود پڑھانے والے اُستاد امتحان کی ضرورت محسوس کرتے ہیں، اول تو معمولی اور کُند ذہن طلباء کے لئے امتحانات کا خوف ہی محنت کرانے کا واحد ذریعہ ہے اور پھر سمجھدار اور مخلص اُستاد عموماً پڑھانے کے نئے نئے طریقوں سے تجربہ کرتا رہتا ہے۔ اور اس کا دل تجربہ کے نتائج معلوم کرنے کیلئے بجا طور پر بیتاب رہتا ہے، لہذا مختلف اسکولوں اور اداروں میں جو تعلیمی طریقے اور طریق کار مستعمل ہیں اُن کے نتائج بصورتِ امتحان سامنے رکھ کر خود اُن طریقوں کی قدروقیمت کا کچھ نہ کچھ اندازہ ضرور ہو جاتا ہے۔

خود یونیورسٹیوں میں امتحانوں سے فرار ممکن نہیں، یہ یونیورسٹیاں پبلک کی جیب پر بڑا بار ہیں اور عموماً تعلیم کے اعلیٰ ترین مدارج طے کرانے کی ذمہ دار ہیں، یہاں سے فارغ ہو کر نکلنے والے فوراً ہی زندگی میں اپنی ذمہ داریاں ادا کرنے کے لئے طلب کئے جاتے ہیں لہذا کسی نہ کسی طریقے سے ان اعلیٰ تعلیمی اداروں کو یہ جانچنا بھی ضروری ہے کہ کیسے لوگ اُس تعلیم کو حاصل کرنے کے مستحق اور قابل ہیں اور وہ لوگ جو تعلیم سے فراغت پا کر نکلتے ہیں کہاں تک اُس صرف اور محنت کا بدلہ ادا کر سکتے ہیں جو ان اداروں میں اُن پر بطور سرمایہ لگایا گیا ہے۔

ان سب ضرورتوں کے پیشِ نظر ہم امتحانات سے بالکل آزاد نہیں ہو سکتے اسی کی ضرورت کا اظہار نوک اسٹون ([illegible]) کانفرنس کے موقع پر بھی کیا گیا تھا جہاں دنیا کے مختلف ملکوں کے ماہرین تعلیم ایسے مسائل کی تحقیق کے لئے جمع ہوئے تھے، اُس موقعہ پر پروفیسر اسٹوارٹ نے کہا تھا کہ "میں [illegible] نظام پر بھروسہ اور اعتماد کرنے کے لئے تیار نہیں جو امتحان کے قیود سے پاک [illegible] اگر موا[illegible]

امریکہ والوں کی نمایندگی کرتے ہوئے کہا تھا کہ میرے ہم وطن اب امتحانات کو مسترد کرنے کا خیال نکال چکے ہیں وہ اب امتحانات کی اہمیت کے قائل ہوگئے ہیں اور ان کی ضرورت کو محسوس کرتے ہیں۔

امتحانات کا موجودہ نظام

یہ تو ظاہر ہوگیا کہ امتحانوں کا وجود ضروری ہے اور اُن کو مسترد کرنا ممکن نہیں لیکن اس میں بھی شبہ کی گنجائش نہیں کہ موجودہ نظام کچھ تشفی بخش نہیں چنانچہ ذیل کے بیانات سے اس کی تصدیق ہوگی۔

پروفیسر (Edgeworth) انگلستان کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"میرے خیال میں ان امتحانوں میں اتفاق اور وقت کا اثر اس درجہ کارفرما ہے کہ کامیاب ہونے والے طلباء میں سے صرف ایک قلیل تعداد ایسی نکلے گی جو فی الحقیقت کامیاب ہے اور جو فیل ہونے کے خطرہ سے بالا ہے اگر اُتنے ہی قابل امتحان لینے والوں کی ایک دوسری جماعت اُنکا امتحان لے۔

سر میکائیل سیڈلر (Michael Sadler) کا بیان ہے:۔

"انگلستان کا ایک وسیع رقبہ آج کسی نہ کسی قسم کے امتحان میں مبتلا ہے۔ لیکن اُن کے نتائج میں جو ابتری ہے وہ ملک اور قوم کے لئے وجہ اضطراب ہے، عوام کی رائے اُن سے متفق نہیں، لوگ اُن پر اعتراض کرتے ہیں، وہ تعلیم کے نتائج اور امتحانوں کے نظام سے مطمئن نہیں جن کا اثر خود اُستادوں اور قومی تعلیم پر بُرا پڑ رہا ہے۔"

سر فلپ ہارٹوگ بھی اسی قسم کا بیان دیتے ہیں۔

"ہمارا نظام مفلوج اور بیکار ہوگیا ہے۔"

پروفیسر سی۔ ڈبلو ویلنٹائن بھی اس سے اتفاق کرتے ہیں:۔

"امتحانوں پر بڑا اعتراض یہ ہے کہ وہ صرف اس بات کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ امتحان دینے والے کہاں تک اسی کام کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ بالفاظ دیگر ان سے طلباء کی موجودہ حالت کا صحیح اندازہ نہیں ہوسکتا ہے"

مذکورہ بالا بیانات انگلستان کے متعلق تھے، اسکاٹلینڈ کے متعلق ڈاکٹر اسمتھ (Smith) نے لکھا ہے۔

"ایسے امتحان جو صرف انفرادی قابلیت کا اندازہ لگاتے ہیں قابلِ اطمینان نہیں، ہیں اُن امتحانوں سے بھی مطمئن نہیں جو مقابلہ کے امتحان کہلاتے ہیں۔

اسی ملک کے متعلق ڈاکٹر ہیپ برن (Hepburn) کا قول ہے:۔

"اسکاٹلینڈ میں ممتحن کی شخصیت بہت زیادہ مشتبہ ہے، ہمارے اسکولوں میں ایسے اُستادوں کی ایک کثیر تعداد موجود ہے جو موجودہ نظام پر بھروسہ نہیں رکھتے اور اس کے برے نتائج سے باخبر ہیں، یہی حال عوام کی اس جماعت کا ہے جس نے گذشتہ چند سالوں سے تعلیمی مسائل اور مراحل میں دلچسپی کا اظہار شروع کیا ہے۔

پروفیسر تھورن ڈائک (Thorndike) جو امریکہ کے ماہر تعلیم ہیں اپنے ملک کی بابت لکھتے ہیں:۔

"ریاستہائے متحدہ میں امتحانات اتفاقی ہوتے ہیں اور مقامی ہم نے انھیں بالکل ناکارہ پایا۔ ایک انسان جو دوسرے انسان کے صرف چند گھنٹوں کی محنت کا معائنہ کرے جس کے لئے اس نے عرصہ تک ایک خاص انداز میں کوشش کی ہو ایک بہت معمولی اندازہ کر سکتا ہے جس کو اس قدر وقعت دیجاتی ہے۔

سوئٹزرلینڈ میں امتحانات کی حالت اس درجہ ابتر ہوگئی کہ اکثر مقامات پر امتحانوں کو مسترد کرنا پڑا۔

پروفیسر بووے (Bovet) کا بیان ہے:۔

"سوئٹزرلینڈ میں ابتدائی اور ثانوی تعلیم کے امتحانات صرف مشتبہ نہیں بلکہ اُن کی مذمت کی جاتی ہے، اکثر مقامات پر تو اب اُن کا وجود بھی نہیں ڈنمارک کے متعلق ایک دوسرے فاضل لکھتے ہیں:۔

"ڈنمارک کے ثانوی مدارس کے اُستادوں کی یہ شکایت بجا ہے کہ وہ امتحانوں کی مصیبت کے مارے ہوئے ہیں .... ان امتحانوں کی بدولت صحیح قابلیت کا اندازہ مشکل ہے۔ کتابوں کو ازبر کرنے کا زیادہ رواج ہوگیا ہے، اسکول میں عموماً ۲۶ گھنٹے فی ہفتہ کام ہوتا ہے لیکن طالبعلم عام طور پر ۳ گھنٹے روزانہ گھر پر کام کرتے ہیں۔

یہی حال دوسرے ممالک اور اقوام کا ہے، اس سے یہ اندازہ کرنے میں دقت نہیں ہوتی کہ امتحانات کا موجودہ نظام بہر حال اور بہر صورت قابل اطمینان نہیں"

موجودہ امتحانات کے نتائج

جب سے عوام اور ماہرین تعلیم نے اس مسئلہ پر غور کرنا شروع کیا ہے کہ موجودہ امتحانوں کی نتائج پر کہاں تک اعتماد کیا جا سکتا ہے بہت سی کوششیں اس مسئلہ کے حل کرنے پر صرف ہو چکی ہیں اور ہندوستان کو چھوڑ کر تمام ممالک میں اس کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے تحقیق و تدقیق ابھی تک جاری ہے۔ ان تحقیقات کے نتائج کو اس مختصر صحبت میں تفصیل کے ساتھ پیش کرنا ناممکن ہے لیکن ہم تازہ ترین تحقیقات کے خلاصے پیش کر کے ظاہر کرنے کی کوشش کریں گے کہ امتحانوں کے ان نتائج میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے اس اختلاف کو ثابت کرنے کے لئے عموماً اعداد و شمار کو کام میں لانے والے طریقوں پر عمل کیا جاتا ہے۔

مثلاً کسی امتحان دینے والے کو مختلف امتحانوں میں بیٹھنے کا موقع دے کر ہر امتحان میں حاصل کئے ہوئے نمبروں کا مقابلہ کیا جاتا ہے اور اس مقابلہ کے لئے مختلف تدابیر اختیار کی جاتی ہیں ان تدابیر کو اختیار کرنے کے بعد حیرت انگیز نتائج ظہور میں آئے ہیں مثلاً اسٹارچ (Starch) اور ایلیٹ (Elliott) نے معلوم کیا کہ مختلف اُستاد ایک ہی کے اسکول کے طلبار کو کسی خاص پرچہ میں جو نمبر دیتے ہیں اُن میں اختلاف کی کوئی حد نہیں یعنی اگر کل نمبر ١٠٠ ہیں تو مختلف اُستاد اُسی پرچہ میں اسے لیکر ٠٠ تک کوئی نمبر دے سکتے ہیں، کوئی اُس کو ٢٠ کے قابل سمجھتا ہے، کسی کی نظر ٤٥ پر پڑتی ہے کوئی ٦٠ اور کوئی ١٠٠ میں سے ٩٩ تک دے سکتا ہے۔ اس سے دو باتیں ثابت ہو گئیں اول تو یہ کہ استاد ایک ہی چیز کے متعلق اپنے اپنے فیصلوں میں متفق نہیں ہوتے اور دوسرے یہ کہ وہ مضامین کے اعتبار سے بھی ایک دوسرے سے مختلف نتائج پر پہنچتے ہیں۔

(Carnegie Corporation) کی اعانت سے اس قسم کی تحقیقات کو بین الاقوامی پیمانے پر عمل میں لایا گیا اور ان کے نتائج فوک اسٹون (Folkstone) کانفرنس میں پیش کئے گئے۔

[illegible]ستان کے متعلق سر فلپ ہارٹوگ کی رپورٹ شائع ہو چکی ہے، اس میں اس امر کی تحقیق

کا حال درج ہے کہ ایک خاص تعداد پرچوں کی جو مختلف امتحان لینے والوں کو دیئے گئے تھے ان میں سے ہر ایک کا آسی پرچہ کے متعلق کیا فیصلہ ہوا اور پھر دو جماعتوں نے علیٰحدہ علیٰحدہ اوقات میں اُن پرچوں کو کس معیار پر جانچا۔

[illegible] کے امتحان میں تاریخ کے پرچہ کی پندرہ کاپیاں علیحدہ کر لی گئیں جن کے نمبر ایک ہی تھے اور اُن کو دوسرے ممتحنین کے حوالہ کیا گیا جنھوں نے ۴۴ مختلف نمبر دیئے جو ۹۶ کے کل نمبروں میں ۲۱ سے ۷۰ تک تھے، کچھ عرصہ بعد وہی کاپیاں دوبارہ اُن ممتحنین کو دی گئیں اور پہلے نمبروں کا نشان مٹا دیا گیا۔ اس مرتبہ ان کے نتائج میں اور بھی زیادہ اختلاف تھا۔ اب بجائے ایک ہی اصل نمبروں کے ۴۴ مختلف نمبر ہو گئے جن کا شمار ۱۶ سے ۷۱ تک تھا۔

اس قسم کی ابتری مختلف پرچوں کے جواب کے نمبروں میں پائی گئی تحقیقات کرنے والے ماہرین نے لاطینی، فرانسیسی وغیرہ کے امتحانات بھی اس میں شامل کئے تھے۔

یہ تو حال اس صورت میں تھا کہ وہی ممتحن ایک ہی پرچے کو مختلف اوقات میں جانچے، اب اگر ایک ممتحن کی جگہ دوسرا ممتحن ہوتا تو اس اختلاف کے اور بھی بڑھ جانے کا احتمال ہے، چنانچہ اس تحقیقاتی کمیٹی نے اس بات کو بھی پایہ ثبوت کو پہونچا دیا ہے کہ امتحان لینے والوں کا اختلاف ایک ہی چیز کے نتیجہ کو مختلف بنا سکتا ہے اب ہم ان اختلافات کے اسباب میں سے بعض کا ذکر کریں گے

ایک ممتحن جب کاپیاں لیکر جانچنے کے لئے بیٹھتا ہے تو بالکل تر و تازہ ہوتا ہے۔ اس کا دماغ محنت سے تھکا ہوا نہیں ہوتا لیکن، جیسے جیسے وہ کاپیاں دیکھتا جاتا ہے اور اس محنت کا اثر اس کے دل او دماغ پر ہوتا جاتا ہے ویسے ہی اس کی جسمانی حالت تبدیل ہوتی جاتی اور اس کے تھک جانے کا اثر جلدی لاپرواہی وغیرہ کی صورت میں ظاہر ہونے لگتا ہے، وقت گزرنے پر وہ اُس پرچہ کی عام غلطیوں سے آگاہ ہو جاتا ہے اور اس کی نظر ان پر ہی پڑتی ہے جو ممکن ہے اُس کے علم میں آنے سے قبل اکثر کاپیوں میں بغیر دیکھی گذر گئی ہوں، غرض ممتحن کی اس حالت کا اثر غیر محسوس طور پر ظاہر ہوتا رہتا ہے و نتائج کا معیار شروع سے آخر تک یکساں قایم نہیں رہتا، وہ کاپیاں جو پہلے دیکھی گئیں [illegible]

بعد میں دیکھی گئیں۔ اُن کے نتائج بالکل بدل سکتے ہیں اگر اُن کی ترتیب بدل گئی ہوتی۔
یہ ایک نفسیاتی کیفیت تھی جو ہر ممتحن کے ساتھ پیش آتی ہے۔ اس کے علاوہ امتحان کی کاپیاں جو اکثر مختلف مقامات اور اداروں سے آتی ہیں ممتحن کے حوالہ کردی جاتی ہیں، ان میں سے ہر مختلف جگہ سے آنے والی کاپیوں میں کچھ پسندیدہ اور کچھ ناپسندیدہ اجزا ہوتے ہیں اور اس کا سبب یہ ہوتا ہے کہ کہیں کسی چیز پر زور دیا جاتا ہے اور کہیں دوسری چیز پر، ایک جگہ اُستاد ایک چیز کو ضروری سمجھکر اُس پر زیادہ محنت صرف کرتا ہے، دوسری جگہ اُسی چیز کو غیر ضروری جان کر پڑھانے والا نظر انداز کردیتا ہے یہ دقت عموماً ہر مضمون میں اور خصوصاً اُن مضامین میں پیش آتی ہے جہاں واقعات اور حالات کا یاد رکھنا لازم ہوتا ہے ممتحن جب ایک جگہ کی کاپیاں پاتا ہے تو اُن میں ایک یکسانیت نظر آتی ہے جب وہ دوسرا بنڈل سامنے رکھکر بیٹھتا ہے تو زاویۂ نگاہ بدل جاتا ہے اس تبدیلی کا اثر نمبروں میں فرق پیدا کردیتا ہے یہ سب اس طرح ہوتا رہتا ہے کہ ممتحن کو اس کا احساس بھی نہیں ہوتا لیکن نتائج میں فرق ظاہر ہے اور اس صورت سے "اتفاق" کا جزو بیحد اہم ہوجاتا ہے، طلبار کے نتیجہ میں یہ چیز بھی شامل ہوجاتی ہے کہ کسی مخصوص بنڈل میں اُن کی کاپیاں کہاں ہوتی ہیں۔

مذکورہ بالا صورت ایسی ہے کہ ایک ہی ممتحن مختلف مرکزوں کی کاپیاں دیکھ رہا ہے لیکن ایک امتحان میں طلبار کے تعداد کی مناسبت سے امتحان لینے والوں کی تعداد بھی بڑھتی جاتی ہے، اس کا اثر اِن صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے۔

(۱) مختلف ممتحن نمبر دیتے وقت جواب کے مختلف حصوں کی مختلف اہمیت قرار دیتے ہیں (مثلاً کوئی ممتحن صرف نفس جواب پر نمبر دیتا ہے، کوئی ترتیب پر زیادہ زور دیتا ہے کہیں طرز ادا اور خط کو اہمیت دی جاتی ہے)۔

(۲) اگر اتفاق سے مختلف ممتحن نمبر دینے میں اُن ضروری اجزار پر متفق بھی ہوجائیں جن پر نمبروں کا فیصلہ ہونا چاہیئے تو بھی وہ ان اجزار کی حیثیت میں اختلاف کرسکتے ہیں کہ کونسا جزو باعتبار اہمیت پہلے آنا چاہیئے اور کونسا بعد میں

(۳) جانچنے میں مختلف ممتحن مختلف طریقوں پر نمبر دیتے ہیں۔

(۴) مختلف ممتحن اپنا معیار علیحدہ قایم کرتے ہیں، کچھ لوگ زیادہ نمبر دینے کے عادی ہوتے ہیں اور اکثر ممتحن بڑی سختی سے نمبر دیتے ہیں مثلاً ایک شخص اپنے بہترین طالب علم کو ۱۰۰ میں صرف ۳۰ دیتا ہے اور دوسرا اپنی فہرست میں اوّل آنیوالے کو ۹۳ دیتا ہے جب سب کاپیاں جمع ہو جاتی ہیں تو ۳۰ والا صرف ممتحن کی سختی کی بدولت ناانصافی کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے۔

(۵) جانچنے والوں کی صلاحیتوں میں جو فرق ہوتا ہے وہ بھی اکثر بہت اہم ہو جاتا ہے۔

ان میں تیسری صورت بیحد اہم ہے یعنی نمبر دینے میں ممتحن کونسا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ اکثر جانچنے والے صرف پہلی سطر یا پہلے صفحہ پر اکتفا کرتے ہیں اور اُس کا اثر اچھا یا بُرا جیسا بھی اُن پر ہو اُسی کے مطابق نمبروں کا فیصلہ کرتے ہیں، امتحان لینے والوں کی دوسری جماعت جوابات کو ابتدا سے انتہا تک پڑھتی ہے اور پھر فیصلہ کرتی ہے، ان دونوں مختلف اصولوں سے نتیجہ میں اختلاف ہو جاتا ہے۔

ان سب کے بعد نتیجہ مرتب کرنے کی منزل ہے، پہلا درجہ پرچہ بنانے کا تھا اس کے بعد امتحان ہوا، لڑکوں نے جواب دیا، کاپیاں جانچی گئیں اور کوشش کی گئی کہ نتائج میں زیادہ اختلاف نہ ہو ہر طالب علم کو نمبر دیدئے گئے۔ لیکن ان سب کے بعد بھی بہت سے اہم پہلو باقی رہ گئے، یعنی کسی خاص طالب علم کے متعلق فیصلہ کرنے میں صرف تحریری جواب کا لحاظ رکھنا چاہیئے یا کچھ خارجی چیزوں کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ پاس اور فیل اور قابلیتوں کے مختلف درجے قائم کرنے میں خاص نمبروں کی تعداد کی قید ہونا چاہیئے یا اس قسم کے درجوں میں کچھ گنجایش رکھنی چاہیئے۔

بعض امتحانوں میں (مثلاً Society Exams) میں صرف واقعی عمل کو جو طالب علم امتحان میں ظاہر کرے پیش نظر رکھ کر فیصلہ کیا جاتا ہے اور خارجی چیزوں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے اکثر یونیورسٹی کے امتحانات میں اور اکثر ممالک میں تو مدارس میں بھی کچھ رعایت ملحوظ رکھی جاتی ہے، بعض اوقات اُستادوں کی سفارش بھی پیش نظر ہوتی ہے اور کہیں کہیں اسکول میں طالب علم کی حالت معلوم کر کے فیصلہ ہوتا ہے۔

اسکول کی رپورٹ اور اُستاد کی سفارش ایسے موقعوں پر کام میں آ سکتی ہے جہاں امتحان کا نتیجہ دونوں پہلوؤں کی طرف جھکتا ہوا ہو، مثلاً ایک طالب علم پاس اور فیل کے مابین ہو تو اسکول کی رپورٹ کام میں لائی جا سکتی ہے (یعنی اگر ۵۰ میں ۱۷ پانے والا پاس شمار ہوتا ہے اور ایک شخص ۱۶ نمبر پاتا ہے تو اس کا فیصلہ کرنے

سے قبل اسکول کی رپورٹ طلب کرنا ضروری ہے اور اس کے روزانہ کام کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہئے۔

اسی طرح درجوں کے قایم کرنے میں دقت پیش آتی ہے۔ ۱۰۰ میں ۶۰ پانے والا I Div. پاتا ہے اور ۵۹ والے کو II Div. میں شمار کرتے ہیں ظاہر ہے کہ ایک نمبر کی کمی و بیشی سے صلاحیت میں اتنا فرق نہیں ظاہر ہوتا جتنا ممتحن کا فیصلہ اور نمبر دینے کا موجودہ طریقہ کر دیتا ہے۔

اِصلاح کی صورت

ابتدائی بحث سے یہ تو ظاہر ہو گیا تھا کہ امتحانوں کو قطعاً مسترد کر دینا نہ تو ممکن ہے اور نہ مفید اور اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی اب پایہ ثبوت کو پہونچ گئی کہ ان کے نتائج پر زیادہ اعتماد اور بھروسہ کرنا جائز نہیں لہذا ان امتحانوں کی اصلاح کی ضرورت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اس سلسلہ میں سب سے اہم اور ضروری چیز یہ ہے کہ ہر امتحان اور ہر قسم کے امتحان کی غایت اور مقصود کو بہت سلجھا کر پیش کیا جائے، اس سے امتحان کے طریقے اختیار کرنے میں آسانی ہو گی، اس مقصد کو متعین کرنے میں سماجی اور نفسیاتی ضروریات کو مدنظر رکھنا چاہیئے اگرچہ مزید اور اعلیٰ تعلیم کا بھی خیال رکھا جاتا ہے لیکن یہ امر فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ اسکول سے نکلنے والے طالب علموں میں سے بہت بڑا حصہ دنیا کے دیگر کاموں میں مصروف ہو گا لہذا سوسائٹی کو ان طلبار کی ترتیب میں دخل دینے کا حق ہونا چاہیئے، امتحانات کا آج کوئی مقصد نہیں واقعات کو اب اس طرح چھوڑنا عقلمندی کا تقاضا نہیں، کامیاب ہونے والے طلبار کے متعلق یہ فیصلہ کرنا ممکن ہو کہ کس کام کے لئے تیار کئے گئے ہیں اور ناکام رہنے والے طالب علموں کو اس طرح نہیں چھوڑ دینا چاہیئے جیسا آج چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اس ناکامیابی سے یہ تو ضرور ظاہر ہو جاتا ہے کہ ان میں چند خصوصیات کی کمی ہے لیکن اس کے علاوہ بھی انکی صلاحیتیں اور قوتیں ہوتی ہیں جو اس خاص امتحان میں بروئے کار آنے کا موقع نہیں پا سکیں۔ ان صلاحیتوں کو بھی بیدار ہونے کا موقع ملنا چاہیئے تاکہ آخرالامر وہ طالب علم بھی اپنی انفرادی حیثیت میں مکمل ہو کر سوسائٹی کے نظام میں اپنی جگہ پا سکے۔

یہ عیب آج ہمارے امتحانوں میں بڑی شدت سے موجود ہے، ابتدائی تعلیم کے بعد اسکول کی تعلیم

ہر ثانوی تعلیم اور ثانوی تعلیم کے بعد اعلیٰ تعلیم ہی بظاہر ہر امتحان کا مقصد سمجھ لیا گیا ہے لیکن یہ تلخ حقیقت ہے کہ بہت سے بچے ابتدائی تعلیم سے گزر کر ثانوی تک پہونچنے میں بھی کامیاب نہیں ہوتے اور اعلیٰ تعلیم تک پہونچتے پہونچتے تو یہ تعداد بیحد کم ہو جاتی ہے، لہذا ابتدائی تعلیمی مرحلوں کے امتحان کا مقصد ثانوی تعلیم کو پیش نظر رکھکر نہیں متعین کرنا چاہیئے (کیونکہ بڑی تعداد اس منزل تک نہ پہونچنے کی ضرورت رکھتی ہے اور نہ ممکن ہے) بلکہ زندگی اور سوسائٹی کی اصل ضرورتوں کو مدنظر رکھنا چاہیئے۔

امتحان کے اقسام اور مقاصد کا تعین کرنے کے بعد امتحان کے طریقوں پر غور کرنا چاہیئے، امتحان کی ہر قسم میں کچھ نہ کچھ عیب ہے، بعض امتحانات زبانی ہوتے ہیں، بعض صرف تحریری اور بعض تحریری اور زبانی دونوں، یہ سب نامکمل ہیں، لیکن ہر ایک میں کچھ نہ کچھ مفید پہلو ضرور موجود ہے، مثلاً زبانی امتحان میں طالب علم متکلم کی شخصیت اور وقت کی مناسبت سے متاثر ہوتا ہے، تحریری امتحان میں یہ عیب نہیں لیکن تھوڑے سے عرصہ میں جو اُسے تحریر کرنے کو ملتا ہے وہ اپنی شخصیت کا مکمل اظہار نہیں کرسکتا، لہذا تحریری اور زبانی دونوں طریقوں کو عمل میں لایا جاتا ہے کبھی یہ طریقہ بھی کامیاب ثابت نہیں ہوتا۔

طالب علم کی کامیابی میں بڑا حصہ اُس کی جسمانی، دماغی، نفسیاتی، جذباتی اور مزاجی کیفیتوں کا ہوتا ہے۔ کامیاب ممتحن جب ہی ہے جب وہ ان تمام جزئیات کی اہمیت کو پیش نظر رکھے۔

نتائج میں جو اختلافات پیش آتے ہیں ان کے دور کرنے کے لئے امتحان لینے والوں کو خود امتحان لینے کی مشق کرنا چاہیئے اور Training Colleges میں صیغہ امتحان کے متعلق علیحدہ شعبہ ہونا چاہیئے جہاں استاد امتحان لینا سیکھ سکے۔

اسکولوں میں Career Master مقرر کرنا بھی مفید ہوگا جن کے لئے ضروری ہے کہ نفسیات انسانی سے بخوبی آشنا ہوں، ایسے Career Master نہ صرف طالب علموں کو اپنے لئے معقول جگہ تلاش کرنے میں مدد دیں گے بلکہ اُستادوں کو بھی اپنے کام کے انجام دینے میں ان کی اعانت سے سہولت اور آسانی ہو جائیگی۔

امتحانوں کو غیر ضروری طور پر پس پردہ رکھا جاتا ہے، اس سے کسی فائدہ کی امید نہیں، نہ صرف

پاس ہونے والوں کی فہرست بلکہ جہاں تک ممکن ہو پورے نتیجے مع اُن اصولوں کے جن پر وہ مرتب کئے گئے ہیں، عوام کے سامنے پیش کرنا ضروری ہیں تاکہ وہ ان کو پرکھ کر کھرا کھوٹا بتا سکیں۔

سب سے زیادہ ضروری یہ ہے امتحانوں کے متعلق جو تحقیقات ہو رہی ہے اس سلسلہ کو برابر جاری رکھا جائے، اب بھی بعض اُستاد اور اکثر والدین ان تمام باتوں سے بیخبر امتحان کے نتائج سے مطمئن ہیں اور غیر ذمہ دارانہ طور پر اپنے شاگردوں اور بچوں کو امتحان کی اس قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا رہے ہیں ان کا یہ عقیدہ خود ان کے لئے مضر ہے ضرورت ہے کہ وہ بھی امتحانات کے موجودہ نظام کو مفلوج اور بیکار سمجھ کر غور و خوض کریں۔ اور ایک واقعی کامیاب نظام امتحان مرتب ہو سکے۔

یہاں ہم اپنی مختصر بحث کو ختم کر سکتے ہیں امتحانوں کا موجودہ نظام ایک بار ہے اور اُستاد اور طالبعلم دونوں کو مبتلا کر دینے والا جال، لیکن معقول اصلاح کے بعد یہی امتحان تعلیم کا ایک اہم جزو بن کر سماجی ضروریات کے مطابق نتائج بتا سکیگا اور جو خطرات آج محض اتفاق اور حادثہ کے وجود سے امتحانوں میں پائے جاتے ہیں ان سے آزاد کرا سکے گا۔

تذکرہ جات اعظم کے ہندوستانی گو شعراء

(جناب نصیر الدین صاحب ہاشمی)

نواب غلام محمد غوث خاں متوفی ۱۲۷۰ھ ارکاٹ کے آخری وظیفہ یاب رئیس تھے، باپ کا سایہ بچپن ہی میں اُٹھ گیا، جوان ہوئے تو امارت کی بے فکریوں میں گھر گئے، شوق و ذوق نے مختلف رنگ اختیار کئے، کبھی پکانے کے فن پر توجہ کی، کبھی رنگ ریزی سے دلچسپی لی، کبھی شعر و شاعری کا ذوق رہا۔ اعظم تخلص تھا، زیادہ تر فارسی میں اور کبھی کبھی "ہندوستانی" میں طبع آزمائی کرتے خاص اہتمام سے مشاعرے ہوتے، ان میں نہ صرف کلام سنایا جاتا بلکہ اعتراضات کرنے کی بھی اجازت تھی، اس زمانہ میں دربار اعظم میں فارسی کے اچھے اچھے نامور شاعر جمع تھے،

دربار اعظم کے فارسی شعراء وغیرہ کے متعلق مولانا محوی لکھنوی ایک دلچسپ اور طویل مضمون رسالہ اُردو میں شایع کر چکے ہیں۔

بہرحال اس زمانہ میں مدراس میں شاعری خصوصاً فارسی شاعری کا بول بالا تھا اعظم نے فارسی شعراء کے حالات میں دو تذکرے بھی لکھے ہیں جو "صبح وطن اعظم" اور "گلزار اعظم" کے نام سے موسوم ہیں، ان میں کم و بیش دو ڈھائی سو شعراء کے حالات جمع کئے ہیں اور ان کے کلام کا نمونہ پیش کیا ہے۔

اگرچہ یہ دونوں کتابیں طبع ہو چکی ہیں مگر اب کم یاب بلکہ نایاب ہیں، اعظم نے شعراء کے حالات میں جن جن شعراء کو "ہندوستانی" شاعری سے دلچسپی تھی اسکی بھی بعض جگہ صراحت کر دی ہے، مگر افسوس ہے کہ ان کے اُردو کلام کا نمونہ شامل نہیں کیا۔ ممکن ہے کہ مدراس میں بعض اصحاب کے کلیات یا دیوان وغیرہ مل جائیں۔

یہاں ہم ان شعراء کے حالات کا اقتباس پیش کرتے ہیں جو تذکرہ جات اعظم کی رو سے "ہندوستانی" میں بھی مشق سخن کرتے تھے، مگر تفصیل میں ابجدی[1]، والہ[2]، آگاہ[3]، نامی[4] اور واصف[5] وغیرہ کو نظر انداز کر دیا ہے کیونکہ ہم ان کے متعلق علیحدہ مضامین لکھ چکے ہیں۔

دوسرے شعراء حسب ذیل ہیں

معجز | غلام محی الدین نام اور معجز تخلص تھا، بمقام ارکاٹ ۱۱۷۳ھ میں ولادت ہوئی اور ۱۲۲۹ھ میں

مدراس میں انتقال ہوا۔ عجز کو باقر آگاہ سے تلمذ تھا،

اولاً شہامت جنگ المتخلص بہ محفوظ کے مصاحب تھے، پھر والاجاہ محمد علی خاں کے تیسرے فرزند عظیم الدولہ کی تعلیم و تربیت کے لئے مامور کئے گئے، عظیم الدولہ نے اپنی مسند نشینی کے بعد عجز کے نام معاش جاری فرمائی۔ عجز ہمیشہ درس و تدریس میں مشغول رہے، گوشہ نشینی زیادہ مرغوب تھی، شاعری سے بڑی دلچسپی تھی، سخن فہم اور سخن سنج تھے، فارسی، اور اردو میں طبع آزمائی کیا کرتے، کئی کتابوں کے مصنف ہیں، کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے،[2]

بے خبر عشق بتاں سے تھا میرا دل افسوس — اس بچارہ پہ عبث فتنہ مچائیں آنکھیں

یار کے عشق نے جب سے مجھے سرشار کیا — چشم انگور کو حسرت ستے خوں بار کیا

ہمیں کعبہ و دیر سے کچھ نہیں کام — کہ ہر جا ترا جلوہ ہم دیکھتے ہیں،

کیا تری چشم کا پیمانہ ہے — حسن جس لہر کا مستانہ ہے،

مدت گزر گئی نہ سنی یار کی خبر — اس شوخ دلربا بتِ غمخوار کی خبر

عجز خیال ہستی موہوم کو وداع — درپیش ہے سفر تجھے دار البقا طرف

ایک دم جلنے پہ مت لاف کرائے پروانہ — شمع کو دیکھ کہ تا صبح جل جاتی ہے،[3]

گر شوق ہے بقا کا دلمیں ترے اے فانی — ہستی کا حرف لوح خاطر ستے مٹالے

نہ ہو کیونکر دلِ بےتاب تیرے ناز کے صدقے — جہاں کے جزو و کل ہیں سب تیری انداز کے صدقے

افصح حسین علی خان المتخلص بہ افصح، محمود علی خان خطاب تھا، ۱۲۱۰ھ میں عمدۃ الامرا فرزند والاجاہ کے دربار میں بار یاب ہوئے، قصیدہ گذرانا۔ اور افصح الشعراء سے ملقب کئے گئے۔

---

[1] عجز کے حالات تذکرہ جات اعظم کے سوا، تذکرہ شعرائے دکن (ملکاپوری) اور "تاریخ النواسط" میں بھی مذکور ہیں۔ [2] عجز کا کلام بیاض کتب خانہ عہدی شرف الدولہ سے لیا گیا ہے۔ [3] اس موقعہ پر جہانگیر کا ایک شعر یادگار ہے۔ شعر

پروانہ من نیم کہ بیک شعلہ جان دہم — شمعم کہ شب بسوزم و دم بر نیاورم (رلیث)

اعظم کے مشاعرہ میں شریک رہا کرتے، گلدستہ کرناٹک کا خلاصہ مرتب کیا، عمدۃ الامرا کی مدح میں جو قصیدہ پیش کیا تھا اس کا مطلع حسب ذیل تھا۔

ہر ذرۂ بے قدر کو خورشید بنایا — یہ کام تو تیرا ہی ہے ممتاز[۱] زمانہ

تجمل | حکیم عظیم الدین المتخلص بہ تجمل، اگرچہ لکھنؤ کے متوطن تھے مگر ۱۲۱۲ھ میں مدراس آئے اور یہیں کے ہو رہے، مدراس میں اپنی تعلیم کی تکمیل ملک العلما، مولانا عبد العلی بحر العلوم سے کی، مثنوی، غزل، اور مرثیہ لکھا کرتے، مثنوی وغیرہ میں تجمل اور مرثیوں میں غمگین تخلص قرار دیا تھا۔ ۱۲۲۰ھ میں انتقال ہوا، مدراس میں مدفون ہیں۔

ناظر | غلام عبد القادر نام، ناظر تخلص، اور قادر عظیم خاں خطاب تھا۔ معجز کے فرزند ہیں، ۱۲۰۰ھ میں ولادت اور ۱۲۴۳ھ میں بمقام مدراس انتقال ہوا۔ مولانا باقر آگاہ، مولوی محمد غوث شرف الملک، مولانا علاء الدین احمد سے علم کا اکتساب کیا، شاعری میں باپ سے تلمذ تھا۔

ریاست ارکاٹ میں خدمت میر سامانی، اور مہتممی کتب خانہ پر مامور تھے، آخری زمانہ میں وقائع نگاری کی خدمت بھی ملی تھی، فارسی اور اردو میں طبع آزمائی کیا کرتے، کئی کتابوں کے مصنف ہیں، ان میں سے بہار اعظم، خلدستان، شرح سکندر نامہ، گلستان نسب زیادہ مشہور ہیں،

خادم | غلام مرتضیٰ خاں نام خادم تخلص اور عظیم جنگ ممتاز الملک خطاب تھا، ثابت جنگ والا اور محمد علی خاں والا جاہ دادا تھے، فارسی اور اردو میں طبع آزمائی کیا کرتے، زیادہ تر اردو شاعری سے دلچسپی تھی۔

شایق | غلام محی الدین نام اور شایق تخلص، باقر آگاہ اور شرف الملک سے اکتساب علم کا شرف تھا۔ شاعری میں اظفری سے تلمذ حاصل تھا۔ فارسی کے ساتھ اردو میں بھی شعر گوئی کا ملکہ حاصل تھا۔ "رشک بہشت" نام ایک مثنوی کے علاوہ دیوان بھی مرتب کیا تھا۔ ۱۲۴۹ھ میں انتقال ہوا۔

---

[۱] ممتاز، عمدۃ الامرا کا تخلص تھا۔

احقر | سید نظام الدین المتخلص بہ احقر ۱۲۰۰ھ میں مدراس میں ولادت ہوئی، آگاہ، معجز، نامی، اظفری سے تلمذ حاصل تھا۔ فارسی اور اُردو دونوں دیوان مرتب کئے تھے۔

بے ہوش | حکیم محمد قادر علی خان نام اور بیہوش تخلص تھا۔ بمقام مدراس ۱۲۲۶ھ میں ولادت اور ۱۲۶۰ء میں انتقال ہوا۔ قاضی ارتضا علی خاں سے تحصیل علم کیا تھا۔ علمی قابلیت بہت اچھی تھی، شاعری میں کسی سے تلمذ نہیں تھا۔ فارسی اور اُردو دونوں دیوان مرتب کئے تھے۔

فاروق | خان عالم خان المتخلص بہ فاروق، ۱۲۰۷ھ میں ولادت ہوئی، اظفری اور نامی سے تلمذ حاصل تھا۔ شاعری کے ساتھ موسیقی میں بھی مہارت تامہ حاصل تھی، مشاعرہ اعظم میں شریک ہوا کرتے،

کامل | غلام کبریا نام اور کامل تخلص، ۱۲۱۱ھ میں بنگال سے مدراس آئے اور یہاں اقامت کر لی عربی، فارسی اور اُردو میں شعر کہا کرتے، طوطی بنگال کے لقب سے مشہور تھے۔

احمدی | غلام احمد نام اور احمدی تخلص، اسد الدین خاں باپ تھے، ۱۲۱۵ھ میں ولادت ہوئی، مولوی واقف اور میر قطب حسن سے تعلیم پائی، قوت جنگ کی وکالت پر مامور تھے، ۱۲۶۲ھ میں بزم مشاعرہ اعظم میں شریک ہوئے، فارسی، اُردو میں شعر کہا کرتے، دونوں زبانوں کے دیوان مرتب کئے تھے، "بحر غم" کا ترجمہ غم نامہ کے نام سے کیا تھا۔

منتظر | سید شاہ فتاح احمد، المتخلص بہ منتظر۔ بمقام مدراس ۱۲۴۱ھ میں ولادت اور ۱۲۶۸ھ میں انتقال ہوا۔ میر مجروح سے تلمذ حاصل کیا تھا۔ مشاعرہ اعظم میں شریک رہا کرتے، فارسی اور اُردو دونوں میں طبع آزمائی کرتے تھے۔

حشمت | انور حسین نام، نور الدین محمد خان حشمت جنگ خطاب اور حشمت تخلص تھا۔ محمد علی خان والاجاہ کے پوتے تھے، بمقام مدراس ۱۲۰۴ھ میں ولادت اور ۱۲۶۹ھ میں انتقال ہوا۔ نامی سے شرف تلمذ حاصل تھا، فارسی اور اُردو میں شعر کہا کرتے،

مختار | باقر حسین المتخلص بہ مختار بمقام سرنگ پٹن ۱۲۱۰ھ میں ولادت ہوئی، پانچ سال کی عمر میں مدراس آئے اور یہاں [illegible]، دربار ارکاٹ سے حسن علی خان بہادر کا خطاب ملا، مشاعرہ اعظم میں شریک

ہوا کرتے، شاگرد اور تجمل سے تلمذ حاصل تھا۔ تجمل کی صحبت کے اثر سے مختار نے بھی مرثیہ گوئی میں نام پیدا کیا تھا۔ ان کے مرثیے شمالی ہند میں بھی مشہور تھے۔

افسر | رضا حسین نام اور افسر تخلص سنہ ۱۲۱۹ھ میں ویلور میں ولادت ہوئی عالم شباب میں مدراس آئے اور قاضی ارتضا علی خاں سے تلمذ حاصل کیا۔ مشاعرہ اعظم میں رسائی پیدا کی، فارسی اور اردو کے دیوانوں کے علاوہ دو ایک کتابیں تصنیف کیں ہیں،

باقی | غلام حسین باقی تخلص، بمقام مدراس سنہ ۱۲۲۴ھ میں ولادت ہوئی، شاعری میں زین العابدین قائم سے تلمذ حاصل تھا۔ اردو میں ایک مثنوی بھی لکھی تھی۔

کمال | سید کمال الدین المتخلص بہ کمال سانوری، فارسی اور اردو شاعری میں اچھی مہارت حاصل تھی۔

فدا | غلام حسین فدا، زیادہ تر اردو میں مشق سخن کرتا تھا، آخری زمانہ عمر میں حیدر آباد چلا گیا تھا۔

واقف | شاہ میران محی الدین قادری المتخلص بہ واقف بمقام اودگیر سنہ ۱۲۰۵ھ میں ولادت ہوئی، فایق سے تلمذ تھا مدراس آکر اعظم کے مشاعرہ میں شرکت کی مدرسہ اعظم کی فارسی مدرسی کی خدمت پر مامور تھے۔

جب تلک شیخ میرا حضرت منصور نہ تھا   سر مخفی سے انا الحق کے نہ تھا میں واقف

مندرجہ صدر شعرا صرف ایک صدی سے تعلق رکھتے ہیں اور پھر یہ بھی ایسے شعرا ہیں جو فارسی کے ساتھ اردو میں طبع آزمائی کرتے تھے، ایسے شعرا جو صرف اردو میں شعر کہا کرتے ان کا ذکر ان تذکروں میں نہیں ہوا ہے۔ اس سے واضح ہو سکتا ہے کہ مدراس میں بھی اردو شعر و سخن کی کافی قدر تھی، اس لئے مدراس میں اردو کے ارتقا کی بحث بھی بڑی دلچسپ ہو سکتی ہے۔[1]

---

[1] "مدراس میں ہندوستانی" کی ترتیب ہمارے پیش نظر ہے۔ اس کے متعلق بہت کچھ ذخیرہ فراہم ہو چکا ہے۔

واسطہ

(ماسٹر باسط بسوانی)

دردِ دل کا ہاں مرے دردِ جگر کا واسطہ
اک نظر پھر دیکھ لے ۔ اپنی نظر کا واسطہ

کر عطا تاثیر۔ آہ بے اثر کا واسطہ
اے مرے فریاد رس۔ پچھلے پہر کا واسطہ

آستانے پر جبیں سائی کا مجکو اذن دے
تجکو اے بیدرد اپنے سنگِ در کا واسطہ

پردے پردے میں دکھا دے زلف و عارض کی جھلک
روز و شب کا واسطہ۔ شام و سحر کا واسطہ

قلب کے ظلمت کدہ کو نور سے معمور کر
تجکو انجم کی قسم شمس و قمر کا واسطہ

عشق کی مجبوریوں، معذوریوں پر کر نظر
حسن محشر خیز و چشمِ فتنہ گر کا واسطہ

آستانے پر پڑا رہنے دے جیتے جی مجھے
تجکو کوچہ کی قسم اس رہگذر کا واسطہ

پردۂ شب میں تڑپکر داستانِ درد سُن
نالۂ شبگیر کا۔ آہِ سحر کا واسطہ

نور بن، میرے لئے خورشید بن، مہتاب بن
ظلمتِ شب کی قسم۔ نورِ سحر کا واسطہ

بھر دے دامانِ تہی کو گوہرِ مقصود سے
خالقِ کونین۔ تجکو بحر و بر کا واسطہ

امتیاز نیک و بد کیا تو جو آئے فضل پر
بے خبر کی بھی خبر لے، باخبر کا واسطہ

کر طریقِ عشق میں منزل بہ منزل رہبری
دربدر مجکو نہ بھٹکا۔ اپنے در کا واسطہ

پردۂ دل میں سما جا لیلیٰ محمل نشیں
تجکو اپنے باسطِ شوریدہ سر کا واسطہ

بمبئی یونیورسٹی لائبریری کی چند نادر مخطوطات اور انکی فہرست

(شیخ حاجی عبدالحق صاحب متعلم مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

الحمد للہ رب العلمین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ الکریم صلی اللہ علیہ وسلم وآلہ واصحابہ اجمعین

گذشتہ سال (۱۹۳۷ء) مجھے مدینہ منورہ میں شیخ الاسلام کے کتب خانہ میں چند نادر قلمی نسخوں کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ افسوس ہے کہ ان نسخوں کی اطلاع ہم لوگوں کو صرف اسی وجہ سے نہیں ہے کہ وہاں کی کوئی فہرست ابتک شایع نہیں ہوئی - اسی طرح ہندوستان کے بعض کتب خانوں کے نادر مخطوطات بھی ہماری نظروں سے پنہاں ہیں۔

اس زمانہ میں کتب خانوں کی فہرستوں کی اشاعت بہت ضروری ہے، کتنی ہی کتابیں ایسی موجود ہیں جنھیں دنیائے علم میں معدوم سمجھا جاتا ہے۔ درآں حالیکہ وہ اچھی حالت میں موجود ہیں۔

فہرست نگاری بذات خود ایک فن ہے جس کا بانی ابن الندیم[1] ہے۔ افسوس ہوتا ہے کہ اس فن سے مسلمانوں نے بے توجہی برتی، اور آج کوئی بڑی فہرست ایسی موجود نہیں ہے جس کو ہم الفہرست کے مقابلے میں رکھ سکیں۔ اس فن کو مستشرقین نے پھر اپنی طرز پر زندہ کیا ہے۔ ڈاکٹر اتیھے، ریو، براؤن وغیرہ کی توضیحی فہرستیں دیکھکر رشک ہوتا ہے۔ کاش ہندوستان کے علمی مرکز اپنے ہاں کے قابل پروفیسروں سے اپنے کتب خانوں کی توضیحی فہرستیں لکھوا کر محققین علوم وفنون کے لئے سہولتیں پیدا کریں۔

فہرستیں ۲ دو قسم کی ہوتی ہیں۔

(۱) وہ فہرستیں جن میں صرف کتابوں کے نام درج ہوتے ہیں۔

(۲) وہ فہرستیں جن میں کتابوں کے نام کے ساتھ ایک محققانہ ریویو بھی ہوتا ہے ثانی الذکر فہرستیں توضیحی کہلاتی ہیں، اسکی

---

[1] ۔ اسکی کتاب الفہرست میں ۳۷۷ھ تک تمام علوم وفنون کی کتابوں کا ذکر ہے

ترتیب کے لئے تبحرِ علمی کی بہت ضرورت ہوتی ہے۔ ہر معمولی شخص کا یہ کام نہیں ہوتا۔

چونکہ مشرق میں کسی مشرقی عالم کی توضیحی فہرست آسانی سے دستیاب نہیں ہوسکتی اس لئے ہماری بہت سی تحقیقات مستشرقین کی تحقیقات اور توضیحی فہرستوں کے مضامین پر منحصر ہوتی ہیں، اور وہ غلطیاں جو ان "سمندر پار رہنے والوں سے دوران تحقیقات میں سرزد ہوجایا کرتی ہیں۔ انھیں پر ہم اپنی عمارتیں تعمیر کرتے ہیں۔

میرے والد بزرگوار پروفیسر الحاج شیخ عبدالقادر صاحب (ایم، اے، آئی، ای، ایس) نے سنہ ۱۹۱۷ء میں قلمی نسخوں کی فراہمی اور تحفظ کے لئے ایک عرضداشت گورنمنٹ میں دی تھی، جو منظور کرلی گئی۔ اور حضرت قبلہ نے مختلف مقامات سے مختلف علوم و فنون کے ۱۱۴ مخطوطات جمع کرلئے، گورنمنٹ بمبئی کی درخواست پر اب انھوں نے ایک توضیحی فہرست تیار کی ہے[۱] جس میں یونیورسٹی کے مخطوطات بھی ہیں جن کی مجموعی تعداد ۲۴۳ ہے۔ اس فہرست کی متعلق ایک مضمون مولوی سید نواب علی صاحب کا معارف میں بھی نکلا تھا، اس میں لکھتے ہیں۔

"ڈاکٹر اتھے، ریو اور براؤن کی مشہور توضیحی فہرستیں دیکھنے کے بعد عام طور سے یہ خیال پیدا ہوگیا ہے کہ فاضلانہ رنگ میں مستشرقین ہی فہرست نگاری کا حق ادا کرسکتے ہیں، لیکن شیخ صاحب جنھوں نے چراغ و بوریا والی قدیم مکتبی تعلیم کے ساتھ بمبئی یونیورسٹی کی صرف ایم، اے کی ڈگری حاصل کی ہے اور جو ہندوستان سے باہر جانا کیا معنی مدراس و لاہور بھی نہیں گئے ہیں۔ ایسی وسعت معلومات تحقیق اور دقت نظر سے فہرست مرتب کرتے ہیں کہ ہم ایسی پرانی لکیر کے فقیروں کو بھی حیرت ہوتی اگر لسان الغیب کا یہ شعر یاد نہ آتا۔

فیضِ روح القدس ار باز مدد فرمائد دیگراں ہم بکنند آنچہ مسیحا میکرد

آج علمائے یورپ کی تحقیقات کو کون غلط ثابت کرے، . . . . . لیکن یہ شیخ صاحب کے آہنی قلم کی جنبش ہے جس نے اس طلسم کو توڑا اور ڈاکٹر ریو، اتھے، براؤن وغیرہم کی غلطیوں کو درست کرکے تحقیق کی داد دی" (ص۲۷۴ جلدہ ۴۳ معارف) اس فہرست میں، اشجار و اثمار ص۴۲، نامۂ خیالات ص۳۳، منظر العجائب ص۶۱، قصیدہ مصنوعہ ص۱۵، ہشت بہشت ص۶۵، وغیرہ نسخوں کے ضمنی توضیحات میں (جن کا ذکر مولوی صاحب موصوف نے کیا ہے) جس کاوش

---

[۱] یہ فہرست گورنمنٹ بمبئی نے شائع کردی ہے۔

اور تحقیق سے حضرت قبلہ نے وضاحت فرمائی ہے اس کا اندازہ اہل نظر ہی کر سکتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی حیات میں برکت عطا فرمائے۔

میں چند مخطوطات کا (جو غیر مطبوعہ اور نادر ہیں) ذکر اجمالاً کرتا ہوں، تفصیل کے لئے فہرست ملاحظہ ہو:

۱- مثنوی حسن و دل جلد ۱۱ صفحہ ۱۲۵

یہ ایک فارسی غیر مطبوعہ مثنوی ہے اور محمد داؤد وآلمی کی تصنیف ہے، جو بروز یکشنبہ ۲۶ شعبان ۱۰۵۴ھ مطابق ۱۸ اکتوبر ۱۶۴۴ء اختتام کو پہونچی، اس نسخہ کے ورق ۸ ب پر آلمی صاف لکھا ہوا ہے۔

بخشائی بر آلمی بے حساب　　　بروزِ حساب گناہ و ثواب

اس مثنوی کا مضمون حسن و عشق کی صوفیانہ داستان ہے، شہزادہ دل عقل کا بیٹا ہے، عقل اقلیم بدن کی حکمران ہے، عشق کی بیٹی حسن سے دل کو محبت ہو جاتی ہے۔ شہزادی حسن ملک دیدار میں رہتی ہے، ان حجابات لفظی میں آلمی نے روح انسانی کا ارتقاء دلنشین پیرائے میں سمجھایا ہے خود ہی ایک جگہ اشارہ کرتے ہیں۔ ع

منم عشق و معشوق من ذوالجلال

اس نسخے کی تاریخ اس شعر سے نکلتی ہے:-

زہجرِ نبیؑ زکی در شمار　　　گذشتہ ہزار ہست و پنجاہ و چار

۲- مخزن شعراء جلد ۴۳ صفحہ ۱۵۰

یہ بھی ایک فارسی قلمی نسخہ ہے۔ اس میں ریختہ کے ۱۰۹ گجراتی شعراء کا تذکرہ ہے اس کے مصنف قاضی نورالدین حسین بن قاضی سید احمد حسین رضوی تیسرازی ہیں جن کا تخلص فائق تھا۔ یہ ۱۲۶۶ھ / ۱۸۵۰-۵۱ء میں لکھی گئی ہے اس میں ایک گجراتی شاعرہ کا ذکر آیا ہے۔ جس کا تخلص حجاب تھا۔

---

[1] حضرت قبلہ کا ایک مضمون رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے رسالہ ۱۹۲۶ء میں نکلا تھا جس میں بجائے آلمی کے غلطی سے الٰہی چھپ گیا تھا، اسی کو عبدالحق صاحب (سیکرٹری انجمن ترقی اردو، اورنگ آباد) نے سبرس کے دیباچہ میں صفحہ ۱۱ پر نقل کر دیا ہے۔

اسی تذکرہ[2] میں لکھا ہے کہ ولی دکنی احمد آباد میں پیدا ہوئے اور وہیں مدفون ہیں اور میر تقی میر نے غلطی سے انھیں اورنگ آبادی لکھا ہے[1]

۳۔ تحفۃ الاستار جلد ۱۴ صفحہ ۲۶

یہ رسالہ قبلہ کی شناخت کی ہدایات پر مشتمل ہے، بقراط سمرقندی ابو القاسم نے بعمر ۶۰ سال اسے کابل میں لکھا ہے۔

۴۔ کلیات صائب جلد ۴۳ صفحہ ۱۲۴

یہ کلیات صائب کے انتقال سے تین سال قبل کی لکھی ہوئی ہے۔ اسمیں خود صائب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ۵ غزلیں ہیں، صفحہ ۴۱ پر لکھا ہے۔

---

[1] ولی کے وطن اور نام میں تذکرہ نویسوں نے بہت اختلاف کیا ہے۔ بعض تذکرہ نویسوں نے ولی کو "صوبہ گجرات کے شہر سورت یا پونہ کا ساکن لکھا ہے۔ کوئی احمد آبادی کہتا ہے۔ اکثر اورنگ آباد دکن سے منسوب کرتے ہیں۔ (کلیات ولی صفحہ ۱۴) صفحہ ۱۵ کلیات ولی (مطبوعہ اورنگ آباد دکن نقش، ۱۹۲۷ء) پر جناب احسن لکھتے ہیں:—

بارہویں صدی ہجری کے تمام تذکرہ نویسوں میں جن کو ان حالات سے زیادہ قرب زمانی حاصل ہے، ولی کو دکنی اور اورنگ آبادی لکھا گیا ہے۔ ایسی صورت میں متاخرین کا بغیر کسی کافی ثبوت کے احمد آبادی یا گجراتی لکھدینا ناقابل تسلیم ہے۔ . . . . اسی طرح ایسے بعض اشعار جن میں کسی تخئیل وخصوصیت سے سحر بنگالہ یا شہر سورت اور دلی کی جمنا کا ذکر آگیا ہو، انکو پڑھکر جے، ہیں، گارسن دی ٹاسی کی طرح یہ سمجھ لینا کہ اس کا قائل سورت دہلی یا بنگال کا رہنے والا ہے۔ ایک لاطائل خیال ہے، اور بے سروپا بات ہے جن تذکرہ نویسوں نے ولی کو گجراتی یا احمد آبادی سمجھ لیا ہے وہ نہ صرف انکے قیام احمد آباد سے دھوکا کھا گئے ہیں، بلکہ انکی وفات احمد آباد نے اس وہم کو جامہ یقین پہنا دیا ہے۔ بغیر کسی تاویل و تامل کے ولی کا دکنی ہونا انکے متعدد اشعار سے ہے:

یو کھ کی شمع سوں روشن ہے ہفت اقلیم کی مجلس
ولی پروانگی کرتا تری ملک دکن بہتر

ولی ایران و توران میں ہے مشہور
اگرچہ شاعر ملک دکن ہے

[2] یہ تذکرہ اورنگ آباد سے ۱۳۴۲ھ میں شایع ہو چکا ہے

بتاریخ پنجم شهر ذی حجه الحرام سنه ثمانون وخمس بعد الف نوشته شد،

حرره العبد محمد ربیع ابن حاجی برخوردار اصفهانی

۵- دیوان ظہوری جلد ۵۰ صفحہ ۱۷۰

یہ دربار بیجاپور کے مشہور و معروف شاعر ظہوری کی غزلیات و رباعیات کا مجموعہ ہے۔ اس میں چند غزلیں خود ظہوری کے دست خاص کی موجود ہیں۔ ظہوری نے خود اس دیوان کو دیکھا ہے چنانچہ سرِ ورق پر لکھا ہے:-

"دیوان افضل الشعرا حضرت مولانا ظہوری علیہ الرحمہ و المغفرہ جابجا خط شریف الیشان ست واز اول تا آخر بنظر مبارک فیض اثر ایشان گذشتہ" اس دیوان کی ابتدا اس شعر سے ہے:-

بے امن و اماں ساختہ خوف و خطرم را
مستی شدہ خوش محتسبی شور و شرم را

اس رباعی سے رباعیات شروع ہوتی ہیں، ع اے از تو ہمہ نہاں و پیدا پیدا

اگرچہ اس نسخے پر تاریخ درج نہیں ہے لیکن یہ ۱۱ صدی ہجری کا معلوم ہوتا ہے۔

۶- اشجار و اثمار، جلد ۱۷، صفحہ ۴۲

مولوی سید نواب علی صاحب نے معارف[1] میں لکھا ہے:-

یہ ایک نایاب نسخہ ہے، جو اب تک کہیں شائع نہیں ہوا، اس کا مصنف علی شاہ محمد بن قاسم الخوارزمی ہے، براؤن نے کتاب کے ایک مصرعہ "شش و ہفتاد و صد و بعد ہزار" سے سنہ تالیف ۱۱۷۶ھ قیاس کیا، اسی سنہ کو نکلسن نے براؤن کے مخطوطات کی فہرست کیمبرج سے ۱۹۳۲ء میں شایع کرتے وقت درج کیا ہے، لیکن شیخ صاحب نے جب نسخہ کو غور سے پڑھکر مصنف کے حالات زندگی جو جستہ جستہ تحریر تھے جمع کئے، پھر واقعات کو تاریخ کی روشنی میں دیکھا، تو معلوم ہوا کہ ۶۸۶ھ میں یہ کتاب تصنیف ہوئی کیونکہ اسوقت بخارا کے قتل عام کو جو ۶۷۱ھ میں آباقا خان کے حکم سے عمل میں آیا پندرہ سال گذر رہے تھے، جیسا کہ مصنف

---

[1] دیکھو جلد ۳۸ معارف اعظم گڈھ

نے بیان کیا ہے۔ شیخ صاحب لکھتے ہیں کہ اشجار و اثمار کا ذکر کشف الظنون میں موجود ہے چونکہ کشف الظنون ۱۰۶۷ھ مطابق ۱۶۵۶ء میں تالیف ہوئی، اس لئے یہی ایک شہادت براؤن کی تردید میں کافی تھی، لیکن شیخ صاحب کی برا ہین طلب طبیعت کو صرف ایک شہادت سے کیا تسکین ہوتی، انھوں نے فہرست کے چار صفحوں میں شہادتیں جمع کرکے ایسے دلچسپ انتخابات نقل کئے ہیں۔ جن سے ضمناً دوسرے واقعات پر بھی روشنی پڑتی ہے مثلاً انوری کی وہ مشہور طوفان باد والی پیشین گوئی جو غلط ثابت ہوئی، اور جو شاعر کی تحقیر و ذلت کا باعث ہوئی، اس کو مؤلف اشجار و اثمار نے قرانات کے حساب سے چنگیز خان کی ولادت کا سال قرار دیکر "طوفانِ خون" سے تعبیر کیا ہے اس کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ احمد شاہ جو وزیر تھا، اس کے دو بیٹوں سیف الدین احمد شاہ اور بدرالدین مبارک شاہ کو جب نجوم سیکھنے کا شوق ہوا تو مصنف سے درخواست کی گئی کہ اس فن پر کوئی کتاب تصنیف کرے، چنانچہ یہ کتاب تصنیف ہوئی۔

۷۔ المشرع الروی، جلد ۴، ۵۴، ص ۱۲۸

یہ حضرت علیؓ کے خاندان والوں کا مختصر تذکرہ ہے، بالخصوص وہ لوگ جو حضرموت میں آکر بسے تھے اس کا مصنف جمال الدین ابو علوی محمد بن ابی بکر بن احمد بن ابی بکر بن عبد اللہ الشلّی الحضرمی ہے۔ جو ۱۶۲۱ء / ۱۰۳۰ھ میں علاقہ حضرموت میں پیدا ہوا اور جس کا انتقال ۱۶۸۲ء / ۱۰۹۳ھ میں ہوا

یہ کتاب کامل ہے اور خود مصنف کے قلمی نسخے کی پہلی نقل ہے، بانکی پور کے نسخے سے یہ نسخہ قدیم ہے اس میں ایک مقدمہ دو باب اور ایک خاتمہ ہے۔

۱۰ جمادی الثانی ۱۰۹۵ھ مطابق ۱۵ مئی ۱۶۸۴ء میں لکھا گیا ہے۔ اس میں سورت، بروج، احمد آباد دکن اور بیجاپور کے علویوں کا بھی ذکر ہے۔

۸۔ ہفت اقلیم، جلد ۲۶، ص ۶۷

یہ کتاب ایک جغرافیائی اور تاریخی انسائیکلوپیڈیا ہے، اس کے مصنف کا نام امین احمد رازی ہے۔ (اس کتاب کا ایک مختصر حصہ ب، انڈیکا میں کلکتہ سے شایع ہوا ہے) یہ کتاب چھ سال کے عرصہ میں لکھی گئی اور ۱۰۰۲ھ / ۱۵۹۳-۴ء میں ختم ہوئی، ایوانو بھی اس تاریخ سے متفق ہے لیکن پروفیسر براؤن لکھتے ہیں کہ یہ ۱۰۲۸ھ / ۱۶۱۹ء میں لکھی

گئی ہے، لیکن ایک داخلی شہادت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس کا لکھنا ۱۰۰۲ء میں اور بعد بھی جاری رہا ہوگا۔ کیونکہ اس میں سلطان محمد ثالث کا ذکر ہے جو ۱۰۰۳ھ/۱۵۹۵ء میں تخت نشین ہوا۔

اس میں صوفیا، علماء، اور شعراء کے حالات و اشعار ہیں، اس کا ایک کامل نسخہ انڈیا آفس میں ہے۔[۱] و [۲]

۹۔ تفسیر الکواشی، جلد ۴، ص ۱۶۱

احمد بن یوسف بن حسن بن رافع بن حسین موفق الدین ابوالعباس الموصلی الکواشی جو ایک متبحر شافعی عالم تھے ان کی تفسیر قرآن کا یہ پہلا حصہ ہے۔ کشف الظنون کی روایت کے مطابق انکا انتقال ۶۸۰ھ/۱۲۸۱-۲ء میں ہوا، آخر میں سورہ کہف کی تفسیر ہے۔

۱۰۔ شرح مختصر الطحاوی، جلد ۳۲ ص ۱۱۸

یہ نادر قلمی نسخہ کسی زمانے میں سلطان محمد عادل شاہ بیجاپور کے شاہی کتب خانے کی زینت رہا ہے۔[۳]

یہ کتاب ابونصر احمد بن منصور المظفری الاسبیجابی نے لکھی ہے جو مختصر الطحاوی کی شرح ہے اس نسخے میں تاریخ نہیں ہے لیکن حضرت قبلہ کی رائے میں یہ دسویں صدی ہجری کا معلوم ہوتا ہے۔

۱۱۔ تاریخ احمد شاہ درانی، جلد، ص ۲۷

یہ افغانی بادشاہ احمد شاہ درانی کی تاریخ ہے، منشی محمود بن ابراہیم الحسینی کی تصنیف ہے منشی محمود بن ابراہیم نادر شاہ کے درباری مورخ مرزا مہدی خاں مصنف تاریخ جہانکشائی نادری کا ہمعصر اور صحبت یافتہ تھا۔ احمد شاہ کے ابتدائی عہد سے لیکر اہل قطغانیہ و ترکمانیہ کی جنگ تک واقعات لکھے ہیں۔ یہی جنگ آخری واقعہ مرقومہ ہے۔

---

[۱] یہ نسخہ ۱۰۸۶ھ/۱۶۷۵ء میں بمقام احمد آباد نقل ہوا تھا۔

[۲] مولوی فیض اللہ صاحب انصاری ہمت جونپوری نے اس کا ایک ملخص شایع کیا ہے

[۳] اس پر شاہی مہر بھی ثبت ہے۔

۱۲۔ تاریخ الفی، جلد ۱۵ ص۱۷۲

اکبر کے حکم سے یہ تاریخ ۹۹۳ھ ۱۵۸۵ء میں ملا احمد ٹھٹوی نے لکھنی شروع کی ملا احمد ۹۹۶ھ ۱۵۸۸ء میں قتل ہوا - اور جعفر بیگ آصف خاں نے اس کو اختتام تک پہونچایا، اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت سے ۹۹۷ھ ۱۵۸۹ء تک حالات درج ہیں۔ چونکہ اس وقت ہزار سال ختم ہو رہے تھے اس لئے اس کا نام تاریخ الفی رکھا گیا۔ اس نسخہ میں عہد اکبری پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، جو بہت اہم ہے۔ یہ نسخہ ناقص ہے۔

ابتدا یہ ہے: "شدہ در مقام فرماں برداری ثابت قدم تر از اول شدند۔ محمد تومرت"

ص۱۰۰۰ پر ان الفاظ پر یہ نسخہ ختم ہوا ہے۔

میت خاں و مرتضیٰ خاں با صوفیان بیگناہ بیچارہ جنگ کردہ ایشانرا منہزم گردانیدند و یکہزار و دوبست کس از ایشاں بقتل آوردند، مجملاً دریں روز بناحق یازدہ کس از نسل .....

۱۳۔ نسخۂ عالمگیری، جلد ۵ ص۲۲

اورنگ زیب کے زمانۂ شاہزادگی کے خطوط کا مجموعہ ہے یہ خطوط منشی قابل خاں کے لکھے ہوے ہیں، جسے خود اورنگ زیب نے دیکھا اور درست کیا ہے۔

یہ نسخہ پنڈت رائے رام داس کی فرمائش سے محمد ماہ قادری نے ۱۲ رمضان چہارشنبہ کو بمقام مدک صوبہ حیدرآباد نقل کیا، سنہ کا پتہ نہیں چلتا۔

۱۴۔ ہشت بہشت، جلد ۲۵ ص۶۵

یہ ہشت بہشت کے ساتویں دفتر کا ناقص نسخہ ہے، ہشت بہشت آٹھ سلاطین عثمانی کی تاریخ ہے۔ جو حکیم الدین ادریس کی لکھی ہوئی ہے۔

کلیمنٹ ہوار نے اپنے مضمون[1] میں اس کتاب کو اسّی ہزار ابیات پر مشتمل لکھا ہے۔ اور اسے نظم سمجھا ہے

---

[1] دیکھو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام

درآنحالیکہ بیت سے صرف شعر ہی مراد نہیں ہوا کرتے بلکہ سطر بھی سمجھی جاتی ہے۔

اس کا اختتام فی ھذا البلوی دلیل بانہا الموت البرایاقایدو یزید، پر ہوا ہے۔

۱۵۔ نامہ خیالات، جلد ۲، ۱۰۱۳۳

ڈاکٹر ایتھے اور آئیونو نے اس کتاب کو غلطی سے امیر خسرو کی تصنیف سمجھ لیا ہے، اور وہ لکھتے ہیں کہ اس کا دوسرا نام انشائے امیر خسرو ہے، اس کتاب کا افتتاح اس سطر سے ہوتا ہے۔

'عنوان نامہ خیالات از مثنوی کمالات صوری و معنوی امیر خسروی دھلوی بیاراست۔'

حضرت قبلہ نے کئی داخلی شہادتوں سے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ کتاب امیر خسرو کی نہیں ہے، کیونکہ اسمیں کاتبی شاہی اور ہلالی وغیرہ کے اشعار ہیں اور ابوالفضل کی عیار دانش کا ذکر بھی آیا ہے۔ یہ کتاب چند خطوط پر مشتمل ہے، جو مصنف نے اپنے دوستوں کو لکھے ہیں، اس میں موسیقی، شطرنج، گنجفہ اور تیر اندازی وغیرہ کی اصطلاحیں بھی ہیں۔ اور بعض تصوف کے مسائل بھی پائے جاتے ہیں۔

آخری شعر یہ ہے جس پر کتاب ختم ہوتی ہے۔

ہر کسی کو دوست دار مصطفیٰ است　　　دوستدار چار یار باصفا است

تاریخ اس پر درج نہیں ہے۔

۱۶۔ دیوان ابن یمین، جلد ۲۳، ۵۰۱

یہ دیوان امیر فخر الدین محمود بن امیر یمین الدین محمود مستوفی کا ہے، جو ابن یمین مشہور ہیں۔ مجمل روضۃ الصفا شعر العجم، لٹریری ہسٹری آف پرشیا، وغیرہ میں لکھا ہے کہ ان کا دیوان ضایع ہوگیا ہے۔ حضرت قبلہ نے اس نسخے کو انھیں کے دیوان کا نسخہ ثابت کیا ہے۔ یہ دیوان اس شعر سے شروع ہوتا ہے ؎

اے خداوند قادر یکتا　　　منبع کون و خالق اشیاء

اس میں کثرت سے ایسی غزلیں ہیں جن میں صرف ۵ شعر ہی درج ہیں اور تمام غزلیں ردیف وار ہیں اس پر بھی تاریخ موجود نہیں ہے غالباً یہ نسخہ دسویں صدی ہجر کا ہے۔

۱۷۔ دیوان ہندو، جلد ۱۰۵، ۲۲۶۔

یہ ایک نادر نسخہ ہے جس میں ہندو کی غزلیات، رباعیات اور قصائد درج ہیں۔ ہندو کے متعلق کسی تذکرہ میں کچھ لکھا ہوا نہیں ملتا۔ اس نسخے کی ابتدا اس قصیدے سے ہوئی ہے ؎

کے دل آسودہ شود گر ہمہ تن جان گردد | تا نہ در گرد سر زلف پریشاں گردد

اس نسخے میں شیخ میر کی شہادت کا ذکر ہے ؎

جستمش سال شہادت از خرد آمد ندا | اولیائی روضہ کشت و عاقبت رضواں بود

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندو اورنگ زیب کے عہد میں زندہ تھا۔

۱۸۔ قصائد مشرقی، جلد ۱۴ ص ۳۷

اس کے سرورق پر دیوان خاقانی لکھا ہے، لیکن یہ درست نہیں، چونکہ خاقانی کے قصیدوں کی اتباع میں قصیدے لکھے گئے ہیں۔ اس لئے غلطی سے دیوان خاقانی لکھ دیا گیا ہے۔ **پہلا قصیدہ**

خود را باصل خویش بصدفن در آورم | لولو بہ بحر و لعل بمعدن در آورم

خاقانی کا قصیدہ یہ ہے:

ہر صبح پائے صبر بدامن در آورم | پرگار عجز گرد دل و تن در آورم

اسی طرح اور قصائد بھی ہیں،

یہ نسخہ کامل نہیں ہے آخری شعر یہ ہے۔

چرخ کابواب کشایش بر خلایق بستہ است | بر ورت مانند مفتاح از بن دنداں سید

اس پر بھی تاریخ نہیں ہے۔

۱۹۔ قصیدہ مصنع۔ جلد انمبر، ص ۱۵

یہ قصیدہ، قصیدہ بدیعہ بھی مشہور ہے۔ قوامی گنجوی جو نظامی گنجوی کا بھائی تھا۔ یہ اسی کا نوشتہ ہے۔ اس میں ایک مشہور قصیدہ کے حسب ذیل شعر ہیں ؎

چیست آں دور و اصل او نزدیک | چیست آں فرد و فعل او بسیار
خام او ہرچہ علم را پختہ | مست او ہرچہ عقل را ہشیار

یہ پروفیسر براؤن سے حل نہ ہو سکا" اسی طرح صنعت مجرد بھی جو اس قصیدہ کے شعر نمبر ۷ میں پائی جاتی ہے۔ ممدوح کی سمجھ میں نہ آئی" حضرت قبلہ نے اولاً ذکر کا حل نکالا ہے۔ جو "عشق" ہے، اور صنعت مجرد کو سمجھایا ہے[1]۔ ابتدا یوں ہوئی ہے۔

حمد بجد بدیع مبدعی را کہ طوطی باغ بدایع،

تاریخ اس پر بھی نہیں پائی جاتی،

۲۰۔ روائح، جلد ۵۹ صـ ۱۸۹

یہ شیخ یعقوب شرفی کی تصنیف ہے جو لوائح جامیؒ کی طرز پر لکھی گئی ہے، کتاب کے آخر میں لکھا ہے

روائح از لوائح کم بمعنیٰ — نیامد بلکہ بیش آمد روائح

چو جستم سال تاریخش خرد گفت — روائح شد بے بیش از لوائح

(سنہ ۹۸۶ھ ۱۵۷۸-۷۹ء)

۲۱۔ سوالات حسینی، جلد ۱۰۱ صـ ۱۸۲

یہ سید حسینی کے مشہور سوالات ہیں جس کا جواب محمود شبستریؒ نے گلشنِ راز میں دیا ہے۔ حضرت قبلہ کی رائے میں یہ اصل مرقومہ سوالات کی صحیح نقل ہے کیونکہ اس میں بعض وہ اشعار ہیں جو مطبوعہ گلشن راز یا اور شرحوں میں بھی نہیں پائے جاتے وہ شعر یہ ہیں :۔[2]

۱۔ ز اہل دانش و ارباب معنیٰ، — سوالے دارم اندر باب معنیٰ

۲۔ ز اسرارِ حقیقت مشکلے چند — بگو اندر حضور ہر خردمند

۳۔ چہ بود آغازِ فطرت را نشانی — سرانجام تفکر را چہ خوانی

۴۔ مسافر چون بود، رہرو کدام ست — کرا گویم کہ او مرد تمام است

---

[1] اس قصیدہ کے متعلق حضرت قبلہ کا مضمون رسالۂ ایشیاٹک سوسائٹی نومبر ۲۷ء میں شایع ہوا ہے ملاحظہ ہو۔

[2] دیکھو میرا مضمون "محمود شبستری اور گلشن راز" علی گڑھ میگزین ۱۹۳۶ء

۵- نگر ممکن ز حد خویش بگذشت	کجا خود گرد ایں معنیٰ تواں گشت
۶- صدف چوں دارد ایں گوہر بیاں کن	کجا زد موجِ ایں دریا عیاں کن
۷- چو عالم ماسوی اللہ ست بیشک	معیّن شد حقیقت بود ہر یک
۸- ولے ثابت شد آنکہ ایں محال است	چہ جائی اتصال و انفصال است
۹- وگر عالم نہ دارد جو وجودی	خیالے گشت ہر گفت و شنودے
۱۰- چہ گوئی کز گزاف ایں جملہ گفتند	نہ در وے ہیچ تحقیقے نہفتند
۱۱- محقق را مجازی کے بود کار	مداں گفتارشاں جز مغز اسرار
۱۲- کسے کو حل کند ایں مشکل را	نثار او کنم جان و دلم را
۱۳- سخنہای حسینی حسب حال است	زبہر امتحانش ایں سوال است

والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ الکریم صلی اللہ علیہ وسلم و آلہ واصحابہ اجمعین

---

[1] حضرت قبلہ نے اسے درست کرکے خود لکھا ہے۔

ہونڈار

(پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی)

میں آج آپ سے ایک بزرگ کے بارہ میں کچھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں لیکن مشکل یہ ہے کہ ان کا نام کچھ اس قسم کا ہے کہ مجھے اندیشہ ہے کہ شاید پہلی کوشش میں اُن کے نام کا صحیح تلفظ نہ کر سکوں یا ریڈیو کے انجنیر صاحب اپنی مشین کی عافیت خطرہ میں سمجھکر مجھے اُس کے تلفظ سے روکدیں یا میرے سننے والوں کا ریڈیو جواب دے جائے یا پھر کچھ نہو تو مجھے خواہ مخواہ کی خفت اُٹھانی پڑے۔ پھر یہ بھی ہے کہ آج بڑا دن ہے جو ہماری سُننے والی برادری میں سے ایک جماعت کا نہایت مبارک تیوہار ہے' بچے تحائف کی اُمید میں کچھ سو چکے ہونگے' کسی کو نیند نہ آتی ہوگی' کوئی نخلِ کرسمس یا "کرسمس ٹری" کے سامنے بیٹھا روشنی اور مٹھائیوں کا لطف اٹھا رہا ہوگا' کچھ روٹھے منائے جا رہے ہونگے اور کچھ منے منائے روٹھے جاتے ہونگے کسی کو اپنا وہ زمانہ یاد آتا ہوگا جو گیا پھر نہ آئے گا' کوئی اِس سوگ میں مبتلا ہوگا کہ وہ زمانہ آگیا جو کبھی نہ جائے گا' بعض ایسے بھی ہونگے جو موجودہ حالت میں ایسے مسرور ہونگے کہ گویا نہ دنیا میں کوئی ماضی رہا ہے اور نہ غیب میں مستقبل کا کوئی وجود۔ ہاں کچھ ایسے بھی ہوں گے جو مسلسل اونگھ رہے ہوں گے۔ یہ سب کچھ تو ہوا لیکن میں کیا کروں مجھے رہ رہ کر اُن بزرگ کا نام یاد آتا ہے جن کا تذکرہ میں نے ابھی ابھی کیا ہے۔ دوسری دقت یہ ہے کہ رات کا وقت ہے اور ہمارے سننے والوں میں سے کچھ ایسے لوگ بھی ہوں گے جو رات کو ایسے نام یا واقعات سننے کے متحمل نہ ہو سکتے ہوں گے جن کا تلفظ غیر معمولی ہو اور کارنامہ غیر معمولی تر۔

بہر حال آج واقعتاً بڑا دن ہو یا نہو بڑی رات ضرور ہے اور اب تو نہیں لیکن کسی زمانہ میں مجھے چھوٹے دن اور بڑی راتیں بہت پسند تھیں۔ بڑی راتیں ناپسند اب بھی نہیں ہیں لیکن پسند ہونے اور ناپسند ہونے میں جو فرق ہے وہ صاحبانِ نظر یا اربابِ فن سے پوشیدہ نہیں ہے۔ ہاں تو میں اُن بزرگ کا نام ہی بھولا جاتا تھا جن کے تذکرہ سے میں نے گفتگو کی ابتدا کی تھی اور اب

جبکہ اُن کا نام یاد آگیا تو کیا ہرج ہے اِس سلسلے میں ایک قصّہ بھی سناتا چلوں۔ بہت ممکن ہے اس اثنا میں اُن کا نام نامی بھی آجائے اور میں و آپ دونوں اپنی اپنی ذمہ داریوں سے بیک وقت فارغ ہو جائیں۔ ذمہ داریوں کا نام میں نے یوں ہی لے دیا ہے ورنہ ذمہ داری ہو یا نہو یہاں تو اس کا سوال ہی نہ تھا تاہم ہرج ہی کیا ہے دورانِ گفتگو میں اِس قسم کے الفاظ استعمال میں آتے رہیں تو کہنے والے اور سننے والے دونوں یہ سمجھتے رہتے ہیں کہ بات معقول ہی ہو رہی ہے اور ہم میں سے کوئی اپنا وقت ضائع نہیں کر رہا ہے۔ اِس قسم کا احساس خود اعتمادی پیدا کرتا ہے اور جب تک خود اعتمادی پیدا نہو تضیع اوقات کا ولولہ ہی نہیں پیدا ہوتا لیکن یہاں، مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں نے ایک ہی سانس میں اپنے ہی قول کی تردید کر دی ہے۔ مگر کوئی پروا نہیں توقع یہی ہے کہ آپ کو ساری باتیں یاد نہ رہتی جاتی ہوں گی ورنہ آپ جانتے ہیں پبلک کا حافظہ قوی ہو تو لیڈر کی آبرو کہاں۔

لوگ کہتے ہیں بات میں بات نکلتی ہے ممکن ہے یہ صحیح ہو لیکن آج کی صحبت میں مجھے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بات میں بات نکلتی کم ہے اور غائب زیادہ ہوتی ہے اِس لئے ممکن ہے بات نکلنے کا محاورہ تو اپنی جگہ پر بالکل صحیح ہو لیکن بات میں بات نکلنے کا واقعہ غلط ہے۔ آپ ہی دیکھئے اور سُنئے تو بھی کوئی مضائقہ نہیں کہ میں بتانا تو چاہتا تھا ایک بزرگ کا نام اور بتا گیا بہت سی ایسی باتیں جن سے آپ یقیناً خوش ہوئے ہونگے اور محض اِس خیال سے کہ میں نے مردِ معقول ہونے کی حیثیت سے ضرور ایسی ہی بات کہی ہوگی جس سے دوسرے مردِ معقول خوش ہوں۔ لیکن آپ یقین مانئے گو میں اور آپ دونوں کم و بیش مردِ معقول ہیں لیکن ہم دونوں کے بھی بزرگ کچھ ایسے مردِ معقول گذرے ہیں جو اِس واقعہ سے ہم دونوں کے بارے میں ایسی رائے قایم کریں گے جو ہماری ہمّت افزائی کا موجب نہ ہوگی۔ گو اس میں شک نہیں کہ اِس کے بعد ہم بھی کوئی ایسی بات ضرور کر گذرتے جس سے اُن کی بزرگی اور ہماری خوردی دونوں مجلس بین الاقوام قسم کی ایک چیز بن جاتی۔

ہاں تو خوب یاد آیا میں آپ کو ایک قصّہ سنانا چاہتا تھا۔ قصّہ نہیں واقعہ اور جی تو یہ چاہتا تھا کہ قصّہ اور واقعہ پر بھی کچھ بحث کرنے لگوں لیکن اتنی تقریر کرنے کے بعد مجھے کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں

باتوں باتوں میں بہک سا جاتا ہوں اور یہ کوئی معقول بات نہیں ہے گو میں اس کا بھی قائل ہوں کہ ہر جگہہ معقول ہی بات کرنا بھی نامعقولیت کی ایک دلیل ہے بالخصوص ریڈیو پر جہاں عام طور پر معقول لوگ تھوڑی بہت نامعقول باتیں سننا چاہتے ہیں۔ نامعقول باتوں سے یہاں مراد سرمایہ و مزدور کی سی باتوں سے نہیں ہے بلکہ ایسی باتیں جن سے کبھی کہنے والے کی نامعقولیت ظاہر ہوتی ہو اور کبھی سُننے والے کی اور بحیثیت مجموعی دونوں کی!

اِن باتوں سے آپ نے اتنا اندازہ تو لگا ہی لیا ہوگا کہ میں بات کرتے کرتے بہکنے لگتا ہوں لیکن جہاں کلیلہ و دمنہ کا ایک دوسرے سے سابقہ ہو وہاں اِس قسم کی باتیں ظہور میں آتی رہتی ہیں اس لئے بگڑنے کے بجائے صرف چگونہ بودست آں پر اکتفا کرنا چاہئے۔ پھر مجھے یقین ہے کہ آپ نے بچپن میں مکتب میں انوار سہیلی اور چھُپ چھُپ کر الف لیلیٰ بھی پڑھی ہی ہوگی۔ شہرزاد یا دنیازاد قسم کی اِس میں کوئی خاتون تھیں۔ بات یہ ہے کہ الف لیلےٰ پڑھے ہوئے مجھے اتنے دن ہوگئے کہ اب نہ تو الف لیلےٰ یاد رہی اور نہ شہزاد اور دنیازاد کی یاد میں کوئی دلچسپی رہی اِس لئے آپ اِن ناموں سے جی چاہے تو مزے لیں میں تو صرف اِس واقعہ کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں جو ان میں سے کسی ایک غالباً شہرزاد سے وابستہ ہے یعنی ایک بادشاہ تھا وہ ہر شام شادی کرتا تھا اور ہر صبح عروس کو قتل کرا دیا کرتا تھا۔ زمانۂ جاہلیت میں ممکن ہے شوہر یہ کر سکتا ہو۔ آجکل یہ منصب خواتین کو حاصل ہے ہاں تو الف لیلیٰ میں آیا ہے کہ وزیر کی لڑکی نے اپنے آپ کو بادشاہ کی زوجیت میں دیا اور شب میں ایک قصہ سُنانا شروع کیا۔ بادشاہ کو قصہ سے ایسی دلچسپی ہوئی کہ صبح ہوگئی اور شہزادی نے قصہ کو ناتمام چھوڑا۔ بادشاہ نے قصہ کے انجام کو شہرزاد کے انجام پر ترجیح دی۔ اسی طور پر شہرزاد ناتمام قصہ سناتی رہتی اور قتل سے بچتی رہی۔ چنانچہ قصہ طوالت پکڑتا گیا اور بادشاہ کی دلچسپی بڑھتی گئی یہانتک کہ شہرزاد کی جان بخشی کی گئی اور قصہ ختم ہوگیا۔ یہی حال میرا ہے میں یہ سوچتا ہوں کہ جہاں سانس ٹوٹی اور ریڈیو والوں نے نکلوا دیا۔ اس لئے جوں توں بات کرتے ہی چلے جاؤ لیکن غالب نے کہا ہے۔

"کیا بنے بات جہاں بات بنائے نہ بنے!"

آپ یقین مانئے مجھے آپ سے قطعاً اتفاق ہے کہ یہاں غالب کو زحمت دینے کی بالکل ضرورت

نہ تھی اور یہ مصرع یہاں بالکل بے محل ہے مگر مژدہ ہو کہ مجھے بھی ان بزرگ کا نام یاد آگیا جن کے پیچھے مجھے یہ برا دن دیکھنا پڑ رہا ہے۔ بات یہ ہے کہ مجھے ایک جلسہ میں شریک ہونے کے لئے ایک جگہ جانا پڑا اور ایک نہایت ہی عزیز دوست لیکن نہایت ہی نامعقول پڑوس میں قیام کرنا پڑا۔ ایک طرف میونسپلٹی کی گندگی ڈھونے والی گاڑیوں کا ذخیرہ اور اس کا دفتر دوسری طرف شراب خانہ تیسری طرف بجلی کا خزانہ چارپائی میں اتنے اور ایسے کھٹمل جن پر کتنے فاقوں پر حرام بھی حلال ہو گیا تھا اور ہر چہار طرف مچھر جو گاتے بھی تھے کاٹتے بھی تھے اور آخر میں تو نوبت یہاں تک پہنچی کہ یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ ان کا کاٹنا ہی مسلسل گانا ہے یا گانا مسلسل کاٹنا۔ اس صورت سے تو میں نے صبح پکڑی!

غرض مچھروں کو میں نے اور میزبان نے مجھے کھلا پلا کر رخصت کیا اور میں جلسہ میں پہنچا۔ بحث یہ چھڑی تھی کہ مشترک زبان کی جو ریڈریں رائج ہیں وہ بالکل مہمل ہیں میں نے عرض کیا کہ ریڈروں کا مہمل ہونا ہی اُن کی سب سے بڑی خوبی ہے جس دن ریڈریں غیر مہمل ہوئیں آپ یقین مانئے ہندوستان کی خیر نہیں۔ خیریت یہ ہوئی کہ میری بات کو سب نے مہمل سمجھا ورنہ ہندوستان کا جو حشر ہوتا وہ بعد میں ہوتا میری خیر نہ تھی اس کے بعد کچھ اور بحث ہونے لگی اور بالآخر یہ طے پایا کہ جن نقائص کی شکایت کی جاتی ہے اُن کی مثالیں پیش کی جائیں۔ ابھی ریڈروں کی ورق گردانی ہی ہو رہی تھی کہ ایک دوست نے کان میں کہا کہ ہندی رسم خط میں ہر جگہ پرمیشر آیا ہے حالانکہ اُردو رسم خط میں ہر جگہ خدا موجود ہے مضمون میں دونوں یکساں ہیں لیکن خدا اور پرمیشر کے اختلاف نے بات کہاں کی کہاں پہنچا دی اس سے اندیشہ ہے کہ ہندو مسلمانوں میں نفاق اور بددلی پیدا ہو۔ میں نے کہا یہ بات نہایت نازک اور بے حد سنگین ہے خدا اور پرمیشر کا فرق ہندو مسلمانوں کا فرق ہے۔ پرمیشر کا لفظ قرآن میں کہیں نہیں آیا ہے اور جب تک مصنف کا نام ہی اس کی تصنیف میں نہ ہو تو ظاہر ہے اُس کا حق طباعت و اشاعت کیونکر محفوظ رہ سکتا ہے اور جب قرآن کے مضامین ہی محفوظ نہیں رہے تو لعنت ہے مجھ پر اور تف ہے آپ پر۔ میری لعنت کو تو وہ پی گئے لیکن اپنی تف پر میری طرف اُنھوں نے اس طور پر گھورا جیسے وہ مجھے مارنا تو چاہتے ہیں لیکن اپنے بیوی بچوں کا خیال کر کے خاموش رہنے پر مجبور ہیں۔ میں نے عرض کی جناب

غور تو کیجیے پرمیشر اور خدا دو نہیں میں لیکن ریڈروں میں اُن کو دو قرار دیدیا گیا ہے اور خدا ہوں یا پرمیشر جب دوئی کی بوائی تو پھر ہم آپ دونوں مشرک ہوئے اور ریڈریں ہماری اولاد پڑھینگے تو وہ بھی مشرک ہوئیں۔ اس طور پر ایک زمانہ ایسا آجائیگا جب دنیا میں صرف مشرک اور یہ ریڈریں باقی رہ جائیں گی۔ دوسری دقت یہ ہے کہ خدا اور پرمیشور کے امتیاز نے رسم خط کی دقتیں بھی بڑھادی ہیں۔ آج ہمارے سامنے ایک سوال یہ بھی ہے کہ رسم خط کیونکر مشترک ہو۔ فرض کیجیے رسم خط ہندی یا رومن ہوجائے پھر آپ اس پر چراغ پا ہوں گے کہ اِس رسم خط میں خدا کا لکھا جانا کیونکر گوارا کیا جاسکتا ہے۔ بعض لوگ خدا کو رسم خط سے علیحدہ نہیں کرسکتے اُن سے آپ کیونکر عہدہ برآ ہوں گے۔ ابھی ہم دونوں اِسی گلخپ میں مبتلا تھے کہ جلسے سے ایک شور اٹھا۔ ہونڈار، ہونڈار، اور یہاں قطع کلام ہوتا ہے یہی بزرگ تھے جن کے سبب سے میں ابتک بھکتا بھٹکتا رہا۔ آپ اِن کا نام یاد رکھیے گا میں بھی دہراتا رہوں گا۔ ہم دونوں نے خدا اور پرمیشور کو جہاں کا تہاں چھوڑا اور حاضرین کی طرف مخاطب ہوئے۔ یہ ہونڈار بھی ریڈر ہی سے برآمد ہوا تھا۔ سوال یہ تھا کہ یورپ سے پچھم کی سمت جن دت شریف کو بھیڑیا کہتے ہیں اُن کو پچھم سے پورب کی سمت والے ہونڈار کہتے ہیں۔ پورب والے مصر تھے کہ ہم ہونڈار ہی کہیں گے پچھم کے لوگ کہتے تھے کہ بھیڑیا موجود ہے پھر ہونڈار پر کیوں اصرار کیا جائے ایک صاحب پورب اور پچھم کے ذرا وسط میں تھے بولے حضرات نہ بھیڑیا نہ ہونڈار ہم تو ہونڑاڑ کہتے ہیں۔ یہ جانور کہیں کا کیوں نہو تلفظ پورب ہی کا رہے گا۔ بحث میں وہ خلفشار تھا گویا واقعی ہم میں دو ایک بھیڑیے دو چار ہونڈار اور ایک آدھ ہونڑاڑ موجود تھے بعض لوگ جو بالطبع صلح پسند اور صورت سے گورخر معلوم ہوتے تھے کہنے لگے بھئی ہونڈار یا بھیڑیا یورپ میں بھی ہوتا ہے وہاں تو اِس قسم کے منافشے ناموں پر سنے نہیں تھے۔ دوسرے صاحب چمک کر بولے حضرت لسنت کی بھی خبر ہے ہندوستان کے ہونڈار اور یورپ کے بھیڑیے میں بڑا فرق ہے۔ تیسرے صاحب بولے حضرات خاموش ہماری جماعت فرقہ بندی اور ملکی غیر ملکی جھگڑوں سے بہت بلند ہے۔ ہم ایسی بات چھیڑنا پسند نہیں کرتے جس سے کسی کی دل آزادی ہو ایک طرف سے آواز آئی 'اور اپنی گرفتاری ہو' جناب صدر نے سب کو خاموش رہنے کی ہدایت کی اور تھوڑی دیر میں پھر وہی خالص علمی فضا پیدا ہوگئی جس میں روئی اور روڑا دونوں یکساں رفتار سے گرتے ہیں۔

تو جناب والا! جب آپ نے ہونڈار کو سُن لیا لیکن قطع سماعت یہ فقرہ میری زبان سے ذرا بے خبری میں نکل گیا ہے ممکن ہے آپ انگریزی داں ہوں اور میرے اس فقرے سے یہ اخذ کرلیں کہ میں بحیثیت ہونڈار تقریر کر رہا ہوں۔ حاشا یہ نہیں ورنہ آپ جانتے ہیں ریڈیو والے اسے کب پسند کریں گے کہ اُن میں کوئی ہونڈار آجائے گو ایک صاحب میرے کان میں یہ کہہ رہے ہیں اور یہ کافی ہونڈار شناس معلوم ہوتے ہیں کہ اُن کو اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا اگر یہ تقریر کوئی ہونڈار سن رہا ہو لیکن احتیاط شرط ہے۔ اس بات کو سُن کر سُننے والوں میں سے کسی کا کان کھڑا ہو تو آپ فوراً سمجھ لیجئے فہوا ہونڈار۔

ہونڈار کے باب میں ہمارے دیہاتی بھائیوں کا خیال ہے اور ریڈیو والوں نے اس برادری میں کافی اضافہ کر دیا ہے کہ یہ جانور چپکے سے گاؤں کے مویشیوں میں آکر مل جاتا ہے اور نگہبانوں کو غافل پاکر کسی حقیر فقیر بہ تقصیر قسم کے جانور کو دبوچ کر رفو چکّر ہو جاتا ہے۔ مدتوں کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی کہ گم شدہ عزیز پر کیا گذری۔ جب متواتر اس قسم کے حادثات پیش آنے لگتے ہیں تو سارے گاؤں میں اور آس پاس اِس خطرہ کا اعلان کر دیا جاتا ہے کہ لوگو اپنی اپنی مویشیوں اور بچّوں بچیوں سے ہوشیار گاؤں میں ہونڈار آیا ہوا ہے۔

اس ہونڈار کے باب میں گاؤں والوں کا واہمہ یہ ہے کہ یہ ہجوم میں اس طور پر گھُل مِل جاتا ہے کہ کسی کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ مجمع میں کوئی غیر معمولی بزرگ شامل ہو گئے ہیں۔ اور یہی سبب ہے کہ یہ صاحب اپنا کام کر گذرتے ہیں اور کسی کو اِن کے کارناموں کی خبر نہیں ہوتی۔

آپ یقین فرمائیے میں نے جنگل کا ہونڈار نہیں دیکھا ہے لیکن آپ کی دعا سے شہری و تمدّنی ہونڈاروں سے کافی سابقہ رہا ہے۔ آپ بھی غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ ہماری موجودہ تمدّنی زندگی میں اس قسم کے ہونڈاروں کی کمی نہیں ہے یہ اور بات ہے کہ آپ نے اِس کے نام اور رکھ دئے ہیں۔ سیاست، حکومت، مذہب، تمدّن، غرض زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس میں آپ کو ہونڈاروں سے سابقہ نہ ہو۔ حکمراں ہونڈار، تاجر ہونڈار، لیڈر ہونڈار، مذہبی ہونڈار، گاؤں سدھار ہونڈار، شہر اُجاڑ ہونڈار، بوڑھا ہونڈار، جوان ہونڈار، ہونڈارن، ہونڈار چہ، ہونڈارک،

ہندوستانی ہونڈار، یورپین ہونڈار، جاپانی ہونڈار، چینی ہونڈار، بین الاقوامی ہونڈار، صاحب ہونڈار خانساماں ہونڈار، شاعر ہونڈار، پروفیسر ہونڈار غرض دِلّی کی دوکان چپل ہی چپل کی مانند ہونڈار ہی ہونڈار!

تفصیل وقت چاہتی ہے اور ریڈیو والے ہونڈار کے لئے وقت بڑھانا نہیں چاہتے اس لئے رخصت، بڑا دن سب کو مبارک ہو۔ ہونڈار کو بھی۔

نوٹ:۔ یہ تقریر ۲۵ر دسمبر ۱۹۳۶ء کو شب میں دہلی ریڈیو اسٹیشن سے نشر کی گئی۔

(لیث)

مردِ مجاہد کا عزم

محمد شریف چشتی بی۔ اے (علیگ)

میں اپنے عزم کے سانچے میں تقدیروں کو ڈھالوں گا
اور اپنے نیند کے ماتے مقدر کو جگا لوں گا

نشیمن کیلئے مجھکو تلاشِ شاخِ گل کیوں ہو؟
تڑپتی بجلیوں میں آشیاں اپنا بنا لوں گا!

میں کیوں احساں اُٹھاؤں ناخدا کی ناخدائی کا؟
کہ ہر موجِ قیامت خیز کو ساحل بنا لوں گا

ہراساں کر نہیں سکتیں مری بربادیاں مجھکو
گُلِ اُمید سو مایوسیوں میں بھی کھلا لوں گا

حقارت سے نہ دیکھ اے خسروی میری گدائی کو!
اگر چاہا خدا نے تجھکو قدموں پر گرا لوں گا

مری خاموشیوں میں پرورش پاتے ہیں ہنگامے!
زباں کھولونگا جب۔ گردوں کی بنیادیں ہلا لوں گا

معاذ اللہ! میرے جذبۂ ایماں کی گیرائی
نہ دم لونگا نہ جب تک کفر کی ہستی مٹا لوں گا

لگا کر نعرۂ تکبیر جب اتروں گا میداں میں
مرے دل کو جو تڑپاتا ہے وہ ارماں نکالوں گا

عجب کیا ہے کہ کٹ جائیں یہ محکومی کی زنجیریں!
نکل کر سر بکف میداں میں قسمت آزما لوں گا

مرے سینے میں اک بیتابئ دل ہے دل میں طوفاں ہے
یہ وہ طوفاں ہے جس میں آتشیں نغموں کو پا لوں گا

اور ان نغموں کو بزمِ ملتِ بیضا میں گا گا کر
دلِ اسلام کے سوتے ہوئے جذبے جگا لوں گا!

پھر ان جذبوں کی گیرائی کو بخشوں گا جہانگیری
مسلماں تھے کبھی جو کچھ وہی اُن کو بنا لوں گا

یہاں کہہ سکتا نہیں وہ عہد کیا اور کیا سماں ہو گا
مگر معلوم ہے کچھ اور ہی رنگِ جہاں ہو گا

جگرؔ کی شاعری پر ایک غیر جانبدارانہ نظر

(محمد یوسف رضا صاحب بدایونی)

ناقدین شعر کا اس بارے میں سخت اختلاف ہے کہ سخن فہمی کا مادّہ شاعروں میں بدرجۂ اولیٰ پایا جاتا ہے یا علماء اور ادباء کے حصّہ میں یہ فضیلت آئی ہے۔ شعرا ہمیشہ سے اس امر کے شاکی رہے ہیں کہ ان کے اشعار کا حقیقی معنوں میں کوئی قدرداں نہیں۔ چنانچہ اُردو زبان کے مایۂ ناز فلسفی شاعر میرزا غالب اپنے طرزِ خاص میں نالاں ہیں کہ:۔

بیا ور ید گر اینجا بود زباں دانے   غریب شہر سخنہائے گفتنی دارد

حال آنکہ غالب کا عہد وہ تھا کہ دہلی میں منتخب روزگار فارسی داں حضرات جمع تھے۔ مولانا آزردہؔ اور شیفتہؔ جیسے اساتذہ کا تو ذکر ہی کیا، غالب کا کلام سمجھنے کے لئے اوسط درجہ کے علماء کافی تھے۔ لیکن پھر بھی مرزا شاکی ہیں کہ یہاں فی الواقع کوئی زبان داں نہیں اور اپنی اجنبیت محسوس کرتے ہوئے خود کو "غریب شہر" کے لقب سے پیش کرتے ہیں۔

اقبالؔ بھی اپنے ابنائے زمانہ کی سخن سنجی سے مایوس ہے۔ اگر کہیں خلاف توقّع اس کے اشعار کی داد مل جاتی ہے تو وہ پکار اٹھتا ہے کہ ؏:۔ ابھی محفل میں ہے شاید کوئی دردآشنا باقی!!

اس تمام بحث سے یہ تو ظاہر ہو گیا کہ قدرت نے شعراء کو قوّتِ نقد نہ سہی، لیکن قوّتِ تفہیم بدرجۂ اتم ودیعت کی ہے۔ اور کم از کم ان کے کلام پر اُن سے بہتر کوئی رائے نہیں دے سکتا۔

جگرؔ کی شاعری پر رائے زنی کرنے سے پیشتر یہ دیکھ لینا چاہئے کہ اپنے کلام کے متعلق اس کا کیا خیال ہے شعلۂ طور کے خود نوشتہ دیباچہ میں لکھتا ہے کہ:۔

"مجھے اپنے شعر و ادب پر سب سے بڑا فخر یہ ہے کہ میری زندگی اور میری شاعری میں بالکل مطابقت ہے تضاد نہیں۔"

چلئے' ایک بات' اور حقیقتاً بہت کام کی بات' تو معلوم ہوگئی یعنی اُس کی شاعری اس کے حوادث حیات کا آئینہ ہے۔ وہ روزانہ جو زندگی گذارتا ہے اس کی سچی تصویر اگر دیکھنا ہو تو شعلۂ طور سے بہتر اور کہیں نہیں مل سکتی۔ بالفاظِ دیگر' اس کی غزلیں نہیں بلکہ وہ تصاویر ہیں جن میں اس کے واقعاتِ زندگی منعکس نظر آتے ہیں۔

لیکن طرز' اور رنگ کے متعلق ابھی فیصلہ نہیں ہُوا کہ وہ کیا ہے؟ اور کس طرح کا ہے؟ مگر نہیں' شعلۂ طور میں اس بارے میں بھی اشارہ ہے کہ :۔

میں نہیں بسملِ خیامِ جگر　　　حافظِ خوش کلام نے مارا

اب معلوم ہُوا کہ جگر کا رجحانِ طبع حافظؔ شیرازی کی طرف زیادہ ہے۔

سب سے بڑی چیز خواجہ حافظؔ کے کلام میں یہ ہے کہ حسنِ بیان' خوبیٔ ادا' شستگی اور لطافت میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ دیکھنا یہ ہے کہ کلامِ جگر میں یہ باتیں کہاں تک پائی جاتی ہیں اور ان کے علاوہ بھی جگر کا طغرائے امتیاز کیا مضامین ہیں۔

حُسن بیان اور خوبیٔ ادا

یہ خوبیاں کسی ایک شاعر کے ساتھ مخصوص نہیں کی جا سکتیں۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ لوازماتِ شاعری میں سے ہیں۔ ہاں جس قدر طرزِ ادا اچھا ہوگا بیان میں لطافت زیادہ پیدا ہو جائے گی۔ ایک مضمون کو لوگ سَو سَو طرح سے ادا کرتے ہیں اثر نہیں پیدا ہوتا مگر ایک فصیح البیان اسی بات کو کچھ اس انداز سے ادا کرتا ہے کہ قلب پر جادو کی طرح اثر ہوتا ہے۔ مثلاً۔ جناب علی اکبر اذان دے رہے ہیں' میر انیس اس کو ایک جگہ یوں ادا کرتے ہیں۔

تھا بُلبُلِ حق گو کہ چہکتا تھا چمن میں

مگر ایک دوسری جگہ جب اسی مضمون کو ذرا بہتر اور مختلف الفاظ میں ادا کرتے ہیں تو چیز ہی اور ہو جاتی ہی۔

ع:۔ بُلبُل چہک رہا تھا ریاضِ رسول میں

اس مثال سے یہ تو ظاہر ہو گیا کہ نشست الفاظ' حُسن ادا اور برجستگی سے کلام میں کیا اثر پیدا ہو جاتا ہے۔

علامہ نظم طباطبائی مرحوم نے جہاں غالب کا یہ شعر درج کیا ہے کہ

کہا تم نے کہ "کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی؟"　　　بجا کہتے ہو! سچ کہتے ہو! پھر کہیو کہ "ہاں! کیوں ہو؟"

توفرمایا ہے کہ اس شعر میں روزمرّہ کی صفائی، حُسن ادا اور بندش کی چُستی سحر کی حدتک پہونچ گئی ہے۔
مولانا زندہ نہیں ورنہ نمعلوم جگر کے اس شعر کے متعلق کیا کہتے۔

"ترا جذبۂ شوق ہے بے حقیقت ذرا پھر تو ارشاد فرمائیے گا!"

غالب کے یہاں "پھر کہیو" والے ٹکڑے نے قدرے ابتذال پیدا کر دیا تھا۔ برخلاف اس کے جگر آدابِ عشق کو بھی ملحوظ رکھے ہوئے ہے لیکن ساتھ ہی محبوب کے اِس ریمارک سے کہ

"ترا جذبۂ شوق ہے بے حقیقت!"

عاشق کی رگِ حمیّت پھڑک اُٹھتی ہے، وہ جھلا جاتا ہے۔ مگر آدابِ عشق کا خیال آتے ہی یہ کیفیت تو ختم ہو جاتی ہے اور اس کا غصہ فرو ہو جاتا ہے، وہ مُسکرا دیتا ہے، اور محبوب کے اس قول کا جواب دیتا ہے مگر کن الفاظ میں؟ جن سے صریح طور پر ایک قسم کا استحقار ٹپکتا ہے کہ:-

ذرا پھر تو ارشاد فرمائیے گا!

لفظ "ارشاد" سے ہی یہ ظاہر ہے کہ مجیب کا دل خفگی سے معمور ہے۔ اس کے نزدیک اس قول کی کوئی حقیقت نہیں اور یہ جواب محبوب کے اس قول کو مُسترد کرنے کی خاطر دیا گیا ہے۔

ناصح سے جھگڑنا شعراء اور علی الخصوص متغزّلین کا عام شیوہ ہے۔ مگر بیشتر تعریضین ایسی ہوتی ہیں جو عقلی دلائل اور براہین پر مبنی نہیں ہوتیں۔ یعنی ناصح کو صرف اس لئے چھیڑا جاتا ہے کہ وہ غریب نصیحت کرتا ہے۔ مرزا غالب شاید پہلے اُردو شاعر ہیں جنہوں نے اس امر کی دلیل پیش کی اور کہا کہ:-

حضرتِ ناصح گر آئیں۔ دیدہ و دل فرشِ راہ کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو، کہ سمجھائیں گے کیا؟

یعنی یہ جھگڑا ان کو معلوم نہیں، وارداتِ عشق سے ان کو مَس نہیں۔ دردِ محبت کی ماہیت سے قطعاً ناآشنا، مگر ہم کو سمجھانے چلے ہیں۔ بھلا وہ کیا سمجھائیں گے!!

جگر بھی اسی قسم کی بات کہتا ہے مگر طرزِ بیان میں بلا کی نُدرت ہے یعنی:-

نہیں کھیل ناصح! جنوں کی حقیقت سمجھ لیجئے گا تو سمجھائیے گا

عاشق کے دل کو محبوب سے زیادہ کوئی شے عزیز نہیں۔ اس کی ہر ادا خواہ وہ ظالمانہ ہی ہو دل نشیں معلوم ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں جب شعرا اس کو قاتل، صیاد، ظالم، عاشق کش اور طرح طرح کے ناموں سے یاد کرتے ہیں تو فی الحقیقت تعجب ہوتا ہے بلکہ عاشق کو قلبی اذیت محسوس ہوتی ہے۔ اسی بات کو جگر ادا کرتا ہے لیکن دیکھئے طرز بیان میں کیا معشوقانہ پن ہے:-

ان شاعرانِ دہر پہ ہو عشق ہی کی مار　　　اک پیکرِ جمیل کو قاتل بنا دیا

جوش ملیح آبادی اسی مضمون کو ذرا واضح الفاظ میں پیش کرتے ہیں کہ

جبیں پر سادگی، نیچی نگاہیں، بات میں نرمی　　　مخاطب کون کر سکتا ہے تم کو لفظِ قاتل سے

لیکن جوش کے سارے مصرع سے وہ مطلب نہیں ادا ہوتا جو جگر کے "پیکرِ جمیل" کہہ دینے سے حاصل ہوتا ہے۔

شانِ عشق عموماً متغزلین کے یہاں عاشق کی ہستی کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی۔ وہ زندہ اس لئے ہے کہ محبوب کے ستم و جور سہے۔ اس کی ہر گھڑی محبوب کی دل جوئی میں گذرتی ہے۔ وہ اپنی ذات کو پست متصور کئے ہے اگر معشوق اس کی جانب ذرا بھی ملتفت ہو جاتا ہے تو گویا عاشق کی معراج ہو گئی۔ لیکن جگر اس "مغلوبانہ ذہنیت" (Defeatist Mentality) کا قائل نہیں۔ محبت میں اس کا مسلک سب سے مختلف اور ساتھ ہی ساتھ مستحسن ہے۔ جیسا کہ خود کہتا ہے:-

محبت ہی اپنا بھی مذہب ہے لیکن　　　طریقِ محبت جدا چاہتا ہوں

جگر کے نزدیک عاشق کا وجود لابُد اور لازمی ہے۔ اس کی ہستی بھی اتنی ہی، بلکہ اس سے زیادہ اہم ہے جتنی محبوب کی۔ صرف یہی نہیں ہے کہ عشق حُسن کا محتاج ہے۔ نہیں! حسن کا بھی لازمی طور سے عشق پر مدار ہے۔ چند مثالیں اس مطلب کو واضح کر دیں گی۔

محبوب نے دل میں ٹھان لی ہے کہ عاشق کے وجود کو نیست و نابود کر دینا چاہئے۔ وہ اس پر تلا ہوا ہے کہ یہ باعثِ بدنامی صفحۂ ہستی سے محو ہو جائے۔ لیکن جگر کیا کہتا ہے۔ سنئے:-

مٹا کر ہمیں آپ پچھتائیے گا　　　کمی کوئی محسوس فرمائیے گا!
ہمیں جب نہ ہونگے تو کیا رنگِ محفل　　　کسے دیکھ کر آپ شرمائیے گا؟

نہ ہوگا ہمارا ہی آغوش خالی　　　کچھ اپنا بھی پہلو تہی پایئے گا!

عاشق کے معیار میں جگر کی مابہ الامتیاز خصوصیت یہ ہے کہ وہ محبوب سے برابری کی حیثیت سے ملتا ہے وہ اپنا مرتبہ "گدایانہ" نہیں بناتا۔ وہ کہتا ہے :-

یہ کیا طاقت کہ ہم پر ڈال دے ٹیڑھی نظر کوئی　　　مگر اس جانِ محبوبی کو "مستثنیٰ" سمجھتے ہیں

مستغنی المزاجی اور خودداری ملاحظہ ہو۔

دیا ہے عشق نے وہ مرتبہ بحمداللہ　　　کہ آنکھ تک نہ اُٹھاؤں اگرچہ تو آئے

یا وہ تھے خفا ہم سے، یا ہم ہیں خفا ان سے　　　کل ان کا زمانہ تھا آج اپنا زمانہ ہے

محبوب اس کا مدعی ہے کہ ہم اب تمہارا خیال اپنے دل سے محو کرنیکی کوشش کر رہے ہیں۔ جگر کا جواب دیکھئے۔

بھلانا ہمارا مبارک! مبارک!　　　مگر شرط یہ ہے نہ یاد آیئے گا

ستم زدہ عاشق اپنا احوال رو رو کر سنا رہا ہے۔ لیکن سنگ دل محبوب نظرِ التفات نہیں کرتا۔ پھر ایک "استحقار آمیز" مسکراہٹ سے اس تمام افسانۂ درد وغم کا استقبال کیا جاتا ہے۔ جگر کو اس کی تاب نہیں۔ وہ جھلّا کر بے ساختہ پکار اُٹھتا ہے کہ

وہ دن بھی قریب ہیں کہ ظالم!　　　تو روئے گا، مسکرائیں گے ہم!

پھر آگے چل کر اپنا مطلب ذرا واضح کر کے دکھاتا ہے :-

جنگل جنگل رُلانے والے　　　کونے کونے رلائیں گے ہم

اسی مفہوم کو ایک اور مقام پر بیان کرتا ہے۔

ہمیں بھی نہ اب چین آئیگا جب تک　　　ان آنکھوں میں آنسو نہ بھر لائیگا

مگر اس پر بھی ظالم محبوب مُسکرائے جاتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ یہ تمام جذباتی گفتگو ہے۔ اس میں حقیقت کہاں

شائبہ نہیں اور اس قول کو فعل سے زیادہ تعلق نہیں۔ جگر اس کا یہ مطلب تاڑ لیتا ہے اور دیکھئے کن پُرجوش الفاظ میں اس کا جواب دیتا ہے ؎

جو کہتے ہیں کر دکھائیں گے ہم　　　دیوانے کی بڑ سمجھ نہ اس کو

معشوق کو یہ غلط فہمی ہے کہ اس کی ہستی پر تمام عُشّاق کی بقا کا مدار ہے۔ جگر اس مغالطہ کو اس طرح رفع کرتا ہے کہ نہیں! حُسن تو کوئی چیز ہی نہیں عشق کے باعث حُسن حُسن ہو گیا ؎

مٹ جائیگی جس دن مرے سجدوں کی حقیقت　　　دنیا میں تیرا نقشِ کفِ پا نہ رہیگا

لیکن ان تمام امور کے باوجود جگر صحیح معنوں میں عاشق ہے۔ وہ آخر دم تک وفادار ہے۔ مگر اس کی وفا بھی دنیا سے نرالی ہے۔ دوسرے "اہلِ نظر" تو رٹ لگائے ہوئے ہیں کہ ہماری عمر وفا کرتے گذری لیکن وہ ظالم توجہ نہیں کرتا۔ جگر کے یہاں اس وفا کا تذکرہ ہی ممنوع ہے ؎

یعنی وفا ہی کرنا ، ذکرِ وفا نہ کرنا　　　اصلِ وفا یہی ہے ، عین وفا یہی ہے

جگر اپنے افسانۂ غم کو شرمندۂ الفاظ نہیں کرنا چاہتا۔ اس کا قول ہے کہ

یہ بھی اک التجا ہے کچھ التجا نہ کرنا　　　عرضِ نیازِ غم کو لب آشنا نہ کرنا

عاشق کی زندگی مجسّم محبت ہے۔ اس کی ہر ادا افسانۂ غم کی راوی ہے۔

خود میں فریاد ہوں میری کوئی فریاد نہیں　　　میری ہستی ہے میری عرضِ تمنائے دوست

کہہ رہا ہوں وہ فسانہ جو مجھے یاد نہیں　　　دیکھنا ہے خودیٔ عشق کا اعجاز جگر

بایں ہمہ جگر اپنے محبوب کی خاطرِ نازک کا بے حد لحاظ رکھتا ہے، اس کو یہ گوارا نہیں کہ اس کا دلرُبا کسی وجہ سے غمگین ہو یا عاشق کے فسانۂ غم سے اس کا نازک دل شرمندہ ہو ؎

پشیمانیوں کی پشیمانیاں ہیں　　　سُنا کر غمِ درد پچھتا رہا ہوں

جگر نے بارگاہِ ایزدی میں دعا کی کہ الٰہی قربِ حبیب میسّر ہو۔ وہ رشکِ مہر کسی طرح میرے سیہ خانہ کی
ر کا باعث ہو۔ کہنے کو تو یہ بات کہدی لیکن غور کرنے پر محسوس ہوا کہ اگر ایسا ہوا تو اُس کی طبع نازک کو
یشانی کا بار اٹھانا پڑے گا یہ خیال آتے ہی دست بدعا ہوئے کہ خدایا ! دعائے مذکورہ کو شرفِ قبولیت
ہتر ہو۔ میں ایسا وصل نہیں چاہتا جس سے میرے آرامِ جاں کے سکون میں خلل پڑے۔ سُنیئے۔

کسی کی خاطرِ نازک کا آگیا ہے خیال　　　دعائیں مانگ رہا ہوں دعا قبول نہ ہو

م کوشی اور ایذا پسندی

اردو شعراء میں جگر کی مختص صفت یہ ہے کہ وہ مصائب و آلام سے گھبرا کر مائلِ فریاد نہیں ہوتا بلکہ اُن میں یک گونہ لذّت کی چاشنی محسوس کرتا ہے

محبت میں تکالیف و مصائب کی کمی نہیں، لیکن جگر یہ خیال کرتے ہوئے کہ خداوندِ عالم نے ہر بشر کو
نج و مصیبت کا کچھ حصہ بخشا ہے، رحم و کرمِ ایزدی سے اس امر کا مدّعی ہے کہ غمِ محبت مکمل طور سے اُسے
یت فرما دیا جائے لیکن اس سے قدرے خود غرضی مترشح ہوتی ہے۔ لہٰذا وہ ظاہر یہ کرتا ہے کہ مجھے جمیع
م کی تکالیف کا احساس ہے میں سمجھتا ہوں کہ اُن کے لئے مصائب کا بار ناقابلِ برداشت ہے اس طرح
بنی نوعِ انسان کی ہمدردی میں وہ اپنا دعویٰ اس طرح پیش کرتا ہے :۔

یارب غمِ محبت سب بخشدے مجھی کو　　　میرے سوا کسی کو اب مبتلا نہ کرنا

ذرا الفاظ بدل کر ایک جگہ یہی مفہوم اس طرح ادا کرتا ہے :۔

داستانِ غمِ ہستی کو مکمل کر لوں　　　ایک بھی عشق کا عنوان نہ جانے پائے

جب جگر کو اس امر کا احساس ہوتا ہے کہ اس کے محبوب کے قبضۂ قدرت میں ہر طرح کے مظالم
تو اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ وہ یہ عرض کرتا ہے کہ

میں خوگرِ ستم ہوں، پروردۂ الم ہوں　　　جور و جفا کے مالک ! مہر و وفا نہ کرنا

ذرا مختلف الفاظ میں یہی مفہوم ملاحظہ ہو ۔

پھر کوئی مہرباں نہ ہو جائے　　　سعیٔ غم رائگاں نہ ہو جائے !

یعنی اب مصائب و آلام برداشت کرنا میری سرشت میں داخل ہو چکا ہے۔ ان چیزوں کا عادی ہو چکا ہوں۔ اب اگر وفا میرے ساتھ کی بھی جائے تو وہ باعثِ تکلیف ہوگی۔

وہ ایک ایسی زندگی گذارتا رہا ہے کہ ایذا پسندی اس کی رگ رگ میں سرایت کر چکی ہے لیکن تقاضائے فطرت یہ ہے کہ مسلسل اور غیر متنوع امور سے جی بھر جاتا ہے۔ جگر اس جی بھر جانے سے بہت افسردہ ہوتا ہے:-

ہائے کیا ہو گیا طبیعت کو   غم بھی راحت فزا نہیں ہوتا!

محبوب کے مظالم نے عاشق کو غم کوشی کی تعلیم دی۔ اب اسے مصائب میں لطافتِ پنہاں محسوس ہونے لگی۔ ایذا پسندی کو زندگی کا ماحصل سمجھنے لگا۔ کہ یکایک محبوب اپنے رویہ پر پشیمان ہوتا ہے۔ لیکن عاشق اب کرم کا متمنی نہیں۔ ہاں، محبوب کی خاطر سے یہ "مصیبت" بھی گوارا کر سکتا ہے۔ چنانچہ لکھتا ہے:-

ظلم کیا، اب تو کرم بھی ہے گوارا مجھ کو   تیری اس اشک بھری چشمِ ندامت کی قسم!

اس کا یہ عقیدہ ہے کہ آرزو کا پورا نہ ہونا ہی کیف کی زندگی ہے جب یہ عالم نہ رہے تو کچھ نہیں۔

سب جسے کہتے ہیں ارمانوں کا پورا ہونا   میرے نزدیک یہی موت ہے ارمانوں کی

جگر کی زندگی کو قایم رکھنے والی شے ستم ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو اس کے قلب کے لئے باعثِ تشویش ہے۔

ستمِ زیست آفریں کی قسم   خطرۂ التفات نے مارا

غرض جہاں دیگر شعرا، محبوب کے ظلم و ستم سے نالاں ہیں۔ اس کی فرقت میں تڑپا کرتے ہیں اور ہر دم لب پر دعائے تقرب ہے، اس کی نظرِ التفات کے متمنی ہیں۔ ایک دن اس کی جناب میں باریاب ہونے کے آرزو مند ہیں، جگر نے اپنے لئے ایک جداگانہ راستہ، جو مذکورۂ بالا مسلک کے قطعاً متضاد ہے، پیدا کیا ہے۔ وہ کیا ہے؟۔ میں سمجھتا ہوں کہ سطورِ بالا میں جتنی بحث کی گئی ہے اس کے بعد کچھ مزید تحریر کرنے کی ضرورت نہیں مخلصاً یہ عرض کر دینا چاہئے کہ جگر کے ذہن میں جو سچے عاشق کا تصور ہے۔ وہ یہ ہے کہ وہ مصائب و آلام کا عادی ہو چکا ہو۔ نہیں! بلکہ اس کو ان تکالیف میں یک گونہ تلذذ محسوس ہونے لگا ہو۔ وہ زندہ اس لئے ہے

کہ مصائب اٹھائے جو اس کی حیات کا جزوِ لاینفک بن گئے ہیں۔ اس کے برخلاف کسی قسم کی عنایت و مہربانی اس کے حق میں وہ کام کرتی ہے جو ہوس پرست عاشق کے لئے محبوب کی بے التفاتی۔

جگر ایک مُتلذّذ کے رنگ میں

اس طرزِ عاشقی کے قطعاً مُتضاد وہم جگر کو بعض مقامات پر ایک متلذّذ Epicurean کے روپ میں پاتے ہیں۔ یہ وہ کیفیت ہے جو ایک حقیقی میخوار پر طاری ہو سکتی ہے۔ اس وقت وہ اپنے جمع فرائض سے بے نیاز ہے۔ عالم و مافیہا سے بے تعلق۔ تمام آدابِ عاشقی اور معاملاتِ حسن و عشق سے آزاد ہے اس کے مدِّ نظر صرف یہ مقولہ ہے کہ "بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست"۔ وہ کامل طور سے "کھاؤ، پیو اور مست رہو" کے فلسفہ کا حامی نظر آتا ہے۔ چند مثالوں سے یہ مطلب واضح ہو جائیگا۔

جتنی بھی آج پی سکوں، عذر نہ کر پلائے جا ۔۔۔ مستِ نظر کا واسطہ! مستِ نظر بنائے جا

اس مفہوم کے ساتھ ہی ساتھ زاہد سے چھیڑ چھاڑ (جو شعراء کی "سنّتِ دیرینہ" ہے) بھی ملاحظہ کیجئے

مسجد میں مُعتکف ہیں بیکار ہی تو زاہد ۔۔۔ دوروزہ زندگی ہے آئیں، پئیں، پلائیں

اسی فلسفۂ تلذّذ (Epicurean Philosophy) کے ماتحت جگر کی وہ نظم بھی ہے جو "شکستِ توبہ" کے زیرِ عنوان لکھی گئی ہے۔

اِن مست انکھڑیوں کی قسم کھا کے پی گیا ۔۔۔ جب لہر آگئی کوئی، لہرا کے پی گیا
بے کیفیوں کے کیف سے گھبرا کے پی گیا ۔۔۔ توبہ کو توڑ تاڑ کے تھرّا کے پی گیا
زاہد یہ میری شوخیٔ رندانہ دیکھنا ۔۔۔ رحمت کو باتوں باتوں میں بہلا کے پی گیا
آزردگیٔ خاطرِ زاہد کو دیکھ کر ۔۔۔ مجھ کو یہ شرم آئی کہ شرما کے پی گیا
اے رحمتِ تمام مری ہر خطا معاف! ۔۔۔ میں حُسنِ اتفاق سے گھبرا کے پی گیا

ذرا طرز ادا میں معشوقانہ پن ملاحظہ ہو:

پینا بغیر اذن یہ کب تھی مری مجال، ۔۔۔ درپردہ چشمِ یار کی شہ پا کے پی گیا

محاکات

محاکات کے لغوی معنی ہیں "باہم حکایت کرنا"، لیکن اصطلاحِ شاعری میں اس فن کو محاکات کے نام سے تعبیر کرتے ہیں جس کے ذریعہ مناظرِ فطرت۔ وارداتِ عشق یا دیگر مواقع کا ہو بہو نقشہ کھینچ دیا جائے۔ پڑھتے ہی آنکھوں کے سامنے اشیائے مذکورہ کی من و عن تصویر پھر جائے۔ اس کمال کو بعض اوقات "شاعرانہ مصوّری" بھی کہتے ہیں۔ فی الحقیقت اس قدرت کا جس قدر وافر حصہ کسی شاعر کو ودیعت کیا گیا ہے اتنی ہی اس کی شاعری بھی ارفع و اعلیٰ ہے۔ ہر زبان میں اکابر شعراء اس صنعت کے سرمایہ دار رہے ہیں۔ اردو میں انیس۔ فارسی میں فردوسی۔ انگریزی میں شکسپیر اور سنسکرت میں کالی داس کا طرۂ امتیاز یہی صفت ہے۔ ہم کو دیکھنا چاہئیے کہ جگر کے کلام کو ارتفاع میں اس صفت نے کس حد تک اعانت کی ہے۔

مثلاً محبوب جب عاشق کی حالتِ زار کی خبر پاکر اُسے دیکھنے آتا ہے۔ لیکن کیفیت دگرگوں پاکر سخت تشویش میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اسی حالت میں واپس جا رہا ہے کہ کوئی شخص کیفیتِ حال کے متعلق استفسار کرتا ہے اس کی تصویر یوں پیش کی ہے:۔

ماتھے پہ پسینہ کیوں؟ آنکھوں میں نمی کیسی! ‌‌‌‌‌‌ کچھ خیر تو ہے، تم نے کیا حالِ جگر دیکھا؟

محبوب سے غیر متوقعانہ طور سے ملاقات ہو جانے کی کیفیت وہی بہتر جان سکتا ہے جس کو ایسے مواقع سے دوچار ہونا پڑا ہو۔ جگر انہیں لوگوں میں سے ہے۔

دھڑکنے لگا دل، نظر جھک گئی ‌‌‌‌‌‌ کبھی اُن سے جب سامنا ہو گیا

قاصد خط حوالے کرتا ہے۔ حضرت اس امر کے ساعی ہیں کہ اہلِ جہاں کو اس مراسلت کے متعلق کسی قسم کی بدگمانی نہ ہو لیکن مضمون نامہ معلوم کرنے کی آرزو میں جناب کی کیفیت یہ ہے کہ "اک رنگ آرہا ہے اک رنگ جا رہا ہے"، بہرحال لفافہ چاک کرتے ہیں مگر جذبات پر قابو نہیں رہتا۔ ملاحظہ ہو۔

لیکے خط اُن کا کیا ضبط بہت کچھ لیکن ‌‌‌‌‌‌ تھرتھراتے ہوئے ہاتھوں نے بھرم کھول دیا

یا مثلاً جگر کا یہ شعر ہے۔

اے محتسب، نہ پھینک! مرے محتسب، نہ پھینک! ظالم! شراب ہے! ارے ظالم! شراب ہے!!

دیکھئے کتنا نیچرل ہے۔ جب محتسب کسی میخوار کے ہاتھ سے جام چھین لے۔ شراب کو بہا دینا چاہے تو قدرتاً وہ میخوار عرض کرے گا "اے محتسب! نہ پھینک!" لیکن جب اس پر وہ نہ مانے گا تو میخوار خوشامد سے بھی دریغ نہ کرے گا۔ نہایت منت و زاری کے ساتھ التجا کرے گا کہ "مرے محتسب! نہ پھینک" لیکن جب وہ دیکھے گا کہ سب منت و زاری بے سود ثابت ہوئی اور اس بیدرد نے شراب زمین پر پھینک ہی دی تو ضبط کی تاب نہ لا سکے گا۔ تڑپ جائیگا اور پکار اٹھیگا کہ:۔

"ظالم! شراب ہے! ارے ظالم! شراب ہے!"

"بیوفائیاں توبہ" "کلائیاں توبہ" جگر کی مشہور غزل ہے۔ اس کے بعض اشعار بھی محاکات کے بہترین نمونے ہیں:۔

شبنم آلودہ وہ حسین آنکھیں رُخ پہ اڑتی ہوائیاں، توبہ!

ایک دوسرا موقع ملاحظہ ہو:۔

آستینوں کا وہ چڑھا لینا گوری گوری کلائیاں، توبہ!

ذیل کے اشعار بھی اس صنعت میں لاجواب ہیں۔

آنکھوں میں نمی سی ہے، چُپ چُپ سے وہ بیٹھے ہیں نازک سی نگاہوں میں نازک سا فسانہ ہے

یہ کچھ آرہی ہے آہٹ اُس پائے نازکی سی تجھ پر خدا کی رحمت! اے دل ذرا ٹھہرنا!

زباں خموش، نظر بے قرار، چہرہ فق تجھے بھی کیا تری کافرادا نے لوٹ لیا؟

قدم ڈگمگائے نظر بہکی بہکی جوانی کا عالم ہے سرشاریاں ہیں

وہ زلفیں دوش پر بکھری ہوئی ہیں جہانِ آرزو نکھرا رہا ہے!

کچھ بات بن پڑی نہ دلِ دادخواہ سے کیا جانے کیا وہ کہہ گئے نیچی نگاہ سے

رنگِ حیا یہ ہے ترے جوشِ شباب میں یا چاندنی کا پھول کھلا ہے گلاب میں

وہی قیامت ہے قدِ بالا، وہی ہے صورت، وہی سراپا — لبوں کو جنبش، نگہ کو لرزش، کھڑے ہیں اور مسکرا رہے ہیں!
لطف سے کچھ اُس نے کہا زیر لب — میں نے جو پوچھا تو کہا "کچھ نہیں!"

اثر اور دل نشینی

جگر کے کلام میں درد و اثر کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ شعر خود کہے دیتا ہے کہ میں جس دل سے نکل کر آیا ہوں وہ درد کا مسکن تھا۔ غم و اندوہ کا پتلا تھا۔ اس خصوصیت میں جگر، میر تقی مرحوم کا ہم آہنگ ہے۔ چند شعر ملاحظہ کیجیے۔

ہم عشق کے ماروں کا اتنا ہی فسانہ ہے — رونے کو نہیں کوئی، ہنسنے کو زمانہ ہے
ساحل کے لبِ پوچھو، دریا کے دل سے پوچھو — اک موجِ تہِ نشیں کا مدت کے بعد ابھرنا
ہر ذرّہ آہ جس کا لبریز تشنگی ہے — اس خاک کی بھی جانب اے ابرِ تر گزرنا
پاسِ ادب سے چھپ نہ سکا رازِ حسن و عشق — جس جا تمہارا نام سنا سر جھکا دیا
کشورِ دل ہی میں گھٹ کر رہ گئیں — کیسی کیسی نازنیں شہزادیاں
تجھ کو گلشن کی قسم! چھیڑ نہ اے بادِ سحر — کھل گئیں غنچوں کی آنکھیں تو پریشاں ہوں گے
لٹا دے دولتِ کونین اور میرے لئے — بس اک تبسم عاجز نواز رہنے دے
وہ لاکھ سامنے ہوں مگر اس کا کیا علاج — دل مانتا نہیں کہ نظر کامیاب ہے
حاصلِ حسن و عشق اُسے سمجھو — وہ جو پہلی نگاہ ہوئی ہے
کوئی بڑھے نہ بڑھے ہم تو جان دیتے ہیں — پھر ان کی چشم توجہ ہوئی، ہوئی، نہ ہوئی!
دل کو کسی کا تابع فرمان بنائیے — دشواریٔ حیات کو آساں بنائیے
نگاہِ ناز کے پیہم اشارہ ہائے لطیف — شکستِ شیشۂ دل بار بار کیا کہنا!

فلسفۂ عالم

جگر عموماً ایک آزاد منش، متلون طبع اور عاشق مزاج شاعر کی حیثیت سے مشہور ہے اس کو ایک حکیم، مفکر اور فلسفی کے نام سے پکارنے والے بہت کم ہیں، بلکہ شاید کوئی نہیں لیکن اگر اس کی ادبیات کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا جائے تو ہم کو اس بحر میں بھی وہ موتی مل سکتے ہیں جن سے گوئٹے اور نیٹشے کے قصر سجے ہوئے ہیں اور جو غالب و اقبال کا طرۂ امتیاز ہیں۔

حکما، اور فلاسفہ کا مشہور نظریہ ہے کہ عالم نام ہی تبدیلی کا ہے۔ اگر تغیرّات کی راہ مسدود ہو جائے تو ہم اس کو دنیا نہیں کہہ سکتے۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال نے اسی خیال کو ادا کیا ہے :۔

سکون محال ہے قدرت کے کارخانے میں ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

لیکن طرز ادا یہاں فلسفیانہ ہے۔ شاعرانہ نہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ اسی حکیمانہ نکتہ کو اگر کوئی شاعر لکھے تو کس طرح ادا کرے گا یا بالفاظ دیگر جگرؔ کیوں کر اس فلسفیانہ بحث پر محاکمہ کرتا ہے۔ سُنیئے :۔

ہر لحظہ کہہ رہا ہے یہ انقلابِ فطرت یعنی جہاں ابھی تھی دنیا وہاں نہیں ہے

اس نظریہ کو پُراثر بنانے کے لئے درسِ عبرت دینا بھی جگرؔ کا کام ہے۔ چنانچہ لکھتا ہے۔

عالم جب ایک حال پہ قایم نہیں رہے کیا خاک اعتبارِ نگاہ و یقین رہے

حکما، و عقلا، اس بات کی بہت زور شور سے تائید کرتے ہیں کہ دنیا میں ہر بشر بلکہ ہر مخلوق کی حیات و ممات دوسری مخلوق کے وجود و فنا پر منحصر ہے۔ بالفاظِ دیگر اس عالم میں ایک مخلوق کی بقاء کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ دوسری کا وجود معدوم ہو جائے۔ جگرؔ بھی اس نظریہ کا مُوّید ہے :۔

کلی کوئی جہاں پر کھل رہی ہے وہیں اک پھول بھی مُرجھا رہا ہے

جمیعؔ مفکّرین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ دنیا میں ہر شے فنا ہونیوالی ہے۔ جگرؔ اس میں ایک تنبیہ کا اور اضافہ کر دیتا ہے تاکہ یہ قول مُوثر ثابت ہو :۔

آدمی نشۂ غفلت میں بھلا دیتا ہے ورنہ جو سانس ہے تعلیم فنا دیتا ہے

غرض اس طرح کے سینکڑوں بلکہ ہزاروں فلسفیانہ نکات اور حکیمانہ مسائل جگرؔ کے یہاں پائے جاتے ہیں لیکن نہایت افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ ابھی تک کسی نے ان کی جانب توجہ نہیں کی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ جگرؔ کو بھی غالبؔ کی طرح اس کے مرنے کے بعد حقیقی معنوں میں سمجھا جائے۔

مزاح بعض بعض جگہ جگرؔ کے یہاں مزاحیہ اشعار بھی پائے جاتے ہیں۔ لیکن ان کا بھی یہ حال ہے کہ

معلوم ہوتا ہے کسی غمگین ومحزون کے قلم سے نکلے ہیں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اگر آپ کسی افسردہ دل بشر سے مذاق کرنے کی فرمائش کیجئے تو وہ مصنوعی طور پر البتہ ہنسنے لگے گا حقیقی ہنسی ناممکن ہے۔ اور اس مصنوعی ہنسی میں بھی ایک درد کی کیفیت پائی جائے گی۔ یہی حال جگر کا ہے۔ اس کا مزاح بھی بالعموم دل کو تڑپا دیتا ہے۔ فرحت نہیں بخشتا۔ مثلاً۔

توبہ زاہد میں اور توبہ ٔ   مُفلسی وجہ پارسائی ہے

یقیں کرو جو تمہاری طرح سے ہم ہوتے   محبتوں کے خزانے لٹا دیا کرتے

کیا برابر کا محبت میں اثر ہوتا ہے   دل ادھر ہوتا ہے ظالم نہ ادھر ہوتا ہے

صبح ٹوٹے ہوئے دلوں کا نہ لے   تو یونہی دبان پان ہے پیا رے!

اعتراضات اگرچہ جگر کی استادی اور عظمت کا جتنا مجھے اعتراف ہے اتنا شاید بہت کم حضرات کو ہوگا لیکن انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ جس طرح میں نے اُس کے محاسن پر بالتفصیل روشنی ڈالی ہے اُس کے معائب کے اظہار سے بھی گریز نہ کروں۔ یہ معائب دو قسم کے ہیں معنوی ولسانی۔

اسقامِ معنوی اس کے تحت میں وہ تمام عیوب آجاتے ہیں جو مہملات اور حشو وزوائد کے نام سے تعبیر کئے جاتے ہیں۔

بعض اشعار ایسے ہیں جو "مجذوب کی صدا" سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے لیکن اُن کے متعلق جگر کا یہ کہنا فضول ہے کہ :- "اکثر غلطیوں کا مجھے احساس ہے بعض غلطیاں ایسی ہیں جنھیں میں نے دانستہ اختیار کیا ہے۔ بعض ایسی بھی ہیں کہ وہ خود اپنی جگہ محاسن ہیں" خیر! جو حقیقی معنوں میں غلطیاں ہیں انہیں ایک غیر جانبدار نقاد کبھی محاسن میں نہیں شمار کرسکتا۔ بہرحال وہ "نکاتِ حکیمانہ" یہ ہیں :-

۱۔ حال بھی ماورائے حال بھی ہے   عشق ممکن بھی ہے محال بھی ہے

۲۔ وہ بھی ہوتا ہے ایک وقت کہ جب   ماسوا ماسوا نہیں ہوتا

(ذرا "ماسوا ماسوا نہیں ہوتا" کے فلسفہ پر غور کیجئے اور اگر خوش اعتقادی ہو تو سر ہلائیے)

۳۔ کن کہتے ہی جلووں کی یہ کثرت نظر آئی   اللہ کو اللہ کی صورت نظر آئی

کم از کم میں تو بالکل نہیں سمجھ سکا کہ اگر "کن" کہہ دینے سے دنیا پیدا بھی ہوئی ہے تو پھر جلوؤں کی کثرت کیونکر نظر آئی۔ اور مزید براں یہ بلیغ مصرع کہ "اللہ کو اللہ کی صورت نظر آئی" سبحان ربی الاعلیٰ !!

اسی صنف کا ایک اور شعر سنئے جس میں بقولِ کسے "از اول تا آخر تصوف بھرا ہوا ہے" اور میرے نزدیک بتمامہ مہمل ہے:

۴۔ میں ہاں ہوں جہاں نہیں میں بھی — عالم و ماورائے عالم کیا

ایک دوسرا شعر ہے کہ

۵۔ ذرا تو آنکھ کھلے عقل میں شعور آئے — ہم اپنے آپے میں آئیں تو وہ ضرور آئے

ذرا کوئی پوچھے کہ عقل میں شعور کس طرح آتا ہے؟

۶۔ آج اس نظر نے دل سے کیا یوں معانقہ — سمجھا یہ میں کہ درد کو درماں بنا دیا

معانقہ بمعنی گلے ملنا۔ بھلا نظر نے دل سے کیونکر معانقہ کیا؟ اگر اختراعات کا یہی عالم رہا تو چشم و ابرو دل سے مصافحہ کیا کریں گی۔ زلفوں سے (اگر جدید فیشن کی ہوئیں) "شیک ہینڈ" کی نوبت آجائے گی۔

بعض مقامات پر "ارے توبہ" "معاذ اللہ" "ہے ہے" اس بے جا طریقہ سے استعمال کیا ہے کہ مذاقِ سلیم پر گراں گذرتا ہے مثلاً۔

ارے توبہ

کرشمہ سازئ حسنِ ازل ارے توبہ — مرا ہی آئینہ مجھ کو دکھا کے لوٹ لیا

نگاہِ شوق کی جذبِ کشش ارے توبہ — جس آئینہ پہ نظر کی ترا جواب ہوا

ستم ظریفئ حسنِ ازل ارے توبہ — وہ دل دیا کہ جسے قرب بھی عذاب ہوا

شباب اور مکمل شباب ارے توبہ — بہار اور مجسّم بہار کیا کہنا

کرم نما ستم نازِ حسن ارے توبہ — ستم نما کرم خاص یار کیا کہنا!

معاذ اللہ

گذارشِ دلِ غم آفریں معاذ اللہ — نگارشِ غم ہمت شکار کیا کہنا

تصادمِ نگہہ شوق ارے معاذ اللہ — تبسّمِ نگہہ فتنہ کار کیا کہنا۔

شروعِ راہِ محبت ارے معاذ اللہ   یہ حال ہے کہ قدم ڈگمگائے جاتے ہیں

ہے ہے مثلاً ایک شعر کافی ہے۔

وستِ آئینہ ساز کیا جانے   آئینہ کی نزاکتیں ہے ہے

اور شعلۂ طور میں اس ارے توبہ" "معاذ اللہ" اور "ہے ہے" کی وہ کثرت ہے کہ معاذ اللہ! مثالیں کافی دیدی گئیں۔ اگر اس طرح کے تمام اشعار نقل کر دیے جائیں تو مقالہ بہت طویل ہو جائیگا۔

ابتذال جگر کے یہاں بعض اشعار حد درجہ سوقیانہ ہیں مثلاً۔

ایک بوسہ اس لبِ جاں بخش کا   عمر بھر کے واسطے انعام ہے

یہ وہ ذہنیت ہے کہ یکہ چلانیوالوں ہی کو زیب دیتی ہے اور کم از کم ایک بلند پایہ شاعر کے مرتبہ سے فروتر ہے۔

ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

دیکھ لے تو بھی کہ اب خیر نہیں جانوں کی   آج ہولی ہے ترے سوختہ سامانوں کی

یہاں خیال میں سوقیت نہ سہی لیکن طرزِ ادا نے شعر کو مبتذل بنا دیا۔

بخوفِ تطویل صرف دو مثالیں پیش کی گئیں ورنہ جگر کے یہاں ایسے اشعار کی بھی کمی نہیں۔

لسانی غلطیاں مذکورۂ بالا اسقام کے علاوہ جگر کا کلام لسانی اغلاط سے بھی پاک نہیں۔ اور بعض بعض غلطیاں تو ایسی ہیں کہ انہیں جگر سے منسوب کرتے ہوئے جھجک محسوس ہوتی ہے۔

یہ غلطیاں دو قسم کی ہیں۔ ایک تو وہ جو جگر نے عربی و فارسی سے کامل واقفیت نہ ہونے کی وجہ سے کی ہیں جیسے:۔

۱۔ میں نہیں بسملِ خیّام جگر   حافظِ خوش کلام نے مارا

یہاں خیام بروزن ہزار نظم کیا ہے حالانکہ صحیح لفظ خیّام بروزنِ جلّاد ہے۔

۲۔ بہار اپنی جگہ پر سدا بہار رہے   یہ چاہتا ہے تو تجزیہ بہار نہ کر

یہاں تجزیہ بتشدید یا نظم کیا ہے۔ لیکن یہ غلط ہے۔ صحیح لفظ تجزیہ بروزن تحلیہ بتخفیف یا ہے۔

۳۔ جن پہ نازل ہوا قرآن سا کامل مصحف — جن کے تابع جن و انسان بھی ملائک کی بھی صف

یہاں "جن" بتخفیفِ نون منظوم کیا گیا ہے درآنحالیکہ جنّ بتشدیدِ نون ہونا چاہئے۔ اگر یہ کہا جائے کہ نہیں، اُردو میں اسی طرح بولا جاتا ہے تو سوال یہ ہے کہ اُردو کے مروّجہ غلط الفاظ کو بترکیبِ فارسی یعنی "جن و انسان" لکھنا کہاں تک درست ہے۔

اغلاط کی دوسری قسم وہ ہے جو اُردو کے روزمرّہ کے خلاف ہیں اور جن کے متعلق بعض جگہ جگرؔ صاحب فرما دیتے ہیں کہ "یہ ایک اجتہاد ہے جسے رائج ہونا چاہئے"۔ چونکہ ابھی رائج نہیں، لہذا ہم غلطیوں ہی میں شمار کرینگے۔ ہاں اگر رائج ہو جائے تو جگرؔ صاحب کو اختیار ہے۔ بعض مثالیں درج کی جاتی ہیں۔

۱۔ جدھر سے حُسن کا ایک گوشۂ نقاب اُٹھا — تمام ذرّے پکار اٹھے آفتاب اُٹھا

یہاں اعتراض یہ ہے کہ آفتاب طلوع ہوتا ہے۔ نکلتا ہے۔ "آفتاب اٹھا" کوئی نہیں کہتا۔

۲۔ تونے ٹانکے جو دئے تھے وہ مگر ٹوٹ گئے — آج پھر خون ہر اک زخمِ جگر دیتا ہے

"خون دینا" غیر مستند ہے۔

۳۔ وہ ہم ہیں اہلِ محبّت کہ جان سی دل سے — بہت بخار اٹھے آنکھ شبنمی نہ ہوئی

"شبنم آلودہ" کے لئے "شبنمی" کم از کم میری نظر سے تو گذرا نہیں۔

۴۔ آدمی نشۂ غفلت میں بھلا دیتا ہے — ورنہ جو سانس ہے تعلیم فنا دیتا ہے

اہلِ دہلی اور اہلِ لکھنؤ دونوں کے نزدیک سانس مونث ہے، مذکر نہیں۔

ظفر دہلوی:۔ ہمیشہ چُپ ہی رہے ہم کبھی جو ٹھنڈی سانس — بھری بھی ہم نے تو ہو کر کے تنگ جان بھری

نسیم لکھنوی:۔ واں پھانس چبھی ہے اس کو غم کی — یاں سانس نہیں ہے ایک دم کی

منزلِ عشق ہے خدا کی پناہ — ہر قدم کربلائیاں توبہ

لطفِ بیگانگی معاذاللہ — اس کی سادہ ادائیاں توبہ

اب کہاں ویسی جنوں آرائیاں نہیں نکہتیں قیس کی لیلائیاں

"کربلائیاں" "سادہ ادائیاں" "لیلائیاں" وغیرہم جگر بکثرت استعمال کرتے ہیں۔ یہ الفاظ وتراکیب نہ صرف غلط ہیں بلکہ طبیعت پر ناگوار گذرتی ہیں۔

ان کے علاوہ بعض اسقام جگر کی شاعری میں ایسے ہیں جو گو اصولاً اسقام نہیں لیکن بتقاضائے زمانہ وہ عیوب ہی میں شمار کئے جائیں گے۔ مثلاً بعض غزلیں اسقدر سنگلاخ اور طویل زمینوں میں کہی ہیں کہ عصر حاضرہ میں تو درکنار، غالب و مومن کے زمانہ سے ایسی زمینوں میں شعر کہنا فضول اور "کوہ کندن وکاہ برآوردن" سے زیادہ نہیں متصور کیا جاتا۔ مثلاً

وہ کافر آشنا نا آشنا یوں بھی ہے اور یوں بھی ہماری ابتدا تا انتہا یوں بھی ہے اور یوں بھی

عشق کا ہاتھ سے دامان نہ جانے پائے جان جائے مگر ایمان نہ جانے پائے

جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان ردیفوں کی غزلیں بالکل بے نمک اور پھیکی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شیخ ناسخ یا شاہ نصیر کا کلام پڑھ رہے ہیں۔

لیکن بایں ہمہ جگر کی استادی میں کلام نہیں۔ اس قسم کی لغزشوں سے کسی شاعر کا کلام خالی نہیں۔ جگر صحیح معنوں میں شاعر ہے۔ اس کا کلام اس کی زندگی کی روداد ہے۔ اس پر یہ قرآنی اعتراض نہیں وارد ہوتا کہ "انھم یقولون مالا یفعلون" اس کے برخلاف اُس کے قول و فعل میں سراسر تطابق ہے۔ تضاد نہیں۔ شاید یہ شعر جگر ہی کی نسبت کہا گیا ہو گا کہ

اراكَ تفعلُ ما تقولُ وَبعضهُم مَذقُ اللسان یقولُ ما لا یَفعَلُ

(میں نے تجھ کو ایسا پایا کہ تو جو کہتا ہے وہ کرتا ہے۔ برخلاف اس کے بعض دوسرے شعرا باتونی اور فضول گو ہیں۔ کیونکہ اُن کے قول و فعل میں مطابقت نہیں)

علاوہ ازیں جیسا کہ پیشتر عرض کیا گیا ہے۔ اس کے محاسن اس کے لئے مختص ہیں اور

فی الحقیقت یہ بہت بڑی خوبی ہے کہ دنیا سے علیحدہ اپنے لئے ایک جدا اور ساتھ ہی ساتھ مستحسن شاہراہ قایم کرلی جائے حقیقی شاعر کا یہی مفہوم ہے۔ اُردو میں ذوقؔ و ناسخؔ جیسے شعرا کی کمی نہیں لیکن میرؔ و مومنؔ غالبؔ و انیسؔ اور اقبالؔ و جوشؔ کی مثالیں مفقود نہیں تو کمیاب ضرور ہیں۔ یہی حال جگرؔ کا ہے۔ اس کا بھی ایک خاص رنگ ہے۔ جس میں وہ پوری طرح کامیاب ہے شعر کو پڑھتے ہی آپ پکار اٹھیں گے کہ یہ جگرؔ کا ہی اس کی شاعری طبیعت کے زور سے ہے نہ کہ محض علم و اکتساب کی مدد سے۔

مُرغانِ خوش آہنگ اند در باغِ سخن لیکن
نالیدنِ ایں بُلبُل شورِ دِگرے دارد

غزل

(محمد جمیل الرحمن جمیلؔ موتیہاروی متعلم مسلم یونیورسٹی)

کوئی اپنا نہ رہا۔ کوئی یگانہ نہ رہا — نہ رہا ہائے کہیں اپنا ٹھکانہ نہ رہا
پوچھتا کیا ہے میرا حال قفس میں ہمدم — اپنی دنیا نہ رہی۔ اپنا زمانہ نہ رہا
میرے صیاد! قفس چھوڑ کے اب جاوں کہاں؟ — آشیاں جب سے جلا۔ کوئی ٹھکانہ نہ رہا
نزع کے وقت وہ آئے ہیں عیادت کے لئے — ہائے مرنے کا بھی اب کوئی بہانہ نہ رہا
آشیاں جان کے بجلی نے قفس پھونکدیا — اِس ٹھکانے کا بھی اب کوئی ٹھکانہ نہ رہا
یا میں رودادِ جنوں کہنے کے قابل ہی نہیں — یا سنانے ہی کے لایق یہ فسانہ نہ رہا

وہ بھی دن تھے کہ رہا کرتے تھے پھولوں میں جمیلؔ
یہ بھی دن ہیں کہ قفس میں بھی ٹھکانہ نہ رہا

غزل

(از جناب کیفی چڑیاکوٹی)

عجب نہیں ہے، دو عالم سے ہو بلند خروش
کہ دل کو جوش اُدھر ہے، زباں اِدھر خاموش

اُٹھا ہے آج کوئی میکدہ لٹانے کو
بدست جام، نظر ہر طرف، سبو بردوش

تو مجھ پہ ٹوٹ پڑ، اے آسمانِ جوشِ شباب!
کہ آنکھ بند کئے ہے کھلا ہوا آغوش

زمیں پہ مجھ کو ٹھکانا کہیں نہیں ملتا
میں پھر رہا ہوں زمانے میں آسماں بردوش

قبول کیوں نہیں کرتا مری غلامی کو؟
تمام کون و مکاں ہیں جو تیرے حلقہ بگوش

کمال عشق کا، اب اس مقام پر پہونچا
جہاں خرد ہے تغافل جہاں جنوں ہے ہوش

کوئی بتائے! دل و دیں کہاں سے لائے گا؟
وہ جس کو لوٹ چکی ہے نگاہِ بادہ فروش

الٰہی! خدمتِ ساقی میں، یہ بھی دن ہوگا؟
کہ جب کہوں میں کہ "بادہ" کہے وہ مجھ سے "بنوش"

سکون دل کو نہیں ہے، نظر کو تاب نہیں
کسی کا حسن ہے پردے میں برق کے روپوش

نہیں جو کیفیؔ بیخود کو، ذوقِ تشنہ لبی
پڑا ہوا ہے درِ میکدہ پہ کیوں بیہوش؟

ہندی صنعت اور انگریزی راج

(ظفر احمد صدیقی سیوانی بی،اے علیگ)

اہلِ یورپ اور یورپ پسند جماعت ہندوستان کے حق میں کتنا ہی زہر اُگلے اپنے جھوٹے نگینوں کی نمائش سے آنکھوں کو دھوکا دیکرُن کی تہذیب وتمدن کو کتنا ہی بُرا کہے۔ مگر تاریخ شاہد ہے کہ جب تمام یورپ محض یورپ ہی نہیں بلکہ وہ تمام ممالک اور اقوام جو آج مہذب ہونیکی ڈینگ مارتی ہیں۔ جن کو آج اپنی تہذیب، تمدن اور ترقی پر ناز ہے۔ قعرِ ذلت میں تھیں۔ اس وقت ہندوستان کو اپنی ترقی پر ناز تھا۔ اور کیوں نہ ہوتا۔ تہذیب و تمدن۔ صنعت و حرفت علم و فضل اور وہ تمام چیزیں جو ایک متمدن ملک کے لئے ضروری ہیں یہاں موجود تھیں۔

مگر افسوس وہی ہندوستان آج مفلس و نادار ہے۔ دنیا کے بدترین غیر متمدن اور غیر مہذب ملکوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ یورپ نے جس طرح ہماری تہذیب وتمدن کا خاتمہ کر دیا۔ اسی طرح ہماری تمام صنعت، دستکاری اور ہماری تمام تجارت اس کی فسوں کاریوں اور عیاریوں کی نذر ہوگئی۔ بڑا رونا تو اس بات کا ہے کہ یہ تمام چیزیں کھو کر بھی ہم خواب گراں سے بیدار نہیں ہوئے۔ نئی تہذیب اور یورپ کی جادوگری نے ہمیں ایسا بیخود کر دیا ہے کہ ہم اپنی ذلت کو عزت انتزل کو ترقی۔ پستی کو بلندی سمجھنے لگے ہیں۔ ہم اب بھی گیت گاتے ہیں کہ یورپ نے ہمیں متمدن بنادیا ہے۔ ہماری صنعت۔ دستکاری اور تجارت کو اعلیٰ پیمانے پر پہونچا دیا ہے۔

اس مختصر سی بحث میں یہ مناسب نہیں کہ اپنی پرانی تہذیب اور تمدن کا رونا رویا جائے بہتر ہے کہ ہندوستان کی سابق اور موجودہ صنعت و حرفت اور تجارت کا جائزہ لیں اور دیکھیں کہ ہم نے کہاں تک ترقی یا تنزل کیا ہے۔

ہندوستان کی قدیم صنعت، دستکاری اور تجارت کی داستان بہت طویل ہے۔ مجملاً یہ کہ جب موجودہ تمدن، صنعت اور تجارت کا علمبردار یورپ تاریکی میں تھا۔ اس وقت ہندوستان کی صناعی و دستکاری

کا ڈنکا چار دانگ عالم میں بج رہا تھا۔ خصوصاً ڈھاکہ کی ململ، اونی شال، زربفت، کمخواب، تافتہ بافتہ اور ہاتھ کی بنی ہوئی دیگر نازک چیزوں کو عالمگیر شہرت حاصل تھی۔ اس قدیم زمانہ میں اہلِ ہند کے تعلقات مصر و ایران روم و دیگر ممالک سے مستحکم ہو چکے تھے۔ اہلِ روم و یونانی ڈھاکہ کی ململ کے بہت دلدادہ تھے، یونان میں ململ کو گنجیٹکا Gangetika کہا جاتا تھا۔[1]

سر جارج برڈووڈ اپنی کتاب موسومہ "ہندوستان کے کارنامے" میں ڈھاکہ کی ململ کے متعلق لکھتے ہیں "کپڑوں میں اول نمبر ڈھاکہ کی ململ کو دیا جاتا ہے۔ آبِ رواں، بافتہ شبنم یہ سب سادے کپڑے ہوتے ہیں۔ ان شاعرانہ ناموں ہی سے ان کی انتہائی نفاست کا پتہ چلتا ہے۔ اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ عام طور پر کتنے مرغوب تھے۔

سترھویں صدی عیسوی میں مشہور فرانسیسی سیاح ٹریورنیر ہندوستان آیا تھا۔ ململ کی نفاست کے متعلق اس کی رائے قابلِ غور ہے۔ وہ لکھتا ہے "کہ محمد علی جب ہندوستان کی سفارت سے ایران واپس آیا۔ تو اس نے جا سیف ثانی کی خدمت میں ایک ناریل پیش کیا۔ یہ ناریل شتر مرغ کے انڈے کے برابر تھا اور اس پر موتی جڑے ہوئے تھے۔ کھولنے سے اس میں ایک تھان برآمد ہوا۔ یہ تھان ساٹھ ہاتھ لمبا تھا اور کپڑا اتنا نفیس تھا کہ ہاتھوں کو محسوس نہیں ہوتا تھا۔ کیوں کہ وہ لوگ اتنا باریک سوت کاتتے تھے کہ بمشکل نظر آتا تھا۔

حیرت اور استعجاب کی کوئی انتہا نہیں رہتی جب ہم مصری ممی کو جسے تقریباً چار ہزار سال کا عرصہ ہوا ڈھاکہ کے نفیس ململ میں لپٹا ہوا پاتے ہیں۔[2] مگر استعجاب محض اس وجہ سے ہے کہ ہم اپنی قدیم صنعت و دستکاری سے واقف نہیں ورنہ یہ تو اس کی ترقی کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے۔

Industrial commission 1918 [1]

Indian Economics – J B Jathar & S.G. Beri Vol I – p 131 [2]

Indian Economics. J. B. Jathar & S. G Beri [3] ملاحظہ ہو صفحہ ۲۵۹

اگر دوسرا کرشمہ دیکھنا ہو تو دہلی جا کر اشوک کی لاٹ کو جسے تقریباً ۲۲ سو سال کا عرصہ ہوا دیکھئے۔ کیا مغرب کی کوئی قوم اس کی نظیر پیش کر سکتی ہے۔ نہیں ہرگز نہیں۔ اس وقت اہل مغرب کو لوہے کا پگھلانا ہی معلوم نہ تھا۔

ہندوستان محض صنعت ہی کے لئے مشہور نہیں تھا۔ بلکہ حضرت عیسٰیؑ سے پانچ چھ سو سال قبل ہندوستانی اچھے جہاز راں تھے۔ منوسمرتی کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اہل ہند اسوقت جہاز سازی اور جہاز رانی میں مشاق تھے[1]۔

Periplus of the Erythraean Sea[2] کا مورخ شاہد ہے کہ زمانہ قدیم میں ہندوستانی جہاز بحر ہند، بحر قلزم اور بحیرہ عرب وغیرہ میں چکر لگایا کرتے تھے۔

ہند کی صنعت اور دستکاری کا عروج اسلامی حکومت تک رہا۔ عہد مغلیہ میں ڈھاکہ، لکھنؤ، احمد آباد، ناگپور، مدورا سوتی کپڑوں کے مرکز تھے۔ جہانگیر کے زمانہ میں ڈھاکہ میں ۱۵ گز لمبا اور ایک گز چوڑا ململ کا تھان تیار ہوتا تھا جس کا وزن ۹۰۰ گرین یعنی تقریباً ۲ ۱/۲ چھٹانک ہوتا تھا۔ اور قیمت ۴۰ پونڈ۔ اب ویسے بہترین ململ کے تھان کا وزن ۱۶۰۰ گرین تقریباً ۵ چھٹانک سے کم نہیں ہوتا اور دس پونڈ میں ملتا ہے۔

عہد مغلیہ میں ململ کی خوبی کا ایک معیار تو یہ تھا کہ ۲۰ گز لمبا اور ایک گز چوڑا ململ کا پورا تھان چھلے میں سے نکل جائے اور دوسرا معیار یہ تھا کہ لمبائی اور چوڑائی کی نسبت سے اس کا وزن کتنا کم ہے اور دھاگوں کی تعداد کتنی ہے۔

کشمیری شال جس کے کارخانے صرف کشمیر ہی میں محدود نہ تھے بلکہ پنجاب میں بھی پائے جاتے تھے اسوقت تمام عالم میں مشہور تھے۔ ایک طرف راجپوتانہ کو سنگین نقوش اور جواہرات کی پچی کاری پر ناز تھا۔ دوسری

---

[1] منوسمرتی مصنفہ منوجی

[2] یہ ایک قدیم یونانی کتاب ہے۔ کتاب پر مورخ کا نام نہیں ہے۔ بحر ہند کو اس زمانہ میں یونانی زبان میں Erythraean Sea کہتے تھے۔ Vide Indian Economics by Bannerji

طرف زربفت کمخواب، تافتہ اور بافتہ میں لکھنؤ اور دہلی انوکھی شان رکھتے تھے۔ بنارس۔ ناسک۔ پونا اور احمد آباد وغیرہ تانبہ پیتل اور پھول کے برتن بنانے میں ممتاز تھے۔

مشہور انگریزی شاعر سر والٹر اسکاٹ بھی اپنی نظم "لاسٹ منسٹرل" میں "آگرے کے ریشمین کرگھے" کے گیت گاتا ہے۔

جہاز سازی کے کارخانے بھی قابل رشک تھے۔ ہندوستان اسوقت عراق۔ عرب۔ ایران اور دیگر ممالک کو سوتی اور ریشمی کپڑے اور دیگر تیار شدہ مال مہیا کیا کرتا تھا۔

میرا یہاں یہ مقصد نہیں کہ اسلامی حکومت کے محاسن بیان کروں یا انگریزی حکومت اور اسلامی حکومت کا موازنہ کروں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کا مقصد ہندوستان کو لوٹنا نہیں تھا اور نہ ان کا مطمح نظر تجارت سے نفع اٹھانا تھا۔ ان کا مقصد حکومت کرنا تھا انھوں نے ہندوستان ہی کو اپنا وطن بنایا اور مادر ہند کے سچے سپوت کی حیثیت سے صنعت و حرفت۔ تہذیب و تمدن کو ترقی دینے میں سر مو کوتاہی نہیں کی۔ ہندوستان اسلامی دور میں مسلم حکمرانوں کے ہاتھوں اقتصادی تباہی کا شکار نہیں ہوا۔ بلکہ ان کی سرپرستی میں تمام علوم و فنون اور صنعتیں سرسبز ہو رہی تھیں[1]۔ چودھری مختار سنگھ پر مسلم پرستی کا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ وہ لکھتے ہیں "کہ جب مسلمان یہاں حکومت قائم کر لیتے تھے تو یہیں کے لوگوں میں مل جایا کرتے تھے اور بڑی حد تک یہیں کی زبان اور یہیں کے رسم و رواج اختیار کر لیتے تھے۔ وہ ان کی شادی و غم میں برابر کے شریک ہوتے تھے اور صرف ایک مذہب کے اختلاف کے علاوہ یہاں کے باشندوں کے ساتھ شیر و شکر ہو جایا کرتے تھے اور اپنے طور پر وہ کوشش کرتے تھے کہ ملک کی صنعت و حرفت کو ترقی دیں"۔

انگریز اس ملک میں تاجر کی حیثیت سے آئے ان کا خاص مقصد تجارت سے نفع اٹھانا تھا روپیہ اور صرف روپیہ

---

[1] کیسان (مصنفہ چودھری مختار سنگھ و مترجمہ محمود علی خانصاحب)

انھیں ہندوستان کی سرزمین تک کھینچ لایا۔ اس وسیع ملک کے باشندوں سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ بحیثیت تاجر کے انھوں نے یہاں کے امراء و حکمراں میں رسوخ پیدا کرنے کی کوشش کی آہستہ آہستہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہدہ داروں کا اقتدار بڑھتا گیا۔ مرکزی اقتدار ختم ہو چکا تھا۔ سلطنت مغلیہ کا آخری چراغ جھلملا رہا تھا مخالف قوتیں حکومت کا شیرازہ بکھیرنے کے لئے تیار تھیں۔ موقع کو غنیمت پا کر مختلف اقوام نے ملک پر دست درازی شروع کردی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی سب پر غالب آئی اور حاکم اور تاجر کی ایک معجون مرکب تیار ہو گئی۔

حکومت کا ہاتھ سے جانا تھا کہ صنعت و دستکاری کو زوال شروع ہوا۔ اب بجائے مسلمان حکمرانوں کے کہ جن کے سایہ عاطفت میں صنعت و دستکاری ترقی پا رہی تھیں انگریز حکام اور یورپ پسند ہندوستانی برسر اقتدار ہوئے۔ صنعت کی سرپرستی تو کون کرتا اس کے وجود کے بھی لالے پڑ گئے ؎

وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا وہ باغ ہی نہ رہا جس پہ ناز تھا اس کو

انگریز فطرتاً تاجر تھے۔ ان کے ہر عمل اور فعل میں روپیہ کمانے کا جذبہ پوشیدہ تھا انھوں نے خواہ لڑائیاں لڑیں یا جائدادیں لیں یا ملک میں شاہی اختیارات حاصل کئے سب کچھ صرف روپیہ کمانے کے لئے کیا۔ ایک ہندی کہاوت ہے "بنیا حاکم غضب خدا" یعنی اگر تاجر حکمراں ہو جائے تو سخت مصیبت اور تباہی کا سامنا ہوتا ہے۔ ایک حاکم کا مفاد تاجر سے بالکل جدا ہے۔ تاجر محض نفع حاصل کرنا چاہتا ہے۔ لیکن حاکم کا فرض رعایا کی حفاظت کرنا ہے۔ نفع طلبی اور حفاظت دو متضاد چیزیں ہیں۔ ان کا کبھی ساتھ نہیں ہو سکتا۔ اگر نفع کا طالب خود حاکم بھی ہو جائے تو پھر اقتصادی لوٹ ہی کا دور دورہ ہوتا ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ماتحت ہندوستان کی بھی یہی درگت ہوئی۔

حاکم ہونے سے قبل اہل برطانیہ ہندوستانی تیار شدہ مال یعنی ململ۔ سوتی اور ریشمی کپڑے اور دوسری چیزیں استعمال کیا کرتے تھے۔ مگر افسوس حکومت پاتے ہی ان پر خود غرضی کا بھوت سوار ہوا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اور برٹش پارلیمنٹ نے متحد ہو کر ارادہ کر لیا کہ انگریزی صنعت و تجارت کو ترقی دی جائے۔ چنانچہ ہندوستانی

تیارشدہ مال پر ۳۰ فی صدی سے لیکر ۸۰ فیصدی تک ڈیوٹی لگادی گئی۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اکثر چیزوں کا بیچنا ہی جرم قرار دیا گیا۔ برخلاف اس کے انگریزی تیارشدہ مال بغیر کسی معقول ڈیوٹی کے ہندوستان میں داخل ہوسکتا تھا۔

مسٹر براؤن ۱۸۲۲ء میں "برطانوی ہند کی تجارت" پر لکھتے ہیں کہ "ہندوستانی کاریگروں کی عام تباہی اور برطانیہ کو جانیوالے سامان کی کمی کا سبب ہمارے شہنشاہ کا وہ عجیب وغریب فرمان ہے جو اس سے قبل کبھی نافذ نہیں ہوا تھا۔ اس حکم کی روسے رعایا کے بنائے ہوئے کپڑے کی درآمد قطعی بند کردی گئی" قربان جائیے اس عیاری کے کہ ہندوستانی تیارشدہ مال پر تو سخت ڈیوٹی لگادی مگر خام پیداوار کے استقبال کے لئے ہر ممکن طریقہ اختیار کیا گیا۔ یعنی خام پیداوار بغیر کسی ڈیوٹی اور ممانعت کے برطانیہ میں داخل ہوسکتی تھی۔ الغرض ہندوستان مجبور کیا گیا کہ غیر تیارشدہ مال کم قیمت پر بیچے اور تیارشدہ مال زیادہ قیمت پر خریدے ظاہر ہے اس عیاری سے ہندوستان کی اقتصادی حالت پر کیا اثر ہوا ہوگا۔ بڑا غضب یہ ہوا کہ لاکھوں صناع اور دستکار بے روزگار ہوگئے۔

محض اتنا ہی نہیں بلکہ بہت سے کارخانے کمپنی اور دیگر یورپ والوں کے سرمایہ سے ہندوستان میں قائم کردیئے گئے۔ اس پر ستم ظریفی یہ کہ ہندوستانی صناع اور دستکار مجبور کئے جاتے تھے کہ وہ کمپنی کے کارخانوں میں کام کریں۔ الغرض حتی الامکان کوشش کی گئی کہ ہند کی قدیم صنعت اور دستکاری کو ختم کردیا جائے تاکہ اہل یورپ بالعموم اور کمپنی کے ہندوستانی کارخانے بالخصوص نفع حاصل کرسکیں۔ ان عیاریوں کی بدولت انگلستان آزاد تاجر بن سکا ہے۔ ان حالات کے بعد ہندوستان میں تجارت کی آزادی کی تلقین کرنا زخم پر نمک پاشی کرنا نہیں تو اور کیا ہے۔

ہند کی قدیم لاوارث صنعت مقابلہ کی تاب نہ لاسکی۔ بالآخر اغیار کے ہاتھوں نیست ونابود ہوگئی صناع اور دستکاروں کے لئے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ بھی کاشتکاری کو ذریعہ معاش بنائیں۔

Indian Economics by J B. Jathar and S. A. Beri, Volume I. ط

زمین پر بار پہلے ہی بہت زیادہ تھا۔ جوں جوں صنعت اور دستکاری کو زوال ہوتا گیا بار اور بھی بڑھتا گیا۔ مندرجہ ذیل گوشوارہ کے دیکھنے سے معلوم ہو جائیگا کہ پچاس سال کے قلیل عرصہ میں ۲۴ فی صدی سے زاید کا اضافہ ہو گیا۔

سنہ	کاشتکاری پیشہ
۱۸۸۱ء	۵۰ فی صدی
۱۸۹۱ء	۶۱٫۶ "
۱۹۰۱ء	۶۶٫۵ "
۱۹۱۱ء	۶۸٫۹ "
۱۹۲۱ء	۷۱٫۶ "
۱۹۳۱ء	۷۲٫۳ "

وہ ہاتھ جو کسی زمانہ میں ایسی نفیس اور نازک چیزیں تیار کرتے تھے کہ انھیں دیکھ کر بیرونی کاریگر دنگ رہ جاتے تھے۔ رشک کرتے تھے لیکن نقل نہ کر سکتے تھے۔ آج جہاں دیکھئے کھیتوں پر۔ ریلوے لائنوں پر نہروں کے کنارے ان میں کھرپے اور پھاوڑے نظر آتے ہیں کروڑوں کو کپڑا نصیب نہیں لاکھوں بھوکوں مرتے ہیں۔

آج ہمیں یہ کہہ کر بھلایا جاتا ہے کہ مشینری۔ حسن انتظام۔ سائنس۔ ریلوے۔ ٹیلیفون اور جہاز رانی وغیرہ کی برکت سے ہندوستان نے تجارت میں عظیم الشان ترقی کی ہے۔ بیشک اشیائے درآمد اور برآمد کی قیمتوں کا نقشہ دیکھکر ہماری آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ مگر جب ہم یہ غور کرتے ہیں کہ اچھا اس ترقی سے ہندوستانیوں کو کیا فائدہ ہوتا ہے تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ سوتی کارخانوں کو چھوڑ کر ہندوستان کے تمام بڑے کارخانے یعنی جوٹ کارخانے لوہے کی صنعت۔ اونی کارخانے سونے کی کانیں۔ چار قہوہ اور مٹی کے تیل کی تجارت یہ ساری چیزیں اغیار کے ہاتھوں میں ہیں۔ ان میں یورپ والوں کا سرمایہ ہے اور ان تمام چیزوں کا نفع براہ راست یورپ چلا جاتا ہے —

میں اس کا قائل نہیں کہ بیرونی سرمایہ کو قطعاً ممنوع قرار دیا جائے۔ اکثر سلطنتوں نے ممالک غیر سے قرض لیکر اپنی تجارت اور صنعت و حرفت کو ترقی دی ہے۔ بیشک اگر بیرونی سرمایہ داروں کا مقصد اقتصادی لوٹ نہیں بلکہ محض جائز نفع طلبی ہے تو ایسا سرمایہ لعنت نہیں بلکہ اکثر ضروریات کے وقت رحمت ثابت ہوتا ہے اور سے وہ ملک جس کو ترقی پذیر ہونے کے لئے روپیہ درکار ہے بخوشی خاطر ایسے سرمایہ کا خیر مقدم کریگا۔

مگر افسوس ہندوستان کو بیرونی سرمایہ سے کچھ نفع نہیں ہوتا۔ اہل یورپ محض جائز نفع پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ اپنے کو ملک کا حاکم و مالک سمجھ کر ہر دم اسی کوشش میں رہتے ہیں کہ کسی نہ کسی صورت سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں۔ ان کو ملک کی آئندہ بہبودی کا قطعاً خیال نہیں۔

اہل ہند غلام ہیں۔ بھلا ان کو اس کا استحقاق تو کہاں کہ مادر وطن کے قدرتی ذخیرے کی آمدنی سے کچھ حصہ طلب کریں۔ اتنا بھی گوارہ نہیں کہ ان کو کارخانوں میں اچھی ملازمتیں ہی دیدی جائیں۔ تقریباً تمام اچھے عہدہ دار ڈائرکٹر اور منیجر سب یورپ سے آتے ہیں۔ بجز اس کے کہ چند ہندوستانی ان کارخانوں میں بطور قلی اور مزدوروں کے نوکر رکھ لئے جائیں ان عظیم الشان کارخانوں سے کوئی نفع نہیں ہوتا۔

جب تک ہندوستان کی تجارت ہندوستانیوں کے ہاتھ میں رہی اس وقت تک عدم مداخلت کا رویہ اختیار کیا گیا ہند کی تجارت کی قطعاً حفاظت نہیں کی گئی۔ ممالک غیر کا مال بغیر کسی ڈیوٹی اور ممانعت کے ہندوستانی بازاروں میں آزادی کے ساتھ فروخت ہو سکتا تھا۔ مگر جب یوروپین کارخانے ہندوستان میں قائم ہو گئے اور ہند کی قدیم لاوارث صنعت نیست و نابود ہو گئی۔ اس وقت گورنمنٹ کو احساس ہوا کہ تجارت کی حفاظت کرنا چاہیئے اور ممالک غیر کے مال پر ڈیوٹی لگا دینا چاہیئے۔

"ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا"

چنانچہ ~~ ~~ تارف بورڈ قایم کیا گیا۔ معصوم ہندوستانیوں کو یہ کہکر بھلایا گیا کہ اس سے ہندوستانی تجارت کی حفاظت ہوگی اور حکومت ہند کی آمدنی بڑھے گی۔ اس میں شک نہیں کہ حکومت کی آمدنی میں کچھ اضافہ ہوا۔ مگر بھولے ہندوستانیوں کو کیا معلوم کہ یہ سب ڈیوٹی غریب خریداروں کو ادا کرنا ہوتی ہے۔

البتہ یورپین کارخانوں اور ہند کے چند دولت مند لوگوں کو اس رویہ سے کافی فائدہ ہوتا ہے۔

سب سے زیادہ مضحکہ انگیز چیز اوٹاوہ پیکٹ ہے۔ جو سلطنت اور اس کی نوآبادیات کے درمیان قرار پایا تھا۔ "کہا جاتا ہے کہ بلی اور چوہے کا کوئی معاہدہ اگر کمزور فریق کے لیے کسی صورت میں مفید ہو سکتا ہے تو حکومت انگلستان اور حکومت ہند کا یہ معاہدہ ہندوستان کے حق میں بھی مفید ہو سکتا ہے۔"

"پچھلے ڈیڑھ سو سال کی معاشی تاریخ نے اہل ہند کو عام طور پر اس قدر بدگمان کر دیا ہے کہ جو لوگ اوٹاوہ کے تجارتی معاہدات کی پیچیدگیوں کو نہیں سمجھ سکتے وہ بھی اس معاہدے کو شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں۔

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

شاہی ترجیح کا سوال تقریباً ۵۰ سال سے ریاستہائے برطانیہ کے پیش نظر رہا اکثر کانفرنسیں ہوئیں۔ بہت سی نوآبادیات نے اس کا خیر مقدم کیا۔ مگر ہندوستانیوں نے کبھی بھی اطمینان ظاہر نہیں کیا کہ "بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی" بالاخر یہ بلا ہندوستان کے سر بھی ڈال دی گئی۔ ۱۹۳۲ء میں اوٹاوہ میں کانفرنس ہوئی ہر نوآبادی کے نمایندے کانفرنس میں شریک ہوئے۔" ہندوستان بھی پانچویں سواروں میں شامل ہوا فرق صرف یہ تھا کہ کنیڈا۔ آسٹریلیا۔ افریقہ اور نیوزی لینڈ کی خود مختار نوآبادیات نے اپنے اپنے نمائندے خود مقرر کئے تھے اور ہندوستان کے نمائندے وزیر ہند نے مقرر کئے تھے۔"

ہمارے نمائندگان میں سر آتول چیٹرجی۔ سر چٹی۔ حاجی عبداللہ ہارون اور سر جارج رینی تھے ان لوگوں کی قابلیت میں کون شبہ کر سکتا ہے۔ وطن کا احساس ہو یا نہ ہو مگر حکومت کے معتمد تھے۔ چنانچہ سب نے وزیر ہند کی رائے کی تائید کی۔ غرضیکہ حکومت انگلستان کی خواہش کے مطابق کانفرنس کامیاب ہوئی اور اوٹاوہ پیکٹ منظور ہوا۔ اس معاہدہ میں یہ قرار پایا کہ ہندوستان میں انگریزی مال پر دس فیصدی کے حساب سے ڈیوٹی میں رعایت کیجائے اس کے عوض میں برطانیہ ہندوستان کے مال پر دس فیصدی کے حساب سے ڈیوٹی میں رعایت کرے گا۔ بظاہر تو یہ معاہدہ بہت اچھا معلوم ہوتا ہے لیکن اگر غور کیا جائے

تو آنکھیں کھل جاتی ہیں۔

ہندوستان کی برآمد میں انگلستان کا حصہ ۳۰ فیصدی سے زیادہ نہیں اس میں بیشتر مال تو ایسا ہے کہ جس کی تجارت پر ہندوستان کا کامل قبضہ ہے مثلاً جوٹ۔ ایسے مال پر کسی قسم کی رعایت کی ضرورت نہیں اس کے علاوہ یہاں سے زیادہ تر کچا سامان مثلاً تلہن غلّہ اور روئی وغیرہ باہر کو جاتی ہے۔ جن کی مانگ دنیا کے اکثر ممالک میں ہے لہٰذا ان میں بھی رعایت کی ضرورت نہیں۔ رعایت کی ضرورت تو اس مال کے لئے ہوتی ہے جیسیں کہ دیگر ممالک کے مال سے مقابلہ کرنا ہو۔ اب رہی چاء وغیرہ کی تجارت تو یہ سب انگریزوں کے ہاتھ میں ہے۔ رعایت سے ہندوستانیوں کو کیا فائدہ "گھر کے دیوتا گھر ہی میں رہے" انگلستان میں رعایت کی گئی اور ہندوستان کے انگریزی تاجروں نے نفع اٹھایا۔

اس کے عوض میں ہندوستان کو انگریزی مصنوعات پر دس فیصدی کی رعایت کرنے کا حکم ہوا۔ اس کی دو صورتیں ہیں۔ یا تو یہ کہ غیر برطانوی مال پر دس فیصدی ڈیوٹی بڑھادی جائے۔ اس صورت میں غریب خریداروں پر بہت زیادہ بار پڑتا ہے یا یہ کہ انگریزی سامان پر دس فیصدی ڈیوٹی کم کردی جائے۔ اس صورت میں حکومت کی آمدنی کم ہوجانے کا خدشہ ہے نیز سب سے بڑا ڈر یہ ہے کہ اس رعایت کے بعد ہندوستان کے سوتی کپڑوں کے کارخانے مقابلہ کی تاب نہ لاسکیں گے۔ وہ تو کہئے ہندوستانیوں کو انگلستان کی چالاکی کا جلد احساس ہوگیا ورنہ اس تھوڑی سی بچی کھچی تجارت سے بھی ہاتھ دھونا پڑتا۔[۱]

یہ ہے ہماری ترقی اور یہ ہیں اصل یورپ کے احسانات اگر ترقی کے معنی تجّار اور صناعوں کو مزدور۔ مزدور بھی نہیں بے روزگار بنا دینا ایک آسودہ اور دولت مند قوم کو فاقہ مست اور مفلس کردینا ہے تو ایسی ترقی اہل یورپ اور یورپ پسند جماعت ہی کو مبارک ہو۔

یہ اس اقتصادی لوٹ کا نتیجہ ہے کہ آج ہندوستان میں مشرق سے لیکر غرب شمال سے لیکر جنوب

---

[۱] پھر بھی سنہ ۱۹۳۶ء میں مرکزی اسمبلی نے کثرت رائے سے یہ طے کردیا کہ شاہی ترجیح کے اصول کو ہندوستان میں رواج دینا مناسب نہیں۔ مگر افسوس کہ اس مردہ لاش کو اب تک ہندوستان میں گھسیٹا جارہا ہے۔

تک بے روزگاری کی مہلک وبا پھیلی ہوئی ہے۔ ہمارے بیشتر بھائی روٹی کے ایک ایک ٹکڑے کو ترستے ہیں۔ لاکھوں کو کپڑا نصیب نہیں۔ جاڑوں کی پہاڑ جیسی راتیں آگ کے سامنے بیٹھ کر گذار دیتے ہیں۔ مادرِ ہند کے لاکھوں فرزند مفلس اور فاقہ مستی کے ہاتھوں اجل کا شکار ہو رہے ہیں مگر ہم کچھ ایسے نشے میں چور ہیں کہ اپنے ملک کی بھلائی کا ذرا بھی خیال نہیں آتا۔

بس اہل وطن نیند بہت ہو چکی۔ اہل یورپ کی عیاریوں کی بدولت ہم بہت کچھ کھو چکے۔ اٹھو اور اپنے وطن کی خبر لو۔

نہ سمجھو گے تو مٹ جاوگے اے ہندوستاں والو — تمھاری داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں

ہندوستان کو مالدار اور با روزگار بنانے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ یوروپین کارخانوں کے مقابلہ میں اپنے سرمایہ سے کارخانے کھولے جائیں۔ مگر یہ صورت معقول معلوم نہیں ہوتی۔ اول تو ہمارے پاس اتنا سرمایہ نہیں اور جو کچھ ہے بھی وہ زمین کے اندر دفن ہے۔ دوسرے یہ کہ ہندوستان کی موجودہ حالت دیکھتے ہوئے یہ صورت بے روزگاری کا حل نہیں ہو سکتی۔

سائنس کی ترقی اور مشینری کی ایجاد نے دیگر اقوام کو کتنا ہی فائدہ پہونچایا ہو۔ نوع انسان کی معاشرتی زندگی میں اس نے کتنی ہی سہولتیں پیدا کی ہوں۔ بیشک دیگر اقوام یا یوں کہئے آزاد اقوام ان حیرت انگیز ایجادوں سے صاحب سرمایہ اور مالا مال ہو گئیں۔ مگر اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ تمام چیزیں جو دنیا کے لئے رحمت ہیں ہندوستان کے لئے لعنت ثابت ہوتے ہیں

دوسری صورت یہ ہے کہ ہند کی قدیم دستکاری اور گھریلو صنعت کو ترقی دیجائے۔ یہ صورت ہندوستان کے لئے بہت مناسب معلوم ہوتی ہے۔ ہندوستان زراعتی ملک ہے تقریباً ۷۲ فی صدی لوگوں کا پیشہ کاشتکاری ہے۔ ظاہر ہے محض کاشتکاری اتنے لوگوں کے ذریعہ معاش کی کفیل نہیں ہو سکتی۔ کاشتکار نصف سال سے زاید بالکل بیکار رہتے ہیں مگر اس عرصہ میں یہ ممکن نہیں کہ کاشت کو چھوڑ کر شہروں میں جاکر ذریعہ معاش تلاش کریں اور کارخانوں میں کام کریں۔ لہذا یہ ضروری ہے کہ گھریلو صنعت اور قدیم دستکاری کو ترقی دیجائے تاکہ ملک کی بہت بڑی جماعت کا گراں مایہ وقت یوں برباد نہ ہو اور فاقہ مستی اور بیروزگاری سے

نجات ملے۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ ہماری صوبہ جاتی حکومتوں کو گھریلو صنعتوں کی اہمیت کا احساس ہوگیا ہے۔ بظاہر یہ مضحکہ انگیز معلوم ہوتی ہے کہ ہاتھ کے بنے ہوئے سامان کا مشین کے بنے ہوئے سامان سے مقابلہ کرنے کی جرأت کی جائے یورپ پسند جماعت حیرت میں ہوگی کہ آخر یہ کیسے ممکن ہے۔ مگر حیرت کیوں یہ وہی ہندوستان ہے جو نصف دنیا سے زاید کو تیار شدہ مال فراہم کرتا تھا۔ وہی سرزمین ہے وہی آب وہوا، وہی پہاڑ، وہی دریا تو پھر کیا اب اتنا بھی ممکن نہیں کہ اپنے ہی لایق سامان تیار کر سکے۔

یہ ہمارے اختیار میں ہے کہ ملک کے بنے ہوئے سامان کو ممالک غیر کے مشین کے بنے ہوئے سامان پر ترجیح دیں۔ غیر تیار شدہ مال بھیجنا قطعاً بند کر دیں۔ اگر آج ہم متفق ہو کر اپنی قسمت بدلنے کا فیصلہ کر لیں تو دنیا کی کوئی طاقت ہمیں باز نہیں رکھ سکتی۔

"بہ نژادِ نو"

نوجوان مُسلم سے خطاب

(سیّد علی سردار صاحب جعفری حزیں)

ہوشیار اے انقلابِ دہر کے آئینہ دار — کس لئے ہے آج تو کم ہمت و زار و نزار

چشمِ عبرت بیں سے اس دنیا کے نظارے کو دیکھ — گوشِ دل سے سُن ذرا کیا ہے زمانے کی پکار

تو ہے میراثِ یقینِ زندگی کا پاسبان، — خوب سُن لے تو ہے دنیائے عمل کا تاجدار

تیرے سینے میں ہیں پوشیدہ رموزِ زندگی — تیری خاکستر میں پنہاں ہیں ابھی لاکھوں شرار

موجزن تیری رگِ ہمت میں ہے خونِ جہاد — جوش زن ہے بازوؤں میں قوتِ پروردگار

سو رہی ہے تیرے پہلو میں جوانی کی اُمنگ — تیرے دل کی دھڑکنوں میں اک قیامت بیقرار

انقلابِ دورِ عالم ہیں قلمرو میں تیری — کروٹیں دنیا کی ہیں تیرے اشاروں پر نثار

منحصر ہستی پہ تیری قومِ مسلم کا عروج — اور تجھ پر ملتِ بیضا کی قوت کا مدار

تیری عظمت عظمتِ اسلاف کی ہے پاسبان — تیری سطوت سطوتِ اسلام کی آئینہ دار

ارتقائے زندگی کا اک سنہرا باب تو — تیرے افسانوں کا مجموعہ کتابِ روزگار

کارزارِ زندگی میں ڈھونڈتے ہیں سب تجھے — کر رہا ہے دیکھ مستقبل بھی تیرا انتظار

چونک اُٹھ صدیوں کی گہری نیند کا ماتا ہے تو
ہوش میں آ نوجوانِ انقلاب آ رہا ہے تو

توڑ دے اللہ اس رنگیں سیاست کا طلسم — محوِ راحت جسکے کاشانے میں ہیں سرمایہ دار

جس کی دنیا میں اثر کی کارفرمائی نہیں — لفظ بے معنی جہاں ہے دکھ بھرے دل کی پکار
صبح کاذب کی چمک جھوٹے نگینوں کی دمک — اس کی عظمت بے حقیقت اور وہ خود بے اعتبار
آ دکھادوں میں تجھے مغرب کے جادو کا اثر — آ بتادوں میں تجھے اس کی حکومت کا شعار
لیکے اپنے ہاتھ میں مکاریوں کا اک عصا — بیٹھتا ہے تخت پر روباہ سیرت تاجدار
گرد اس کے نغمہ سنجانِ سیاست کا ہجوم — نغمہ پردازانِ فرعونی قطار اندر قطار
حق کے میخانے میں ہے پیمانۂ باطل کا دور — پردۂ مجبور میں قیصر کی قومیں یادگار
ظلم کی آغوش میں انصاف پل سکتا نہیں — جامۂ تلبیس ہے اس کی قبائے زرنگار

دورِ حاضر کی سیاست اک خیالِ خام ہے
یعنی یہ ابلہ فریبی کا مہذب نام ہے

اس کے افسونِ جہاں بانی کے وہ تیرِ ستم — جن کے سوفاروں پہ ہے اس کی حکومت کا مدار
اس کی تہذیب و تمدن کی کمانِ پرخطر — اور غرورِ عزت و ثروت کا وہ رنگیں غبار
اس کا قصرِ زندگی اس کی دروغ آرا حیات — اس کا داماں جو بنا ہے خونِ دل سے لالہ زار
کچھ سمجھتا ہے سرابِ دہر کی موجیں ہیں یہ — چند لمحوں کی چمک ہے کچھ نہیں انجامِ کار

کس قدر پرہول صبحِ عیش کی تصویر ہے
آہ یہ بھی اک سنہرے خواب کی تعبیر ہے

دیکھ لے نافہم اے افسونِ مغرب کے شکار — اے عروجِ ملتِ بیضا کی زندہ یادگار
ایک دنیا ہے ترے حالِ زبوں پر اشکبار — اک زمانہ ہے ترے خوابِ گراں سے سوگوار
تیرے دل میں کارفرما دورِ حاضر کا نظام — تیرے سر میں بادۂ تہذیبِ حاضر کا خمار
جبہ سائی کر رہا ہے آستانِ غیر پر — کیوں ملائے دے رہا ہے خاک میں اپنا وقار؟
سرِ مسلماں کا کسی کے سامنے جھکتا نہیں، — اس کے دامن تک نہیں آتا غلامی کا غبار
تو نے جن قوموں کو مانے جو ہیں انسانیت — کیا انہیں سے لیگا تہذیب و تمدن مستعار؟

شرم کر تو غیر کا منت کشِ درماں نہ ہو — تو ہے خود ہی نغمہ ہائے کن فکاں کا رازدار
در رکھو دنیا میں وہ جینے کا حق رکھتا نہیں — دوش پر اپنے اُٹھا سکتا نہیں جو اپنا بار
ادیٔ ہستی سے جوئے نغمہ خواں بن کر گذر — گلستانِ زندگی سے صورتِ بادِ بہار
تم کردے مزرعۂ اُمید پر رحمت کا جوش — نااُمیدی کو جلا دے بن کے برقِ شعلہ بار
ی جولانگاہ یوں میدانِ ہستی کو بنا — جیسے تیرے خون کے دریا میں تیغِ آبدار
حتِ اسلاف سے لے کام گھبراتا ہے کیوں — تو بنا لے گا زمانے کو کسی دن سازگار
وگا پیشانی سے تیری پھر طلوعِ آفتاب — نقش باطل کی طرح مٹ جائینگی شبہائے تار
لمتِ تاریک میں پھوٹے گی اک رنگیں کرن — خود بخود ہو جائیگی تیری حقیقت آشکار
انپ جائیں گی فضائیں نعرۂ تکبیر سے — چونک اُٹھے گا زمانہ ہوگی دنیا ہوشیار

دیکھتا ہوں میں تجھے پھر نغمہ خوانِ زندگی
جادہ پیما ہو رہا ہے کاروانِ زندگی

غزل

(فراؔق گورکھپوری)

یہ جُرم ماورائے عذاب وثواب ہے
تقصیرِ عشق آپ ہی اپنا جواب ہے

اے ساکنانِ دہر یہ کیسا اضطراب ہے
اتنا کہاں خراب جہانِ خراب ہے

ناکامیاب ہے ؟ کہ نظر کامیاب ہے!
ایک ایک ادائے شوخ میں سو سو حجاب ہے

تقدیرِ میکدہ کو جگا اے نگاہِ مست
یوں تو ہر ایک قطرۂ مے آفتاب ہے

نازک بہت ہے ہمنفسو کاروبارِ دہر
یہ کائنات بحرِ عدم پر حباب ہے

دل بے نیازِ لطف وکرم ہو چکا۔ مگر
ابتک تری نگہ کو وہی پیچ وتاب ہے

میں ڈر رہا ہوں خوبیٔ تقدیرِ عشق سے
دیکھ اے نگاہِ ناز زمانہ خراب ہے

آخر کو کام آئی محبت میں بے حسی،
سمجھے ہوئے تھے دل میں غمِ بیحساب ہے

رہبر نہ ہم سفر ہے کوئی راہِ عشق میں
تیری نگاہِ لطف بھی یا در رکاب ہے

عشق اپنے حالِ زار سے بیگانہ ہو گیا
یہ درد اُٹھا ہوا ہے کہ تیرا شباب ہے

اب جو نگاہِ شوق کرے اہلِ ذوق سے
سُنتا ہوں آج حُسن ترا بے نقاب ہے

کیسی فنا کہاں کی بقا یہ کوئی بتائے
دنیا میں زندگی بھی کہیں دستیاب ہے

پرکھی ہوئی شراب کہن لا سکے گا کون
رند و شریکِ بزم کوئی شیخ و شاب ہے

دنیا کو بھی خبر نہیں دنیا بدل گئی
اے حسنِ شوخ یار یہ کیا انقلاب ہے

دلچسپیاں فسانۂ غم کی بجا مگر
سُننے کی تاب ہے نہ سنانے کی تاب ہے

پُرکار کس قدر ہے نگاہوں کی سادگی
ہر اک سمجھ رہا ہے کہ وہ بے نقاب ہے

چمکا ہوا وہ دردِ محبت یہ بے حسی،
وہ خواب تھا فراؔق یہ تعبیرِ خواب ہے،

حضرت شیونؔ مدظلہٗ کی شاعری

جناب محمد لیئق صاحب (بھوپال) متعلم مسلم یونیورسٹی

رباعی

شاعری را سہ چیز می باید
تا کہ اشعار برمراد آید
علم و تحصیل و فیض یزدانی
ہر کرا نیست ترا اثر می خاید

انوری

دنیائے شاعری پر جو انقلاب آتے رہتے ہیں۔ اور آچکے ہیں اور جو جو تغیرات اس میں رفتہ رفتہ رونما ہوئے ہیں۔ وہ کسی طرح سلطنتوں کے انقلابات سے کم نہیں۔ مادی دنیا کی صورت زمانے نے بدل دی، معنوی دنیا کو شاعری کی ترقی اور تنزل نے متغیر کر دیا۔ اگر غور سے دیکھا جائے۔ تو ہر قوم شعراء کی ممنون ہے ادب کی دنیا میں شاعری جو درجہ رکھتی ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ شعراء کبھی رزمگاہ میں تیغ بدست ہیں۔ اور فوجوں کا دل رجز پڑھ پڑھ کر بڑھانے میں مصروف ہیں۔ تو کبھی بزمگاہ میں دربار کی زینت، بادشاہوں کی سوانح حیات شعراء کی مرہونِ منت، تاریخ پر اُن کا احسان۔ پند و نصائح کی وہ جان۔ ادب اُن کا شکر گذار تصوف کے چمن میں اُن سے بہار مذہب کے اسرار اُن سے آشکار آخر کون سا شعبۂ حیات ایسا ہے جو شعراء کا منت کش نہیں ہر مشرق و مغرب کے لٹریچر سے اگر شعراء کی ذہنی کاوشوں کو الگ کر دیا جائے تو چند اوراق پریشان کے سوا کیا باقی رہ جاتا ہے۔ عرب کی جان شاعری، عجم کی روح شاعری یونان شاعری کا گہوارہ، انگلستان اس کا جگر پارہ۔ اگر شعراء جیسی ضروری اور کار آمد مخلوق کو فلاطون کے ہاں جگہ نہیں ملتی اور وہ شعراء کو ایک غیر ضروری مخلوق سمجھتا

ہے تو اس کی مثال بالکل ایسی ہی ہے جیسا کہ علامۂ اقبال نے کہا ہے۔ مصرعہ

گوسفندے در لباسِ آدم است

شعرار کی زندگی۔ وہ شعرار جنھیں شاعری میں فنا فی الشعر ہونے کا مرتبہ حاصل ہے۔ اپنی قوم، اپنے فن کے لئے کلیتہً وقف ہوتی ہے۔ انھیں شعر و شاعری سے عشق ہوتا ہے اور وہ اسی نشہ میں مست رہتے ہیں۔ انھیں ہماری دنیا سے کچھ سروکار نہیں رہتا۔

ملکی اور قومی شاعر ملک و قوم کے لئے وقف ہوتا ہے۔ ادب نواز شعرار ادب کیلئے، محاورہ پسند شعرار زبان کے لئے، رند مشرب میخانے کے لئے۔ غرض۔ یہی وہ "اوقاف" ہیں جو ملک و ملّت کا سرمایہ ہوتے ہیں۔

شاعر، ملکی ہو خواہ قومی۔ ناصح ہو یا زاہد۔ صوفی ہو یا رند خراباتی اپنی ایک جدا زندگی رکھتا ہے۔ اسکی ایک علیحدہ دنیا ہوتی ہے جس کا وہ تنہا مالک ہوتا ہے۔ اسی لئے اُس کی زندگی کے پختہ خیالات آزادانہ اور فائدہ مند ہوتے ہیں۔ اس پر جو جو انقلابات انفرادی صورت میں گذرتے رہتے ہیں وہ اجتماعی صورت میں قومی ذہنیت کے انقلابات ثابت ہوتے ہیں۔

ایسے شعرا بہت کم ہوتے ہیں جن میں، مذہب، ادب، نصیحت، تجربہ کاری، زہد اور رندی بیک وقت مجتمع ہو جائیں یوں تو انسان اضداد کا مجموعہ ہے لیکن ذہن کی اضداد پسندی، غیر معمولی دماغوں کا انتہائی کمال سمجھنا چاہیے۔ وہ دنیا کی خوشی کو خوشی نہیں سمجھتے، لیکن خوش ہوتے ہیں۔ دنیا کا رنج و غم اُن کے نزدیک کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔ لیکن مصیبت زدہ کو دیکھ کر ضرور متاثر ہو جاتے ہیں۔

دکن میں اب تک متعدد باکمال شعرار موجود ہیں لیکن عام نظروں سے روپوش ہیں۔ وہ دنیا کے سامنے آکر مشاعروں میں شریک ہو کر ناقدرشناس لوگوں کی رسمی واہ واہ اور خوب خوب سے لطف اندوز نہیں ہوتے اور حقیقتاً ایسے ہی شاعر ہیں جن کو نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا۔ اور اسی صفت استغنار کی بنا پر وہ لوگوں کی نظروں سے چھپے ہوئے ہیں۔ ان کی حالت اُن مبتذل اور بتدی شاعروں کی سی نہیں جو کہ ہر عام مشاعرہ میں ہر عام جلسہ میں غزل سرائی کے لئے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جن کا منشار محض شہرت ہوتا ہے۔ چاہے شعر کہنے کی قابلیت ہو یا نہ ہو۔

مجھے حضرت شیون مدظلہٗ کے کلام کا مجموعہ صہبائے سخن میرے ایک مکرم دوست شیخ عبدالحق صاحب نے روانہ کیا تھا جو خود اُن کا مرتب کردہ ہے۔ اور علی گڑھ سے شایع ہو چکا ہے۔ اور جس کی تاریخ طبع ہمارے ملک کے مشہور و معروف شاعر حضرت مولانا حاجی حافظ سید احسن صاحب مارہروی پروفیسر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے لکھی ہے۔ حضرت احسن۔ اُستاد داغ کے ممتاز شاگردوں میں سے ہیں۔ موصوف کی نکتہ شناسی اور سخن فہمی محتاج بیان نہیں جس کے متعلق صرف یہ کہدینا کافی ہے کہ مصرعہ

'عمر گذری ہے اسی دشت کی سیاحی میں'

آپ حضرت شیون کے متعلق لکھتے ہیں جو صحیح معنٰی میں داد کہی جاسکتی ہے۔ شعر:۔

'نقطہ نقطہ میں سخنور کے لئے ہے دلکشی　　　لفظ لفظ ارباب معنٰی کے لئے ہے دلکشا'

حضرت احسن داد کیوں نہ دیں ہم مشرب ہیں پھر وہ بھی شیون کے جو خمخانۂ مینائی سے شرف بادہ کشی حاصل کر چکے ہیں۔ خود احسن صاحب نے اس طرف اپنے قطعہ میں اشارہ فرمایا ہے کہ شعر:۔

'ہیں وہ مینائے امیرؔ پاک دل کے جرعہ کش　　　کیوں نہ ہو پُر کیف اک اک شعر اس دیوان کا'

شعراء کے دواوین اور بیاضیں آئے دن شائع ہو رہی ہیں۔ لیکن بہت کم ایسے دیوان اور بیاضیں نظر آتی ہیں جن میں شروع سے آخر تک کوئی سست شعر نہ ہو۔ اور دلچسپی، مضمون آفرینی کے لحاظ سے شاید ایک غزلیں یا کچھ اشعار پورے دیوان میں مل سکیں۔ لیکن حضرت شیون کی شایع شدہ کتاب صہبائے سخن کو دیکھنے کے بعد احسن صاحب کے اس شعر کی داد دینے کو طبیعت چاہتی ہے کہ کیسا نپا تلا ناطق فیصلہ کیا ہے فرماتے ہیں شعر:۔

'اُسکی دلچسپی کا اک ادنٰی سا دیکھا یہ اثر　　　کی نظر جس حرف پر خاطر نشیں وہ ہو گیا'

یہی نہیں بلکہ احسن صاحب نے اپنے قلم سے صہبائے سخن پر اپنے اوٹوگراف کی صورت میں خود قطعہ تاریخ لکھا ہے شیون صاحب کا طویل تعارف کرانا نثر میں قصیدہ گوئی کرنا ہے۔ تذکرہ نویسوں نے شعراء کی سوانح حیات لکھنے کا جو طرز اختیار کیا ہے وہ قابل اصلاح ہے۔ شاعر کی دماغی ترقی کا تدریج انقلاب اگرچہ نقل و حرکت سے متاثر ہوتا ہے لیکن اس کے نقل و حرکت کی تاریخیں۔ چھوٹے چھوٹے واقعات، غیر ضروری تعلقات فضول اور بیکار معاصر جن کا تعلق شاعر سے کچھ نہیں ہوتا۔ حقیقتاً لازمی جزو نہیں ہیں صرف اتنا کہدینا کافی ہے کہ حضرت شیون ناسک کے

متمول اور مقتدر اور شریف خاندان کے نامور فرد حکیم شیخ سرفراز صاحب کے چھوٹے صاحبزادے ہیں۔ اور دکن کے مایۂ ناز عالم پروفیسر الحاج شیخ عبدالقادر صاحب ایم۔ اے۔ آئی۔ ای۔ ایس۔ کے چھوٹے بھائی ہیں۔

حضرت شیون کا نام گرامی عبدالرزاق ہے شیون تخلص فرماتے ہیں۔ مشرقی تعلیم خارجی طور پر حاصل کی فارسی عربی پر بھی عبور حاصل کیا اس کے بعد شاعری کو اپنا نصب العین قرار دیا اور سب سے بے نیاز ہو گئے۔ جناب شیون کا بہت سا کلام ضائع ہو چکا ہے یا بہ الفاظ مرتب جناب شیون کا سرمایہ حیات ایک ضخیم کلیات اور دیوان دستبردِ زمانہ سے محفوظ نہ رہ سکا۔"

ہمارے زمانہ کے قابل احترام فاضل پروفیسر مولوی سید نواب علی صاحب۔ ایم۔ اے (مصنف سیرۃ رسول اللہ ومعارج الدین وغیرہ) کی مدد سے شیخ عبدالحق صاحب نے جو کلام کا انتخاب صہبائے سخن کے نام سے شایع کیا ہے اپنی جگہ پر اردو ادب میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ میں اسی انتخاب سے چند اشعار جو شاعر موصوف کی زندگی کے اصول اور تجربات پیہم کا نتیجہ ہیں۔ شائقین اور صاحب ذوق اصحاب کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

جناب شیون عشقِ رسول میں سرشار ہیں اور ریاکار زاہد کی زندگی سے بہت ہٹ کر چلنے والے ہیں اور عشق کی مستی وہ نشہ نہیں جو اس دنیائے آب و گل میں یا اس کے بعد والی دنیا میں ختم ہو جائے یا اتر جائے۔ چنانچہ فرماتے ہیں شعر:

'وہ مست تھے کہ حشر میں ہم کو خبر نہ تھی
جنت کا منہ کدھر تھا کدھر تھا جحیم کا'

جناب شیون واقعی عاشق ہیں اور وہ بھی کیسے عاشق کہ صرف نام محبوب ہی کو اپنے لئے سب کچھ سمجھتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔ شعر:۔

'جو ایکبار میرے منہ سے یا نبیؐ نکلا
نجات غم سے ہوئی دم بصد خوشی نکلا'

اور سنئے اپنی اسی سرمستی میں فرماتے ہیں۔ شعر:۔

'جو سینہ چیر کے دیکھا میرا پس مرن
لکھا میرے ورقِ دل پہ 'یا نبی' نکلا'

حضور صلعم کی رفعتِ شان کو کس خوبی سے ایک شعر میں ادا کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں۔ شعر:

'وہی تھے شافع محشر کہ روز محشر بھی
ہر اک نبی میرے حضرتؐ کا ملتجی نکلا'

قصیدہ بردہ کا مصرعہ بے ساختہ یاد آتا ہے: ع وکلہم من رسول اللہ ملتمس

جناب شیون کی ہر رگ و پے میں عشق رسولؐ سرایت کر گیا ہے اور یہ ان کا عقیدۂ راسخ ہے کہ روزِ ازل سے وہ غلامان و عاشقانِ رسول میں سے ہیں چنانچہ اپنے مقطع میں فرماتے ہیں۔ شعر:۔

'خدا کا شکر میں کرتا ہوں رات دن شیون   کہ دل ازل سے میرا عاشقِ نبی نکلا'

ایسے قابلِ قدر شعر بہت ہیں جو بہ لحاظ زبان بھی اپنا جواب نہیں رکھتے جنھیں ہم صرف بخیال طوالت چھوڑتے ہیں۔ یہ امر تو قطعی ہے کہ عشق حقیقی جناب شیون کا سرمایہ ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ عشق مجازی کا ابتلا بھی بعض بعض شعروں سے معلوم ہوتا ہے۔ اور اس کا ہونا ضروری بھی ہے اور لطف بھی اسی میں ہے کہ

"ملتی ہے شاہراہ حقیقت مجاز سے"

شعرا نے غمِ عشق کو طرح طرح سے بیان کیا ہے اور عجب عجب انداز سے ظاہر کیا ہے جناب شیون کا عقیدہ علامہ اقبال سے ملتا ہے اقبال نے کہا ہے مصرعہ "غمِ دل نگفتہ بہتر ہمہ کس جگر نہ دارد" ۔ جناب شیون فرماتے ہیں شعر:۔

نہ پوچھو صدمۂ عشق بتاں کو   خدا پر حال ہے روشن ہمارا

قدما کی طرح، اور شعرا کے عقیدوں کے مطابق وہ اپنے بخت ہی کو ملزم ٹھہراتے ہیں کسی پر کوئی الزام نہیں نہ کسی کی کوئی شکایت فرماتے ہیں شعر:۔

شکایت کیا کریں شیون کسی کی   ہمارا بخت تھا دشمن ہمارا

حافظ شیرازی کا "بارِ امانت" والا مضمون ہند کے مست یعنی شیون کے ہاں بھی موجود ہے شعر:۔

'تیرے دیوانے نے وہ سودا لیا روزِ ازل   جس پہ راضی ڈر سے کوئی بھی ملک ہوتا نہ تھا'

جناب شیون اپنے محبوب کو کسی وجہ سے چھوڑنا نہیں چاہتے ظاہر ہے کہ ہر بازاری قسم کا عاشق شکوہ شکایت کرکے محبوب کو اپنی وفاداری کا ثبوت دینا چاہتا ہے مگر شیون کے یہاں یہ ایک معیوب بات سمجھی جاتی ہے اور وجہ ترکِ شکایت' کو کس خوبی سے بیان فرماتے ہیں۔ شعر:۔

'اس سے میں شکوہ کرکے کیا کرتا   پھر بھی اُمیدوار ہونا تھا'

' اضطراب شوق' کا مضمون اکثر شعرا نے باندھا ہے۔ لیکن شیون کی بات ہی اور ہے۔ شعر:۔

' نہ پوچھو اضطراب شوق کا عالم گر اس در تک   پہونچ جاتا ہوں اُڑکر آپ میں فریاد سی پہلے'

'جذب دل' اور اس کی تاثیر کی قیامت آرائیاں شعرائے متقدمین اور متاخرین کا واحد مضمون ہے لیکن ذرا اس کو ملاحظہ کر لیجئے جو شیون کے جذبات کا نتیجہ ہے۔ شعر:۔

'الٰہی جذبِ دل میں ایسی کچھ تاثیر پیدا ہو   میرے پہلو میں وہ آجائیں اپنی یاد سے پہلے'

جناب شیون کی بے نیاز طبیعت نہایت عجیب اور بانکپن لئے ہوئے ہے وہ جب کسی سے کنارہ کش ہوتے ہیں تو پھر اس کی طرف رُخ نہیں کرتے 'بے نیازی کی شان دیکھئے فرماتے ہیں۔ شعر:۔

'رہا کرتے تھے جو آنکھوں پہ ہر دم پیش نظر پہلے   اب ان کی شکل تصویر خیالی ہوتی جاتی ہے'

محبوب کی ہر ادا عاشق کے لئے واقعی قیامت خیز ہوتی ہے لیکن اس کے بگڑنے کی ادا اس قدر بے پناہ ہے کہ معاذ اللہ عاشق کو دیکھئے کہ محبوب کو برافروختہ کرنے کے لئے کیسا عجیب حیلہ اختیار کرتا ہے جناب شیون فرماتے ہیں شعر:۔

اس آرزو میں کہ غصے کی میں ادا دیکھوں   خطا کسی کی بھی ہو مجھ کو اپنے سر لینا

شیون اپنی گراں قدری سے واقف ہیں اور کس استقلال اور بے ساختگی سے فرماتے ہیں۔ شعر:۔

'بنا ساقی میری مٹی سے ساغر   حقیقت کچھ نہیں ہے جامِ جم کی'

(مضمون کتنا بلند ہے اور ساقی اور ساغرگری کی اختراع نے کیسی خوبی پیدا کر دی ہے)

شیون کے سرمایہ راحت جسے انھوں نے اپنے ایک شعر میں کتنا صاف بیان کر دیا ہے ملاحظہ فرمائے کہ شاعر کتنی عالی تخیل رکھتا ہے فرماتے ہیں۔ شعر:۔

یہی سرمایۂ راحت ہوا ہے   خوشی ہوتی ہی ہے مجھ کو تو غم کی

کیسی پاکیزہ زبان لکھی ہے۔ اور تصویرِ غم کو کس حسرت بھرے انداز سے کھینچا ہے۔ فرماتے ہیں۔ شعر:۔

'میری جاں دیکھ لو شیون کو چل کر   نہ دیکھی ہو اگر تصویر غم کی'

ہر فطری شاعر کو تصوف سے کم و بیش لگاؤ ہوتا ہے۔ یہی حال آپ جناب شیون کے کلام میں ملاحظہ کریں گے 'وحدۃ الوجود' کے اہم مسئلہ کو کس سادگی اور خوبی سے حل کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں۔ شعر:۔

قیدِ مقام کا دل نہ پابند کرنا   کعبہ ہو یا کلیسا ہر جا نماز کرنا

شیون موجودہ زمانے کے لوگوں کی 'ذہنیت' اور 'عشق مجازی' کے نتائج کو خوب جانتے ہیں کیوں نہ

جائیں آخر ایک فطری شاعر کو ماہر نفسیات بھی ہونا چاہئے اسلئے وہ اپنے آپ کو فانی جذبہ میں مبتلا کرنا نہیں چاہتے
بلکہ دامن بچا کر اس منزل سے گذر جاتے ہیں جیسا کہ خود فرمایا ہے ۔ شعر :۔

'تشبیہ دے گئے ہیں دنیا کو ایک پل سے — کھل جائیگی حقیقت عشقِ مجاز کرنا'

شیون کا رندانہ فیصلہ جو واقعی اقتضائے وقت کا حامی ہے ملاحظہ کیجئے فرماتے ہیں ۔ شعر :۔

'جوانی میں معشوق اور مے سے شیون — جو توبہ کرے گا گنہگار ہو گا'

غالب اگر آج ہوتے تو بغیر تڑپے ہوئے نہ رہتے اور بے ساختہ داد اُن کے مُنہ سے نکل ہی جاتی
لیکن آج بھی اہلِ نظر اس شعر کو پڑھ کر جناب شیون کی فلسفیانہ عالی نظری کی داد دیتے ہیں ۔ شعر :۔

'بقائے ہستئ موہوم تجھ کو — ملی ہے رب کے تعلیم فنا کیا'

اسی غزل کا ایک دوسرا شعر ہے جس میں اپنے عشقِ حقیقی کے علو کو بتلایا ہے جس میں علاوہ معنیٰ کے
زبان کیسی صاف اور عمدہ لکھی ہے فرماتے ہیں ۔ شعر :۔

'وہ بیمارِ محبت ہوں کہ مجھ سے — مسیحا پوچھتے ہیں ہے دوا کیا'

اخلاقیات کے مضامین کو بھی جناب شیون ایک جدید رنگ میں بیان کرتے ہیں ہمارے شعرار
اگر غور کریں تو واقعی بلندئ خیال کا پتا چلے ۔ فرماتے ہیں ۔ شعر :۔

'شیون خدا کیواسطے جڑ کاٹ دیجئے — کم بخت پھل نہ آئے کبھی نخلِ آرزو میں'

'غم' شعرار کی زندگی کا عنصر اعظم ہوتا ہے اسی کی راگنی وہ طرح طرح سے الاپتے ہیں جناب شیون نے
بھی غالبؔ کی مشہور زمین میں ایک قابلِ داد شعر لکھا ہے ۔ فرماتے ہیں ۔ شعر :۔

'کسی سے کیا کہیں اور کیوں کہیں ہم یہ سمجھتے ہیں — رفیقِ دم ہے غم اپنا جو دم نکلے تو غم نکلے'

غم کی دوا اور اسکی تلاش شعرا کا دلچسپ مشغلہ ہے ؟ یار کی یاد 'تصویر یار' 'تصور یار' یہی نسخے شعرار نے غم
غلط کرنے کے لئے تجویز کئے ہیں ۔ شیون صاحب فرماتے ہیں ۔ شعر :۔

'مئے راحت فزا نہیں ملتی — دردِ غم کی دوا نہیں ملتی'

اہلِ ذوق اصحاب جانتے ہیں کہ دنیا کے جھگڑوں سے چھٹکارا پانے کے لئے 'مئے راحت فزا' کی 'بیخودی'

کتنی ضروری ہے۔

جناب شیوَن میں آپ ایک انوکھی بات دیکھیں گے کہ سلاست و مضمون آفرینی کے ساتھ ساتھ جو بات کہتے ہیں اُس پر خود کو کتنا اعتماد ہے۔ چاہے وہ عام خیالات کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ شعراء کے یہاں سر پر ہما کے بیٹھنے کی آرزو کی جاتی ہے اور اس تمنا میں "سایۂ بام یار" کو "ہما" کہا جاتا ہے لیکن جناب شیوَن کے یہاں ایک لطیف بات پیدا کر دی گئی ہے فرماتے ہیں شعر:۔

'شاہی سے زیادہ ہے اس فقر میں استغنا — بہتر ہے یہی اپنے سر پہ نہ ہما بیٹھے'

دنیا کی بے ثباتی اور زندگی کی ناپائداری عام مضمون ہے لیکن جناب شیوَن نے کس عمدگی سے ادا کیا ہے فرماتے ہیں۔ شعر:۔

'ہے حباب آسا فنا کے بحر میں — دھر میں انسان کی بنیاد کیا'

جناب شیوَن واقعی شاعر ہیں، اور شاعری کے اصول سے واقف، اساتذہ کے کلام پر پورا عبور حاصل ہے لیکن ان سب باتوں پر اُنکی منصف مزاجی غالب ہے وہ صحیح خیال کے آدمی ہیں شعراء دشمن کو برا سمجھتے ہیں۔ اسکی موت پر ان کے یہاں شادیانے بجتے ہیں لیکن شیوَن صاحب ایک ایسے عاشق مزاج شاعر ہیں جو اپنے دل کو 'مرگ دشمن' پر بھی خوش نہیں ہونے دیتے سبحان اللہ کیا مضمون ہے فرماتے ہیں۔ شعر:۔

'جو یہاں آیا ہے اک دن جائے گا — مرگ دشمن پر مبارک باد کیا'

اُلفت میں بے سروسامان ہونا عاشق کے لئے مرتبہ کمال پر پہونچنا ہے ساز و سامان والا عاشق اپنے آپ کو بے سروسامان کہنا ہی پسند کرتا ہے لیکن شیوَن صاحب پھر اس عام روش سے علیحدہ چلتے ہیں وہ بے سروسامانی کی زندگی عاشقی میں عزیز نہیں رکھتے۔ اور وجہ کیسی عمدگی سے ادا کی ہے فرماتے ہیں۔ شعر:۔

'نہیں کچھ غم جو شیوَن بے سروسامانِ اُلفت ہوں — مہیا میری خاطر اور ساماں ہوتے جاتے ہیں'

وحدۃ الوجود کا مہتم بالشان مسئلہ ہر باکمال شاعر نے حل کیا ہے اور کیوں نہ حل کیا جائے انسانی دماغ کے کمال کی معراج ہی اس مسئلہ کا سمجھانا ہے شیوَن صاحب سے یہ راز اپنی بیخودی میں نہ چھپ سکا کہتے ہیں۔ شعر:۔

'حرم ہو دیر ہو یا ہو شراب خانۂ عشق — ترے جمال کا جلوہ کہاں نہیں رہتا'

شاعر کو جہاں خاکسار ہونا چاہیئے وہاں خوددار بھی ہونا لازمی ہے شاعر کی خودداری کا اندازہ ہر شخص نہیں کرسکتا بظاہر شاعر نہایت خاکسار اور عاجزی کرنے والا ہوتا ہے لیکن اتنی ہی بلند اُس کی خودداری ہوتی ہے، وہ فاقوں سے مرجانا پسند کرتا ہے لیکن دست سوال بڑھانا اس کے لئے زہر کا پیالہ پینا ہے اور یہی غیور انسانوں کا دستور رہا ہے جناب شیونؔ فرماتے ہیں۔شعر:۔

'ہم سے نازک دماغ سائل سے بار احساں نہ اغنیاء کے اُٹھے'

واقعات نگاری سے علمی یا متصوفانہ مسئلہ نکالنا اور اس کو بھی واقعہ ثابت کرنا بہت بڑا کمال ہے جناب شیونؔ کا یہ شعر واقعی بہت بلند ہے فرماتے ہیں۔شعر:۔

'پھرا کرتے ہیں تیری جستجو میں تیا ملتا نہیں شمس و قمر کو'

ماہر اخلاقیات حسد کو تمام ناکامیوں کی جڑ بتاتے ہیں لیکن شیونؔ صاحب کے یہاں اس سے زیادہ سختی ہے وہ رشک سے بھی جو ماہر اخلاقیات کے یہاں جذبہ محمود ہے اپنے آپ کو پاک رکھتے ہیں اور فرماتے ہیں شعر:۔

'کیوں نہ روشن ہو مرا نام جہاں میں شیونؔ وہ چمکتے نہیں جو رشک ہیں کرنے والے'

فلکِ ناہنجار کا گلہ کرنے میں شاعر و غیر شاعر دونوں برابر کے شریک ہیں لیکن شیونؔ صاحب ہی ایک ایسی طبیعت رکھنے والے ہیں جو شاہراہ عام سے بچ کر علیحدہ علیحدہ جاتے ہیں فرماتے ہیں۔شعر:۔

'ہونے دیا نہ تو نے کبھی شادماں مجھے اس پر بھی کچھ گلا نہیں اے آسماں مجھے'

غالبؔ کی زمین میں کیا خوب شعر فرمایا ہے محبوب کے وعدہ پر یقین نہ آنے کی وجہ کیا انوکھی بتلائی ہے کہ زبان سے بے ساختہ داد نکل جاتی ہے فرماتے ہیں۔شعر:۔

'ترے وعدوں کا ستمگر مجھے کچھ یقین تو آتا میری زندگی کا مجھکو اگر اعتبار ہوتا'

ایک اخلاقی شعر کس یقین کے ساتھ فرماتے ہیں کہ بات دل میں اُتر جاتی ہے۔زباں کیا خوب ہے۔شعر:۔

'سچ ہے شیونؔ کہ مخلصائے طمع پھولتے ہیں کبھی نہ پھلتے ہیں'

اسی طرح مسئلہ ہمہ اوست جس پر ہر صوفی منش شاعر نے خامہ فرسائی کی ہے جناب شیونؔ کے یہاں ایک نیا انداز لئے ہوئے ہے فرماتے ہیں۔شعر:۔

'ہر ایک کے شامل ہے ہر ایک سے بیگانہ ہے کون سوا تیرے ایسا میرے جانانہ'

دل کی حقیقت جناب شیون کی زبان سے سنئے فرماتے ہیں۔ شعر:۔

'تم دل کی حقیقت سے واقف ہی نہیں ابتک کعبہ کا حرم یہ ہے، ہے دیر کا تبخانہ'

شمع و پروانہ کا مضمون اور شمع پر پروانہ کا اپنے کو قربان کر دینا ایک عام خیال ہے جس کو عام طور پر اکثر شاعروں نے باندھا ہے لیکن جناب شیون اقبال کی طرح پروانہ کو شمع کی آگ میں جل جانے کی اجازت نہیں دیتے وہ اس کی تاویل ایک عجیب انداز میں فرماتے ہیں۔ شعر:۔

' الزام جلانے کا ہے شمع پہ لاحاصل خود آگ میں آپ اپنی جلتا رہا پروانہ'

میر تقی میر کی مشہور زمین میں یہ تین شعر ملاحظہ ہوں زبان کی شستگی بیان کی عمدگی ہر حال ہر ایک طریقہ سے اپنی آپ مثال ہیں۔ شعر:۔

'ہے نمونہ حشر کا کوچہ تیرا حشر پر رکھا ہے پھر دیدار کیوں'
'گھٹ رہے ہیں زندگی کے دن مرے بڑھ رہا ہے انتظار یار کیوں'
' اس میں بھی شیون ہے کوئی مصلحت کیا کہوں تم سے ہوں بادہ خوار کیوں'

علامہ اقبال کی زمین میں یہ اشعار فرمائے ہیں داد کے قابل ہیں۔ شعر:۔

' خبر دار! اور آسماں اور بھی ہیں میری طرح گرم فغاں اور بھی ہیں'
' نہ خوش ہو تماشا کر ہیں چرخ گرداں پس کارواں کارواں اور بھی ہیں'
' نہیں منحصر دیر و کعبہ پہ شیون کہ رہنے کے اسکے مکاں اور بھی ہیں'

چند اشعار مشتے از خروارے ارباب نظر کے لئے پیش کرتا ہوں۔ شعر:۔

' شیون عطا کی دولت معنیٰ فقیر کو ہے لاکھ لاکھ شکر خدائے کریم کا'

سبحان اللہ کیا خوب کہا ہے۔ شعر:۔

' دیر و کعبہ میں جا کے دیکھ لیا بات کب ہے شراب خانے کی'

یہ بے چینی یہ بے خوابی یہ سرکوبی یہ بیتابی ۔ یہ ساری آفتیں ہیں مجھ پہ ایک حسرت بھرے دل سے
قیامت ہے جنوں سے کم نہیں یہ حرکتیں دل کی ۔ کہ منزل پر پہونچکر پھر پلٹ آتا ہے منزل سے

کر دیا جلوہ نما تجھکو خود آرائی نے ۔ دونوں عالم ہیں ترے عکس کے دو آئینے

محشر میں تیری وسعت رحمت کے سامنے ۔ ہوگا میرے گناہوں کا یا رب شمار کیا
شیونؔ شباب میں مئے ومعشوق چھوڑ دوں ۔ یہ رُت گئی تو آئیگی پھر بار بار کیا

میں یہ جانتا تو سر کو نہ جھکاتا نقشِ پا پر ۔ کہ وہ بدگماں ہوگا مرے سجدوں کے نشاں سے
یہی کوہِ غم اُٹھائے ترے عشق میں ہیں سر پر ۔ یہ نظر جو آرہے ہیں تجھے لوگ ناتواں سے

یوں گذاری ہے باغِ دنیا میں ۔ گل سے اُلجھے کبھی نہ خار سے ہم

حال شیونؔ سنائیں کیا اُن کو ۔ بات سے پہلے آہ ہوتی ہے

بہت رنگ بدلے زمانے نے لیکن ۔ نوشتے کہاں اپنی قسمت کے بدلے

کوئی بے پردہ کیا دیکھے جمالِ عالم آرا کو ۔ نقاب روئے روشن جب ہجوم نور ہو جائے
تماشا عکسِ حسنِ یار کا دیکھیں گے کیا موسیٰؑ ۔ کرم جس ذرے پر ہو جائے برق طور ہو جائے
تمہاری پردہ پوشی سے ہے یہ اندھیر دنیا میں ۔ جو تم چاہو تو عالم نور سے معمور ہو جائے
ترا جلوہ دکھاتا ہے کرشمے ناز کے کیا کیا ۔ رہے مجھ ہی میں اور مجھ ہی سے وہ مستور ہو جائے

جو مٹنے کی اس کے تمنا ہے شیون　　توہستی کو اپنی مٹانا پڑے گا

کھلا ہم پر یہ تیری ہاں نہیں سے　　فنا کہتے ہیں کس کو اور بقا کیا
رہِ الفت میں خود گم ہو رہا ہوں　　کرے گا رہنمائی رہنما کیا

رُباعیات

ابرار احمد فاروقی عزمی متعلم مسلم یونیورسٹی

(۱) زمانہ پھر گیا! پھر جائے! کیا ہے!
متاعِ دل سلامت! کیا گیا ہے!
حدیثِ طور اب بھی گونجتی ہے،
فقط میری سماعت کی خطا ہے!

---

(۲) مری تخمیر خاکی، روح نوری!
مری تقدیر، فرقت اور حضوری!
لبوں سے جام کو رکھتا ہوں کچھ دور
متاعِ تشنگی ہے ہجر و دوری!

غزل

(از جناب غلام سجاد صاحب رضا بسمل بدایونی)

نومیدیم زعفو تو گاہے نبودہ است — کارے نکردہ ام کہ گناہے نبودہ است

تا شوق را بکوئے تو راہے نبودہ است — آں یکنفس کدام کہ آہے نبودہ است

آرے زتو دریغ نگاہے نبودہ است — بیچارۂ مگر سر راہے نبودہ است

آہم خجل زبخت سیاہے نبودہ است — جز دود بہر شعلہ کلاہے نبودہ است

تسکینِ شوق دیدن ماہے نبودہ است — اے دیدہ بازبیں کہ گناہے نبودہ است

برروئے من دو دیدہ چہ بیباک فتنہا — گوی مرا بدہر پناہے نبودہ است

اشکم بہ چشم روشنیِ دیدہ چوں رسید — گر دیدہ کامیاب نگاہے نبودہ است

ایں برہمی زجرأت عرضم رواسدار — مسکیں گدا بحضرتِ شاہے نبودہ است

داغم کہ ایں حجاب زداغِ دلم چرا است — شمعم حریف جلوۂ ماہے نبودہ است

نابردہ رنج غیر چہ داند نگاہ چیست — کارش بدل شکستن آہے نبودہ است

بسمل اگر ببزم تو جا یافت عیب نیست
گل منفعل زقرب گیاہے نبودہ است

لمعاتِ قمر

(از حضرت قمر بدایونی)

کہا کیا تم نے واعظ - رندِ بادہ خوار کیا جانے | تمہاری دین کی باتیں یہ دنیادار کیا جانے
اُسے بے سوچے سمجھے تیر برسانے سے مطلب ہے | جگر زخمی ہوا - یا دل نگاہِ یار کیا جانے
غمِ الفت ہے میری زندگی، یہ میں سمجھتا ہوں | اسے غمخوار کیا سمجھے اسے غمخوار کیا جانے
اذیت آبلہ پائی کی پوچھو قیس کے دل سے | یہ لیلیٰ کیا سمجھ سکتی ہے نوکِ خار کیا جانے
وہ دردِ دل کی حالت اپنے مُنہ سے تو نہیں کہتا | زبانِ حال کیا کہتی ہے یہ بیمار کیا جانے
اسے تو اپنی دُھن ہے شوقِ نظارہ سے مطلب ہے، | مآل اس آرزو کا طالبِ دیدار کیا جانے
کبھی کی ہے کسی مظلوم سے ظالم نے ہمدردی | دہانِ زخم کیا کہتا ہے یہ سوفار کیا جانے
گری ہے آشیاں پر جس کے بجلی موسمِ گُل میں، | وہ آوارہ وطن سیرِ گل و گلزار کیا جانے
خلش کیا ہے سبب کیا ہے مرض کیا ہے دوا کیا ہے | یہ باتیں آپ جانیں آپ کا بیمار کیا جانے
وہ ایک اللہ کا اور اسکی یکتائی کا قائل ہے | مسلماں اختلافِ کافر و دیندار کیا جانے

قمر اب تک تو مایوسی کا منظر ہے نگاہوں میں
اب آگے کیا دکھائے حسرتِ دیدار کیا جانے

جسٹس سیّد محمود کے ساتھ

۲ گھنٹے

(جناب احسن صاحب مارہروی لکچرار شعبہ اُردو)

سیّد محمود ایک معمولی نام ہے، جس سے دوچار نہیں بے شمار افراد موسوم کئے گئے اور رکھے جاتے رہیں گے، سُننے والے رات دن اس نام کو سُنتے ہیں اور کوئی خاص کشش وجذب نہیں پاتے، لیکن اسی نام کے ساتھ اگر ہائی کورٹ کے جج کی نسبت بڑھا دی جائے تو بے ساختہ سننے والوں میں ایک شغف پایا جائے گا اور ان کے حالات سننے اور معلوم کرنے کا اشتیاق پیدا ہو جائے گا۔

حقیقت میں یہ جذب داثر سیّد محمود کے نام میں نہیں بلکہ اُن کی عدیم النظیر لیاقت اور علمی جامعیت کی بدولت ہے، اُن کی شخصیت نے شہرتِ دوام نہ تو تصنیف وتالیف کے ذریعے حاصل کی ہے نہ اُن کی قابلیت نے لکچروں اور تقریروں سے قبولیت عام کا تمغا پایا ہے بلکہ اُن کی غیر معمولی دماغی قوّت نے اُن کی عظمت کا سکّہ دلوں میں ایسا جما دیا ہے کہ مٹائے نہیں مٹ سکتا، مبدا رفیّاض نے یہ جوہر اُن کو ایسا عطا فرمایا تھا جس کی مثال ونظیر اونچے اونچے مصنفین اور بڑے بڑے مقرّرین میں نہیں ملتی، یہی وہ قوت ہے جو درس کتابی اور امتحانات کے پاس کرلینے سے نہیں پیدا ہوتی،

"تا نہ بخشد خدائے بخشندہ"

اگرچہ اُن کی خصوصی شہرت عام طور سے قانونی معلومات کے ساتھ وابستہ ہے، لیکن جن لوگوں نے ان کو دیکھا ہے اور اُن کی ملاقاتوں اور صحبتوں میں باتیں سُنی ہیں وہ جانتے ہیں اور تصدیق کریں گے کہ اُن کی حذاقتِ ذہنی، وسیع النظری، اور سلامتی مذاق کا ثبوت ہر فن میں خواہ وہ ادب ہو یا فلسفہ، مذہب ہو یا تاریخ سب میں یکساں ملتا ہے، وہ بات بات میں ایسی ایسی باریکیاں نکالتے تھے

کہ سننے والے سُن کر دنگ رہ جاتے تھے، وہ اپنے عالمِ سرخوشی میں بھی ایسی پتے کی کہہ جاتے تھے کہ بڑے سے بڑا ہوشیار بھی اُس کی حقیقت کو نہیں پہنچتا تھا۔

روئے معنی ہے ہیکنے میں مجی علی کی طرف   تاکتا ہے تو ثریا کی سنہری بوتل

اُن کے تمام کمالات کی تفصیل میری طاقت سے باہر ہے، حُسنِ اتفاق سے مجھے چند ساعتیں ایسی نصیب ہو گئیں تھیں کہ اُن کی زیارت سے شرف اندوز بھی ہوا اور تھوڑی دیر کے لئے اُن کی پُر لطف اور دلچسپ باتوں سے سبق آموز بھی، اب سے چالیس اکتالیس برس پہلے کے واقعات ہیں، سب باتیں تو یاد نہیں دو چار باتوں کا خاکہ سا ذہن میں باقی رہ گیا ہے اُسی کو قلم بند کرتا ہوں:۔

ڈر ہے کہیں مٹ جائے نہ یہ نام بھی آخر   مدت سے اسے دورِ زماں میٹ رہا ہے

قبل اس کے کہ اپنے سُنے اور دیکھے ہوئے چند لطائف ضبطِ تحریر میں لاؤں۔ مولانا ڈاکٹر عبدالحق صاحب سکرٹیری انجمن ترقی اُردو کے ایک لکچر سے (جو اُنھوں نے مرحوم کے انتقال (۱۹۰۳ء) پر دیا تھا) چند سطریں بطورِ تائیدِ کلام نقل کرتا ہوں، وہ فرماتے ہیں:۔

"ایک بڑے عالم نے مجھ سے بیان کیا کہ اگرچہ وہ عربی نہیں جانتے تھے (ممکن ہے کہ وہ اُن بڑے عالم کے برابر عربی نہ جانتے ہوں مگر اس واقعے سے جو آیندہ سطروں میں لکھا جائے گا یہ مسلم ہے کہ وہ علم الادب کے سمجھنے کی پوری صلاحیت رکھتے تھے۔ از راقم) مگر جب کبھی کسی فقہی مسئلے کے دیکھنے کی ضرورت ہوتی تو وہ کتاب پڑھوا کر سنتے اور مطلب پوچھتے، لیکن بعض اوقات ادھر اُدھر کے بعض الفاظ سمجھ جانے سے کہتے کہ اس کا یہ مطلب نہیں ہے اور خود بیان کرتے، یہ مولانا فرماتے ہیں کہ اُن کی زبان سے ان مسائل کو سُن کر حیرت ہوتی تھی اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ تیرہ سو برس کے عرصے میں اگر کوئی شخص شارع کا صحیح مطلب سمجھا ہے تو وہ محمود ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ شخص کس بلا کا دماغ لے کر آیا تھا، اس کی قوتِ دماغی کا صرف وہی لوگ اندازہ کر سکتے ہیں جن کو اُس سے ملنے جلنے اور باتیں کرنے کا موقع ملا ہے، اُس کی باتیں نہایت پُر لطف اور مزے کی ہوتی تھیں، اُن میں ایک جادو تھا جو سامعین کے دل پر بے اختیار اثر کرتا تھا اور لوگ گرویدہ ہو جاتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ عام و خاص اور ہر فرقے میں مقبول تھا، اُس کا

علم اس قدر وسیع تھا کہ گویا وہ زندہ انسائیکلوپیڈیا تھا اور اس لئے اس کی باتیں اور گپ شپ نہایت دلچسپ اور بصیرت افروز ہوتی تھی کسی قسم کا مسئلہ اور کسی فن کی بحث اُس کے سامنے پیش کیجئے وہ کوئی نہ کوئی نئی بات ضرور سمجھا دیتا تھا وہ ساتھ ہی اس کے بڑا ظریف بھی تھا اور اس کی ظرافت بھی عجب شان کی ظرافت تھی اُس کے ایک ٹھٹھول میں وہ وہ مضمون اور نکات ہوتے تھے جو عمر بھر کے مطالعے اور کتابوں کے کھنگالنے سے بھی حاصل نہیں ہو سکتے وہ ایک ایک چٹکلے میں بڑے بڑے مسائل کا فیصلہ کر دیتا تھا اُس کے خاص خاص لفظ اور خاص خاص جملے جن میں جدت اور طباعی کی بو پائی جاتی تھی اب تک دلوں میں چبھتے ہیں، اس کا لب ولہجہ اس کی شیریں بیانی اور بعض اوقات اُس کے ڈرامیٹک (Dramatic) حرکات انسان کو بھڑکا دیتی تھیں اس کی گفتگو میں جو سحر تھا وہ میں نے آج تک کسی میں نہیں دیکھا۔ علاوہ اس کے ان سے باتیں کرنے میں جو بڑا سبق حاصل ہوتا تھا وہ یہ تھا کہ واقعات کے ہر پہلو پر نظر ڈالنی چاہئے ورنہ صحیح نتیجے کا اخذ کرنا محال ہے رسوم کی پابندی، عادت کی بندھن ہمیشہ بلا ارادہ بھیڑیا چال پر مجبور کرتی ہے اور تقلید اس قدر اندھا کر دیتی ہے کہ معمولی سی معمولی بات جو خلافِ عادت ہے نظر نہیں آتی، وہ ہر بات میں ایک نیا پہلو دکھاتا تھا جو ہمیں نظر نہیں آتا تھا، اور معمولی سی معمولی بات میں وہ شان پیدا کر دیتا تھا جو دوسروں کو نہیں سوجھتی تھی اور یہی عین مقصد ہے تعلیم و تربیت کا کہ انسان واقعات کے ہر پہلو پر صحت کے ساتھ نظر ڈال سکے اور جو یہ نہیں تو کوئی تعلیم انسان کے مفید نہیں ہو سکتی۔"

جو واقعات اب قلم بند کئے جائیں گے وہ بظاہر ٹھٹھول اور ظرافت یا گپ شپ سے زیادہ وقیع معلوم نہ ہوں گے، لیکن اقتباس مندرجہ صدر پڑھنے کے بعد بقول مولانا حالی ماننا پڑے گا۔

لاکھ مضمون اور اُس کا ایک ٹھٹھول — سو تکلف اور اس کی سیدھی بات
دل میں چبھتا تھا، وہ اگر بمثل — دن کو کہتا دن، اور رات کو رات

غالباً ۱۹۰۵ء کا مذکور ہے کہ راقم الحروف کسی ضرورت سے علی گڑھ آیا ہوا تھا لٹن لائبریری میں سید افتخار عالم مرحوم مؤلف حیاۃ النذیر جو رشتے میں میرے چچا تھے، ملازم تھے، اور سید ابن محمد بلگرامی جو میرے قریبی عزیز ہیں، کالج میں پڑھتے تھے، اس سلسلے سے میرا قیام کالج ہی میں ہوا جسٹس سید محمود مرحوم ہائی کورٹ

کی جی سے استعفا دے کر علی گڑھ آ چکے تھے اور اکثر یہیں مقیم رہتے تھے، سنا گیا کہ وہ معمولاً بعد مغرب کالج کا گشت لگایا کرتے ہیں، کبھی کسی متعلم کے کمرے میں، کبھی کسی معلم کے پاس بے تکلف بیٹھ جاتے ہیں اور گھنٹوں اپنے لطائف وظرائف سے محظوظ و مستفیض کرتے رہتے ہیں، لڑکوں کے ساتھ اکثر بیت بجثی کا سلسلہ چھڑ جاتا تو آدھی آدھی رات تک چھڑا رہتا، اور کسی مولوی کے کمرے میں پہنچ جاتے تو مختلف علمی مباحث شروع ہو جاتے اور جب تک سننے والے اکتا اکتا کر ادھر ادھر نہ ہو جاتے وہ خود اٹھنے کا نام نہ لیتے، اپنے اسی زمانہ قیام میں ایک دن معلوم ہوا کہ موصوف اس زمانے کی کچی بارگ کے کسی کمرے میں رونق افروز ہیں، بہت دنوں سے ان کے دیکھنے کا اشتیاق تھا، یہ خبر سنتے ہی ہم چند نوجوان جن میں مذکورۃ الصدر راعزؔہ بھی شامل تھی اٹھ کھڑے ہوئے اور کچی بارگ میں پہنچے دریافت کرنے سے پتہ چلا کہ شمس العلما مولانا خلیل احمد اسرائیلی مرحوم (پروفیسر عربی) کے کمرے میں موجود ہیں، ہمارا نوعمری کا زمانہ تھا اور راجنبیت کی وجہ سے طبیعتوں میں جھجک بھی تھی، یکایک کمرے میں جانے کی جرأت نہ کر سکے اور جھانک کر دیکھنا شروع کیا، ابتدائی شب تھی کمرے میں لیمپ جل رہا تھا، اس تاک جھانک سے ہم لوگوں کی پرچھائیاں کمرے میں پڑیں جس کو دیکھکر ایک بھاری آواز میں یہ الفاظ سنائی دیئے "کون صاحب ہیں" اس آواز کے سننے کے بعد ہم لوگ آگے بڑھے اور مرحوم کے سامنے پہنچ گئے، فرمانے لگے "آیئے آیئے تشریف رکھئے" اس کمرے میں دو چار پائیاں آمنے سامنے بچھی ہوئی ہیں، درمیان میں فرش تھا جس پر چار چھ آدمی بیٹھ سکتے تھے، وہیں ہم سب بیٹھ گئے ایک طرف کے پلنگ پر خود سید محمود رونق افروز تھے، دوسرے مقابل کے پلنگ پر مولانا خلیل احمد، اور ایک گوشے میں لالٹین کے پاس ایک عربی پڑھنے والا طالب علم کتاب کھولے بیٹھا تھا، سید محمود مرحوم کی یہ ہیأت تھی کہ صرف قمیض پہنے ہوئے تھے اور ایک موٹا سا ڈنڈا چارپائی کی پٹی کے سہارے رکھا ہوا تھا اور خود پاؤں لٹکائے بیٹھے تھے۔ ہمارے پہنچنے سے پہلے کیا باتیں ہو رہی تھیں اس کا ہمیں کچھ علم نہیں، اس زمانے میں ہم لوگوں کی عمریں ۲۰۔ ۲۵ برس کے لگ بھگ تھیں، بیٹھنے کے بعد جو پہلی بات ہم سے مخاطب ہو کر پوچھی وہ یہ تھی کہ آپ لوگوں کی سیکنڈ لینگویج (Second Language) کیا ہے جواباً عرض کیا کہ ہم یہاں کے طالب علم نہیں، یہ سن کر فرمایا، اچھا آپ مہمان ہیں، فرمایئے وطن کہاں ہے۔ کہا گیا کہ

مارہرہ' فرمایا وہ مارہرہ جہاں کی چٹنی مشہور ہے' عرض کیا کہ جی ہاں۔ پھر پوچھا کہ آپ کمبوہ ہیں۔ بتایا کہ نہیں' سادات کے خاندان سے ہیں' یہ سن کر مسکرائے اور کہا کہ اچھا آپ تو ہمارے بھائی نکلے' حسب ونسب کے متعلق دو ایک معمولی باتیں پوچھکر فرمانے لگے کہ آپ اب کے آئیں گے تو ہمارے لئے مارہرے کی چٹنی کا ایک گلھڑ لائیں گے؟ عرض کیا گیا کہ ضرور' فرمایا' دیکھئے آپ وعدہ کر رہے ہیں (مولانا خلیل احمد اور اپنی طرف اشارہ کر کے کہا) شاہدینِ عادلین موجود ہیں ایسا نہ ہو کہ ایفائے عہد نہ کیا جائے۔ اس کے بعد مختلف موضوع پر باتیں ہونے لگیں' جن میں سے ۵-۶ عنوانوں کی متفرق باتیں یاد رہ گئیں' ہیں جن کا نہ اور چھور یاد ہے نہ سلسلہ قائم ہے انھیں ادھ کٹ باتوں کو بغیر کسی ترتیب کے جُدا جُدا نمبروں میں لکھا جاتا ہے۔

۱۔ فرمانے لگے ہم ۱۴-۱۵- برس کے تھے کہ دِلّی میں ایک مشاعرہ ہوا' مرزا غالب بھی اس مشاعرے میں شریک تھے' ہم نے بھی غزل کہی اور مشاعرے میں پڑھی۔ اُس کا ایک شعر سُنایا اور کہا کہ اس شعر پر مرزا غالب نے ہماری پیشانی چومی تھی' وہ شعر یہ ہے:۔

کانٹے بچھا نہ راہ میں اے حسرتِ وصال ۔۔۔ نازک ہیں رہ روانِ غریب الوطن کے پانوں

اس زمین میں مرزا غالب کی بھی غزل ہے جس کا ایک مطلع اور مقطع یہ ہے:۔

دی سادگی سے جان پڑوں کوہکن کے پانوں ۔۔۔ ہیہات کیوں نہ ٹوٹ گئے پیر زن کے پانوں

غالبؔ مرے کلام میں کیوں کر مزا نہ ہو ۔۔۔ پیتا ہوں دھو کے خسرو شیریں سخن کے پانوں

۲۔ سید افتخار عالم مرحوم مؤلف حیاۃ النذیر نے باتوں باتوں میں کہا کہ ایک مرتبہ میں پٹنہ گیا' چند نوجوانوں کے مجمع میں آپ کا تذکرہ ہو رہا تھا انھیں باتوں میں آپ کے مذہب کی بابت بھی گفتگو شروع ہو گئی۔ ایک صاحب بہت وثوق سے کہہ رہے تھے کہ سید محمود شیعہ ہیں' میں نے اس کی تردید کی۔ یہ سن کر پوچھنے لگے تو آپ نے میرا مذہب کیا بتایا' انھوں نے کہا کہ سنّی۔ تنبیہانہ انداز سے کہنے لگے کہ تم نے بھی غلط کہا۔ اب اگر تم سے کوئی پوچھے کہ محمود کا مذہب کیا ہے' تو کہنا "شمس تبریزی" یہ کہکر حسب ذیل شعر جو غالباً حضرت شمس تبریزیؒ کا ہے دردناک لہجے میں اثر انداز طریقے سے پڑھا:۔

نمی دانم زمنع گریہ مطلب چیست ناصح را ۔۔۔ دل از من دیدہ از من آستیں از من کنار از من

آخری مصرع پڑھتے وقت دیکھا گیا کہ آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے ہوئے تھے اور آستین کا لفظ ادا کرتے ہوئے اپنی آستین سے آنسو پونچھ رہے تھے۔

۳۔ اسی سلسلے میں شعر و شاعری کا تذکرہ چھڑ گیا، فرمانے لگے پٹنہ میں ایک رئیس تھے (نام نہیں بتایا) وہ اپنا دیوان بڑے اہتمام سے جزدان میں بند رکھتے اور خاص تکلف و تعظیم کے ساتھ اُس کو کسی اونچے مقام پر رکھواتے۔ جب کوئی بڑا شخص، جو اُن کے خیال میں سخن شناس بھی ہوتا، اُن سے ملنے آتا تو بڑی احتیاط سے وہ دیوان اُتارا جاتا، اشعار سنانے سے پہلے ہر شعر کے مناسب پہلے کوئی تعریف و تشریح کی جاتی پھر سنایا جاتا، ہم بھی اُن سے ملنے گئے اور وہ اپنے الہاماتِ سخن کے سنانے کو تیار ہوئے اپنی شاعری کی توصیف خود فرمائی اور خاص خاص تخیلات کی داد چاہی، اسی ضمن میں وہ پٹنوی صاحب کہنے لگے کہ عام شعرا کی یہ تخصیص ہے کہ وہ عاشقِ جاں باز کو ہمیشہ، ناتواں، نحیف اور لاغر لکھا کرتے ہیں مگر یہ کوئی ضروری بات نہیں کہ عاشق دُبلا پتلا ہی ہو، کیا کوئی شاعر موٹا تازہ نہیں ہو سکتا۔ سنئے میں اس کے خلاف کہتا ہوں :-

میں وہ پہلوانِ عشق ہوں کہ بعد مرگ بھی　　　　میرے نہالِ قبر پہ مُگدر ہلا کریں

مرحوم نے جب یہ شعر سُنایا ہے کہ مُگدر کے لفظ پر دونوں ہاتھوں کو جنبش دے کر مُگدر ہلانے کی تصویر کھینچ دی تھی۔

۴۔ ایک موضوع کے بعد ہی بے تامل و توقف دوسرا موضوع چھیڑ دیتے تھے، چنانچہ فرمانے لگے کہ تم نے اس مدرسے (محمڈن کالج) کی تاریخ بھی سُنی ہے۔ جواب میں انکار کیا گیا، کہنے لگے، سنو!

چلا گھڑا جب یہ بنا آسماں

یہ مصرع پڑھکر پوچھنے لگے، جانتے ہو گھڑا کسے کہتے ہیں، کہا گیا کہ ہم نہیں جانتے، ارشاد ہوا کہ کنوئیں پر پانی کھینچنے کے لئے جو گھڑی ہوتی اُسے جانتے ہو، اقرار کیا گیا، فرمایا اس کے باپ کو گھڑا کہتے ہیں، پھر پورا شعر جس کو اُنھوں نے کالج کی تاریخ کہا تھا یوں پڑھا۔

چلا گھڑا جب یہ بنا آسماں　　　　مدرسے کی بنیا دڈالو یہاں

خیال ہے کہ اس کے علاوہ بھی دو ایک شعر اسی تاریخ کے سلسلے میں اور پڑھے تھے مگر افسوس کہ وہ یاد نہیں رہے۔ لفظ مدرسہ، دال کے جزم سے صحیح ہے، اگر انھوں نے عام بول چال کی پابندی کے لحاظ سے اس غلطی کو غلطی نہیں سمجھا، اور یہ اُن کی طباعیوں کا معمولی اجتہاد ہے، جس پر حرف گیری نہ کرنی چاہیئے۔

۵۔ اوپر لکھا گیا ہے کہ مولانا خلیل احمد مرحوم کے کمرے میں ایک عربی خواں طالب علم کتاب کھولے بیٹھا ہوا تھا، ہم سے باتیں کرتے کرتے یکایک اس کی طرف پھر پڑے اور بایں الفاظ پوچھنے لگے "لونڈے کیا پڑھتا ہے؟" اُس نے جواب میں آہستہ سے کہا، سُلَّم۔ مگر وہ سمجھے کہ سَلَّم سین کے زبر (فتحہ) سے کہہ رہا ہے، بے ساختہ پوچھنے لگے "کیا سَلمٰی تیری ماں کا نام تھا" اور یہ کہکر فرمانے لگے کہ دیکھئے مولانا، پڑھیں فارسی بیچیں تیل دیکھو یہ قدرت کے کھیل۔ اتنی بڑی کتاب پڑھتا ہے اور یہ نہیں جانتا کہ سلّم معروف کا صیغہ ہے یا مجہول کا۔ واللہ (ہائے ہوز کو زیادہ کھینچ کر کہا) اس کتاب کو پڑھے ہوئے مجھے ۴۲ برس ہو چکے، اس کے بعد ایک ڈانٹ بتا کر کہا "کھول لونڈے کتاب اور بتا کہیں سے" اوّل تو وہ غریب جھجھکا مگر ان کے اصرار پر کسی صفحے کا کوئی جملہ پڑھا۔ ۲-۳ لفظ سننے کے بعد اُسے روک دیا اور آگے کی عبارت اپنی یاد سے پڑھنے لگے، جہاں تک راقم الحروف اپنی ۴۰ سال قبل کی یادداشت اور حافظے سے کام لے سکتا ہو کہہ سکتا کہ ۳-۴ منٹ تک مُسلّم کی عبارت حفظ پڑھتے رہے، پڑھتے پڑھتے جَلْبابٌ کا لفظ آیا (بمعنی چادر اور اوڑھنی) وہیں رک گئے، اور دوسرا پہلو بدل دیا۔ مولانا سے مخاطب ہو کر فرمایا، جلباب کے معنی کیا ہیں؟ مولانا نے کہا میری عقل پر تو پردہ پڑا ہے نہیں جانتا۔ فرمانے لگے، جلباب نام ہے جُلّاب کے باپ کا، اور وہ اس طرح کہ جَل پانی کے معنی میں لیا جائے اور رباب کی آخری ب میں یہ تصرّف سمجھا جائے کہ اُس کے ایک نقطے (٠) کے اوپر دو مکھیاں ہگ گئی ہیں، اس طرح (ﭖ) باب کی جگہہ باپ ہو گیا ہے۔

۶۔ اس کے بعد صنائع بدائع کا مذکور ہونے لگا، اور لف و نشر کی تعریف اور مثالیں بیان کرنے لگے، اوّل اُردو کے پھر فارسی، اُس کے بعد یہ کہکر کہ میں اپنے دادا کا کلام سُناتا ہوں، ایک عربی شعر حضرت علی مرتضیٰ رضؓ کا پڑھا جس میں لف و نشر کی مثال موجود تھی، افسوس ہے کہ ان مثالیہ اشعار میں سے کوئی شعر میرے حافظے میں باقی نہیں رہا۔ مگر یہ یاد ہے کہ حضرت مولا علیؓ کا شعر پڑھکر جوتا اُتارا اور پلنگ پر دوزانو

بیٹھ گئے اور کہنے لگے کہ اب وہ کلام پڑھتا ہوں جس کے سامنے میرے دادا کا کلام بھی ہیچ ہے' پھر اعوذ باللہ اور بسم اللہ پڑھکر سورۃ البقرہ کے تیسرے رکوع کی دوسری آیت تلاوت فرمائی' یعنی:-

الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ

جس نے تمہارے لئے زمین کو بچھونا اور آسمان کو چھت بنایا اور آسمان سے مینہ برساکر زمین سے تمہارے کھانے کیلئے

مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّکُمْ

انواع واقسام کے میوے اگائے۔

واضح رہے کہ لف ونشر کی دو قسمیں ہیں' ایک مُرتب' دوسری غیر مُرتب' اس آیت میں غیر مرتب کی مثال ہے۔ اس کے بعد مولانا کمرے سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور ہم سب کو ساتھ لئے ہوئے مسجد میں تشریف لائے' مسجد اُس زمانے میں مکمل نہیں ہوئی تھی تاہم جس قدر بن چکی تھی اسی میں نماز ہوا کرتی تھی' صحن مسجد میں پہنچ کر پوچھا تم میں کوئی حافظ ہے' راقم الحروف اُس زمانے میں حفظ کلام مجید کرچکا تھا' سید افتخار عالم صاحب نے میرا نام بتانا چاہا مگر میں نے اُن کو اشارے سے منع کیا' کیوں کہ اُن کی ملاقات اور بات چیت میں کافی وقت ختم ہو چکا تھا' اُن کی انداز مزاج اور طوالت پسندی سے خوف تھا کہ خدا جانے وہ کیا حکم دیں اور کب تک اس کی تعمیل میں مصروف رہنا پڑے' اتفاق سے اُسی وقت دیوٹی شاپ کے منیجر جو حافظ تھے اور جن کا نام یاد نہیں رہا وہاں آ گئے اور اُن کو پیش کر دیا گیا' اُن سے کہا کہ تم مسجد کے اندر ممبر پر جاکر بیٹھو' اور میں صحن میں (جہاں اب حوض بنا ہوا ہے) کھڑا ہوں اور اتنی بلند آواز سے سورۃ الرحمٰن کی تلاوت کرو کہ میں یہاں سنوں' اس گفت وشنید میں موصوف نے پہلو بدلا اور ہماری طرف اُن کی پشت ہوگئی۔ اس موقع کو غنیمت سمجھکر ہم لوگ وہاں سے کھسک گئے۔ صبح کو معلوم ہوا کہ بہت دیر تک ان نحیف الجثہ حافظ صاحب کو جھنجھوڑتے رہے کبھی خود ایک طرف چلے جاتے کبھی ان کو دوسری طرف بھیج دیتے اسی ہیرا پھیری میں گھنٹہ سوا گھنٹہ گذار دیا۔

بظاہر یہ چند باتیں بے سروپا اور اوٹ پٹانگ سی معلوم ہوتی ہیں لیکن انھیں سے اُن کی ذہنی جودت' حافظے کی قوت اور دماغی طاقت کا بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کبھی کبھی جب ان واقعات کا

خیال ہوتا تو مجھے بھی یہ گمان ہوتا تھا کہ ان کی حیثیت گپ شپ سے زیادہ نہیں اور یہ باتیں منگھڑت سے زیادہ وقیع نہیں، مگر مدت کے بعد بعض باتوں نے اُن کی وسیع النظری اور جامعیت کو بے شک و شبہ ثابت کر دیا، مثلاً تصرفاتِ شعری کے سلسلے میں ممدوح نے جو مکھی کا تصرف بیان کیا تھا اُس کو مذاق اور ظرافت سے زیادہ وقعت نہیں دی گئی، اتفاقاً ایک دن تذکرۂ خزانۂ عامرہ مؤلفہ علامہ میر غلام علی آزاد بلگرامی زیر مطالعہ تھا، خاقانی کے تذکرے میں حضرت آزاد بلگرامی تحریر فرماتے ہیں۔

خاقانی وقتے ایں بیت بہ خاقان (خاقان کبیر منوچہر شرواں شاہ ۵۹۰ھ) فرستاد

وشقے دہ کہ در برم گیرد　　　یا وشاقے کہ در برش گیرم

"وشق بمعنی پوستین است، و وُشاق بضم، غلام امرد۔ خاقان متغیر گشت کہ چرا ہر دو نہ خواست، و قصور در ہمت شاہی متصور نمودہ تردید کرد، چوں ایں خبر بہ خاقانی رسید، مگسے را بال و پر کندہ نزد خاقان فرستاد کہ گناہ از من نیست از مگس است، یعنی من با وشاقے گفتہ بودم بجائے یک نقطہ، مگس فضلہ انداختہ یائے دو نقطہ ساخت، خاقان ازیں لطیفہ بشگفت در آمد و خاقانی را موردِ انعام ساخت۔"

(ترجمہ:۔ ایک موقع پر خاقانی نے یہ شعر لکھ کر خاقان شاہ کو بھیجا اور اُس میں دو چیزوں کی خواہش کی، کہ یا تو مجھے کوئی پوستین (گرم شال وغیرہ) عنایت ہو جس کو میں اپنی بغل میں دباؤں، یا کوئی نوجوان معشوق عطا ہو کہ وہ مجھے اپنی بغل میں دبائے۔ اس شعر کو پڑھ کر خاقان برہم ہوا کہ خاقانی نے دونوں چیزیں کیوں نہ مانگیں، گویا یہ بات شاہانہ ہمت کی کوتاہی کو ثابت کرتی ہے۔ اس برافروختگی کی خبر جب خاقانی کو پہنچی تو اُس نے ایک مکھی پر و بال نوچ کر اس کے پاس بھیجی اور کہلا بھیجا کہ خطا میری نہیں ہے بلکہ اس مکھی کی ہے اس نے ایک نقطے والی بے کے نیچے بیٹھ کر اپنے فضلے سے دو نقطے والی (ی) بنا دی ہے میں نے با وشاقے کہا تھا نہ یا وشاقے، بادشاہ یہ لطیفہ سُن کر بہت خوش ہوا اور خاقانی کو انعام بخشا۔ بادشاہوں کے نبض شناس نے سچ کہا ہے،

"گاہے بسلامے بہ رنجندہ و گاہے بہ دشنامے خلعت دہند،"

نتیجۂ کلام یہ ہے کہ مرحوم سید محمود کے متعلق اس قسم کے چٹکلے اور لطیفے بہت مشہور ہیں جو اکثر

اُن کے ملنے والوں نے سنے اور دیکھے ہیں، ابھی ان کے دیکھنے والے بکثرت موجود ہیں اگر اس ط
کے علمی، اور قانونی برجستہ لطائف وظرائف جو اثنائے ملاقات میں اُن کی زبان سے ادا ہوتے،
ہیں اور وہ یقیناً ملنے والوں کو یاد ہوں گے قلم بند کرلئے جائیں تو یہ ایک عجیب وغریب مجموعۂ معلوما
ہوگا اور ادبی ملفوظات کا بہترین مرقع سمجھا جائے گا۔

اس وقت مجھے اپنی ایک ملاقات کے جو واقعات یاد رہ گئے تھے اُنھیں علی گڑھ میگزین :
چھپنے کے لئے بھیجتا ہوں بشرط موقع وفرصت آیندہ چند ایسی حکائتیں پیش کی جائیں گی جو میری دیکھ
ہوئی نہیں بلکہ سنی ہوئی ہوں گی مگر وہ روایت، درائیت سے بے گانہ نہ ہوگی۔

غزل

(اظہر کمالی متعلم مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

سچ کہو کیا ستم نو کوئی ایجاد کیا — آج کیا تھا جو مجھے تمنے بہت یاد کیا
جب اسیرانِ قفس ہوگئے مانوسِ قفس — بال وپر نوچ کے صیاد نے آزاد کیا
آفریں لذتِ ایذائے محبت کہ مجھے — غرقِ کیفِ خلشِ عشق خداداد کیا
ہوئے زندان سے رہا زیست کی بیڑی بھی کٹی — دوہری قیدوں سے اجل نے ہمیں آزاد کیا

عمر ہو ذوقِ تصور کی دراز اے اظہر
دل کو حیرت کدۂ حسنِ خداداد کیا

نوجوانانِ علی گڑھ سے خطاب

از آفتاب احمد صدیقی صبحی (ردولوی) متعلم بی اے آنرز علی گڑھ

آہ - اے مخمورِ جامِ صحبتِ شامِ نشاط
اب کسی صورت سے رفعِ سرگرانی چاہیئے

آتشِ غیرت سے گرما دے جہانِ آب و گل،
اُس طرح اظہارِ جوشِ نوجوانی چاہیئے

لب کشا ہو کر دکھا دے اپنا اعجازِ کلام،
میں نہیں کہتا کہ اب بھی بے زبانی چاہیئے

سونے والوں سی کہاں تک خواب آور داستاں
نیند کو بھی نیند آئے وہ کہانی چاہیئے

اشک افشانی سی کیا حاصل بجز اظہارِ عجز
ہے اگر غیرت تو جوئے خوں بہانی چاہیئے

اب تو ہر حرکت سے پیدا کر شجاعت کا غرور
اب تو ہر جنبش حریفِ ناتوانی چاہیئے

شاہدِ خنجر کی بھی کچھ دن پرستاری سہی
جنگ کے میدان میں بھی دھونی رمانی چاہیئے

آہ - اے غافل تجھے سبطِ پیمبر کی قسم
شوق سے بڑھ بڑھ کر اب گردن کٹانی چاہیئے

جس سی وابستہ ہے صبحی دونوں عالم کی اُمید
اُس کے در سے ہمکو اذنِ حکمرانی چاہیئے

جواہر پارے

(جناب جگر مرادآبادی)

(۱)

وہ مست ہوں کہ اُلٹ دی جب آستیں میں نے
دکھا دیے حرم و دیر سب یہیں میں نے
کبھی یہ وہم کہ میں کیا ہوں، میرا سجدہ کیا
کبھی یہ فخر جھکا دی اگر جبیں میں نے

(۲)

جب تک شباب عشق مکمل شباب ہے
پانی بھی ہے شراب، ہوا بھی شراب ہے
جو قوت نہ زندگی ہے نہ پیغام زندگی
وہ حسن قہر ہے، وہ محبت عذاب ہے

آثم

(گولڈ اسمتھ کا شاہکار)

(سید سخی حسن نقوی متعلم بی۔ اے)

جہاں طوفان سے سر لگائے ہوئے طارس کی چوٹیاں دور سے مسافر کی نظروں میں ہلتی ہوئی چٹانیں گرتے ہوئے چشمے اور ہولناک مناظر پیش کرتی ہیں۔ اس وحشتناک پہاڑ کے سنسان قلب میں بستی سے دور۔ معاشرت سے جدا۔ "انسان نفور" آثم رہتا تھا۔

آثم کا عنفوان شباب عام لوگوں میں بسر ہوا۔ ان کی تفریحات میں شریک رہتا۔ مخلوق سے محبت اور ہمدردی اس کے قلب میں انتہا درجہ کی تھی۔ رحم و کرم کے سبب وہ تمام مال و متاع حاجت مندوں کی حاجت روائی میں صرف کر بیٹھا سائل اس کے در سے کبھی محروم نہ جاتا تھا۔ درماندے مسافر اُس کے مکان سے کبھی بغیر ضیافت نہ پلٹتے تھے۔ اُس کی سخاوت کا ہاتھ اس وقت رکا جب مفلسی نے اُسے شل کر دیا۔

دولت کو ہمدردی کے قدموں پر اس طرح نچھاور کر کے وہ اُن لوگوں سے "تشکر آمیز" معاوضہ کی اُمید لگائے ہوئے تھا جو اُس کے دست کرم سے فیض اُٹھا چکے تھے۔ اور اُمیدواری کے یقین پر اپنا کاسۂ گدائی پیش کرتا تھا۔ مگر ناشکر دنیا اُس کے سوالوں سے تھک گئی۔ کیونکہ رحم ایک وقتی جوش ہے، لہذا اُس نے نوع انسانی کو اس روشنی میں دیکھنا شروع کیا جس میں اس سے قبل نہ دیکھا تھا۔ اب اس نے ہزاروں گناہ پائے جن کے ارتکاب کا اسے شک بھی نہ ہوا تھا جہاں گیا اُس نے احسان فراموشی۔ منافقت۔ دغا بازی کا جال پھیلا ہوا پایا۔ جس کے باعث نوع انسان سے نفرت اس کے قلب میں جاگزیں ہوتی گئی اس نے آبادی کے چھوڑنے کا ارادہ کر کے جو اُس سے متکبرانہ نفرت سے پیش آ رہی تھی اس سنسان خطّہ کو مسکن قرار دے لیا تھا تاکہ وہ خلوت

میں اس جذبہ تنفر پر غور کرے اور اپنے قلب سے گفتگو کرے جس کو وہ ایماندار سمجھتا تھا۔ پہاڑ کا ایک غار زمانہ کے سرد و گرم سے اس کا محافظ۔ محنت سے چنے ہوئے پھل اُس کی غذا۔ خطرناک اور پرہیبت گہرے چشمے اس کی سیرابی کا سامان تھے۔ اس طرح تمدن سے دور غور و فکر سے زندگی بسر کرتا تھا اور کبھی کبھی آزادی کا تخیل سرمایۂ مسرت بھی بہم پہونچاتا تھا۔

پہاڑ کے دامن میں ایک وسیع جھیل جھلملا رہی تھی جسکی شفاف سطح پر پہاڑ کے ہیبت ناک مناظر اپنا عکس ڈال رہے تھے اس وسیع چشمۂ آب پر اکثر وہ بھی بعض اوقات اتر آتا تھا اور اسکے ساحل پر لیٹ کر ایک نظر ساکن سطح پر ڈالتا تھا اور جذبۂ بے خودی سے مجبور ہو کر اکثر کہہ اُٹھتا "مناظر کتنے دلکش ہیں۔ بھیانک ہونے پر بھی کس قدر پیارے ہیں۔ زمین کا سطح فرش ابر سے سرگوشیاں کرنے والی چوٹی سے کیسا مقابلہ کر رہا ہے! مگر ان مناظر کا حسن اُن کے فوائد کے مقابل نہیں لایا جا سکتا۔ سیکڑوں دریا یہاں سے سیراب ہو کر نکلتے ہیں جو مختلف ممالک میں صحت اور شادابی تقسیم کرتے ہیں اور کروٹیں لیتے چلے جاتے ہیں۔ دنیا کی ہر شے حسن انصاف اور عقلمندی کا مظہر ہے، مگر انسان! ــــ دامنِ فطرت کا داغ، مخلوق میں وحشی ہے۔ طوفان اور گرداب مفید مگر شریر ناشکرا انسان عالم کے صفحۂ سادہ پر ایک دھبہ ہے۔ میں کیوں ایسی نوع میں پیدا کیا گیا جس کے جرائم خالق عالم کے دامن تدبر کو داغدار بناتے ہیں؟ اگر انسان معصوم ہوتا تو تمام نظام عالم متحد اور منظم ہوتا۔ اگر انسان آئینۂ اخلاق ہوتا تو تمام دنیا اس کے پرتو سے چمک اُٹھتی۔ پھر کیوں۔ اے پیدا کرنے والے تو نے مجھے تاریکی۔ شک۔ اور ناامیدی میں قید کر دیا ہے؟"

ناامیدی کا لفظ لبوں سے نکلکر فضا میں پھیلتے ہی وہ فوراً جھیل میں کودنے والا تھا کہ اپنے شک کو اطمینان سے تبدیل کر دے اور اپنی کشمکش کا خاتمہ کر دے۔ اتنے میں اس نے ایک بزرگ ہستی کو پانی کی سطح پر اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ وہ بغیر کچھ سوچے ہوئے اپنے ارادہ سے باز آیا۔ ٹھہرا۔ غور کیا اور اُن بزرگ کے بشرے میں تقدس اور ہیبت کی جھلک دیکھی۔

"ابن آدم" فرشتہ چلایا "جلد بازی سے باز آ۔ خدا نے تیرے انصاف۔ ایمانداری اور تکالیف کو دیکھکر مجھے تسلی کے لئے بھیجا ہے۔ اپنا ہاتھ مجھے دے اور بغیر لغزش جدھر میں لیجاؤں میرا

اتباع کر۔ مجھ میں ایمان ملکی کا نظارہ کر جو رسولِ معظم کا عطا کیا ہوا ہے تاکہ ان لوگوں کو گمراہی سے پھیروں جو خواہشات کی بنا پر نہیں بلکہ تحقیق حق کی غرض سے غلطی میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔"

آثم فوراً جھیل میں اُتر گیا اور اجنبی اُسے پانی کی سطح پر لے چلا بیچ جھیل میں پہونچکر دونوں ڈوبنے لگے۔ پانی سروں سے اونچا ہو گیا۔ کچھ عمق طے کرنے کے بعد قریب مرگ آثم نے خود کو آسمانی رہبر کی معیت میں تہ آب دوسرے عالم میں پایا جہاں انسانی قدم پہونچ بھی نہ سکتے تھے۔ اُس کی حیرانی بیان سے باہر تھی۔ وہاں اس نے ایسا ہی سورج اسی طرح کا پُرسکون آسمان اور پیروں کے نیچے لہلہاتا ہوا سبزہ پایا۔ "تُو سا تیری حیرانی دیکھ رہا ہوں" فرشتہ نے کہا۔ "مگر ذرا توقف کر۔ یہ دنیا بھی خدا کی مخلوق ہے۔ اس دنیا کے ساکن تیرے خیالی ڈھانچوں پر خلق کئے گئے ہیں۔ یہ بالکل خطا اور گناہ سے منزّہ ہیں۔ یہ دنیا تمام اُمور میں تیری بستی سے مشابہ ہے۔ مگر یہاں کے ساکن معصوم ہیں۔ اگر تو اس جگہ کو اپنی دنیا سے زیادہ خوشگوار پائے تو حیات کی باقی ساعتیں یہاں بسر کرنے کی تجھے اجازت ہے۔ مجھے تھوڑی دیر اپنی مصاحبت کی اجازت دے تاکہ میں تیرے ہونے والے مصاحبوں سے تیرا تعارف کرادوں اور تیری نئی قیامگاہ بھی بتلادوں۔"

"ایک معصوم دنیا! ذی عقل مخلوق! اور جرائم سے پاک!!" آثم نے انتہائی مسرت میں کہا۔ "اے خدا۔ میں تیرا شکر کرتا ہوں کہ آخر کار تو نے میری التجا سنی۔ یہاں حقیقتاً خوشی۔ مسرت۔ اور راحت حاصل ہوگی کاش میں ابد تک ان لوگوں میں زندگی بسر کرتا۔ جو احسان فراموشی غیر منصفی۔ دغا بازی۔ تشدد۔ اور اُن ہزاروں جرائم کے ارتکاب سے منزّہ ہیں جن سے سوسائٹی وبال ہو جاتی ہے۔"

"کلمات مسرت کو روک"۔ فرشتہ نے جواب دیا۔ "اپنے اِرد گِرد دیکھ اور ہر شے اور فعل پر غائر نظر ڈال اور مطالعہ کا نتیجہ بیان کر۔" اثم اور اس کا رفیق کچھ دیر تک خاموش سفر کرتے رہے۔ آثم کبھی حیرت میں محو ہو جاتا تھا اور پھر چونک کر اپنی رائے ظاہر کرتا تھا۔ یہانتک کہ آبادی کے نشانات نظر آنے لگے جو اس کی دنیا سے مشابہ تھے۔ لیکن یہ عالم تحتانی ابھی تک زمانہ قدیم کی طرح بھیانک تھا۔

آثم نے کہا یہاں شکاری اور غیر شکاری جانور بھی ہیں جو محض شکم پرستی کی غرض سے زندہ رہے ہیں۔ یہ بالکل عالم فوقانی کی مثل ہے۔ اگر مجھے اپنے پیغمبر سے درخواست کی اجازت ملجاتی تو میں اس نقص

کے دفعیہ کی کوشش کرتا۔ اور کسی خونخوار اور شکم پرست جانور کو نہ خلق ہونے دیتا۔ جو دوسری مخلوق کو اپنی خواہشات کا لقمہ بناتے ہیں"

فرشتہ نے جواب دیا "کمزور جانوروں پر تمھارا رحم قابلِ تعریف ہے۔ ضعیف مخلوق کے لحاظ سے عالم تحتانی اور فوقانی میں کچھ فرق نہیں ہے۔ مگر حقیقتاً زمین صرف نباتات سے جانوروں کی اتنی پرورش نہیں کر سکتی جتنی ایک کو دوسرے کی غذا بنا کر۔ اس لئے مختلف الاغذیہ حیوانات بجائے کمی تعداد کے کافی زندہ رہتے ہیں"

وہ جنگل سے نکلکر جلد اُس آبادی میں داخل ہو گئے جو معصوم لوگوں سے آباد تھی۔ آثم اس معصوم تمدن میں عاقلانہ مسرت کی تلاش کرنے لگا جس کا وہ آرزومند تھا۔ انھوں نے حدود صحرا کو چھوڑا ہی تھا کہ ایک آدمی خوف سے بھاگتا ہوا نظر آیا جس کے پکڑنے کے لئے گھریاں دوڑ رہی تھیں۔" اے رفیق فرشتہ۔ یہ کیوں بھاگتا ہے؟ کیا یہ ایسے حقیر جانور سے ڈرتا ہے؟" آثم کی زبان سے یہ الفاظ بمشکل نکلے ہونگے کہ دو کتے نظر آئے جو دوسرے آدمی کا تعاقب کر رہے تھے۔ اور وہ اس سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا۔

آثم نے اپنے رہنما سے کہا " یہ حقیقتاً حیرت انگیز ہے۔ یہ تعجب خیز منظر عقل سے باہر ہے"۔ فرشتہ نے جواب دیا۔" جانوروں کی ہر قسم یہاں شروع سے بہت طاقتور اور غالب رہی ہے۔ چونکہ انسان نے دغا اور قوت کو ان کے خلاف استعمال کرنا ظلم سمجھا اس لئے وہ روز بروز بڑھتے گئے۔ اور اب بے ضرر ہمسایوں (انسانوں) کو برباد کرتے ہیں"

آثم نے کہا "ان جانوروں کو ہلاک کر دینا چاہیئے۔ آپ انسان کی تغافل کیشی کا نتیجہ دیکھتے ہیں"

فرشتہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا" تم رحم اور انصاف کو بھول گئے جو تم نے ابھی ضعیف مخلوق کے متعلق ظاہر کیا تھا" آثم نے کہا" میں اپنی غلطی کا اعتراف کرتا ہوں میں جانتا ہوں کہ اگر ہم دنیا کو اپنے لئے رکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں وحشی مخلوق کے ساتھ تشدد اور ظلم اختیار کرنا پڑیگا۔ اب ہمیں اس غیر ذی عقل مخلوق کے متعلق اُن کے فرائض پر نظر ڈالنی چاہیئے۔ بلکہ باہمی تعلقات پر بھی غور کرنا چاہیئے"

جس قدر وہ دونوں آبادی کی طرف بڑھتے گئے۔ آثم کا تعجب یہ دیکھکر بڑھتا گیا کہ وہاں نہ خوبصورت

مکانات تھے۔ نہ شہر۔ نہ شاندار بنیادوں کے نشانات۔ اُس کے رفیق سفر نے آثم کو متحیر دیکھکر بتایا کہ اس نئی دنیا کے ساکن پرانی سادگی پر قانع تھے۔ ہر شخص ایک مکان کا مالک تھا۔ جو اگرچہ سادہ ہوتا تھا۔ مگر اس کے اہل وعیال کے لئے کفایت کرتا تھا۔ وہ تعمیرات کے بارے میں بہت نیک اور سادہ مزاج واقع ہوئے تھے کہ مبادا اُن سے اُن کا غرور اور نظارگیوں کا رشک بڑھ جائے۔ اُن کی تعمیر کا مقصد صرف آرام ہوتا تھا نہ کہ نمائش۔" آثم نے کہا۔" یہاں معمار۔ مصور۔ مجسمہ ساز۔ نہیں ہیں بلکہ شاید یہ بیکار فن خیال کئے جاتے ہیں۔ میں آپ کا شکریہ ادا کرونگا اگر آپ بعض عقلا کی مجلس تک میری رہنمائی کریں گے۔ میرے نزدیک خوشگوار مکالمہ بڑھکر کوئی مسرت اور عقل سے زیادہ ساحر کوئی شے نہیں۔"

"عقل!!" رفیق نے جواب دیا۔" ایک تمسخر آمیز کلام! ہمیں یہاں عقل کی حاجت نہیں کیونکہ اس کے استعمال کے مواقع نہیں پائے جاتے۔ صحیح معنی میں عقل اپنے فرائض اور دوسروں کے فرائض کے علم کا نام ہے جو ہم سے متعلق ہیں۔ لیکن ایسی عقل یہاں کس مصرف کی۔ یہاں ہر شخص فطرتاً وہی کرتا ہے جو اس کے لئے مناسب ہے۔ اور اُسی کی وہ دوسروں سے اُمید رکھتا ہے۔ اگر عقل سے مقصد لاطائل شوق اور لاحاصل تحقیق ہے اور ایسی دماغی مسرت کی اصل خود آرائی۔ تعیش۔ اور شوق نام آوری ہے۔ تو ہم اس کی پروا نہیں کرتے۔" "یہ سب ٹھیک ہے!" آثم نے کہا۔" لیکن میں خیال کرتا ہوں کہ لوگ انفرادی حیات بہتر سمجھتے ہیں۔ ہر خاندان اپنی جداگانہ حدود بغیر اختلاط اور باہمی روابط کے قایم رکھتا ہے۔" رفیق نے جواب دیا۔" یہ صحیح ہے یہاں کوئی قایم کردہ سماج نہیں ہے۔ نہ یہاں اس کی ضرورت ہے اسلئے کہ تمام اجتماعی مجالس کی بنیاد خوف یا محبت پر ہوتی ہے مگر ہم میں سے کوئی کسی سے خوف نہیں کرتا۔ اور نہ کوئی نجی محبت کا سبب ہے۔ کیونکہ سب مساوی طور پر قابل ہیں۔

آثم نے کہا۔"جبکہ بقیہ عمر مجھے یہاں گذارنی ہے اور نہ یہاں فنون لطیفہ ہیں نہ عقل نہ دوستی۔ تو کم از کم مجھے ایک بشاش رفیق کی ضرورت ہے جس سے تبادلہ خیالات ہو سکے۔" فرشتہ نے کہا" یہ کس مقصد کے لئے۔ خوشامد یا مخاطب سے طلب مشورت یہی دو سبب تلاش دوست کے ہو سکتے ہیں اور عقل کا مسئلہ تو خارج از بحث ہے۔"

آثم نے کہا۔" بہرحال یہاں کے رہنے والوں کو خوش ہونا چاہئے۔ کہ ہر ایک اپنی ملکیت پر قانع ہے اور از روئے طمع ضرورت سے زیادہ جمع کرنے کی خواہش نہیں رکھتا۔ لہذا حاجت مندوں پر ترحم کے لئے

کافی موقع ہے"۔

سلسلہ کلام جاری تھا کہ ایک بیمار فقیر کی آواز سنائی دی۔ جو سڑک کے کنارے بیٹھا اپنی قابل رحم حالت بیان کر رہا تھا۔ آثم اس کی اعانت کے لئے بڑھا۔ اور اس کو تپ دق کے آخری درجہ پر پایا۔ ابن آدم چلا اٹھا "حیرت! معصوم طبقہ بھی بیکسی کی حالت میں ایسے مصائب برداشت کر رہا ہے"۔ بیمار نے جواب دیا "حیران نہ ہو۔ کیا یہ حد درجہ ناانصافی نہ ہوتی کہ جو لوگ بقدر زیست سرمایہ رکھتے ہیں اور تھوڑے سامان پر قانع ہیں ان کے منہ سے نکالکر اپنے منہ میں رکھ لیتا۔ وہ ضرورت سے زیادہ ایک شخص کی بھی خوراک نہیں رکھتے۔ اور جو بقدر زیست ہے وہ کسی کو دیا نہیں جا سکتا"۔ آثم نے کہا "ان لوگوں کو ضرورت سے زیادہ جمع کرنا چاہئے۔ اور جو رائے میں قبل ظاہر کر چکا ہوں اس کو واپس لیتا ہوں سب ذہنی تشکوک اور دماغی پریشانی ہے۔ تشکر بھی یہاں کوئی صنعت نہیں ہو سکتی۔ اسلئے کہ سلوک اور احسان بھی نہیں کیا جا سکتا۔ مگر ان میں ایک صفت حُبِ وطن ضرور ہو گی"۔ "خاموش رہ" فرشتہ نے کہا اور فطرتی حسن سے متغیر ہو کر کسی قدر ترشرو ہو گیا"۔ اس قسم کے جملوں سے عقل پر دھبہ نہ لگا۔ وہی خود غرضی جو ہر معاملہ میں اپنی بہبودی سوچتی ہے وہی محرک ہوتی ہے کہ ہم اپنے ملک کو دوسرے ملک سے بہتر سمجھیں۔ صرف محبت عامہ گناہ نہیں جس پر تم یہاں کے لوگوں کو عمل پیرا دیکھتے ہو"۔

"حیرت!" مایوس مسافر نے کہا "میں کیسی دنیا میں لایا گیا ہوں۔ جہاں علاوہ اعتدال کے اور کوئی خوبی نہیں اور اس میں بھی وہ حیوانات سے زیادہ سبقت نہیں لے گئے۔ جہاں لطف اندوزی کے لئے کوئی تفریح نہیں۔ جرات۔ سخاوت۔ رفاقت۔ عقل اور حب وطن یہ تمام ممدوحہ صفات یہاں بیگانہ ہیں اسلئے کہا جا سکتا ہے کہ بدی سے ناآشنائی اور بیگانگی نیکی سے ناواقفیت ہے۔ اے میرے رہبر مجھے اُسی دنیا میں پہونچا جس کے عدم تشکر اور غرور کو میں حقیر سمجھتا تھا۔ میں اب ان کو برداشت کر سکتا ہوں کیونکہ مجھ میں اس کی صلاحیت ہے۔ خدا کے تدبر اور حکمت پر نکتہ چینی کر کے میں نے اپنی جہالت کو ظاہر کیا۔ اس لئے خود کو گناہوں سے بچانا اور دوسرے گنہگاروں پر رحم کرنا چاہئے"۔

آثم کی تقریر ختم نہ ہونے پائی تھی کہ فرشتہ گرداب میں غائب ہو گیا۔ آثم اس وحشتناک

منظر کو دیکھ رہا تھا - اور تخئیل کی دنیا میں سیر کر رہا تھا - کہ یکبارگی چونکا - اور خود کو اسی جگہ پایا جہاں وہ اظہار یاس اور گلہ وشکوہ کر رہا تھا - اس کا داہنا قدم مہلک جست کے لئے اٹھا ہوا تھا کہ خدا نے اس کے قلب پر حقانیت کے نقوش ثبت کر دیئے اس نے ویران اقامت گاہ کو خیرباد کہا اور اپنے وطن کو مراجعت کی اور تجارت کے ذریعہ مالدار ہوگیا - اور اس مفلوک الحال جوان کا انجام پیری میں خوش حالی - دولت مندی - اور راحت پر ہوا۔

(ترجمہ)

انتظارِ نامہ

(محمد حبیب الرحمن صاحب حبیب متعلم مسلم یونیورسٹی)

آپ کے نامہ کا مجھکو اس قدر تھا انتظار
ناامیدی میں ٹپک پڑتے تھے آنسو بار بار

سانس جو تھی وہ اسیرِ گریۂ بیتاب تھی
ایک موجِ ناتواں پابستۂ گرداب تھی

دل کی کیفیت مثالِ ماہیِ بے آب تھی
سوز میں ڈوبی ہوئی آہِ دلِ بیتاب تھی

ہر ادا وحشت کا ساماں ہر نظر تھی بیقرار
مرتعش مضرابِ غم سے تھا ربابِ دل کا تار

ہر گھڑی تھی انتظارِ وعدۂ فردا بہ دوش
ہر نفس تھا انتہائے یاس سی سازِ خموش

شام آخر ہو گئی امید ہی امید میں
بن گئی جاں پر اسی امید ہی امید میں

آپ کا نامہ نہ آنا تھا نہ آیا آخرش
مجھ سے بسمل کو رلانا تھا رلایا آخرش

جوئے خوں بہتی ہی آنکھوں سی بہ اندازِ سکوں
بہہ رہی ہی ساغرِ دل سی شرابِ لالہ گوں

جہاد فی الاسلام

از جناب محمد شریف صاحب چشتی متعلم۔ بی اے (فائنل)

انسان انسان خالق اکبر کی خالقیت کا شاہکار۔ اس کی شانِ خلاقی کا بہترین نمونہ اور اس کی قدرتوں کا شفاف ترین آئینہ ہے۔ فرشتوں سے زیادہ بلند مرتبت اور گرامی منزلت ہے۔ خدا کے لطف و کرم نے نوری اور ناری مخلوق کو نظر انداز کر کے نگہہ انتخاب ڈالی ہے تو اسی پیکر خاکی پر۔ اور اسی لئے کہ یہ خالقِ کائنات کے آگے اپنا سر نیاز جھکا کر اتنا بلند ہو جاتا ہے کہ فرشتے تک بھی اس کو سجدہ کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ کائنات کا ذرہ ذرہ اس کے آگے جھکتا ہے۔ بحر و بر اس کے اطاعت گذار۔ مہ و خورشید اس کے خدمت گار اور شام و سحر اس کے غلام بن جاتے ہیں۔ آگ اور پانی اس کے قبضے میں آجاتے ہیں۔ وہ طوفانی سمندروں کے سینوں کو چیرتا ہے۔ تند و تیز ہواؤں کی موجوں میں پیرتا ہے۔ کڑکتی بجلیاں۔ گرجتے بادل۔ کوہسار۔ آبشار غرضیکہ زمینوں اور آسمانوں کی کوئی چیز نہیں جو اس کی مطیع اور فرماں بردار نہیں ہو جاتی۔ یہ سب منعم حقیقی کے انعامات ہیں۔ ان انعامات کا محور اور ان الطاف کا مورد انسان اس لئے اور محض اس لئے ہے کہ وہ ان سے تمتّع اندوز ہو کہ اُن فرائض کو ادا کرے جو اس پر بحیثیت "خَلِیفَۃُ اللّٰہِ فِی الْاَرْضِ" (Vice-gerent of God on Earth) عائد ہوتے ہیں۔ زمینوں آسمانوں۔ بلندیوں پستیوں ہواؤں اور فضاؤں کو اس کے قبضۂ تسخیر میں اس لئے دیدیا گیا ہے کہ وہ ان کی مدد سے اپنے مشن کی تکمیل کر سکے۔ خدا نے انسان کو یہ تمام قوتیں اس لئے مرحمت فرمائی ہیں کہ وہ افکار و کردار۔ جذبات و حسیات اور اسباب و حوادث کی طوفانی شورشوں میں متاع خلافت و نیابت کے لئے سعی و عمل کی قوت سے صحت و سلامتی کے ساتھ خدا کی جانب بڑھتا جائے اور عبودیت و کمال کے اُس مقام محمود پر پہنچ جائے جو صرف اُسی کے لئے مخصوص ہو چکا ہے۔

مذہب کا مقصد یہی وہ نکتہ ہے جس کو مذہب ایک سچا اور فطری مذہب ذہن نشین کرانا چاہتا ہے۔

اس کی توضیح کے لئے صبح ازل کے طلوع سے لیکر نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت تک مختلف زمانوں اور مختلف قوموں میں خدا کی جانب سے سفیر آتے رہے۔ اپنے دور اور اپنے مخاطب گروہوں کی استعداد اور صلاحیت کے مطابق اپنا فرض ادا کرتے رہے۔ اسلام بھی اسی حقیقت کے انکشاف کے لئے آیا۔ اسلام کا خطاب چونکہ ساری کائناتِ انسانی سے تھا لہذا اُس نے انسانیت کبریٰ کے اس سب سے بڑے راز کو تفصیلی طور پر کھولدیا کہ خلافت و نیابت ہی انسان کی تخلیق کا اوّلین مقصد ہے اور اس مقصد کے حصول کی اوّلین شرط آزادی ہے۔ وہ آزادی جو بندہ خدا کے سامنے سر جھکا کر حاصل کرتا ہے خدا سے بالاتر کوئی قوت نہیں۔ مخلوقات میں انسان سے افضل کوئی مخلوق نہیں۔ انسان اگر اپنے مرتبے اور عظمت کے لحاظ سے کسی قوت کے آگے جھک سکتا ہے تو وہ صرف خدا ہے۔ اصولاً اور فطرتاً وہ کسی تیسری قوت کے آگے سر اطاعت و انقیاد خم نہیں کر سکتا۔ خدا کے علاوہ ہر چیز اس کے آگے جھکنے کے لئے بنائی گئی ہے۔ یہی حقیقی آزادی اور یہی اس کا مفہوم ہے۔

بندگی بندہ کی فطرت ہے۔ بندہ بندہ ہے مگر صرف خدا کا۔ اس کا سر نیاز خم ہوتا ہے مگر صرف خالق اکبر کی بارگاہ میں لیکن اگر وہ خدا کے علاوہ کسی اور قوت کو بھی اپنے سے بالا تصور کر کے جھکتا ہے تو یقیناً وہ اپنے آپ کو اُس آزادی سے محروم کرتا ہے جو خدائے واحد کی بندگی سکھاتی ہے۔ اپنے اس شرف کو بٹہ لگاتا ہے جو اُسے اشرف المخلوقات ہونیکی حیثیت سے حاصل ہے۔ ان الحکم الا للہ۔ اگر فرزند آدم کسی قوت کو حکم تسلیم کر سکتا ہے تو وہ صرف اللہ ہے یہی ایک سچے اور فطری مذہب کا مقصد ہے۔ یہی اسلام کا مشن ہے۔ یہی محمدؐ کا پیام ہے۔ یہی اُن پیروانِ اسلام کا مقصد حیات تھا جن کے آئینۂ دل پر آفتابِ اسلام نے اپنی اوّلین شعاعیں ڈالی تھیں!

اسلام کے اوّلین حامل

اسلام کے اوّلین حاملوں نے اس راز کو سمجھ لیا تھا۔ وہ عبودیت اور بندگی کی اُس رفعت پر فائز ہو چکے تھے کہ کائنات کی ہر بلندی اُن کی نگاہوں میں ہیچ تھی۔ سورج سے لیکر ذرّہ تک اور زمین سے لیکر آسمان تک ہر شئے اُن کے قدموں پر جھکتی تھی۔ وہ عرب کے ریگزاروں سے سیل کی طرح نکلے اور مشرق و مغرب پر چھا گئے۔ اگر ایک طرف ظلمات

کی طوفان خیز موجوں نے ان کے گھوڑوں کی ٹاپوں کو چوما تو دوسری طرف ہمالہ کی بلندی ان کے قدموں پر بچھا ور ہوئی۔ اگر ایک طرف ڈنیوب اور رائن نے ان کو فتح و نصرت کے مژدے سنائے تو دوسری جانب گنگ و جمن کی جولانی نے ان کے نغمے گائے۔ یہ سب کیوں تھا؟ اس عروج و عظمت کا سبب کیا تھا؟ یہ کہ وہ جس راز کو خود سمجھ چکے تھے۔ دوسروں کو سمجھانا اپنا مقدس فرض اور مقصد حیات سمجھتے تھے جس پیغام آخریں کو اپنے دلوں میں اتار چکے تھے مشرق و مغرب کی ملتوں کے کانوں تک پہنچانا چاہتے تھے۔ اسکے پہنچانے کی غیر مختتم تسلسل اور سرفروشانہ کوشش کیا کرتے تھے۔ دنیا کو نمرودی و فرعونی، قیصری و تاجداری کے پنجے سے آزاد کرکے ایک قوت حقیقی کے آگے جھکانا چاہتے تھے۔ انسانیت کو ذلتوں پستیوں اور گمراہیوں کے عمیق و تاریک گڑھے سے نکال کر شرافت و عظمت کے آسمان پر پہنچانا چاہتے تھے۔ یہی ان کی تگ و دو کی روح تھی۔ یہی ان کا جہاد تھا۔ یہی اُن کی زندگی کا نصب العین تھا اور یہی وہ جذبۂ بے تاب تھا جس نے اُن گمنام اور بے نوا خاک نشینوں کے سروں پر تاج حکومت و سلطنت رکھا تھا ؎

"عرب۔ ایران۔ ٹرکی۔ مصر و کابل ہند و افریقہ
یہ کیا ہیں ایک لفظ جاھدوا کی سب ہیں تفسیریں"

آزادی اور غلامی لیکن جب ان اولوالعزم اسلاف کے نام نہاد اور زبوں ہمت اخلاف نے عزت کی زندگی کے اس راز کو بھلا دیا تو عزت و آبرو۔ شرف و امتیاز۔ کمال و عروج کے اس بلند مرتبہ سے گر گئے! خالق کائنات کو بھول کر کائنات کی ہر چھوٹی بڑی قوت کے غلام بن گئے!!

ٹھیک جس طرح آزادی کی قوتیں اور اثر اندازیاں ہمہ گیر اور غیر محدود ہوتی ہیں اسی طرح غلامی کی تباہ کاری اور مذلت ہمہ گیر اور دور رس ہوتی ہے۔ چمن انسانی کی کوئی کلی نہیں جو اُس کی جھلس دینے والی لو سے پژمردہ نہ ہو جائے۔ افکار و کردار۔ رفتار و گفتار، نشست و برخاست، جذبات و حسیات۔ امیال و عواطف۔ تہذیب و معاشرت۔ علوم و فنون غرضیکہ زندگی کا ہر پہلو اس کے سانچے میں ڈھل کر گھناؤنی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

ہندوستانی مسلمان اُمتِ وسطہ کا وہ حصہ جو واژگوں بخت، محکوم ہندوستان میں بستا ہے۔

اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں۔ جب تک اُس نے محمدؐ کے پیام کی قدر کی۔ جب تک اُس نے خدا کو خدا سمجھا اور اپنا سرِ عبودیت اس کے آگے خم رکھا اس کا پرچم اقبال پوری شان کے ساتھ ہمالہ کی چوٹیوں پر لہراتا رہا۔ مگر جونہی وہ غیر الٰہی قوتوں سے مرعوب ہونے لگا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرض سے روگردانی کرنے لگا اپنے مقام بلند سے گر گیا۔ اس کی عظمت خاک دہلی کا پیوند ہو گئی۔ اس کی سیاست۔ اسکی ثقافت۔ اس کا اخلاق۔ اس کی شاندار روایات غرضیکہ ہر چیز مٹ گئی برباد ہو گئی! مسلمان ہندوستان میں بحیثیت مسلمان مٹ گیا!

نوجوان

نوجوان ہر قوم کے لئے دل کی حیثیت رکھتا ہے۔ زندہ قوم کا نوجوان اُس کا دھڑکتا ہوا دل ہے وہ دل! جس کی وسعتوں میں حمیت و غیرت کے شعلے ہمیشہ روشن رہتے ہیں۔ جس کی پنہائیوں میں قوم کی اولوالعزمیاں۔ مضبوط ارادے۔ حشر انگیز جذبات۔ روح پرور تمنائیں۔ زندگی بخش اور دہر آشوب آرزوئیں پلتی ہیں۔ نوجوان قوم کی نبض ہے جس میں زندگی کا گرم خون رقص کرتا ہے۔

مسلم نوجوان

ہندوستانی مسلمان زندہ ہے یا مر چکا؟ اس کا فیصلہ کرنا ہو تو اس کی نبض پر انگلی رکھئے۔ آہ! ہندوستانی مسلمان کی نبض "نوجوان" سے زندگی کی نہیں موت کی صدا آتی ہے۔ وہ موت جو ڈیڑھ سو سال کی محکومی و غلامی کی کریہہ ترین صورت ہے۔ یہاں نوجوان سے میری مراد وہ نوجوان ہے جس کو کالج اور مکتب کی آغوش تربیت نے پالا ہے۔ وہ نوجوان جو سوچنے سمجھنے والا طبقہ (Intelligentsia) کہلاتا ہے۔ وہ نوجوان جسکے عزم و عمل کے سانچے میں قوم کی تقدیر ڈھل رہی ہے۔ وہ نوجوان جسکی جانب رہ رہ کر دین وطن کی نگاہیں اُٹھ رہی ہیں وہ نوجوان جو غلام آباد ہند میں ملت محکوم کی پہلی اور آخری اُمید گاہ ہے۔ وہ نوجوان جس کے ہاتھ قوم کی آیندہ باگ ڈور ہے!

مسلم نوجوان کی امتیازی حیثیت

ہندو اور مسلمان دونوں غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں مگر باوجود غلامی کی درماندگیوں اور بے بسیوں کے برادرانِ وطن کا نوجوان جد و جہد سعی و کوشش اور تنازع للبقا کی راہ پر سرعت سے گامزن ہے۔ وطن عزیز کی آزادی کے لئے یہ امر موجب اطمینان ہے۔ مگر میرا عقیدہ ہے کہ ہندوستان کی مخلصی اور نجات

اُسی وقت تک ممکن نہیں جب تک مسلم نوجوان خوابیدہ ہے۔ بالفاظ دیگر اگر ہندوستان کی خاک کو غلامی کی ذلت سے کوئی قوت چھڑا سکتی ہے تو وہ مسلم نوجوان کے بازو کی ہمت خیبر شکن ہی ہیں اُسکے اظہار میں ذرہ برابر بھی جھجک اور باک محسوس نہیں کرتا کہ جب تک مسلمان نوجوان کی قوت بر سر کار نہیں آتی ہندوستان کی بیچارگی و محکومی کی بیڑیاں نہیں کٹ سکتیں۔ اسی لئے کہ ہندوستانی غلاموں میں مسلمان ہی نوجوان ایسی قوم سے تعلق رکھتا ہے جو آزادی کو اور آزاد رہنے کو اپنا فطری اور مذہبی فرض سمجھتا ہے جس کا مقصدِ حیات غلامی میں رہ کر پورا نہیں ہو سکتا جس کے لئے غلامی کی فضا میں ہر سانس دردناک عذاب ہے۔ مسلم نوجوان ہی ہے جس کی قوم کا ماضی شاندار اور زندگی بخش روایات کا سرمایہ دار ہے۔ جس کی جہانگیری و شوکت کے منتشر اجزا اب بھی صفحۂ دہر پر موجود ہیں۔ اگر قوموں کی زندگی کی تعمیر میں ماضی کی روایات کی کچھ بھی اہمیت ہے تو مسلمان کی تاریخ اپنے دامن میں یقیناً وہ انگارے رکھتی ہے جو اس کی سرد خاکستر سے شعلے اٹھا سکتے ہیں!

نصب العینی کا فقدان

مگر آہ! مسلمان نوجوان ہی سب سے زیادہ بے حس سب سے زیادہ تن آسان اور بے خبر ہے۔ مدیر روزنامہ "زمیندار" کے الفاظ میں اُسے ابھی یہ بھی معلوم نہیں کہ اس کی زندگی کا نصب العین کیا ہے اُس کو نادان دوستوں اور عقلمند دشمنوں نے یہ پٹی پڑھا دی ہے کہ تیری زندگی کا مقصدِ وحید کالجوں اور سرکاری مدارس کی تعلیم "آئی سی ایس" اور "پی سی ایس" کی ڈگریاں حاصل کرنا ہے۔ تیری فلاح اسی میں ہے کہ مغربی تہذیب کے اسرار و رموز سے آگاہ ہو۔ اُس کی باریکیوں کا اداشناس ہو۔ تعلیم سے فارغ ہو کر سرکاری ملازمت میں منسلک ہو جائے۔ کیونکہ اسلام کی تعلیمات کی رُو سے تیرا اہم ترین فرض یہ ہے کہ نوکری حاصل کرے۔ یہی آزادیٔ وطن ہے! یہی ترقی اسلام!! ملازمت میں ہر ممکن طریق سے روپیہ جمع کرے۔ اور پنشن لے کر اپنی کوٹھی یا مکان میں ایک بڑھیا بیوی۔ چند نوجوان بچّوں۔ چند کمسن پوتوں اور نواسوں کی بھیڑ میں نرم و نازک بستر پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر دم توڑ دے۔ تیرے مرنے پر قوم کے بدنصیب شاعر مرثیے لکھیں۔ حفّاظ سر ہلا ہلا کر قرآن مجید پڑھیں اور تو قبر میں منکر نکیر کے سوالوں کا جواب دیتے دیتے عاجز ہو جائے۔ قیامت میں اگر خدا اور رسول کے سامنے اپنی غلامانہ زندگی کے لئے شرمندہ ہو تو کچھ پروا نہ کر۔ تیرے لئے یہی کافی ہے کہ تیری نامراد زندگی میں تجھ

سے انگریز خوش رہیں۔ تیرے لئے سفید فام آقاؤں کی خوشنودی مالک حقیقی کی خوشنودی سے زیادہ ضروری ہے۔ محلے کے لوگ رشک سے تیری دولت اور کپڑوں کو دیکھیں اور تیرے خوف سے لرزیں"!

کالج اور مکتب یہ ہے قوم کے اس طبقے کی نفسیات کی تصویر جو (Intelligentsia) کہلاتا ہے یہ (Intelligentsia) کہاں پرورش پاتا ہے؟ کالجوں اور مکتبوں کی چار دیواریوں میں! کالجوں کی تعلیم توخیر "قوم غالب" کی ساحری ہے ہی جب تک غلامی کی بلا سر پر مسلط ہے لارڈ مکالے کی روح تعلیمی نصابوں کی تدوین و ترتیب میں کام کرتی رہیگی مگر آہ! نتائج کے اعتبار سے قسطلانی اور غزالی کے فلسفہ کی باریکیاں چھانٹنے والے۔ حریری اور زمخشری کے مقامات رٹنے والے بھی اسی سے علی بلکہ اس سے بھی زیادہ بے حسی اور جمود کے حضیض میں ہیں۔ اگر کالج کی دل کی موت ہے تو مکتب ذہن کی موت مکتب والوں کو اتنی فرصت کہاں کہ فَعَل یفعل کی لامتناہی گردان سے نجات حاصل کرکے اپنی غلامی کے اسباب اور ان کے ارتفاع پر متوجہ ہوں کالج والوں کو اس کی کیا ضرورت کہ شیکسپیر اور ملٹن ہیگل اور ڈیکانٹ کے چنگل سے دماغوں کو آزاد کرکے ملت کی محکومی اور اس کے مآل پر توجہ دے سکیں! ؎

زندگی ہے وہ نوجوانوں کی
جس پہ ہوتا ہے موت کا اطلاق

شعاع اُمید مگر ہمت اور اُمید کہتی ہے کہ مایوسی کی کوئی وجہ نہیں (Every cloud has a Silver lining) ہر تاریک بدلی میں شعاع نور چمکتی ہے۔ غلامی کے تیرہ و تار محیط بادلوں کے روزن سے اب بھی یقین و اُمید کی شاعیں چھن رہی ہیں۔ وہ یقین و اُمید جو مردہ قوموں میں زندگی پیدا کرتی ہے۔ مکتب کے قُل اعوذیوں میں کچھ بیدار مغز اور پرجوش مجاہد بھی پل رہے ہیں، کالجوں میں صرف کارل مارکس اور لینن کے مرید ہی نہیں محمدؐ کے غلام بھی زیر تربیت ہیں!

اُمید و یقین کا حرف شیریں زبان پر آتے ہی علی گڑھ کی گذشتہ شاندار روایات سامنے آجاتی یہی وہ مقدس مادر تعلیم ہے جس نے ملت کی شکستہ کشتی کو محمد علی مرحوم۔ ظفر علی خاں۔ حسرت موہانی

اور ذاکر حسین ایسے ناخدا بخشے ہیں۔ علیگڑھ نے جو اسلامی ہندوستانی کے دل کی حیثیت رکھتا ہے سوتے سے ایک کروٹ لی ہے۔ کاش یہ کروٹ مسلمانوں کی خوابیدہ قسمت کی کروٹ ہو! ؎

عجب کیا ہے یہ بیڑا غرق ہو کر پھر اچھل آئے
کہ ہم نے انقلاب چرخِ گرداں یوں بھی دیکھے ہیں!

"مجلس اسلامیات" اور "سوسائٹی آف اسلامک ہسٹری اینڈ کلچر"

یہ امر موجب ہزار مسرت و اطمینان ہے کہ اس درس گاہ کے ذمہ دار اصحاب کو قوم کی مصیبتوں اور اس کی ذلتوں کا احساس ہو چلا ہے۔ نوجوانوں کے دل اور دماغ کو اسلامیت کے سانچے میں ڈھالنے کیلئے طلبا اور اساتذہ کے اشتراک عمل سے متعدد چھوٹی بڑی سوسائٹیاں قائم ہو چکی ہیں جو نوجوانوں کو عظمت رفتہ کی انقلاب انگیز اور حیات بخش یاد دلا کر سعی و عمل پر ابھارنے کا تہیہ کر چکی ہیں۔ ان میں "مجلس اسلامیات" اور "سوسائٹی آف اسلامک ہسٹری اینڈ کلچر" خاص طور پر قابل ذکر اور لائق توجہ ہیں۔ اول الذکر کے بانی اور روحِ رواں جناب ڈاکٹر سید ظفر الحسن صاحب قبلہ ہیں دوسری مجلس کے کوشاں اور پرجوش کارکن ڈاکٹر امیر حسن صاحب صدیقی ہیں۔ ڈاکٹر ظفر الحسن صاحب قبلہ فلسفی اور سن رسیدہ بزرگ ہیں۔ مگر نہ تو اُن میں فلسفیوں کی بے عملی ہے اور نہ بوڑھوں کی زبوں ہمتی اور فرسودہ خیالی۔ ممدوح اپنے نحیف و ضعیف جسم میں جوانوں کا بے تاب اور آرزوؤں سے آباد دل رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا جذبۂ تنظیم و تحریک لائق تحسین و تبریک اور ان کا دم بسا غنیمت ہے۔ ڈاکٹر امیر حسن صاحب صدیقی نائب صدر "ہسٹری اینڈ کلچر سوسائٹی" لندن ریٹرن ہیں مگر کام وہ کر رہے ہیں جو ننانوے فیصدی مکہ ریٹرن بھی نہیں کر سکتے۔

ڈاکٹر صاحب موصوف نے سوسائٹی کے زیر اہتمام لیکچروں اور مقالوں کا جو سلسلہ شروع کر رکھا ہے نوجوانوں کے دل و دماغ پر اطمینان بخش طریق پر اثر انداز ہو رہا ہے۔ خدا اُن کی کوششوں کو نتیجہ خیز اور کامیاب کرے۔

موجودہ مقالہ | یہ مقالہ اب سے دو سال قبل دراصل "مجلس اسلامیات" کے لئے لکھا گیا تھا جو [illegible] گذشتہ

کا شرف مجھے بھی حاصل ہے۔ مگر اُس زمانے میں مجلس مذکور ہنوز عہدِ طفولیت میں تھی۔ اس کے ارکان کی تعداد محدود اور اس کے جلسوں کی نوعیت دو چار لوگوں کے تبادلۂ خیالات کی سی ہوتی تھی۔ اس مقالہ کا تھوڑا سا حصہ مجلس کے ایک جلسہ میں پڑھا گیا تھا۔ اس کے بعد جلسوں کا سلسلہ منقطع ہوگیا اور یہ مقالہ نامکمل رہ گیا

اس کے بعد ڈاکٹر امیر حسن صاحب صدیقی کو میرے مقالہ کا علم ہوا ممدوح نے اصرار فرمایا کہ اسے مکمل کرکے سوسائٹی آف اسلامک ہسٹری اینڈ کلچر میں پڑھوں بلی لحاظ فائن، کے خیال۔ وقت کی قلت تحریر و ترتیب کی مشکلات کے پیش نظر مجھے کافی تامل تھا مگر موضوع جہاد کی اہمیت اور اس کے متعلق عام غلط فہمیوں نے صحت کی کمزوری اور چند در چند موانعات کے باوجود ڈائرکٹر صاحب کے ارشاد کی تعمیل پر مجبور کردیا۔ ۱۵ر جنوری ۱۹۳۰ء کو یہ مقالہ "اسٹریچی ہال" میں پڑھا گیا۔ چونکہ علمی مقالات میں عام طور پر تفصیلات سے بحث کی جاتی ہے اکثر و بیشتر سننے والوں کے لئے دلچسپی پیدا نہیں ہوتی۔ مگر الحمد للہ کہ میرے محترم نوجوان بھائیوں کی بہت بڑی تعداد نے میرے لمبے چوڑے مقالے کو دو گھنٹے تک اسی توجہ اور اشتیاق سے سنا جو جہاد کے لئے ضروری تھا۔ میں تہہ دل سے شکر گذار ہوں۔

جہاد کے موضوع پر قلم اٹھاتے وقت بہت سے پہلو سامنے آتے ہیں۔ اس مختصر سے مقالہ میں اس کی گنجائش نہیں تھی کہ ان تمام پہلوؤں پر خاطر خواہ روشنی ڈالی جاسکتی یا کسی ایک پر بھی سیر حاصل بحث ہوسکتی۔ یہ شے ایک کتاب کے مصنف ہی کا حصہ ہے۔ پھر ایک طالب علم کے لئے جس نے کورس کی کتابوں کے مطالعوں سے وقت بچا کر مخصوص احساسات و جذبات کی سفارش پر چند ضروری باتوں کو ذہن نشین کرانے کی کوشش کی ہو یہ اور بھی مشکل ہوجاتا ہے۔ مقالہ نگار کو مقالہ کی جامعیت و مانعیت کا ہرگز دعویٰ نہیں۔ بہت سے ضمنی مباحث مثلاً مسئلہ غلامی "مال غنیمت" وغیرہ کو قصداً نظر انداز کردیا گیا ہے۔ اور بہت سے پہلو وقت کی قلت کی وجہ سے تشنہ بھی رہ گئے ہیں۔

مقالہ کا مقصود

مگر مقالہ کا مقصود اصلی یہ ہے کہ ان سطور کے پڑھنے والے اُن جذبات کو کماحقہ سمجھنے کی کوشش کریں جو اس کو سپرد قلم کرانے کے محرک ہوئے ہیں۔ اور یہ وہ جذبات ہیں جو ہر حریت طلب اور بخہ غلامی میں سسکنے والے نوجوان کے دل کو بے تاب رکھتے ہیں۔ مجھے

یقین ہے کہ اس پیغام کو دلوں میں جگہ دی جائے گی جو میرا نہیں بلکہ محمدؐ کا اور محمدؐ کے خدا کا پیام ہے مگر جس کو یاد دلانے کا شرف مجھے بھی حاصل ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

رفع التباس کے لئے ایک چیز عرض کر دینا ضروری معلوم ہوتی ہے۔ مقالہ میں متعدد جگہ علمائے کرام سے شکوہ ہے۔ یہ شکوہ جیسا کہ ہونا چاہئے بعض اوقات ضرورت سے زیادہ سخت الفاظ میں ادا ہوا ہے لیکن ان چبھتے ہوئے الفاظ کے مخاطب تمام علمائے کرام نہیں بلکہ صرف وہ نام نہاد اور بے عمل علما ہیں جن کی غلامانہ روش اسلام کی نورانی چادر پر سیاہ داغ لگا رہی ہے۔ یہ گروہ یقیناً کسی رواداری۔ کسی ہمدردی۔ کسی احترام کا مستحق نہیں اور اتنا ہی قابلِ ملامت ہے جتنا بے دین۔ بے حس۔ مذہب سے بیگانہ انگریزی تعلیم یافتہ نوجوان طبقہ۔

علمائے حق

نام نہاد اور بے عمل "علماء" کو چھوڑ کر علمائے حق نے جو نائبین رسولؐ ہیں اور بنی اسرائیل کے انبیاء کا درجہ رکھتے ہیں اسلام اور وطن کی جو خدمات انجام دی ہیں رہتی دنیا تک یادگار رہینگی۔ علماء کے گروہ میں بعض ایسی ہستیاں بھی ہیں جن پر ملت جتنا بھی فخر کرے کم ہے ان کی زندگی اور موت۔ چلنا پھرنا۔ سونا جاگنا سب اعلائے کلمۃ الحق کے لئے ہے۔ ان قدسی نفسوں کی زندگی کی ایک ایک سانس مردہ قوم کیلئے دمِ عیسیٰ کا حکم رکھتی ہے حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ ہستیاں اپنے علم و عمل سے حریت کا پیغام نہ دیتیں تو مسلمانوں میں وہ بیداری نہ ہوتی جس میں ایک روشن تابناک اور امید افزا مستقبل جھلک رہا ہے۔

جب مولانا قاسم رحمۃ علیہ بانی دیوبند۔ مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ۔ مولانا عبید اللہ سندھی۔ مولانا حسین احمد مدنی۔ مولانا محمد علی مرحوم۔ مولانا ابوالکلام آزاد۔ مولانا ظفر علی خاں۔ مولانا کفایت اللہ وغیرہ کا نام زبان پر آتا ہے تو گردنیں عقیدت و احترام سے جھک جاتی ہیں یہ ملت بیضا کے وہ جانباز نڈر اور مخلص مردانِ مجاہد ہیں جن کا نام نامی اخلاصِ ملت و وطن کی تاریخ میں ہمیشہ سنہرے حروف میں لکھا جائے گا۔

ہدیہ اخلاص و تشکر

آخر میں مجھے ان مصنفین کا شکریہ ادا کرنا ہے جن کی بصیرت افروز تصانیف سے مجھے مقالہ کی تیاری میں مدد ملی ہے حضرت مولانا ابوالکلام آزاد۔ قاضی محمد سلیمان منصورپوری۔

علامہ شبلی۔ علامہ سید سلیمان صاحب ندوی اور مولانا ظفر علیخاں صاحب قبلہ کے خیالات۔ ارشادات و شالعات نے ہر قدم پر میری رہنمائی فرمائی ہے۔ مولانا ابو الاعلیٰ مودودی صاحب کی جامع و مانع تصنیف "الجہاد فی الاسلام" سے مجھے خاص مدد ملی ہے۔ آیات قرآنی کے تراجم اور بعض تاریخی حقائق اسی کتاب سے ماخوذ ہیں۔

حضرت مولانا محمد ابو بکر شیث صاحب قبلہ ناظم شعبہ دینیات کا شکریہ بھی میرا مقدس فرض ہے۔ حضرت ممدوح نے مجھے مقالہ کی نسبت مفید مشورے دئے اور مناسب ہدایات سے مستفید فرمایا ہے۔

جہاد کے ہنگامہ خیز موضوع پر کچھ سوچتے، کہتے یا لکھتے وقت ایک سچے مسلمان میں جو ذہنی اور قلبی کیفیتیں بیدار ہوتی ہیں ان کا اندازہ کچھ وہی کر سکتا ہے جس کے دل میں حمیت و غیرت کی آگ اور رگوں میں گرم خون دوڑتا ہے۔ جہاد کا لفظ زبان پر آتے ہی اُس جلال و عظمت اور خیبر شکنی کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جس نے عرب کے ساربانوں کو جہاں بان کر دیا تھا۔ اُس ایمان و یقین کے جلوے نگاہوں میں رقص کرنے لگتے ہیں جس نے بے نوا صحرا نشینوں کے سروں پر تاج زرنگار رکھا تھا۔ اُس عزم و جوش کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے جس نے چند گڈریوں کو مشرق و مغرب کی تقدیروں کا مالک بنا دیا تھا۔ اور خصوصاً نوجوانوں کے مجمع میں جہاد کا لفظ ادا کرتے ہی دل میں ہمت و شجاعت کا احساس اور سرفروشانہ بے تابی کا جذبہ شعلہ بن کر بھڑک اٹھتا ہے!

جہاد ہر مسلمان خصوصاً نوجوان مسلمان کے دل اور روح کے لئے زندگی کا مستقل پیام ہے!!

مگر جہاد کیا ہے؟ جہاد اسلامی کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے تھوڑی دیر تک ہمیں اپنے ذہن سے شمشیر زنی، رزم آرائی اور جنگ و جدل کے محدود اور رسمیانہ خیال کو رخصت کرنا پڑے گا۔ جہاد کا اطلاق صرف اس جانبازی اس جدال و قتال اور جد و جہد پر ہی نہیں ہوتا جس کا مظاہرہ مسلمانوں نے خیبر سے لیکر پانی پت اور قادسیہ سے چلکر جبرالٹر تک کے میدانوں میں کیا۔ بلکہ اس مختصر سے لفظ کے غیر محدود اور وسیع مفہوم میں ہر وہ سرفروشانہ کوشش آتی ہے جو خدا کے آخری پیغام کے حاملوں نے اس پیغام کو مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک پہنچانے کے لئے کی۔ اس لئے جہاد کی ماہیت اور اصلیت کو پوری طرح ذہن نشین کرنے کے لئے پہلے اُس پیغام کی نوعیت کو سمجھنے کی ضرورت ہے جسے ایک مکہ کا یتیم

لایا تھا اور جس کو عام کرنے والے عرب کے چند گمنام اونٹوں کے چرانے والے تھے۔ وہ پیغام امن سلامتی کا وہ مژدہ تھا جو نوع انسانی کو بحیثیت مجموعی پہلی مرتبہ فاران کی چوٹیوں سے ملا تھا! وہ پیغام صلح وآشتی کی وہ نوید تھی جو آدم کے فرزندوں کو پہلی بار حرا سے دی گئی تھی!!

اسلام سے پیشتر بھی دنیا نے کچھ پیامات سُنے۔ مگر یہ تاریخی حقیقت ہے کہ ایک پیامات اپنی نوعیت اور دعادی کے لحاظ سے عالمگیر نہ تھے۔ ان کا روئے سخن مخصوص قوموں اور جماعتوں کی طرف تھا۔ جس طرح حضرت موسیٰؑ کا مقصد فرعون کی سرکوبی اور یہودیوں کی ہدایت تھا۔ جس طرح حضرت مسیحؑ نے اپنی تمام تر توجہات کا مستحق بنی اسرائیل کی بھولی بھٹکی بھیڑوں کو سمجھا۔ اِسی طرح دیگر رہنمایان ادیان و مذاہب نے اپنی تعلیمات کو خاص خاص گروہوں، خاص خاص جماعتوں کے لئے پیش کیا۔ کسی مذہب کسی تمدن نے انسانوں کے لئے عالمگیر اور اجتماعی نظامِ حیات پیش نہیں کیا جس میں خواجہ و بندہ۔ بلند و پست۔ گورے کالے۔ مشرقی اور مغربی ایک ہی خاندان کے افراد کی طرح منسلک ہو کر اپنے مقصد حیات کو پورا کر سکتے۔ اس مقالہ کی محدود وسعت اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ یہاں مختلف مذاہب کا مقابلہ کیا جائے ورنہ تقابل اور تجزئے سے یہ حقیقت واضح کی جاسکتی ہے کہ یہ پہلا اور آخری لازوال شرف صرف اسلام ہی کو حاصل ہوا ہے کہ اس نے اپنی رحمت کے دامن میں تمام نوع انسانی کو لینے کی کوشش کی ہے۔

اگر انسان افضل کائنات ہے۔ اگر کائنات کی تخلیق بے مقصد نہیں اور اس مقصد کا تعلق انسان سے بھی ہے اور یقیناً ہے تو اس کی برآوری کا سہرا کسی ایک انسان یا انسانوں کی ایک مخصوص جماعت کے سر نہیں ہو سکتا بلکہ اسی کا دارومدار تمام انسانوں پر بحیثیت مجموعی ہے۔ لیکن اس مقصد کی تکمیل اس وقت تک ناممکن ہے جب تک تمام انسان مل کر کوشش نہ کریں اور یہ اجتماعی کوشش اس وقت تک بروئے کار نہیں آسکتی جب تک اولاد آدم مختلف گروہوں میں مخاصمانہ انداز سے بٹی رہے۔ جب تک نسل و رنگ کے امتیازات قائم رہیں۔ جب تک جغرافیائی حدود کی محبت وجہ تفریق بنی رہے۔ یہی جغرافیائی یا بالفاظ واضح تر وطنی تعصب ہے جو اقوام اور افراد کی خواہشات کو مقامی حیثیت دے کر اس عالمگیر برادری اور اخوت کے قیام سے منحرف کر دیتا ہے جو ہر انسان پر بحیثیت انسان فرض ہے اور جس کے بغیر انسانیت کی

ترقی ناممکن ہے۔یہی غیر فطری تقسیم ہے جو اپنی ترقی یافتہ ملکی گھناونی صورت میں ایک قوم کو دوسری قوم پر چڑھ دوڑنے۔ اپنی آبادیوں اور حکومتوں پر قانع نہ رہنے۔ دوسروں کے حقوق پر دست درازی کرنے اور انسان کے پیدائشی حق آزادی کو پامال کرنے پر مجبور کر دیتی ہے!

اسلام کائنات اور انسان کی اجتماعی ترقی کا فارمولا ہے اُس کا مشن اِن تمام تقسیموں کو ختم کرنا۔ عالمگیر صلح اور امن قائم کرنا ہے اسلام نے دنیا کو توحید اور ختم نبوت دے کر اس مقصد کو پورا کر دیا ہے۔ اسلام سے قبل مذاہب میں بھی توحید گو کسی قدر شرک آمیز اور ناقص شکل میں تھی مگر موجود ضرور تھی اور تمام مذاہب کی اوّلین تعلیم ہے۔لیکن اِن مذاہب میں توحید کی بنیاد کسی اصول پر مبنی نہیں تھی۔ اسلام نے چند بنیادی اصول قائم کئے وہ اصول خدا کی حقیقی عظمت۔ انسان کا مرتبہ کائنات میں۔ اور بندہ اور خدا کا تعلق ہے۔

توحید کے بنیادی اصولوں کی توضیح وتعین اسلام کا اتنا بڑا احسان ہے کہ نوع انسانی اس کے بارے اپنا سر نہیں اٹھا سکتی۔ اسلام کی مقرر کردہ راہ ہی وہ راہِ حیات ہے جو انسانیت کو اس کی منزل مقصود تک بحفاظت و امن پہنچا سکتی ہے۔یہی وہ پیغام ہے جس کو عام کرنے کی ضرورت ہے اور جس کو عام کرنے کی ہر کوشش جہاد ہے۔

جس طرح پیغام اسلام کی نوعیت عالمگیر ہے اِسی طرح اس کے عام کرنے کے طریقے بھی ہمہ گیر تھے اسلام کے اوّلین پیروؤں کا اٹھنا بیٹھنا۔ سونا جاگنا۔ چلنا پھرنا۔ موت و زندگی سب کچھ اِس پیام کی تبلیغ کے لئے تھا۔ جہاد کا لفظ زبان پر آتے ہی تیغوں کی جھنکار اور گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز کانوں میں آنے لگتی ہے مگر جہاد کو صرف میدانِ جنگ تک ہی محدود کر دینا سخت ترین غلط فہمی ہے جہاد کے معنی لامتناہی اور مسلسل جدّوجہد کے ہیں۔ ایک بے پناہ جوشِ عمل اور آتشیں عزم کے ہیں۔ قرآن کے الفاظ میں ہر وہ کوشش جہاد ہے جو خدا کی راہ میں یعنی خدا کے بندوں کی بھلائی اور بہتری کے لئے کی جائے۔ اور جس میں ذاتی اغراض اور نفسانی خواہشات کا کوئی شائبہ نہ ہو جب تک ایک مسلمان مسلمان ہے۔جب تک وہ خدا کے آخری پیغام کا حامل ہونیکا مدعی ہے نوع انسانی کی فلاح وبہبود کی کوشش سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتا!

اگر جہاد صرف آگ اور خون کا طوفان برپا کرنے ہی کا نام ہوتا تو قرآن آن مالی۔ لسانی اور قلبی کوششوں کو کبھی جہاد نہ کہتا جن کی تاکید ہر مسلمان کو کی گئی ہے۔ افراد اور قوموں کی زندگی میں رزم وپیکار کے مواقع آتے ہیں مگر کم۔ جنگ وجدال تک نوبت پہنچتی ہے مگر مخصوص حالات اور واقعات میں۔ جہاد صرف انھیں مواقع پر کٹنے مرنے۔ خون گرانے اور خون بہانے کا نام نہیں بلکہ جہاد مسلمان کی پوری زندگی اور زندگی کی ہر سانس پر حاوی ہے۔ جب تک مسلمان کی نظر قرآن کے بتلائے ہوئے مقصدِ حیات پر ہے اور جب تک اس مقصدِ حیات کے حصول میں رکاوٹیں حائل ہیں اور جب تک مسلمان کی منزل کو جانے والی راہ صاف نہیں اس کو صاف کرنے کی کوششیں برابر جاری رہینگی۔ اور میدانِ جنگ کے علاوہ بھی ہر کوشش جہاد ہی کہلائیگی۔

افسوس ہے کہ مسلمان اور خصوصاً ہندوستانی مسلمان جہاد کے اس مفہوم کو بھول چکا ہے۔ ڈیڑھ سو سال کی غلامی نے اس سے تلوار چھین لی ہے۔ اس کے پیروں میں محکومی اور ذلت کی بیڑیاں پڑ چکی ہیں۔ چونکہ جمود و تعطل کے باعث اس میں شعلۂ حیات سرد ہو چکا ہے وہ جہاد کو اس زمانے کی پرانی داستان سمجھنے لگا ہے جب اس میں میدان جنگ کی طرف رُخ کرنے کی ہمت تھی۔ اس ذہنی افلاس اور عملی موت کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کے وہم وگمان سے بھی یہ حقیقت رخصت ہو چکی ہے کہ رزمگاہوں کے علاوہ بھی جہاد کیلئے میدان ہیں جہاں تیغ فولاد سے نہیں بلکہ شمشیرِ قلم سے نوکِ سناں سے نہیں بلکہ تیغ زباں سے رگ باطل کاٹی جاسکتی ہے رہ گئے مخالفین تو وہ جب تک جہاد کو جدال وقتال اور کشت وخون ہی کا نام دے کرنہ کوسیں ان کے دلائل زیادہ اضطراب خیز۔ جاذب توجہ اور لایق التفات ہو ہی نہیں سکتے۔ اس لئے کہ جہاد کا وہ حصہ جو دعوت وتبلیغ کے تحت میں آتا ہے اس میں مسلمانوں نے اُدْعُ اِلیٰ سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ کو ہمیشہ مدنظر رکھا ہے جہاد بالسیف ہی ایک ایسی کھونٹی ہے جس پر مسلمانوں کے کردہ وناکردہ گناہ خوش اسلوبی سے لٹکائے جاسکتے ہیں۔

فی الواقع ایک سچے اور پرجوش مسلمان کی زندگی کا کوئی کام ایسا نہیں جو جہاد کے تحت میں نہ آجائے اُس کا دماغ ہر وقت حق کی سربلندی کے لئے سوچتا ہے اُس کا دل ہمیشہ باطل کا نام ونشاں مٹادینے کے لئے بے تاب رہتا ہے اس کے قلب کی ہر حرکت اُس آتشِ شوق کو ہوا دیتی ہے جس سے اس کی

رگوں میں ایمان ویقین کا لہو دوڑتا ہے اس کے جذبات۔ اس کے خیالات۔ اس کے ولولے۔ اس کے ارادے غرضیکہ اس کی ساری زندگی مشتمل ہی ان کوششوں پر ہے جو وہ اپنے مشن کو پورا کرنے کیلئے کرتا ہے۔

لیکن نبرد آزمائی اور تیغ زنی ہی جہاد کا وہ حصہ ہے جس کو اسلام کے مخالفین نے بدترین رنگ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس لئے اس مقالہ میں بڑی حد تک انہیں اعتراضات کا جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ جہاد کے اور پہلوؤں سے قطع نظر صرف جہاد بالسیف ہی کے اتنے ضمنی مباحث ہیں کہ ہر ایک پر ضخیم کتابیں لکھی جاسکتی ہیں مگر ایک مقالہ نگار یہی کر سکتا ہے کہ چند اہم پہلوؤں کو لیکر باقی سب کو نظر انداز کر دے۔ وقت کی قلت کے پیش نظر یہاں صرف چند اہم پہلوؤں پر ایک سرسری نظر ڈالی جاسکتی ہے۔ مجھے پورا پورا احساس ہے کہ یہ طریق توضیح زیادہ سیر حاصل نہیں۔ جو حضرات اس موضوع سے دلچسپی رکھتے ہیں ان کا فرض ہے کہ اس کے دوسرے پہلوؤں پر لکھنے اور پڑھنے کی کوشش کریں۔

اسلام پر خوں ریزی کا الزام اور اسکی حقیقت

اسلام کے مخالفین خصوصاً مغربی مصنفین نے جہاں اور بہت سے اتہامات تراشے ہیں وہاں ایک یہ الزام بھی اسلام پر لگایا ہے کہ وہ ایک خونخوار مذہب ہے اور اپنے پیروؤں کو شقاوت وخوں ریزی کی تعلیم دیتا ہے۔ اسلام پر یہ بیہودہ اور سراسر بے بنیاد الزام لگانے والوں میں دو قسم کے لوگ نظر آتے ہیں۔ ایک گروہ وہ ہے جو تعصب۔ عداوت۔ جہالت۔ کم نظری اور بے خبری کا شکار رہا ہے۔ اس طبقے کی رہنمائی یورپ کے متعصب ومعاند پادری کرتے آئے ہیں اور کر رہے ہیں۔ دوسرا گروہ وہ ہے جو باوجود حقایق سے باخبر ہونے کے اپنے ملوکانہ عزائم اور امپریل مصلحتوں کی کامیابی اسی میں دیکھتا ہے کہ اسلام کو جس طرح ممکن ہو خونخوار اور درندوں کا مذہب ثابت کر دیا جائے۔ نفسیاتی تجزیہ بتلاتا ہے کہ دونوں گروہ عداوت وحق دشمنی کے مرض مزمن میں مبتلا ہیں مگر چونکہ اُن کے اعتراضات کی نوعیت اور اعتراضات کے مقاصد قدرے مختلف ہیں مناسب یہی ہے کہ ان لغو الزامات کا تار پود بکھیرتے وقت مقاصد کی اختلافی نوعیت کو مد نظر رکھا جاوے دوسرا گروہ نسبتاً زیادہ خطرناک ہے۔ مگر پہلے اول ذکر گروہ کے پیدا کردہ شبہات وشکوک کے ازالے کے طور پر کچھ تصریحات پیش کر دینا ضروری ہے۔

متعصّب پادری اور اُن کے مُریدین

اگر یہ جماعت پیغام اسلام کی نوعیت اور اس پیغام کے لانے والے کی سیرت اور عمل پر نگاہ رکھتے تو شکوک وشبہات پیدا ہونیکا امکان یقیناً نہیں ہوسکتا مگر جہاں اسلام اور مسلمانوں کی ہر شے کو مذہبی عصبیّت اور تنگ نظری کی گلابی عینک سے دیکھا جائے وہاں یہ توقع فضول ہے۔ مخالفین کے اعتراضات کا جواب دلیل وبرہان اور حقایق سے بارہا دیا جاچکا ہے۔ یہ بحث اتنی فرسودہ ہوچکی ہے کہ اس کا اعادہ اور تکرار زیادہ خوشگوار معلوم نہیں ہوتا۔ یورپین مصنفین کے دلوں اور دماغوں پر تعصب اور اسلام دشمنی کی تاریکی کچھ اس انداز سے چھائی ہوئی ہے کہ اُن میں دلائل وبراہن کی روشنی قبول کرنیکی صلاحیت ہی باقی نہیں رہی۔ تعصب وتنگ نظری سے پیدا شدہ الزامات کا جواب سعیٔ لاحاصل سے زیادہ کچھ نہیں مگر چونکہ بعض اوقات مخالفین کی ہٹ دھرمی اور ضد خود موافقین کو جنھیں اسلام کے مطالعہ کی فرصت نہیں غلط فہمیوں اور ذہنی الجھنوں میں مبتلا کردیتی ہے لہذا جواباً بعض روشن اور اہم تاریخی حقائق کا پیش کردینا نہایت ہی ضروری ہے

رسول اکرم صلعم نے جب پیغام حق کی تبلیغ شروع کی تو عداوت۔ حق دشمنی۔ نفرت اور تنگدلی کی بارود جو دلوں میں بھری ہوئی تھی شعلہ بن کر بھڑک اٹھی۔ عرب کے سارے قبائل اور خود قریش نے آپؐ کے خلاف غیظ وغضب کا ایک ہولناک طوفان کھڑا کردیا۔ ہمدردیاں بے دردیوں سے بدل گئیں حسن ظن سوئے ظن میں تبدیل ہوگیا۔ محبّت وانسیت جو آپ کی ذات گرامیؐ سے اپنوں بیگانوں کو تھی نفرت ودشمنی کے سانچے میں ڈھل گئی۔ کوئی راہ چلتے سر پر خاک ڈالتا۔ کوئی راستے میں کانٹے بچھاتا۔ کوئی بے رحمانہ سنگ باری سے آپؐ کے جسم مبارک لہولہان کرتا غرضیکہ سنگدلی۔ شقاوت اور بہیمیت کا کوئی حربہ نہیں جو آپؐ کو پیغام حق کی اشاعت سے روکنے کے لئے استعمال نہ کیا گیا ہو۔ قبیلہ قحطان۔ اہل ثقیف اور طائف والوں نے آپؐ کو اپنے ہاں بلا کر جو سلوک کیا وہ ایسا نہیں جس کے تصور اور تذکرے سے رونگٹے نہ کھڑے ہوجائیں۔ سنگ باری۔ دل آزاری۔ سب وشتم۔ طعن وتعریض تضحیک واستہزا کوئی بیہودگی کوئی ستم نہیں جو روا نہ رکھا گیا ہو۔

مگر آپ نے ان سب سختیوں اور مصیبتوں کو مردانہ وار برداشت کیا اور آپؐ کی استقامت میں یہ مو

فرق نہ آیا۔ جور و جفا پر اس صبر و تحمل کی وجہ آپؐ کی بیچارگی اور بے کسی نہ تھی۔ آپؐ اس قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے جو قریش میں سب سے زیادہ معزز اور طاقتور تھا۔ باوجود آپؐ کے پیام سے بھاگنے کے آپؐ کو عزیز اور محبوب جانتا تھا۔ اور دشمنوں کے مقابلے میں آپؐ کی حمایت و اعانت کے لئے مستعد رہنے کو اپنے قبائلی شرف کے لئے ضروری سمجھتا تھا۔ لیکن آپؐ نے اپنے قبیلہ سے کبھی استمداد نہیں کیا اور راہ حق میں جو سختی آئی اُسے نہایت خندہ پیشانی اور پامردی سے سہا۔ اس تحمل کی وجہ حضورؐ کی فطری بردباری۔ صلح جوئی اور سلامت روی تھی۔ آپؐ دنیا کے لئے امن و رحمت کا پیام بن کر تشریف لائے تھے۔

آپ نے اپنی رحمۃ للعلمین کا ثبوت اُن مواقع پر بھی دیا جن پر بڑے سے بڑے متحمل انسان کے دل میں انتقام کی آگ مشتعل ہو جاتی ہے۔ وحشی نے آنحضرت کے پیارے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو دھوکے سے شہید کر کے ناک اور کان کاٹ ڈالے۔ ہندہ زوجہ ابو سفیان نے ان کا پیٹ چاک کر کے کلیجہ نکالا اور چبا ڈالا۔ ہبار نے آپؐ کی بیٹی حضرۃ زینب رضی اللہ عنہا کے نیزہ مار کر ہودج سے گرا دیا جس سے ان کا حمل ساقط ہو گیا اور وہ اسی صدمے سے کچھ دنوں بعد رحلت فرما گئیں۔ آپ ان ظالموں سے بدلہ لینے پر پوری طرح قادر تھے مگر جب سامنے آئے تو بکمال رحم و کرم معاف فرما دیا۔

خود ذاتِ گرامیؐ کو ایک شخص نے سوتے میں آکر شہید کرنا چاہا۔ جب آپؐ نے بیدار ہو کر اس پر قابو پالیا تو عفو و درگزر سے کام لیکر چھوڑ دیا۔ جو آپ کو شہید کرنے کی نیت سے آیا تھا آپؐ کی تیغ اخلاق کا شہید ہو کر مسلمان ہو گیا۔

یہ ہے اُس نبی اُمیؐ کی سیرت جسکے پیام پر خوں ریزی کا الزام لگاتے ہوئے شرم محسوس نہیں کی جاتی۔ دنیا جانتی ہے کہ جبر و اکراہ سے نفرت و بیزاری پیدا ہوتی ہے۔ اگر بفرض محال یہ باور بھی کر لیا جائے کہ اسلام بزور شمشیر پھیلایا گیا تو دیکھنا یہ ہے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوتا۔ اُن لوگوں کو جنھیں لات و ہبل منات و عزیٰ جان و دل سے عزیز تھے اگر بنوک شمشیر کلمہ پڑھایا جاتا اسلام کیلئے مار آستین نہ ہوتے؟ کیا وہ موقع ملنے پر اسلام کو بیخ و بن سے نہ اکھاڑ پھینکتے؟ اس کا سب سے بڑا موقع بدر یا اُحد سے بڑھکر اور کونسا ہو سکتا ہے جب ایک طرف بے سر و ساماں۔ بے بس و بے کس اور غریب الوطن یتیم مکہ تھا اور دوسری طرف

اس کے دشمن تھے۔ وہ دشمن جو آتشِ انتقام سے آگ بگولا۔ فوج در فوج۔ اور جملہ ساز و سامان سے مسلح تھے۔ مگر تاریخ شاہد ہے کہ یہی دو مواقع تھے جن پر آپ کے مٹھی بھر مگر سچے جانثاروں نے مردانہ وار خاک و خون پر لوٹ کر اسلام کی عظیم الشان سطوت و ہیبت کی بنیاد رکھی اور اس شان سے کہ آج تک قائم ہے۔

یہ وہ حقائق ہیں جن کا انکار متعصب سے متعصب انسان بھی نہیں کر سکتا۔ علامہ شبلیؒ نے "سیرۃ النبیؐ" صفحہ ۲۱۶ پر ایک عیسائی مورّخ گاڈ فرے ہگینس کی کتاب "اپالوجی" سے ایک اقتباس پیش کیا ہے جس میں مورّخ مذکور اپنے ہم مذہبوں سے کہتا ہے :-

"عیسائی اسکو یاد رکھیں تو اچھا ہو کہ محمدؐ (صلعم) کے مسائل نے نشۂ دینی کا وہ درجہ اپنے پیرو ؤں میں پیدا کیا جسے عیسیٰؑ کے ابتدائی پیروؤں میں تلاش کرنا بے فائدہ ہے .... جب عیسیٰؑ کو سولی پر لے جایا گیا تو اُن کے حواری بھاگ گئے اُن کا نشۂ دینی ہرن ہو گیا اور اپنے مقتدا کو موت کے پنجہ میں گرفتار چھوڑ کر چلدیئے۔ اس کے برعکس محمدؐ (صلعم) کے پیرو اپنے مظلوم پیغمبر کے گرد آئے اور آپ کے بچاؤ میں اپنی جانیں خطرہ میں ڈال کر کل دشمنوں پر آپ کو غالب کیا"

آیئے ذرا ان کے صبر و استقامت کا ایمان پرور نظارہ دیکھیں جنھیں "بزورِ شمشیر" مسلمان بنایا گیا تھا۔

رسول اکرم علیہ التحیہ والتسلیم سر بسجدہ ہیں۔ ظالم عقبہ بن محیط گردن میں چادر ڈال کر اس زور سے لپیٹ دینا شروع کرتا ہے کہ گلوئے مبارک گھٹ جاتا ہے۔ آنکھیں باہر کو نکل آتی ہیں۔ لیکن آپ عبادت کی محویت اور جوشِ استغراق میں ذرہ برابر جنبش نہیں فرماتے۔ ابو بکر صدیقؓ موقعہ پر پہنچ جاتے ہیں اور بدبخت عقبہ کو دھکا دیکر ایک طرف ہٹاتے ہیں۔ اور یہ آیت پڑھتے ہیں اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ یَّقُوْلَ رَبِّیَ اللّٰہُ وَقَدْ جَآءَکُمْ بِالْبَیِّنٰتِ ہ کیا تم آنحضرتؐ کو اس جرم میں مارتے ہو کہ وہ اللہ کو اپنا پروردگار سمجھتے ہیں اور اپنی سچائی کے لئے دلیلیں پیش کرتے ہیں۔ یہ شقی اور اس کے ساتھی آنحضرتؐ کو چھوڑ کر صدیق اکبرؓ پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ ڈاڑھی اور سر کے بال نوچ ڈالتے ہیں اور اتنا زدوکوب کرتے ہیں کہ آپ پر غشی اور نیم مردنی کی سی حالت طاری ہو جاتی ہے۔

یہ سلوک اس ہستی سے کیا جاتا ہے جو اپنی تاجرانہ عظمت۔ شرافت و بزرگی کے لحاظ سے نیز اپنے

اثر و رسوخ کی وجہ سے اپنے قبیلہ ہی میں نہیں دور دور مشہور تھے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ غریب مسلمانوں اور بے کس ایمان لانے والوں پر کیا کیا سختیاں روا رکھی جاتی ہونگی۔

چلئے ابھی ایمان و ایقان کے چمنستان کے پھولوں کا اور نظارہ کیجئے۔

حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو محض اس جرم میں ستایا جاتا تھا کہ وہ مسلمان ہو چکے تھے۔ آپ کی گردن میں رسی ڈالکر گلی کوچوں میں گھسیٹا جاتا تھا۔ عرب کی اُس تپتی ہوئی ریت پر جس سے مئی اور جون کے مہینوں میں شعلے نکلتے ہیں لٹا دیا جاتا اور سینے پر دو دو من کے وزنی پتھر رکھکر اسلام چھوڑ دینے کو کہا جاتا تھا مگر اس مرد اخدا مست کی زبان سے اَحَدٌ اَحَدٌ کے سوا اور کوئی آواز نہ نکلتی تھی۔

زبیر بن عوامؓ جو عشرہ مبشرہ میں سے ہیں سہ دار زادہ تھے۔ ۱۶ سال کی عمر میں مسلمان ہوئے رشتہ داروں کو آپ کے اسلام کا علم ہوا تو رشتہ داروں نے کھجور کی صف میں لپیٹ کر کھڑا کر دیا اور نیچے سے دھواں دینا شروع کر دیا کہ آپ اسلام کو چھوڑ دیں۔ مگر صداقت اور حق کی محبت وہ چیز نہیں جو روح اور دل کو جسمانی عذاب سے چھوڑ دے۔

حبیب بن زید مازنی رضی اللہ عنہٗ کو مسیلمہ کذاب نے اپنی جھوٹی رسالت کے نہ ماننے کی پاداش میں اور عشق محمدؐ کے "جرم" میں بند بند کٹوا کر شہید کروا دیا۔ اس موقعہ پر مولانا ظفر علی خاں صاحب کا ایک وجد آور شعر بتصرف قلیل یاد آتا ہے ؎

وہی ہو انداز تسلی کا جو شیوہ تھا ابن مازنی کا
اگر کٹانا پڑے محمدؐ کے نام پر بند بند تجھکو!

حبیب بن عدی رضی اللہ عنہ کو قریش نے پکڑ لیا۔ قید رکھنے کے بعد پھانسی کے تختہ پر اسلام چھوڑ دینے کو کہا مگر اس مرد خدا نے کہا "قسم ہے رب العزت کی اگر تم دونوں جہاں کی سلطنت بھی میرے قدموں میں لاکر ڈال دو میں اسلام کو نہیں چھوڑ سکتا۔ پھر قریش نے آپ کی مزید دلآزاری اور اور اپنی ملعونانہ تشفی کے لئے کہا کیا تم یہ پسند نہیں کرتے کہ تم اس وقت آرام سے گھر میں ہو اور محمدؐ تمہاری جگہ ہوں۔ آپ نے فرمایا میں تو یہ بھی برداشت نہیں کر سکتا کہ حضورؐ کے پائے مبارک میں کانٹا بھی چبھ جائے۔

حنظلہ ایک رات کی بیاہی ہوئی دلھن کو چھوڑ کر میدان جنگ میں شریک ہوئے اور اپنے شادی کے جوڑے کو خونِ شہادت سے رنگیں بنایا۔

کہاں تک عشقِ محمد صلعم میں مر مٹنے والوں کی مثالیں پیش کی جائیں! یہ ہیں وہ جنھیں بزورِ شمشیر مسلمان بنایا گیا تھا"!

آہ! انصاف اپنا سر پیٹتا ہے۔ عدل ماتم کرتا ہے

صحابہ کرام تو خیر بلا واسطہ نورِ نبوت سے فیضیاب تھے ان کو چھوڑ کر ۱۴سو سال کے بُعد پر بھی ایک متقی اور زاہد مسلمان دس برس کی عمر سے لیکر مرتے دم تک دشمنوں کے تغیر۔ عمر کے ضعف کے باوجود سفر و حضر میں جس استقامت اور باقاعدگی سے نماز ادا کرتا ہے جس فراخ دلی سے ہر سال خون اور پسینے کی گاڑھی کمائی کا چالیسواں ۱/۴۰ حصہ مسکینوں اور غریبوں کے لئے نکالتا ہے جس صبر و رضا کے ساتھ سرد سے سرد اور گرم سے گرم ملک میں ۱۰'۱۰ گھنٹے بھوکا اور پیاسا رہ کر روزہ کا فرض ادا کرتا ہے۔ جس اشتیاق سے ہزاروں میلوں کے برّی و بحری سفر کی صعوبتیں برداشت کرکے بیت الحرم پہنچتا ہے جبر و اکراہ کے الزام کی لغویت کو واضح کرنے کیلئے کافی ہے۔

کیا یہ ورزش ایمان اور استقلال بھی کسی شمشیر زنی ہی کا نتیجہ ہے؟

پھر موجودہ "بادہ پرست۔ ملحد۔ سرکشی۔ بے دین اور عیسائی یورپ" جس سرعت سے اسلام کی طرف بے تابانہ بڑھا چلا آرہا ہے اُس کی وجہ بھی مسلمانوں کی تلوار ہے؟ وہ مسلمان جن کی قوتیں یورپ کی محکوم ہیں؟

اِس پروپیگنڈے کا ایک اور سبب

ان حقایق سے قطع نظر اگر ہم اس پروپیگنڈے پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ معترضین اپنی جہالت اور بعض اوقات تجاہل عارفانہ سے کام لیکر اسلام کو بھی اسی طرح غیر فطری۔ ناقابل فہم۔ پیچیدہ اور لاینحل معمّہ سمجھتے ہیں جیسا کہ اُن کا اپنا مذہب ہے۔ چونکہ ان کے مذاہب کی تعلیمات محض پند و موعظت سے ذہن نشین نہیں کی جاسکتیں اور عقل سلیم ان کی معقولیت کا اعتراف نہیں کرتی وہ یہ باور کرنے پر مجبور ہیں کہ اسلامی تعلیمات بھی اسی انداز کی

فہم انسانی سے بالا اور پیچیدہ ہیں۔ وہ جب دیکھتے ہیں کہ اسلامی سلطنت کے ساتھ اسلام کا حلقہ بھی وسیع ہوتا گیا تو اس کی وجہ انہیں تلوار کے سوا اور کوئی نہیں سوجھتی۔ یہ ہے اُن کی عقل و بصیرت جن کو اپنی تحقیقات و تفتیشات پر ناز ہے اور جنھیں اپنی انصاف دوستی اور حق پرستی پر فخر ہے۔

لیکن یہ اُن کا قصور نہیں یہ اُن عجیب و غریب معتقدات (Dogmas) کا قصور ہے جنھیں وہ مذہب کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ آئیے ذرا عیسائیت کے بنیادی عقیدہ پر غور کریں اور دیکھیں کہ وہ کہاں تک سمجھ میں آنے والی شے ہے اور کہاں تک فطرت سے مطابقت رکھتی ہے اور کیونکر محض پند و نصیحت سے بغیر کسی تزویر و تحریص کے ذہن نشین ہو سکتا ہے۔

ہر مذہب میں دو مسئلے نہایت اہم اور بنیادی ہوتے ہیں (۱) معرفتِ خداوندی (۲) نجات دنیا کے بڑے بڑے مذاہب اور اسلام کے تقابل سے واضح ہو سکتا ہے بلحاظ وضاحت و دلنشینی، عمدگی و تاثیر ان میں سے ہر مذہب کے ان بنیادی مسئلوں کی توضیحات کا کیا درجہ ہے۔ کیا بخوف طوالت باقی مذاہب کو چھوڑ کر صرف عیسائیت کو لیا جاتا ہے۔ اسلئے کہ عیسائیت ہی کے پرستار اسلام کو ناقابل فہم بتا کر اس کی عام ترویج و اشاعت کو شمشیر آرائی کا رہین کرم بتلاتے ہیں!

بندوں کو خدا سے روشناس کرانے کے لئے جو تجویز عیسائیت نے ارشاد فرمائی ہے وہ کیا ہے؟ "Three in One and One in Three" "ایک میں تین اور تین میں ایک" فرمائیے کیا سمجھے جس خدا کو جانے بغیر نجات اور ہدایت محال ہے اس کا کیا تصور ذہن میں آتا ہے۔ "ممکن ہے تین میں ایک اور ایک میں تین" کی "مابعد الطبیات" یا "ہیت" میں کچھ اہمیت ہو مگر یہ کائنات کی نجات و ہدایت کا فارمولا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ غیر عیسائی تو کیا خود عیسائی بھی اس معمہ کو نہیں سمجھ سکے۔ عیسائیت کی جو شرح اتھاناسیس نے کی ہے اس کے چند فقرے ملاحظہ فرمائیے۔ اور اگر ہو سکے تو کچھ سمجھئے۔ ورنہ خیر۔

عیسائیت کی الوہیت

"باپ غیر مخلوق	بیٹا غیر مخلوق	روح القدس غیر مخلوق
باپ غیر محدود	بیٹا غیر محدود	روح القدس غیر محدود
باپ ازلی	بیٹا ازلی	روح القدس ازلی

باپ قادر مطلق	بیٹا قادر مطلق	روح القدس مطلق
باپ خدا	بیٹا خدا	روح القدس خدا

اس پر بھی تین خدا نہیں بلکہ ایک خدا۔ ذرا باپ۔ بیٹا اور روح القدس کی مساوی و متوازی قوتوں اور صفتوں پر غور فرمائیے۔ پھر باپ۔ بیٹے اور روح القدس کے ایک ہی شان اور انداز سے خدا ہونے کو دیکھئے اور منطقی تجزیہ کیجئے کہ کیا نتیجہ نکلتا ہے!

نجات مذہب کا دوسرا اہم اور بنیادی مسئلہ نجات ہے جس مذہب کی الوہیت اتنی "آسان" اور "واضح" ہو اس کی نجات کا اندازہ کیا مشکل ہے

قیاس کن ز گلستانِ من بہار مرا

نجات کی بنیاد کفارے پر ہے" خدا کے عدل نے بندوں کو گناہ کی سزا دینا چاہی اور خدا کے کرم نے چھوڑ دینا چاہا۔ اگر چھوڑتا ہے تو عدل کے خلاف اگر سزا دیتا ہے تو رحم کے خلاف ہوتا ہے۔ لہذا خدا کے اکلوتے بیٹے نے جامہ انسانی پہنا۔ صلیب پر چڑھ گیا ملعون ہو کر تین روز تک جہنم میں رہا۔ اور سب گناہ گاروں کے گناہ اپنے سر لئے"

اس کا نتیجہ یہی نکلا کہ ایک عیسائی بڑے سے بڑا گناہ۔ بڑے سے بڑا جرم کرنے پر نجات سے محروم نہیں رہ سکتا۔ ظلم و ستم۔ جور و جفا۔ زنا۔ شراب۔ ڈاکہ۔ عصمت دری دنیا کی کوئی معصیت نہیں جو کسی عیسائی کی معصومیت میں فرق آنے دے (اس مذہب کے حامل دنیا پر جتنا بھی ستم ڈھائیں تھوڑا ہے

یہ ہے وہ "سلجھی" ہوئی تعلیم جس کے متعلق سر مکینزی ایم۔ اے پرائیویٹ سکرٹری لارڈ ڈفرن نے "تاریخ روس" میں لکھا ہے کہ وہ عیسائیت کے مسئلہ تثلیث کو تمام عمر سمجھنے کی کوشش کرتے رہے مگر وہ فہم انسانی سے اتنا بالا ہے کہ نہ سمجھ سکے!

تثلیث اور کفارے کے مسائل کو فہم و فطرت انسانی سے اتنا ہی بُعد ہے جتنا آسمان کو زمین سے یا قطب شمالی کو جنوبی سے۔ ان معموں کو تو دنیا بغیر کسی خارجی اثر کے بلا چون و چرا تسلیم کرتی ہے مگر اسلام کی توحید۔ اور نجات کے لئے عمل صالح کی اہمیت بغیر تلوار کے ذہنوں میں نہیں اترتی ہے

بباید بریں عقل و دانش گریست

خلفائے راشدین کا عہد

اب معترضین رسول اکرم صلعم کے دور کو چھوڑ کر خلفائے راشدین کے عہد مبارک پر الزام لگانے کی گنجایش پیدا کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر اس وقت کے عربوں کی حالت کا مقابلہ ہمسایہ ممالک سے کیا جائے تو یہ اعتراض بھی باور ہوا جاتا ہے۔

شمال میں رومیوں کی جابر و قاہر اور عظیم الشان سلطنت تھی۔ مشرق میں ایرانیوں کا جلال و جبروت اور مغرب مصر و حبش کی مستحکم اور قوی حکومتیں تھیں۔ اس ماحول میں عربوں کی کیا حالت تھی؟ چند بے نام ونشاں اونٹوں کے چرانے والے۔ غریب۔ فاقہ کش۔ خانہ بدوش۔ بڑی حد تک غیر مسلح۔ شہنشاہ ایران جس کی سلطنت چار ہزار برس سے مشرق پر مسلط تھی۔ یا قیصر قسطنطنیہ کے خلاف جو نصف مغربی دنیا کو اپنا باج گزار بنا چکا تھا۔ بے سروسامان عربوں کا تلوار اٹھانا سوائے تنگ آمد بجنگ آمد کے اور بھی کچھ ہو سکتا ہے؟

اس میں شبہ نہیں کہ خلفائے راشدین کے مسعود دور میں لاکھوں اور کروڑوں انسان حلقہ بگوش اسلام ہوئے مگر اس کا سبب شمشیر فولاد نہیں بلکہ شمشیر اخلاق اور تیغ سیرت تھی۔ مشہور مورخ مسٹر گبن لکھتے ہیں:۔

"افریقہ اور ایشیا کے لکھو کھا نومسلموں نے عرب کے مسلمانوں کی تعداد بڑھادی اور ان کے رسول پر ایمان لانے میں فریفتہ ہو گئے۔ اس کی یہ وجہ نہیں کہ ان پر کوئی خارجی دباؤ ڈالا گیا تھا۔ بلکہ کلمہ پڑھتے ہی ایک ادنیٰ سے ادنیٰ غلام قیدی اور اسیر بھی فتحیاب مسلمان کا ہمسر اور آزاد ہو جاتا تھا۔ گناہ دور ہو جاتا تھا .... نئے دین نے ہر شخص کو اس کی لیاقت اور حوصلہ کے مطابق اپنی صحیح فطرت پر پہنچا دیا"

ایک مشہور پادری صاحب لکھتے ہیں:۔

جب اسلام کو ایک حبشی قوم نے قبول کیا۔ بت پرستی، مخلوق پرستی۔ جنات پرستی۔ مردم خوری۔ انسانی قربانی اولاد کشی۔ جادوگری فوراً دور ہو گئی۔ باشندے کپڑے پہننے لگے۔ نجاست کی جگہ نفاست وصفائی نے لے لی۔ شرافت ذاتی اور خودداری کے جوہر پیدا ہو گئے۔ مہماں نوازی مذہبی فرض ہو گیا۔ شراب خواری جاتی رہی۔ جوا متروک ہو گیا۔ بے حیائی کے نام اور مردوں عورتوں کے ناجائز تعلقات ختم ہو گئے۔ عفت کو ایک نیک خصلت خیال کیا جانے لگا۔ کاہلی کی جگہ محنت نے لے لی۔ ذاتی اختیار نے

قانونِ مرکزی کو جگہہ دی۔ انتظام اور پرہیزگاری پھیل گئی۔ شقاوت و سنگدلی رحم و کرم سے بدل گئے وغیرہ وغیرہ

پادری صاحب ممدوح نے یہ الفاظ یورپ اور افریقہ کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ یورپ کو عیسائیت کا گہوارہ ہونے کا شرف حاصل ہے۔ پادری صاحب کو افسوس ہے کہ یورپ میں ان خوبیوں کی بجائے ان کے مقابلہ کی برائیاں ہیں۔ یہ ہے یورپ کا حال جس کے مذہب کی تعلیم عام فہم ہونے، عمدگی اور تاثیر کے لحاظ سے فوقیت کا دعویٰ رکھتی ہے!

مسلمانوں کی قوت وشوکت کا آخری دور

معاندین اسلام خلفائے راشدین کے عہد کو بھی نظرانداز کر کے مسلمانوں کی بربریت و شقاوت کو ثابت کرنے کے لئے بہت ہی بعد کے زمانہ کو بھی لیتے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ کسی مسلمان بادشاہ نے خواہ اپنی جابرانہ طبع یا سفیہانہ مزاج سے کتنی ہی بڑی سفاکی و خوں ریزی کا ثبوت کیوں نہ دیا ہو کبھی اسلام پھیلانے کے لئے تلوار کو بے نیام نہیں کیا۔ جس طرح بابر کا حملہ ہندوستان یا نادرشاہ کی محمد شاہ کے خلاف یلغار اسلام پھیلانے کے لئے نہیں بلکہ ہوس ملک گیری یا ذاتی عداوت و جوشِ انتقام کا کرشمہ تھی اِسی طرح مغل اور غلام بادشاہوں کی راجپوتوں سے نبرد آزمائیاں سیاسی نوعیت رکھتی تھیں۔ اسلام پھیلانے کیلئے ہرگز نہیں تھیں۔ اگر یہ نبرد آزمائیاں محض فی سبیل اللہ ہوتیں اور ان تیغ بازوں کے سامنے قرآنی تعلیمات ہوتیں تو سلطنت دہلی کا چراغ گل نہ ہوتا۔ ہندوستان پر سات سمندر پار سے آکر دوسری قوم تسلط نہ جماتی۔ چونکہ یہ تیغ آزمائیاں ملوکانہ انداز کی تھیں اسلئے دوسری قوموں کی بڑھتی ہوئی ہوس ملک گیری او شہنشاہیت کا شکار ہو کر رہ گئیں ؎

ہر کہ خنجر بہر غیر اللہ کشید
خنجر او در رگ او آرمید!

ہندوستان میں "قوم غالب" کی کرم فرمائیوں نے تعلیمی نصابوں میں ایسی کتابیں داخل کردی ہیں جو اورنگ زیب عالمگیر کو عوام سے متعصب۔ ظالم، سنگدل اور جفاجو کی حیثیت سے متعارف کراتی ہیں۔ مگر پروفیسر آرنلڈ لکھتے ہیں کہ عالمگیر کے دورِ حکومت میں کسی کو جبراً مسلمان نہیں بنایا گیا۔ آرنلڈ یا کسی دوسرے یورپی مصنف کی شہادت صرف "مغرب زدہ" دماغوں کی تشفی کے لئے پیش کی جاسکتی ہے ورنہ

حقیقت اس شہادت سے بے نیاز ہے اور بہر حال حقیقت ہے۔

ایک اور چیز قابل توجہ ہے۔ دہلی ۸سو سال تک مختلف مسلمان حکمرانوں کا مرکز سلطنت رہا لیکن اس کے گرد و نواح کی آبادی کا صرف ۱/۹ حصہ مسلم اور ۸/۹ غیر مسلم ہے۔ کیا یہی وہ علاقہ ہے جہاں آٹھ سو برس تک جبراً لوگوں کو مسلمان بنایا جاتا رہا؟ آگرے کے گرد و نواح میں بھی مسلمانوں کی آبادی ۱/۹ سے زیادہ نہیں۔

اگر بجبر مسلمان بنائے جانے کے الزام میں کچھ بھی صداقت ہوتی تو آج ہندوستان میں فرقہ وار کشمکش نہ ہوتی جو بدقسمتی سے مسلمانوں کے اقلیت میں ہونے کی وجہ سے پیدا ہو رہی ہے۔ مسلمان اکثریت میں ہوتے اور دوسری اقلیتوں کے ساتھ وہی سلوک کرتے جو مصری مسلمانوں نے قبطیوں کے ساتھ کیا۔

کاش مسلمان اکثریت میں ہوتے کہ ہندوستان کی غلامی کی بیڑیاں آسانی سے کٹ سکتیں۔

اسلام کو بزور شمشیر منوانا تو کجا خود وہ جو اسلام کی طرف شمشیر کھینچکر آئے اسلام کے جانباز بن گئے۔ یہ اسلام کی صداقت کا اعجاز نہیں تو اور کیا ہے؟ تاتاریوں کو اسلام اور مسلمانوں سے جو عداوت تھی۔ اور اس کا مظاہرہ جو بغداد کی تاراجی، عباسیوں کی تباہی اور مسلمانوں کے علمی اور تمدنی سرمایہ کی تباہی کی صورت میں ہوا ہے وہ اب بھی تاریخ کے صفحات پر خونیں حروف میں ثبت ہے۔ مگر یہی اعدائے دین محمد جب آگے چل کر مسلمان ہو گئے تو چھ سو سال تک اسلام کی سپر ثابت ہوئے!

(باقی آئندہ)

جذبِ حرم

(شیخ عبدالحق صاحب متعلم مُسلم یونیورسٹی)

یہ اشعار بمقام مکہ معظمہ ۱۹۳۶ء میں لکھے گئے

الحمد للہ رب العلمین والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ الکریم صلی اللہ علیہ وسلم وآلہ واصحابہ اجمعین

دعا

مرے شعر کی سمجھ بھی مری قوم کو عطا کر
جو عطا ہوا ہے مجھ کو یہ مذاقِ شاعرانہ

ہندی سالک سے

۱

عرب سے اک دلِ شوریدہ ساتھ لایا ہوں — ہے اک زمانے سے خاموش ہند کی محفل
دیا ہے تب مجھے اک دیدۂ و دلِ بیدار — تباہ اس نے کئے ہیں ہزار دیدۂ و دل
میں تیرے ظرف سے واقف ہوں، سالکِ ہندی — نہ ہوگا تو مرے جذبِ حرم کا متحمل

۲

اگر یقین نہیں ہے تو آزما کر دیکھ — زمانے بھر سے نرالی ہے میری درویشی
حرام ہے مرے نزدیک وہ توکل و فقر — سکونِ قلب ہو جس میں نہ دور اندیشی
بہ کارزارِ حیات ست مطمئن دلِ من — مبارک ست مرا سخت کوشی و کیشی

لہ آیۃ: الا بذکر اللہ ـــ تسبا + الا من ـــ قلب سلیم

۳

اگر ہے طالبِ رشحاتِ فیضِ اہلِ دل — تو بارگاہِ محبت میں دل نوازی سیکھ
جنوں نواز نگاہوں سے دیکھ میری طرف — اداشناس ہوں میں مجھ سے بے نیازی سیکھ
بنا وہ شیشہ کہ ہو جس سے سنگ بھی لرزاں — مقیمِ دامنِ کوہ! ایسی شیشہ سازی سیکھ

۴

ابھی ہے تو نظریاتِ ساحری میں اسیر — نہ کر زباں سے سوزِ کلیم کی تصدیق
نیاز و نماز سے ہو ذرّہ ذرّہ لذت کش — ہوئی ہے ارض و سما کی اسی لئے تخلیق
کروں جو رازِ حرم فاش ہندیوں کے حضور — کہیگا شیخِ حرم مجھ کو کافر و زندیق

۵

سنبھل، یہ عشق کا دریا ہے بے سمجھ نہ اتر — ہزار اس میں خطر ہیں ہزار ہیں گرداب
ہے رندِ میکدۂ عشق میں ابھی بدمست — فقیہِ شہر اسی میں ہوا تباہ و خراب
اسی سے بتکدہ قایم ہے روئے ہستی پر — اسی سے باقی ہے بنیادِ منبر و محراب

۶

ہے تیرا دل ابھی آلودۂ ہوا و ہوس — فریبِ چشم ہے دنیائے زشتی و خوبی
اگرچہ آدم و شیطان اُسی کی ہیں مخلوق — اِدھر ہے بولہبی اور اُدھر ہے محبوبی
یہ تار و پود ہے اضداد کا کہ عالم ہے — دکھا رہا ہے تماشا شکیبِ ایوبیؑ

۷

فریب خوردۂ افرنگ ہیں تیرے افکار — بتاؤں آ تجھے اسرارِ احسن التقویم
فلک نشیں بھی ہیں اسکی نگاہ کے محتاج — ہے جس کے سینے میں محفوظ سوز و سازِ کلیم
وہ کیا بتائیگا تجھکو رموزِ لاہوتی — اسیرِ آب و گلِ دہر ہے وجودِ حکیم

۸

بتاؤں کیا تجھے واعظ! کہ کیا ہے لطفِ عصیٰ
بہارِ ظلمتِ شب ہے مرے ثمر کی حیات
تو اپنے آپ کو محدود جانتا ہے تو جان
کھلے ہیں مجھ پہ تری ذات کے عجیب صفات
تجھی سے ہیں دو جہاں تو نہیں تو کچھ بھی نہیں
ہیں منحصر تیرے اجزا پہ سارے کلیّات

۹

فضائے مہر میں امروز ہے نہ فردا ہے،
پڑا ہوا ہے خرد پر حجابِ بود و ہست
ہوا نہ عشق ازل سے کسی کا منت کش
رہینِ عقدۂ دل، ناخنِ کشا و دبست
حیات، عشق کی وہ کارزار ہے کہ جہاں
خوشی ہے فتح کی جس میں نہ کوئی رنجِ شکست

۱۰

تیری نگاہ گرفتارِ حرکتِ نظری
نہ کوئی چیز ہے ثابت نہ کوئی شئے سیار
فرنگ اپنی حقیقت میں ہے دہیں کا دہین
ہے احتیاجِ تمدن سے گرمیٔ بازار
ہے فکرِ مردِ مسلماں سے منقلب ماحول
اثر پذیر ہیں ماحول سے تیرے افکار

۱۱

ہے ایک چیز حقیقت میں سب اصول و فروع
ہیں درمیاں میں کچھ وقفہ ہائے بود و نبود
نہیں کسی کا بھی پابند مردِ دیوانہ
اگرچہ سینکڑوں پابندیاں ہیں لاکھ قیود
کھلی نہیں ہے حقیقت نماز کی تجھ پر
اہم ہیں تیری نظر میں بہت رکوع و سجود

۱۲

سراب دیدہ ہے کہتے ہیں قرب و بعد جسے
نگاہیں مل گئیں جب پھر ہے سب خیال و خواب
اگر ہوئی نہ رسائی تری، تو بے پایاں
رسائی ہو تو ہے دریائے بیکراں، پایاب
نہ کر بیاں عرب اور عجم کی تحقیقات
کہ وہ حدیثِ ضعیفی ہے یہ جنونِ شباب

۱؎ آیۃ، وعصیٰ آدم ربہٗ فغویٰ۔
۲؎ آیۃ، وما ینطق عن الھویٰ اِن ھُوَ الّا وحی یوحیٰ

۱۳

نہ ہو جو برق خودی کی تو مردہ ہیں دو جہاں — کہ برقِ پاروں[۱] سے ہے کائنات کی تعمیر
خودی کے نور سے ہے آفتاب روشن دل — خودی کے نور سے ذروں میں آگئی تنویر
خودی کی برق میں پنہاں ہیں قوتیں بےحد — اسی سے کرتے ہیں اہلِ نظر جہاں تسخیر

۱۴

ہیں اتحادِ مقاصد سے متحد قومیں — اسی کو کہتے ہیں نیشن بہ اصطلاحِ عوام
یہ اختراعِ تعصب ہے اور خود رائی — کوئی جہاں میں نہ آزاد ہے نہ کوئی غلام
ہیں ناگزیر یہ دونوں رہِ ترقی میں — ہیں اُمتوں کے لئے بھی منازل و مقام
ترقی اور تنزل کو تو نے سمجھا ضد — اسی لئے ہے زباں پر غلام اور آزاد
وہ انتہا ہے تو یہ ابتدا تمدن کی — وہاں ہے جہل کی بستی یہاں خرد آباد
یہ بات راز کی ہے آ تجھے بھی بتلادوں — اسی پہ ہے امم شرق و غرب کی بنیاد

۱۵

میں جانتا ہوں یہ ناآشنائے بحرِ حیات — نہیں ہے تیرے مقدر میں عشرتِ ساحل
تو کیا حوادثِ عالم سے بچ کے نکلے گا — ترا سفینہ نہیں سختیوں کا متحمل
یہ تیرا دل ہے کہ موجود جس میں دونوں ہیں — نہ دیکھی میں نے کہیں شرکتِ حق و باطل

۱۶

ہے انقلاب سے باقی حیاتِ انسانی — فضائے دہر میں کوئی نہیں ہے نقشِ دوام
ترے وجود میں بھی ہے تغیرِ آنی — سفر میں ہیں ترے ذرات صبح سے تا شام
اس انقلاب سے ثابت ہوا کہ انساں پر — حیات بے تگ و دو ہے ازل کے دن سے حرام

۱؎ الیکٹرن

۱۷

جنوں کو اپنے سمجھتا ہوں میں زمانہ ساز — نہ میرا حال پریشاں نہ ہے گریباں چاک
تو جانتا نہیں آئینِ حفظِ خودداری — تیری نگاہ اسی واسطے نہیں بے باک
یہ اپنی مدح سرائی نہیں خدا کی قسم — مرا سلوک ہے جذب و جنوں تہِ افلاک

۱۸

اگر ہے تجھ میں ابھی قوتِ شکستِ ساز — نوائے سازِ زمانہ سے ہو نہ ہم آہنگ
اگر ہے واقفِ اسرارِ صبغۃ اللّٰہی — چڑھا زمانہ کی بے رنگیوں پہ اپنا رنگ
نبود و بود میں پنہاں ہے نرمی و سختی — میری نظر میں برابر ہیں یہ زجاج و سنگ

۱۹

بنا ہوں اپنی خودی سے مثالِ تیغِ اصیل — نہ کوئی میرا مقلّد نہ کوئی میرا امام
رہِ نیاز میں، میں اور جستجو میری — رواں ہیں بے غمِ اندیشہائے صبح و شام
ہے کائنات میں ہر ذرہ ضامنِ تنظیم — خودی سے ذرے کی قایم ہے کائنات و نظام

۲۰

ہے سر سے تا بقدم گرچہ غرقِ فسق و فجور — عیاں ہے فطرتِ انساں سے پھر بھی معصومی
نہیں ہے بندگی پر درِ عطائے کریم، — ہے تیری سعی کی کوتاہیوں سے محرومی
عجب نہیں کہ نصیبِ فرنگ ہو جائے — فضا میں مضطرب اب تک ہے نعرۂ رومیؒ

۲۱

مرے چمن کی ہے جس سے بہار لافانی — ترا چمن ابھی اُس رنگ و بو سے خالی ہے
مجھے پسند ہے یہ دہر گرچہ ہے فانی — وہ لازوالِ جہاں، آرزو سے خالی ہے
کہاں نصیب تجھے لذتِ جگر کاوی — کہ تیرا قلب ابھی جستجو سے خالی ہے

۲۲

جہاں میں اس لئے ہے خوار مسلمِ ہندی — کہ خود ہی بھول گیا اپنی قاہرانہ روش
اگرچہ محرمِ رازِ درونِ پردہ نہیں — مگر ہے پیرِ فرنگی کی محرمانہ روش
ہیں اہلِ راز میرے مجھ سے لرزہ براندام — کہ مثلِ تیغ ہے میری قلندرانہ روش

۲۳

بہت بلند ہے گرچہ مقامِ اہلِ خرد — بلند اور بھی اس سے ہے منزلِ عشاق
ابھی نہیں تجھے حاصل کمالِ معشوقی — نہ پوچھ کیفیتِ گرمیٔ دلِ عشاق
سکھائیگا وہی آدابِ دلبری تجھکو — بنایا جس نے مجھے صدرِ محفلِ عشاق

۲۴

خبر نہیں کہ دلِ کوہکن پہ کیا گذری — ہے دلنشین بہت داستانِ پرویزی
سُنی ہے میں نے فرشتوں کی بزم میں یہ بات — گلوئی غرب ہے مشتاقِ تیغِ چنگیزی
دیا زمانہ کو فتویٰ یہ عصرِ حاضر نے — حلال، صاحبِ سرمایہ کو ہے خوں ریزی

۲۵

بُری نہیں ہے رقابت ادا شناسوں کی — اسی سے قصۂ الفت ہوا ہے طولانی
تمام لطفِ عمل ہے کرشمۂ ملبس — وہی ہے ضامنِ سوز و گدازِ انسانی
کہیں یہ رازِ محبت نہ فاش ہو جائے — کہ ہے قیامتِ کبریٰ اسی کی عریانی

۲۶

کسی کی آنکھ نے دیکھا نہیں ہے حسنِ حبیب — کہ ہے کمالِ تجلّی، کمالِ مستوری
نہیں خصوصیتِ طور و حضرتِ موسیٰؑ — ہے ذرہ ذرہ میں موجود جلوۂ طوری
دکھائیگا وہ کسے جلوہ ہائے گوناگوں — جو میری حسرتِ دیدار ہوگئی پوری

۲۷

وجودِ اصل خودی کا ہے نفی سے ثابت — کوئی کہے نہ کہے لا الٰہ الا اللہ

نگاہ و قلب کا آساں ہے اتحاد بہت
اُسے ہے شوقِ سفر اور یہ ہو واقفِ راہ

اسی لئے تو نہیں حق شناس دیدۂ و دل
کہ دی ہے شورشِ باطل کو تو نے دل میں پناہ

٢٨

کھُلا نہ اس پہ حقیقت جمالِ یوسفؑ کی
اُلجھ کے رہ ہی گیا اِس مقام پر رازیؔ

وہی ہوا وہی پہنائے آسماں لیکن
ازل سے زاغ بچوں کو نہ آئی شہبازی

مجھے نظر نہیں آتے خصوصیاتِ قدیم
جہاں میں آج بھی ہیں گرچہ ترکی و تازی

٢٩

زباں پہ قصۂ فردوس و حور جاری ہے
چڑھا ہوا ہے ابھی تک خمارِ دوشِ ازل

یہ صورِ حشر سے بیدار ہو نہیں سکتا
ابھی ہے لطف وہ گوشِ دل سروشِ ازل

میری بلا سے جو فانی، خمارِ ہستی ہے
زہے نصیب کہ باقی ہے مے فروشِ ازل

٣٠

ہوں سرزمینِ عرب اور غرب سے لرزاں
اُدھر ہے خشکئ صحرا، اِدھر نمِ دریا

ہے دونوں مسکنِ آدم پہ قبضۂ قدرت
وہاں ہے ریگ، یہاں جوشِ پیہم دریا

مثالِ ذرہ و قطرہ بنا وجود اپنا
کہ وہ ہے بے غمِ صحرا، یہ بے غمِ دریا

نہیں ہے ذرہ و قطرہ عبث[1] حقیقت میں
کہ وہ ہی درخورِ معدن، تو یہ برائے صدف

کمال کے لئے لازم ہے سختی و گردش
وہ وقفِ ظلمتِ معدن، یہ تنگنائے صدف

سمجھ نہ ذرہ و قطرہ کو تو حقیر و ضعیف
ہے ذرہ دولتِ معدن، گہر عطائے صدف

محرکِ ازلی دے رہا ہے دونوں کو
ہوا سے ذرے کو، شورش سے قطرہ کو ترغیب

فنا کا خوف نہ ذرے کو ہے نہ قطرہ کو
نگاہبانِ ازل کے معلّم اور ادیب

---

[1] افحسبتم انما خلقناکم عبثاً ۱ خ

ہزار سعی سے پھر مکتبِ زمانہ میں — تمدن اِس کو سکھایا گیا اُسے تہذیب

۳۱

کیا ہے شاعرِ مشرق نے فاش رازِ خودی — "بلند زورِ دروں سے ہوا ہے فوارہ"[1]
میں ایسے زورِ دروں کو فنا سمجھتا ہوں — بلند ہو کے جو ہو پست اور صد پارہ
میں چاہتا ہوں وہ زورِ دروں مسلماں میں — فضا میں جس سے ہے ثابت وجودِ سیارہ

---

[1] فوارہ:- یہ آبجو کی روانی یہ ہم کناریِ خاک — مری نگاہ میں ناخوب ہے یہ نظارہ
اُدھر نہ دیکھ اِدھر دیکھ اے جوانِ عزیز — بلند زورِ دروں سے ہوا ہے فوارہ
اقبال (ضربِ کلیم)

"ہندو ڈرامہ نویسی اور اس کا ارتقا"

(سید شمس الحسن صاحب آزل متعلم مسلم یونیورسٹی)

بادی النظر میں گلاب کے پھول کی پیدائش اس چھوٹی کلی سے ہی معلوم ہوتی ہے جو سورج کی سنہری اور نئی کرنوں اور اس کی نمناک چکناہٹ کے بار بار سموئے جانے سے چٹک جاتی ہے لیکن رگوں میں دوڑ جانے والی نظروں سے دیکھا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اس کی آفرینش کا سبب وہی چند خمدار اور زرد روجڑیں ہیں جن کو مٹی نے اپنے نیچے دبا رکھا ہے۔

لفظ "ڈرامہ" یا "ڈرامہ نویسی" کو سنکر اس کی تخلیق اور ارتقا کے متعلق جو پہلا خیال ہمارے دماغ میں جبراً داخل ہوتا ہے وہ سراسر مغربی ہوتا ہے۔ کچھ تو اس وجہ سے کہ ہم انگریزی یا مغربی ادب کو اچھوتا خیال ہی کرتے ہیں اور کچھ اس وجہ سے بھی کہ ہر نئی تہذیب اپنے سے پرانی تہذیب کی تمام بہترین چیزیں اور تمام شاہکار اس طرح اپنا لیا کرتی ہے کہ ان کی تکوین اسکی اپنی معلوم ہونے لگتی ہے۔ لیکن وہ خیال قطعاً کھوکھلا اور پھس پھسا ہوتا ہے بقول ٹینی سن "اگر کسی چیز کا مخرج معلوم کرنا ہو تو کسی پرانی اور قابل یادگار تہذیب کا مطالعہ کرو"۔ ہر جدت اپنے ماضی کی احسانمند ہوتی ہے۔

ہندو ڈرامہ جس کو ناٹک کہتے ہیں ہندو تہذیب کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے اس کی ابتدا دوسری صدی عیسوی سے ہوتی ہے جبکہ "چند مرد اور حسین عورتوں کا ایک گروہ کسی بڑے تالاب کے کنارے یا پیڑوں کے کسی جھنڈ کے آس پاس ناچنے گانے اور بجانے کے لئے جایا کرتا تھا اور دوسرے لوگ انکا تماشا دیکھنے کے لئے آیا کرتے تھے دن بھر ایک غل غپاڑہ رہتا تھا۔ ان گانے بجانے اور ناچنے والوں کی بہت قدر کی جاتی تھی اور ان کو عزت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اس وقت ناچنے کو سوسائٹی کے اعلیٰ لوازم میں شمار کیا جاتا تھا۔ جیسا کہ خود لفظ ناٹک سے پتہ چلتا ہے۔ نارٹ کے معنی سنسکرت میں

ناچنے کے ہیں اور نارٹکا کے معنی "مہذب نچینا" یہی لفظ بگڑ کر ناٹک بن گیا ہے۔ ایک ناٹک میں کئی قسم کے نچینے ہوتے تھے کچھ "تانڈوا" یعنی دوڑ ناچ ناچتے تھے۔ کچھ "راسیا" یعنی گول ناچ ناچنے میں ماہر ہوتے تھے اور کچھ "رسا منڈالا" یعنی جھمکر ناچ خوب جانتے تھے۔ یہ وہی ناچ ہے جس کو خاص طور پر کرشن جی سے منسوب کیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں کچھ نچینے ایسے بھی ہوتے تھے جو صرف نئے قسم کے ناچ ایجاد کرنے میں مشہور ہوتے تھے۔ اس کے بعد تیسری صدی عیسوی میں سنسکرت کو ترقی ہوئی اور زبان کو شاعرانہ انداز سے بھی پیش کیا جانے لگا تو ناٹکوں کے واسطے گیت اور عمدہ عمدہ گانے لکھے جانے لگے۔

بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ ڈرامہ نویسی ہندوستان میں یونان سے آئی۔ لیکن اس کا کوئی ثبوت نہیں تھا۔ جیسا کہ "لیسن" نے انڈین اٹیلس میں کہا ہے "ہندو ناٹک کسی صورت میں بھی یونانی ڈراموں سے ماخوذ نہیں ہیں۔ نہ وہ مواد میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں نہ تدوین و ساخت میں۔ یہی نہیں بلکہ وہ اپنی خصوصیات اور اپنی شان میں عربی ڈراموں مثلاً "الحریری" "الف لیلا" وغیرہ سے بھی قطعاً مطابقت نہیں رکھتے بلکہ ہندوستان میں ان کو وہی اختراعی حیثیت حاصل ہے جو علم نجوم اور منطق و فلسفہ کو ہے۔"

ہندو ڈرامہ کو ٹریجڈی یا کومیڈی میں تقسیم کرنا ناممکن ہے کیونکہ اس میں حصہ اول کو بہ نسبت حصہ آخر زیادہ اہمیت حاصل ہوتی تھی اور عموماً انجام کسی درمیانی اور مرکب رنگ سے پُر ہوتا تھا۔ البتہ مجموعی حیثیت سے ڈرامہ میں زندگی کے دونوں پہلوؤں کو تقدیر کی روشنی میں صاف صاف دکھایا جاتا تھا۔ ان ڈراموں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ مصیبتوں کو موت کی طرح اٹل مانتے تھے اور مسرتوں کو بارش کی طرح اپنے وقت اور اپنی مرضی پر برسنے والی تسلیم کرتے تھے۔ جس سے اس زمانے کی ہندو تہذیب اور تمدن پر کافی روشنی پڑتی ہے۔

آپ کو یہ سُنکر ضرور تعجب ہوگا کہ "مرک چکا ٹکا" جس کے معنی "مٹی کی گاڑی" ہیں کا مصنف اب سے پندرہ سو برس پہلے ہوا ہے اور باوجود اس کے اس کتاب میں اسی قسم کا مواد اور اسی قدر لطیف جذبات پائے جاتے ہیں جیسے کہ انگریزی ڈراموں میں جو سولھویں اور سترھویں صدی کی پیدائش ہیں۔ اس مصنف کے انتقال کے بعد اسی خاندان سے ایک اور شخص "بھار بھوا" نامی نے موسیقی میں دخل دیا اور

ایک "النکر شاستر" جس کے معنی ہیں "منقار موسیقار" لکھی۔ جس کو اشوک بادشاہ نے بہت پسند کیا۔ اس کتاب میں ناٹک کے لئے عمدہ عمدہ گانے اور گیت لکھے گئے تھے۔ اسوقت سے شاعری اور ناٹک کے باہمی تعلقات کو توسیع دی گئی۔ "وسار وپا" "کاویا پرکاس" "کاویادرسا" اور "الن کری" وغیرہ رسائل نکلے اور ان میں بھی ناٹک اور موسیقی کے فطری میلانات پر کافی بحث کی گئی۔ چوتھی صدی کے آغاز میں "وامانا" نے "کاویالنکارا" لکھی۔ "بہاما" نے "النکرا کاستوبہا" "اپی آیا" نے "کوالا" اور جے دیو نے "سُسن گیتارتن" کتابیں لکھکر سنسکرت ادب میں ایک عظیم الشان اضافہ کیا جیسے جیسے مذاق سلیم بڑھتا گیا اور انداز سلیس اور شستہ ہوتا گیا، ویسے ویسے جذبات لطیف اور بیان سامعہ نواز ہوتا گیا۔ آخر کار ڈرامہ نویسی کے طے شدہ اور چیدہ اصول مقرر کئے گئے جن کو "روپاکا" میں اس طرح بتایا گیا ہے (۱) ناٹک میں پانچ سے دس تک ایکٹ (Acts) ہونے چاہئیں (۲) ایک طے شدہ اور خوب گوندھا ہوا قصہ ہونا لازمی ہے جیسے رام کہانی۔ (۳) کردار اعلیٰ میں بہادری یا نیکی کی جھلک ہونی چاہئے۔ (۴) تمام کردار ایک دوسرے سے مربوط اور واقف ہونے چاہئیں۔ (۵) چونسٹھ رنگا یعنی اشخاص ڈرامہ۔ (۶) چونتیس[۳۴] نشانات۔ (۷) اس کے گانوں میں "رسا" یعنی جوش وخروش ہونا چاہئے۔ (۸) "نائیکا" یعنی ہیرو کا کام سب سے سخت ہونا چاہئے (۹) ڈرامہ کا ڈھال گائے کی دم کی طرح ہونا چاہئے۔ (۱۰) چھوٹے ڈرامہ کو ناٹک اور بڑے ڈرامہ کو مہاناٹک کہنا چاہئے۔" لیکن "النکرا سرواسوا" میں اس فیصلہ سے انکار کیا گیا ہے اور حسب ذیل ترتیب کو کافی تبلایا گیا ہے۔

۱۔ **ناٹک**:۔ جس میں ہیرو دیوتا اور ہیروئن دیوی ہو۔

۲۔ **پراکارنا**:۔ جس میں ہیرو برہمن یا وزیر ہو (مرک چکاٹکا۔ مالتی مادھو)

۳۔ **بھان**:۔ جس میں مرد زیادہ ہوں اور عورتیں کم اور تمام واقعات کی کھپت صرف ایک ایکٹ (Scene) ہی میں ہو جائے جیسے سمراتھن۔

۴۔ **سماواکارا**:۔ چار ایکٹس ہوں اور شیطانی کارنامے بیان کئے گئے ہوں۔

۵۔ **دیایوگا**:۔ جس میں عورتیں زیادہ ہوں اور مرد کم۔

۶۔ ڈی ماہ۔ خوفناک لیکن سچا واقعہ۔ اس میں پورے سولہ آدمی کام کرتے ہیں اور عموماً سانپوں کی پرستش کا قصہ ہوتا ہے۔

۷۔ آہا مرگیا:۔ چار ایکٹس اور دو ہیرو والا۔

۸۔ انکایا:۔ ایک ایکٹ اور چالیس اشخاص والا ڈرامہ مثلاً "سار ستہاتیاتی"

۹۔ وتھی:۔ اس کے معنی ہیں "جذبات کی مالا" یہ ایک ایکٹ میں پُر اثر طریقہ سے ہم رشتہ ہونا چاہئے۔

۱۰۔ پراسہانا:۔ یہ کھیل ہنسی کا ہوتا ہے یعنی "کومک پلے" اور کہیں کہیں پر محبت کے کھیل بھی دکھائے جاتے ہیں۔ جیسے "کند پر اکیل"۔

ڈرامہ لکھنے سے پیشتر ایک پلاٹ بنانا پڑتا تھا اور تھوڑے تھوڑے وقفے سے اُس زمانے کے عمدہ عمدہ گیتوں کو جگہ دی جاتی تھی۔ کارکن بھڑک دار پوشاکیں پہن کر مقررہ جگہ پر جاتے تھے اور اپنا کمال دکھاتے تھے۔ ہر ڈرامہ کے لکھے جانے۔ پڑھے جانے اور کھیلے جانے کے لئے مخصوص وقت مخصوص موسم اور مخصوص عرصہ ہوتا تھا اور اس اصول کی مخالفت بدمذاقی کا سب سے بڑا ثبوت تصور کی جاتی تھی اگر ڈرامہ موسم بہار میں لکھا جاتا تھا تو وہی موسم اس کے پڑھنے اور کھیلنے کا ہوتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ کالیداس کو گرمی کا موسم بہت پیارا تھا کیونکہ اس کے ڈراموں میں محبت کی رفتہ رفتہ کثافت اور مصیبت کا نزول گرمی کی شدت کے ساتھ زیادہ عمدہ معلوم ہوتا ہے۔ "بہار ہوا" کو موسم بہار بہت زیادہ پسند تھا کیونکہ ایک تو وہ فطری شاعر تھا اور دوسرے وہ اپنے ڈراموں میں بھی "ہیرو" کے ہمراہ ایک اور شخص کو رکھتا ہے۔ جس کو وہ "دتوکا شا" یعنی مسخرہ کہتا ہے۔ وہ اکثر برہمن ہوتا ہے اور فضا کو خوشگوار بناتا رہتا ہے۔"

جواخانہ

پہلا جواری:۔ مجھے بچاؤ! یہ مندر خالی ہے۔ مجھے اس میں گھس جانے دو اور مجھے ایک کھوکھلے بت کے اندر پناہ لینے دو۔

دربان:۔ نہیں تم چور معلوم ہوتے ہو۔ تم وہی معلوم ہوتے ہو جو بغیر روپیہ ادا کئے کل بھاگ گئے تھے پکڑو پکڑو

(وہ بھاگ کر چھپ جاتا ہے)

دوسرا جواری:۔ ہاں پکڑو۔ ہات ترے گیدی کی دم میں نندہ گھر گھٹ کی دوڑ بٹورے تک اب کہاں جائیگا بچہ۔

(دونوں تلاش کرتے ہیں)

دربان۔ یہ مجسمہ تو خالی ہے۔ اس بت میں بھی نہیں۔ کہاں گیا۔ خیر چھوڑو ہم اور تم جوا کھیلیں۔

دوسرا جواری۔ اچھا پہلا سولیاں میں پھیکونگا۔

دربان ۔ نہیں میں پھینکونگا۔

پہلا جواری ۔ (کودکر) نہ تم ۔ نہ تم ۔ میں پھینکونگا۔

(دونوں پکڑکر) پکڑلیا۔ پکڑلیا۔ روپیہ دو۔ سب کا سب۔ ابھی ابھی۔ ورنہ مار پڑتی ہے۔

پہلا جواری ۔ اچھا مار و مت میں آدھا روپیہ ابھی دیتا ہوں۔

("مارنا بند کردیتے ہیں")

پہلا جواری ۔ اچھا اگر چھوڑ دو تو میں دو تہائی ادا کرونگا۔

(چھوڑ دیتے ہیں)

پہلا جواری فروٹ بھاگ جاتا ہے

(ماخوذ از مرک چکارتکا)

کہا جاتا ہے کہ کالیداس کی زندگی بکرماجیت کے دربار میں گذری جس کی حکومت ہندوراج کی "سماوات" کہلاتی ہے۔ یہ بڑا مصنف بکرماجیت کے نورتن میں سب سے بڑا تھا۔ اس کے تین ڈرامہ بہت مشہور ہیں۔ "موروسی" "شکنتلا" اور "مالاوکاگ غرتا"۔ شکنتلا کی بابت گوئٹے نے لکھا ہے:۔

" یہ تمام منہ بند کلیاں یہ تمام نورس پھول یہ تمام روح کو مسحور کردینوالی ہوائیں یہ تمام زمین و آسمان ۔

میں تیرے نام پر نچھاور کرتا ہوں شکنتلا اور سب کچھ یہی ہے"

(مسٹر ڈی)۔ ۱۔ السرد ک ٹرانسمشن۔ ۱

کالیداس کے بعد بھاوابھوتی اور سری کنٹھا بڑے مشہور ڈرامہ نویس ہوئے اور در اصل انکا شمار کالیداس سے دوسرے اور تیسرے نمبر پر ہوتا ہے۔ بھاوابھوتی ایک برہمن کا لڑکا تھا جسکا نام نیلا کنٹھ تھا اور جو کسیاپا کی خاندان سے تھا جو شہر پدما در کا حکمران اور کالے یجر دیو کا کٹر پجاری تھا۔ بھاوابھوتی برار میں پیدا ہوا اور یشو درمن کے دربار میں رہا۔ اس کے تین ڈرامہ کالیداس کے تین ڈراموں کا عکس خیال کئے جاتے ہیں "مالتی مادھو" "مہادریا" اور "اوتار راما" ہیں۔ مالتی مادھو دس ایکٹ والا ڈرامہ ہے۔ انداز بیاں کالیداس سے زیادہ لطیف اور سبق آموز ہے جس پر مصنف کو خود بھی ناز تھا۔ کول برک نے مالتی مادھو کا ترجمہ کیا ہے جسمیں سے ایک ٹکڑے کا ترجمہ حسب ذیل ہے۔ جو خلاصتاً درج کیا جاتا ہے۔

"قریب قریب کی دو ریاستوں کے دو وزیر اپنی لڑکی اور لڑکے کی سگائی کرتے ہیں۔ لڑکے کا نام مادھو ہے اور لڑکی کا نام مالتی ہے۔ ایک دن بادشاہ لڑکی والے وزیر سے کہتا ہے کہ تم اپنی لڑکی کی شادی نندا سے کردو جو خود بادشاہ کا منہ چڑھا مگر اچھوت قوم کا فرد ہے جب بادشاہ اس بات پر زیادہ مصر ہوتا ہے تو وزیر اپنی مرضی کا اظہار کر دیتا ہے۔ لڑکی کو خبر لگ جاتی ہے۔ وہ ایک باغ میں جاکر مادھو سے ملاقات کرتی ہے۔ جہاں مکرندا۔ مادھو کا جگری دوست اور مدھیان۔ نندا کی بہن بھی مل جاتے ہیں حسن اتفاق سے کٹھرے سے ایک چیتیا نکل کر بھاگتا ہے اور باغ میں آنکر مدھیان پر حملہ کرتا ہے۔ مگر مکرندا اس کو تلوار سے قتل کر دیتا ہے اور اس طرح مدھیان کی جان بچاکر مالتی کی مدد سے اس کو اس کے گھر پہنچاتا ہے۔ جس پر بادشاہ کو ایک اچھا موقع ہاتھ لگ جاتا ہے اور وہ مکرندا اور مدھیان اور نندا اور مالتی کی شادیوں کا ایک وقت اور جگہ مقرر کر دیتا ہے۔ عین ہنگامہ تقریب میں۔ مادھو پہونچ جاتا ہے اور برہمنوں اور شہر کا کارکو قتل کرنے کے بعد مالتی کو اپنے ساتھ بھگا لیجاتا ہے۔ ادھر نندا اپنے بہنوئی کو صرف اسلئے کہ مادھو کا دوست ہے اپنے گھر سے نکال باہر کرتا ہے۔ اب مکند کی نامی فقیر جو مادھو کا طرفدار ہے ایک چال کھیلتا ہے۔ ایک طرف تو نندا سے وعدہ کرتا ہے کہ وہ مالتی کو اس کے گھر بھیجدیگا اور دوسری طرف نندا کا بہنوئی مکرندا کو مالتی کا لباس زیب تن کرا کر روانہ کرتا ہے۔ مکرندا مالتی کے بھیس میں وہاں جا اترتا ہے اور موقع غنیمت سمجھکر مدیان کو وہاں سے بھگا لاتا ہے۔ غرض دونوں کی شادی

جدید اُردو ادب کا بانی

(سر سیّد احمد خاں)

محمد ابو اللیث صدیقی البدایونی بی۔ اے۔ آنرز (علیگ)

ایک
نے اُردو ادب کی نشاۃ الثانیہ علی گڑھ سے ہوئی اور جدید شعر و ادب کی داغ بیل یہیں سے پڑی، زبان کے
ر نوجیون کی تحریک کے علمبردار سرسیّد احمد خاں تھے جو بہر حیثیت انیسویں صدی کے سب سے بڑے مجدد تھے، قدرت
سرڈ انہیں اپنے فرائض کی تکمیل کے لئے مناسب اور بے حد مناسب رفقائے کار بخشے حالیؔ، نذیر احمد، شبلیؔ، ذکاء اللہ
معنی من نظام کے شموس تھے سرسیّد کی تحریکات کے کسی نہ کسی رُخ سے ضرور ہمدردی رکھتے تھے، ان میں اکثر اور علاّمہ
ساتھ بالخصوص اُن کے مذہبی معتقدات سے متفق نہ تھے لیکن جہاں تک زبان اور ادب کا تعلق ہے انہوں نے سرسیّد
کا امام اور پیشوا تسلیم کیا تھا، اُن کی متفقہ کوششوں نے اس مردہ زبان میں نئی جان ڈال دی اور بہ قول مہدی
معلوم ہوی "اس نوخیز بازاری یعنی کل کی چھوکری کو اس قابل بنا دیا کہ اپنی ثقہ بہنوں یعنی دُنیا کی دیگر علمی زبانوں
کے ہم ملا سکے" [۱] اس حیثیت سے ان ادیبوں اور انشا پردازوں کی اہمیت اور خصوصاً سرسید کی ذ
اور اُن کی سرگرمیوں کی تفصیل اردو ادب کی تاریخ میں اپنے لئے مستقل جگہ حاصل کر چکی ہے۔

سرسید دہلی میں پیدا ہوئے جیسے مسلمانوں کے عہد حکومت میں مرکزی حیثیت حاصل ہو چکی تھی نہ صرف
"اس بنا پر کہ دلّی مغلیہ سلطنت کا دار الخلافہ تھا بلکہ یوں بھی کاملین فن اور استادانِ باکمال دلّی والوں کی
قدردانی اور فیض رسانی کی اُمید پر ہندوستان اور بیرونِ ہند سے برابر آتے رہتے تھے اور حق یہ ہے کہ دلّی
والوں نے بھی ایسی قدر کی کہ جو اس دیار میں آیا پھر یہیں کا ہو رہا، دلّی کی گلیاں ملکوں ملکوں کے جواہر ریزوں
سے پٹ گئیں، ہزار ہا خاندان جو علم و فضل کی محفل میں آفتاب اور ماہتاب بن کر چمکے اسی خاک سے اٹھے اور
یہیں پیوندِ خاک ہوئے رفتہ رفتہ یہ حالت ہوئی کہ دلّی کے نوواردین کے سامنے اُن کے باپ دادا کے مقابر

[۱] مہدی الافادی بہ سلسلہ شبلی

تھے اور اُن کے پیش نظر بیٹوں اور پوتوں کا مسرت افزا مستقبل، اب دلی اُن کا وطن اور آبائی ملک ہو چکا تھا، انہیں حالات میں جملہ علوم و فنون کے اکتساب کے لئے لوگ دور دور سے دہلی آتے اور اپنا خالی دامن زر و گوہر سے بھر کر واپس لوٹتے۔

لیکن آفتاب کے کمال کے بعد زوال کا وقت بھی قریب آیا مسلمانوں کے اقبال کا ستارہ جو آٹھ سو برس تک اوج اور بلندی کی انتہائی منازل پر پہنچ کر اس ملک کے ذرہ ذرہ پر چمکتا رہا تھا ماند پڑنے لگا حکومت کے جانے کے آثار نظر آنے لگے اور ساتھ ہی دولت و ثروت نے بھی اپنی بے ثباتی کا ثبوت دیا، دہلی میں بھی وہی ہوا جو تاریخ میں ہزار بار نہیں لاکھ بار ہو چکا ہے، پہلے جو پنج ہزاری اور ہفت ہزاری کی اولاد ہونے پر نازاں تھے اب نان شبینہ کو محتاج ہے جو حاتم کی سخاوت کو کبھی آنکھ تلے نہ لاتے تھے اب دوسروں کے دست نگر اور مرہونِ منت ہوئے، امیر غریب ہوئے، شریفوں کو ذلت اور رسوائی نصیب ہوئی دلی کا چمن دیکھتے دیکھتے خزاں نے پامال کر دیا اور یہاں کے نونہال اودھ رامپور اور مرشد آباد کے دامن میں پناہ گزیں ہوئے، رفتہ رفتہ دلی کی شاہراہیں جہاں کبھی کھوے سے کھوا چھلتا تھا سنسان پڑنے لگیں جہاں کبھی کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی تھی وہاں اب کان آوازوں کو ترسنے لگے۔ دنیا اور اس کے لوازمات کی یہ بے ثباتی بھی دیکھنے کے قابل تھی جب سرسید نے اس تیرہ خاکدان میں قدم رکھا۔

دلی اُجڑ چکی تھی مگر اس اُجڑنے پر بھی وہ شان باقی تھی کہ دوسروں کی بہار اُس کو ترستی تھی، پرانے وضعدار مٹ چکے تھے مگر اب بھی جو دو چار باقی تھے اُن کے دم قدم سے شعر و ادب اور علم و فن کے مرقد میں کبھی کبھی چراغاں ہو جاتا تھا، آزردہ، صہبائی، شیفتہ، غالب اب بھی دلی کو فخر لیلا دکھلانے کو موجود تھے سرسید نے آنکھ کھولی تو ان ہی بزرگوں کا سایہ نصیب ہوا اول تو مٹی ایسی جس کا خمیر دلی کی خاک سے تھا پھر خاندانی تربیت اور اس پر ایسی صحبت کام آئی، ستاروں کی آنکھیں دیکھ رہی تھیں کہ یہ نونہال ایک دن فخر قوم اور فخر ملک ہو کر رہے گا۔

سرسید کی ابتدائی زندگی میں بقول مولانا حالی کوئی ایسی بات نظر نہ آتی تھی جو اُن کو اپنے ہم عمروں سے ممتاز کرتی، سیرت فریدیہ میں جو انھوں نے اپنے نانا نواب دبیر الدولہ امین الملک خواجہ فرید الدین احمد خاں -

بہادر مصلح جنگ کے حالات میں لکھی ہے اُن کے بچپن کے اکثر حالات قلمبند ہیں، ان ہی واقعات سے مولانا حالی نے حیات جاوید میں سرسید کے بچپن کی تصویر میں رنگ بھرا ہے اس زمانہ کے متعلق جو بات خاص طور پر قابل غور ہے وہ علمی اور اخلاقی ماحول ہے جس میں سرسیّد کی پرورش ہو رہی تھی، ان کے نانا خواجہ فریدالدین بلند پایہ عالم اور ماہر فن تھے خصوصاً علوم ریاضیہ میں اُن کو جو کمال حاصل تھا سرسید نے اکثر موقعوں پر اس کا اعتراف کیا ہے، یہی علمی ذوق تھا جو سرسیّد کو وراثت میں ملا، ان کے نانا نے فوائدالافکار فی اعمال الفرجار، تحفہ نعمانیہ در صنعت اصطرلاب، اور چند مختصر رسالے صنعت اصطرلاب، صنعت پرکار متناسبہ اور اعمال پرکار متناسبہ پر تصنیف کئے، سرسیّد نے تسہیل فی جرالثقیل کو فارسی سے اردو کا جامہ پہنایا، اور اُس کو عام فہم اور آسان بنانے کے لئے اشکال اور تصریحات سے مزین کیا اور فوائدالافکار فی اعمال الفرجار کا ترجمہ کیا کتب بینی کا شوق بھی ان کو اسی گھر سے پیدا ہوا جس نے اُن میں وسعت نظر اور تحقیق و تجسس کا ذوق پیدا کر دیا، ان کے نانا کا کتب خانہ خاصا بڑا تھا اور تمام کتابوں پر خود اُن کے قلم سے اشارے اور حاشئے تحریر تھے۔

مذہبی جوش بھی اُن میں بچپن سے پیدا ہو گیا تھا، اُن کے والدین خود بیحد متقی اور پرہیزگار تھے اور اُن کی والدہ خصوصاً مذہب کے معاملے میں بے حد روشن خیال تھیں، مذہب میں روشن خیالی سرسیّد نے اپنی والدہ سے ورثہ میں پائی تھی، اسی زمانہ سے مذہب کو وہ انسانی زندگی میں بے حد اہم سمجھنے لگے تھے، یہی اُن کے مذہبی اجتہاد کی بنیاد ہے جس پر کسی نے ان کو کافر ٹھیرایا اور کسی نے نیچری اور ملحد کا خطاب دیا، مولویوں اور ملاؤں کی گالیاں اخبار والوں کی پھبتیاں، ہند اور عرب کے مفتیوں کے کفر کے فتوے سب اسی مذہبی روشن خیالی کا صلہ تھے۔

ابتداً اُن کو تھوڑا بہت لگاؤ مغلوں کی برائے نام سلطنت سے بھی رہا تھا نواب فریدالدین احمد ابوالنصر معین الدین محمد اکبر شاہ ثانی کے وزیر تھے، موروثی خطاب جوادالدولہ بھی سرسیّد کو سراج الدین بہادر شاہ ابوظفر کے آخری دربار سے ملا تھا اس پر عارف جنگ کا مزید اضافہ بھی اُس نیک بخت بادشاہ کی طرف سے ہوا اور اس خطاب کے عطا ہونے کی تمام رسوم حسب معمول ادا ہوئیں لیکن وقت اور موقع کی مناسبت سے سرسیّد نے برطانوی حکومت کی ملازمت کو ہی مناسب سمجھا اور مرتے دم تک وہ انگریزوں کے وفادار دوست رہے

اوراُنھوں نے کوشش کی کہ ہندوستان میں انگریزی طرز تعلیم طرز معاشرت کو ترقی ہو سرسید کی زندگی کے دوسرے پہلو ہمارے موضوع سے باہر ہیں، ان پر مولانا حالی نے حیات جاوید میں کافی روشنی ڈالی ہے، آج کی صحبت میں صرف اُن کے ادبی کارناموں سے بحث ہے۔

سرسید کی ادبی کوششوں کو بارآور کرنے کے لئے قدرت نے پہلے سے مناسب ماحول تیار کر دیا تھا، اس زمانہ میں ایسے واقعات رونما ہوئے جو اردو کی ترویج اور ترقی میں بہت کچھ معین و مددگار ثابت ہوئے، ان میں سب سے اہم اردو پریس کا قیام ہے جس نے اردو کی نشر و اشاعت میں بہت مدد دی، سب سے پہلے اردو حروف کا لوہے کا چھاپہ فورٹ ولیم کالج والوں نے اردو داں طبقہ سے روشناس کرادیا تھا، اس کالج کے اراکین اور مصنفین کی متعدد کتابیں اس پریس سے طبع ہو کر نکلیں اور ہندوستان کے طول و عرض میں پھیل گئیں، آج اس حقیقت کا اعتراف کر لیا گیا ہے کہ زبان کی ترقی میں بہت کچھ حصہ پریس کا ہے اور اردو پریس کی ترقی اُردو زبان کی ترقی کے لئے ناگزیر ہے اس حیثیت سے فورٹ ولیم کالج والے اردو کے محسنوں میں شمار ہونے کے قابل ہیں۔

لیکن لوہے کا یہ چھاپہ ہندوستان میں زیادہ رواج نہ پا سکا اوّل تو لوہے کے حروف ڈھالنے میں کافی دقت اور روپیہ صرف ہوتا ہے اور پھر ایسے حروف اُردو کے مقبول نستعلیق رسم الخط کی خوبیوں پر پانی پھیر دیتے ہیں، حروف کے دائرے اور کشش سانچے میں آکر اپنے حُسن کو قایم نہیں رکھ سکتے اسی بناء پر یہ ٹائپ ملک میں مقبول نہ ہو سکا اور پتھر کے چھاپے (یعنی لیتھو پریس) کے رواج کو عام طور پر لوگوں نے پسند کیا، لیکن اس میں بڑی دقت یہ ہے کہ زیادہ تعداد میں کسی چیز کی طباعت ممکن نہیں اور زبان کا دائرہ وسیع کرنے کے لئے اس کی بھی سخت ضرورت ہے آج لوگوں نے پھر اس دقت کو محسوس کیا ہے اور پھر ٹائپ پریس کے رواج کا مسئلہ درپیش ہے۔

یہ واقعہ ۱۸۲۷ء عیسوی کا ہے، اسی زمانہ میں ملک میں جا بجا چھاپے خانے قایم ہوئے اور اردو کے اس وقت کے ادب اور زبان کی کتابیں طبع ہو کر عام طور پر بازاروں میں ملنے لگیں ان ابتدائی پریسوں میں مطبع مصطفائی اور چند دیگر پریس بہت مشہور ہوئے۔

۱۸۳۲ء میں انگریزوں نے اردو کو عدالتی اور دفتری زبان قرار دیا مغلوں نے جب فارسی کو اپنی سرپرستی میں درباری زبان کا رتبہ بخشا تھا تو ہندوستان کے کایستوں تک کو فارسی کا اکتساب کرنا پڑا تھا یہی حال اب ہوا' اردو دیکھا یک اعلیٰ رتبہ پر پہنچ گئی اور زبان کے سرمایہ میں سرعت کے ساتھ بیش بہا اضافہ ہونے لگا مصطلحات قانونی جو ابھی تک صرف انگریزی اور فارسی قانون کی کتابوں میں محدود تھے اردو کے قالب میں آنے لگے' اس سلسلہ میں مولوی نذیر احمد کی خدمات خصوصیت کے ساتھ ممتاز ہیں جن کے قانونی تراجم کی مدد سے ہزارہا الفاظ رواج کا ٹھپہ پاکر خواص اور عوام کی زبانوں پر رواں ہو گئے۔

اسی زمانہ میں مدرسوں کے لئے اکثر کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ ہوئیں اور اردو کے طرز بیان اور محاورے میں انگریزی کی صاف گوئی اور روانی کو رواج پانے کا موقع ملا' وہ پرانا اور فرسودہ طریقہ ادائے مطلب کا اٹھنے لگا اور مقفیٰ اور مسجع عبارت کی جگہ جس کی خوبی صرف الفاظ کی ظاہری نمائش پر منحصر تھی سیدھا سادا انداز پیدا ہوا اس سلسلہ میں مرحوم دہلی کالج کا نام ہمیشہ یادگار رہے گا جہاں بڑی کثرت سے بیش بہا تراجم ہوئے چونکہ یہ کتابیں خالص علمی اور ادبی مباحث سے متعلق تھیں لہذا رفتہ رفتہ زبان میں یہ صلاحیت پیدا ہونے لگی کہ سنجیدہ اور ٹھوس مباحث پر قلم اٹھایا جا سکے ورنہ اس سے پہلے شرفا اور اہل علم حضرات اردو کو صرف تفنن طبع کے لئے استعمال کرتے تھے اور قابلیت و علمیت کا معیار فارسی سے سمجھا جاتا تھا ان کے نزدیک اردو میں علمی ادبی اور معیاری چیزوں کی گنجایش ہی نہ تھی۔

فورٹ ولیم کالج والوں نے بھی اردو کی اصلاح میں بڑا حصہ لیا' برطانوی مدبروں نے محسوس کیا کہ ہندوستان میں حکومت کرنے کے لئے ہندوستانیوں کی زبان اور ادب پر قبضہ کرنا سب سے اہم ہے' زبان ہی انسان کی نفسیاتی کیفیات کا خارجی پہلو ہے اور زبان سے ہی داخلی پہلو کا علم ہوتا ہے' انھوں نے فورٹ ولیم کالج میں ہندوستانی زبان کی سرپرستی کے لئے ایک شعبہ کھولا۔

اس موقع پر اتفاقاً یا قصداً اُن سے ایسی حرکت سرزد ہوئی جس نے ہمارے زمانے میں خطرناک رنگ اختیار کر لیا ہے یعنی اردو اور ہندی کے شعبوں کو علیحدہ کر کے ایک کو مسلمانوں کے سپرد کیا اور دوسرا ہندوؤں کے سر ڈالا اور دونوں فریقوں کو اس کا احساس ہونے دیا کہ اردو مسلمانوں کی اور ہندی ہندوؤں کی

زبان ہے' اس احساس نے اُردو کو جو اسی ملک کی پیداوار ہے اور ہندو مسلمانوں کے اتفاق اور ربط وارتباط سے ظہور میں آئی' فرقہ وارانہ رنگ دے کر شدید نقصان پہنچایا۔

اگر اس امر کو نظر انداز کر دیا جائے تو فورٹ ولیم کالج والوں نے اردو کی بڑی خدمت کی اور سب سے پہلے اردو کے طرز کو سلیس اور عام فہم بنانے کی کوشش کی' انہوں نے مشہور اہل قلم حضرات کو ہندوستان کے دور دراز گوشوں سے جمع کیا اور اُن سے درسی کتابوں کی فرمایش کی' میر امن' شیر علی افسوس' مرزا علی لطف' پیارے لال' بہادر علی حسین' نہال چند لاہوری' اکرام علی' حفیظ الدین احمد' حیدر بخش حیدری نے اپنی کتابوں سے اردو میں تالیف و تصنیف کا نیا انداز پیدا کر دیا۔

۱۸۳۵ء عیسوی میں پریس ایکٹ کا نفاذ ہوا جس سے اخباروں کو برائے نام آزادی دیدی گئی' اس وقت تک اردو کا کوئی اخبار موجود نہ تھا' ۱۸۳۶ء میں مولانا آزاد کے والد مولوی محمد باقر نے دہلی سے سب سے پہلا اردو کا اخبار "اردو اخبار" نکالا اور پھر "سید الاخبار" شائع ہونے لگا جس میں سرسید اور اُن کے بڑے بھائی کی کوششیں شامل تھیں لیکن اس میں بھی زیادہ تر مضامین سرسید کے ہی قلم سے نکلتے تھے۔

تصنیفی زندگی کا پہلا دور (۱۸۳۷ء سے ۱۸۴۷ء تک)

سرسید کی تحریری زندگی اسی سید الاخبار کے دور سے شروع ہوئی اس کے بعد انہوں نے متعدد چھوٹے رسالے اور کتابیں تصنیف کیں ۱۸۳۹ء عیسوی میں کلمۃ الحق، ۱۸۴۲ء عیسوی میں[۵۱] جلاء القلوب بذکر المحبوب اور ۱۸۴۴ء میں تحفہ حسن اُن کے قلم سے شائع ہوئیں۔

کلمۃ الحق جو اس سلسلہ میں سب سے پہلی کتاب ہے پیری اور مریدی کے مروجہ طریقے کے خلاف لکھی گئی ہے' اس کی ابتدا یوں کرتے ہیں :-

"یہ کلمۃ الحق بے اختیار پیری اور مریدی کے بیان میں ہماری زبان سے نکلا ہے کیونکہ ہمارے زمانے میں پیری مریدی کا ایک ایسا جھگڑا لگا ہے جس کے سبب ہزاروں آدمی دھوکے میں پڑے ہیں جہاں ایک نئی صورت کا آدمی دیکھا کوئی تو اُس کو قطب کہتا ہے اور کوئی ابدال اور کوئی ولی اور کوئی غوث اور پھر وہ کیسی ہی باتیں کرتا ہو اس پر کچھ خیال نہیں کرتے' اگر کوئی کہے کہ میاں یہ تو شرع کے برخلاف باتیں کرتا ہے تو یوں جواب دیتے ہیں کہ اجی تم نہیں جانتے طریقت کا اور ہی رستہ ہے' فقیروں کی باتیں ہی جدا ہیں' یہ ولی اللہ کے ہیں جو کریں سو بجا ہے اور یہ نہیں جانتے کہ اللہ کی راہ نبیؐ کی اطاعت کے بغیر ملتی ہی نہیں۔

دریں راہ جز مرد راعی نرفت　　　گم آں شد کہ دنبال داعی نرفت

اس کے بعد انہوں نے حدیث اور قرآن کے حوالوں سے ثابت کیا ہے کہ انسان اگر احکام شریعت کے خلاف عمل کرے تو اُس کا ایمان درست نہیں اور اُس کی نیکی اور عبادت اور ریاضت سب بیکار ہیں' پورا مسلمان جب ہی ہوتا ہے جب شریعت کے مطابق عمل کرے' سیدھی راہ احکام الٰہی اور سنت رسول اللہ کے اتباع سے ملتی ہے' باقی راہوں میں شیطان ہے جو انسان کو بری راہ دکھاتا ہے یہ کہنا کہ انسان

---

۵۱ تصانیف کی تمام تاریخیں تصانیف احمدیہ کے حوالے سے درج ہیں۔

جب تک مرید نہ ہو اور طریقت کے بعض اشغال اور اذکار پر محنت نہ کرے دل صاف نہیں ہوتا اور ولایت حاصل نہیں ہوتی غلط ہے سنت رسول اللہ کے اتباع ہی سے ولایت اور مرتبہ ابدال اور غوث کا حاصل ہوتا ہے۔ مریدی کے موجودہ طرز پر لکھتے ہیں۔

"اب سمجھ لو کہ گناہوں سے بچنے اور سنت رسول اللہ پر چلنے اور اگلے گناہوں سے توبہ اور استغفار کرنے کے لئے اگر کوئی شخص سنت رسول اللہ سمجھ کر کسی نیکبخت پرہیزگار لکھے پڑھے عالم آدمی سے بیعت کرے تو کچھ مضائقہ نہیں بلکہ سنت و مستحب ہے مگر یہ بات کہ ہم فلانے سلسلے میں مرید ہوئے، اس کی کچھ اصل نہیں کیونکہ یہ بیعت تو دراصل توبہ ہے پھر یہ کہنا کہ ہم نے فلانے خاندان میں توبہ کی اس کے کچھ معنی نہیں، ہمارے زمانے میں تو یہ حال ہو گیا ہے کہ مرید ہو کر پیر کو اپنا حمایتی جانتے ہیں اور شجرہ لے کر اُس کو معافی کا پروانہ سمجھتے ہیں اور یوں جانتے ہیں کہ ہمارے پیر نزع کے وقت بھی کام آویں گے اور قبر میں بھی حمایت کو دوڑیں گے اور اڑے کام نکالیں گے یہ سمجھنا بالکل گمراہی ہے قبر میں اپنے اعمال کے سوا اور کچھ کام نہیں آتا شجرہ لے جانے سے کیا فائدہ اپنا نامۂ اعمال درست کرنا چاہئے جو قبر میں بھی کام آوے اور قیامت میں بھی ———"

کلمۃ الحق سرسیّد کی اولیں تصنیف ہے اور کئی وجوہ سے اہم ہے، اوّل تو یہ کہ اس سے سرسیّد کی مذہبی روشن خیالی کا حال معلوم ہوتا ہے یعنی ابتدا ہی سے وہ اُن تمام بدعتوں اور شرک سے گھبراتے تھے جو عام مسلمانوں میں خصوصاً ہندوستان میں رائج تھیں، دوسرے یہ اُس طرز تحریر کا نمونہ ہے جو سرسیّد نے اولاً صرف معمولی مذہبی مباحث کے لئے اختیار کیا اور پھر اسی کو ترقی دے کر اردو انشا پردازی کا نیا ڈھنگ نکالا، یہ کہنا کہ ۱۸۴۷ء تک جب سرسیّد نے آثار الصنادید کا پہلا اڈیشن نکالا وہ پرانے اور فرسودہ طریقے پر چلتے رہے تھے غلط ہے، ہم ابھی اس کی تردید کریں گے اور کلمۃ الحق کی طرز نگارش بھی اس کی تردید کرتی ہے، یہ ضرور ہے کہ اُس وقت وہ اس بات کے قائل تھے کہ اظہار قابلیت کے لئے اردو کو فارسی اور عربی سے الفاظ، استعارات اور محاورات مستعار لینا ضروری ہیں، اور چونکہ آثار الصنادید کو انہوں نے بڑی محنت اور عرق ریزی سے تیار کیا تھا وہ چاہتے تھے کہ کتاب عام طور پر قبول عام حاصل کرے اسی بنا پر انہوں نے آثار الصنادید کی عبارت صہبائی کی اعانت سے لکھی اور اس کا انہوں نے خود اعتراف کیا ہے، رفتہ رفتہ زمانے کا مذاق

سدھرنے پرانہوں نے اپنی تمام تصانیف کے لئے وہی آسان اور عام فہم انداز بیان اختیار کیا۔

کلمۃ الحق کے تین سال بعد یعنی ۱۸۴۲ء عیسوی میں جلاء القلوب بذکر المحبوب تصنیف ہوئی، یہ ایک مختصر سا مذہبی رسالہ ہے جس میں آنحضرت صلعم کی زندگی کے واقعات قدیم مسلمانوں کے اعتقاد کے مطابق مذکور ہیں یہ اُس زمانے کی یادگار ہے جب اُن کے مذہبی خیالات میں انقلاب پیدا نہ ہوا تھا اس وقت تک وہ محفل میلاد کو باعث خیر و برکت سمجھتے تھے اور جانتے تھے کہ شیرینی پر نیاز اور فاتحہ کا ثواب مردوں کی روح تک پہنچ جاتا ہے، یہ رسالہ بھی میلاد خوانی کی محفلوں کی نیت سے لکھا گیا تھا۔

جلاء القلوب بذکر المحبوب کا ماخذ شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کی تصنیف "سرور المحزون" ہے جو خود نور العیون فی تلخیص سیر الامین المامون" کا ترجمہ ہے، اس اصلی کتاب کے مصنف علامہ زماں شیخ ابو الفتح محمد بن محمد ہیں، اس کتاب میں جو واقعات مندرج ہیں اُن کو آج مشکوک سمجھا جاتا ہے، سرسید کتاب کی تصنیف کے وقت خود ان تمام باتوں کو مستند سمجھتے تھے مثلاً واقعہ معراج کی بحث کے سلسلے میں معراج جسمانی کو معتبر جانا ہے، اسی طرح معجزہ شق القمر اور آنحضرت کی وفات کے وقت حضرت خضر کی آمد کو معتبر سمجھا ہے آنحضرت کے سفر شام اور بحیرہ راہب کی روایت کو بھی مستند تسلیم کیا ہے، ان تمام باتوں کو سرسید نے ۱۸۸۳ء میں ایک تبصرہ میں ناقابل قبول قرار دیا ہے،

عبارت کا انداز وہی ہے جو اُس زمانے میں عام طور پر میلاد کی کتابوں کا ہوتا تھا مثلاً آنحضرت صلعم کی شب ولادت کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:-

"جس رات کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہور فرمایا انوار الٰہی ظاہر ہوئے اور کسریٰ کہ کافروں میں بہت بڑا عظیم الشان بادشاہ تھا اور ہزاروں برس سے اُس کے گھرانے میں بادشاہی چلی آتی تھی اُس کا محل لرز گیا اور چودہ کنگرے اُس کے گر پڑے ـــــ

چو صیتش در افواہ دنیا فتاد
تزلزل در ایوانِ کسریٰ فتاد"

جلاء القلوب بذکر المحبوب کی تصنیف کے دوسرے سال یعنی ۱۸۴۳ء میں سرسید نے ابو علی کے رسالہ

معیار العقول کا اردو میں ترجمہ کیا اور اُس کا نام تسہیل فی جرالثقیل رکھا، اس فن پر پہلے ایک رسالہ حکیم ابوذر یمنی نے لکھا تھا اور معیار العقول اسی کی عربی تصنیف کا ترجمہ تھا۔

اب تک اردو زبان میں سائنٹفک مباحث پر بہت کم تصانیف دستیاب ہوتی ہیں، اوّل تو ہندوستان میں سائنسدانوں کا ہمیشہ فقدان رہا ہے دوسرے اردو میں ان علوم کے لئے مناسب مصطلحات بھی ناپید ہیں، دارالترجمہ حیدرآباد کی کوششوں سے مختلف علوم وفنون کی کتابیں بکثرت ترجمہ ہورہی ہیں اور اردو کے علمی سرمایہ میں کافی اضافہ کی اُمید ہے لیکن انیسویں صدی میں نہ لوگوں کو اس طرف توجہ تھی اور نہ اس کی سرپرستی اور حمایت کی جاتی تھی، اس دور میں سرسید کا تسہیل فی جرالثقیل کا ترجمہ کرنا اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ وہ اردو زبان کو علوم وفنون سے مالا مال کرنا چاہتے تھے اور اُس کے لئے تراجم کو سب سے مناسب اور آسان سمجھتے تھے۔

یہ ترجمہ اُس زمانہ کی یادگار ہے جب سرسیّد فتح پور سیکری میں منصف تھے اور اکثر علم دوست انگریزوں کی صحبت میں ہر وقت اُٹھنے بیٹھنے کا موقع ملتا تھا چنانچہ یہ رسالہ بھی پادری جیمس مور سیکریٹری اگرہ اسکول بک سوسائٹی کی تحریک سے ترجمہ ہوا اور آگرہ میں ۱۸۴۴ء سے طبع ہوا اس کی ابتداء سرسید نے یوں کی ہے۔

"آدمی کو لازم ہے کہ دن رات اپنے پروردگار کی تعریف کرے جس نے ایک چٹکی خاک سے طرح بہ طرح کی سورتیں بنائیں اور اپنے بندوں کو دین کی سیدھی سیدھی راہیں بتائیں اور اللہ کی رحمت ہو اس پاک پیارے محمد نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر کہ اُس کے سبب سے ہم گمراہوں نے دوزخ کی آنچ سے نجات پائی اور پروردگار کی اُس نے راہ دکھائی، اللہ اور اللہ کے رسول کی حمد اور نعت کے بعد سید احمد حسینی الحسنی المخاطب بخطاب جواد الدولہ سید احمد خان بہادر عارف جنگ فتح پور سیکری ضلع آگرہ کا منصف سب بزرگوں اور عقلمندوں کی خدمت میں عرض کرتا ہے۔"

کلوں کے بیان میں لکھتے ہیں:۔

"جرثقیل کے علم سے تین کام پڑتے ہیں، ایک یہ کہ بڑی بھاری بوجھل چیزوں کو تھوڑے زور سے اُٹھانا

یا کھینچ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا، دوسرے یہ کہ سخت سخت چیزوں کو چیرنا، تیسرے یہ کہ جو چیزیں کہ اُن کا دبانا یا نچوڑنا مشکل ہو اُن کو دبانا یا نچوڑنا ان تینوں کاموں کے واسطے کل پانچ کلیں ہیں، ایک کا نام محور ہے کہ ہندی میں اس کو دھورا کہتے ہیں دوسری کا نام محل ہے کہ ہندی میں اُس کو ڈبلک کہتے ہیں اور ڈھینکلی بھی کہتے ہیں اور تیسری کا نام بکرہ ہے کہ ہندی میں اُس کو چرخی کہتے ہیں اور گھرنی اور پہیہ بھی اُسی قسم سے ہے اور چوتھی کا نام لولب ہے کہ ہندی میں اُس کو پیچ کہتے ہیں، پانچویں کا نام اسفین ہے کہ ہندی میں اُس کو پھینی کہتے ہیں اور چھینی بھی اسی قسم سے ہے، حکیم ابو ذر نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ اگر میرے تئیں زمین کے سوا اور کوئی ایسی جگہ ملتی کہ اس میں جر ثقیل کی کلیں کھڑی ہو سکتیں تو میں ساری زمین کو اُدھر اٹھا لیتا ۔

جلاء القلوب بذکر المحبوب، کی تصنیف کے دو سال بعد یعنی ۱۸۴۴ء ۱۲۶۰ھ میں سرسید نے شاہ عبدالعزیز صاحب کی کتاب 'تحفہ اثنا عشریہ' کے چند ابواب کا ترجمہ کیا اور اُس کا نام تحفہ حسن رکھا، ترجمے میں دو باب شامل ہیں باب دہم جس میں مطاعن حضرت ابو بکر صدیقؓ اور ان کے جوابات کا ذکر ہے اور باب دوازدہم جو تولاّ اور تبرا کی بحث پر ہے، اس رسالہ کی ابتدا سرسید نے یوں کی ہے :۔

"اُس خداوند مقدس ہی کو سب تعریفیں پھبتی ہیں جو ہر عیب اور نقصان سے پاک ہے اور اُس کے کسی کام میں طعنہ تشنہ کا مقام نہیں جو کیا عین حکمت ہے اور جو کرتا ہے وہ عین مصلحت ہے، اپنے بندوں کے واسطے کیا کیا کچھ کیا رسول بھیجے سیدھی راہ بتائی، بھلے بُرے کی سمجھ سکھائی اور درود اور رحمت پہنچے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارک کو کہ اُن کے نور ہدایت سے عالم روشن ہوا، گمراہوں نے سیدھی راہ سیکھی دوزخ کے عذاب سے بچے اپنے معبود کو پہچانا اور اپنے پیدا ہونے کا سبب جانا اور اُن کی آل اور اصحاب اور خلفائے راشدین پر اللہ کی رحمت ہو کہ انہوں نے اپنے دین کے چمکنے کے لئے طرح طرح کے دُکھ اٹھائے، انواع انواع کی مصیبتیں سہیں، دنیا کے مزوں کو چھوڑا خدا کی راہ کو پکڑا۔"

اس مختصر تمہید کے بعد انہوں نے افسوس کیا ہے کہ لوگ عموماً خلفائے راشدین کے حالات سے بے خبر ہیں اور شیعوں نے اُن کی نسبت ایسی ایسی جھوٹی باتیں پیدا کر لی ہیں جو ان کا ہر بچہ جانتا ہے اور سنیوں کی کتابوں میں اُن کا کچھ پتہ نہیں لہذا شاہ عبدالعزیز صاحب کی کتاب "تحفہ اثنا عشریہ" کے باب دہم اور باب دوازدہم

مطاعن حضرت ابوبکرؓ کا "صاف صاف اردو زبان" میں ترجمہ کیا اور ترجمہ کا نام تحفہ حسن رکھا افسوس کہ ترجمہ مکمل نہ ہوسکا یا مکمل ترجمہ شاید طبع نہ ہوسکا مطاعن حضرت ابوبکرؓ کی ابتدا یوں کرتے ہیں:۔

"یہ جان لو کہ دنیا میں ایسا کوئی شخص نہیں ہے کہ اس کے اوپر عیب چینوں اور دشمنوں نے عیب نہ لگائے ہوں بلکہ خدا کو بھی نہیں چھوڑا اور معتزلہ نے حضرت آدم سے لیکر ہمارے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم تک سب نبیوں کی طرف صغیروں، اور کبیروں کی تہمت لگا کر آیتوں اور حدیثوں سے ثابت کئے ہیں اور یہودیوں نے فرشتوں کو اور خارجیوں اور ناجیوں نے جناب علی مرتضیٰؓ اور اہل بیت کی نسبت ایسا کچھ بکا ہے کہ کیا کہئے لیکن عقلمندوں پر ظاہر ہے کہ یہ سب کتوں کا بھونکنا ہے کہ جب چاندنی نکلتی ہے کتے بھونکا ہی کرتے ہیں ایسی باتوں سے ان بزرگوں کے مرتبہ میں کچھ نقص نہیں ہوتا۔

تحفہ حسن کے بعد ۱۸۴۴ء سے ۱۸۴۶ء تک سرسید نے کوئی خاص تصنیف پیش نہیں کی البتہ ۱۸۴۷ء میں آثار الصنادید کا پہلا اڈیشن نکلا، اس طرح ۱۸۳۷ء سے ۱۸۴۷ء تک سرسید کی تصنیفی زندگی کا پہلا دور ختم ہوتا ہے، اس زمانہ میں انہوں نے صرف تین مذکورالصدر رسالے مذہب پر اور ایک جرالثقیل پر تصنیف کئے لیکن اُس وقت تک اُن کا شمار ملک کے ادیبوں اور بلند پایہ مصنفوں میں نہیں کیا جاتا تھا، آثار الصنادید کی اشاعت کے بعد وہ ہندوستان اور بیرون ہندوستان میں مستقل حیثیت کے مالک ہوگئے، اس دہ سالہ تصنیفی زندگی میں بھی اُن کے آیندہ کارناموں کی جھلک پائی جاتی ہے، تحفہ حسن میں وہ "صاف صاف اردو زبان" کو پسند کرتے ہیں اور خود بھی اس کی پابندی کرتے ہیں لیکن طرز میں اب بھی قدامت پسندی کا اثر موجود ہے، تمہیدیں بھی خاصی طولانی ہوتی ہیں اور اُن کا انداز قدماء کی تمہیدوں سے بہت قریب آجاتا ہے لیکن اُن کا استدلال جس کے لئے وہ اپنے تمام معاصرین میں ممتاز تھے اس دور کی تصانیف میں بھی پایا جاتا ہے، جس بات کو وہ کہنا چاہتے ہیں اُس کو سادہ زبان میں ادا کرتے ہیں کہ سننے والے کے دل پر اثر کرے، عبادت آرائی اور رنگین و مترنم الفاظ کی میناکاری جو اس عہد تک مقبول چیز سمجھی جاتی تھی اُن کے ہاں موجود نہیں، معلوم ایسا ہوتا ہے کہ وہ خود ان چیزوں سے متنفر تھے،

اب تک اُن کی تحریریں انگریزی ادب اور زبان سے بالکل غیر متاثر معلوم ہوتی ہیں، انگریزی کا اثر خصوصیت کے ساتھ آخر عمر کے کارناموں میں پایا جاتا ہے جب وہ انگریزی معاشرت، انگریزی تعلیم اور انگریزی

حکومت کو ہندوستان کے لئے ضروری سمجھنے لگے تھے، انگریزی کی جگہ اب تک فارسی اور عربی کا ہی اثر کارفرما نظر آتا ہے لیکن اردو کا خون اس طرح نہیں کیا ہے جیسا مرزا رجب علی بیگ سرور نے میرامن کی روزمرہ کے مقابلہ میں فسانہ عجائب اور دیگر تصانیف میں کیا ہے۔

سرسید سب سے پہلے اور سب سے آخر میں ایک بڑے مصلح تھے، نذیر احمد نے اردو زبان سے سب سے پہلے سوسائٹی کی اصلاح کا کام لیا لیکن اس کی ابتدا بھی سرسید نے کی، کلمۃ الحق، جلاء القلوب بذکر المحبوب اور تحفہ حسن تینوں رسالے مذہبی عقائد کی اصلاح کو پیش نظر رکھ کر لکھے گئے۔

تصنیفی زندگی کا دوسرا دور

تصنیفی زندگی کا دوسرا دور ۱۸۴۲ء سے ۱۸۵۷ء تک قایم رہا۔ اس دور کی تصانیف میں آثار الصنادید ۱۸۴۷ء سب سے پہلی اور آئین اکبری کی تصحیح شاید آخری خدمت ہے۔ "راہ سنت در رد بدعت" (۱۸۵۰ء) سلسلۃ الملوک (۱۸۵۲ء) کیمائے سعادت (۱۸۵۳ء) آثار الصنادید کا دوسرا نسخہ (۱۸۵۴ء) تاریخ بجنور (۱۸۵۶ء) بھی اسی زمانہ کی یادگار ہیں، ان میں سب سے بڑا کارنامہ آثار الصنادید ہے۔

آثار الصنادید کئی اعتبار سے بڑی اہم کتاب ہے، اس کی تاریخی اہمیت اس پایہ کی ہے کہ اس کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ ہوا اور رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے سرسید کو اعزازی فیلو منتخب کیا، جس تفصیل اور صحت کے ساتھ سرسید نے دہلی کی قدیم اور جدید عمارات کا حال لکھا ہے اور جس تحقیق و تدقیق سے یہ کام انجام دیا ہے وہ بہر حال قابل ستایش ہے، کتبوں کے پڑھنے میں جو محنت اور دقت درکار تھی اُس سے سرسید کے ذوق کی داد دینا پڑتی ہے آثار الصنادید کی اہمیت یہ بھی ہے کہ وہ اپنی قسم کی اردو زبان میں پہلی کتاب ہے، اس سے قبل اس قسم کے ٹھوس علمی اور تاریخی مباحث پر اردو میں قلم اٹھانے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔

آثار الصنادید اس وجہ سے بھی اہم کتاب ہے کہ پرانی طرز کی مقفیٰ اور مسجع عبارت کا آخری نمونہ ہے، سرسید کا مذاق اگرچہ ابتدا ہی سے سادگی پسند تھا لیکن انھوں نے آثار الصنادید کا انداز بیان عوام کے مذاق کے مطابق رکھا بلکہ بقول حالی انھوں نے کتاب کے لئے مصالحہ جمع کیا اور صہبائی کے قلم نے عبارت آرائی کی، اس کے بعد سرسید کو خود اپنی غلطی کا احساس ہوا اور انھوں نے آثار الصنادید کے دوسرے طبع میں انداز بیان اتنا ہی سادا اور سلیس و عام فہم کر دیا جتنا کلمۃ الحق، تحفہ حسن، تسہیل فی جر الثقیل اور جلاء القلوب بذکر المحبوب کا ہے۔

آثار الصنادید کی تصنیف کے بعد ہی سرسید ملک کے ادیبوں اور مصنفوں کی صفِ اوّل میں آگئے، اس سے پہلے انھوں نے جو رسائل تصنیف کئے تھے ان سے ان کی شہرت صرف محدود مذہبی حلقوں میں ہوگئی تھی آثار الصنادید کے بعد وہ ہندوستان اور بیرون ہند بھی متعارف ہوگئے، چنانچہ گارسن دتاسی نے جو فرانس کا

مشہور مصنف اور انشا پرداز تھا اور اردو ادب سے بالخصوص دلچسپی رکھتا تھا باوجود ہندوستان سے دور رہنے کے ہندوستان کی زبان و ادب پر اس درجہ عبور رکھتا تھا کہ ہر سال کے آخر پر ہندوستانی ادب کا جائزہ لیا کرتا تھا اور اس پر ایک بصیرت افروز خطبہ بھی تیار کرتا تھا، یہ خطبات فرانسیسی زبان میں تھے لیکن ان میں سے اکثر اور بیشتر اب اردو میں منتقل ہو چکے ہیں۔ ان خطبات میں سرسید کا ذکر آثار الصنادید کے بعد ہی ملتا ہے۔

آثار الصنادید کافی ضخیم کتاب ہے اور ضخامت میں مزید اضافہ عمارات کے نقشوں اور کتبات کے چربوں کی وجہ سے ہو گیا، کتاب کی ترتیب یوں ہے کہ اوّل ایک تقریظ منظوم نواب محمد ضیاء الدین خان بہادر کی فارسی میں ہے جس میں تقریباً ایک سو ایک اشعار شامل ہیں، اس تقریظ میں حمد و نعت کے بعد وہ کتاب کی تعریف اس طرح کرتے ہیں۔

محمل لیلائے معانی نگر　　　ہودج سلمائے معانی نگر

اور پھر مصنف کی تعریف کرتے ہیں۔

زمزمہ در پردہ سرائیم چرا　　　پردہ معنی نہ کشائیم چرا
کیں گہر کیں پیکر رنگین طراز　　　کامدہ ہم دلکش وہم دلنواز
ریختۂ خامۂ میر احمد است　　　خود سخن از نامۂ میر احمد است
آں علوی گوہر عالی نسب　　　سید عالی معالی حسب
خازن گنجینۂ اسرار فیض　　　ناظر آئینۂ انوار فیض

اسی طرح آخر تک ثنا و توصیف کرتے چلے گئے ہیں۔

اصل کتاب کی ابتدا ایک تمہید سے ہوتی ہے جس کا انداز سرسید کی قدامت پسندی کا آئینہ ہے لکھتے ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

از نقش و نگار در و دیوار شکستہ　　　آثار پدید است صنادید عجم را

حمد اس خالق کائنات کی جس نے اٹھارہ ہزار عالم کو دو حرف کن سے پیدا کیا اور بعد ہزار آن ہزار

جلوۂ ہائے زنگارنگ کے پھر پردہ عدم میں لے جائے گا اور نعت اس رسول الثقلین کی جس نے جن و انس کو وادی ضلالت سے نکالا اور بعد جزائے اعمال کے اور سزائے کردار کے پھر دار السلام میں پہنچائے گا حیّز تحریر سے افزوں ہے اور احاطہ تحریر سے بیرون، بہتر یہ ہے کہ فکر مآل اندیش اس داعیہ محال سے ہاتھ اٹھا کر اپنے اندازہ سے پانوں باہر نہ نکالے اور اس امر صعب میں ہاتھ نہ ڈالے اسی واسطے خاک پائے اہل ہنر خوشہ چین معنی طرازان سخنور اُمیدوار رحمت صمد سید احمد مخاطب بہ جواد الدولہ عارف جنگ بیٹا سید محمد متقی خاں بہادر مرحوم اور پوتہ جواد الدولہ جواد علی خان بہادر مرحوم اور نواسہ نواب دبیر الدولہ امین الملک خواجہ فرید الدین احمد خان بہادر مصلح جنگ کا دانایان اولی الابصار اور صاحب طبعان روزگار کی خدمت میں عرض کرتا ہے کہ مدت دراز سے یہ اندیشہ دامن گیر تھا کہ اگر حیلہ گری زمانہ بر بہانہ سے اندک نجات حاصل ہو جاوے اور فلک ناتواں چیں کے پنجہ سے کچھ مہلت ہاتھ آوے تو ایک ایسا نسخہ عجیب اور مجموعہ غریب خامہ چابک رقم کے زور اور فکر آسمان سیر کی اعانت سے لکھا جائے کہ عمارات سواد حضرت شاہ جہاں آباد حرسہ اللہ عن الاضداد اور مکانات درون شہر اور قلعہ مبارک کا حال اس میں مندرج اور اطوار و اوضاع ساکنین شہر کا احوال اس میں مندرج ہو"

کتاب چہار ابواب پر مشتمل ہے، پہلے باب میں شہر کی عمارتوں کا حال ہے، دوسرا باب قلعہ معلی کی عمارتوں کے حال میں ہے، تیسرے باب میں خاص شہر شاہ جہاں آباد کا ذکر ہے چوتھے اور آخری باب میں دلی کے لوگوں کا بیان شامل ہے، پہلے باب میں ۴۳۱ عمارات و باغات و مقابر کا حال اور نقشے شامل ہیں، دوسرے باب میں ۴۳ عمارتوں کا ذکر ہے جو سب کی سب قلعہ معلیٰ سے متعلق ہیں تیسرے باب میں ۸۷ عمارات کا ذکر ہے۔ آخری باب میں تمام مقامات کا حال لکھ کر شہر کی آب و ہوا زبان اور لوگوں کے عادات و اطوار کو بیان کیا ہے اور آخر میں ارباب موسیقی، مصور اور شعراء کا حال علیحدہ علیحدہ تحریر کیا ہے اب ہم مختلف مقامات سے کچھ نمونے پیش کرتے ہیں۔

بیان قلعہ تغلق آباد

یہ قلعہ غیاث الدین تغلق شاہ بیٹے ملک تغلق نے جو غیاث الدین بلبن کے غلاموں میں تھا بنایا ہے اس قلعہ کی تیاری سنہ ۷۲۱ ہجری میں شروع ہوئی اور بہت جلد تیار ہو گیا کسی زمانہ میں یہ قلعہ بہت نفیس اور لطیف ہو گا

لیکن اب بالکل خراب اور ویران ہے، اکثر جگہ سے فصیل قلعہ کی قائم ہے مگر اندر کے مکان بالکل ٹوٹ گئے ہیں کہ نام ونشان تک نہیں رہا، بجز گڑہوں اور پتھروں کے ڈھیر کے اور کچھ معلوم نہیں ہوتا، قلعہ کے بیچوں بیچ میں ایک بہت بلند مکان بنا ہوا تھا اور وہ بادشاہ کی بیٹھک تھی، اس کو جہاں نما کہا کرتے تھے، لوگوں کے ذہن میں یہ سمارہا ہے کہ اس سے بڑا اور کوئی قلعہ نہیں ہے اور کہتے ہیں کہ اس قلعے کے چھپن کوٹ اور باون دروازے ہیں، میں نے جو اس قلعے کو بخوبی دیکھا تو یہ خیال غلط معلوم ہوا اور یہ بات تحقیق ہوئی کہ یہ قلعہ بہت بڑا نہیں ہے، بادشاہ نے مغرب کی طرف قلعہ بنایا تھا اور تین طرف یعنی مشرق اور شمال اور جنوب کی طرف تغلق آباد کا شہر آباد کیا تھا اور شہر کی فصیل اور قلعہ کی فصیل اس خوبصورتی سے ملا کر بنائی ہے کہ سارا شہر اور قلعہ ایک قلعہ معلوم ہوتا ہے، ہم نے اس نقشہ میں جس قدر کہ اصل قلعہ کی عمارت ہے وہاں لفظ قلعہ کا لکھ دیا ہے یہ قلعہ شاہجہاں آباد سے چھ کوس کے فاصلہ پر جنوب کی طرف واقع ہے، اس قلعہ میں راجہ ناہر سنگھ بلم گڈھ والہ کی عملداری ہے اور پچاس ساٹھ برس سے اس قلعہ میں گوجر آباد ہیں اور اُن کو افعال شنیعہ کرنے کو بہت اچھا مامن ہاتھ آیا ہے اور ایک چھوٹی سی پہاڑی پر یہ قلعہ بنایا گیا ہے، عمارت اس قلعہ کی تمام چونہ اور خارا کے پتھر سے ہے، دروازے بہت چھوٹے اور در پست پست جیسے اگلی عمارتوں کے ہوتے تھے ویسے ہی ہیں، لیکن اس زمانہ کی عمارتوں میں بہت خوبصورت عمارت ہے اور نہایت مستحکم، اس عمارت کو بنے ہوئے پانسو چالیس برس کے قریب عرصہ ہوا، اسی قلعہ کے پاس مغرب کی طرف تغلق شاہ کا مقبرہ ہے۔" [۵]

اسی کتاب میں دوسرا اہم بیان زبان کے متعلق ہے جو اس عہد کی تحقیقات کے معیار سے یقیناً بہت بلند ہے، لکھتے ہیں۔

"یہاں جو اب زبان مروج ہے اور جس میں سب لوگ بولتے چالتے ہیں اوس کا نام اردو ہے اور تحقیق اس کی یوں ہے کہ اردو فارسی لفظ ہے اور اس کے معنی بازار کے ہیں اور اردو سے مراد اردوئے شاہجہاں ہے، اگرچہ دلی بہت قدیم شہر ہے اور ہندوؤں کے تمام راجا پرجاؤں کا ہمیشہ سے دارالسلطنت رہا ہے لیکن سب اپنی اپنی بھاکا بولتے تھے ایک کی دوسرے سے زبان نہیں ملتی تھی، جبکہ ہندوستان میں مسلمانوں کی عملداری

---

[۵] آثار الصنادید طبع اوّل مطبوعہ مطبع سید الاخبار باہتمام سید عبدالغفور ۱۸۴۷ء ۱۲۶۳ھ

ہوئی اور مسلمان لوگ ان شہروں میں آئے تو اور بھی مشکل پڑی اور اس نئی زبان کے لوگوں کے آنے سے سودا سلف لینے دینے بیچنے بچانے میں دقت پڑنے لگی، اوّل اوّل تو مسلمانوں کی عملداری میں اختلاف رہا، کبھی کسی کی بادشاہت رہی کبھی کسی کی، کبھی غوری آئے اور کبھی لودھی اور کبھی پٹھان اور کبھی مغل، اس سبب سے زبان کا بدستور اختلاف رہا اور کوئی شخص اُس کی اصلاح کے پیچھے نہ پڑا جب کہ اکبر بادشاہ ہوا ایک گونہ سلطنت کو قیام ہوا اور سب لوگ اپنے اپنے ٹھکانے بیٹھے اور علم کا بھی چرچا ہوا لیکن اس زمانہ میں فارسی زبان کی ایسی قدر تھی کہ لوگ اور کسی طرف متوجہ بھی نہیں ہوتے تھے جب کہ شہاب الدین شاہجہاں بادشاہ ہوا اور اس نے انتظام سلطنت کا کیا اور سب ملکوں کے وکلا کے حاضر رہنے کا حکم دیا اور دلّی شہر کو نئے سرے سے آباد کیا اور قلعہ بنایا اور شاہجہاں آباد اس کا نام رکھا اس وقت اس شہر میں تمام ملکوں کے لوگوں کا مجمع ہوا، ہر ایک کی گفتار رفتار جدا جدا تھی ہر ایک کا رنگ ڈھنگ نرالا تھا، جب آپس میں معاملات کرتے لاچار ایک لفظ اپنی زبان کا دو لفظ اس کی زبان کے تین لفظ دوسرے کی زبان کے ملا کر بولتے اور سودا سلف لیتے، رفتہ رفتہ اس زبان نے ایسی ترکیب پائی کہ یہ خود ایک نئی زبان ہو گئی اور چونکہ یہ زبان خاص بادشاہی بازاروں میں مروج تھی اس واسطے اس کو زبان اردو کہا کرتے تھے اور بادشاہی امیر امرا اسی کو بولا کرتے تھے گویا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی یہی زبان تھی، ہوتے ہوتے خود اس زبان کا ہی اردو نام ہو گیا، اس وقت سے اس زبان نے ایک رونق حاصل کی اور دن بدن تراش خراش اس میں ہوتی گئی یہاں تک کہ جس زمانہ میں میرؔ اور سوداؔ نے آوازہ اپنی خوش بیانی کا بلند کیا تھا اور یہ آویزہ ہر ایک کے کان میں پہنایا تھا اس وقت یہ زبان بہت درست ہو گئی تھی اور عجب رنگ ڈھنگ نکال لائی تھی اُن کے بعد کچھ کچھ اس زبان میں تغیر و تبدل ہوئی اور اب ایسی منجھ گئی ہے کہ قیامت تک اس سے بہتر ہونی ممکن نہیں، اور اس زبان کو شاہجہاں آباد سے ایسی نسبت ہے جیسے فارسی کو شیراز سے، یعنی یہاں کے لوگوں کی زبان تمام اردو بولنے والوں کو سند ہے، نہیں تو بقول میرامن کے اپنی دستار رفتار گفتار کو کوئی برا نہیں جانتا، اگر ایک گنوار سے پوچھیے تو شہر والے کو نام رکھتا ہے اور اپنے تئیں سب سے بہتر سمجھتا ہے، خیر عاقلان خود میدانند، اگرچہ اس زبان میں اکثر فارسی اور عربی اور سنسکرت کے الفاظ مستعمل ہیں اور بعضے بعضوں میں کچھ تغیر و تبدیلی ہو گئی ہے لیکن اس زمانے میں اس شہر کے لوگوں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ اردو زبان میں یا تو فارسی کے لغت بہت ملا دیتے ہیں اور یا فارسی کی ترکیب پر

لکھنے لگتے ہیں، یہ دونوں باتیں اچھی نہیں ان سے اردوپن جاتا رہتا ہے اور ظاہر ہے کہ اس بات کے لیے کہ کس قدر فارسی کی ترکیب دی جاوے اور کون کون سے لغت اور زبانوں کے نہ بولے جاویں کوئی قاعدہ مقرر نہیں ہو سکتا یہ بات صرف اہل زبانوں کی صحبت پر منحصر ہے" [۵۱]

آثار الصنادید کے طبع اوّل (۱۸۴۷ء) سے ۱۸۵۷ء تک سرسید نے متعدد تاریخی اور مذہبی کتابیں تصنیف کیں ان میں "رسالہ راہ سنت در رد بدعت" (۱۸۵۰ء) سلسلۃ الملوک (۱۸۵۲ء) ترجمہ کیمیائے سعادت (۱۸۵۳ء) آثار الصنادید طبع دویم (۱۸۵۴ء) تاریخ بجنور (۱۸۵۵ء) تصحیح آئین اکبری (۱۸۵۶ء) زیادہ اہم اور مشہور ہیں۔

"راہ سنت در رد بدعت" اس زمانہ کی تصنیف ہے جب سرسید پر وہابیت کا دورہ طاری تھا، یہ زمانہ سرسید کی ابتدائی اور یادگار صحبتوں کا تھا لکھتے ہیں:۔

"یہ باتیں تو ایسی صحبتوں کی یادگار ہیں جن کی یاد سے آنسو بھر آتے ہیں، کجا وہ صحبتیں اور کجا وہ محفلیں کہاں وہ آزردہ کہاں وہ شیفتہ، اور کہاں وہ صہبائی، کہاں وہ علما اور کہاں وہ صلحا، صرف یاد ہی یاد ہے" [۵۲]

رسالہ پر تبصرہ کرتے ہوئے ۱۸۷۹ء میں سرسید نے لکھا ہے کہ اس رسالے کے دو حصے ہیں، ایک وہ جو عقائد اور عبادت سے تعلق رکھتا ہے جس کو وہ آخر عمر میں مذہب سمجھتے تھے، دوسرے حصے کا واسطہ عبادات اور امور دنیاوی سے ہے جس کو وہ تبصرہ کرتے وقت مناسب سے خارج کر دیتے ہیں، اصل رسالے میں دونوں چیزوں کو ملا دیا گیا ہے۔

رسالے کے شروع میں ۱۲ اشعار کی ایک مناجات ہے جو بیحد رواں اور شگفتہ ہے اسی کے بعد اصل عبارت یوں شروع کی ہے:۔

"سنو بھائی مسلمانوں ہمارے زمانے میں بدعت کا ایسا زور ہوا ہے کہ سنت کے نام سے لوگ بھاگتے ہیں، اگر سنت کا نام لو تو وہابی اور معتزلی کہلاؤ اور اگر بدعت پر بدعت کرتے جاؤ تو اللہ کے ولی بن جاؤ اب تو یوں ٹھہر گیا ہے کہ جو سنت پر چلے وہ وہابی اور جو بدعت کرے وہ ولی، ایک بزرگ کا قول ہے کہ اگلے

---

۵۱ آثار الصنادید طبع اوّل مطبع سید الاخبار سہ فصل چہارم ص ۱۳۱۔۱۲

۵۲ راہ سنت در رد بدعت، مشمولہ تصانیف احمدیہ حصہ اوّل جلد اوّل۔

زمانے میں بعض بزرگوں نے ایسا کیا ہے کہ جب بہت سے لوگ ان کے معتقد ہو جاتے اور اس سبب سے ان کے اوقات میں خلل پڑتا تو اُن کا عقیدہ توڑنے اور اپنا پیچھا چھڑانے کو ایک چھوٹی سی سنت کو چھوڑ دیتے تاکہ لوگ بے اعتقاد ہو جاویں اور ملامت کریں کہ یہ تو تارک سنت ہے اس کے پاس پھٹکنا نہیں چاہئے' اب یہ زمانہ آگیا ہے کہ اگر کوئی یہ چاہے کہ لوگ مجھے بُرا کہیں اور میرے پاس نہ پھٹکیں وہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا اتباع کرے کہ اس زمانے میں اس کے بُرا کہنے کو یہی بات کافی ہے''

اس تمہید کے بعد انہوں نے سنت اور بدعت کے معنی اور مفہوم سے بحث کی ہے' اور سنت کا مفہوم یہ بتایا ہے کہ جو بات آنحضرت نے کی یا کرنے سے منع نہ کیا اور جو صحابہ اور تبع تابعین کے عہد میں رائج تھی اس کا اتباع اتباع سنت ہے اور بدعت کے معنی نئی چیز پیدا کرنا ہیں کہ نہ وہ اور نہ اس کے مثل ان تینوں زمانوں میں موجود تھی' اسی سلسلہ میں وہ مختلف قسم کی بدعتوں کا ذکر کرتے ہیں اور اس کی مثالیں مسلمانوں کے اس عہد کی معاشرت سے پیش کر کے حدیث اور قرآن سے اسناد کرتے ہیں:۔

سرسید کے مذہبی معتقدات پر تبصرہ کرنا ہمارے موضوع سے باہر ہے" رسالہ راہ سنت در رد بدعت کی اہمیت ہماری نظر میں صرف یہ ہے کہ وہ سرسید کے قلم کی پیداوار ہے اور ان کے مخصوص طرز تحریر کی آئینہ دار ہے' یہ رسالہ اس وجہ سے اور بھی اہم ہے کہ آثار الصنادید کی اشاعت کے بعد سرسید کی تحریر کا اولین نمونہ ہے اور طرز بیان ادا اور زبان میں آثار الصنادید سے مختلف ہے' اگر آثار الصنادید کی عبارت مقفیٰ مرصع اور پر تکلف ہے تو اس رسالہ میں روانی اور سلاست ہے' عبارت میں بلا کی بے تکلفی اور برجستگی پائی جاتی ہے' نہ ردیف اور قافیے کا التزام ہے نہ فارسی اور عربی کے ثقیل الفاظ اور لغات سے بیچاری اردو کا خون کیا گیا ہے' اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ آثار الصنادید کی عبارت قصداً ایسی لکھی گئی اور ایک حد تک صہبائی کے قلم کی مرہون منت ہے اور باقی رسائل سرسید کے فطری انداز میں لکھے گئے ہیں تو اس حقیقت کے اعتراف میں شبہ کی گنجائش نہیں کہ سرسید ابتدا ہی سے اردو نثر میں سادگی اور بے تکلفی کے قائل تھے جس کو عام بنانے کے لئے' انہوں نے تہذیب الاخلاق کے پرچوں کے ذریعہ سے بڑی کوشش کی۔

اس رسالہ کے دو سال بعد یعنی ۱۸۵۲ء میں انہوں نے سلسلۃ الملوک مرتب کیا' یہ کتاب اصل میں اُن

راجاؤں اور بادشاہوں کی مختصر فہرست ہے جو دلّی میں پانچ ہزار برس تک نوبت بہ نوبت فرمانروا ہوتے چلے گئے اصل میں یہ فہرست آثار الصنادید کے لئے ضمیمہ کے طور پر لکھی گئی تھی اور دوسرے اڈیشن میں پہلے باب کے ساتھ اضافہ کی گئی ہے، اسی فہرست کو کسی قدر اصلاح اور اضافہ کے بعد علیحدہ کتابی صورت میں چھاپی گئی اور یہی سلسلۃ الملوک کے نام سے مشہور ہوگئی۔

۱۸۵۳ء میں انہوں نے کیمیائے سعادت کا ترجمہ شروع کیا لیکن ترجمہ ناتمام رہ گیا صرف دیباچے اور دو تین فصلوں کا ترجمہ ہوا تھا وہی شائع کر دیا گیا، کتاب کا ترجمہ حاجی امداد علی صاحب کی فرمایش پر شروع ہوا تھا لکھتے ہیں:-

اگرچہ بہت دنوں سے دل چاہتا تھا کہ ایک ایسی کتاب اردو زبان میں لکھی جاوے جس سے نفس کو تہذیب ہو اور اخلاق کو آراستگی، دل کو نرمی اور ایمان کو مضبوطی حاصل ہو لیکن مکروہاتِ زمانہ سے یہ بات لیت ولعل میں پڑی تھی، اتفاقاً ۱۲۷۰ھ ہجری میں حاجی محمد امداد اللہ صاحب دہلی میں تشریف لائے اور انہوں نے کیمیائے سعادت کے ترجمے کے لئے فرمایا، اگرچہ شیطان نے دل میں وسوسہ ڈالا کہ اگر اس قسم کا کام کسی بادشاہ امیر وزیر کی فرمایش سے کیا جاتا تو روپئے ہاتھ لگتے ان درویشوں کی فرمایش سے محنت میں پڑنا کیا فائدہ، اگر اچھے ہیں اپنے لئے ہیں ہم کو کیا مگر پھر خیال آیا کہ بزرگوں کی دعا بھی کافی ہے آؤ ہم ان کے ارشاد کے بموجب ترجمہ میں محنت کریں اور وہ ہمکو دعائیں دیں، الحمدللہ کہ ان کے ارشاد کی برکت نے اس سے بھی بڑھ کر کام کیا کہ جب میں نے اس کتاب کے ترجمے کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے میرے دل سے بدلے کی طمع کو مٹا دیا اور اس محنت کو خالص مخلص اپنے لئے کیا۔"

اِن تصانیف میں سرسیّد کی عبارت تو ضرور سلیس اور آسان ہے لیکن قدامت پسندی کا اثر اب تک اُن کی تحریروں میں نمایاں ہے، خصوصاً دیباچوں اور تمہیدوں میں وہ قدماء کا اتباع کرتے ہیں، ترجمہ کیمیائے سعادت کے دیباچے کو یوں شروع کیا ہے:-

"ابھی تو نے ہم ناچیز اپنے بندوں کو نیست سے ہست کیا اور پھر کن کن نعمتوں اور کیسے کیسے احسانوں سے نوازا، آنکھیں دیں، ناک دی، کان دیئے، زبان دی، ہاتھ دیئے پانوں دیئے سر سے پانوں تک دیکھو تو ذرہ ذرہ اور رواں رواں تیری ہی نعمتیں اور تیرے ہی احسان ہیں پھر اس پر بھی تو نے بس نہ کیا تمام عالم کو اپنے ناچیز بندوں کے لئے پیدا کیا، رات بنائی کہ آرام سے سوتے ہیں دن بنایا کہ اپنے کام سے لگتے ہیں، پھر دنیا میں کیسی کیسی

نعمتیں کھانے اور پینے اور پہننے اور سننے اور دیکھنے کی بنائیں کہ ایک ایک سے اچھی اور نرالی ہے۔"

اصل کتاب کے ترجمے میں بھی عبارت کی یہی روانی موجود ہے مثلاً۔

"اللہ کی درگاہ میں بہت سا شکر آسمان کے تاروں اور مینہ کی بوندوں اور درختوں کے پتوں اور جنگلوں کے ریت اور زمین کے ذروں برابر ہے کہ یکا ہونا اس کی تعریف ہے اور دبدبہ اور بڑائی اور بزرگی اور شان اُسی کا سہاوُ ہے' اس کی بزرگی کو کوئی نہیں جانتا اور اس کے سوا اور کوئی اس کو نہیں پہچانتا" ۵[1]

۱۸۵۲ء تک سرسید ملک کے ادبی حلقوں میں کافی متعارف ہو چکے تھے اور ان کی تحریروں کی بیساختگی نے خود ان کو اپنے معاصرین میں ممتاز سمجھنے کا احساس پیدا کر دیا ہوگا' انہوں نے وقت کی نزاکت کو محسوس کیا اور اس اصول پر کاربند ہونا چاہا جس کو 'زبان کے بیان' کے سلسلہ میں وہ آثار الصنادید میں لکھ چکے تھے یعنی

"اس زمانے میں اور شہر کے لوگوں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ اردو زبان میں یا تو فارسی کے لغت بہت ملا دیتے ہیں اور یا فارسی کی ترکیب پر لکھنے لگتے ہیں' یہ دونوں باتیں اچھی نہیں ان سے اردو پن نہیں رہتا"

چنانچہ اسی سال (یعنی ۱۸۵۴ء) میں انہوں نے آثار الصنادید کو جو اس معیار پر پوری نہیں اترتی تھی دوسرے قالب میں ڈھال دیا اور چند مزید اضافوں کے ساتھ اسے دوبارہ شائع کیا۔

۱۸۵۵ء میں سرسید احمد خاں بجنور میں تعینات تھے' اس زمانہ میں اس ضلع کے بندوبست کا مسئلہ درپیش تھا اور ضلع کی ناپ و پیمایش کا کام جاری تھا' اسی عرصہ میں سرکاری احکامات جاری ہوئے کہ جن اضلاع میں بندوبست کا کام مکمل ہو جائے وہاں کی تاریخ بھی مرتب کی جائے' ان میں سے بعض تاریخیں (Gazetteer of India) میں شامل ہیں' بجنور میں یہ کام سرسید احمد خاں نے اپنے ذمہ لیا اور بڑی محنت اور جانفشانی سے اسے انجام دیا' تکمیل کے بعد کتاب آگرہ کے صدر دفتر دیوانی کو روانہ کی گئی اور ہنوز زیر غور تھی کہ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ شروع ہو گیا اور "آن دفتر را گاؤ خورد و آن گاؤ مرد" کے مصداق ہزارہا انسانوں کی جانوں اور مال کے ساتھ یہ تاریخ بھی تلف ہو گئی جس کا خود سرسید کو بڑا ملال رہا' افسوس تو یہ ہے کہ اُن کے پاس اصل مسودہ بھی نہیں تھا ورنہ ممکن تھا کتاب کو از سر نو لکھ کر شائع کرا دیا جاتا'

۵[1] ترجمہ کیمیائے سعادت مشمولہ تصانیف احمدیہ حصہ اول جلد اول

بجنور ہی کے قیام کے زمانہ میں انہوں نے آئین اکبری کی تصحیح کا اہم اور دشوار کام شروع کیا اور سب سے زیادہ محنت تصاویر اور نقشوں کی فراہمی میں صرف کی، اس تصحیح شدہ آئین کی تیسری اور پہلی جلد باقی رہ گئی ہے جو ۱۲۷۲ھ میں طبع ہو چکی تھی، دوسری جلد کا بھی وہی حشر ہوا جو تاریخ بجنور کا ہوا یعنی وہ بھی ۱۸۵۷ء کے سیلاب کے نذر ہو گئی۔

۱۸۷۳ء میں مسٹر ایچ بلوک (Mr. H. Bloch) نے آئین کا ترجمہ کیا تو سرسید کی تصحیح کردہ آئین سے انہیں بڑی مدد ملی اور جو تصویریں مسٹر بلوک کے ترجمہ میں شامل ہیں سرسید سے ہی منقول ہیں۔

سرسید بجنور میں ہی تھے کہ ۱۸۵۷ء کا طوفان آگیا، اس کی تفصیل انہوں نے خود رسالہ خیر خواہان مسلمان ہند (Loyal Mohammadans of India) میں بیان کی ہے اور اسی سے مولانا حالی نے حیات جاوید میں استفادہ کیا ہے لیکن ان تاریخی واقعات سے بحث کرنا ہمارا موضوع نہیں البتہ اس سنہ یعنی ۱۸۵۷ء تک ہم اُن کی تصنیفی زندگی کا دوسرا دہ سالہ دور ختم کر سکتے ہیں۔

تصنیفی زندگی کا تیسرا دور

۱۸۵۶ء سے ۱۸۶۶ء تک

(تاریخ بجنور کی تصنیف کے بعد سے انسٹیٹیوٹ گزٹ کے اجراء تک)

۱۸۵۷ء کا ہنگامہ جب فرو ہوا اور امن وامان کی صورت نظر آئی تو نئی حکومت نے اصلاح اور درستی کا کام ہاتھ میں لیا۔ بجنور میں جس وفاداری کا اظہار سرسید احمد خاں نے کیا تھا اس کا اعتراف اس صورت سے کیا گیا کہ اُن کو ضلع مرادآباد کا نظم ونسق سپرد ہوا یہی وہ جگہ تھی جہاں مسلمانوں پر سب سے زیادہ نزلہ گرنے والا تھا اور یہی موقع سرسید کے امتحان کا تھا، ایک طرف برطانوی حکومت سے وفاداری کا خیال دامن گیر تھا دوسری سمت اپنے ہموطنوں کے جذبات کا احساس تھا جو نئی حکومت سے تعاون کرنا خلافِ مذہب اور خلاف انسانیت سمجھتے تھے۔

سرسید صاحب قلم تھے اور اس موقع پر سیف کی جگہ قلم سے ہی کام نکالنا چاہتے تھے چنانچہ انہوں نے انگریزوں اور مسلمانوں میں صلح اور سمجھوتہ کے خیال سے متعدد تصانیف پر قلم اُٹھایا اور بڑی حد تک کامیاب رہے چنانچہ تیسرے دہ سالہ تصنیفی دور میں اسی موضوع پر کتابیں ملتی ہیں تاریخ سرکشی بجنور (۱۸۵۸ء) رسالہ درباب تعلیم (۱۸۵۹ء) اسباب بغاوت ہند (۱۸۵۹ء) رسالہ خیرخواہان مسلمانان ہند (Loyal Mohamadans of India ۱۸۶۰ء)، رسالہ تحقیق لفظ نصاریٰ (۱۸۶۰ء) تبئین الکلام فی التفسیر التوراۃ والانجیل علی ملتہ اسلام (۱۸۶۲ء) میں یہی خصوصیت سب سے نمایاں ہے ان میں رسالہ اسباب بغاوت ہندوستان، رسالہ خیرخواہان مسلمانان ہند رسالہ تحقیق لفظ نصاریٰ اور تبئین الکلام زیادہ اہم ہیں۔

رسالہ اسباب بغاوت ہندوستان جو ۱۸۵۸ء میں تصنیف ہوا بعض اعتبار سے بہت اہم ہے، ہونے کو تو یہ ایک مختصر سا رسالہ ۶۶ صفحات کا ہے لیکن اس میں سرسید نے استدلال کا وہ اعلیٰ نمونہ پیش کیا ہے کہ اس سے بہتر مثال ملنی ممکن نہیں، تمہید میں ۱۸۵۷ء کے روح فرسا ہنگامے پر افسوس کرتے ہوئے لکھا ہے کہ دل چاہتا تھا کہ ان امور کو اب دل سے فراموش کردوں لیکن چونکہ کسی ہندوستانی نے اب تک اسباب بغاوت کے نہیں لکھے لہٰذا

یہ مناسب ہے کہ کسی ایسے شخص کی بھی ایک رائے شامل رہے، اس کی ابتداء یوں کی ہے: ۔

"مضمون"

'کیا سبب ہوا ہندوستان کی سرکشی کا'

'جواب'

جواب سے پہلے انہوں نے سرکشی کے مفہوم کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کی متعدد مثالیں پیش کی ہیں اور بتایا ہے کہ سرکشی کا ارادہ کیوں دل میں آتا ہے، اُن کے نزدیک ۱۸۵۷ء کی سرکشی کسی ایک بنا پر نہیں ہوئی بلکہ بہت سی باتوں کا مجموعہ تھی، اس کے بعد بعض اسباب سے بحث کی ہے۔

(۱) چپاتی بٹنا کوئی سازش کی بات نہیں (۲) روس اور ایران کی سازش کا گمان بے بنیاد ہے (۳) اشتہار جو ایران کے شہزادہ کے خیمہ میں نکلا اُس کا کوئی لفظ ہندوستان کی سازش پر دلالت نہیں کرتا وغیرہ ——

. . . .

اُن کے نزدیک بغاوت کا اصلی سبب ہندوستانیوں کا لیجسلیٹو کونسل میں شرکت نہ کرنا تھا، اسی نے بہت سی غلط فہمیاں پیدا کردیں اور ہندوستانیوں کو انگریزوں اور اُن کے نئے قوانین سے بدگمان کر دیا خصوصاً اس وجہ سے کہ انگریز ہندوستانیوں کے عادات اطوار سے واقف نہ تھے نہ اُن کو دیسی باشندوں سے کوئی ہمدردی اور لگاؤ تھا بعض لوگ ہندو اور مسلمان دونوں یہ سمجھتے تھے کہ انگریز مذہب میں مداخلت کے درپئے ہیں، اس غلط فہمی کی ذمہ دار پادری ایڈمنڈ کی وہ چٹھی تھی جو اس نے تمام سرکاری ملازمین کو قبول عیسائیت کی دعوت کے لئے بھیجی تھی۔

اس رسالہ میں سرسید کے جذبات اور الفاظ جو انہوں نے دلّی کے آخری تاجدار کی شان میں ادا کئے ہیں ہرگز شایانِ شان نہیں لکھتے ہیں: ۔

"دلّی کے معزول بادشاہ کا یہ حال تھا کہ اگر اس سے کہا جاتا کہ پرستان میں جنوں کا بادشاہ آپ کا تابعدار ہے تو وہ اس کو سچ سمجھتا اور ایک چھوڑ دس فرمان لکھدیتا، دلّی کا معزول بادشاہ کہا کرتا تھا کہ میں مکھی اور مچھر بنکر اُڑجاتا ہوں [illegible] ملکوں کی خبر لے آتا ہوں [illegible] بات کو وہ اپنے خیال میں سچ سمجھتا تھا [illegible]

تصدیق چاہتا تھا اور سب تصدیق کرتے تھے، ایسے مالیخولیا والے آدمی نے کسی کے کہنے سے کوئی فرمان لکھ دیا ہو تو کوئی تعجب نہیں" ۵۱

اسی طرح ایک اور مقام پر لکھتے ہیں :—

"دلی کے معزول بادشاہ کی سلطنت کا کوئی بھی آرزومند نہ تھا اس خاندان کی لغو اور بیہودہ حرکات نے سب کی آنکھوں میں اس کی قدر اور منزلت گرادی تھی .... خاص دلی کے اور اس کے قرب وجوار کے رہنے والے بادشاہ کی کچھ بھی وقعت خیال میں نہ لاتے تھے"

یا

"دلی کے معزول بادشاہ کو کوئی شخص ولی اور مقدس نہیں سمجھتا تھا۔

یہ سب باتیں اُس شخص کی نسبت تحریر کی گئی ہیں جس کے عطا کردہ موروثی خطاب جواد الدولہ اور ذاتی خطاب عارف جنگ کو سرسید نے آخر عمر تک خود فخریہ استعمال کیا ہے، حیرت ہے کہ اس قدر لغو اور بے سروپا باتیں ان کے ذمہ دار قلم سے کیسی نکل گئیں۔ ایسی ہی بیانات نے ان کو قوم کے ایک طبقہ سے ٹائم سرور یعنی ابن الوقت کا خطاب دلوایا۔

بہرحال سرسید کا یہ احسان ضرور ہے کہ انہوں نے اس رسالے کی تصنیف سے انگریزوں کو جو ۱۸۵۷ء کی سازش کی تمام تر ذمہ داری مسلمانوں کے سر ڈالتے تھے ایک گونہ مطمئن کر دیا، انگریزوں کو گمان تھا کہ مسلمان جو ہندوستان میں تقریباً آٹھ سو سال حکومت کر چکے تھے اپنا اقبال اس طرح لٹتے نہ دیکھ سکتے تھے اور یہ ہنگامہ جسے وہ غدر سے تعبیر کرتے ہیں انگریزوں کی حکومت کو اُلٹ دینے کے ارادہ سے تھا اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ہزاروں مسلمان بدامنی کے زمانے میں مارے گئے، اور لاکھوں امن قائم ہونے پر پھانسی پر لٹکائے گئے پھر بھی انگریزوں کے غم اور غصہ کی حرارت میں کوئی کمی نہ تھی، سرسید نے اس رسالہ کی متعدد کاپیاں ولایت بھجوائیں اور اس کا ترجمہ پارلیمنٹ کے سامنے پیش کیا گیا، بہت سے انگریزوں نے جو انتہا پسند واقع ہوئے تھے سرسید کے ان خیالات کو باغیانہ قرار دیا اور اُن کو سزا کے لائق سمجھا لیکن رفتہ رفتہ اُن کے رسالوں نے انگریزوں کو مسلمانوں کی بے گناہی کا یقین دلا دیا۔

---

۵۱ رسالہ اسباب بغاوت ہندوستان مطبوعہ مطبع مفید عام آگرہ ۱۹۰۳ء

"اسباب بغاوت ہندوستان" کی تصنیف کے دوسرے ہی سال یعنی ۱۸۶۰ء میں سرسید نے مسلمانوں کی وفاداری کا مزید ثبوت پیش کرنے کے لئے ایک تذکرہ اُن مسلمانوں کا لکھنا شروع کیا جنھوں نے ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کی اعانت کی تھی جس کا اعتراف خود اُن لوگوں نے کیا ہے لیکن بعض وجوہ سے خصوصاً روپئے کی کمی کے خیال سے انھوں نے اس کتاب کو بالاقساط رسالوں کی صورت میں رسالہ خیرخواہان مسلمانان ہند یعنی Loyal Mohammadans of India کے نام سے شائع کرنا شروع کیا، ہر صفحے کے دو حصے تھے ایک میں انگریزی عبارت تھی اور دوسرا اُردو میں تھا، اس کے صرف تین نمبر چھپ کر رہ گئے جن میں پہلے رسالے میں ۸۲ صفحات ہیں دوسرے کی ضخامت ۱۰۰ صفحات ہے اور تیسرے رسالہ میں ۹۱ صفحات شامل ہیں، اس طرح کل تذکرہ ۲۷۳ صفحات پر مشتمل ہے، پہلے دونوں رسالے ۱۸۶۰ء کی تصنیف ہیں اور تیسرا ۱۸۶۱ء میں مرتب ہوا، اس کی ابتدا سرسید نے یوں کی ہے:۔

"سچ ہے انقلاب زمانہ ایک ایسا برا حادثہ ہے کہ آدمی کو نہایت زبون اور درماندہ کر دیتا ہے، ایسے وقت میں انسان کا فضل و کمال، عقل و ہنر علم و عمل کچھ کام نہیں آتا، یہی حادثہ ہے جس سے انسان کا یا پلٹ ہو جاتا ہے، کوئی کام اس کا اعتبار کے قابل نہیں رہتا، کسی شخص کو اُس کی قدر و منزلت کا خیال نہیں ہوتا، جو کام انسان سے برا سرزد ہوتا ہے وہ درحقیقت برا ہے مگر اس کمبخت وقت کا مقتضا یہ ہوتا ہے کہ اُس کا اچھا کام بھی برائی اور ظاہرداری پر محمول ہوتا ہے ہر ایک قوم میں اچھے برے سب قسم کے آدمی ہوتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔" [۱]

اس کے بعد انھوں نے لکھا ہے کہ مسلمان من حیث القوم اس ہنگامے میں شریک نہ تھے اور نہ ہی تمام باتیں جو اس عرصہ میں ظہور میں آئیں اُن کے مذہب کے مطابق تھیں جو لوگ شریک ہوئے وہ انفرادی اور غیر ذمہ دارانہ حیثیت سے شامل ہوئے جس کی ذمہ داری تمام قوم پر عائد نہیں کی جا سکتی، چنانچہ مسلمانوں میں ہی ایسی مثالیں بکثرت موجود ہیں کہ لوگوں نے اپنی جان اور مال کو خطرہ میں ڈال کر انگریزوں کو پناہ دی اور دشمنوں کا مقابلہ کیا، سب سے پہلے سرسیّد نے خود اپنی مثال پیش کی ہے اور پھر دوسرے مسلمانوں کا تذکرہ کیا ہے جن کو بعد فرو ہونے اس ہنگامہ کے سرکار سے پروانے جاگیریں، انعامات معافیاں اور سارٹیفکٹ عنایت ہوگئے۔

---

[۱] رسالہ خیرخواہان مسلمانان ہند حصہ اوّل مطبوعہ میرٹھ ۱۸۶۰ء صفحہ ۱

اس رسالہ کو انگریزی میں لکھنے کا مقصد یہ تھا کہ انگریزوں تک اس کی رسائی ہو سکے اور وہ اپنی غلط فہمی اور شک کو دور کر سکیں اور اس طرح مسلمان بلا وجہ عتاب اور سزا سے محفوظ رہیں۔

سرسید کا خیال تھا کہ مکمل تذکرہ یہ پنج رسالوں میں ختم ہو جائے گا لیکن بعض وجوہ سے وہ صرف تین ہی رسالے نکال سکے۔

اس تیسرے دور کی سب سے اہم اور اُن کی زندگی کا بڑا کارنامہ تبئین الکلام فی تفسیر التوراۃ والانجیل علی ملۃ اسلام ہے جو عہد عتیق (Old Testament) اور عہد جدید (New Testament) کی تفسیر اسلامی نقطۂ نظر سے پیش کرتی ہے۔

۱۸۵۷ء کے ہنگامہ نے ایک بڑی غلط فہمی (بقول سرسید "غلط فہمی") یہ پیدا کر دی تھی کہ انگریزوں سے جنگ کرنا مسلمانوں کا مذہبی فرض ہے، یہ جنگ جہاد ہے اور جہاد فی سبیل اللہ مسلمان کا پہلا اور آخری فرض ہے۔ اس غلط فہمی نے اسلام اور عیسائیت کو ایک دوسرے کا ضد اور مخالف قرار دیدیا تھا اس غلطی کا ازالہ ان کے نزدیک نہایت ضروری اور مستحسن تھا۔

کتاب کی تصنیف کے وقت اُن کے پیش نظر یہ تھا کہ مختلف کتب آسمانی کا بالتقابل مطالعہ کیا جائے اور ان واقعات کو یکجا کیا جائے جن کے بیان میں سب مشترک ہیں، ایسے امور جو اختلافی ہیں اُن کی وجہ اختلاف پر بحث کی جائے اس صورت سے وہ مغائرت جو کتب آسمانی میں ایک دوسرے سے پیدا ہو گئی ہے دور ہو جائے گی۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ عبرانی کی بھی تحصیل کی جائے کیونکہ توراۃ کا مطالعہ بغیر اس کے ممکن نہ تھا چنانچہ غازی پور کے قیام کے دوران میں جہاں وہ ۱۸۶۲ء میں تبدیل ہو کر گئے تھے انہوں نے ایک عیسائی پادری کو ملازم رکھ کر باقاعدہ عبرانی پڑھی اور اس سے فرصت پا کر اس اہم تصنیف کی ابتدا کی، اپنے مفہوم اور تصنیف کے مقصد کو اُنہوں نے کلام پاک کی اس آیت سے ظاہر کیا ہے جو سرورق پر تحریر ہے:۔

"آمنا باللہ وما انزل علینا وما انزل علی ابراہیم واسمٰعیل واسحٰق ویعقوب والاسباط وما اوتی موسیٰ وعیسیٰ والنبیون من ربھم لا نفرق بین احد منھم ونحن لہ مسلمون ۝

تفسیر کے دو حصے ہیں، حصہ اول میں دس[۱] مقدمات اور دو[۲] ستے شامل ہیں اور کل ضخامت ۷۵۴ صفحات ہیں

پہلا مقدمہ = انسان کی نجات کو نبیوں کا آنا ضروری ہے

دوسرا مقدمہ = وحی اور کلام الٰہی کیا ہے۔

تیسرا مقدمہ = توریت اور صحف انبیاء اور زبور اور انجیل جن کا نام قرآن مجید میں آیا ہے وہ کونسی کتابیں ہیں۔

چوتھا مقدمہ = توریت اور زبور اور صحف انبیاء اور انجیل پر مسلمانوں کا کیا اعتقاد ہے

پانچواں مقدمہ = یہ کتنی کتابیں تھیں، سب بائیبل میں شامل ہیں۔

چھٹا مقدمہ = اس بات کے معلوم کرنے کا کہ ان کتابوں میں سے کون سی کتابیں معتبر ہیں مسلمانوں کے مذہب میں کیا قاعدہ ہے۔

ساتواں مقدمہ = مسلمانوں کے مذہب میں کتب مقدسہ کی تحریف کا کیا مسئلہ ہے

آٹھواں مقدمہ = کیا یہ کتابیں بالکل ان اصلی نسخوں کے مطابق ہیں جن کو الہامی لکھنے والوں نے لکھا تھا۔

نواں مقدمہ = ان کتابوں کے ترجموں کی نسبت مسلمانوں کا کیا اعتقاد ہے

دسواں مقدمہ = مسلمانوں کے مذہب میں ناسخ و منسوخ کیا ہے۔

پہلا تتمہ = بائیبل کی تاریخانہ واقعات کے بیان میں۔

دوسرا تتمہ = ہجری اور عیسوی سنوں کی مطابقت میں۔

پہلا مقدمہ جس کا عنوان "انسان کی نجات کو نبیوں کا آنا ضروری ہے صرف اردو میں قلمبند ہے باقی کتاب اردو اور انگریزی دونوں میں تصنیف ہوئی کیونکہ اس کا مقصد اردو داں اور انگریزی داں دونوں طبقوں تک پہنچانا تھا، پہلے مقدمے میں سرسید نے خدا کے تصور اور وجود کے متعلق عام مسلمانوں کے عقیدے کو پیش کیا ہے اور یہ کہ انبیاء اور مرسلین کے متعلق اُن کا کیا ایمان ہے، معاد و محشر، جنت و دوزخ، حور و فرشتے کے متعلق انہوں نے اپنے معتقدات کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے:۔

"جن الفاظوں سے کہ دوزخ وبہشت کے عذاب و تنعم کا بیان ہوا ہے وہ صرف بطور مثال کے ہے ورنہ وہاں کے تنعم اور عذاب سے اور دنیا کے تنعم اور عذاب سے بجز ایک سا نام ہونے کے اور کچھ مناسبت نہیں ہے، اصلی اور اعلیٰ نعمت بہشت کی دیدار الٰہی ہے کہ ایمان والے اس ذات پاک کو جس پر بن دیکھے ایمان لائے تھے بغیر کسی

پردہ کے اور بغیر کسی صورت کے اور بغیر کسی جہت کے علانیہ دیکھیں گے،

کتب آسمانی کے بیان میں مسلمانوں کا عقیدہ چوتھے مقدمے میں مذکور ہے :۔

"اب سمجھنا چاہیے کہ ہم مسلمان دل سے اس بات پر یقین کرتے ہیں کہ توریت اور زبور اور جمیع انبیاء کے صحیفے اور انجیل سب سچ اور برحق ہیں اور خدا کی طرف سے اتری ہیں اور سب سے آخیر جو کلام الٰہی نازل ہوا وہ قرآن مجید ہے اور بے شک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اترا ہے، قرآن مجید ہی سے ہم کو اس بات کی دلی تصدیق ہے کہ توریت اور زبور اور انجیل اور صحف انبیاء برحق اور خدا کی طرف سے اتری ہوئی ہیں چنانچہ قرآن مجید کی ان آیتوں سے جو آگے آتی ہیں یہ مطلب ثابت ہے" ؎۱

دوسری جلد میں جس کی ضخامت تقریباً ۲۶۸ صفحات ہے اصل تفسیر اور اس کی مطابقت کلام پاک اور احادیث سے شامل ہے، ابتدا یوں کی ہے :"

توریت مقدس

سورہ براشیث وسورہ نوح

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتابوں میں سے پہلی کتاب

مسمیٰ بہ کتاب پیدائش

باب پہلا لغایت گیارہ

سب سے پہلے سرسید نے توریت کو کلام الٰہی ان الفاظ میں لکھا ہے :۔

"ہم مسلمانوں کے مذہب کے بموجب یہ بات ناقابل شبہ کے ہے کہ یہ کتاب از روئے الہام لکھی ہے کیونکہ اس میں دنیا کے پیدا ہونے کے ایسے حالات لکھے گئے ہیں جن کا بغیر الہام کے لکھا جانا ممکن نہیں ہے اور بہت سے قصص اگلے زمانوں کے جو قرآن مجید میں خدا تعالیٰ نے فرمائے ہیں اور جن میں مسلمان ذرا بھی شبہ نہیں رکھتے وہ اس کتاب میں پائے جاتے ہیں" ؎۲

؎۱ تبیین الکلام حصہ اوّل مطبوعہ ذاتی مطبع مصنف غازی پور ۱۸۶۲ء

؎۲ تبیین الکلام حصہ دوم مطبوعہ علی گڑھ ۱۸۶۵ء

۲۶ صفحوں کے دیباچے کے بعد انہوں نے اصل تفسیر شروع کی ہے اور بڑی خوبی سے مشترک واقعات کو توریت اور کلام پاک سے نکال کر یکجا کیا ہے جسے بخوف طوالت نظر انداز کیا جاتا ہے۔

تبئین الکلام کے مطالعہ سے سرسید کے ذوق اور محنت کی داد دینا پڑتی ہے عبرانی الفاظ کی تحقیق اور اُن کے بحث و مباحثہ میں سرسید نے بڑے علم و فضل کا اظہار کیا ہے' اس سے ان کی وسعت نظر اور بے پناہ معلومات کا اندازہ ہوتا ہے' قوت استدلال جو اُن کی طرز تحریر کا طرہ امتیاز ہے اور سوائے ان کی تحریروں کے اُردو میں اس کے نمونے (باستثنائے شبلی) اور کہیں نہیں ملتے موجود ہے عبارت منطقی اور سلجھی ہوئی بیحد رواں اور سلیس ہے' عبرانی کا ترجمہ ضرور لفظ بہ لفظ ترجمہ ہونے کی وجہ سے غیر فطری اور اُلجھا ہوا معلوم ہوتا ہے لیکن اس کا سبب یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اصل عبارت کو بجنسہ اردو میں منتقل کرنا چاہتے تھے۔

مذکورالصدر تصانیف کے علاوہ تصحیح تاریخ فیروز شاہی (۱۸۶۲ء) اور فوائدالافکار فی اعمال الفرجار کا ترجمہ بھی اسی تیسرے دور سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ان کی کوئی خاص اہمیت نہیں فوائدالافکار اُن کے نانا نواب فریدالدولہ کی تصنیف فارسی زبان میں تھا جس کا انہوں نے اردو ترجمہ کر دیا' تصحیح شدہ فیروز شاہی کو بنگال ایشیائٹک سوسائٹی نے طبع کرادیا۔

ان سب کے علاوہ سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ کا قیام انگریزی کتب کے ترجمے اور انسٹیٹوٹ گزٹ کا اجراء (۱۸۶۶ء) بھی اُن کی ادبی زندگی میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

غازی پور میں ہی سرسید نے سائنٹفک سوسائٹی کے نام سے ایک انجمن کی ابتدا کر دی تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ سائنس کے مختلف مباحث پر اردو میں کتابیں تصنیف اور ترجمہ کی جائیں ۱۸۶۴ء میں جب کہ ان کا تبادلہ علی گڑھ کو ہوا تو سوسائٹی بھی منتقل ہو کر علی گڑھ آگئی' علی گڑھ کی عظمت جس پر ہندوستان ہی کیا دنیا کے مسلمان ناز اور بجا طور پر ناز کرتے ہیں اس کی ابتداء اسی مبارک فعل سے ہوئی' سائنٹفک سوسائٹی ایک علمی اور ادبی مجلس تھی جس میں ہندو اور مسلمان' انگریز اور ہندوستانی ایک دوسرے کے رفیق بن کر ہندوستانی زبان اور ادب کے سرمایہ میں گرانبہا اضافہ کر رہے تھے' وہ وقت بھی کیسا مبارک ہوگا جب سوسائٹی کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا گیا ہوگا' کیسے مبارک ہونگے وہ لوگ جو تنگ نظری اور خود غرضی کو بھول کر ملکی ادب اور ملکی زبان کے لئے

اپنی دولت اپنے دماغ اور اپنی محنت صرف کر رہے ہونگے لیکن رونا ہے تو اپنے اوپر کہ آج علی گڑھ میں سب کچھ ہے مگر جو کام اُن بزرگوں نے شروع کیا تھا اس پر کسی کی نظر اور توجہ نہیں، سرسید، حالی، شبلی، ذکا ءاللہ، نذیر احمد سب کی نظریں آج بار بار علی گڑھ کی طرف اٹھتی ہیں کہ اپنے جانشینوں کو دیکھیں اور دیکھ کر شاد ہوں لیکن حسرت اور مایوسی سے دوچار ہو کر واپس ہوتی ہیں جو کام علی گڑھ سے شروع ہوا اور جس کو آج دوسرے تکمیل کی منزل پر پہنچانے کا فخر حاصل کر رہے ہیں اُس کا ہمیں احساس بھی نہیں، خود سرسید نے اس وقت اس کا رونا رویا تھا لکھتے ہیں:-

"صرف اس بات کی کمی ہے کہ وہ سامان ہمارے پاس موجود نہیں ہے جس سے ہماری معلومات زیادہ ہوں اور ہمارے خیالات کو وسعت ہو، جو مضمون لکھنا چاہیں اُن کے ماخذ اور اُن کے حالات اور جو بحثیں اوپر ہو چکی ہیں اور جو امور اُن کی نسبت متحقق ہو چکے ہیں اُن سے آگاہی ہو اور یہی سبب ہے کہ بعض دفعہ ہماری قوم کے ارٹیکلوں میں غلطی ہو جاتی ہے اور جن امور کا تصفیہ ہو چکا ہے انہیں کو پھر کہے جاتے ہیں، یہ نقص اسی وقت رفع ہو گا جب کہ انواع و اقسام علوم و فنون کی کتابیں ہماری زبان میں موجود ہو جاویں گی اور ہماری قوم کو عموماً اُن پر دسترس ہوگی، سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ نے اس کام کے پورا کرنے کا ارادہ کیا تھا مگر افسوس ہے کہ قوم کو اس طرف توجہ نہیں ہے اور اسی سبب سے اُس کا کام ادھورا پڑا ہے۔ [۵۱]

سرسید کو بذاتِ خود جس قدر دلچسپی سوسائٹی سے تھی اس سے زیادہ اور کسی شغل سے نہیں تھی، انہوں نے اپنا ذاتی مطبع جو غازی پور میں تبئین الکلام کی طباعت کے سلسلہ میں قائم کیا تھا سوسائٹی کی نذر کر دیا اور ہر ممکن ذریعہ سے چندہ فراہم کرنے کی کوشش کی، سوسائٹی کا انہیں اس قدر خیال تھا کہ ولایت کے سفر کے دوران میں جہاز پر سے نواب محسن الملک مرحوم کے نام ایک خط لکھا ہے، اُس میں لکھتے ہیں:-

"جناب مخدومی مکرمی سلامت

بعد سلام مسنون التماس این کہ جس رنج اور محبت سے آپ نے مجھ کو اور میں نے آپ کو رخصت کیا ہمارا آپ کا دل جانتا ہے، اب خدا سے دعا ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ مع الخیر والعافیت پھر ہم سب تم سب سے ملیں گے،

---

[۵۱] تہذیب الاخلاق ۱۲۹۱ھ کا آخری پرچہ مضمون سرسید احمد خاں

میرا مفصل حال اخبار سوسائٹی سے معلوم ہوگا، میں بفضل الہٰی مع الخیر قریب عدن پہنچا ہوں، چند گھنٹے قبل عدن کے پہنچنے کے ہند کی ڈاک لے لی جاتی ہے، اس سبب سے یہ خط ڈاک میں ڈالدیا، چند گھنٹے بعد عدن پہنچے گی، انشاءاللہ تعالےٰ، مجھ کو علاوہ مفارقت احباب کے یہ رنج بڑا ہے کہ میرے پیچھے لوگ عقل کے دشمن سائنٹفک سوسائٹی کو باقی نہ رکھیں گے، بس میں چاہتا ہوں کہ آپ سوسائٹی کی طرف زیادہ متوجہ ہوں اور اس کو سنبھالنے اور ممبروں کی تعداد بڑھانے میں زیادہ کوشش فرماویں، مرزاپور کے لوگوں نے اگرچندہ نہیں دیا تو اُن کو ممبر بنائے، بہرحال سوسائٹی کے معاملہ میں حد سے زیادہ خیال و کوشش فرمائیں، بخدمت حافظ جی صاحب سلام

زیادہ بجز یار شما یاد شما یا د شما چہ نویسم

والسلام

خاکسار سیّد احمد ۵؎

سائنٹفک سوسائٹی کے باقاعدہ افتتاح کی رسم ۱۴ فروری ۱۸۶۶ء کو ادا کی گئی، اس موقع کی روئداد اس قابل ہے کہ اس کو پیش کیا جائے:۔

مقام علی گڑھ ۱۴ فروری ۱۸۶۶ء

آج کی تاریخ کھلنا انسٹیٹیوٹ سائنٹفک سوسائٹی کا جناب ایف ولیمس صاحب بہادر کمشنر قسمت میرٹھ کے ہاتھ سے قرار پایا اور ایک جم غفیر رئیسوں اور شریفوں اضلاع علی گڑھ اور آگرہ اور بلند شہر کا اس رسم کے رچانے کو مکان نو تعمیر کے آس پاس جمع ہوا گیارہ بجے جناب صاحب کمشنر بہادر معہ جناب براملی صاحب بہادر جج اور جناب پرنسپ صاحب بہادر کلکٹر کے تشریف لائے اور خدا تعالےٰ سے دعا مانگ کر ایک دروازہ کھول کر مکان کے اندر داخل ہوئے اور سب اُن کے پیچھے پیچھے گئے، اور کرسیوں پر بیٹھے، بعد اس کے صاحب کمشنر بہادر کرسی پر سے اُٹھے اور یہ گفتگو کی ۔

مجھ کو سائنٹیفک سوسائٹی کے ممبروں کی مہربانی سے اس مجمع میں شریک ہونے کی بڑی خوشی حاصل ہوئی، اس بڑے کام کی نسبت جس کو ہمارے دوست سیّد احمد خاں نے خوش نصیبی سے انجام کو پہنچایا میں چار لفظ

۵؎ خطوط سر سید مرتبہ نواب سر سید راس مسعود مرحوم خط بنام محسن الملک ۔

کہنا چاہتا ہوں اب سب صاحب متوجہ ہو کر سنیں سرسید احمد خاں کے اس کام کی عظمت میں مبالغہ کرنا فضول ہے تم سب صاحبوں کو معلوم ہے کہ یہ اُن ہی کا کام ہے اور وہی اس جلسے کے بڑے ترقی دینے والے ہیں سائنٹفک سوسائٹی کے اس مکان کی اس عمدہ عمارت کے جس کے کھولنے کے لئے ہم سب جمع ہوئے ہیں وہی بڑے صانع ہیں، عمارت کی تعریف کرنے کی کچھ حاجت نہیں تم سب صاحب خود دیکھ رہے ہو کہ یہ ایسی عمدہ عمارت ہے جو ہندوستان کے اور مقاموں میں بھی اس کام کے واسطے ایسے تھوڑے ذریعوں سے جیسے یہاں تھے شاید اس سے بہتر نہ بن سکے، وسیلوں کو قلیل بتانے سے میری غرض یہ ہے کہ نہ تو گورنمنٹ سے سوائے عطائے زمین کے کوئی مدد ملی نہ کسی میونسپل فنڈ سے کچھ حاصل ہوا اور نہ کسی لکھ پتی آدمی نے کچھ استعانت کی مگر تم سب صاحبوں کی فیاضی کی بدولت اس کام کے ذریعوں کو بہت بڑا کہنا چاہئے چنانچہ بعضے شریفوں نے مثل عنایت اللہ خاں رئیس بھیکم پور اور راجہ ٹیکم سنگھ وغیرہ نے جن کی تفصیل بیان کرنے کی مجھے ضرورت نہیں بڑی مدد دی ہے، میں نہایت خوشی سے یہ بات کہتا ہوں کہ یہ ذریعے ایک حساب سے بہت ہی بڑے اور تعریف کے لائق ہوئے یعنی تم سب صاحبوں نے صرف ایک عمدہ عمارت کے تعمیر کرنے اور ایک عمدہ جلسے کے قائم کرنے ہی میں استعانت نہیں کی بلکہ تم نے ایک بہت عمدہ مثال اس بات کی قائم کی ہے کہ جب تم ایک اچھے کام کے انجام دینے پر صرف اپنی ہی ذات پر بھروسہ کر کے کمر ہمت باندھو تو تم کیا کیا کچھ نہیں کر سکتے ہو، اس بات سے میں یہ نتیجہ نکال سکتا ہوں کہ بھلائی کے کاموں میں خدا تعالےٰ اپنے فضل و کرم سے تم کو کامیاب کرے گا، مجھ کو خوب یقین ہے کہ تمہارے اس بڑے کام کا نتیجہ لوگوں کے حق میں نہایت بہتر ہو گا، اس مکان میں سب آ سکتے ہیں اور علمی عجائبات دیکھ سکتے ہیں اور علم حاصل کر سکتے ہیں اور اُس کا تجربہ کر سکتے ہیں، توقع یہ ہے کہ بعد تجربہ کے جو کچھ نہایت عمدہ ٹھیرے اس کو بہت لوگ اختیار کریں جس کا نتیجہ یہ ہو کہ علم کثرت سے پھیلے اور کاشتکاری اور ہر ایسی شے کی جس سے لوگوں کو فائدہ پہنچتا ہے ازبس ترقی ہو،

اخیر کلام میرا یہ ہے کہ سید احمد خاں نے جو کچھ محبت لوگوں کے ساتھ ظاہر کی ہے سب کے دلوں پر اس کا اثر ضرور ہو گا، خدا کرے کہ یہ انسٹیٹیوٹ اس بات کا سبب ہووے کہ ہم سب ہندوستانی اور انگریز ایسے بھلے کاموں میں دل سے شریک ہوا کریں اور یہی بات سید احمد خاں کی بڑی خواہش ہے، پس آؤ ہم سب اُن کی

مدد کریں اور اُن کا شکر بھی ادا کریں اے خدا اس انسیٹیوٹ کو سرسبز کر" ۵؎

بعد اس کے سید احمد خاں بانی سوسائٹی کے چھوٹے صاحبزادے سید محمد محمود نے انگریزی زبان میں جلسہ سے اس طرح گفتگو کی :-

"اے صاحبو خدا کا شکر ہے کہ یہ عمدہ عمارت جو تمہارے ذریعے سے اس سوسائٹی کے لئے تعمیر ہوئی اب انجام کو پہنچی، تھوڑے ہی دن ہوئے کہ اس عمارت کی بنیاد کا پہلا پتھر جناب نواب لفٹننٹ گورنر بہادر شمال مغربی اضلاع نے جواب ہماری سوسائٹی کے وائس پیٹرن ہیں چٹیل میدان میں جہاں اب تم یہ بڑی عمارت دیکھتے ہو رکھا تھا، اب ہم یہاں جمع ہوئے اور اس عمارت کو جناب ولیمس صاحب بہادر کے ہاتھوں سے کھلتے ہوئے دیکھا، اگرچہ ہماری سوسائٹی کا مقام اس ضلع میں صرف ایک ہی برس سے ہے مگر اس میں کچھ شک نہیں کہ اس عرصہ میں تم سب صاحبوں کو اس سے کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور ہوا ہوگا لیکن جو کچھ فائدے اب تک حاصل ہوئے ہیں وہ اُن فائدوں کی بہ نسبت کچھ بھی نہیں ہیں جو ان لکچروں میں آنے سے جو اس مکان میں مختلف مضمونوں پر دیئے جاویں گے اور ایسی ایسی کلوں مثل گاس کی کل اور بجلی کی کل وغیرہ کے بخوبی دیکھنے اور اُن کے تجربہ کرنے سے ہوں گے، اس عمارت سے کھلنے سے تم سب صاحبوں کو یاد آتا ہوگا اور تمام ضلع میں مدت تک یاد رہے گا جناب برا ملی صاحب بہادر جج کے صدر انجمن ہونے کے وقت میں یہ مکان تعمیر ہوا ہے۔

آج کی خوشی میں ایک بڑی کمی یہ ہے کہ سوسائٹی کی دل سے بھلائی چاہنے والے آنریری سکریٹری لفٹینٹ گریہم صاحب بہادر تشریف نہیں رکھتے، مجھ کو یقین ہے کہ اُن کو اس جلسہ میں تشریک نہ ہونے کا بہت افسوس ہوگا، خدا تعالےٰ اس عمارت کو مدت تک قائم رکھے اور اس ضلع کے لوگوں کو اُس سے فائدہ پہنچاوے"

بعد اس کے سیّد احمد خاں نے تمام حاضرین جلسہ کا کیا ممبر اور کیا غیر ممبر خصوصاً اُن لوگوں کا جو آگرہ سے تشریف لائے تھے بہت شکریہ ادا کیا اور بیان کیا کہ جس طرح میں جیتے جی تم صاحبوں کو اس نو تعمیر انسٹیٹیوٹ میں جمع اور سوسائٹی کے کاروبار میں سرگرم دیکھ کر خوش ہوتا ہوں اس سے بہت زیادہ خوش ہوتا اگر مجھ کو یہ یقین ہوجاتا کہ میرے بعد بھی تم ایسے ہی گرم جوشی سے اُس کے کاروبار میں سرگرم رہوگے اور جو گلبن آرزو خدا کے

۵؎ کمشنر کی تقریر انگریزی میں تھی جس کا ترجمہ روئداد کے لئے سرسید نے کیا ہے۔

فضل اور کرم کی آبیاری سے اب تک ایسا سرسبز ہوا اور پھولا پھلا ہے آئندہ زمانوں تک باقی رکھوگے اور ترقی دوگے مگر اس بات سے انجام کا دیکھنا تم پر اور تمہاری اولاد پر موقوف ہے، میں دل سے دعا دیتا ہوں کہ خدا تعالےٰ تمہارے دل کو اور تمہارے فہم کو ایسا روشن کرے کہ تم ہمیشہ اس سوسائٹی کی ترقی اور اپنے ملک کی بھلائی میں کوشش کرتے رہو۔

بعد اس کے تمام مجمع کے اتفاق سے یہ بات تجویز ہوئی کہ سکریٹری سوسائٹی جناب ہز گریس ڈیوک آف آرگائل پیٹرن سوسائٹی اور جناب لفٹننٹ اے ڈرمنڈ صاحب بہادر وائس پیٹرن سوسائٹی کی خدمات عالی میں خاص چٹھیاں اطلاعی بھیجے کہ انسٹیٹیوٹ سوسائٹی کا بڑی خوش اسلوبی سے آج کی تاریخ کھُل گیا"۔ ؎۱

یہ تھا وہ مبارک دن اور نیک ساعت جب سرسیّد نے ملک کی ترقی اور قوم کی بھلائی کی طرف پہلا مستقل قدم اُٹھایا، اُنھوں نے انگریزوں اور ہندوستانیوں، ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک نیک کام میں ایک دوسرے کے دوش بدوش لاکر کھڑا کردیا، سائنٹفک سوسائٹی کی ایک مطبوعہ فہرست ممبران میں جن کی مجموعی تعداد ۵۹ ہے، ۶ انگریز ۲۶ ہندو اور ۲۷ مسلمانوں کے نام شامل ہیں ؎۲

۱۴ فروری (۱۸۶۶ء) کو سائنٹیفک سوسائٹی کے انسٹیٹوٹ کے افتتاح کی رسم ادا ہوئی اور ۳۰ مارچ (۱۸۶۶ء) کو سوسائٹی کے اخبار یعنی علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ کا پہلا پرچہ ملا، خوش قسمتی سے اخبار کے پہلے سال کی جلد جو ۲۴ دسمبر کے پرچہ پر ختم ہوتی ہے مجھے حاصل ہوگئی ہے اور اس وقت پیشِ نظر ہے، سرورق پر "The Aligarh Institute Gazette" انگریزی میں اور "اخبار سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ" اُردو میں تحریر ہے اور انگریزی کی یہ عبارت مرقوم ہے۔

"Liberty of the Press is a prominent duty of the Government and a natural right of the subjects"

جس کا اردو ترجمہ یوں کیا گیا ہے۔

؎۱ "سینٹیفک سوسٹیٹی کے انسٹیٹوٹ مسمیٰ عجائب گھر کھلنے کی روئداد" مطبوعہ انسٹیٹیوٹ گزٹ جلد ۱ ع ۱ مورخہ ۳۰ مارچ ۱۸۶۶ء صفحہ ۹-۸

؎۲ انسٹیٹوٹ گزٹ جلد ۱ نمبر ۳ ۱۳ اپریل ۱۸۶۶ء

"آزادی چھاپہ کی ہے ایک بڑا فرض گورنمنٹ کا اور ایک اصلی اور جبلی حق رعیت کا"

اخبار ہر ہفتہ ۱۶ صفحات کی ضخامت پر نکلتا تھا سالانہ چندہ معہ محصول ڈاک پندرہ روپیہ تھا، اخبار کی طباعت سرسید کے ذاتی مطبع میں منشی محمد یار خاں کے اہتمام سے ہوتی تھی، طباعت کے لئے لوہے کا چھاپہ استعمال ہوتا تھا، اخبار کے مقاصد پہلے نمبر میں ایک تمہید کے بعد یوں پیش کئے ہیں: -

"اس لئے ارادہ ہے کہ اس اخبار میں نہایت عمدہ عمدہ مضامین جن کو بڑے بڑے قابل اور ہندوستان کے خیر خواہ انگریز اور نیز قابل اور لائق ہندوستانی شرفا لکھیں گے چھاپہ ہوں گے تاکہ عموماً ہندوستانیوں کو تعلیم بھی ہو اور لطف بھی حاصل ہو اور انگریزی زبان سے ترجمہ ہو کر نفیس اور عمدہ جواب مضمون بھی لکھے جاویں گے اور اور اخباروں سے ایسے مضمونوں کے بھی ترجمے چھاپے جاویں گے جو ہندوستان بلکہ کل انسانوں کے مفید اور بکار آمد ہوں اور جن سے ہندوستان کے لوگ اور کسی طرح سے واقف نہیں ہو سکتے" ۵۱

اخبار کے مضامین کا اندازہ پہلے نمبر کی اس ترتیب سے بخوبی ہو سکتا ہے:

(۱) تمہید ۲ صفحے (نصف حاشیہ اردو و نصف انگریزی)

۲ - پارلیمنٹ ۸ صفحے تقریباً (اردو میں)

۳ - روئداد سوسائٹی ۲ صفحے (نصف اردو و نصف انگریزی)

۴ - ایک جہاز کا ڈوبنا جس کا نام لندن تھا ۱ صفحہ

۵ - کابل (۱ صفحہ)

۶ - اجلاس پارلیمنٹ

۷ - اسپیچ ملکہ معظمہ

۸ - ادارہ تعلیم فن کاشتکاری

۹ - ترقی تعلیم اہل ہند

۱۰ - ایک نئے مدرسہ کی تعمیر

(۶ تا ۱۰: ۳ صفحے)

---

۵۱ انسٹیٹیوٹ گزٹ جلد ۱ عدد ۱ - ۳۰ مارچ ۱۸۶۶ء صفحہ ۳

۱۱ - ایک نئے مدرسہ کا قایم ہونا
۱۲ - غازی آباد اور میرٹھ کی ریل۔
۱۳ - بھاول پور
۱۴ - ریل
۱۵ - عالم گیری مسجد لاہور
۱۶ - ٹین کی کان کا برآمد ہونا
۱۷ - درخواست امتناع تعدد شادیوں کی بنگالیوں میں
۱۸ - اشتہار

۶ صفحے

ہر پرچہ میں کوئی نہ کوئی عمدہ مضمون ضرور ہوتا تھا چنانچہ نمبر ۲ میں ایک مضمون "ہندوستانیوں کے عیب" کے عنوان سے انگریزی اخبار ("Englishman") مورخہ ۲۴ مارچ ۱۸۶۶ء سے ترجمہ ہوا ہے سرسید نے اس کی ابتدا یوں کی ہے:۔

"اگر کسی قوم میں وہ تمام خوبیاں جو خدا کی قدرت میں ہیں درحقیقت جمع ہوں تو ہم کو نہایت خوش ہونا چاہیے گو کہ وہ خوبیاں بالفعل ہم میں جمع نہوں اس لئے کہ جب اُن کا انسان میں جمع ہونا ممکن ہے تو اُمید ہے کہ کبھی ہم میں بھی جمع ہو جائے گی، اسی طرح اگر کچھ عیب ہم میں ہیں تو ان کو سُن کر رنجیدہ نہ ہونا چاہیے بلکہ اُمید رکھنی چاہیے کہ کوئی دن ایسا ہوگا کہ وہ عیب ہم سے چھوٹ جاویں گے، ہمارے دوست انگلشمین صاحب نے اپنے ایک اخبار میں ہندوستانیوں کی بہت سے عیب گنے ہیں ہم ان کو اپنے اخبار کے پڑھنے والوں کے ملاحظہ کے لئے لکھتے ہیں اس اُمید سے کہ ان عیبوں میں سے جو عیب ان میں نہیں ہیں ان کے نہ ہونے پر خدا کا شکر ادا کریں اور اُن عیبوں میں سے جو عیب اُن میں ہیں اُن کے چھوڑنے پر کوشش کریں۔"

۲۰ اپریل کے پرچہ میں ایک مضمون سچائی پر ہے:۔

"لوگ سچ کو مذاق میں ڈالتے ہیں، اچھا کہتے ہیں پر بولتے نہیں، اچھا جانتے ہیں پر بوجھتے نہیں، سچ کو پوچھتے ہیں پر سنتے نہیں، ہزاروں ہیں جو تلون مزاجی سے خوش ہیں، سچ پر قائم نہیں رہتے، اپنے خیالات کو اپنے

افعال کو سچ کا پابند نہیں رکھتے، سچ کے ڈھونڈنے میں کچھ محنت مشقت نہیں سچ میں کچھ دھوکا نہیں جو آدمی اُسے چھوڑے اور جھوٹ کو پکڑے، مگر ایک جبلی عبادت ہے کہ آدمی کو خود بخود جھوٹ بولنے کا مزا آتا ہے۔"

علاوہ ان چیزوں کے گزٹ میں وہ لکچر بھی شائع ہوتے تھے جو معزز ہندوستانی اور انگریز سائنٹفک سوسائٹی میں دیا کرتے مثلاً ۸ جون ۱۸۶۶ء والے پرچہ میں مسٹر ولبرٹ کا ایک لکچر تعلیم نسواں پر شائع ہوا ہے، اُس کا ایک حصہ یہاں پیش کیا جاتا ہے:-

"ہر مقام اور ہر ملک میں پہلے اس سے کہ شائستگی اور تعلیم بڑے بڑے کاموں کا راستہ کھولے عورتوں کی ایسی بُری حالت رہی ہے جس کے خیال کرنے سے رنج ہوتا ہے کیونکہ عورت بہ نسبت مرد کے طاقت جسمانی کم رکھنے کے سبب سے خانگی سامان اور اسباب کا ایک جزو تصور کی گئی ہے جس کو جب چاہیں بدل سکتے ہیں یا جو چاہیں سو کر سکتے ہیں اُس کو نہایت ادنیٰ اور ذلیل خدمتیں کرنا پڑتی ہیں اور تھوڑے دن ہوئے جب حقیقت میں یہ بات معلوم نہ تھی کہ خدا نے مرد کے برابر عورت کو بھی عقلی طاقت عطا کی ہے، پہلے پہل تعلیم اور شائستگی سے بھی اُس کی قدر زیادہ نہ ہوئی تھی، چین والے عقیل خیال کئے جاتے ہیں اور بہت دنوں سے عقل و دانش میں مشہور ہیں تاہم ان کی عورتوں کی ذلیل حالت پر خیال کرو ایک سیاح جو حال میں چین کو گیا تھا لکھتا ہے کہ چین میں تمام دنیا سے زیادہ عورت ذلیل ہے، اس ملک میں ترقی تعلیم اور شائستگی کے سبب سے وہ اور بھی زیادہ حقیر معلوم ہوتی ہے، کسی بات میں اس کو مرد کی برابر نہیں سمجھتے وہ صرف مرد کی تلون مزاجی اور ہوس نفسانی کی مطیع سمجھی جاتی ہے، جس صورت میں چین کا یہ حال ہے کہ آدمی کا فخر علم ہے اور عورت کا فخر علم کا ترک کرنا ہے تو بجز حالت مذکورہ بالا کے اور کیا سمجھا جاتا ہے، قدیم زمانے سے شہر بابل مشہور ہے اور اس کے تباہ ہو جانے سے جس کی پہلے سے پیشین گوئی ہو گئی تھی اس کا نام سن کر رنج ہوتا ہے، ہم کو قدیم مورخوں کی تاریخ سے معلوم ہوا ہے اسی شہر بابل میں عورتیں ایسی ذلیل و خوار سمجھی جایا کرتی تھیں کہ وہ علانیہ سب سے زیادہ قیمت دینے والے کے ہاتھ فروخت کر دی جاتی تھیں اور جو کچھ روپیہ خوبصورت عورتوں کے فروخت کرنے سے وصول ہوتا تھا وہ بدشکل اور لنگڑی لولی عورتوں کے خریدنے کی ترغیب کے واسطے دیا جاتا تھا، اسی طرح کی اور بھی مثالیں میں بیان کر سکتا ہوں لیکن ہر ایک قوم کی جداگانہ تاریخ بیان کرنا

کچھ ضرور نہیں، ہندوستان کے اُن شہروں میں بہت سی ایسی نظیریں عورتوں کی خراب حالت کی موجود ہیں جو ہر رُوز ہم کو معلوم ہوتی ہیں جہاں وہ مرد کی نسبت ایسی نہیں سمجھی جاتی ہیں جیسا خدا تعالٰے نے چاہا تھا، اگرچہ عورتیں ہمیشہ مطیع سمجھی جاتی ہیں اور عموماً آزادی سے محروم ہیں اور بعض حالتوں میں ایسا بھی خیال کیا جاتا ہے کہ گویا اُن میں رُوحِ انسانی نہیں ہے تاہم اُن کی تعریف میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اُنہوں نے ہمیشہ مختلف مقاموں پر جب اُن کو موقع ملا ہے وہ خاصیتیں دل اور جسم کی ظاہر کی ہیں جو خدا تعالٰے نے مرد کی برابر ان کو عطا کی ہیں . . . .'' ۵؎

الغرض انسٹیٹیوٹ گزٹ میں انگریزی مضامین کے ترجمے، مفید اور دلچسپ خبریں، پُر از معلومات خطبے لکچر شائع ہوتے تھے اور ملک میں عام طور پر شوق اور دلچسپی سے پڑھے جاتے تھے، ان میں سے بعض چیزیں تو اس قابل تھیں کہ اُن کا انتخاب موجودہ اور آیندہ نسلوں کی بہتری کے خیال سے شائع کیا جاتا لیکن افسوس کہ لوگوں کو اس طرف بالکل توجہ نہیں، انسٹیٹیوٹ گزٹ کے پرانے فایل اب بھی کمیاب ہیں اور دس بیس سال بعد ڈھونڈنے والوں کو سوائے نام اور حوالوں کے کوئی اور نشان بھی نہ مل سکے گا۔

انسٹیٹیوٹ گزٹ جس کی عبارت کے کئی اقتباسات ہم نے پیش کئے، اردو کی اخباری دنیا میں بڑا کامیاب رہا، اُس کے طرزِ بیان سے لوگ اس درجہ متاثر ہوئے کہ عام اخباروں نے اسی انداز پر لکھنا شروع کیا اور ہر ہفتہ انسٹیٹیوٹ گزٹ کے اتباع میں اردو اخباروں میں مفید اور بکار آمد مضامین نکلنے لگے جن سے زبان میں وسعت اور خیالات میں ترقی کی راہیں کُھل گئیں سرسید کا یہ احسان بھی اُن کی اوّلیات میں شمار ہونے کے قابل ہے اور اس کا بدلہ صرف یہی ہو سکتا ہے کہ ہم اُس کام کو جاری رکھیں جو انہوں نے شروع کیا تھا۔

انسٹیٹیوٹ گزٹ عرصہ تک نکلتا رہا، پھر بند ہو گیا، چند سال ہوئے اسے پھر جاری کیا گیا ہے اور مسلم یونیورسٹی کے گزٹ کی صورت میں اب بھی ہر ہفتہ شائع ہوتا ہے لیکن ہمارے انسٹیٹیوٹ گزٹ کو سرسید کے انسٹیٹیوٹ گزٹ سے کوئی نسبت نہیں نہ اب وہ مقاصد پیشِ نظر ہیں اور نہ ہم لوگوں میں وہ ذوق سرگرمی اور مستعدی باقی ہے۔

۵؎ جلد ۱۱ء ۸ جون ۱۸۷۶ء صفحہ ۷۲-۷۳

انسٹیٹیوٹ گزٹ کے اجرا (۱۸۶۶ء) تک سرسید کی تصنیفی زندگی کا تیسرا دور (۱۸۵۶-۶۶ء) ختم ہوجاتا ہے اور اُن کی زندگی کے آخری ایام کا ذکر باقی رہ جاتا ہے جو اُن کی ادبی زندگی کا چوتھا' سب سے پختہ اور آخری دور تھا' اُس کے بعد قدرت نے ہم سے وہ دل اور دماغ چھین لیا جس کی مثالیں دنیا کی تاریخ میں کم ملیں گی' افسوس اب تک اُن کا صحیح جانشین پیدا نہ ہوا اور نہ مستقبل قریب میں اس کی اُمید ہے ۔

تصنیفی زندگی کا چوتھا دور

۱۸۶۶ء سے وفات (۱۸۹۸ء) تک

تہذیب الاخلاق کا زمانہ

سرسید کی زندگی کا آخری ورق سب سے دلچسپ اور سب سے اہم ہے، اسی دور میں وہ کافر اور نیچری کہلائے، اسی زمانہ میں انہیں ٹائم سرور اور ابن الوقت کے معزز خطاب نامعقول قوم سے ملے اسی عہد میں انہیں زندیق اور ملحد بننا پڑا الغرض یہی زمانہ تھا جب انہیں مولویوں کی حماقت اور ملاؤں کی کٹ حجتی کا شکار ہونا پڑا، لیکن اسی عہد میں وہ سب کچھ ہوا جس نے سرسید کو ابد تک کے لئے ہندوستان کی سب سے بڑی ہستی بنا دیا یعنی اسی زمانہ میں مدرسۃ العلوم مسلمانانِ علی گڑھ کی تحریک شروع ہوئی اور اس کے ساتھ ہی تہذیب الاخلاق طلوع ہوا جس نے انہیں فادر آف اردو لٹریچر کہلانے کا فخر بخشا۔

۱۵ اگست ۱۸۶۶ء کو اُن کا تبادلہ علی گڑھ سے بنارس کو ہوگیا اور دو سال سے کچھ کم وہ وہیں مقیم رہے، بعدہٗ اپریل ۱۸۶۹ء میں انہوں نے ولایت کا سفر کیا اور ۴ ستمبر ۱۸۷۰ء کو واپس بنارس لوٹے۔

بنارس کے دوران قیام میں ۱۸۷۰ء سے قبل صرف دو رسالے یادگار ہیں ایک رسالہ "علاج ہیضہ بطریق ہومیوپیتھی" اور دوسرا رسالہ "طعام اہل کتاب" ہومیوپیتھی سے سرسید کو خود بڑی دلچسپی تھی ہمارے زمانے میں یہ طریق علاج بہت کامیاب، اور مقبول ہوتا جا رہا ہے لیکن اب سے پچاس سال قبل اسے صرف دماغ کا فتور اور ڈاکٹر ہنیمن (موجد ہومیوپیتھی) کی حماقت سمجھا جاتا تھا، اس عہد میں سرسید کا اس طریق علاج کی حمایت کرنا اُن کی روشن خیالی اور دوررس نگاہ کا قائل کر دیتا ہے، بہرحال چونکہ یہ رسالہ ادبی نقطہ نظر سے زیادہ اہم نہیں لہذا اس کی تفصیل کو نظر انداز کیا جاتا ہے۔

دوسرا رسالہ طعام اہل کتاب، جو ۱۸۶۸ء کی تصنیف ہے، اہل کتاب یعنی یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ شریک طعام کے مسائل پر بحث کرتا ہے اُس زمانہ میں جب یہ رسالہ تصنیف ہوا (اور بعض حلقوں میں آج بھی)

ان دونوں قوموں کے ساتھ مل کر کھانا مذہباً ناجائز سمجھا جاتا تھا اور ایسے لوگ جو عیسائیوں اور انگریزوں کی دعوت میں شرکت کرتے تھے یا اُن کو اپنے یہاں دعوت دیتے تھے، اچھی نظر سے نہیں دیکھے جاتے تھے، سرسید احمد خاں جن کو انگریزوں سے ربط و ارتباط کی ضرورت پڑتی رہتی تھی اس مغائرت کو دور کرنا چاہتے تھے، انہوں نے اس رسالے میں پہلے اس مسئلہ کو ثابت کیا ہے کہ اہلِ کتاب کے ساتھ شرکت طعام مسلمانوں کے لئے جائز ہے، کلام پاک اور احادیث سے انہوں نے اپنے دعوے کی تائید میں دلیلیں پیش کی ہیں۔

اس کے بعد انہوں نے یہ شک رفع کرنے کی کوشش کی ہے کہ عیسائیوں کے ساتھ کھانے سے حرام یا مُردار مثلاً لحم خنزیر یا شراب کا اثر ہونے کا اندیشہ ہے، ان کے نزدیک ان چیزوں کے پکنے اور کھانے پینے کے ظروف ہی علیحدہ ہوتے ہیں۔

رُسالہ طعام اہل کتاب، بھی ادبی نقطہ نظر سے زیادہ اہم نہیں البتہ ولایت سے واپسی کے بعد سرسید نے اپنی زندگی کے ایک بڑے کارنامے اور اُردو کے پہلے ادبی رسالے تہذیب الاخلاق کی طرف توجہ کی۔

تہذیب الاخلاق کا پہلا پرچہ ۱۸۷۰ء مطابق ۱۲۸۷ہجری میں نکلا اس کے مقاصد خود سرسید نے پہلی اشاعت میں واضح کئے ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ ہم لوگوں کو مغربی تمدن اور معاشرت سے آگاہ کریں گے، جہالت اور رسم و رواج کی بیخ کنی کریں گے، سوسائٹی اور اس کے اخلاق کو سُدھاریں گے، علم مجلس اور علم اخلاق کی ترقی میں کوشش کریں گے اور سب سے بڑھ کر فن انشا اور شاعری میں ایک نئے باب کا اضافہ کریں گے۔

اس حیثیت سے تہذیب الاخلاق انگریزی اخبار اسپیکٹیٹر اور ٹیٹلر کے ہم طرح ہے یورپ کی حالت خانہ جنگیوں کے زمانہ میں ہندوستان کی اُنیسویں صدی کی یاد دلاتی ہے وہاں بھی جہالت اور بربریت کا دور دورہ تھا، تعلیم کو لوگ لغو سمجھتے تھے اور عورتوں کے لئے تو اسے قطعاً باعثِ شرم سمجھتے تھے، اُن کی زندگیوں پر تصنع اور بناوٹ کے پردے پڑے ہوئے تھے جن کے اُٹھانے کے لئے انقلاب کا زبردست ہاتھ درکار تھا۔

ادب و انشا بھی فطری انداز سے پرے ہٹ کر ظاہری نمائش اور پُرتکلف آورد کی لعنت میں گرفتار تھا، قدیم مصنّفین کے شاہ کار فراموش ہوتے جارہے تھے، نئے ادیب بلند آہنگ آوازوں میں صرف کہی ہوئی کہانیوں کو بار بار دہرا رہے تھے، ہنگامہ آرائی تو اُن کے بس کی بات نہ تھی ہاں وقتی ہنگاموں میں شریک ہوکر

جہالت اور کم عقلی کا ثبوت دے سکتے تھے۔

بہت سے سمجھ دار نوجوان ان حالات سے تکلیف دہ حد تک متاثر ہو رہے تھے لیکن بہت کم ایسے تھے جو کچھ کر سکتے تھے، اسی آخر الذکر فہرست میں سر رچرڈ اسٹیل اور اڈیسن کے نام سر فہرست ہیں، سر رچرڈ اسٹیل نے ۱۲ اپریل ۱۷۰۹ء کو ایک اخبار ٹیٹلر کے نام سے جاری کیا جو ہفتہ میں ۳ بار نکلتا تھا، اپنے مقاصد میں اس نے لکھا ہے کہ ہم زندگی کو جھوٹی بناوٹوں سے پاک کریں گے، مکاری اور جھوٹی شیخی کو مٹائیں گے، قوم کی پوشاک اور گفتگو میں سادہ پن پیدا کریں گے، اڈیسن اور اسٹیل دونوں ان پرچوں میں مضامین لکھتے رہے ۱۷۱۱ء میں یہ پرچہ بند ہو گیا۔

اسی سال دونوں انشا پردازوں نے اسپیکٹیٹر کے نام سے دوسرا پرچہ نکالنا شروع کیا، انگریزی ادب کی تاریخوں میں اسی اخبار کے اجرا کے وقت سے عہد جدید کی ابتدا کی جاتی ہے، اس کے تمام مضامین تہذیب قومی کی خاطر تھے اور ملک کو انشا کا ایک سنجیدہ اور مفید طرز سکھانا چاہتے تھے۔

ان پرچوں کا ملک و قوم پر بڑا اثر ہوا، بقول ڈریک عوام میں علم ادب کا شوق اسی وقت سے پیدا ہوا (Paradise Lost) جو انگریزی ادب کا ایک غیر فانی شاہکار ہے لوگوں کے دلوں سے محو ہوتا جا رہا تھا، اسی اخبار کی بدولت اس نے حیات تازہ پائی، اڈیسن کی طرز تحریر میں ایک سادگی، شوخی اور بے ساختگی تھی، زبان شستہ اور سلیس تھی، رفتہ رفتہ یہی انداز انگریزی ادب کا پسندیدہ طرز قرار پا گیا۔

سر سید ان تمام امور سے واقف ہو کر ہندوستان میں اڈیسن اور اسٹیل کا کام کرنا چاہتے تھے لیکن ہندوستان اور انگلستان کی ذہنیت میں بڑا فرق تھا یہاں ہر چیز مذہب میں داخل تھی اور مذہب ہر امر میں مزاحم تھا، خود ہمارے زمانے میں زبان کے مسلہ نے مذہبی در فرقہ وارانہ رنگ اختیار کر لیا ہے جس نے حالات کو بے حد نازک بنا دیا ہے چنانچہ تہذیب الاخلاق میں بھی سر سید کو بعض اوقات ناخوشگوار مذہبی مسائل پر قلم اٹھانا پڑا جس نے مخالفین کی ایک خاصی جماعت پیدا کر دی اسپیکٹیٹر میں اس قسم کی مذہبی بحثیں کبھی نہیں چھڑیں اسی وجہ سے اڈیسن اور اسٹیل کا کام نسبتاً آسان تھا، بقول سر سید یہ دونوں انشا پرداز اخبار کی اشاعت کے بعد اپنی محنت اور کاہش کا صلہ عوام کی تعریف اور اسان مندی کی صورت میں حاصل کر لیتے تھے لیکن ان کو (یعنی سر سید کو) اہل ملک کی بدمذاقی کے

باعث دشنام سنا پڑتے تھے، باوجود اس مخالفت کے وہ ہمیشہ یہی کہتے رہے۔

بدم گفتی و خورسندم نکو گفتی جزاک اللہ

نوائے تلخ می زیبد لبِ لعل شکر خارا

رفتہ رفتہ مخالفت کے بادل چھٹ گئے اور مطلع صاف نظر آنے لگا، جس خدائے قدوس کے بھروسے پر سرسید نے اس بڑے کام کا بیڑا اُٹھایا تھا اُسی نے ان کی مدد کی، انہوں نے اپنی محنت کا ثمر اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اپنے قلب کو شاد اور مطمئن پایا، چنانچہ ۱۲۹۱ھ ہجری کے اختتام پر یعنی اجرا کے صرف چار سال بعد اسی تہذیب الاخلاق میں لکھتے ہیں:۔

"وہ عید کا مبارک دن یعنی یکم شوال ۱۲۸۷ھ نبوی اور ۱۲۸۷ھ ہجری جب کہ ہمارا پہلا پرچہ نکلا امید ہے کہ ہماری قوم کی تاریخ میں کبھی بھولا نہ جاوے گا، ہماری قوم کی جو کچھ بد اقبالی تھی وہ یہی تھی کہ کچھ نہ تھے اور جانتے تھے کہ ہم سب کچھ ہیں، اس غفلت کے داروئے بے ہوشی نے اُن کے کانوں کو بہرا کر دیا تھا اُن کی آنکھوں کو پتھرا دیا تھا، دماغ قابو میں نہیں رہا تھا، ہاتھ پانوں ضعیف ہو گئے تھے، زندہ تھے پر مُردوں سے بدتر تھے، اُٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے تھے پر کچھ نہ کرتے تھے، اسی تھوڑے عرصہ میں وہ حالت بہت کچھ بدل گئی۔ کچھ لوگ بخوبی ہوشیار ہو گئے وہ سمجھے کہ ہماری کیا حالت ہے اور ہم پر کیا مصیبت ہے، لبوں پر جان ہے پھر اگر جان نہیں تو جہان نہیں، کچھ لوگ ہوشیار ہوئے پر ابھی آنکھیں ملتے ہیں ....

....

بہت سونے اور اندھیرے میں پڑے رہنے سے آنکھوں میں چیپڑا جمع ہوا ہے، کچھ کھلی ہیں مگر روشنی میں چوندھیا جاتی ہیں، کچھ لوگ ابھی تک نیند کے خمار میں ہیں، کچھ حرکت تو اُن میں آئی ہے مگر ابھی انگڑائی لے کر اور کروٹ بدل کر پھر غافل ہو جاتے ہیں، پھر جب جھنجوڑو تو "ہاں! اچھا!" کہہ کر دوسری کروٹ لیتے ہیں پھر غافل ہو جاتے ہیں، کچھ لوگ ایسے ہیں کہ ابھی بدستور غافل پڑے سوتے ہیں"۔

ترقی علم انشاء کے سلسلہ میں تہذیب الاخلاق کی کامیابی کو وہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:۔

"جہاں تک ہم سے ہوسکا ہم نے اردو زبان کے علم و ادب کی ترقی میں اپنے ان ناچیز پرچوں کے ذریعہ سے

کوشش کی، مضمون کے ادا کا ایک سیدھا اور صاف طریقہ اختیار کیا، جہاں تک ہماری کج مج زبان نے یاری دی الفاظ کی درستی، بول چال کی صفائی پر کوشش کی، رنگینی عبارت سے جو تشبیہات اور استعارات خیالی سے بھری ہوتی ہے اور جس کی شوکت صرف لفظوں ہی لفظوں میں رہتی ہے اور دل پر اس کا اثر کچھ نہیں ہوتا پرہیز کیا، تک بندی سے جو اس زمانہ میں مقفّیٰ عبارت کہلاتی تھی ہاتھ اٹھا لیا، جہاں تک ہو سکا سادگی عبارت پر توجہ کی اور اس میں کوشش کی کہ جو کچھ لطف ہو وہ صرف مضمون کے ادا میں ہو، جو اپنے دل میں ہو وہی دوسرے کے دل میں پڑے تاکہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے، ہم نہیں کہہ سکتے کہ ہماری یہ کوشش کہاں تک کارگر ہوئی اور ہمارے ہموطنوں نے اس کو کس قدر پسند کیا، مگر اتنی بات ضرور دیکھتے ہیں کہ لوگوں کے خیالات میں ضرور تبدیلی آگئی ہے اور اس کی طرف لوگ متوجہ بھی معلوم ہوتے ہیں، اخباروں کی عبارتیں نہایت عمدہ اور صاف ہوتی جاتی ہیں، وہ پہلا ناپسند طریقہ ادائے مضمون کا بالکل چھوٹتا جاتا ہے، بھاری بھاری لفظوں اور موٹے موٹے لفظوں سے اردو زبان کا خون نہیں کیا جاتا، صفائی اور سادگی روز بروز عبارتوں میں بڑھتی جاتی ہے، خیالات بھی بالکل بدلے ہوئے ہیں، بہت کم اخبار ایسے ہوں گے جن میں ہر ہفتہ کوئی نہ کوئی آرٹیکل عمدہ اور سلیس عبارت میں کسی مضمون پر نہ لکھا جاتا ہو، صرف اس بات کی ہی کمی ہے کہ وہ سامان ہمارے پاس موجود نہیں ہے جس سے ہماری معلومات زیادہ ہوں اور ہمارے خیالات کو وسعت ہو، جو مضمون ہم لکھنا چاہیں اُن کے ماخذ اور ان کے حالات اور جو بحثیں اوپر ہو چکی ہیں اور جو امور اُن کی نسبت متحقق ہو چکے ہیں اُن سے آگاہی ہو، اسی سبب سے بعض دفعہ ہماری قوم کے آرٹیکلوں میں غلطی ہو جاتی ہے اور جن امور کا تصفیہ ہو چکا ہے انہیں کو پھر کیے جاتے ہیں، یہ نقص اسی وقت رفع ہوگا جبکہ انواع واقسام علوم وفنون کی کتابیں ہماری زبان میں موجود ہو جاویں گی اور ہماری قوم کو عموماً اُن پر دسترس ہوگی۔ سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ نے اس کام کے پورا کرنے کا ارادہ کیا تھا مگر افسوس ہے کہ قوم کو اس طرف توجہ نہیں ہے اور اسی سبب سے اُس کا کام ادھورا پڑا ہے۔

نئی اردو نے درحقیقت ہماری ملکی زبان میں جان ڈال دی ہے، میرؔ و دردؔ و ظفرؔ نے اردو اشعار میں جو کچھ سحر بیانی کی ہو گی ہو، میرامن دہلوی نے کوئی کہانی شستہ بول چال میں کہدی ہو کہدی ہو جو اس سے زیادہ فصیح و دل چسپ اور بامحاورہ نہ ہو گی جو ایک بوڑھی بڑھیا بچوں کو سلاتے وقت اُن کو کہانی سناتی ہے مضمون

نگاری دوسری چیز ہے جو آج تک اردو زبان میں نہ تھی اور ابھی نہایت بچپن کی حالت میں ہے۔" ۵۱

تہذیب الاخلاق کے اس رنگ پر انگریزی انشا پرداز اڈیسن اور اسٹیل کا بھی کافی اثر پڑا تھا، ان کے کارناموں کو ہم بیان کر چکے ہیں، تہذیب الاخلاق میں ان کے اکثر مضامین کے ترجمے شائع ہوتے تھے اور اس طرح انگریزی کا طرز ادا اور خیال اردو میں پہلی مرتبہ مروج ہوا، اکثر انگریزی الفاظ بھی اردو میں مستعمل ہو گئے اور رفتہ رفتہ زبان کا جزو بن گئے، سرسید نے اس کے متعلق لکھا ہے کہ :-

"ہم نے نامی یورپ کے عالموں اڈیسن اور اسٹیل کے مضامین کو بھی اپنی طرز اور اپنی زبان میں لکھا ہے، جہاں کہ ہم نے اپنے نام کے ساتھ (AD) اور (T ید) کا اشارہ کیا ہے اور اپنی قوم کو دکھایا ہے کہ مضمون لکھنے کا کیا طرز ہے اور ہماری زبان اردو میں ان خیالات کے ادا کرنے کی کیا کچھ طاقت ہے اور اگر ہماری قوم اس پر متوجہ ہو تو کس قدر اور زیادہ خوبی اور صفائی و سادگی اُس میں پیدا کر سکتی ہے۔"

تہذیب الاخلاق اپنی قسم کا پہلا ادبی اور علمی رسالہ تھا جو اردو زبان میں شائع ہوا اس کے اجرا سے اردو ادب کے نشاۃ الثانیہ کی ابتدا کی جاتی ہے، اسی نے مغربی خیالات کو اردو کی دنیا سے متعارف کرایا، قوم، قومیت اور قومی ذمہ داری جن پر آج اس قدر شد و مد سے بحث کی جاتی ہے تہذیب الاخلاق ہی کے ذریعہ سے ملک میں اس کا تصور پیش کیا گیا ورنہ اس سے پہلے اردو میں ایسے الفاظ جو قومیت کے صحیح مفہوم کو واضح کر سکیں ناپید تھے، یہ تخیلات جن پر عصر حاضر کی بنیاد رکھی گئی ہے سرسید ہی کے قلم کے مرہونِ منت ہیں۔

اب تک اردو میں مضمون نگاری کا رواج نہ تھا، اگر کوئی کچھ لکھنے بھی بیٹھتا تو پہلے مذہب پر خامہ فرسائی کرتا، چنانچہ سرسید، حالی، شبلی سب نے اپنی ادبی زندگی کی ابتدا مذہبی تصانیف سے کی، اس سے گذر کر خیالی مضامین اور پیش پا افتادہ افسانوں اور من گھڑت قصوں پر وقت برباد کیا جاتا تھا، تہذیب الاخلاق نے نیچرل مضامین کو اردو کی راہ دکھائی۔ تہذیب الاخلاق کے مضمون نگار سیدھے سادے انداز میں نیچرل مباحث پر مضمون لکھتے تھے اور چونکہ انداز بیان نرالا اور بے حد دلآویز ہوتا تھا لوگ عام طور پر اسے دل چسپی سے پڑھتے تھے، رفتہ رفتہ ملک کے دوسرے اخباروں اور رسالوں میں بھی اسی قسم کے مضامین لکھے جانے لگے اور اس

---

۵۱ تہذیب الاخلاق ۱۲۹۱ھ کے آخری پرچہ مضمون سرسید احمد خاں

روش سے عام طور پر دلچسپی کا اظہار کیا گیا۔

یہ زمانہ سرسید کی زندگی میں بڑا نازک تھا، ان کی عمر پختہ ہو چکی تھی، دنیا کے سرد اور گرم سے وہ آشنا ہو چکے تھے، تجربہ نے ان میں دقت نظر پیدا کر دی تھی، مسلمانوں کی بدحالی پر وہ آٹھ آٹھ آنسو روتے تھے، حکومت کے جانے کا ان کو اتنا رنج نہ تھا جتنا اس بات کا کہ مسلمان من حیث القوم بھی اپنے ہمسایوں کے سامنے شرمندہ ہو رہے تھے ان کی معاشرت جس سے یورپ نے درس لیا تھا ہندوستان میں آکر زر کم عیار بن گئی تھی، علم اور عمل دونوں کا ان میں فقدان تھا، وہ فراموش کر چکے تھے کہ لِکُلِّ اُمَّۃٍ اَجَلٌ، ان کے سامنے کوئی مقصد بھی نہ تھا کوئی ایسا اصول ہی نظر نہ آتا تھا جس پر ملت کے منتشر شیرازہ کو یکجا کیا جا سکے۔

بہت غور و خوض کے بعد انہوں نے اصلاح معاشرت کا زبردست کام اپنے ہاتھ میں لیا، کسی مریض کو جب کڑوی دوا دی جاتی ہے تو باوجود اس یقین کے کہ اس سے مرض کو افاقہ ہوگا وہ واویلا کرتا ہے اور تیمارداروں کو بہت کچھ سخت اور سست بھی کہہ گذرتا ہے، لیکن ہمدرد تیماردار اپنی ذمہ داریوں کو مریض کی کوتاہ عقلی کے سامنے شکست اعتراف کا موقع نہیں دیتا، اسی طرح سرسید نے اس قیامت خیز ہنگامے اور شور کی بالکل پروا نہیں کی جو اصلاح معاشرت کو ہاتھ میں لیتے ہی ملک و قوم نے ان کے خلاف بلند کیا، وہ بڑی مستعدی اور عزم کے ساتھ برابر تہذیب الاخلاق میں مضامین لکھتے رہے اور مضمون نگاروں پر زور دیتے رہے کہ وہ ان کی امداد کریں۔

انہوں نے مسلمانوں کو بتایا کہ تم کیا تھے اور کیا ہو گئے تہذیب الاخلاق کے آئینہ میں انہوں نے ان کے درخشندہ ماضی اور تابناک مستقبل کی تصویریں اپنے قلم سے اجاگر کر کے دکھائیں، ساتھ ہی ساتھ انہوں نے حال کے بھیانک منظر کو بھی بار بار دکھایا تاکہ دیکھنے والوں کو عبرت ہو اور اس سے درس لے کر ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہو سکیں۔

تہذیب الاخلاق میں مضامین کا دوسرا موضوع اسلام پر اعتراض کرنے والوں کو معقول جواب دینا تھا آئندہ چل کر یہ خدمت خصوصیت کے ساتھ علامہ شبلی کے سپرد ہوئی جسے انہوں نے بڑے حسن اور خوبی سے انجام دیا۔

اسی زمانہ میں سرسید تفسیر القرآن کے لکھنے میں مصروف تھے، اُن کے مذہبی معتقدات اور خیالات دانستہ اور نادانستہ طور پر تہذیب الاخلاق میں آجاتے تھے، پرانی لکیر کے فقیر کس طرح اس کو گوارہ کر سکتے تھے چنانچہ ان کے رد میں متعدد رسائل اور اخبار نکلنے لگے یہاں تک کہ جب ایک پریشان حال دوست نے ان سے اپنی ملازمت کے لئے سفارش چاہی تو انہوں نے ازراہ ظرافت کہا کہ جو کچھ میں لکھا کروں تم اُس کی تردید لکھتے رہو، اللہ نے چاہا تو کھانے پینے کی طرف سے اطمینان ہوجائے گا۔

مذہبی مباحث میں بھی انہوں نے کبھی متانت اور سنجیدگی دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا، اکثر مولوی ان سے اختلاف کی صورت میں اپنا بخار گالیوں اور پھبتیوں سے نکالتے تھے، اس کے جواب میں سرسید کے قلم سے اور وہ بھی صرف گاہے گاہے ہلکی سی مسکراہٹ ٹپک پڑتی تھی جو مخالفین کے لئے نوک نشتر سے بھی زیادہ تیز ہوتی تھی اور دل کے پار ہو کر رہتی تھی۔

ایک مرتبہ مولوی علی بخش خاں صاحب بدایونی جو سرسید سے شدید اختلاف رکھتے تھے عازم بیت اللہ ہوئے اور وہاں کے مفتیائے اسلام سے ان کی تکفیر کے فتاوی لائے، ان کی واپسی پر سرسید لکھتے ہیں :۔

"جو صاحب ہماری تکفیر کے فتوے لینے کو مکہ معظمہ تشریف لے گئے تھے اور ہمارے کفر کی بدولت ان کو حج اکبر نصیب ہوا، ان کے لائے ہوئے فتووں کو دیکھنے کے ہم بھی مشتاق ہیں،

ببین کرامت بتخانۂ مرا اے شیخ — کہ چوں خراب شود خانۂ خدا گردد

سبحان اللہ ہمارا کفر بھی کیا کفر ہے جو کسی و حاجی اور کسی کو ہاجی اور کسی کو کافر اور کسی کو مسلمان بناتا ہے۔"

تہذیب الاخلاق میں عموماً ایسے مباحث پر مضامین تحریر ہوتے تھے۔

(۱) رسم و رواج کی پابندی کے نقصانات
(۲) تعصب
(۳) آزادی رائے
(۴) کن کن چیزوں میں تہذیب چاہیے
(۵) تربیت اطفال

(۶) ہندوؤں میں ترقی تہذیب
(۷) نامہذب ملک اور نامہذب گورنمنٹ
(۸) مذہب اور عام تعلیم
(۹) تعلیم کا عام رواج بلاشمول مذہبی تعلیم کے ناممکن ہے
(۱۰) تفسیر السموات
(۱۱) مذہبی تعلیم
(۱۲) غیر مفید تعلیم وغیرہ

سرسید نے تہذیب الاخلاق میں اپنے ایک انگریز دوست کا مکتوب نقل کیا ہے جو لکھتا ہے:۔

تہذیب الاخلاق نے یہ ثابت کر دیا کہ اردو زبان میں بھی ہر قسم کے مضامین اور خیالات عمدگی اور سادگی سے ادا ہو سکتے ہیں اور یہ بھی ثابت کر دیا کہ مذہب اسلام ایسا تنگ و تاریک رستہ نہیں ہے جیسا کہ اب تک سمجھا جاتا رہا ہے'

مولانا شبلی لکھتے ہیں:۔

"پروفیسر رینان نے جو فرانس کا ایک بڑا مشہور مصنف گذرا ہے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ عربی زبان میں یہ صلاحیت نہیں کہ وہ فلسفی مسائل کو ادا کر سکے' یہ صرف رینان کی لاعلمی ہے' سرسید نے اردو جیسی کم مایہ زبان میں وہ مسائل ادا کر دئے ہیں' فلسفہ الہیات پر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ فلسفہ کے اعلیٰ درجہ کے مسائل ہیں" [۱]

ذیل کا اقتباس سرسید کے ایک مضمون 'تعصب' سے لیا گیا ہے جو ان کے طرز تحریر اور تہذیب الاخلاق کی عبارت کا نمونہ کہا جا سکتا ہے:۔

"انسان کی بدترین خصلتوں میں سے تعصب بھی ایک بدترین خصلت ہے' یہ ایسی بدخصلت ہے کہ انسان کی تمام نیکیوں اور اس کی تمام خوبیوں کو برباد کرتی ہے' متعصب گو اپنی زبان سے نہ کہہ سکے

[۱] محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج میگزین علی گڑھ مئی ۱۸۹۸ء

مگر اس کا طریقہ یہ بات جتلاتا ہے کہ عدل و انصاف کی خصلت جو عمدہ ترین خصائل انسانی سے ہے اس میں نہیں ہے، متعصب اگر کسی غلطی میں پڑتا ہے تو اپنے تعصب کے سبب اس غلطی سے نکل نہیں سکتا کیونکہ اس کا تعصب اس کے برخلاف بات کے سننے اور سمجھنے اور اس پر غور کرنے کی اجازت نہیں دیتا اور اگر وہ کسی غلطی میں نہیں ہے بلکہ سچی اور سیدھی راہ پر ہے تو اس کے فائدے اور اس کی نیکی کو پھیلنے اور عام ہونے نہیں دیتا کیونکہ اس کے مخالفوں کو اپنی غلطی پر متنبہ ہونے کا موقع نہیں ملتا"

اسی سلسلہ میں وہ متعصب آدمی کے لئے ایک نہایت جاندار تشبیہ استعمال کرتے ہیں جس سے بہتر خیال میں نہیں آسکتی، لکھتے ہیں:۔

"اُس کی مثال ایک ایسے جانور کی ہوتی ہے جو اپنے ریوڑ میں ملا رہتا ہے اور نہیں جانتا کہ اس کے اور ہم جنس کیا کر رہے ہیں، بلبل کیا چہچہاتی ہے اور قمری کیا غل مچاتی ہے، بیا کیا بُن رہا ہے اور مکھی کیا چُن رہی ہے، وہ بجز کوڑے پر کی گھانس چرنے کے اور کچھ نہیں جانتا کہ باغ کیوں بنا ہے اور پھول کیوں کھلا ہے، نرگس کیا دیکھتی ہے اور انگور کی تاک کیا تاکتی ہے"

اسی انداز میں دوسرا مضمون اُمید کی خوشی ہے جو اپنی زبان اور بیان کے اعتبار سے اس عہد کا شاہکار کہا جاتا ہے۔

مختصر یہ کہ تہذیب الاخلاق نے ہمارے ادب اور انشا کا رُخ بدل دیا، تصنع کی جگہ سادگی اور اصلیت نے لے لی، عبارت سلیس اور جاندار لکھی جانے لگی، اب قلم اور دماغ کو الفاظ کی میناکاری کی بجائے مضمون کے ادا کرنے کا موقع ملا۔ اردو میں بھاشا کی سادگی، عربی کی وسعت انگریزی کی صاف گوئی اور زور کو رواج پانے کا موقع ملا۔ سرسید کے اس دبستان ادب سے وہ ادیب اور انشاپرداز صاحب قلم اور صاحب طرز پیدا ہوئے جن سے اردو کے خزان دیدہ باغ میں پھر بہار کے آثار نظر آنے لگے، اسی کم مایہ زبان میں حالی نے تنقید اور سیرت نگاری کی داد دی، اسی میں نذیر احمد نے اصلاح معاشرت کے لئے افسانوں اور ناولوں کا کمال دکھایا اور اسی میں شبلی نے تاریخ نگاری کی راہ نکالی، غرض اس زبان کا سکہ ایسا رواں ہوا کہ اپنے اور پرائے کی جیب میں اس کے

سوا کچھ اور باقی نہ رہا۔ خراطِ پر اتر کر زبان نے ایسی صورت پائی کہ متقدمین اگر آج دیکھتے تو نقش حیرت بن جاتے فیض و کرم کا یہ چشمہ جو علی گڑھ سے اس روز نکلا ہنوز جاری ہے اور ملکی زبان اور ادب کی آبیاری میں مصروف ہے اور رہتی دنیا تک رہے گا۔

خاتمہ

ہمیں احساس ہے کہ سرسید علیہ الرحمۃ کے علمی اور ادبی کارناموں کے لئے اس سے زیادہ وضاحت اور تفصیل کی ضرورت ہے، ایسے آدمی دنیا میں کم پیدا ہوتے ہیں اور اُن کے چلے جانے سے جو جگہ خالی ہو جاتی ہے اس کو پُر کرنے والے مشکل سے دستیاب ہوتے ہیں، اس مختصر مقالہ میں ہم نے بہت سی چیزوں کو نظر انداز کر دیا ہے اور اکثر کے متعلق ہمارا بیان تشنہ ہے، کچھ تو مواد کی فراہمی میں دقتیں تھیں اور کچھ دیگر مصروفیتوں نے موقع نہ دیا، انشاء اللہ

یار زندہ صحبت باقی

سرسید کی زندگی کا ایک بڑا کارنامہ ان کی تفسیر القرآن ہے، افسوس کہ وہ اس کی تکمیل نہ کر سکے اور ان کی حیات کا یہ شاندار باب ناتمام رہ گیا۔

سرسید علیہ الرحمۃ کی تربت کو خدا عنبریں کرے، انہوں نے اپنی زندگی ملک و قوم کی خدمت کے لئے وقف کی تھی اور اسی پر ان کا انجام ہوا، اردو ادب بھی ان کا مرہونِ منت ہے، ہماری زبان کا جو خلعت اور رنگ و روپ آج نظر آتا ہے اُنہیں کا عطا کردہ ہے، وقت اور زمانہ نے بھی ان کے احسان کا اعتراف کیا ہے، مسلم یونیورسٹی ان کی ایسی یادگار ہے جو رفتار زمانہ کے ساتھ ترقی کی شاہراہ پر ہمیشہ آگے بڑھتی رہے گی، افسوس ہے تو یہ ہے کہ اردو زبان والوں نے اپنی رفتار کو نہایت سست کر رکھا ہے، اس کی ذمہ داری ہم نوجوانوں پر ہے، ہم زندگی کی تازہ بہاروں سے لطف اندوز

ہو رہے ہیں دل امیدوں کے مسکن ہیں اور دماغ آرزو کدہ، کیا یہ ممکن نہیں کہ اس شباب کی دنیا میں ایک گوشہ اردو کی بے لوث اور خالص مخلص خدمت کے لئے بھی نکل آئے۔

چشم سید نگراں ہے کہ پھر اُٹھے شاید
کوئی دیوانہ محبت کے بیابانوں سے

ضمیمہ (۱)

سرسیّد کی بعض اہم تصانیف باعتبار موضوع

(الف) تاریخ :-

(۱) آثار الصنادید

(۲) سلسلۃ الملوک

(۳) تاریخ بجنور

(۴) تصحیح آئین اکبری

(۵) تاریخ سرکشی بجنور

(۶) تصحیح فیروز شاہی

(۷) خطبات احمدیہ

(ب) سوانح :-

(۱) سیرت فریدیہ

(۲) خیر خواہانِ مسلمانانِ ہند — "Loyal Mohammadans of India"

حصہ اوّل - دوم و سوم — Parts I, II and III.

(ج) سائنس :-

(۱) تسہیل فی جرالثقیل

(۲) قول متین در حرکت ابطال زمین

(۳) ترجمہ فوائد الافکار فی اعمال الفرجار

(د) مذہب:۔

(۱) جلاء القلوب بذکر المحبوب

(۲) کلمۃ الحق

(۳) راہ سنت در رد بدعت

(۴) ترجمہ کیمیائے سعادت

(۵) تبیین الکلام فی التفسیر التوراۃ والانجیل علی ملتہ اسلام حصّہ اوّل، دوم، سوم

(۶) رسالہ احکام طعام اہل کتاب

(۷) تفسیر القرآن

(ہ) اخبار ورسائل:۔

(۱) سید الاخبار

(۲) علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ

(۳) تہذیب الاخلاق

(و) ادب:۔

(۱) مضامین سرسید

(ز) لیکچر:۔

(۱) مجموعہ لیکچر سرسید احمد خاں

(ح) تعلیم:۔

(۱) التماس بخدمت ساکنانِ ہندوستان

(۲) رائے درباب تعلیم

(۳) مضامین مشمولہ تہذیب الاخلاق وانسٹیٹیوٹ گزٹ

(ط) سفرنامہ:۔

(۱) سفرنامہ انگلستان

(۲) سفرنامہ پنجاب

(ی) مکاتیب:۔

(۱) خطوط سرسید (مرتبہ راس مسعود مرحوم)

(ك) متفرقات:۔

(۱) انتخاب الاخوین

(۲) رسالہ تحقیق لفظ نصاریٰ

(۳) رسالہ علاج ہیضہ بطریق ہومیوپیتھی

(۴) ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر ریویو

(۵) رسالہ اسباب بغاوت ہند

(ل) لغت:۔

(۱) اردو ڈکشنری (نامکمل)

(نوٹ) بقول حالی سرسید نے اردو ادب کی تاریخ لکھنے کا بھی ارادہ کیا تھا لیکن افسوس کہ وہ اس کی تکمیل نہ کر سکے۔

ضمیمہ (۲)

سرسید کی بعض اہم تصانیف تاریخی ترتیب سے

سنہ	نام تصنیف :-
سنہ ۱۸۳۶ء	سیدالاخبار
سنہ ۱۸۳۹ء	کلمۃ الحق
سنہ ۱۸۴۲ء	جلاءالقلوب بذکر المحبوب
سنہ ۱۸۴۳ء	تسہیل فی جراثقیل
سنہ ۱۸۴۴ء	تحفہ حسن
سنہ ۱۸۴۷ء	آثارالصنادید نقشِ اوّل
سنہ ۱۸۵۰ء	راہ سنت در رد بدعت
سنہ ۱۸۵۲ء	سلسلۃ الملوک
سنہ ۱۸۵۳ء	ترجمہ کیمیائے سعادت
سنہ ۱۸۵۴ء	آثارالصنادید نقش ثانی
سنہ ۱۸۵۶ء	تاریخ بجنور
سنہ ۱۸۵۶ء	تصحیح آئین اکبری
سنہ ۱۸۵۸ء	تاریخ سرکشی بجنور
سنہ ۱۸۵۹ء	رسالہ درباب تعلیم
سنہ ۱۸۵۹ء	اسباب بغاوت ہند
سنہ ۱۸۶۰ء	رسالہ تحقیق لفظ نصاریٰ

سنہ	نام تصنیف :-
سنہ ۱۸۶۲ء	تصحیح فیروز شاہی
سنہ ۱۸۶۲ء	تبئین الکلام فی التفسیر التوراۃ والانجیل علی ملۃ اسلام حصہ اول
سنہ ۱۸۶۴ء	ترجمہ فوائد الافکار فی اعمال الفرجار
سنہ ۱۸۶۵ء	تبئین الکلام حصہ دوم وسوم
سنہ ۱۸۶۶ء	علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ
سنہ ۱۸۶۷ء	رسالہ علاج ہیضہ بطریق ہومیوپیتھی
سنہ ۱۸۶۸ء	رسالہ احکام طعام اہل کتاب
سنہ ۱۸۷۰ء	تہذیب الاخلاق

"مقروض"

مترجمہ
(شاہد لطیف مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

ایک ایکٹ میں ایک طربیہ

افراد :- (جس ترتیب سے اسٹیج پر آتے ہیں)

ممتاز .... ایک نوجوان

احمد .... اس کا نوکر

موچی

اجنبی

سوداگر

لڑکی

آدمی

ڈرائیور

سگ فروش

زمیندار

چھاپہ خانہ کا کلرک

ایک بنگالی مصور

سین :- (ایک معمولی سا سجا ہوا کمرہ)

(ممتاز پردہ کے پیچھے پلنگ پر سو رہا ہے)

احمد۔ (کمرہ میں داخل ہوتا ہے اور پلنگ کے قریب جاتے ہوئے) حضور! حضور! اُٹھئے! (خاموشی) حضور اب تو اُٹھئے!

ممتاز۔ اے — جی — اوہوں!

احمد۔ حضور اُٹھئے بھی، بہت دن چڑھ گیا۔

ممتاز۔ کیا وقت ہوگا؟

احمد۔ حضور ساڑھے دس۔

ممتاز۔ (جھلاتے ہوئے) ہوں! ساڑھے دس، تم نے مجھے اس سے پیشتر کیوں نہیں جگایا جب کہ میں تم سے کل ہی ....

احمد۔ حضور، میں نے تو جگایا تھا۔ لیکن آپ اُٹھے ہی نہیں۔

ممتاز۔ تم کو جگانا ہی نہیں آتا۔ بیکار باتیں بناتے ہو، کیا تم میرا لحاف اُتار کر نہیں پھینک سکتے تھے؟

(پردہ کے پیچھے سے نہانے کے کپڑے پہنے ہوئے نکلتا ہے۔ اور کھڑکی کے قریب جا کر باہر کی طرف دیکھتا ہے)

اُف جب یہاں سردی اس شدّت کی ہے تو باہر کیا حال ہوگا، احمد! انگیٹھی سلگاؤ۔

احمد۔ حضور، کوئلے ختم ہو گئے ہیں۔

ممتاز۔ ہیں کوئلے ختم ہو گئے..... کیسے؟

احمد۔ حضور، کوئلوں کو تو ختم ہوئے ایک ہفتہ ہو گیا۔

ممتاز۔ یہ کیا بیہودگی ہے، آخر تم سونے کا کمرہ کس طرح گرم کرتے ہو؟

احمد۔ حضور میں آجکل سونے کا کمرہ گرم نہیں کر رہا ہوں!

ممتاز۔ (تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد) ہوں! جبھی تو میں رات لحاف میں بھی کانپا جا رہا تھا،..... تم کو کہیں نہ کہیں سے کوئلہ لانا ہی چاہئے تھا۔ آئندہ ہمیشہ اس بات کا خیال رکھنا۔ تم نے چاء تیار کر لی۔

احمد۔ جی ہاں، تیار کر لی۔

ممتاز۔ اچھا تو لے آؤ۔

احمد - بہت اچھا حضور، لیکن شکر نہیں رہی۔
ممتاز - کیا شکر بھی ختم ہو گئی؟ بالکل نہیں رہی؟
احمد - جی حضور، بالکل نہیں۔
ممتاز - (ہاتھ ملتے ہوئے) میں بغیر چاے کے زندہ نہیں رہ سکتا۔ جاؤ اور کہیں نہ کہیں سے شکر لے کر آؤ۔ جاؤ!
احمد - حضور، کہاں سے لاؤں۔
ممتاز - فرینڈس اسٹور سے لے آؤ میں کل دام ادا کر دونگا۔
احمد - اب اسٹور والا اعتبار نہیں کرتا، حضور! وہ مجھے بُرا بھلا کہتا رہتا ہے۔
ممتاز - اچھا تو اس کے کتنے روپے چاہئیں۔
احمد - ستائیس روپیہ بارہ آنے۔
ممتاز - محض ستائیس روپیہ بارہ آنے۔ یہ بھی کوئی رقم ہوتی ہے۔ اچھا جاؤ، اور ایک مرتبہ اور کوشش کرو، ممکن ہے وہ دے دے۔
احمد - حضور، وہ نہیں دے گا۔
ممتاز - جاؤ اُس سے کہنا کہ دو روز بعد صاحب کے گھر سے خرچ آجائیگا روپیہ آتے ہی تمہاری رقم مل جائیگی، جاؤ!
احمد - حضور، جانے سے کچھ فائدہ نہیں، اب بغیر روپیہ کے وہ کچھ نہ دے گا۔ یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔
ممتاز - ہاں، وہ قرض اس لئے نہیں دے گا کہ تم بالکل گدھے ہو۔ . . . . تم ذرا اُس کی خوشامد کرنا کہ اس وقت ہمارے پاس خرچ ختم ہو گیا ہے۔ لیکن تمہیں گھبرانا نہیں چاہئے۔ تمہارے روپے مارے نہیں جائینگے لیکن تمہارے ساتھ مغز زنی سے کیا فائدہ! تمہاری سمجھ میں کچھ بھی نہیں آئیگا۔
(گھنٹی بجتی ہے، ممتاز پردہ کے پیچھے چھپ جاتا ہے۔ اور آہستہ سے کہتا ہے) کسی کو اندر نہ آنے دینا۔ دیکھو اندر نہ آنے پائے، ارے سنتا ہے؟ کہنا کہ میں علی الصبح ہی شہر چلا گیا ہوں۔ (اپنے کانوں میں انگلیاں دے لیتا ہے)

(احمد باہر جاتا ہے)

موچی کی آواز۔ صاحب گھر میں ہیں!

احمد - نہیں

موچی - کیا کہا نہیں ہیں!

احمد - میں نے کہا تو وہ گھر میں نہیں ہیں۔

موچی - تو پھر وہ آتے ہی ہونگے۔

احمد - میں کہہ نہیں سکتا —— لیکن —— نہیں نہیں وہ ابھی واپس نہ ہونگے۔

موچی - یہ اچھی بات نہیں ہے۔ مجھے اپنے روپئے کی ضرورت ہے۔

احمد - میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ وہ گھر پر نہیں ہیں، وہ کسی کام سے باہر گئے ہیں۔

موچی - اچھا تو میں اُن کا انتظار کرتا ہوں۔

احمد - تم یہاں نہیں ٹھہر سکتے۔

موچی - میں ٹھیروں گا۔

احمد - تم یہاں ہرگز نہیں ٹھہر سکتے، یہاں سے چل دو، سُنا تم نے، چل دو، اسی دم، مجھے بھی باہر جانا ہے۔

موچی - نہیں میں انتظار کرونگا۔

احمد - میں تم سے کہہ رہا ہوں کہ تم یہاں نہیں ٹھہر سکتے۔

موچی - مجھے روپیے کی سخت ضرورت ہے، میں بغیر روپیے کے واپس نہیں جا سکتا۔

احمد - میں کہتا ہوں تم یہاں سے چلے جاؤ۔

موچی - بڑے شرم کی بات ہے۔ شریف آدمی بنتے ہیں اور حرکتیں ایسی ہیں، ڈوب مرنے کا مقام ہے۔

احمد - اب دفان بھی ہو، میں تم سے گھنٹہ بھر دماغ نہیں مار سکتا۔

موچی - پھر میرا روپیہ کب ملیگا!

احمد - پرسوں آنا، پرسوں،

موچی - کس وقت۔

احمد۔ اسی وقت

موچی۔ اچھا جاتا ہوں۔۔۔۔۔۔۔ سلام

احمد۔ سلام

(دروازہ بند کرنے کی آواز ہوتی ہے، احمد داخل ہوتا ہے)

ممتاز۔ (ڈرتے ڈرتے پردہ کے پیچھے سے دیکھتے ہوئے) کیا وہ چلا گیا؟

احمد۔ جی حضور گیا۔

ممتاز۔ بہت اچھا ہوا، بڑا حرامزادہ ہے۔ روپیہ کے لئے مرا جاتا ہے۔ مجھے ان لوگوں سے سخت نفرت ہے۔ اچھا دیکھو، اب شکر تو لے آؤ۔

احمد۔ لیکن حضور سنئے تو۔۔۔۔۔۔۔

ممتاز۔ میں کچھ سننا نہیں چاہتا! تمھاری مرضی ہے کہ میں بغیر چائے پئے ہی چلا جاؤں، ہوں، جاؤ، کہیں سے بھی شکر لاؤ۔ چوری کرو یا ڈاکہ ڈالو۔

(احمد باہر جاتا ہے)

ممتاز۔ (تنہا) یہ بوڑھا گدھا محض ناکارہ ہے۔ مجھے اب کوئی نوجوان ملازم تلاش کرنا پڑے گا۔ (مختصر خاموشی) اب مجھے کہیں نہ کہیں سے روپیہ کا انتظام کرنا چاہئے۔۔۔۔۔ لیکن مجھے کون قرض دینے لگا۔ یہی تو ٹیڑھا سوال ہے (گھنٹی بجتی ہے) مردود! کوئی اور قرضخواہ آگیا۔ اور احمد شکر لینے گیا ہے (گھنٹی پھر بجتی ہے) یقیناً کوئی قرضخواہ ہے ـــــ جانور کہیں کا! (گھنٹی) بڑا مردود ہے، (دروازہ کی طرف جانے کا ارادہ کرتا ہے) مجھے وہاں نہ جانا چاہئے، یہ ٹھیک نہیں (گھنٹی زور سے اور متواتر بجتی رہتی ہے) ٹوٹ جائے مجھے اس کی پرواہ نہیں (جھلاتے ہوئے) غالباً اس لئے گھنٹی توڑ ڈالی ہے۔ مردود کتنا دلیر ہے۔۔۔۔ ممکن ہے یہ کوئی قرضخواہ نہ ہو، ہو سکتا ہے کہ ڈاکیہ روپیہ لایا ہو۔۔۔۔۔ نہیں! نہیں!! ڈاکیہ نہیں ہو سکتا اس کو ایسی جلدی کیا پڑی تھی۔ وہ پھر لا سکتا تھا۔

(احمد داخل ہوتا ہے)

ممتاز۔ تم کہاں مرگئے تھے، تمہارے پیچھے کوئی گھنٹی توڑگیا، یہ تو بڑے غضب کی بات ہے ...... اور
ہاں شکر لائے؟

احمد ۔ (اپنی جیب سے ایک ہری پڑیا نکالتا ہے) لیجئے۔

ممتاز۔ (پڑیا کھولتے ہوئے) بس اتنی سی، اتنی سی سے کیسے کام چلے گا اور اس میں تمام تنکے ملے
ہوئے ہیں۔

احمد ۔ یہ بھی بڑی مشکل سے ملی ہے۔

ممتاز۔ خیر کام تو چل ہی جائیگا ۔ اچھا چار تیار کرو (ایک ٹھمری الاپنا شروع کرتا ہے)
احمد!

احمد ۔ جی حضور!

ممتاز۔ دیکھو میں چاہتا ہوں کہ تمھارے لئے ایک وردی بنادوں،

احمد ۔ جیسی حضور کی مرضی۔

ممتاز۔ تمھارا کیا خیال ہے؟ میں چاہتا ہوں کہ تمھاری وردی بالکل جدید بنواؤں۔ بادامی زین کا کوٹ
اور سفید زین کا بینٹ۔ (گھنٹی) لاحول ولاقوۃ! (پردہ کے پیچھے چھپ جاتا ہے)

(احمد باہر جاتا ہے)

سوداگر کی آواز ۔ کیا تمھارے صاحب ابھی تک سو رہے ہیں!

احمد ۔ وہ تو کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔

سوداگر ۔ باہر چلے گئے ہیں؟

احمد ۔ ہاں کہیں باہر گئے ہیں۔

سوداگر۔ تو یہ کہو، آج تڑکے ہی اُٹھ بیٹھے ۔ اچھا میرے روپوں کا کیا ہوگا۔ گھر میں اس وقت کچھ
روپیہ موجود ہے کیا؟

احمد ۔ اس وقت تو نہیں ہے، لیکن جلد ہی آجائیگا۔

سوداگر۔ آخر کب تک۔ اگر زیادہ دیر نہ لگے تو میں انتظار کروں،

احمد۔ نہیں، نہیں، تم ٹھہر کر کیا کرو گے۔ بہتر یہی ہے کہ تم دو تین دن کے بعد آؤ۔

سوداگر۔ تو اس وقت تمھارے پاس بالکل روپیہ نہیں۔

احمد۔ اس وقت تو نہیں ہے۔

سوداگر۔ تمھارے صاحب کچھ ایسے زیادہ کے تو مقروض نہیں، لیکن انھوں نے مجھے پریشان کر رکھا ہے۔ میں پھیرے کرتے کرتے تھک گیا ہوں، لیکن وہ ہیں کہ ملتے ہی نہیں۔

احمد۔ دو دن کے بعد روپیہ ضرور مل جائیگا۔

سوداگر۔ یعنی جمعرات کے دن ـــــ اس کے یہ معنی ہوئے کہ مجھے جمعہ یا ہفتے کو آنا چاہئے۔

احمد۔ ہاں ہاں، اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے، ہفتہ کو ہی سہی۔

سوداگر۔ لیکن اس وقت کیا بالکل نہیں مل سکتا؟

احمد۔ نہیں اس وقت تو ہے ہی نہیں۔

سوداگر۔ اچھا تو پھر میں کب آؤں؟

احمد۔ میں نے کہا تو، ہفتہ کے دن آنا۔

سوداگر۔ ہفتے کے دن، اچھی بات ہے، ہفتہ کو ہی آؤنگا ـــــ لیکن اسوقت تمھارے پاس تھوڑا سا بھی روپیہ نہیں؟

احمد۔ بھئی قسم پروردگار کی، اس وقت ایک پیسہ نہیں۔

سوداگر۔ پچیس روپے بھی نہیں؟

احمد۔ ایک چھدام نہیں۔

سوداگر۔ بیس روپے بھی نہیں۔

احمد۔ میرے پاس کہاں سے آئے۔

سوداگر۔ تو تمھارے پاس بالکل روپیہ نہیں ہے۔

احمد۔ کہا تو نہیں ہے، نہیں ہے، نہیں ہے۔

سوداگر۔ اچھا تو میں کب آؤں؟

احمد۔ ہفتے کے دن، ہفتے کو۔

سوداگر۔ اس سے پہلے نہیں؟

احمد۔ اگر آنا چاہو تو اس سے پہلے ہی آ جانا کوئی خاص فرق نہیں ہوگا۔

سوداگر۔ اچھا تو جمعہ کے دن سہی۔

احمد۔ اچھی بات ہے جمعہ سہی۔

سوداگر۔ تو جمعہ کو روپیہ ضرور مل جائیگا؟

احمد۔ ہاں جمعہ کو مل جائیگا۔

سوداگر۔ کیا اس وقت کچھ بھی نہیں دے سکتے۔

احمد۔ اس وقت تو ناممکن ہے۔

سوداگر۔ تو پھر جمعہ کو!

احمد۔ ہاں اُس روز ضرور۔

سوداگر۔ کوئی اسی وقت آؤں نا!

احمد۔ ہاں، ہاں، اسی وقت۔

سوداگر۔ یا پھر ہفتے کے دن آؤں، میرے خیال سے ہفتے کا دن زیادہ موزوں رہے گا۔

احمد۔ جس دن چاہو چلے آنا۔

سوداگر۔ اچھی بات ہے۔ میں جمعہ یا ہفتہ کو جو دن بھی مناسب ہوگا، آ جاؤنگا۔ سمجھے تم! جس دن بھی فرصت ہوگی۔ آ جاؤنگا۔

احمد۔ جب تمھیں سہولت ہو۔

سوداگر۔ کوشش میں جمعہ ہی کو آنے کی کرونگا . . . . لیکن کیا اس وقت تم تھوڑا بہت بھی نہیں دے [illegible]۔ خدا کے واسطے اب تو میرے اوپر رحم کرو،

سوداگر - اچھا بھئی معاف کرنا - میں ہفتہ ہی کو آؤنگا۔

احمد - اچھا سلام

سوداگر - سلام، دیکھو تو پھر میں جمعہ یا ہفتہ کے دن آؤنگا - اسی وقت اچھا معافی چاہتا ہوں۔ (دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دیتی ہے، احمد کمرے میں داخل ہوتا ہے، اس کا رنگ زرد ہے اور سانس زور زور سے چل رہا ہے)

ممتاز - (پردہ کے پیچھے سے آتے ہوئے) تمھیں شرم آنی چاہئے - تم بھی کس کمینے کے منہ لگے تھے غضب خدا کا ایک گھنٹہ ہو گیا - آخر یہ تھا، کون؟

احمد - (ترشروئی سے) فرنیچر والا تھا -

ممتاز - کیا میں اس کا بھی مقروض ہوں -

احمد - جی ہاں باون روپے کے

ممتاز - باون روپے کا، آخر کیسے، ایسے بھدے اور کمزور فرنیچر کے باون روپے! وہ دیکھو میز تو کبھی کی ٹوٹ چکی ہے - مجھے لاہور کا بنا ہوا فرنیچر ذرا پسند نہیں ہے، ان لوگوں کو فرنیچر بنانے کا ذرا بھی شعور نہیں - (گھنٹی) پھر کوئی منحوس آ گیا - یہ حرامزادے مجھے کوئی کام نہ کرنے دینگے - غضب خدا کا میں چار بھی تو سکون کے ساتھ پی نہیں سکتا -

(پردہ کے پیچھے چھپ جاتا ہے)

(احمد دروازہ کی طرف جاتا ہے)

لڑکی کی آواز - کیا تمھارے صاحب گھر میں ہیں -

(ممتاز جلدی سے پردہ کے پیچھے سے دیکھتا ہے)

احمد - صبح سے کہیں گئے ہوئے ہیں -

ممتاز - (زور سے) کون ہے؟

لڑکی - (احمد سے) جھوٹ بولتے ہو، ویسے ہی کہدیا کہ صاحب گھر پر نہیں ہیں۔

احمد۔ اچھی بات ہے تو پھر اندر آجاؤ...... جب وہ خود ہی تم کو... (تقریباً سولہ برس کی ایک لڑکی اندر داخل ہوتی ہے۔ اس کے ہاتھوں میں کاغذ کا ایک بنڈل ہے)

ممتاز۔ (مسکراتے ہوئے) ہوں، ہوں، تم کیا چاہتی ہو؟

احمد۔ لانڈری سے آئی ہے

ممتاز۔ (قدرے گھبرائے ہوئے) اچھا، تو تم کس لئے آئی ہو؟

لڑکی۔ (ممتاز کو ایک بل پیش کرتے ہوئے) مجھے یہ روپیہ چاہیئے۔

ممتاز۔ (بے اعتنائی سے) اچھا (بل کو دیکھتا ہے) اچھی بات ہے، چھ روپیہ سوا پندرہ آنے...... تو دیکھو یہ روپیہ کل لے جانا۔

لڑکی۔ لیکن مجھ سے ماں نے کہا ہے کہ روپیہ آج ہی لیکر آؤں۔

ممتاز۔ میں تم کو روپیہ تو ابھی دیدیتا (مسکراتے ہوئے) لیکن یہ بات ہے کہ اس وقت میرے پاس نوٹ ہے۔ خوردہ نہیں۔

لڑکی۔ میں دکان سے نوٹ بھنا لاتی ہوں۔

ممتاز۔ نہیں نہیں تم پھر کسی وقت آنا (اپنی قمیص پر انگلیاں مارتے ہوئے) کل یا آج ہی، دوپہر کو کھانے کے بعد لے جانا۔

لڑکی۔ نہیں صاحب، مہربانی کرکے ابھی دید یجئے۔ نہیں تو اماں مجھ پر ناراض ہونگی۔

ممتاز۔ ناراض ہونگی، کس قدر ظالم عورت ہے، تم پر ناراض ہونا تو سخت ناانصافی ہے، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہاری ماں کس قسم کی عورت ہے۔

لڑکی۔ صاحب........

ممتاز۔ تم بڑی اچھی ہو، خدا گواہ ہے، میں نے تم ایسی نیک لڑکی آج تک نہیں دیکھی۔

لڑکی۔ نہیں صاحب، آپ بل کا روپیہ ادا کر دیجئے۔

ممتاز۔ تم میرا اعتبار تو کرو، میں تمہارا سب روپیہ بہت جلد ادا کر دونگا۔ بات یہ ہے کہ اس وقت میں بہت پریشان ہوں

(گھنٹی بجتی ہے) خدا ان سے سمجھے' اچھا دیکھو' دیکھو تو اب کل آنا۔ میں سب روپیہ ادا کردونگا۔ اچھا تو خدا حافظ۔

لڑکی۔ نہیں صاحب نہیں . . . .

(ممتاز پردہ کے پیچھے چھپ جاتا ہے)

ممتاز۔ خدا کے واسطے اس وقت چلی جاؤ۔

لڑکی۔ لیکن مجھ پر میری ماں تو ناراض ہوگی۔

ممتاز۔ اچھا اچھا' تم اس وقت تو چلی جاؤ' (ہلکے سے اُس کو دھکا دیتا ہے اور احمد سے چلاکر کہتا ہے) اس کو پچھلے دروازہ سے باہر کردو' ارے سنتے ہو؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ اُس آدمی کو خبر ہو جائے (خود سے) کیسی مصیبت ہے' سخت پریشانی ہے۔ لڑکی تو چڑیل کی طرح پیچھے پڑ گئی ہے۔

آدمی کی آواز۔ (بھاری اور نہایت بھدی) صاحب ہیں؟

احمد۔ جی وہ گھر میں نہیں ہیں۔

آدمی۔ تم جھوٹ بولتے ہو'

احمد۔ خدا گواہ ہے۔

آدمی۔ آخر یہ تمھارے صاحب کے دل میں ہے کیا۔ انھوں نے مجھے بیوقوف سمجھ رکھا ہے۔ ایک تو مجھ سے روپیہ لیا۔ اور پھر ہر وقت مکان کے چکر لگواتے ہیں۔ جیسے میں ان کا نوکر ہی ہوں' دیکھو' قلم دوات اور کاغذ لاؤ' میں خط لکھے جاتا ہوں۔

احمد۔ ابھی لایا (احمد' قلم دوات' کاغذ لاتا ہے اور میز پر رکھدیتا ہے)

آدمی۔ لے او! ذرا یہ چھڑی تو میرے ہاتھ سے لے۔

(کمرے میں میانہ قد کا ایک آدمی داخل ہوتا ہے' جس کی لمبی لمبی مونچھیں ہیں' اجنبی میز پر بیٹھ جاتا ہے زیر لب بڑبڑاتے ہوئے خط لکھتا ہے' پردہ کے پیچھے خاموشی چھائی ہوتی ہے)

آدمی۔ (اُٹھتے ہوئے) یہ خط اپنے صاحب کو دیدینا۔ سُنا تم نے؟

احمد۔ بہت اچھا حضور!

آدمی ۔ اور دیکھو اپنے صاحب سے کہنا مجھے اس قسم کا مذاق پسند نہیں، کھڑے کھڑے جیل کرا دونگا۔

(کمرے کے دروازہ تک جاتا ہے، جوتے پہنتا ہے اور چھڑی ہلاتا ہوا باہر چلا جاتا ہے۔ دروازہ بند ہوتا ہے
ممتاز تھوڑی دیر کے بعد پردہ کے باہر آتا ہے)

ممتاز۔ (خشمناک ہوتے ہوئے) خبیث کہیں کا۔ مجھے ڈرانا چاہتا ہے........ نہیں نہیں مجھے کیا ڈرا سکتا ہے۔ ابھی مجھے جانتا ہی نہیں (خط پڑھتا ہے) خبیث، مردود کہیں کا (خط کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے) جنگلی جانور! میں اس سے کسی طرح کم نہیں، ڈراتا ہے (غصے کی وجہ سے کمرے میں ٹہلنے لگتا ہے) مجھے اس کا انتظام کرنا پڑیگا اور........ (گھنٹی بجتی ہے)

(پردہ کے پیچھے چھپ جاتا ہے)

احمد ۔ کیا چاہتے ہو؟

ڈرائیور ۔ کل میں تمہارے صاحب کو ٹیکسی پر لے گیا تھا۔

احمد ۔ کہاں لے گئے تھے۔

ڈرائیور ۔ بندرن۔

احمد ۔ اچھا تو پھر؟

ڈرائیور ۔ صاحب نے کہا تھا کہ کل گھر پر آکر کرایہ لے جانا۔

احمد ۔ کتنا کرایہ ہوا۔

ڈرائیور ۔ پانچ روپیہ

احمد ۔ کل لے جانا۔

ڈرائیور ۔ (تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد) اچھی بات ہے۔

ممتاز ۔ (پردہ سے باہر آکر) یقیناً مجھے روپیہ کی سخت ضرورت ہے۔ مجھے کہیں نہ کہیں سے روپیہ منگانا چاہئے۔ ارے احمد (احمد آتا ہے۔) تم نے کرنل اشرف الحق کا بنگلہ دیکھا ہے؟

احمد ۔ جی ہاں، دیکھا ہے۔

ممتاز۔ دیکھو! وہاں ایک خط لے کر جاؤ ـــــ تم ابھی جاؤ۔ خط لکھ لوں تو تمھیں بلا لوں گا (میز پر بیٹھ کر خط لکھتا ہے) قلم کتنے خراب ہیں۔ مجھے بازار سے نئے لانا پڑینگے۔ (خط کو زور سے پڑھتا ہے)

"محترمی کرنل صاحب! آداب عرض ہے، میری آپ سے ایک حقیر سی (زور دیتے ہوئے) درخواست ہے۔ مجھے اس وقت تین سو روپیہ کی سخت ضرورت ہے۔ انشاء اللہ جلدی واپس کردے جائینگے اس بے وقت کی تکلیف دہی کی معافی چاہتا ہوں" "امید ہے کہ آپ بخیریت ہونگے۔ آپ کا خادم۔۔۔۔

میرے خیال میں اتنا لکھنا کافی ہے۔ عبارت سے تھوڑی بے تکلفی تو ضرور ٹپکتی ہے۔ لیکن کوئی حرج نہیں۔ وہ اگر بڑے آدمی ہیں۔ تو میں بھی ایسا گیا گذرا نہیں پبلک مجھے بھی عزّت کی نگاہ سے دیکھتی ہے احمد! (احمد داخل ہوتا ہے) دیکھو یہ خط لیکر جاؤ، لیکن دیر نہ کرنا۔ فوراً جواب لیکر آنا۔ بنگلہ زیادہ دور نہیں ہے

احمد۔ (باہر جاتے ہوئے) بھلا میں دیر کیوں کرنے لگا صاحب!

ممتاز۔ اب روپیہ ملنے کی کوئی نہ کوئی سبیل نکل ہی آئیگی ـــــ میرے خیال سے تو وہ روپیہ ضرور دیدینگے بیچارے شریف آدمی ہیں۔ اس کے علاوہ مجھ سے محبت بھی بہت کرتے ہیں ـــــ میں نے ابھی تک چار بھی تو نہیں پی۔ اب تو ٹھنڈی بھی ہوگئی ہوگی۔ (ایک گھونٹ پیتا ہے) یہ تو بالکل پانی ہوگئی۔ (ذرا دیر بعد) اس کو گرم کرنا چاہئے۔۔۔۔۔ لیکن میں گرم نہیں کرسکتا۔ مجھے احمد کا انتظار کرنا پڑیگا۔ وہ روپیہ لے کر آتا ہی ہوگا ـــــ ممکن ہے کرنل صاحب اسوقت بنگلہ پر نہ ہوں ـــــ کیا بجا ہوگا؟

(گھڑی دیکھنے جاتا ہے۔) بڑی خطرناک حالت ہے! (جسم میں ایک پھریری آتی ہے) احمد!۔۔۔۔ ابھی واپس نہیں آیا (لکھتا ہے)

"ہمارے ناکامی مقدر نے ہمکو ناکامیاب رکھا"

یقیناً یہ ناکامی مقدر ہی ہے۔ اقبال اتنا بڑا شاعر ہے۔ سارا ہندوستان اس کی قدر کرتا ہے لیکن میں باعظمت کیوں نہیں؟ مجھ میں ایسی کونسی خامی ہے۔ (غور کرتا ہے) میں نے بڑی غلطی کی کہ فوجی ملازمت نہیں کی۔ اوّل تو وہ ملازمت بہت اچھی ہوتی ہے۔ دوئم میں اس بات کو محسوس کرتا ہوں کہ مجھ میں کام کی کافی اہلیت ہے۔ لیکن اب کیا ہو سکتا ہے۔

(احمد داخل ہوتا ہے)

ممتاز۔ (ممتاز اپنے سر کو تکیوں میں چھپا لیتا ہے اور اپنے چہرے کو اپنے ہاتھوں سے ڈھانپ کر چلاتا ہے۔) میں سمجھ گیا وہ گھر پر نہیں ملے نا۔ کیا وہ گھر پر نہیں تھے؟ بولو جلدی بولو!

احمد۔ نہیں حضور وہ گھر پر تھے۔

ممتاز۔ (اپنا سر اٹھاتے ہوئے) وہ گھر پر تھے، اچھا تو تمھیں کوئی جواب ملا؟

احمد۔ جی حضور!

ممتاز۔ (اپنے چہرے کو موڑتے ہوئے اور ہاتھ پھیلاتے ہوئے) مجھے دو، مجھے دو۔ . . . . . . (خط کو دیکھتا ہے) یہ تو خالی ہے (خط کو قریب سے دیکھتا ہے) اچھا (خط کو اپنی آنکھوں کے قریب سے ہٹاتے ہوئے) یہ تو میرا ہی خط ہے!

احمد۔ انھوں نے اس کی پشت پر لکھا ہے۔

ممتاز۔ اچھا میں سمجھا، میں سمجھا، انھوں نے انکار کر دیا۔ . . . . . میں جواب کو پڑھ کر کیا کرونگا۔ (خط کو پھینک دیتا ہے) میں جانتا ہوں کہ انھوں نے کیا لکھا ہوگا۔ . . . . (خط کو اٹھاتے ہوئے) لیکن اس خط کو پڑھ ضرور لینا چاہئے، ممکن ہے انھوں نے قطعی انکار نہ کیا ہو، شاید روپیہ دینے کا وعدہ کیا ہو، (احمد سے) انھوں نے یہ خط تمھیں اپنے ہاتھ سے دیا ہے؟

احمد۔ نہیں حضور، ایک آدمی کے ہاتھ بھیجا تھا۔

ممتاز۔ ہوں، . . . . . بہرحال میں پڑھتا ہوں۔ آخر اس میں حرج ہی کیا ہے۔ (خط کو پڑھتا ہے اور طنزیہ طور پر مسکراتا ہے) وہ ایک بڑا آدمی ہے، بڑا آدمی۔

"عزیزی ممتاز میں تمھاری درخواست پوری نہیں کر سکتا"

تمہارا . . . .

پھر بھی میرے بنتے ہیں۔ مجھے عزیز سمجھتے ہیں۔ زمانہ ساز کہیں کا۔

احمد۔ (آہ بھر کر) آج کا دن بڑا منحوس ہے۔

ممتاز ۔ آپ اپنی قابلیت نہ چھانٹیے۔ نکل جاؤ یہاں سے، میں اب کام کرونگا۔ سمجھے تم؟

(احمد باہر چلا جاتا ہے۔ ممتاز کچھ دیر کمرے میں ٹہلتا ہے۔) یہ تو بُری بات ہے۔ بہت بُری بات...
(میز پر بیٹھ جاتا ہے) مجھے کچھ نہ کچھ کام کرنا چاہئے، (لیٹ جاتا ہے، ایک انگریزی ناول اُٹھاتا ہے اور یونہی ایک صفحہ کھول کر پڑھنے لگتا ہے)

(احمد اندر آتا ہے)

احمد ۔ (آہستہ سے) حضور.......

ممتاز ۔ کیا ہے؟

احمد ۔ (ڈرتے ڈرتے) اسمٰعیل آیا ہے۔

ممتاز ۔ کس لئے آیا ہے؟

احمد ۔ (آہستہ سے) وہ کہہ رہا ہے کہ اُسے روپیہ کی ضرورت ہے۔ اس کے صاحب اپنے وطن جا رہے ہیں۔ اور اُس کو بھی اپنے ساتھ لئے جا رہے ہیں۔ اسلئے وہ آپ سے روپے لینے آیا ہے۔

ممتاز ۔ (آہستہ سے) ہم نے اس سے کتنا روپیہ لیا تھا؟

احمد ۔ مع سود کے پچاس روپے کے قریب ہوتے ہیں۔

ممتاز ۔ کیا تم نے اُس سے کہہ دیا ہے کہ میں گھر پر ہوں؟

احمد ۔ (آہستہ سے) نہیں تو۔

ممتاز ۔ (آہستہ سے) بڑا اچھا کیا۔
لیکن وہ گھر میں کیسے آگیا۔ گھنٹی کی آواز تو ہوئی نہیں۔

احمد ۔ وہ پشت کے دروازہ سے آیا ہے۔

ممتاز ۔ (غصے سے آہستہ آہستہ) کیا کہا۔ پشت کے دروازہ سے کیوں آنے دیتے ہو؟ ممکن ہے کسی روز وہ مجھے اسی دروازہ سے آکر لوٹ لیجائیں۔ اس قسم کی بیہودگیاں مجھے پسند نہیں گھر میں آنیکا راستہ سامنے سے ہے نہ کہ پشت سے۔

احمد - (آہستہ سے) جی ہاں حضور میں اس کو ابھی واپس بھیج دیتا ہوں۔ وہ تو اس وقت صرف یہ پوچھنے آیا ہے کہ کب روپیہ لینے آئے۔

ممتاز۔ (زیرلب) کب، ....کب، .... اچھا کوئی ایک ہفتہ کے بعد.....

احمد - (زیرلب) ہاں حضور، اسمٰعیل کے لئے کہیں نہ کہیں سے ضرور روپیہ فراہم کر دیجئے۔

ممتاز۔ آخر کیوں؟ کیا وہ تمہارا ملنے والا ہے۔

احمد - جی ہاں۔

ممتاز۔ یہی وجہ ہے کہ تم اس کے لئے اتنی کوشش کر رہے ہو؟ جاؤ! جاؤ! .... دیکھا جائیگا میں کوشش کروں گا۔

(احمد چلا جاتا ہے)

ممتاز - سب کو اپنی پڑی ہے۔ میں سب کو سمجھتا ہوں۔ سب کے سب مطلبی ہیں۔ ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے (ناول پھر پڑھنے لگتا ہے۔ اور یکایک اپنا سر بلند کرتا ہے) مجھے کرنل سے اس قسم کے جواب کی امید نہ تھی وہ میرے والد کے دوست ہیں۔ فوج میں ایک ساتھ رہے ہیں۔ (کھڑا ہو جاتا ہے اور آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر گاتا ہے) مجھکو کام کرنا چاہئے۔ (میز پر بیٹھ جاتا ہے)

(احمد داخل ہوتا ہے)

ممتاز - کون ..... احمد؟

احمد - جی ہاں!

ممتاز - کیا بات ہے؟

احمد - ایک کتے والا آیا ہے وہ آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ کہتا ہے کہ آپ نے اس سے گھر پر آنے کو کہا تھا۔

ممتاز - ارے ہاں کہا تو تھا۔ کیا وہ اپنے ساتھ کوئی کتا لایا ہے؟

احمد - جی حضور! ایک لایا تو ہے۔

ممتاز - اسے اندر بلالو۔

(ایک سگ فروش کمرہ میں داخل ہوتا ہے۔ جو ایک پھٹا ہوا کوٹ پہنے ہوئے ہے۔ گردن پر ایک رومال ہے اور زنجیر میں ایک بوڑھا کتا بندھا ہوا ہے)

ممتاز۔ (کتّے کو چشمہ لگا کر دیکھتا ہے) اس کا نام کیا ہے؟

سگ فروش۔ پوسی۔

ممتاز۔ اچھی نسل کی ہے کیا؟

سگ فروش۔ ہاں حضور اچھی نسل کی ہے۔

ممتاز۔ چیزیں اُٹھالاتی ہے کیا؟

سگ فروش۔ جی ہاں اُٹھالاتی ہے۔ (اپنی بغل میں سے اپنی ٹوپی نکال کر پھینکتا ہے) چلو۔ لے ...... (کتیا ٹوپی اُٹھالاتی ہے)

ممتاز۔ بہت خوب۔ شکار وکار کے بھی کام کی ہے نا؟

سگ فروش۔ اول درجہ کی شکاری ہے۔

ممتاز۔ غالباً یہ بوڑھی ہے۔

سگ فروش۔ تیسرا سال لگا ہے (زنجیر پکڑ کر کتیا کو اُٹھا لیتا ہے۔)

ممتاز۔ کیا لوگے؟

سگ فروش۔ پچاس روپیہ۔ ایک پیسہ کم نہیں۔

ممتاز۔ ہش، بہت زیادہ ہے۔ تیس روپیہ بتاتے۔

سگ فروش۔ میں آپ سے زیادہ نہیں مانگ رہا ہوں۔

ممتاز۔ نہیں نہیں۔ اس کی قیمت تو دس روپیہ سے زیادہ نہ ہوگی۔

(احمد کے چہرہ سے غصّہ کا اظہار ہوتا ہے)

سگ فروش۔ اتنے میں تو نہیں بیچ سکتا۔

ممتاز۔ اچھا تو تمھاری مرضی کونسی نسل ہے؟

سگ فروش۔ اچھی نسل کی ہے صاحب۔

ممتاز ۔ اچھی نسل کی ہے۔ ایں؟

سگ فروش۔ جی حضور ہم معمولی نسل کے کتے نہیں رکھتے۔

ممتاز۔ تو معمولی قسم کے کتے تمھارے پاس نہیں ہیں!؟

سگ فروش۔ ہم ان کو رکھ کر کیا کریں۔

ممتاز۔ (احمد سے) تمھارا کیا خیال ہے۔ اچھی نسل کی ہے!

احمد ۔ (بے دلی سے) اچھی کتیا ہے

ممتاز ۔ دیکھو بھئی ۳۰ روپیہ دے سکتا ہوں۔

سگ فروش۔ چالیس روپیے سے ایک پیسہ کم نہیں لے سکتا۔ دل چاہے۔ خرید لیجئے۔

ممتاز۔ میں اس سے زیادہ نہیں دے سکتا۔

سگ فروش۔ اچھا لائیے پینتیس ۳۵ روپیے ہی سہی۔

ممتاز۔ تمھیں پہلے ہی راضی ہو جانا چاہئیے تھا۔ بیکار اتنی دیر تک سودا کیا۔ اچھی نسل کی ہے نا؟

سگ فروش۔ حضور اس قسم کی کتیا تو تمام شہر میں نہیں مل سکتی۔

ممتاز۔ (قدرے گھبراتے ہوئے) دیکھو بھئی اس وقت تو میرے پاس بہت تھوڑا روپیہ ہے۔ کل تک میرے پاس روپیہ ہو جائیگا۔ اچھا تو تم کل آنا۔ اس وقت ذرا مشکل ہے۔ اگر کل نہیں تو پھر پرسوں سہی۔

سگ فروش ۔ تو پھر تھوڑا سا بیعانہ دے دیجئے۔ میں کتیا یہیں چھوڑ جاؤنگا۔

ممتاز ۔ اس وقت تو میں نہیں دے سکتا۔

سگ فروش ۔ ایک روپیہ ہی سہی۔

ممتاز۔ میں سب کا سب روپیہ یک مشت ادا کرنا چاہتا ہوں۔

سگ فروش ۔ (دروازہ کی طرف جاتے ہوئے) سنئے حضور! اگر آپ مجھے تیس ہی روپے نقد دیدیں تو کتیا

آپ کو دیئے دیتا ہوں۔

ممتاز۔ اِس وقت نہیں دے سکتا۔

سگ فروش۔ اچھا یں ہی سہی۔

ممتاز۔ اس وقت تو قطعی ناممکن ہے

سگ فروش۔ پوسی، پوسی (طنزیہ طور پر مسکراتے ہوئے) آپ کے پاس تو کبھی روپیہ ہوتا ہی نہیں، پوسی، پوسی

ممتاز۔ یہ بک کیا رہے ہو؟

سگ فروش۔ خالی جیب پر کتے خریدنے بیٹھے ہیں۔ پوسی، پوسی۔

ممتاز۔ بدمعاش کہیں کا۔ نکل جا یہاں سے۔ ارے احمد اس بدمعاش کو لات مار کر باہر نکال دے۔

سگ فروش۔ خاموش رہیئے میں خود ہی جا رہا ہوں۔

ممتاز۔ احمد سنا نہیں۔ میں نے کیا کہا؟

سگ فروش۔ (دروازہ کے قریب سے) خبیث بڈھے! اگر میرے نزدیک آیا تو اچھا نہیں ہوگا۔

(احمد اسکے پیچھے جاتا ہے)

ممتاز۔ لات مار کر مردود کو نکال دو۔ حرامزادہ کہیں کا۔ (کمرہ میں ٹہلنا شروع کرتا ہے۔)
کیسا حرامزادہ ہے۔ میرے خیال میں کتیا بھی اچھی نسل کی نہیں تھی۔ اچھا کیا جو میں نے اس کو نہ خریدا لیکن اس کو مجھے برا بھلا کہنے کا کیا حق تھا۔ (صوفہ پر بیٹھ جاتا ہے) کیسا منحوس دن ہے۔ صبح سے اب تک میں نے کوئی کام نہیں کیا۔ اور نہ کہیں سے روپیہ ملا ہے۔ حالانکہ مجھے روپے کی شدید ضرورت ہے۔

احمد!

(احمد اندر داخل ہوتا ہے)

احمد۔ جی حضور!

ممتاز۔ دیکھو شہاب کے پاس میرا خط لیجاؤ۔

احمد۔ بہت اچھا۔

ممتاز۔ احمد۔

احمد۔ کیا ہے حضور؟

ممتاز۔ تمہارا کیا خیال ہے کیا وہ کچھ روپے دیدیگا۔؟

احمد۔ حضور! مجھے تو کچھ اُمید نہیں۔

ممتاز۔ نہیں وہ ضرور دیدیگا۔ (زور دیتے ہوئے) تم دیکھنا وہ ضرور دیدیگا۔

احمد۔ حضور اُنسے کچھ نہیں مل سکتا۔

ممتاز۔ آخر کیوں؟

احمد۔ (کچھ سوچتے ہوئے) مجھ بے وقوف کی بھی تو کچھ سنئے۔

ممتاز۔ کہو کیا کہتا ہے۔

احمد۔ (کھانسنے کے بعد) حضور دیکھئے۔ یہ آپ اچھا نہیں کر رہے ہیں۔ جو ایک غیر جگہ اس طرح پڑے ہیں حضور! میں آپ کا خاندانی ملازم ہوں۔ آپ بڑے آدمی ہیں۔ زمیندار ہیں۔ آخر شہر میں رہنے سے کیا فائدہ۔ روپیہ پاس نہیں۔ ہر وقت تکلیفیں اُٹھانا پڑتی ہیں۔ آپ زمیندار ہیں۔ خدا کے فضل سے آپ کی والدہ ابھی بقید حیات ہیں۔ آپ کو چاہئے کہ آپ ان کے پاس رہیں۔

ممتاز۔ کیا ماں کے پاس سے کوئی خط آیا ہے۔ جو تم ان کا راگ الاپ رہے ہو۔؟

احمد۔ جی حضور! اں کے پاس سے ایک خط آیا تھا۔ انھوں نے آپ کی خیریت پوچھی تھی۔ میں نے آپ کی صحت کی حالت مفصل طور پر لکھ بھیجی ہے۔ یقین مانئے حضور! وہ بیچاری بغیر آپ کے بہت پریشان رہتی ہیں۔ مجھ سے پوچھا تھا کہ حضور کیا کر رہے ہیں۔ کن کن لوگوں سے ملتے ہیں، کہاں کہاں جاتے ہیں۔ غرضکہ آپ کے متعلق تمام باتیں پوچھی تھیں۔ اُنھوں نے لکھا تھا کہ اگر میں نے ٹھیک باتیں نہ لکھیں تو مجھے سخت سزا دی جائیگی۔ خط میں لکھا تھا کہ ممتاز میاں سے کہنا کہ میں تمھارے بغیر پریشان ہوں۔ لاہور میں اس طرح بیکار پڑے رہنے اور خواہ مخواہ روپیہ برباد

کرنے سے کیا فائدہ۔

ممتاز۔ (مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے) اچھا تو تم نے کیا جواب دیا۔

احمد۔ یہی کہ یہاں سب خیریت ہے۔ اور میں حضور کو لانے کی جلد از جلد کوشش کرونگا۔ حضور، دیکھئے تو سہی اگر آپ گھر چلیں گے تو وہاں امیروں کی طرح زندگی بسر ہوگی۔ اپنا ذاتی مکان ہوگا اس کے علاوہ آپکی شادی بھی ہو جائیگی۔ آخر یہاں رہنے سے کیا فائدہ؟ جب دیکھئے کوئی نہ کوئی تقاضائے موجود رہتا ہے۔ ادھر گھنٹی بجی اُدھر آپ پردہ کے پیچھے جا چھپے۔ لاکھ کوششوں کے باوجود روپیہ نہیں ملتا۔

ممتاز۔ مگر احمد مجھے تو گھر کی ویرانی ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ گاؤں کے لوگ بالکل جاہل ہیں۔ لڑکیوں کو دیکھو وہ بھی کچھ عجیب سی ہیں۔ انھیں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر گھورنا تو آتا ہے۔ لیکن ان سے ذرا کچھ کہا کہ ان کا پسینہ چھوٹ جاتا ہے۔

احمد۔ حضور، یہاں کی لڑکیاں کون سی اچھی ہیں۔ جتنی لڑکیاں بھی آپ سے ملتی ہیں۔ سب بدکردار اور کمینی ہیں یقین کیجئے وہ تو اس قابل بھی نہیں کہ انھیں نظر بھر کے دیکھا جائے۔ لیکن اپنے گاؤں کی لڑکیوں کا یہ حال نہیں۔ میں تو یہی کہتا ہوں۔ خدا ان سے ہر شریف کو محفوظ رکھے۔ اب پہلے کی سی تو حالت نہیں رہی۔ آپ کے دادا خدا ان کی مغفرت کرے بڑے بھاری بھرکم آدمی تھے۔ آخر میں بیچاروں کا دماغ خراب ہوگیا تھا۔ اور اس بُری طرح سے چلایا کرتے تھے۔ کہ راتوں کو لوگوں کا سونا حرام ہوگیا تھا۔ بیچارے بڑے نیک آدمی تھے۔ کسی سے خوش ہوئے تو ایسا سلوک کیا۔ کہ تمام عمر یاد کیا کرے آپ کی دادی بھی بڑی نیک تھیں۔ تمام گاؤں ان کی عادت کی تعریف کرتا تھا۔

ممتاز۔ لیکن میں گاؤں میں چل کر نہیں رہ سکتا۔ اس فضا میں تو میرا دم گھٹ جائیگا۔

احمد۔ لیکن حضور سوچئے تو سہی۔ وہاں آپ کے پاس ضرورت سے زیادہ روپیہ ہوگا۔ وہاں آپ عیش کریں گے۔ یہاں کیا ہے۔ تنہا میں ہی آپ کی خدمت کے لئے ہوں۔ آپ سے شکایت نہیں کرتا۔ لیکن اس طرح کی زندگی بسر کرنا تکلیف دہ ضرور ہے۔ آپ بُرا نہ مانیے (اپنے پھٹے ہوئے کوٹ سے دہجی پھاڑتے ہوئے) یہ محض نام ہی کا کوٹ ہے۔ لیکن حضور گھر پر یہ حال نہ ہوگا۔ وہاں ہر چیز کی افراط ہے۔ کتنا عالی

شان مکان ہے۔ کھانے پینے کی ہر چیز میسر ہے یہاں تو مجھے پیٹ بھر کھانے کو بھی نہیں ملتا۔ اس کے علاوہ وہاں آپ شکار کھیلنے جایا کیجئے گا۔ سوچئے تو آپ کی والدہ صاحبہ آپ کو دیکھ کر کتنی خوش ہونگی۔

ممتاز۔ میں چلنے کو چلا تو چلوں لیکن آفت یہ ہے کہ وہ مجھے واپس نہ آنے دیں گے۔ ان لوگوں سے چھٹکارا پانا ذرا مشکل ہی ہو جائے گا اور اگر شادی کر دی تو پھر آفت ہی ہے۔

احمد۔ شادی میں کیا برائی ہے۔ یہ چیز تو مذہباً بہت ضروری ہے۔

ممتاز۔ شادی کا نام نہ لو۔ میں وہاں شادی نہیں کر سکتا۔

احمد۔ جیسے آپ کی مرضی۔ لیکن میں تو آپ سے بھی کہتا ہوں کہ آپ یہاں سے ضرور چلئے۔ یہ تو بڑی بری جگہ ہے۔ اگر خدانخواستہ کوئی چیز چوری چلی جائے۔ تو میری تو ساری عمر کی کرائی محنت اکارت جائیگی۔ سب الزام میرے ہی سر آئیگا۔ کہیں، کیوں مکان کی چیزوں کی حفاظت نہیں کرتا۔ یہ کوئی نہیں کہنے کا کہ تنہا مجھے ہی کھانا پکانے۔ سودا سلف لانے اور ادھر ادھر جانے کا کام کرنا پڑتا ہے یہاں پر تو کوئی اتنا بھی نہیں جس سے میں بات کر سکوں، خدا یہاں کے نوکروں اور باورچیوں سے بچائے صورت سے کیسے شریف معلوم ہوتے ہیں لیکن ہوتے پکے فریبی ہیں۔ زمانے بھر کے چور۔ گاؤں کی زندگی سے بڑھ کر شہر کی زندگی نہیں۔ وہاں ہر شخص آپ کی عزت کرے گا۔ یہاں خلوص نام کو نہیں محض دکھاوا ہی دکھاوا ہے حضور، اس بوڑھے کی بات مانئے اور گھر واپس چلئے۔ میں آپ کا پرانا نمک خوار ہوں۔ آپ سے پہلے آپ کے دادا اور والد کی خدمت کر چکا ہوں۔ مجھ سے آپکی یہ حالت نہیں دیکھی جاتی۔ یہ باتیں دیکھکر میرا جی جلتا ہے۔ کبھی کبھی بوڑھے آدمیوں کی باتیں بھی ماننا چاہئیں۔ میں دنیا کی اونچ نیچ دیکھے ہوئے ہوں (گھنٹی بجتی ہے) دیکھئے۔ آپ پھر گھبرائے جا رہے ہیں۔

ممتاز۔ جاؤ جاؤ دروازہ تو کھولو (احمد باہر جاتا ہے۔ ممتاز ساکت و خاموش بیٹھا ہے)

مصور۔ ممتاز صاحب ہیں؟

احمد۔ وہ نہیں ہیں

مصور۔ کیا کہا وہ نہیں ہیں؟

احمد۔ آخر تم چاہتے کیا ہو؟

مصور۔ میں کے۔ این۔ بوس ہوں۔ مشہور آرٹسٹ۔

احمد۔ خدا تم سے محفوظ رکھے۔

(دروازہ بند ہوتا ہے احمد۔ ممتاز کو ایک ملاقاتی کارڈ دیتا ہے)

ممتاز۔ (کارڈ بغیر دیکھے ہوئے) مجھے معلوم ہے وہ کون ہے۔ بنگالی مصور ہوگا میں نے کل اس سے آنے کو کہا تھا نا کہ میرا فوٹو بنا دے۔ خیر اب وہ آگیا ہے۔ کوئی حرج نہیں مجھے شہاب سے روپیہ منگانا چاہئے ورنہ بنگالی خواہ مخواہ باتیں بنائیگا۔ (میز پر بیٹھکر خط لکھتا ہے۔ کھڑکی کے قریب جاکر جلدی جلدی خط کو پڑھتا ہے) بھئی۔ شہاب۔ ایک دوست کی مصیبت میں مدد کرو۔ خدا کے واسطے کسی نہ کسی طرح ڈھائی سو یا دو سو روپیہ کا انتظام کردو۔ روپیہ حامل رقعہ کو دیدینا۔ تمہارا . . . .

میرے خیال میں اتنا لکھنا کافی ہے۔ احمد دیکھو یہ خط لیجاؤ۔ سمجھے۔ میں پہلے بھی ان سے کچھ روپیہ قرض لے چکا ہوں۔ وہ ضرور میرا اعتبار کریں گے۔ دیکھو فوراً جواب لیکر آؤ۔ سمجھے جواب لیکر آنا۔

احمد۔ بہت اچھا حضور۔

ممتاز۔ جاؤ احمد خدا تمھیں کامیاب کرے۔

(احمد جاتا ہے)

ممتاز۔ احمد کا کہنا ٹھیک ہے۔ اس کی سیدھی سادی باتیں خلوص پر مبنی ہیں۔ یقیناً گاؤں میں رہنا ہی مناسب ہے۔ اور آجکل تو وہاں کا موسم بھی بڑا اچھا ہوگا۔ اس کے علاوہ مجھے دیہات کا رہنا کچھ دیسے بھی بہت زیادہ پسند ہے۔ ایسا ہی ہے تو کچھ دنوں بعد پھر لاہور واپس چلا آؤنگا۔ اس میں شک نہیں کہ وہاں کے باشندے بڑے جاہل ہیں۔ لیکن پھر بھی دو چار ایسے ہیں۔ جو بات چیت کرنے کے قابل ہیں۔ میں خود ہی ان کو اس قابل بنا لونگا۔ کہ وہ میرے ساتھ رہ سکیں۔ رہیں لڑکیاں وہ بھی راہ پر آہی جائینگی۔ (کمرہ میں ٹہلنا شروع کر دیتا ہے) لیکن گاؤں میں ایک چیز سخت تکلیف دہ ہے۔ وہاں کی لوگوں کی مفلسی ناقابل برداشت ہے لیکن میرا دل شکار، سیر و تفریح میں بہل سکتا ہے (سوچتا ہے) میں اپنے

لئے شکاری کپڑے بنوا لونگا۔ آج بڑی غلطی کی۔ وہ کتیا نہیں خریدی۔ خیر کیا ہوا۔ کوئی اور سہی۔ کچھ کتابیں خریدنا چاہئیں۔ اور ایک کتاب مجھے بھی تصنیف کرنا چاہئے۔ کسی نئے موضوع پر۔ ایسے موضوع پر کہ کسی نے آجتک نہ لکھی ہو۔ احمد کا خیال ہے مجھے گاؤں واپس چلنا چاہئے۔ اگر دل نے چاہا تو پھر لاہور چلا آؤنگا۔ لیکن مجھے لاہور نہ آنے دیا تو! خیر کچھ بھی سہی کبھی کبھی بوڑھے آدمیوں کی بات بھی مان لینا چاہئے۔ والدہ کو بھی اتنے دنوں سے نہیں دیکھا۔ ٹھیک ہے میں گاؤں چلا ہی چلونگا۔ مجھے خوب روپیہ خرچ کرنے کو دیں گی۔ مجھے ضرور واپس چلنا چاہئے۔ (کھڑکی کے پاس جاتا ہے) مجھے لاہور چھوڑنا پڑ رہا ہے۔ الوداع لے لاہور الوداع کتنی جلد تجھے الوداع کہنا پڑ رہا ہے۔ (آہ بھرتا ہے) لاہور کا ذرّہ ذرّہ مجھے عزیز ہے (پھر آہ بھرتا ہے) مجھے واپس جانا ہی پڑیگا۔ تاکہ میں اپنا قرض تو ادا کردوں۔ یقیناً مجھے جانا ہی چاہئے۔ (گھنٹی پھر بجتی ہے) کوئی اور بلا نازل ہوئی۔ احمد ابھی تک واپس نہیں آیا۔ معلوم نہیں کہاں بیٹھ رہا۔ (گھنٹی پھر بجتی ہے) غالباً یہ کوئی قرض خواہ نہیں ہے۔ اب تو ان لوگوں کے آنے کا وقت بھی نہیں رہا۔ قرض خواہ اس طرح گھنٹی نہیں بجاتے (گھنٹی پھر بجتی ہے) دروازہ پر جاتا ہوں مجھے جا کر دیکھنا چاہئے معلوم نہیں کون ہے۔ آخر یہ کیا بزدلی ہے۔ اب تو میں گھر جانے والا ہوں۔ (دروازہ کھولتا ہے۔ سلام اور بغل گیر ہونے کی آوازیں آتی ہیں) اوہو! تم کہاں بھائی مرزا صاحب کہئے مزاج تو اچھا ہے۔ آؤ بھی تشریف لاؤ۔

مرزا صاحب جو خیر سے زمیندار ہیں، اور ممتاز کمرہ میں داخل ہوتے ہیں۔

ارے بھئی کوٹ تو اتار دو۔ بیٹھو نا۔

ممتاز۔ (بڑے اخلاق سے) کہئے کیسے آنا ہوا۔ آپ یہاں کب تشریف لائے۔ واللہ آپ کو دیکھکر بڑی خوشی حاصل ہوئی۔ بھئی آرام سے بیٹھو، میری آنکھیں کہیں دھوکہ تو نہیں دے رہی۔ آپ سے ایسے اچانک مل کر خیال تو یہی ہو رہا ہے۔

زمیندار۔ (بیٹھتے ہوئے) مجھے ذرا دم تو لینے دو۔ ساری باتیں ابھی بتائے دیتا ہوں (اپنے چہرہ سے پسینہ پوچھتا ہے) عیش کرتے ہو یار تم تو۔

ممتاز۔ خدا گواہ ہے مرزا تمہیں دیکھکر بڑی خوشی ہوئی۔ تم نے بڑی تکلیف کی۔ ٹھیرے کہاں ہو؟

زمیندار۔ پرنس ہوٹل میں۔

ممتاز۔ ارے بھئی کب کے آئے ہوئے ہو تم؟

زمیندار۔ رات ہی تو آیا ہوں۔ راستہ بڑا خراب ہے۔ بڑی تکلیف ہوئی۔

ممتاز۔ تم نے خواہ مخواہ تکلیف کی بھلے آدمی آج تو آرام کیا ہوتا۔ ایسی کیا جلدی پڑی تھی۔ مجھے کسی سے بلوالیا ہوتا۔ خواہ مخواہ تکلیف . . . .

زمیندار۔ اماں رہنے بھی دو میں کوئی بوڑھا تھوڑی ہوں۔ (کمرہ کو دیکھتا ہے) تمہارا کمرہ بہت چھوٹا ہے۔ اور ہاں تمہاری ماں نے دعا کہی ہے۔ وہ شکایت کر رہی تھیں کہ تم انہیں خط تک نہیں لکھتے ہو۔

ممتاز۔ والدہ خیریت سے تو ہیں؟

زمیندار۔ ہاں سب خیریت ہے۔

ممتاز۔ اور گاؤں کا کیا حال چال ہے؟

زمیندار۔ سب خیریت سے ہیں۔

ممتاز۔ کب تک ٹھیرو گے؟

زمیندار۔ خدا جانے کب تک رہنا پڑے۔ میں تو بڑے ضروری کام سے آیا ہوں

ممتاز۔ (ہمدردی سے) کیسا ضروری کام؟

زمیندار۔ بہت ضروری کام تھا۔ ورنہ میں خواہ مخواہ یہ دردِ سر کیوں مول لیتا۔ مجھے تو بھئی اپنا گھر بہت پسند ہے۔ ایک گاؤں والے سے جھگڑا ہو گیا تھا۔ کمبخت نے مقدمہ دائر کر دیا ہے۔

ممتاز۔ ارے۔

زمیندار۔ اب کمبخت کو سب کھائی پی کا مزہ معلوم ہو جائیگا۔ یاد کرے گا کہ کسی سے پالا پڑا تھا۔ تم تو یہاں کسی بڑے عہدہ پر مامور ہو نا۔؟

ممتاز۔ ابھی تک تو نہیں۔ لیکن جلد ہی . . . .

زمیندار۔ خیر کوئی بات نہیں ہے۔ تم سے مجھکو بڑی مدد ملیگی۔

ممتاز۔ میری تو یہ عین خوش نصیبی ہوگی۔ کہ میں آپ کے کچھ کام آسکوں۔

زمیندار۔ ہاں کیوں نہیں (غور سے ممتاز کی طرف دیکھتا ہے) ارے بھئی چاء پینا چاہیئے۔ مجھے بڑی سردی لگ رہی ہے۔

ممتاز۔ (گھبراکر) مجھے بڑا افسوس ہے۔ چاء تو تیار نہیں اور نوکر باہر کام سے گیا ہوا ہے۔

زمیندار۔ ارے گھر میں چاء نہیں۔ معلوم ہوتا ہے تم چاء پیتے نہیں۔ تمہارے والد تو چاء کے عادی تھے۔
(ممتاز کی پریشانی کو دیکھکر) خیر کچھ مضائقہ نہیں۔

ممتاز۔ نوکر بس اب آتا ہی ہوگا ......

زمیندار۔ میرا ناک میں دم کر دیا تھا۔ آئے دن زمین کے پیچھے جھگڑتا رہتا تھا۔ میری زمین پر قبضہ جمانے کی فکر میں تھا۔ میرے کارندے نے اسے منع بھی کیا۔ لیکن وہ مانتا ہی نہ تھا۔ اس نے اپنے کھیتوں کی حد بڑھالی۔ اور اب کہتا ہے کہ وہ زمین اسی کی ہے۔ لیکن وہ مجھے دھوکہ نہیں دے سکتا۔ اسکی کیا مجال ہے۔ میں نے جب اپنی زمین پر قبضہ کرلیا۔ تو اس کا کارندہ آیا میں نے اس کو اچھی طرح ٹھونکا۔ اس پر اس کے مالک نے میرے اوپر دعویٰ ٹھونک دیا ہے۔ اس نے رپٹ میں لکھا ہے کہ میں نے سر پھاڑ ڈالا اور اس کی زمین پر زبردستی قبضہ کرلیا ہے۔ سنتے ہو! تفتیش ہوئی اور خوب مقدمہ بازی ہوئی، میرا خیال تھا کہ مقدمہ کا فیصلہ میرے حق میں ہوگا۔ لیکن اس بدمعاش نے رشوت دے دلاکر اپنے حق میں فیصلہ کرالیا۔ میں نے ہائی کورٹ میں اپیل دائر کردی ہے۔ اس نے بھی میرے خلاف اپیل کی ہے۔ لیکن اب وہ کچھ نہیں کرسکتا۔ اب خاموش تھوڑی بیٹھا رہونگا۔

ممتاز۔ واقعی یہ تو بہت بری خبر ہے

زمیندار۔ بہرحال جو ہونے والا تھا وہ ہوگیا۔ کہو تم اچھے تو رہے!

ممتاز۔ بھئی خدا کا شکر ہے۔ مجھے یہاں کسی بات کی تکلیف نہیں۔

زمیندار۔ کہو تھیٹر وٹیٹر بھی جاتے ہو۔

ممتاز۔ ہاں ہاں اکثر جاتا رہتا ہوں۔

زمیندار۔ بھئی آج مجھے بھی لے چلو

ممتاز۔ ارے یہ بھی کوئی بات ہے، بڑے شوق سے چلئے۔ شوق سے . . . . . "

زمیندار۔ میں کوئی ٹریجیڈی دیکھنا چاہتا ہوں۔ بہت خوب ڈراما ہونا چاہیئے۔

ممتاز۔ اچھی بات ہے ٹریجیڈی ہی سہی۔

زمیندار۔ آج رات کو کھانا کہاں کھاؤ گے؟

ممتاز۔ جہاں تمہارا مزاج چاہے۔

زمیندار۔ میں تو کسی انگلش ہوٹل میں کھانا چاہتا ہوں۔ (ہنستا ہے) اس وقت کچھ کھانے کو بھی موجود ہے۔

ممتاز۔ واللہ مجھے سخت شرمندگی ہے۔

زمیندار۔ (ممتاز کی طرف بڑے غور سے دیکھتے ہوئے) دیکھو ممتاز . . . .

ممتاز۔ کہو۔

زمیندار۔ تمہارے پاس کیا روپیہ نہیں رہا؟

ممتاز۔ روپیہ . . . . میرے پاس تھوڑا روپیہ تو موجود ہے۔

زمیندار۔ نہیں مجھے خیال ہوا کہ تمہارے پاس روپیہ نہیں رہا۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ تمہارے پاس کچھ کھانے کے لئے بھی موجود نہیں۔ خیر کچھ مضائقہ نہیں۔ پردیس میں ایسا ہوتا ہی ہے۔

ممتاز۔ واقعی عجیب بات ہے۔ محض اتفاق ہے۔ ملازم بھی باہر گیا ہوا ہے۔ معلوم نہیں کہاں بیٹھ رہا ہے!

زمیندار۔ وہ آتا رہے گا۔ تمہیں بھوک نہیں معلوم ہو رہی ہے۔ میری آنتیں تو قل ہواللہ پڑھ رہی ہیں۔ اور تھیٹر بھی تو چلنا ہے۔

ممتاز۔ ضرور۔ ضرور۔ تھیٹر تو ضرور چلیں گے۔

زمیندار۔ تو پھر کپڑے پہنو۔ چل کر کھانا کھائیں

ممتاز۔ تمہیں کھانا ہے تو کھالو۔ مجھے تو اس وقت بھوک نہیں معلوم ہو رہی۔

زمیندار۔ اماں رہنے بھی دو۔

ممتاز۔ نہیں بھئی نہیں۔

زمیندار۔ سنا ہے تمھاری یہاں ان لڑکیوں سے بھی ملاقات ہے جو گھوڑے کی پیٹھ پر کھڑے ہوکر سواری کرتی ہیں

ممتاز۔ ہاں ہے تو۔ وہ سرکس میں کام کرتی ہیں۔

زمیندار۔ تو کیا وہ کھڑے کھڑے گھوڑے کی سواری کرتی ہیں! صورت شکل کی کیسی ہیں؟

ممتاز۔ کافی حسین ہیں۔

زمیندار۔ خوب موٹی تازی ہونگی۔ ایں؟

ممتاز۔ نہیں کچھ ایسی موٹی بھی نہیں ہیں۔

زمیندار۔ اچھا ...... تو پھر آج میری ملاقات کرانا

ممتاز۔ اچھی بات ہے۔

(گھنٹی بجتی ہے)

ممتاز۔ (گھبرا جاتا ہے) کوئی مجھ سے ملنا چاہتا ہے ......

.. (جا کر دروازہ کھولتا ہے) ممتاز کی آواز آتی ہے' آؤ بھئی آؤ

(چھاپہ خانہ کا کلرک داخل ہوتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں کچھ تصویریں ہیں)

ممتاز۔ آپ غالباً چھاپہ خانہ سے تشریف لا رہے ہیں؟

کلرک۔ جی ہاں آپ کی تصویریں لایا ہوں۔

ممتاز۔ کون سی تصویریں؟

کلرک۔ وہی جو کل آپ نے منتخب کی تھیں۔

ممتاز۔ اہاہاہا۔ اچھا تو تم لے آئے۔ بل لائے ہو؟

کلرک۔ جی ہاں۔

ممتاز۔ (بل لیتا ہے۔ اور کھڑکی کے قریب جاتا ہے) اچھی بات ہے' اچھی بات ....

زمیندار ۔ (کلرک سے) آپ یہیں کے رہنے والے ہیں؟

کلرک ۔ (قدرے پریشان ہوتے ہوئے) جی ہاں.... میں یہیں کا رہنے والا ہوں۔

زمیندار ۔ آپ کہاں ملازم ہیں۔

کلرک ۔ میں..... آفتاب پریس میں ہوں۔

زمیندار ۔ تنخواہ پر کام کرتے ہیں؟

کلرک ۔ جی ہاں۔

زمیندار ۔ کیا ملتا ہے۔

کلرک ۔ تیس روپیہ ماہوار۔

زمیندار ۔ آپ کا نام کیا ہے؟

کلرک ۔ مجھے محمد دین کہتے ہیں۔

زمیندار ۔ محمد دین صاحب۔

ممتاز ۔ (زمیندار کے قریب آکر) دوست میں سخت نادم ہوں تمھیں ایک تکلیف دیتا ہوں براہ کرم مجھے بیس پچیس روپے صرف دو دن کے لئے قرض دے دو۔ زیادہ......

زمیندار ۔ لیکن تم کہہ رہے تھے کہ تمھارے پاس روپیہ ہے۔

ممتاز ۔ میرے پاس روپیہ ہے تو لیکن مجھے مکان کا کرایہ ادا کرنا ہے.....؟

زمیندار ۔ اچھی بات ہے ابھی دیتا ہوں۔ (جیب سے ایک تھیلی نکالتا ہے) کتنے روپیوں کی ضرورت ہے سو یا دو سو۔

ممتاز ۔ اس وقت تو مجھے صرف بیس روپے کی ضرورت ہے لیکن اگر تم دے سکتے ہو تو.....

زمیندار ۔ لو یہ دو سو ہیں۔

ممتاز ۔ واللہ میں تمھارا بہت ممنون ہوں۔ انشاءاللہ کل ہی اور زیادہ سے زیادہ پرسوں تمھارا سب روپیہ واپس کر دونگا۔ (کلرک کیطرف متوجہ ہوتا ہے) لو بھئی یہ روپیہ لو۔ اور دیکھو آج میں پھر تمھاری

دوکان پر آؤنگا۔ اور کچھ تصویریں خریدونگا۔

کلرک:۔ شکریہ! (چلا جاتا ہے)

زمیندار۔ چلو بھئی اب کھانا کھانا چاہئے

ممتاز۔ ہاں چلو بھئی چلو۔ تمھیں انگلش ہاؤس میں لئے چلتا ہوں۔ وہاں کھانا کھائیں گے۔

زمیندار۔ لیکن وہاں ناچ واچ بھی ہے کیا!

ممتاز۔ ناچ تو نہیں ہے۔

زمیندار۔ نہیں بھئی کسی ایسے ہوٹل میں لے چلو۔ جہاں ناچ بھی ہو،

ممتاز۔ اچھی بات ہے۔

(احمد داخل ہوتا ہے)

ممتاز۔ تم آ گئے۔ ملاقات ہوئی۔

احمد۔ جی ہاں، ملاقات ہوئی۔ جواب بھی لایا ہوں (ممتاز کو خط دیتا ہے)

ممتاز۔ (خط کو ہاتھ میں لے لیتا ہے، اور بے پروائی سے پڑھتا ہے) یہ بات ہے۔

احمد۔ (زمیندار سے) کہئے سرکار، مزاج تو اچھا ہے۔

زمیندار۔ (احمد سے ہاتھ ملاتے ہوئے) ہاں بھئی اچھی طرح ہوں۔ تم تو اچھی طرح سے ہو۔

احمد۔ سب خیریت ہے۔

ممتاز۔ (خط کو زمین پر پھینکتے ہوئے) یہ لوگ ذرا کام کے نہیں احمد۔ بہرحال مجھکو کپڑوں کے لئے روپیہ مل گیا ہے۔

احمد۔ حضور نئے بوٹ لاؤں۔

ممتاز۔ کیا کروگے۔ یہی ٹھیک ہیں۔

زمیندار۔ ابھی تک کپڑے نہیں پہن چکے۔ جلدی سے کوٹ پہنو

ممتاز۔ اچھی بات ہے چلو۔

زمیندار۔ ہاں بھئی چلو۔ تو پھر تم مجھے تھیٹر دکھاؤ گے نا، اور لڑکیاں بھی ......"

احمد ۔ (ممتاز سے آہستہ سے کہتے ہوئے) تو پھر حضور گاؤں کب چل رہے ہیں؟

ممتاز ۔ (زمیندار کے ساتھ باہر جاتے ہوئے) تمھارے سر پر یہ گاؤں جانے کا کیا خبط سوار ہوا ہے۔ جب دیکھو گاؤں، گاؤں۔"

(زمیندار اور ممتاز باہر چلے جاتے ہیں)

احمد۔ (ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے) یہ تو بڑی بری بات ہے (ٹھنڈی سانس بھرتا ہے۔ اور زمیندار کی طرف دیکھتے ہوئے) کیسا زمانہ آگیا ہے۔ شرافت نام کو نہیں رہی۔

(پردہ گرتا ہے)

"تورگنیف"

(ترجمہ)

یادِ ایامِ عشرتِ فانی

(جناب آل احمد صاحب سرور ایم۔اے لکچرار شعبہ اردو)

بہت دن ہوگئے پھر بھی وہی تصویر پھرتی ہے
نگاہوں میں ابھی تک وادیِ کشمیر پھرتی ہے

اُسی سرسبز وادی کے کنارے شعر کہتا ہوں
مری دنیا وہی ہے میں اُسی دنیا میں رہتا ہوں

اُسی کہسار کی ٹھنڈی ہوا کے گیت گاتا ہوں
اُسی گلزار کی دلکش فضا کے گیت گاتا ہوں

اُسی دریا کی طوفاں خیز موجیں گدگداتی ہیں
وہ خود ہنستی ہیں، اپنے ساتھ مجھکو بھی ہنساتی ہیں

مشامِ جاں میں ہے ان لالہ زاروں کی شمیم ابتک
میں سنتا ہوں، وہ پھولوں سے لپٹتی ہے نسیم ابتک

اُسی موجِ تبسم میں سنورتی ہے بہار ابتک
اس آئینہ میں پھروں دیکھتا ہوں عکسِ یار ابتک

بہت دن ہوگئے پھر بھی وہی تصویر پھرتی ہے
نگاہوں میں ابھی تک وادیِ کشمیر پھرتی ہے

نقد و تبصرہ

(الف) رسائل:-

۱۔ مجلہ عثمانیہ
۲۔ خضر راہ
۳۔ شاعر
۴۔ فولیو
۵۔ مشعل
۶۔ المنظور
۷۔ عزیز
۸۔ ایجوکیشن گزٹ

(ب) خاص نمبر:-

۹۔ اردو مسعود نمبر
۱۰۔ سالنامہ ہمایوں
۱۱۔ سالنامہ سہیلی
۱۲۔ سالنامہ عالمگیر

(ج) مطبوعات جدیدہ

۱۳۔ دکن میں اردو
۱۴۔ یادگار عالی
۱۵۔ مضامین رشید

مجلہ عثمانیہ | (طلبۂ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کا سہ ماہی رسالہ) مدیرین سید اشفاق حسین و محمد شہاب الدین
مشیر حصہ اُردو مولوی عبدالحق صاحب، عام چندہ لے، دفتر مجلہ عثمانیہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن سے مل سکتا ہے (ع)

کچھ عرصہ ہوا کہ اُردو ادب کے آسمان پر ایک نیا ستارہ طلوع ہوا اور آہستہ آہستہ اپنی ضیا پاشیوں سے دنیا والوں کو متوجہ کرنے لگا، یہ درخشاں ستارہ اُردو کے مستقبل کا پیغام تھا جو جامعہ عثمانیہ کی صورت . . . میں نمودار ہوا تھا۔

ہماری زبان اور ادب کی تاریخ میں حیدرآباد کو اکثر مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے، جب اس کا تخم مسلمان اپنی رحمت کے ساتھ اس سرزمین پر لے گئے تھے اس وقت اُنھیں گمان بھی نہ ہوگا کہ یہ سرزمین اور یہ آب و ہوا ایسی راس آئیگی کہ یہ تخم اس قدر جلد ارتقائی منازل طے کرے اور شمالی ہند کے ساتھ ساتھ لیکن کہیں زیادہ پھل پھول لائیگا بہرحال اُردو کے قدما کا زرین دور جو تاریخ کا پہلا باب ہے دکھنی ادبیات سے شروع ہوتا ہے۔

کچھ عرصہ کے بعد یہ مرکزی حیثیت دہلی کو نصیب ہوئی جس کی قسمت پر ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں کو رشک آتا تھا، زمین یہاں کی مردم خیز تھی، ہوا یہاں کی شعر و ادب کے لئے سازگار، سلاطین اور امراء کی سخاوت اور ادب نوازی اس پر اضافہ کیجئے، مختصر یہ کہ اُردو یہاں بھی خوب پھلی پھولی۔

انقلاب زمانہ نے یہ بھی ورق اُلٹا، اُردو غریب الوطن ہو کر دہلی سے نکلی، کبھی لکھنؤ میں دن گذارا کبھی مرشدآباد میں شب بسر کی، دو ایک روز رامپور کی مہمان نوازی بھی دیکھی آخر اپنے پہلے قدیمی مرکز پر جاکر دم لیا اور نکھر کر وہ رنگ و روپ پایا کہ اب پہچانی نہیں جاتی۔

اس مرکز سے اُردو کی نشر و اشاعت کا کام برابر جاری ہے، انجمن ترقی اُردو جو (بقول رشید صاحب) مولوی عبدالحق صاحب کا لمبا چوڑا تخلص ہے اور جامعہ عثمانیہ کا دارالتصنیف و الترجمہ ہمارے زمانے میں گراں قدر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ انجمن کا رسالہ اُردو ہے جس کے معیار پر لکھنے یا کہنے کی حاجت نہیں، جامعہ سے مجلہ عثمانیہ شائع ہوتا ہے جس کی جلد ۱۰ کا شمارہ ۲ و ۴ ہمارے پیش نظر ہے۔

مجلہ کی عنان ادارت طالب علموں کے ہاتھ میں ہے، مضامین میں بیشتر طلباء اور طالبات کے اور اکثر اساتذہ جامعہ کے ہیں، کل ضخامت ۱۷۰ صفحات ہے جس میں ۲۳۹ عام مضامین کے

لئے وقف کئے گئے ہیں بقیہ میں شیخ چاند مرحوم کی یاد کو تازہ کیا گیا ہے جو جامعہ کے فرزند اور اردو کے مخلص خدمتگذار تھے، افسوس کہ ان کی عمر نے وفا نہ کی اردو شعر و ادب کی ان سے بہت سی امیدیں وابستہ تھیں جن کی تکمیل باوجود ذوق اور مسلسل محنت کے وہ نہ کر سکے۔

مجلہ کا اداریہ جو صرف ۲۱ سطروں تک محدود ہے رسالے کے معیار اور ضخامت کے پیش نظر مضحکہ انگیز ہے، اسی میں ادارت کی تبدیلی، اشاعت میں غیر معمولی تعویق، شیخ چاند مرحوم کا تذکرہ، راس مسعود مرحوم کی وفات پر اظہار افسوس اور کوائف جامعہ سب کو سمو دیا ہے واقعی کوزے میں سمندر بند کر دیئے ہیں، بظاہر اس مختصر نویسی کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔

مضامین میں سرو صحرا (ڈاکٹر محی الدین زور) محفل سخن کی چند شمعین (میر محمد علی خاں میکش) بہت دلچسپ ہیں، خصوصاً محفل سخن کی چند شمعین، ملاحظہ ہو:۔

"شاعر نہیں مگر شاعر بن گئے ہیں، ان کی ایک نظم جو بحر کی پابندیوں سے بہت آزاد تھی ناشناسوں کی محفلوں میں ایسی مقبول ہوئی کہ ان کو غلط فہمی ہو گئی، وہ لکھتے ہیں اور لکھے جاتے ہیں، کہے جاتے ہیں اور گاتے ہیں، گردن کے خم اور انگلیوں کے ارتعاش کو ترنم سمجھتے ہیں اور ترنم کو شاعری۔

دوسری تصویر جو بالکل واضح ہے اس سے بھی دلچسپ ہے:۔

" لکھ لیتے ہیں، قدیم دبستان کے پیرو ہیں لیکن سینگ کٹا کر بچھڑوں میں مل گئے ہیں۔ بعض وقت نہ ہنس کی چال باقی رہتی ہے اور نہ کوے کی، صرف پھدکنے لگتے ہیں پہلے تحت اللفظ سناتے تھے، اب گانے لگے ہیں اور گانے میں فن کارانہ اتار چڑھاؤ کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ خود ساختہ "سخن شناس" ہیں۔ اپنی ہر چیز کو توصیفی تمہید کے ساتھ پیش کرتے ہیں لیکن دوسروں کے شاہکاروں کو بھی قابل ستائش نہیں سمجھتے، ان کی شاعری بے رنگ، ہر رنگ ہے اس لئے "معجون مرکب" بن کر رہ گئی ہے۔

اس مضمون میں اس قسم کی بیس تصویریں ہیں جن میں طرز ادا نے خوب رنگ بھرا ہے۔

قانون بین الاقوامی کے چند نکات (پروفیسر ہارون خاں شروانی) جنگ اور زہریلی گیس (خادم حسین قریشی) بھی مفید معلومات بہم پہنچاتے ہیں۔

چار مضامین اُردو کی تاریخ سے متعلق ہیں، اور چاروں نامکمل اور سطحی ہیں، جو آج نوجوان ادیب ہیں وہی کل پختہ مشق محقق ہونگے، اس منزل میں جو کچھ لکھا جائے۔ محنت اور تحقیق کے بعد لکھا جائے، اگر کوئی اتفاقی فروگذاشت پھر بھی رہ جائے تو خیر قابل معافی ہیں، لیکن ایسی لغزشیں جو صرف بے اعتنائی اور بے نیازی کا نتیجہ ہوں قابل گرفت ہیں۔

ایک مضمون "تاریخ ادب اُردو کے چند قدیم ماخذ ہیں" جن میں فاضل مضمون نگار نے اُردو کے بعض قدیم تذکروں کا ذکر کیا ہے اور سلسلہ میں نکات الشعرا، مخزن نکات، چمنستان شعرا، تذکرہ شعرائے اُردو (میر حسن) مجموعہ نغز، تذکرہ گلزار ابراہیم و گلشن ہند طبقات الشعرائے ہند اور آب حیات کا نام گنایا ہے۔ اسی عنوان پر ایک مضمون سالنامہ سہیل ۱۹۳۶ء میں علی گڑھ سے شائع ہوا تھا جس میں اُردو کے تمام ماخذوں کی مکمل فہرست موجود تھی۔ اس مضمون میں صرف بعض مشہور مطبوعہ تذکروں کو لے لیا ہے، اکثر اہم قلمی تذکروں کو مثلاً تحفۃ الشعراء افضل قاقشال (علی گڑھ میگزین میں شائع ہو چکا ہے) بہار و خزاں مرتبہ بہار الدین حسین عروج، تذکرہ قدرت اللہ قدرت وغیرہم کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ حال آنکہ یہ نسخے کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد میں ہی موجود ہیں اور راقم کی نظر سے گذر چکے ہیں۔

بعض بیانات سے شبہ ہوتا ہے کہ مضمون لکھتے وقت جدید تحقیقات کو پیش نظر نہیں رکھا گیا ہے۔ مثلاً سعدی دکھنی اور شیرازی کے مسئلہ میں دکنی ہونے پر اتفاق کیا ہے۔ حالانکہ یہ سعدی کاکوروی تھا جن کے متعلق حال میں کئی مفصل مضامین، (سالنامہ یادگار ۱۹۳۴ء) علی گڑھ میگزین (۱۹۳۵ء) میں شایع ہو چکے ہیں۔

دوسرا مضمون "مغربی تصانیف کے اُردو تراجم ۱۹۱۷ء کے بعد" ہے، یہ فہرست بھی نامکمل ہے اور اضافہ کی گنجایش بھی ہے اور آسانی بھی۔

تیسرا مضمون "وجہی" پر ہے جس کے متعلق یورپ میں دکھنی مخطوطات، دکن میں اُردو، اُردو شہ پارے میں کافی صراحت موجود ہے لیکن یہ مضمون مولوی عبدالحق صاحب کے مقدمہ سب رس (مطبوعہ انجمن ترقی اُردو) کا ملخص ہے جس کا کم از کم اعتراف ضروری تھا۔

چوتھا مضمون "اُردو ادب کا مرکز" ہے۔ پہلا مرکز جہاں اُردو نے ارتقا حاصل کیا پنجاب قرار دیا گیا ہے۔

یہ صحیح نہیں، پنجاب سے پہلے اُردو کی داغ بیل سندھ میں پڑ چکی تھی (علامہ سید سلیمان ندوی اور نواب صدر یار جنگ بہادر حبیب الرحمٰن خاں شروانی اس موضوع پر بصیرت افروز مقالات پڑھ چکے ہیں جو انجمن اُردوئے معلیٰ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی طرف سے مقالات اُردو کے عنوان سے شائع ہوئے ہیں)۔ بعض دیگر بیانات بھی محل اعتراض ہیں۔

"الغرض جب وجہی، ابن نشاطی، غواصی وغیرہ دکنی مصنفین کی تصنیفیں دہلی پہونچیں تو وہاں کے ادیب اور انشا پرداز دنگ رہ گئے"۔ اس معلومات کا ماخذ معلوم نہیں، کم از کم جس قدر مطبوعہ اور قلمی تذکرے اور تاریخیں ہماری نظر سے گذریں ان میں موجود نہیں، نہ کسی معتبر محقق ادیب یا انشا پرداز سے سُنا گیا۔

دوسرا بیان:۔

"شمالی ہندوالوں نے صرف دکنی شعرا کی تقلید میں اُردو زبان میں شعر کہنا شروع کیا"۔
یہ دکھنی حضرات کا عام شیوہ ہے جس کی ہمیں شکایت نہیں، لیکن تاریخ اور تذکروں کی روشنی میں واقعات یہی کہتے ہیں کہ ولی سے بہت پہلے شمالی ہند میں کہنے والے اُردو میں اچھے اچھے شعر کہہ چکے تھے۔
عصر جدید میں اُردو کے مرکزوں میں صرف پنجاب، حیدرآباد، الہ آباد، لکھنؤ، دلی اور آگرہ کو شمار کیا ہے۔ علی گڑھ والوں کی نیت پر آپ شبہ کریں یا نہ کریں اس کا اعتراف تو جبراً و قہراً کرنا ہی پڑیگا کہ اُردو کی نشاۃ الثانیہ علی گڑھ سے ہوئی اور اب بھی اسی دبستاں سے اُردو کا ستھرا مذاق رکھنے والے پیدا ہو رہے ہیں،
آگرہ کو سیماب کی وساطت سے اُردو کا جدید مرکز کہا ہے، یہ بیان بھی کس قدر مضحکہ انگیز ہے۔

"سیماب اکبرآبادی کی کوششوں کی بدولت یہاں کا اسکول بہت کامیاب ہو رہا ہے' ان کا دعویٰ ہے کہ وہ آگرہ کو مرکز ادب ہندوستان بنا کر رہینگے اور یہ بھی کہ اُردو وہیں کی پیداوار ہے اور وہیں رہیگی"

ہمیں مضمون نگار اور جناب سیماب دونوں سے ہمدردی ہے لیکن سمجھدار آدمی ایسے بیانات پر صرف مسکرا دیتے ہیں۔
نظموں کا معیار بھی برا نہیں اور بحیثیت مجموعی مجلہ کا یہ نمبر کامیاب ہے۔

(لیمث)

۵

شاعر

(ایڈیٹر اعجاز صدیقی اکبرآبادی)

ماہانہ رسالہ ہے آگرہ سے شائع ہوتا ہے۔ سائز کتابی ہے۔ سرورق معمولی۔ لکھائی چھپائی معمولی، صفحات پر مشتمل ہے۔ مضامین کا کوئی خاص معیار نہیں ہے، مگر ایڈیٹر صاحب کی خاص تمنا رسالہ کو ادبی بنانے کی معلوم ہوتی ہے۔ پرچہ زیر تنقید میں اکثر مضامین ناقدانہ ہیں مثلاً اردو زبان و ادب اور دوسرے مضمون اسی عنوان سے ایک جگہ پر "اُردو میں اول تو اعلیٰ علمی و ادبی کتابوں ہی کا فقدان ہے اور جو گنتی کے دو چار ہیں بھی وہ اور جنل نہیں بلکہ ترجمے ہیں" یہاں پر شاید مضمون نگار کے مطالعہ کا فقدان ہے علم و ادب کا نہیں۔ دوسری جگہ پر "اُردو رسائل میں" "نگار، اُردو، ہمایوں، ہندوستانی اور شاعر شایع ہونیکے علاوہ اور کوئی ایسا رسالہ ہی نہیں جسکے مطالعہ سے سوائے تضیع اوقات اوقات کے کچھ حاصل ہو سکے۔ 'ساقی' میں البتہ کبھی کبھی عمدہ مضامین شائع ہوتے ہیں مگر بہت کم تعداد میں۔ 'نیرنگ خیال' 'عالمگیر' وغیرہ میں شاذونادر ہی علمی و ادبی مضامین دیکھنے میں آتے ہیں" اس موقع پر حضرت کی معلومات کا علم ہوتا ہے اور آپکی غیر محدود معلومات میں اضافہ کی کوششیں کرتے ہوئے ہم انکو چند اور اُردو کے علمی اور ادبی رسائل کا نام گنانا چاہتے ہیں۔ وہ یہ ہیں۔ معارف۔ جامعہ۔ علی گڑھ میگزین۔ ادبی دنیا وغیرہ وغیرہ۔ ہم کو آپکے ساتھ ہمدردی بھی ہے کہ آپکے ذوق ادبی نے کبھی ان رسائل کی طرف متوجہ ہونیکا موقع ہی نہیں دیا ہے۔ مسلم یونیورسٹی کے متعلق فرماتے ہیں۔ "ہر لحاظ سے مسلمانوں کی تو نہیں البتہ انگریزوں کی یونیورسٹی بن گئی ہے۔ رپورٹیں انگریزی میں شایع ہوتی ہیں۔ تقریریں بھی انگریزی میں ہوتی ہیں۔ میں حیران ہوں کہ جب مسلمانوں کی اپنی درسگاہ اُردو کیساتھ سوتیلی ماں کا سا سلوک کر رہی ہے تو پھر مسلمانوں کو کیا حق حاصل ہے کہ وہ ہندوؤں سے شکایت کریں کہ وہ اُردو کی مخالفت کر رہے ہیں"۔ ہم آپکو تسلی دینا چاہتے ہیں کہ آپکو حیران ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، آیئے اور دیکھئے کہ مسلم یونیورسٹی میں اُردو کو ترقی دینے کے کیا کیا ذرائع مہیا کئے گئے ہیں اور یہاں پر ادب اور اُردو کے صحیح حامیوں کی تعداد آپکی وسعت خیال سے کہیں زیادہ ہے موجودہ شعرا کا ذکر فرماتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "مری ذاتی رائے یہی ہے کہ علامہ سیماب اور ڈاکٹر اقبال کو چھوڑتے ہوئے باقی حضرات نے اخلاقیات میں کوئی حصہ نہیں لیا"۔ آپکی ذاتی رائے نے تو یہاں پر ستم ہی کر دیا اور اس تقابل کی داد نہیں دی جا سکتی

اُردو رسائل کے ایڈیٹروں پر تنقید فرماتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"اگر ہندوستان کے ایڈیٹروں کی تعلیم و تربیت کا کوئی بندوبست ہوتا تو پھر اس بات کا رونا ہی کیا تھا کہ ہمارا مذاق پست ہو رہا ہے ...... " اعجاز صاحب آجکل ہر وہ شخص جسے اُردو لکھنا آتی ہے اور جس سے موت بھی بچکر گذرتی ہے ایڈیٹر بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُردو رسائل اور جرائد وغیرہ کے ایڈیٹر زیادہ تر جاہل یا نیم جاہل ہوتے ہیں وہ اُردو زبان کے لئے ایک خطرہ بنے ہوئے ہیں"

ہم بتانا چاہتے ہیں کہ اس میں اہل مضمون کا کوئی قصور نہیں کیونکہ وہ تو پہلے ہی اُردو رسائل تعداد گنا چکے ہیں اس لئے یہ غلطی ہوئی البتہ انداز تخاطب میں مخاطب سے جس پہلو سے اعتراف شکست کرانا چاہتے ہیں اس کے ہم قائل ہیں۔

دوسرا مضمون

اُردو زبان و ادب کا رخ

مضمون نگار ایک جگہ پر تحریر فرماتے ہیں "اُردو صحافت ہنوز رکیک و متبذل دور سے نہیں نکلی اور ہمیں بہت کچھ اس کا خمیازہ بھگتنا پڑ رہا ہے اس بات میں اصلاح کی توقعات موہوم ہیں" ہم اس موقع پر اتنا ہی لکھکر اکتفا کریں گے۔ ع

"اُسے کیا خبر کہ کیا ہے رہ و رسم شاہبازی"

اُردو کی کتب کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں "پنجاب سے جو اُردو کتب شائع ہوئیں وہ اُردو ادب کو بجائے ترقی کے تنزل کی جانب لے جا رہی ہیں"۔

شاید بانگ درا، ضرب کلیم۔ وغیرہ ایسا ہی کر رہے ہوں۔

مدیران صاحبان کے متعلق لکھتے ہیں "میرا ذاتی تجربہ ہے کہ اُردو جرائد کے مدیر اکثر وہ لوگ ہیں جنھیں اپنی ناقابلیت کی وجہ سے دوسری شکل میں قوت لایموت حاصل کرنا بھی دشوار ہوتا۔ اس کے متعلق ہم وہی کہہ سکتے ہیں جو اکثر مدیران کے سلسلے میں کہہ چکے ہیں"۔

ایک مضمون اُردو پر ایک نظر بھی انھیں تمام صفات کا حامل ہے اور اس دعویٰ بے دلیل کی تکرار باقی اور مضامین معمولی ہیں۔ نظم کے لحاظ سے بعض نظمیں اچھی ہیں خصوصاً "تیر" حصہ نظم کے اعتبار سے شاعر موجودہ زمانہ کا شاعر ہے یا "مشاعرہ" (انجم صدیقی)

(نوٹ) شاعر پر یہ تبصرہ میرے عزیز تقی الدین انجم صدیقی نے لکھا ہے۔ مجھ عرصہ سے بعض رسائل میں دلّی اور لکھنؤ اسکول کے علاوہ آگرہ کے دبستان شاعری کا بھی نام نظر آنے لگا ہے اور اس کارواں کے میر کارواں سیماب صاحب بنائے گئے ہیں، یہاں "پیران نمی پرند و مریدان می پرانند" کا مسئلہ نہیں، یہاں 'پیران پرند' اور "مریدان می پرانند"

دلّی اور لکھنؤ کا امتیاز چند خصوصیات کی بنا، پر قایم ہوا تھا، لکھنؤ والوں نے شاعری میں ایک جدید طرز کی بنا ڈالی محاورے کو درست کیا اور زبان کو مانجھا معاملہ بندی اور خارجی واقعات اشیائے متعلقہ حسن پر زیادہ زور دیا۔ اس طرح دلّی اور لکھنؤ میں خاص فرق نمایاں ہوگیا، جہاں تک ہم نے مطالعہ کیا ہے سیماب صاحب اور ان کے تلامذہ شاعر ضرور ہیں اور ممکن ہے بعض ان کو بلند پایہ شعرا، میں شمار کریں لیکن انھیں ناسخ اور تلامذہ ناسخ کی شان حاصل نہیں، تاہم انھیں علامہ اقبال کے برابر جگہ دے سکتے ہیں جیسا کہ شاعر کی زیر تبصرہ اشاعت میں ایک فاضل مضمون نگار اور شاید سیماب صاحب کے شاگرد نے کیا ہے۔ اقبال جس جگہ کھڑے ہیں وہاں سیماب کا تو شمار کیا بڑے بڑے شعرا رکے پر جلتے ہیں۔ سیماب صاحب کے پرستار اگر انکو انکی جگہ پر چھوڑ دیں تو ہم پر اور خود اپنے آپ پر احسان فرمائنگے۔ میگزین کی کسی آئندہ اشاعت میں ہم اس مسئلہ پر اپنے خیال کا تفصیل کے ساتھ اظہار کریں گے۔

(لیث)

خضر راہ | چیف اڈیٹر حکیم محمد یوسف حسن، مقام اشاعت دفتر خضر راہ بارود خانہ اسٹریٹ لاہور۔ فی پرچہ ۳ر

کاغذ طباعت کتابت بہت خراب (صرف مردوں کے لئے) جنوری نمبر صفحہ ۳ پر خضر راہ کا مقصد ملاحظہ ہو۔۔

"خضر راہ کے ناظرین یہ سمجھ لیں کہ ہمارے پرچے کا مقصد نہ عریاں نویسی ہے نہ عریاں نگاری کی حوصلہ افزائی یہ صرف فنی پرچہ ہے جس میں آرٹ، جالبات، حسن و جمال، ورزش وصحت، فن کاری، آپ بیتیاں، سچی کہانیاں، سیکشول سائنس، طبی معلومات، جنسی مقالات وغیرہ درج ہوتے ہیں۔ اس لئے اس پرچہ کو اسی نکتہ نظر سے مطالعہ کرنا چاہیئے"

خضر راہ کے مقاصد بیشک بلند اور مفید ہو سکتے تھے لیکن ہندوستان میں نہیں، شاید فرانس اور انگلستان میں جہاں ترقی تہذیب اور عریانی (Nudism) کو مترادف سمجھا جاتا ہے ' اسے ہندوستان کی قدامت پسندی کے لئے یا ملائیت بہر حال جو بھی ہو ہم ابھی اس کے متحمل نہیں ہو سکتے عریاں نگاری کا مہذب اور مغربی نام سیکشول سائنس ہے، اردو کے خدمتگذاروں کے سامنے میدان بہت وسیع ہے، بہت سے علوم وفنون پر لکھنے لکھانے کی ضرورت ہے' اس فن کی ضرورت بہت بعد آئیگی۔

(Nudism) عریانی کا سیلاب یورپ میں بڑی سرعت سے بڑھ رہا ہے اس کا رخ ہندوستان کی طرف پھیرنا کچھ مستحسن نہیں، اس میں جو محنت وقت اور سرمایہ صرف ہو اس کو کسی دوسرے مفید کام پر لگایا جا سکتا ہے۔

مضامین بیشتر عامیانہ ہیں، اشتہارات خصوصاً وہ اشتہار جو آخری صفحہ پر دیا گیا ہے (انگریزی میں) فحش ہے اردو صحافت کے دامن پر اس رسالہ کا وجود بدنما دھبہ ہے خدا کرے کہ ذمہ دار حضرات بھی اسے محسوس کریں ۔

(لیمث)

نوٹ:۔ یہ تبصرہ خضر راہ کے موجودہ پرچوں کے متعلق ہے۔ اس سے پہلے پرچہ کے متعلق ہمارے بیش رو نے تعریف کی تھی۔ لیکن اب حالت زیادہ قابل رحم معلوم ہوئی، اور اس تبصرہ کی ضرورت پیش آئی۔

المنظور | رئیس التحریر محمد عبد الواحد عثمانی فاضل ادب، بیادگار مولانا عبد الماجد بدایونی مرحوم قیمت سالانہ ؎ دفتر المنظور کلاک ٹاور بدایوں۔

المنظور بدایوں سے مولانا عبد الماجد مرحوم کی یادگار میں جاری ہوا ہے جس کی ادارت کے فرائض مولوی عبد الواحد صاحب فاضل ادب مولانا مرحوم کے صاحبزادے کے سپرد ہیں، رسالہ ابھی ابتدائی منازل میں ہے، معیار کو زیادہ بلند کرنے کی ضرورت ہے۔ کبھی کبھی دو ایک اچھے مضامین اور نظمیں شائع ہوجاتی ہیں، کاغذ، اور طباعت پر ذرا زیادہ توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

(لیث)

فولیو | فورمین کرسچین کالج لاہور کا رسالہ کل ضخامت ۶۶ صفحات ۵ زبانوں میں مضامین ہیں اُردو کو ۲۲ صفحے اور انگریزی کو ۳۰ صفحات وقف کئے گئے ہیں۔ مدیر حصہ اُردو طاہر غلام ناصر خاں، ایڈیٹوریل بہت عامیانہ بلکہ سوقیانہ ہے۔ مضامین کا معیار اتنا پست کہ آجتک کسی رسالہ کا نہیں دیکھا۔ ایک علمی ادارہ سے ایسے رسالہ کی اشاعت ذمہ دار اصحاب کی نگرانی میں حیرت کا مقام ہے۔

(لیث)

مشعل | ایڈیٹر مفتی عزیز الرحمٰن بی۔اے۔بی۔ٹی۔ایس۔ مقام اشاعت گورنمنٹ ٹریننگ اسکول (مردانہ) پشاور۔ چندہ سالانہ عہ فی کاپی ۲ر، کاغذ، طباعت، کتابت معمولی، شاید سہ ماہی رسالہ ہے اس کی صراحت نہیں،

مشعل صوبہ سرحد کا واحد تعلیمی مجلہ ہے اور اس دور دراز علاقہ میں اُردو کی شمع روشن کئے ہوئے ہر اس وقت اُردو کے خدمتگذاروں کو یہ احساس ہے کہ ہندوستان کے ہر حصے میں اُردو کی ترویج واشاعت کا کام شروع کیا جائے پشاور میں ایک اُردو رسالہ کا وجود اس نظر سے نیک فال ہے اور ہم گورنمنٹ ٹریننگ اسکول پشاور والوں کے ممنون ہیں کہ اُنھوں نے اس نازک وقت میں اپنی ذمہ داریوں کے احساس کا ثبوت دیا ہے۔

مجلہ زیر نظر (جنوری نمبر ۳۳ء) میں افتتاحیہ یا شذرات "واردھا کی تعلیمی کانفرس" سے متعلق ہے اس کی مختصر روئداد اور آئندہ پروگرام کی طرف بھی مختصر اشارے ہیں۔

تعلیمی مضامین میں "کامیاب مطالعہ" "حافظہ اور اس کی تربیت" مدرس کی تعریف اور کمرہ تعلیم میں اس کی حیثیت، کافی محنت سے لکھے گئے ہیں۔ "صوبہ سرحد میں مخلوط پرائمری تعلیم کی ضرورت" "صوبہ سرحد اور صنعتی تعلیم" "پرائمری مدارس میں مذہبی تعلیم کی ضرورت" "صوبہ سرحد میں تعلیم کس طرح پھیلائی جا سکتی ہے" بھی اچھے مضمون ہیں اور دلچسپ۔

فاضل مدیر اگر بیرون پشاور سے بھی تعلیمی مضامین حاصل کریں اور رسالہ کے حجم کو بڑھا دیں تو مشعل ہندوستان کے تعلیمی رسالوں میں خاصا مرتبہ حاصل کر سکتا ہے۔

(لیث)

عزیز میاں صاحب جارج اسلامیہ انٹرمیڈیٹ کالج گورکھپور کا ماہانہ رسالہ، ایڈیٹر بدیع الزماں اعظمی کاغذ طباعت، طباعت بہت خراب ضخامت ۴۰ صفحات (ماہ نومبر و دسمبر) اس رسالے کے سرپرستوں، مدیران، اور معاون مدیران کی فہرست تو خاصی طویل ہے لیکن رسالے کا معیار انٹرمیڈیٹ کالج تو کیا کسی اسکول کے لئے بھی موزوں نہیں۔ مضامین ایسے ہیں جو نہ بچوں کیلئے مفید ہیں اور نہ بڑوں کے لئے دلچسپ، موجودہ نمبر میں زیادہ تر مضامین عید پر ہیں لیکن ان میں سے ایک بھی معیاری نہیں۔ تعلیمی اداروں کو اپنے رسالے اور مجلہ بڑی احتیاط سے مرتب کرنا چاہیئے، ان اسکولوں کالجوں میں پڑھے لکھے، لکھنے والے اور ہدایات دینے والے موجود ہوتے ہیں ان کے باوجود اگر رسالہ کی حیثیت قابل گرفت ہو جائے تو سوائے لاپرواہی کے اور کسے الزام دیا جائے۔

(لیث)

ایجوکیشن گزٹ، جالندھر ادارہ (۱) سید عابد علی عابد ایم۔ اے، ایم۔ او۔ ایل، ایل۔ ایل۔ بی۔

(۲) پروفیسر رام سروپ صاحب کوشل، ایم۔ اے۔

(۳) ایم۔ ایس قریشی اسکوائر ایم۔ اے، بی۔ ٹی۔

(۴) طاہر عباسی جالندھری

سالانہ چندہ ۳ روپے فی پرچہ ۵/، طباعت، کتابت اور کاغذ معمولی نام سے معلوم ہوتا ہے کہ تعلیمی رسالہ ہوگا، لیکن زیر تبصرہ اشاعت دسمبر ۳۲ء میں بھی ایک بھی تعلیمی مضمون نہیں، حصہ نثر کا معیار بیحد پست ہے نظم میں شانگ یاجو ایک چینی نظم کا ترجمہ ہے اور ماہر القادری کی غزل اچھی ہیں، نثر میں صرف ایک مضمون ذوقؔ اور غالبؔ کے سہروں کا موازنہ ہے جو بہت بیش پا افتادہ اور فرسودہ موضوع ہے۔

علامہ اقبال کے عنوان سے طاہر عباسی صاحب نے ملک وقوم سے اپیل کی ہے کہ علامہ موصوف کی شاعری، فلسفہ، اور پیغام کو سمجھنے اور ان کے کلام کے مطالعہ کو عام کرنے کے لئے ایک مستقل ادارہ قائم ہونا چاہیئے۔ یہ ضرورت ملک کو عرصے سے محسوس ہو رہی ہے کہ اکثر مقامات پر (مثلاً علی گڑھ) اقبال اکیڈمی کا عمل زیر غور ہے۔ علی گڑھ ہر اس تحریک میں دلچسپی لینے کو تیار ہے جس کا تعلق علامہ اقبالؔ کی ذات اور شاعری سے

ہو۔ میگزین کی آئندہ اشاعت بھی علامہ موصوف کے نام سے منسوب ہوگی اور ۹ جنوری کو علی گڑھ میں یوم اقبال بھی منایا گیا تھا۔

(لیث)

خاص نمبر

اردو مسعود نمبر

رسالہ اردو کا اکتوبر نمبر مسعود نمبر کے نام سے شائع ہوا ہے۔ سر راس مسعود مرحوم مختلف حیثیتوں کے مالک تھے، وہ سید محمود کے بیٹے اور سر سید کے پوتے تھے، دادا سے انھوں نے درد قومی، ورثہ میں پایا اور والد سے ذہانت اور حافظہ، غرض اس عہد کے مسلمانوں میں وہ منفرد تھے، ان کی ناوقت وفات سے ملک و قوم کو جو صدمہ ہوا اس کی تلافی ممکن نہیں، بقول ایک دوست کے ہندوستان میں فاضل اور ادیب، مقرر اور مدبر، سیاست داں اور ماہر تعلیم سب کچھ پیدا ہونگے لیکن دوسرا مسعود پیدا نہ ہوگا۔

مرحوم انجمن ترقی اردو کے صدر تھے اور اردو کی نشر و اشاعت میں ہمیشہ عملی سرگرمی کا اظہار کرتے رہے، انتخاب زریں (جو متقدمین متوسطین اور متاخرین کا مختصر تذکرہ ہے) گارس ڈٹاسی کے فرنچ خطبات کا ترجمہ اور جاپان کا تعلیمی نظم و نسق مرحوم کی یادگار ہیں انجمن ترقی اردو نے اپنے اس محسن کی یاد کو مسعود نمبر میں تازہ کیا ہے۔

اُردو پر کسی تبصرہ کی حاجت نہیں، اس کے لئے انجمن کا کام اور عبدالحق صاحب کا نام ضمانت ہے، قابل ذکر چیزوں علامہ اقبال کی ایک نظم مرحوم کی وفات پر شامل ہے دیگر مضامین بھی بیحد دلچسپ اور قابل قدر ہیں۔

ہمایوں سالگرہ نمبر

ہمایوں پنجاب کے رسالوں میں نسبتاً ستھرا اور بلند پایہ ادب پابندی وقت کے ساتھ شائع کرتا رہتا ہے، سال کی ابتدا میں ایک سالگرہ نمبر بھی پیش کیا جاتا ہے، ۱۹۳۸ء کے سالنامہ میں بعض چیزیں بہت اچھی ہیں مثلاً غالب اور بیدل افسانوں میں نیا قانون بھی دلچسپ ہے۔ فلک پیما کا ڈرامہ نیمو، ان کے خاص طرز کا آئینہ ہے۔ عبدالقادر صاحب سروری کا مضمون پردہ بھی برا نہیں، نظموں کا معیار زیادہ بلند نہیں، تصاویر کے انتخاب میں بھی کوئی خاص چیز

نظر نہیں آتی۔

سہیلی سالنامہ (دستکاری نمبر) اس سال سہیلی نے اپنا دستکاری نمبر بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے۔ علاوہ علمی، ادبی اور تاریخی مضامین کے دستکاری کے مختلف نمونے اور ان پر مختصر تشریحی بیانات شامل ہیں جو شریف بیبیوں اور بچیوں کو "کلب اور بال روم" کی بجائے فرصت کے اوقات اس دلچسپ اور بکار آمد مشغلے میں گذارنا سکھاتے ہیں۔ بعض نمونے بہت نفیس ہیں اور دلچسپی کے علاوہ گھر کی زینت بھی بڑھا سکتے ہیں۔

مضامین میں مسلم خواتین کی جنگی خدمات، خواتین اسلام کی تاریخی حیثیت، ام المصریان سبق آموز اور دلچسپ ہیں، افسانوں کا معیار زیادہ بلند نہیں البتہ نظمیں بہت پاکیزہ اور ستھری ہیں خصوصاً مرد و عورت (صوفی عورت)، مینہ جانی جو ایک لوری کے طرز میں لکھی گئی ہے بیحد رواں اور شگفتہ ہے سہیلی کی ناظرات کرخوش و خرم بچوں کی ہنستی روتی تصویریں بھی قابل دید ہیں، مجموعی حیثیت سے سالنامہ کامیاب ہے۔

عالمگیر سالنامہ عالمگیر بھی عموماً سال کے آخر میں اپنا خاص نمبر شائع کرتا ہے، اس سال سرورق بدل دیا گیا ہے اور نیا نمونہ جو منتخب کیا گیا ہے بہت دیدہ زیب ہے مضامین کے اعتبار سے عالمگیر کا معیار روز بروز ترقی کی بجائے تنزل کی طرف مائل ہے، زیر نظر نمبر میں بھی بعض مضامین بالکل سطحی اور تشنہ ہیں مثلاً اردو کی تاریخ پر جو مضمون ہے اس میں پیش پا افتادہ اور فرسودہ روایات کا اعادہ کیا گیا ہے، اردو کی تاریخ زبان و ادب پر جو تحقیقی کام ہو رہا ہے اور ہو چکا ہے اس کی پیش نظر ایسے مضامین محنت اور مطالعہ کے بعد لکھے جائیں تو مناسب ہے،

افسانوں کا معیار بھی معمولی ہے، نظموں میں ایک آدہ نظم البتہ دلچسپ ہے۔ تصویریں نہ ادب سے تعلق رکھتی ہیں اور نہ آرٹ سے، ان کے انتخاب میں بڑی لاپرواہی سے کام کیا گیا ہے

ضرورت ہے کہ اردو رسالے اپنے معیار کو زیادہ بلند کریں، اس کا مطلب یہ نہیں نہ صرف تحقیقی اور تنقیدی ٹھوس مضامین، اشاعت کے قابل ہیں اور انھیں کو رسالوں میں جگہ ملنا چاہئے۔ افسانوی ادب، ڈراموں اور نظموں میں بھی ستھرا اور بلند پایہ معیار قائم کیا جا سکتا ہے۔

۱۵

پنجاب کی آب وہوا رسالوں اور خاص نمبروں کے لئے بالخصوص سازگار ہے، اگر ارباب ذوق اس طرف متوجہ ہوں تو یہ بات کچھ زیادہ دشوار نہیں۔

(لیاث)

مطبوعاتِ جدیدہ

دکن میں اردو ۔ مؤلفہ نصیرالدین ہاشمی، طبع سوئم صفحات ۵۶۸ قیمت ہے ناشر مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن ۔

اب سے کچھ دن پہلے تک اُردو کی عمر کو گھٹا کر بتانے کا رواج تھا اور بعض دوستوں کو اب بھی اس پر اصرار ہے، بات صرف یہ ہے کہ اُردو کا ادب القدما، عوام کی دسترس سے باہر ہے ورنہ نظم اور نثر کے جو نمونے اب سے ساڑھے تین سو سال پہلے کی دکھنی میں موجود ہیں ان کے مطالعہ سے خیال کو وسعت دیکر کہہ سکتے ہیں کہ یہ زبان کم عمر ضرور ہے لیکن ایسی بھی گئی گزری نہیں کہ " اپنی بڑی بوڑھی ثقہ بہنوں یعنی دنیا کی دیگر علمی زبانوں " سے آنکھ نہ ملا سکے ۔

دکن میں اُردو کا موضوع بھی یہی ہے جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، نصیرالدین صاحب ہاشمی ان مخصوص نوجوانوں میں ہیں جن کی مساعی جمیلہ نے دکھنی ادبیات کے مطالعہ کو ترقی دی ہے، یورپ میں دکھنی مخطوطات بھی اسی سلسلہ کی ایک دوسری کڑی ہے جو ہاشمی صاحب نے اپنے قیام یورپ کے زمانہ میں مرتب کی۔ آخر الذکر کتاب بھی ہماری زبان کی تحقیقی کتابوں میں بڑا درجہ رکھتی ہے ۔

دکن میں اُردو اب تیسری مرتبہ طبع ہوئی ہے۔ اس سے اس کی مقبولیت کا اندازہ ہو سکتا ہے ۔ موجودہ طبع میں کتاب کی ترتیب بالکل بدل دی گئی ہے اور اُردو کی ابتدا، سے مختصر بحث کرنے کے بعد بلحاظ ارتقا رسات تدریجی دور قایم کئے گئے ہیں۔ بہمنی اُردو (۷۴۸ھ سے ۹۰۰ھ) قطب شاہی وعادل شاہی اُردو (۹۰۰ تا ۱۱۰۰ھ) مغلیہ اُردو (۱۱۰۰ تا ۱۱۶۰ھ) سلطنت آصفیہ اور اُردو کے عنوانات سے دکن کے قدیم اور جدید، مرحومین اور موجودہ شعراء، نثار، رسائل اور اخبارات کے اڈیٹر صاحبان کا تذکرہ شامل ہے، کتاب کی ترتیب میں بھی سلیقہ کو ملحوظ رکھا ہے ۔ کتابت اچھی ہے، کاغذ اور طباعت کتاب کے معیار کی نہیں قیمت اس کی ضخامت کو پیش نظر رکھتے ہوئے کچھ زیادہ نہیں ۔

اُردو کی ابتدا، کے متعلق مؤلف نے چار نظریئے پیش کئے ہیں ۔

(۱) اس کی ابتدا، پنجاب سے ہوئی ۔ (۲) اس کی ابتدا، سندھ سے ہوئی (۳) اس کی ابتدا، دکن سے

ہوئی ۔ (۴) اس کی ابتدا اردو آبہ گنگا جمنا سے ہوئی ۔

ان میں وہ پہلے تو سندھ اور دکن دونوں میں اُردو کی ابتدا کے امکان کو قبول کرتے ہیں اور پھر سندھ کو خارج کر دیتے ہیں اور دلیل اس کی صرف یہ ہیں کہ فاتحین سندھ کی اصلی زبان عربی تھی اس لحاظ سے جو زبان ظہور میں آئی وہ عربی اور سوراسنی سے مشترک ہوئی لیکن اُردو میں فارسی کا حصہ زیادہ ہے سندھ کے بعد مسلمانوں کی آمد شیوخ عرب اور سرداران آل ہاشم کی تجارت اور تبلیغ دین کے سلسلے میں دکن میں ہوئی لہذا اُردو جو نو واردین اور ہندوستانیوں کے باہمی میل جول سے پیدا ہوئی ہے اس کی ابتدا دکن سے کرنی چاہیئے۔

ہمیں مؤلف کے اس قول سے اتفاق نہیں، سندھ میں زبانوں کا جو ملغوبہ تیار ہوا تھا اس میں فارسی آمیز عربی تھی اور فارس کے قرب کی بنا پر فارسی کا یہ اثر ہمیشہ تازہ ہوتا رہا۔ جب مسلمانوں نے ملتان، لاہور اور دہلی کو اپنی سلطنت میں ملا لیا تو اپنی زبان بھی ساتھ لائے، مقامی اثرات نے زبانوں میں رد و بدل کا عمل شروع کیا تغلقوں کے عہد میں ملتان بھی دہلی میں شامل ہوا اور اس طرح ایک زبان جو بالکل ابتدائی حالت میں تھی ظہور میں آئی ۔

مؤلف کا یہ قول بھی درست نہیں معلوم ہوتا کہ ولی کے دہلی آنے کے بعد شمالی ہند میں اُردو شاعری کی ابتدا ہوئی، حضرت امیر خسرو کے ہندی کلام سے قطع نظر شمالی ہند کے بیشتر صوفیائے کرام نے اس زبان میں اشعار نظم کئے۔ کبیر داس جن کی پیدائش ۸۰۰ھ مطابق ۱۳۹۱ء میں ہوئی اسی زبان میں شعر کہتے تھے جس پر اُردو کا اطلاق بیجا نہیں، یہ زمانہ ولی کے عہد سے ۲۰۸ سال پہلے کا ہے، اگر ولی کا کلام باوجود دکھنی کے کثیر عنصر کے اُردو کا نمونہ کہا جا سکتا ہے۔ تو ولی کو اُردو شاعری میں اولیت کا فخر بخشنے والے کبیر کی ہندی آمیز اُردو کو بھی ولی سے ۲۰۸ سال پہلے کی اُردو ماننے پر مجبور ہیں، سعدی کاکوروی المتوفی ۱۰۰۲ھ بھی ولی سے پہلے گذرے ہیں جن کی یہ غزل مشہور ہے۔

ہمنا تم کو دل دیا تم دل لیا اور دکھ دیا
ہم یہ کیا تم وہ کیا اچھی بھلی یہ پیت ہے

افضل جھنجانوی المتوفی ۱۰۲۰ھ جن کے بارہ ماسہ کی زبان یہ ہے ۔

اری جس شخص کوں یہ دیو لاگا ، سیانا دیکھ اسکوں دور بھاگا ،

اری یہ عشق ہے یا کیا بلا ہے ، کہ جس کی آگ میں سب جگ جلا ہے ،

ولی سے پہلے شمالی ہند میں ہو گذرے ہیں ، پنڈت چندر بھان برہمن ، مرزا عبدالقادر بیدل ، ملا محمد علیم تحقیق سب ولی سے مقدم ہیں اور شمالی ہند میں اردو میں شعر کہتے تھے جو اس زمانے میں ہندی ، ہندوی اور ریختہ کے نام سے منسوب تھی اور یہ نام سعدی کاکوروی (۱۰۰۲ھ) نے استعمال کیا ہے ۔

دکھنی نثر کی ابتدا کے متعلق لکھا ہے :۔

"اس امر کا بھی کوئی قطعی ثبوت نہیں کہ شمالی ہند میں اردو کب احاطہ تحریر میں آئی مگر بلا خوف تردید یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ دکن میں اس کی ابتدا پہلے ہوئی اور یہاں ہی وہ بول چال کے ابتدائی مدارج سے گذر کر تحریری صورت میں بھی آئی (صفحہ ۲۶)"

یہ بھی درست نہیں ، حضرت مخدوم اشرف جہانگیر سمنانی علیہ الرحمۃ (المتوفی ۸۰۹ھ) ہجری کا ایک رسالہ نثر میں تصوف پر موجود ہے ۔ ان سے پہلے نہ شمال میں کسی تصنیف کا پتہ لگا ہے اور نہ دکن میں دستیاب ہوئی ہے ۔

ان دو چار غلطیوں سے قطع نظر دکن میں اردو اچھی کتاب ہے ، اس موضوع پر اردو شہ پارے بھی موجود ہے لیکن اس میں وہ ترتیب اور تسلسل ملحوظ نہیں رکھا گیا ، جو دکن میں اردو میں پایا جاتا ہے ۔ اردو کے ابتدائی دور پر اس سے بہتر کتاب ہماری نظر سے نہیں گذری ، قدیم اور جدید تذکروں میں اس عہد کو نظر انداز کر دیا گیا ہے ۔ تاریخ ادب اردو مصنفہ رام بابو سکسینہ میں بھی یہ اہم حصہ بے حد کمزور ہے ۔ تذکرہ شعرائے دکن میں بھی باوجود دو ضخیم جلدوں کے اتنا مواد اس دور پر دستیاب نہیں ہوتا ، ہم ہاشمی صاحب کو کتاب کی مقبولیت پر مبارکباد پیش کرتے ہیں ۔

(لیمث)

یادگار عالی (یعنی انتخاب دیوان مولوی رفیع احمد صاحب عالیؔ) مرتبہ مولوی ضیاء احمد صاحب ایم۔ اے۔ لکچرار شعبہ فارسیہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ ضخامت ۹۲ صفحات۔

مولوی رفیع احمد صاحب مرحوم ان بزرگوں میں تھے جن کی مثال اب ملنا دشوار ہے پچھلی نسلوں میں جو بزرگ ہو گذرے ان کی مثل ابتک پیدا نہیں ہوئے اور زمانہ کے رنگ کو دیکھتے ہوئے اُمید بھی نہیں کہ آئندہ ان کے جانشین ان جیسے پیدا ہوں۔

رفیع احمد صاحب قدیم دبستان شعر کے پیرو تھے اور طرز جدید کو کچھ زیادہ پسندیدہ نہیں سمجھتے تھے میرؔ اور اثیرؔ کی شاعری سے وہ بیحد متاثر تھے کلام میں قدرتاً لکھنؤ اسکول کا رنگ جھلکتا ہے، وہی مضمون آفرینی معاملہ بندی اور صنائع معنوی و لفظی جو ناسخ اور تلامذہ ناسخ کا طرہ امتیاز تھے عالیؔ صاحب کو بھی مرغوب تھے، غزل، قصیدہ، مثنوی، قطعہ، رباعی، مسمط سب میں دادِ سخن دی لیکن اصل میدان غزل تھا، انتخاب موجودہ جو آپ کے دو دیوانوں سے ضیاء احمد صاحب نے مرتب کیا ہے اس کا آئینہ دار ہے، ذیل کے اشعار سے کلام کا اندازہ ہوگا۔

ہماری نعش پر جسدم وہ شوخ فتنہ گذرا
تاسف سے کہا ہے ہے جو کہتا تھا وہ کر گذرا

زمانہ عیش کا افسوس کتنا مختصر گذرا
نظر پھیری، پلک جھپکی، اِدھر آیا، اُدھر گذرا

آنکھوں میں باغباں کی کھٹکتے ہیں رات دن
تنکے جو چار پانچ مرے آشیاں کے ہیں

تم چاہنے کے نام سے کیوں اتنے خفا ہو
یہ کوئی بُری بات ہے تو تم ہیں چاہو

خدا کا نام لو اب اس سے بڑھکر اور کیا ہوتے
جواں ہو نازنیں ہو خوش ادا ہو خوبصورت ہو

مرے مرنے کے وہ ہیں آرزومند
تجھے اے موت لے آؤں کہاں سے

چمن میں لا کے شاخِ گل میں لٹکایا قفس میرا
نہیں معلوم کیوں کرتا ہے خاطر باغباں میری

شروعِ شیب میں کیوں دل بجھا سا جاتا ہے
اُداس ایسی تو شمعِ سحر نہیں ہوتی

نکلنے ہی نہیں دیتے ہیں کانٹے دشتِ وحشت سے
پکڑنے والے ہر جانب مرے دامن کے بیٹھے ہیں

رُباعی

ہستی کا نہ کچھ ہم نے زمانہ جانا　　آنا جانا نہ ہائے جانا جانا
وقفہ نہ ہوا آمد و شد میں کچھ بھی　　مانند نفس تھا دم کا آنا جانا

اشعار ذیل کی سادگی اور انداز بیان بھی حد درجہ دلآویز ہے۔

جب کہا تو کبھی نہیں ملتا　　ہنسکے بولا کہ جی نہیں ملتا،
مجھ سے بہتر رفیق اور کوئی　　تجھکو اے بیکسی نہیں ملتا،

کیا بتاؤں بے ترے کیسا رہا　　یہ سمجھ مر مر کے میں جیتا رہا
چودہویں کی رات میں نکلا جو چاند　　مجھکو پہروں آپ کا دھوکا رہا
بھول کر بھی تم کو کچھ آیا نہ دھیان　　مرنے والا مر گیا جیتا رہا
کس لئے اوروں سے ہو تم پوچھتے　　دیکھ لو اب آکے مجھ میں کیا رہا
جی گیا تو میں یہ سمجھا جی گیا　　جیتے جی کا روگ تھا جاتا رہا
رکھ گئے دو پھول میرے ڈھیر پر　　مر گئے پر بوجھ یہ اُن کا رہا
میں ہی اک کانٹا تھا سو میں بھی نہیں　　سچ ہے اب کس کا اُنھیں کھٹکا رہا

کہیں کہیں ناسخ و نصیر کی طرح اخلاقی اشعار بھی موجود ہیں:۔

سچ ہے مثل حباب ہے دنیا　　دیکھ لو نقش آب ہے دنیا،

ان اشعار کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ آپ قادر الکلام اور مشاق شاعر تھے، اگرچہ شاعری کا یہ قدیم رنگ اب مقبول نہیں رہا ہے لیکن اس سے مرحوم کے کلام کے مرتبہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا - ہم ضیاء احمد صاحب کے ممنون ہیں کہ انھوں نے اس انتخاب کو شائع کر کے بہت سے جواہر پارے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دئے۔

(لیث)

مضامین رشید ناشر مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی، کاغذ کتابت اور طباعت اعلیٰ جلد نہایت دیدہ زیب قیمت عمر
یہ مجموعہ رشید احمد صاحب صدیقی کے ان منتخب مضامین کا ہے جو ابتک مختلف علمی اور ادبی رسالوں میں منتشر تھے اور اہل ملک کے اصرار پر اب مکتبہ جامعہ کی طرف سے شائع ہوئے ہیں۔

رشید صاحب ایک خاص طرز تحریر کے مالک ہیں جو خود ان ہی کی ایجاد ہے اور جس پر صرف وہی قدرت رکھتے ہیں، مزاحیہ لکھنے والے اردو میں اور بھی انشا پرداز موجود ہیں لیکن ایسا مزاح جس میں طنز کا پہلو نمایاں ہو اگر آپ دیکھنا چاہیں تو رشید صاحب کی تحریر کے سوا کہیں اور نہیں ملے گا، چلتے چلتے رشید صاحب کوئی ایسا جملہ یا فقرہ معترضہ لکھ جاتے ہیں جس کا اگرچہ اصل مضمون سے کوئی تعلق نہیں ہوتا لیکن پڑھنے والا اصل مضمون سے زیادہ لطف اس میں حاصل کر لیتا ہے، ایسے جملوں میں بالعموم مولوی، انگریز، بیوی یا پھر رشید صاحب کے دوست احباب، اور آشنا معرض بحث میں آجاتے ہیں، رشید صاحب فطرت کی ان ستم ظریفیوں اور حضرت انسان کی کمزوریوں پر خود بھی ہنستے ہیں، اور دوسروں کو بھی ہنساتے ہیں۔

ان مضامین کے متعلق اکثر شکایت بھی سنی گئی کہ اس میں اس قسم کی بھول بھلیاں اور پیچ در پیچ راہیں ہوتی ہیں کہ ہر شخص سلامتی سے نہیں گذر سکتا، یہ صحیح ہے، یہ راستہ گذرگاہ عام بنایا ہی نہیں گیا ہے، یہاں صرف وہ لوگ گذرتے ہیں جو گذرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں رہے وہ لوگ جو نگھو را اور مولانا نیاز فتحپوری کے مرید ہیں انھیں واقعی اس طرز میں لطف اور دلچسپی کا موقع نہیں اور یہی خدا کا بڑا احسان ہے ورنہ اردو بیچاری صرف ادب لطیف ہو کر رہ جاتی۔

یہ اٹھارہ مضامین جو اس مجموعہ میں شامل ہیں ان کی تحریر کا مستقل نمونہ ہیں، ان میں مرشد اور سہیل کا لطف جب ہی آسکتا ہے جب آپ نے مرشد اور سہیل کو دیکھا ہو، کاروان بیداست بھی اسی کے لئے ہے جس نے علی گڑھ میں جوانی نہ سہی بڑھاپا ہی گذرا ہو۔

یہ چیز رشید صاحب کے تمام مضامین پر صادق آتی ہے جن شخصوں، مقامات یا واقعات کو وہ بقول خود اپنے مضمون کا "گوبر" بناتے ہیں ان سے باہر والے آشنا نہ ہونے کے باعث لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔ رشید صاحب کا یہ طرز علی گڑھ کی ہی پیداوار ہے اور اس میں یہ مقامی رنگ علی گڑھ

سے محبت کرنے والوں کو بیحد دلاویز معلوم ہوتا ہے۔

ان مضامین میں ہماری سوسائٹی کی بہت سی دلچسپ تصویریں ہیں مثلاً حالت سفر میں مارواڑی اور بنگالی کا ساتھ جس لطف سے "مرشد" والے مضمون میں ادا ہوا ہے رشید صاحب کا حصہ ہے، 'وکیل' صاحب بھی عصر حاضر کے 'وکیل' کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔

اسی سلسلہ میں جن بزرگوں، دوستوں اور لیڈروں کی تعریف ہوئی ہے اگر ان کا بس چلتا تو تعزیرات ہند کے ساری دفعات رشید صاحب پر قائم کرا کے چھوڑتے۔

بہر حال یہ مجموعہ بے نظیر ہے اور اردو ادب میں گرانبہا اضافہ ہے جس کے لئے ہم جامعہ ملیہ والوں کے ممنون ہیں۔

(لیث)

جائزہ تصانیف زبان اُردو
سنہ ۱۹۳۷ء

مُرتّبہ

محمد ابواللیث صدیقی البدایونی، بی۔ اے آنرز (علیگ) ایڈیٹر
(سید جمیل احمد نقوی، اورینٹل اسسٹنٹ لٹن لائبریری مسلم یونیورسٹی علیگڑھ)

عنوان بالا پر کام کرنا ضروری بھی ہے اور مشکل بھی، ضروری تو یوں ہے کہ اُردو کے خدمت گذاروں لازم ہے کہ زبان کی روزافزوں ترقی سے آشنا رہیں۔ اس سے ان کی حوصلہ افزائی بھی ہوگی اور اپنی خامیوں حساس بھی ایک حد تک ہونے لگے گا۔ مشکل اس وجہ سے کہ اس کے لئے وقت روپیہ اور محنت درکار ہے، وقت محنت کی قربانی کرنے والے نوجوانوں کی ہم میں کمی نہیں اور جہاں تک ستائش کا تعلق ہے ہمارے اہل علم کو قدر کی نگاہ سے بھی دیکھتے ہیں لیکن جہاں تک سرمایہ کا سوال ہے "سخن دریں است"۔

اس قسم کے سالانہ جائزہ کے لئے ہندوستان کے مختلف مطابع، دارالاشاعت اور متعدد اداروں سے

ِس وقت میگزین کی ادارت ہمارے سپرد ہیں احساس ہوا کہ اپنے دور میں کسی ایسے کام کی داغ بیل ڈالتے چلیں جس پر ہمارے ین حضرات چل کر میگزین کو اُردو و ادب کا کارآمد خدمت گذار بنا سکیں۔ مختلف عنوانات ذہن میں آئے اور آخرالامر قرار پایا کہ میگزین میں ِکی تمام تصانیف، تالیفات تراجم، رسائل اور اخبارات کا سالانہ جائزہ لیا جایا کرے۔ تاکہ ہمیں معلوم ہوتا رہے کہ زبان اور ادب کس طرف ہے اور ہم جدید رجحانات اور میلانات کو نظر انداز نہ کر دیں۔

براہ راست تعلق رکھنے کی ضرورت ہے علاوہ بریں انفرادی طور پر جو حضرات اُردو کے بہی خواہ ہیں ان کی کوششوں کے نتائج سے بھی باخبر رہنے کی حاجت ہے۔ یہ چیز کسی ایک شخص یا چند گم نام شخصیتوں کے بس کی نہیں۔ بلکہ اس کے لئے با اثر حضرات اور منظم ادارہ کا ہونا لازمی ہے۔ جو عملی طور پر اُردو کی حالی مطبوعات کے متعلق بلا کسی تخصیص کے مکمل ومفصل اطلاعات بہم پہونچا سکے۔

چنانچہ سب سے بڑی دقت جس سے ہمیں دوچار ہونا پڑا یہ تھی کہ باوجود ہماری مکرر التجاؤں کے اکثر ذمہ دار حضرات اور مشہور اداروں کی طرف سے "صدائے برنخواست" اور اکثر نے جواب میں ۱۹۳۷ء کی مطبوعہ فہرستیں (عام) بھیجدیں جس میں بیشتر وہ کتابیں شامل ہیں جو سالہائے گذشتہ میں شائع ہوئیں اور سال زیر تبصرہ کی مطبوعات کی صراحت نہیں کی گئی ہے اس وجہ سے ہمیں اس فہرست کے مرتب کرنے میں بڑی دقت پیش آئی اور بہت ممکن ہے کہ گذشتہ مطبوعات بھی اسی دقت کی بنا پر غلطی سے (جس کا ہمیں قطعاً علم نہیں) شامل ہوگئی ہوں اور بعض جدید مطبوعات کے سلسلہ میں متشابہ لگ گیا ہو بہر حال سرکاری اطلاعات اور ذاتی معلومات یا ان جوابات کی مدد سے جو ہمیں گشتی چٹھی کے جواب میں موصول ہوئے ذیل میں ہم اپنی نامکمل لیکن پہلی (جو شاید اپنی قبیل کی بھی پہلی ہی ہے) کوشش آپ کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔

انشاء اللہ آئندہ اشاعتوں میں یا بطور ضمیمہ کے ہم اس فہرست کے باقی ماندہ حصوں کو شائع کرتے رہیں گے۔ اور اگر ہماری یہ سعی ادبی حلقوں میں مقبول ہوئی تو اس سلسلہ کو مستقل صورت دی جائے گی۔ ۱۹۳۸ء کے لئے ہم ابھی سے مواد فراہم کر رہے ہیں اور اگر حالات نے مساعدت کی تو شاید اس موجودہ صورت سے کہیں بہتر ومرتب شکل میں پیش کر سکیں گے۔

اُردو اکیڈمی، جامعہ ملیہ دہلی جامعہ ملیہ دہلی کا دار الاشاعت ہے جس کا مقصد جامعہ کے فارغ التحصیل طلباء اور مشہور اہل قلم حضرات کی کوششوں کو منظر عام پر لانا ہے۔ اس ادارہ نے بندرہ بیس سال کے عرصہ میں اُردو ادب کی جو خدمت کی ہے وہ قابل ستائش ہے۔ جہاں تک اُردو مطبوعات کے ظاہری حسن کا تعلق ہے اُردو اکیڈمی جامعہ ملیہ نے ایک قابل تقلید نمونہ اُردو اشاعت خانوں کے روبرو پیش کیا ہے اور اب ہم دیکھتے ہیں کہ ملک کے دیگر اشاعت خانے بھی مطبوعات کے اس پہلو کو زیادہ نمایاں حیثیت سے پیش

رنے کی سعی کر رہے ہیں۔ اس قومی اشاعت خانے کی ایک بین خصوصیت بچوں کے لئے آسان اور دلچسپ لٹریچر فراہم کرنا بھی ہے۔ اس سلسلہ میں اولیت کا شرف تو دارالاشاعت پنجاب ہی کو حاصل ہے لیکن جامعہ والوں کی سعی بھی سعی مشکور رہے۔ سال زیر تبصرہ میں اکیڈمی مذکور نے حسب ذیل مطبوعات نشر کی ہیں۔

مطبوعات جامعہ ۳۶ء

۱۔ **معاہدہ عمرانی :۔** از ژاں ژاک روسو مترجمہ ڈاکٹر محمود حسین خاں صاحب بی۔اے (جامعہ) ایم۔اے پی۔ایچ۔ڈی (ہائیڈلبرگ)۔ حریت، اخوت اور مساوات کی سیاسی تبلیغ۔ روسو کا کمال یہ ہے کہ اس نے سیاست مدن کے دقیق مسائل باتوں باتوں میں سمجھا دئے ہیں۔ اس کی یہ کتاب جو معنوی حیثیت سے فلسفۂ سیاست کی سب سے اہم کتاب ہے زبان اور طرز بیان کے لحاظ سے سب سے سہل ہے کتابت وطباعت کے ساتھ ساتھ اس کی ظاہری خوشنمائی میں بھی کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی گئی ہے۔

قیمت مجلد عہ

۲۔ **جدید دستور کا خاکہ :۔** ڈاکٹر زین العابدین صاحب نے (The new Constitution) کے نام سے انگریزی میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ پر تبصرہ لکھا تھا، جس میں اس کا ضروری خلاصہ پیش کیا گیا تھا۔ جناب شفیق الرحمٰن صاحب قدوائی۔ بی۔اے (جامعہ) نے انگریزی سے ناواقف لوگوں کی آسانی کے لئے ہندوستانی میں اس کا ترجمہ کر دیا ہے۔ ترجمہ سلیس ہے۔ اس کے دیکھنے سے جدید دستور کی حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ قیمت ۲ر

۳۔ **ہندوستان میں زراعت کا مسئلہ :۔** از ڈاکٹر زین العابدین احمد صاحب بی۔ایس۔سی، پی۔ایچ۔ڈی (لندن) معہ دیباچہ پنڈت جواہرلال نہرو۔ مترجمہ شفیق الرحمٰن صاحب قدوائی بی۔اے (جامعہ) اس مختصر سے رسالے میں کاشتکاروں کی کثرت اور زمین کی قلت، کسانوں کے افلاس، کسانوں کے قرضے اور حقیقت اراضی کے نظام پر بحث کی گئی ہے۔ قیمت ۴ر

۴۔ **فکر و نشاط :۔** یہ مجموعہ ہے جناب جوش ملیح آبادی کی ۸۲ نظموں کا جو مختلف جرائد و رسائل میں شائع

ہو کر بہت مقبول ہو چکی ہیں۔ جوش کی مخصوص انفرادیت سے کون انکار کر سکتا ہے یہ مفہوم و معنی کی جستجو کے ساتھ ساتھ حسنِ ادا اور ندرتِ بیان کی خصوصیات کے بھی مالک ہیں۔ قدرتاً شریں بیان ہیں۔ لطیف اور پاکیزہ ذہن پایا ہے۔ اسی لئے وہ مخاطب کو فکر کی پیچ در پیچ گھاٹیوں میں بھٹکتا ہوا نہیں چھوڑ دیتے بلکہ اُسے نشاط کی سرسبز وادیوں کی بھی سیر کراتے ہیں۔ قیمت ۲ر

۵۔ **مضامین رشید:**۔ یہ پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی کے ان مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے جو اب تک مختلف رسالوں میں منتشر تھے، اصحاب ذوق کی خواہش پر یہ بیش بہا موتی ایک لڑی میں پرو دئے گئے ہیں۔ تمام مضامین دریائے لطافت سے سینچی ہوئی کشت زعفران، تروتازہ، شاداب اور فرحت بخش۔ کتابت وطباعت اور ظاہری خوشنمائی میں بھی خاص اہتمام سے کام لیا گیا ہے قیمت مجلد عہ

۶۔ **صحیفۂ چین:**۔ سید اسد علی انوری صاحب نے چین کے مشہور حکیم و فلسفی کنفیوشش کی کتاب "شوکنگ" کا ترجمہ کیا ہے۔ اصل ترجمے کے علاوہ اس میں تین ضمیمے شامل کئے گئے ہیں جو جنوری ۱۹۳۷ء تک کے حالات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ قیمت مجلد عہ۔

۷۔ **واردات:**۔ یہ منشی پریم چند آنجہانی کے جادو نگار قلم کے ۱۳ مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے۔ یہ افسانے کیا ہیں ہماری معاشرت کی جیتی جاگتی تصاویر ہیں۔ جو افسانوں کی شکل میں منشی جی نے پیش کی ہیں۔ کتابت وغیرہ کے لئے مکتبہ کا صرف نام کافی ہے۔ قیمت مجلد عہ

بچّوں کی کتابیں

۸۔ **ایورسٹ کی داستان اور ننگا پربت:**۔ ان دو پہاڑی چوٹیوں کو سر کرنے کے لئے بہت دنوں سے مہمیں جاری ہیں۔ اس کتاب میں انہی دو مہموں کی سرگذشت ہے۔ چوٹیوں تک پہونچنے کے لئے کیا کیا صورتیں اختیار کی گئیں۔ کیا کیا دقتیں پیش آئیں، کتنے بہادروں کی جانیں ان کوششوں پر قربان ہوئیں، یہ سب حال اس کتاب میں بیان کیا گیا ہے۔ قیمت ۵ر

۹۔ **کائنات**:۔ سورج، چاند، ستارے اور ہماری یہ دنیا کیا چیز ہے۔ سب کے سب پھرتے کیوں نظر آتے ہیں۔ دن رات کیسے ہو جاتے ہیں، گرمی جاڑا کیوں ہوتا ہے۔ ان سب باتوں کو دلچسپ مثالوں کے ذریعہ بچوں کو سمجھایا گیا ہے۔ قیمت ۴ر

۱۰۔ **دنیا کے بچے**:۔ اس کتاب میں دنیا کے چودہ مختلف ملکوں کے بچوں کے حالات بہت ہی آسان زبان اور دلچسپ انداز میں لکھے گئے ہیں۔ ان ملکوں کے رہنے والوں کے بارے میں بہت سی مفید باتیں بچے کو دلچسپی ہی دلچسپی میں معلوم ہو جاتی ہیں۔ تصویروں کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ ۸۰ صفحے قیمت ۶ر

۱۱۔ **بچوں کا حساب ۳**:۔ جامعہ کے ریاضی استاد برکت علی صاحب نے "بچوں کا حساب" کا ایک سلسلہ شروع کیا ہے جس کا یہ تیسرا ۳ ہے۔ یہ جماعت سوم کے درس میں داخل ہے۔ قیمت ۹۰ر

کہانیاں

۱۲۔ **بچوں کی کہانیاں باتصویر**:۔ عبدالواحد صاحب سندھی استاد مدرسہ ابتدائی جامعہ نے پرندوں کی کہانیاں بچوں کی زبان میں لکھی ہیں۔ بچے چونکہ بہت زیادہ پرندوں سے مانوس ہوتے ہیں اس لئے یہ بہت پسند کی جا رہی ہے۔ قیمت ۲

۱۳۔ **ننھی مرغابی باتصویر**:۔ یہ عبدالواحد صاحب سندھی کی لکھی ہوئی ہے۔ اس میں "میاں مٹھو کی ہوشیاری"، "ننھی مرغابی اور لومڑی"، اور "آلو کی عینک" تین کہانیاں ہیں۔ تینوں بہت سہل اور مزے دار قیمت ۲ر

۱۴۔ **لال مرغی باتصویر**:۔ عبدالواحد صاحب سندھی نے چھوٹے بچوں کے لئے لال مرغی، مینڈک اور خالہ بلی کی اَن بَن اور بعد میں پھر دوستی بہت اچھے پیرایہ میں لکھی ہے۔ صفحات ۸۰ قیمت ۲ر

۱۵۔ **چھدّو اور دوسری کہانیاں**:۔ اس میں چار بہت دلچسپ کہانیاں ذرا بڑے بچوں کے

و

لئے ہیں۔ چھدو اور باچھو تو محترمہ رقیہ ریحانہ کی لکھی ہوئی ہیں۔ "آخری قدم" ڈاکٹر محمود حسین خاں صاحب کی اور چوتھی "پان کو" امتیاز حسین خاں صاحب بی۔ اے (جامعہ) قیمت ۳ر

۱۶۔ چھوٹا چمو:۔ از محمد حسین خاں صاحب ایڈیٹر پیام تعلیم۔ بڑے مزے کی کہانی ہے۔ ایک ننھے منھے چوہے کی شوخی اور شرارت کی دلچسپ کہانی ہے قیمت ۲ر

۱۷۔ انعامی مقابلہ:۔ بہت اچھی کہانی ہے۔ جیسے مدرسے میں ہاکی۔ فٹ بال۔ کرکٹ وغیرہ کے آئے دن مقابلے ہوتے رہتے ہیں اسی طرح میاں اُلو کے مشورے سے بہت سی چڑیوں نے گھونسلا بنانے کا مقابلہ کیا ہے اور خود اُلو صاحب جج بنے ہیں۔ جگہ جگہ چڑیوں کی تصویریں بھی ہیں قیمت ۲ر

۱۸۔ عقاب اور دوسری کہانیاں:۔ یہ ذرا بڑے بچوں کے لئے ہے۔ سب کی سب بہت اچھی اور دلچسپ، ابو کی بکری کو ذرا دیکھو، جانور بھی غلام رہنا پسند نہیں کرتے تو بھلا انسان کا کیا کہنا۔ بچاری لڑتے لڑتے آخر میں مرجاتی ہے لیکن غلام رہنا پسند نہیں کرتی۔ قیمت ۴ر

۱۹۔ پوری جو کڑھائی سے نکل بھاگی:۔ کسان کی کھیتی اور پوری کا نکل بھاگنا، اس کا بیچا، کسان کی بیوی، اس کے ساتھیوں، خرگوش، لومڑی اور کتوں میں سے کسی کے ہاتھ نہ لگنا۔ بہت ہی مزیدار ہے۔ قیمت ۲ر

از ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب

ہندوستانی اکیڈمی (یو-پی) الہ آباد — ۱۹۲۷ء میں یو-پی گورنمنٹ نے ہندوستانی اکیڈمی کے نام سے ایک ادبی ادارہ الہ آباد میں قایم کیا تھا۔ جس کا مقصد اُردو اور ہندی کی ترقی کے بہترین ذرایع اور وسائل مہیا کرنا ہے۔ اُردو ہندی کی موجودہ کشمکش سے یہ ادارہ بھی غیر ضروری طور سے متاثر ہوا اور اُردو کے علمبرداروں کو اس سے بھی شکایت کا موقع حاصل ہوا۔ جو اس کے مقاصد کے ایک حد تک منافی ہے۔

۱۹۳۶ء میں اکیڈمی کی طرف سے مندرجہ ذیل کتابیں شائع ہوئیں:۔

۱- **انقلاب روس**:۔ از کشن پرشاد کول، ممبر سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی لکھنؤ۔

۲- **چند دکھنی پہیلیاں**:۔ از محمد نعیم الرحمن، ایم۔اے، استاذ عربی و فارسی، الہ آباد یونیورسٹی (اس عنوان سے ہندوستانی الہ آباد کی کئی اشاعتوں میں پروفیسر موصوف نے کئی مضمون تحریر فرمائے جو بعد میں کتابی صورت میں شایع کر دئے گئے ہیں۔

۳- **تاریخ فلسفہ سیاسیات**:۔ از محمد مجیب، بی۔اے (آکسن) استاذ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی (اُردو زبان میں اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے

۴- **انگریزی عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ**۔ از علامہ عبداللہ یوسف علی۔

۵- **دیوان بیدار**۔ میر محمدی بیدار کا اُردو دیوان مع مقدمہ و حواشی از جلیل احمد قدوائی۔

۶- **نفسیات فاسدہ**۔ از معتقد ولی الرحمن، ایم۔اے،

۷- **سلطان الہند محمد شاہ بن تغلق**۔ از پروفیسر آغا مہدی حسین، ایم۔اے، پی۔ایچ۔ڈی۔

دار المصنفین، اعظم گڑھ — دار المصنفین نے مذہبی مسائل اور مشرقی علوم و فنون پر مطبوعات کا سلسلہ عرصہ سے شروع کیا ہے اور اب تک مغربی فلسفیوں اور ماہرین نفسیات کی اکثر اعلیٰ درجہ کی کتابیں ترجمہ کی جا چکی ہیں۔ اس ادارہ کا شمار بھی اُردو کے مخلص خدمتگزاروں میں ہے اور اس کی سعی پیہم زبان کی ترقی اور اشاعت کے لئے بیحد مفید ہے۔

۱۹۳۶ء میں دار المصنفین سے صرف ایک کتاب مقالات شبلی کی چھٹی جلد شائع ہوئی جو مولانا مرحوم کی

ان تاریخی مضامین کا مجموعہ ہے جس میں اسلامی حکومتوں کے تمدن وتہذیب، علم وفن، شوق علم اور بے تعصبی کے متعلق نہایت محققانہ واقعات درج کئے گئے ہیں۔ اور ان کے متعلق یورپین مورخوں کے اعتراضات کے جوابات دئے گئے ہیں۔

محترمی مولوی مسعود علی ندوی صاحب سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اس سال زیادہ تر سیرۃ النبیؐ کا کام ہوتا رہا۔ سیرۃ النبیؐ جلد ششم عنقریب شائع ہونے والی ہے۔ سیرۃ النبی جلد پنجم کی چھوٹی تقطیع کی طباعت کا کام بھی اسی کے ساتھ ہو رہا ہے۔

معارف پریس اعظم گڑھ سے اس سال تین کتابیں اور بھی شائع ہوئیں، یعنی:۔

۱۔ **مختصر تاریخ ہند** ۔ از مولوی سید ابوظفر ندوی۔

۲۔ **کلام لطف** ۔ مجموعہ کلام مولوی لطف اللہ صاحب مرحوم (علی گڑھی) موسوم بہ استاذ العلما، مرتبہ مولوی سید بدرالدین علوی اُستاذ عربی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ نواب صدر یار جنگ کا مقدمہ بھی شامل ہے۔

حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی مولانا حالی مرحوم کی صد سالہ سالگرہ کی تقریب منعقدہ اکتوبر ۱۹۳۶ء کی یادگار میں یہ کتاب گھر قایم ہوا ہے۔ جس کا مقصد مولانا مرحوم کی ہر تصنیف کو بہتر حالت میں شائع کرنا۔ اور ان کے پیغام کو گھر گھر پہونچانا ہے۔ ۱۹۳۶ء میں اس پبلشنگ ہاؤس نے صرف دو کتابیں شایع کیں، جن میں سب سے پہلی مسدس حالی کا صدی ایڈیشن جو حقیقتاً بہت اعلیٰ ترتیب وطباعت کا حامل ہے۔ دوسری احمد صدیق مجنوں گورکھپوری کے افسانوں کا مجموعہ "ہتیا اور دیگر افسانے"

سال زیر تبصرہ (۱۹۳۷ء) میں حسب ذیل کتابیں یہاں سے شائع ہوئیں۔

۱۔ **زادراہ** ۔ منشی پریم چند آنجہانی کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔

۲۔ **محمد علیؒ** ۔ رئیس الاحرار مولانا محمد علیؒ مرحوم کی مختصر سوانح عمری مرتبہ خواجہ احمد عباس۔

۳۔ **مسولینی فاشیست اور جنگ حبش**:۔ خواجہ احمد عباس کے قلم سے۔ ایک مختصر مگر جامع کتاب ہے،

جس میں مسولینی کی ملوکیت پرستی اور غریب حبش کے خون میں ہاتھ رنگنے کی کہانی دلدوز انداز میں بیان کی گئی ہے۔

۴۔ دنیائے تبسم۔ شوکت تھانوی کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ مع مقدمہ از پروفیسر رشید احمد صدیقی۔

۵۔ ماہ درخشان۔ محترمہ مسز مرزا احمد علی صاحبہ کا ناول جس میں اسلام کی خوبیاں بہت اچھی طرح دکھائی گئی ہیں

۶۔ انصار الحق ہارونی کا مرتبہ تذکرہ۔ سرسید بھی حالی پبلشنگ ہاؤس نے طبع کرایا تھا لیکن طباعت وکتابت وغیرہ کی خرابیوں کی وجہ سے شایع نہ کیا جاسکا۔ اب اس کی دوبارہ کتابت وطباعت کی جارہی ہے۔

ساقی بکڈپو دہلی علاوہ ان چند اردو رسالوں کے جو محض ٹھوس ادبی کہلائے جانے کے مستحق ہیں، رسالہ ساقی نے جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں جو مقبولیت حاصل کرلی ہے اس کے مقابلہ میں کوئی دوسرا رسالہ مشکل ہی سے پیش کیا جاسکے گا۔ جس کے لئے مجبی شاہد احمد صاحب قابل مبارکباد ہیں۔

ادارہ ساقی سے متعلق ایک بکڈپو بھی قایم ہے جو عرصہ سے ستھرا اور بلند پایہ افسانوی ادب ہمارے سامنے پیش کرنیکی سعی کررہا ہے جس کو ایک حد تک "سعی مشکور" بھی کہا جاسکتا ہے۔ ۱۹۳۶ء میں اس بکڈپو سے حسب ذیل کتابیں شایع ہوئیں جن کا بیشتر حصہ تراجم پر مشتمل ہے:۔

۱۔ تائیس۔ از اناطول فرانس۔ مترجمہ مولانا عنایت اللہ دہلوی (تائیس کا پہلا ایڈیشن عرصہ ہوا دار الاشاعت پنجاب لاہور، نے شائع کیا تھا۔ اب بہتر طریقہ پر شاہد صاحب نے دوبارہ شائع کیا ہے۔

۲۔ ہیرودیاس۔ از گستو فلابیر۔ مترجمہ مولوی عنایت اللہ دہلوی۔

۳۔ ہملٹ۔ از شیکسپیر۔

۴۔ چمکی۔ از مرزا اعظم بیگ چغتائی (عورت کی کمزوری اور شہزوری کے مظاہرہ کے بعد مرزا صاحب نے اپنے ظرافت نگار قلم کی نوک سے اس کی خودداری کو مجروح کرنے کی کوشش فرمائی ہے

۵۵ - محبت اور نفرت، افسانے اختر حسین رائے پوری کے ان افسانوں کا مجموعہ ہے جو زیادہ تر ساقی میں اور شاید دو ایک دوسرے رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ اختر ان افسانہ نگاروں میں ہیں جو عام سوسائٹی کی دکھتی رگ پر نیش زنی کرنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ یہ افسانے تقریباً اسی قسم کے بہترین نمونہ کہے جا سکتے ہیں۔

شانتی نکیتن، بنگال وسط ۱۹۳۲ء میں شانتی نکیتن سے بھی پروفیسر ایم، ضیاء الدین نے ڈاکٹر ٹیگور کی مختلف بنگالی نظموں کا جو موصوف کی تصانیف میں سے منتخب کی گئی ہیں اور ان گیتوں کا جو سانتی نکیتن میں عام طور سے ورد زبان ہیں۔ اردو میں ترجمہ کر کے شائع کیا ہے۔ ابتدا میں شاعر کی زندگی کے حالات جمع کئے ہیں اور ان کی ہمہ گیری ثابت کی ہے۔

(باقی آئندہ)